Paramount
پنجاب کا بٹوارا
1947
ایک المیہ ہزار داستانیں
پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق احمد
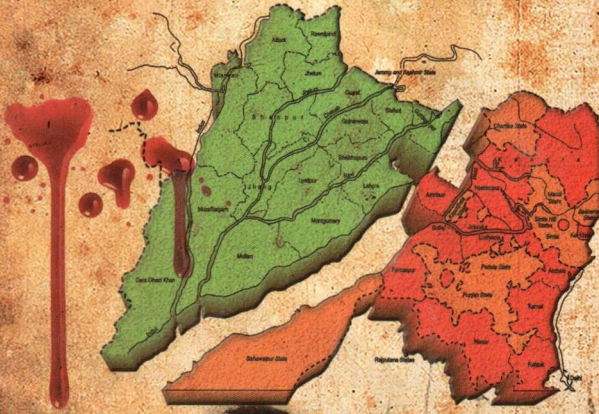
پنجاب کا بٹوارا - 1947

ایک المیہ ہزار داستانیں

پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق احمد

ترجمہ: وسیم بٹ

Paramount Books (Pvt) Ltd.
Karachi | Lahore | Islamabad | Hyderabad | Faisalabad | Peshawar | Abbottabad

پنجاب کا بٹوارا–1947: ایک المیہ ہزار داستانیں

(پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق احمد کی شائع شدہ انگریزی کتاب
The Punjab Bloodied, Partitioned and Cleansed: Unravelling the 1947 Tragedy through Secret British Reports and First-Person Accounts.
کا اردو ترجمہ ہے۔)

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق احمد
مترجم: وسیم بٹ
سرورق: عابد علی
اشاعت اوّل: ۲۰۱۵
پیش کش: اقبال صالح محمد
تعداد: ۵۰۰
ناشر و طابع: پیراماؤنٹ بکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی
تقسیم کار: پیراماؤنٹ بکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی
۱۵۲/O بلاک نمبر ۲ پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس، کراچی
فون، ۳۴۳۱۰۰۳۰: فیکس ۳۴۵۵۳۷۷۲
آئی۔ایس۔بی۔این: ۹۷۸-۹۶۹-۶۳۷-۰۷۱-۰

انتساب

اپنی شریک حیات ملیحہ کے نام
جو ہمارے پورے خاندان کے لیے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی
ہیں اور جن سے ہمیشہ میں نے، میرے بیٹوں ساحر اور سلیم
اور ان کی شریک حیات بالترتیب آئس اور ہیلینا نے
قوت اور تعاون حاصل کیا

اردو ایڈیشن میں استعمال کیا گیا حوالہ نظام (Reference System)

1. اردو ایڈیشن میں حوالاجات (references) اصل زبان یعنی انگریزی میں دیے گئے ہیں کیونکہ ان کی بہت بڑی تعداد انگریزی میں شائع شدہ مواد سے لی گئی ہے۔ اس سے تحقیق میں دلچسپی رکھنے والوں کو ان ذرائع تک رسائی میں مدد مل سکتی ہے۔ ان کا اردو ترجمہ کرنے سے کوئی کارآمد مقصد حاصل نہیں ہو پاتا۔

2. ہم نے اردو متن (text) میں جو حوالہ نظام استعمال کیا ہے اس کے تحت پہلا حوالہ مختصراً متن میں دیا گیا ہے جبکہ باب کے آخر میں حوالاجات کی فہرست دی گئی ہے جس میں استعمال ہونے والے تمام ذرائع کی مکمل معلومات دی گئی ہے۔

3. متن میں دیا گیا حوالہ اس ترتیب سے ہے: مصنف کا خاندانی نام (surname) پھر وقفہ کی علامت (comma) پھر سالِ اشاعت (year of publication) اور صفحہ نمبر، مثلاً (Ahmed, 2012: 78-80)

4. اگر حوالہ کسی مکمل کتاب کا ہے تو اس صورت میں صرف مصنف کا خاندانی نام (surname) اور سالِ اشاعت (year of publication) دیا گیا ہے۔

5. جب ایک گذشتہ حوالہ اور صفحہ نمبر دوبارہ دیا گیا ہے تو مصنف کا خاندانی نام اور سال اشاعت دوبارہ دینے کے بجائے (Ibid) استعمال کیا گیا ہے۔

6. اگر گذشتہ حوالہ مختلف صفحہ نمبر کے ساتھ دیا گیا ہے تو اس طرح استعمال کیا گیا ہے: (Ibid: 69)۔

7. اگر مصنف کا نام یا کتاب یا مضمون کا عنوان پہلے بھی متن میں دیا جا چکا ہے تو صرف سال اشاعت اور صفحہ نمبر دیا گیا ہے: (2012: 48)

8. عمومی طور پر ایک حوالہ کافی ہوتا ہے لیکن اگر ثبوت کی تقویت کے لیے ایک سے زائد حوالاجات دیے گئے ہیں تو ان کو (;) سے جدا کیا گیا ہے: (Ahmad 2012: 37-38; Jalal 1985: 120-21)

9. جہاں ایک ہی مصنف کی ایک ہی سال میں شائع شدہ دو تصانیف کا حوالہ دیا گیا ہے وہاں فرق ظاہر کرنے کے لیے سال اشاعت کے بعد a, b, c کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً:

   (Jones, K.W.,--------------,(1989a)

   (Jones, K.W.,--------------,(1989b)

10. باب کے اختتام پر ایک کتاب کے بارے میں مکمل معلومات دی گئی ہے، کسی صفحہ نمبر کا ذکر نہیں ہے کیونکہ یہ پہلے ہی متن میں مختصراً دیے جا چکے ہیں۔ حوالاجات کی فہرست اس طرح سے ہے:

References

Ahmed, Ishtiaq, *The Punjab Bloodied, Partitioned and Cleansed: Unravelling the 1947 Tragedy through Secret British Reports and First-Person Accounts*, Karachi: Oxford University Press, (2012).

Jalal, Ayesha, *The Sole Spokesman, Cambridge*: Cambridge University Press, 1985.

فہرست

ابتدائیہ

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ پنجاب کی تقسیم پر ریسرچ کرنے کا خیال مجھے سب سے پہلی بار کب آیا تھا لیکن یہ جستجو میرے بچپن سے میرے ساتھ تھی۔ میں بچپن سے اپنے بڑوں سے ٹیمپل روڈ (لاہور، جہاں میں پیدا ہوا) پر ہونے والے واقعات سنا کرتا تھا۔ یہ کینوس اس وقت مزید وسیع ہوا جب میں اپنی محبوب جنم بھومی لاہور میں موٹر سائیکل پر گھومتے ہوئے اس شہر کے ماضی کی کھوج لگایا کرتا تھا۔ میں گھومتے گھومتے ان علاقوں میں بھی جاتا تھا جو کبھی ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت کا مسکن ہوا کرتے تھے تاہم اب ان کی موجودگی کا نام ونشان بھی نہیں۔ کم عمری میں بھی میں یہ سوچ سکتا تھا کہ یہ ہندو یا سکھ اپنی مرضی سے یا خوشی کے ساتھ اپنے گھر یا علاقے چھوڑ کر نہیں گئے ہوں گے۔ صرف خرید و فروخت کے مشہور مرکز انارکلی جو تقسیم سے قبل ہندو دکانداروں کا گڑھ ہوا کرتا تھا میں ایک ہندو بیلی رام اینڈ سنز 1970 کے عشرے تک ایک بڑی ڈسپنسری اور میڈیکل سٹور چلاتا رہا۔ 1971 میں پاکستان دولخت ہونے کے بعد بالآخر وہ بھی بھارت کو نقل مکانی کر گئے۔ یہ بات ابھی تک ایک اسرار ہے کہ یہ ہندو تاجر اور اس کا کاروبار اتنا طویل عرصے تک کیسے محفوظ رہے۔

تقسیم کے بعد بھی لاہور میں مسلمانوں کی مشکلات کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ میری اوائل عمری کی یادوں میں ایک بوڑھا اب بھی زندہ ہے جو ہمارے گھر کے سامنے ایک چھوٹی دکان میں رہتا تھا۔ اس کا اپنا کوئی باقاعدہ گھر نہیں تھا۔ وہ پرانے متحدہ پنجاب کے دوسرے حصے (مشرقی پنجاب) سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ وہ ایک کھردری قسم کی اردو بولتا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ ہریانوی لہجے کی اردو تھی۔ تقسیم سے قبل ہریانہ متحدہ پنجاب کے بیشتر مشرقی حصوں پر مشتمل تھا۔ ہر شام کو وہ اپنی دکان سے باہر کھڑا ہو کر پوری دنیا کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتا۔ گلی کے لڑکے بالے اسے چھیڑتے تھے۔ وہ اس کی دکان کے دروازے پر دستک دیتے اور اس کے باہر آنے سے پہلے بھاگ جاتے۔ اسے چاچا چورنجی لال کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جس سے لگتا تھا کہ وہ ہندو تھا لیکن اصل میں وہ مسلمان تھا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اس کا نام لال دین تھا جبکہ بعض افراد سمجھتے تھے کہ نام اصل میں لال محمد تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کی شادی تاخیر سے ہوئی تھی۔ پہلے بچے کی پیدائش کے وقت اس کی بیوی چل بسی اور اس نے خود اپنے اکلوتے بیٹے کو پالا پوسا۔ تقسیم ہند کے دوران ہونے والے تشدد میں اس کے بچے کو اس کی آنکھوں کے سامنے ہلاک کر دیا گیا۔ اس صدمے نے تمام عمر اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اسے ذہنی طور پر بھی شدید متاثر کیا۔ 1953 میں جب احمدی کمیونٹی کے خلاف فرقہ وارانہ ہنگامے پھوٹ پڑے تو لاہور میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ ہر شام کو فوجی جوان ٹرکوں پر ٹیمپل روڈ کا بھی گشت کرتے۔ یہ گاڑیاں سست رفتار سے چلتی تھیں۔ فوجیوں کی بندوقیں شرپسندوں سے نمٹنے کے لیے چوکس ہوتی تھیں۔ یہ ایک دہشتناک منظر تھا، البتہ وہ بوڑھا چاچا چورنجی لال اس خطرے سے بے نیاز معمول کے مطابق باہر کھڑے ہو کر دشنام طرازی کرتا رہتا۔ اس بات سے فوجی بہت غصے میں آ گئے اور اس بوڑھے کو سبق سکھانے کے درپے ہوئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ بوڑھا شاید انہیں مطعون کرتا ہے۔ البتہ علاقے کے عمائدین نے فوجیوں کو بوڑھے کے دکھ اور صدمے سے آگاہ کر دیا جس

کے بعد انہوں نے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ بعد ازاں وہ مر گیا۔ 1947 میں لاکھوں پنجابیوں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا شاید جو زندہ بچ گئے انہیں زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی۔ مجھے یقین نہیں کہ اس صدمے کا پورا اندازہ کیسے کیا جائے۔

افسانوی تحریریں:

پنجاب کی تقسیم پر افسانوی ادب جو اکثر حقیقت اور تصور کا مجموعہ ہے اس حوالے سے کافی روشنی ڈالتا ہے۔ یہ دوسرا نکتہ ہے جس نے مجھے پنجاب کی تقسیم میں دلچسپی لینے کی طرف مائل کیا۔ معروف ادیبوں کی مثلث کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور رجندر سنگھ بیدی کے افسانے اور ناول کافی شہرت کے حامل ہیں۔ منٹو کا افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ شاید تقسیم پنجاب کی بہترین فرد جرم ہے۔ اس موضوع پر تحقیق کے دوران کئی دیگر ادیبوں نے بھی شاہکار تخلیق کیے ہیں۔ تقسیم کے 64 برس بعد (جب کتاب لکھی گئی) آج بھی اس موضوع پر معیاری افسانوی ادب کی تخلیق جاری ہے۔

جہاں تک میری ذاتی رائے ہے تو شعرا نے پنجاب کی تقسیم پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی کہ دینی چاہیے تھی۔ بسا اوقات مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آخر کیوں؟ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری اتنی آزادی کے ساتھ واقعے کی منظر کشی نہیں کر سکتی۔ البتہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنی رائے میں غلط ہوں۔ اس ضمن میں کم از کم ایک مشہور نظم ضرور موجود ہے جس میں پنجاب کے عظیم صوفی شاعر وارث شاہ (1798-1722) کو مخاطب کیا گیا ہے۔ جن کی شہرہ آفاق تصنیف 'ہیر' کو پنجاب کی لوک 'رومیو جولیٹ' داستان سمجھا جاتا ہے۔ یہاں میں امرتا پریتم کی نظم 'وارث شاہ' کی چند سطریں لکھنا پسند کروں گا:

اج آکھاں وارث شاہ نوں
کیتوں قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا
کوئی اگلا ورقہ پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی
توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں
تینوں وارث شاہ نوں کہن
اٹھ دردمنداں دیا دردیا
اٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں
تے لہو دی بھری چناب
کسے نے پنجاں پانیاں وچ
دتا زہر رلا

تے اونہاں پانیاں دھارتوں
دتاپانی لا

کوئی بھی بات تقسیم پنجاب کے المیے کا اس طرح مختصراً احاطہ نہیں کر سکتی جتنی یہ حقیقت کرتی ہے کہ اس تقسیم سے لاوارث عورتوں کا ایک انبوہ کثیر بھی وجود میں آگیا۔ ایسی خواتین سے ان کے خاندانوں اور معاشرے کے سلوک کا بالعموم رویہ مختلف تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے لیے مغوی خواتین کو واپس قبول کرنے میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان کے برادری نظام کے مطابق مسلمانوں کے پاس رہنے والی خواتین ناپاک ہو چکی ہیں۔ مسلمان خواتین سے البتہ سلوک نسبتاً بہتر رہا کیونکہ وہاں مذہبی طور پر انہیں مسترد کرنے کا کوئی جواز موجود تھا نہ ایسا مخصوص سماجی اور ثقافتی تعصب پایا جاتا تھا۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر کیس میں دشمن کی خواتین کو محض جنگ کا بدلہ لینے کے لیے یا مال غنیمت کے طور پر اغوا کیا یا خرید اگیا بلکہ بعض واقعات میں محبت اور چاہت کے جذبات بھی فروغ پاتے نظر آئے۔ آزادی کے بعد بھارت اور پاکستان کی حکومتوں نے مغوی خواتین کی بازیابی اور انہیں ان کے اصل خاندانوں تک پہنچانے پر اتفاق کیا۔ دونوں ملکوں کی بیوروکریسی کو یہ ٹاسک سونپا گیا کہ مخالف مذہب میں شادیوں کے معاملات کا بھی پتہ چلایا جائے۔ اس صورتحال کو پیش کرنے کے لیے بوٹا سنگھ سے بڑھ کر کوئی اور واقعہ نہیں۔ بوٹا سنگھ 40 سال کی عمر تک کنوارا رہا پھر اس نے اپنے سے بہت چھوٹی مسلمان لڑکی زینب سے شادی کر لی۔ اس لڑکی کو اس نے اغوا کنندگان سے خریدا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی بن کر رہنے لگے۔ اس دوران زینب نے دو بچیوں کو جنم دیا۔ پھر ایک دن زینب کو سرکاری حکام نے بازیاب کرا کے اپنے اصل خاندان کی طرف بھجوا دیا جو اب مغربی پنجاب کے شہر لائل پور کے قریب ایک گاؤں میں رہ رہا تھا۔ ایک نرم دل مسلمان نے بوٹا سنگھ کو زینب کے بارے میں مطلع کر دیا جو اپنے ساتھ ایک شیر خوار بچی بھی لے گئی تھی۔ البتہ بڑی بیٹی بوٹا سنگھ کے ہی پاس تھی۔ بوٹا سنگھ نے اسلام قبول کر لیا اور جمیل احمد بن گیا، پھر بڑی بچی کو لیکر پاکستان آ گیا۔

پاکستان کی پولیس قانون کے مطابق اپنی تفصیلات تھانے میں رپورٹ نہ کرنے پر اسے ہراساں کرنے لگی۔ جمیل احمد نے کسی طرح مجسٹریٹ کو تو قائل کر لیا کہ وہ زینب کو عدالت میں پیش ہونے کا حکم دے جس نے اس دوران کسی اور جگہ شادی کر لی تھی۔ لیکن زینب نے عدالت کے اندر بوٹا سنگھ کو مسترد کر دیا۔ کیا اس نے از خود یہ فیصلہ کیا یا کسی نے اسے مجبور کیا؟ ٹوٹے دل کے ساتھ بوٹا سنگھ نے ٹرین کے سامنے کود کر خودکشی کر لی۔ اس واقعے نے مسلمانوں کے جذبات کو کافی ابھارا کیونکہ وہ بوٹا سنگھ کی موت کو اپنی کمیونٹی کی اجتماعی غلطی سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس کا ازالہ جمیل احمد کو پورے اسلامی اعزاز کے ساتھ دفنا کر کیا اور نماز جنازہ میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ یہ تھا پنجابی مسلمانوں کا کلچر۔ انہیں بڑی آسانی سے مشتعل یا جذباتی کیا جا سکتا تھا لیکن وہ غلطی تسلیم کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے اور رحمدل بھی تھے۔ یہ کلچر پنجابی مسلم شناخت کو 'خلیجی پیٹروڈالروں' کی آمد سے 'عربی رنگ' دینے سے تباہی کی سمت جا سکتا ہے۔ خلیجی ریاستوں اور خود ریاست پاکستان کی طرف سے اسلام پسندی کے فروغ کے اقدامات کو سپانسر کرنے سے معاشرے پر تشدد کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ایسی اسلام پسندی طویل عرصے سے معاشرے پر جبر مسلط کیے ہوئے ہے۔

تقسیم پنجاب کی ریسرچ

پنجاب کی تقسیم کے موضوع پر پوچھ گچھ کرنے کا مجھے پہلی بار موقع برطانیہ کی کوینٹری یونیورسٹی میں گورو گوبند سنگھ کی 300 سالہ تقریبات کے حوالے سے آئن ٹالبوٹ اور شنڈر تھندی کی دعوت پر ایک کانفرنس میں شرکت کے موقع پر ملا۔ کانفرنس میں تقسیم پنجاب کے موضوع پر بھی روشنی ڈالنا تھی۔ میں نے پیشکش کی کہ میں ان دنوں لاہور میں ہونے والے واقعات بیان کروں تاہم اس بارے میں مزید کوئی پیشرفت نہ ہو سکی۔

قدرتی طور پر ماہر سیاسیات کی حیثیت سے میں 1947 کے وقت پنجابیوں کی نقل مکانی، نسل کشی اور قتل عام سے متعلق اپنی معلومات کا دائرہ کار بڑھانے کا خواہاں تھا۔ ایک لحاظ سے یہودیوں کا ہالو کاسٹ، سابق یوگوسلاویہ میں نسل کشی، روانڈا اور دارفر میں قتل عام اور پنجاب کی تقسیم ایک ہی طرح کی جارحیت اور غیر منطقی سوچ کا شاخسانہ ہیں جس نے قرون وسطیٰ اور ہمارے موجودہ دور میں تہذیبوں کو داغدار کر دیا۔ اس کتاب میں، میں نے صورتحال پر روشنی ڈالنے کے لیے مخفی شواہد سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ البتہ زیادہ تر توجہ میں نے پنجاب کی مخصوص صورتحال کی وجوہات جانچنے اور اس کی نظریاتی انداز میں وضاحت کرنے پر دی ہے۔ اس قسم کا طریقہ کار نظریے کی جانچ پڑتال کی اساس فراہم کرتا ہے۔ بالالفاظ دیگر پنجاب اور اس جیسے موضوعات کا مطالعہ کرنے والے دانشوروں کے لیے پنجاب کا مقدمہ نظریاتی پہلوؤں سے دیکھنا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

میں اس لحاظ سے خود کو ممتاز سمجھتا ہوں کہ مجھے کئی پنجابیوں سے ملنے اور ان کے تاثرات ریکارڈ کرنے کا موقع ملا۔ اس مشق کے نتیجے میں بڑی مقدار میں Ethnographic مواد جمع ہوا، جو اب میں قارئین سے شیئر کر رہا ہوں۔ ہمیں پنجابی جذبات، ان کی طاقت اور کمزوریوں کی جھلکیاں ملیں: فطری بات ہے کہ اس طرح ہمیں ان روایات اور رسومات۔۔۔ کچھ اچھی اور کچھ بری۔۔۔ کے بارے میں بھی آگاہی ملی جنہوں نے 1940 کی دہائی میں لوگوں میں نفوذ کیا، ان کی ہمدردیاں، جذبات اور تعصبات کو ڈھالا۔ اس کے بدلے میں اس نے قطعی غیر متوقع صورتحال کے بارے میں ان کے ردعمل پر اثر ڈالا جس کا نتیجہ 1947 میں سامنے آیا۔ اس تحقیق میں جو بات زور دے کر ظاہر کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی مخصوص گروہ یا مذہبی کمیونٹی پوری طرح نیک یا مکمل بری نہیں تھی۔

سپیلنگ (Spelling)

پنجابی زبان کے نام، عرفیت یا مقام کے انگریزی میں کوئی معیاری سپیلنگ موجود نہیں۔ چنانچہ جو سپیلنگ مجھے لوگوں نے بتائے وہ میں نے قبول کر لیے۔

انتظامیہ میں مقامی لوگوں کی شمولیت

کتاب میں انتظامی عہدوں پر مقامی افراد کی تعیناتی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس کا آغاز 1940 کے عشرے میں ہوا تھا۔ مجھے مکمل درست تفصیل تو نہیں مل سکی کیونکہ سرکاری ریکارڈ اور رپورٹوں میں زیادہ مواد دستیاب نہیں ہے۔ انتقال اقتدار کے دوران افسروں کی نامزدگی کا کوئی معیاری طریقہ نہیں تھا۔ اپنی ریسرچ کے اختتام کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اس دور میں ہر ضلع میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر تعیناتی ہونے والے نام حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میری سرتوڑ کوشش کے باوجود میں

مکمل اور قابل اعتبار فہرست حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ البتہ میں نے تقسیم سے قبل کے دور کے کچھ متعلقہ نام اور فہرست حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ ان افسروں میں ہندو، سکھ اور مسلمان شامل تھے۔ اس فہرست کی روشنی میں، میں نے جمع ہونے والی معلومات کی درستگی کی۔ جو لسٹ میں نے مرتب کی وہ مکمل ہونے اور غلطیوں کے باوجود اہم ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لسٹ 1947 میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی پیشگی تیاریوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ پرانے (متحدہ) پنجاب کی 5 ڈویژنیں تھیں اور انکے 29 اضلاع تھے۔ جولائی (1947) سے ڈپٹی کمشنروں کو مذہبی تعلق کی بنا پر دوسری طرف تبدیل کیا جانا شروع کر دیا گیا تھا۔ آگے دی گئی فہرست میں یکم جنوری سے 30 جون 1947 کے دور کی تفصیل دی گئی ہے۔ کچھ اضافی تفصیل بھی دستیاب ہوئی ہے جو نیچے واضح کر دی گئی ہے۔

راولپنڈی ڈویژن	
اٹک (کیمپبل پور)	سروپ کرشن (مکمل تفصیل اس طرح سے ہے: سروپ کرشن 22 مارچ تک، اتچ جے ڈی ٹیلر 31 جولائی تک، کے ایس شیخ 11 اگست 1947، محمد راشد 14 نومبر 1948 تک)
راولپنڈی	سی ڈبل کوٹس، ایس اے حق نے 14 اگست کو چارج لیا
جہلم	ایس پی بلونت سنگھ نلوہ
گجرات	وزیر چند
میانوالی	خان غلام حسن خان لغاری
شاہ پور	کیول سنگھ چودھری
ملتان ڈویژن	
منٹگمری (اب ساہیوال)	سعید زمان خان
لائل پور (اب فیصل آباد)	آغا عبدالحمید (مکمل تفصیل یوں ہے: اے کے ملک 26 اپریل 1947، نوکل سین 26 اپریل سے 3 اگست، آغا عبدالحمید 6 اگست سے 24 نومبر 1947 تک)
ملتان	اے جے پی آر تھر۔ اے جی رضا نے 8 اگست کو چارج لیا
جھنگ	ایس پی نریندر سنگھ، ظفر الحق خان نے وسط اگست میں چارج سنبھالا
مظفر گڑھ	سلطان لال حسین
ڈیرہ غازی خان	15 مارچ 1947 تک، جے اے بکس ڈیوڈسن 16 مارچ سے 22 مئی، جے اے بھٹر 25 مئی سے 23 اکتوبر، جے اے بکس ڈیوڈسن 24 اکتوبر تا 10 فروری 1948
لاہور ڈویژن	
گوجرانوالہ	سندر داس میدھا، یکم جولائی کو ان کا تبادلہ کر دیا گیا
لاہور	جے مائیفرن 23 جنوری تک رہے، جے سی ڈبلیو ایو سٹاس نے 23 جنوری کو جبکہ ظفر الاحسن نے 14 اگست کو چارج سنبھالا۔
شیخوپورہ	دیوان سکھ آنند، ایم سی ڈیزنی اگست میں تعینات تھے۔

سیالکوٹ	نوکل سین
امرتسر	جے ڈی فریسر 22 مئی تک رہے۔ جی ایم برینڈر 24 مئی سے 22 اگست تک ڈپٹی کمشنر تعینات رہے جبکہ 23 اگست سے نوکل سین کو ڈی سی لگا دیا گیا۔
گورداسپور	14 اگست کو حکومت پاکستان نے مشتاق احمد چیمہ کو ڈی سی تعینات کر دیا۔ ان کی تعیناتی 17 اگست کو اس وقت ختم ہو گئی جب ریڈ کلف نے گورداسپور کو بھارت میں شامل کر دیا۔ ان کی جگہ 18 اگست کو کنہیا لال پی سی ایس نے لی۔ بعد ازاں 10 اکتوبر کو سروپ کرشن ڈپٹی کرشن بنے جو 17 دسمبر تک تعینات رہے۔
جالندھر ڈویژن	
فیروزپور	آر بی وشنو بھگوان
جالندھر	احسان الدین: یکم جولائی 1947 کو سندر داس میدھا نے چارج لے لیا۔
لدھیانہ	سردار عبدالصمد خان پی سی ایس 23 جولائی 1946 سے 3 اگست 1947، آر این لتھر پی سی ایس نے 4 اگست کو چارج سنبھالا اور 23 ستمبر تک فائز رہے۔ 24 ستمبر 1947 کو این سہگل نے ان کی جگہ لی اور 18 جولائی تک تعینات رہے۔
ہوشیارپور	آر ایس ہربنس لال کھنہ 13 اکتوبر 1944 سے 12 فروری 1948
کانگڑہ	ظفر الاحسن مئی 1946 تا 1947، ان کے بعد کپور سنگھ 3 اگست 1947 سے 8 فروری 1948 تک تعینات رہے۔
انبالہ ڈویژن	
انبالہ	گرے وال
حصار	ایس اے حق
روہتک	علاؤ الدین
کرنال	آر لٹل پی وی بھگوان 16 اکتوبر 1945 تا 8 جنوری 1947۔ ان کی جگہ روشن لال نے لی جو 8 اگست 1947 سے 21 جون 1948 تک تعینات رہے۔
شملہ	شیخ فضل الٰہی

ان ڈپٹی کمشنروں میں سے بیشتر آئی سی ایس افسر تھے۔ ضلع کا سب سے بڑا پولیس افسر سپرنٹنڈنٹ (ایس پی) تھا۔ ان میں سے بیشتر ہندوستانی تھے۔ 1940 کے عشرے میں بعض اعلیٰ عہدوں پر پنجابی عیسائی افسر بھی تعینات رہے۔ جب اقتدار بھارت یا پاکستان کو منتقل ہو گیا تو ان افسروں کو کہاں بھیجا گیا اس کے بارے میں صورتحال زیادہ واضح نہیں۔ تقسیم کے بعد پنجاب کے دونوں حصوں میں ہونے والے واقعات پر تحقیق کے بہت زیادہ امکانات موجود ہیں۔ مجھے امید ہے کہ پنجاب کی داستان مزید بیان ہوتی رہے گی کیونکہ وقت 1947 کے بعد تھم نہیں گیا۔

اشتیاق احمد

سولینتونہ (گریٹر سٹاک ہوم)

24 فروری 2011

اظہار تشکر

فرانسیسی نژاد الجزائری ادیب البرٹ کیموس جنہیں 1957 میں ادب کا نوبل انعام ملا تھا نے انتہائی مختصر الفاظ میں کہا ہے کہ "فکشن ایک ایسا جھوٹ ہے جس کے توسط سے ہم سچائی سامنے لاتے ہیں۔" بلاشبہ پنجاب کی تقسیم ایک ایسے تلخ حقیقت ہے کہ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، خشونت سنگھ، بلونت سنگھ، اشفاق احمد، رامانند ساگر، احمد ندیم قاسمی، امرتا پریتم، فیض احمد فیض، اشفاق احمد اور دیگر کئی شعراً اور ادیبوں نے اپنے تخیل اور حقائق کے خوبصورت مرقع سے متاثر کن اردو / ہندی / پنجابی ادب تخلیق کیا۔ تقسیم کے موضوع پر اکیڈیمک ریسرچ طویل عرصے تک ہچکچاہٹ کا شکار بلکہ یرغمال رہی کیونکہ پنجاب کی تقسیم کا سچ ریاست کے ایسے ریکارڈ کی بنیاد پر نہیں بولا جاسکتا تھا جن پر عام طور پر مؤرخین انحصار کرتے آئے ہیں۔ 15 اگست کو اقتدار کی منتقلی کے بعد بھارتی اور پاکستانی پنجاب کی انتظامیہ نے چپ سادھ لی۔ The Punjab Bloodied, Partitioned and Cleansed: Unravelling the 1947 Tragedy through Secret British Reportsand First-Person Accounts کے عنوان سے میری اس کتاب کا جس کا اردو میں نام 'پنجاب کا بٹوارہ—1947: ایک المیہ ہزار داستانیں' رکھا گیا ہے میں دراصل البرٹ کیموس کی بات کا اُلٹ نظر آتا ہے یعنی یہ کتاب پنجاب کی تقسیم سے متعلق بولے جانے والے جھوٹ کو بے نقاب کرتے ہوئے سچ بولتی ہے۔

اس موقع پر میں اپنے سٹاک ہوم (سویڈن) کے دیرینہ دوست خواجہ ہمایوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے لاہور کے نوجوان صحافی اور ترجمہ نگار وسیم بٹ سے متعارف کرایا ہے۔ بٹ صاحب اب تک درجن بھر بین الاقوامی کتب کا اردو زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ یوں اس کتاب کی انگریزی سمجھنے والی اشرافیہ کے محدود طبقے سے اردو پڑھنے والی وسیع کلاس تک منتقلی کا تاریخی عمل شروع ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وسیم بھائی نے زخم خوردہ پنجاب کی داستان کو ان تمام طبقوں تک قابل رسائی بنانے کیلئے نہایت مشقت کی جو یہ سچ جاننا چاہتے ہیں کہ 1947 کو کیا واقعات رونما ہوئے تھے۔ اب یہ ایسا کرنا مزید ممکن نہیں ہوگا کہ یہ تلخ اور مشکل حقائق چھپائے جائیں کہ 1947 کے وسط میں پنجاب 'کیسے' اور 'کیوں' دو حصوں میں تقسیم ہوا اور پھر اس کے بعد دونوں حصوں میں خون کے دریا بہے اور پھر مغربی پنجاب میں تقریباً کوئی ہندو یا سکھ اور مشرقی پنجاب میں کوئی مسلمان باقی نہ رہا۔

یہ کتاب لکھنے میں میرے لیے سب سے خوشی کی بات یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں میں نقادوں اور ماہرین نے اسے زبردست انداز میں سراہا، کچھ صاحبان نے ریسرچ کی مقصدیت پر زور دیا جبکہ بعض دیگر نے یہ نشاندہی کی کہ کتاب میں دیے گئے سچے وقعات منٹو کی کہاوتی حقیقت پسندی اور کرشن چندر کی ماضی کی آئیڈلزم دونوں کی تردید کرتی ہے۔ دراصل حقیقت پسندی فکشن کے مقابلے میں ہمیشہ اجنبی ہوتی ہے اور اس کا برملا اظہار ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں سے جمع کی گئی داستانوں سے بار بار ہوتا ہے۔

تاہم میرے لیے سب سے خوشگوار سرپرائز پاکستان سے آیا۔ جہاں میری کتاب کو 2012 کی بہترین نان فکشن کتاب کے دو قومی انعامات سے نوازا گیا ہے۔ مثال کے طور پر 17 فروری 2013 کو عظیم الشان

کراچی لٹریچر فیسٹیول کے اختتامی روز جیوری نے بہترین نان فکشن کتاب برائے 2012 کا اعلان کرتے ہوئے یہ کلمات کہے:

"ہم ارکان جیوری نے متفقہ طور پر اشتیاق احمد کی کتاب The Punjab Bloodied, Partitioned and Cleansed کو کوکا کولا بیسٹ نان فکشن بک 2012 کے انعام کیلئے منتخب کیا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو اپنی اصلیت اور گہرائی کے لحاظ سے ہمیں امسال موصول ہونے والی تمام دیگر کتابوں سے زیادہ شاندار محسوس ہوئی۔ اس کتاب میں 1947 کی تقسیم سے متعلق واقعات کا بامقصد انداز میں دانشورانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی بھی اس کتاب کا قابل مطالعہ ہونا بھی اس کے انتخاب کی وجہ بنا۔"

اس خوشخبری کی سب سے پہلے مجھے اطلاع آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی کی مینجنگ ایڈیٹر مس شہلا نقوی نے 20 فروری کو اس وقت بذریعہ ای میل دی جب میں پنجاب کے موضوع پر اپنی کتاب پر لیکچر دینے کیلئے بھارت کے 7 روزہ دورے میں ممبئی میں قیام پذیر تھا۔ اس سے پہلے بھی تھوڑے استثنٰی کے ساتھ پاکستان اور بھارت دونوں طرف سے اسی پیرائے میں میری تحقیق کی پذیرائی کی گئی۔ اس امر کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان 1947 میں سرحد خون سے کھینچی گئی اور دونوں طرف قوم پرستی کا تلخ ورثہ حصے میں آیا کے باوجود دانشوروں اور ممتاز صحافیوں میں کسی بات پر تقریباً اتفاق غیر معمولی بات ہے۔ عوامی حلقوں میں سے بھی کئی افراد نے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔ لوگ جس بات سے انتہائی متاثر ہوئے وہ یہ حقیقت ہے کہ بربریت اور خونریزی کے روح فرسا واقعات کے ساتھ دونوں طرف تقسیم کے عمل کے دوران انسانیت اور ہمدردی کے جذبات بھی دیکھنے میں آئے۔ میں نے اپنی بارہ سالہ تحقیق میں حقیقی دنیا سے جو واقعات جمع کئے ہیں ان سے ایک لحاظ سے سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر دونوں کی تقسیم کے موضوع پر شاہکار فکشن کی توثیق ہوتی اور ان کا دفاع بھی۔

میرے لیے ایک اور بڑا سرپرائز اس کتاب کو 22 نومبر 2013 کو لاہور میں یو بی ایل-جنگ گروپ ادبی میلے میں بہترین نان فکشن ایوارڈ برائے 2012 ملنا تھا۔ جیوری نے یہ تعریفی کلمات کہے: "تحقیق کا اصلی پن، عظمت اور انتہاپسندی کے خلاف مؤقف قابل تعریف ہے۔"

مہاتما گاندھی کے پوتے پروفیسر راج موہن گاندھی نے مجھے لکھا کہ وہ میرے کام سے نہایت متاثر ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ 1947 میں پنجاب سے متعلق ہولناک واقعات کی بامقصد منظر کشی کے علاوہ یہ کتاب دونوں طرف بے رخی کا شکار پنجابیوں کے درمیان مصالحت کیلئے زبردست مرہم کا کردار ادا کرے گی اور یوں برصغیر میں قیام امن کے کاز کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوگی۔

حقیقت میں ایک خاتون ہربھجن کور / شہناز بیگم کی اپنے گمشدہ بچوں سے ملاقات کا واقعہ اس کتاب کے زخموں کو بھرنے اور بچھڑے ہوؤں کو ملانے کی خاصیت کا زندگی سے بڑا اور فکشن سے بڑھ کر اظہار کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ واقعہ امریکی ریاست ڈیلاور کے شہر ہوکیسن میں مقیم پاکستانی انجنیئر نسیم حسن نے میرے علم میں لایا۔ میرا اور ان کا تعلق اس وقت قائم ہوا جب انہوں نے لاہور کے اخبار 'ڈیلی ٹائمز' میں پنجاب کی تقسیم سے متعلق میرے مضامین پڑھے۔ ان کے پاس سنانے کو اپنی بھی ایک داستان تھی۔ نسیم حسن 1947 میں ایک بچہ تھا جب اسے آبائی شہر شملہ سے اپنے خاندان کے ساتھ فرار ہونا اور لاہور میں قیام کرنا پڑا۔ کئی سال کے بعد وہ دوبارہ شملہ گئے۔ اپنے احساسات کو انہوں نے اسی کتاب میں

نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔(اندرونی صفحات میں ملاحظہ فرمائیں)۔ ایک شریف النفس سکھ رومی سنگھ نے کہانی پڑھ کر ان سے رابطہ کیا۔ رومی سنگھ کا کاروبار تو ورجینیا بیچ میں ہے لیکن فیملی بالٹی مور، میری لینڈ میں رہتی ہے۔ رومی سنگھ چاہتا تھا کہ نسیم حسن اس کی سوتیلی ماں کے پاکستان میں لاپتہ پانچ بچے ڈھونڈنے میں مدد کریں۔ چنانچہ نسیم حسن نے مجھ سے مدد مانگی۔ ہر بھجن سنگھ نے مجھے ان الفاظ میں کہانی سنائی:

"میرا نام ہر بھجن کور ہے۔ اب میری عمر 82 سال ہے۔ میرے والد شیر سنگھ امر تسر کے نواحی علاقے راجہ سانسی کے زمیندار تھے۔ 1946 کو میری شادی لاہور میں سردار ہر بیل سنگھ سے ہوئی۔ 1947 کو لاہور سے امر تسر کو نقل مکانی کرتے ہوئے ہمارے ٹرک پر حملہ کر دیا گیا۔ ہجوم نے لڑکیوں کے سوا ہر کسی کو جان سے مار ڈالا۔ بچنے والوں میں، میں بھی شامل تھی۔ کئی ہاتھوں سے گزرنے کے بعد بالآخر ایک مسلمان افضل خان نے مجھ سے شادی کر کے اسلامی نام شہناز بیگم دے دیا۔ افضل خان مجھ سے عمر میں 16 سال بڑا تھا۔ ہم بعد ازاں لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے جہاں ہمارے پانچ بچے ہوئے۔ وہ فیس کریم بنانے کا کاروبار کرتا تھا اور ہم کوئلہ گودام کے علاقے میں رہتے تھے۔ میرے بچوں کے نام خورشید، جمیلہ، زبیدہ، بالا اور رضوان ہیں۔

"1962 میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ویزے کی پابندیاں کچھ نرم کر دی گئیں لہٰذا میں نے راجہ سانسی جانے کا ارادہ بنایا کیونکہ میں طویل عرصے سے اپنے والدین سے ملنے کی متمنی تھی۔ اکبری منڈی لاہور کے افراد بشیر احمد اور ظہور احمد نے ہمیں ویزہ حاصل کرنے میں مدد فراہم کی۔ اصل میں ان کی ساس میرے لئے محسن کا درجہ رکھتی تھیں۔ بہر حال میں افضل خان اور ہمارے پانچ بچے راجہ سانسی چلے گئے۔ سب سے چھوٹا رضوان 1960 میں پیدا ہوا۔ میرے والدین نے مجھے پاکستان واپس نہ جانے دیا بلکہ افضل خان کو بچوں سمیت واپس بھیج دیا۔ یوں میں تقسیم کی ایک نہیں بلکہ دوبار نشانہ بن گئی۔

"1969 میں میری شادی سردار گر بچن سنگھ سے ہوئی جس کی پہلی بیوی انتقال کر چکی تھی اور اسے اپنے پانچ سالہ بیٹے رومی سنگھ کی دیکھ بھال کیلئے کسی کی ضرورت تھی۔ میرا رومی 1989 میں امریکہ منتقل ہو گیا جہاں اس نے اپنا کاروبار قائم کر کے مجھے اور میرے شوہر کو بھی 1997 میں اپنے پاس بلا لیا۔ میرے شوہر کا انتقال 2007 میں ہوا۔ اگرچہ میں نے رومی کو کبھی اپنے ماضی کے بارے میں نہیں بتایا لیکن اسے دیگر ذرائع سے اس کا علم ہو گیا۔ رومی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں پاکستان میں اپنے بچوں سے رابطہ کرنا چاہتی ہوں؟ اب وہ یقیناً جوان ہو چکے ہوں گے اور نہ جانے اس وقت کس حال میں ہوں گے۔ براہ کرم کیا کوئی مجھے پاکستان میں اپنے بچوں سے ملانے میں میری کوئی مدد کر سکتا ہے؟"

نسیم حسن نے میرا رومی سنگھ سے رابطہ کرایا۔ میری درخواست پر اس نے مجھے اپنے والد گر بچن سنگھ بچن کی تفصیلات لکھ کر بھجوائیں جو ایک شاعر اور ماہر تعلیم تھے۔ ان کا تعلق بنیادی طور پر پشاور سے تھا لیکن ان کی فیملی بعد ازاں لائل پور کی ایک نہری کالونی میں آباد ہو گئی۔ وہ پاکستان سے محبت کرتے تھے کیونکہ بابا گورونانک وہیں پیدا ہوئے۔ گر بچن سنگھ صوفی ازم کے بھی بڑے مداح تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام (معروف صوفی شاعر جلال الدین رومی کی یاد میں) رومی سنگھ رکھا۔ صاف ظاہر ہے کہ باپ کی شخصیت نے بیٹے کو نہایت متاثر کیا چنانچہ وہ اب اپنی سوتیلی والدہ کے مسلمان بچوں کی تلاش کرنا چاہتا ہے۔ رومی نے مجھے بتایا کہ اس کہانی کے دو عینی شاہدین ابھی تک زندہ ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر طفیل اوپل (عمر 92 سال) ہے جو تقسیم سے پہلے راجہ سانسی میں رہتا تھا اور ہر بھجن کور / شہناز بیگم کو جانتا تھا۔ اب وہ امریکی ریاست

ڈیلاور میں مقیم ہے۔ (نسیم حسن نے رومی اور طفیل اوپل کا آپس میں تعارف کرایا تھا۔ دونوں فیملیاں بالٹی مور میں رہتی ہیں) 'ڈیلی ٹائمز' میں اپنے ایک آرٹیکل میں میں نے تمام اچھے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ مجھے اس حوالے سے میرے ای میل ایڈریس billumian@gmail.com پر معلومات فراہم کریں۔

30 جنوری کو میں لیکچر ٹور کے سلسلے میں بھارت گیا۔ اس وقت تک کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ بہر حال 15 فروری کو میں نے اپنی ای میل چیک کی تو مجھے 13 فروری کی جمیلہ بیگم (عمر 63 سال، وہ پرینشے پری کے نام سے بھی مشہور ہیں) کی ایک میل پڑھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے لکھا کہ وہ شہناز بیگم (ہر بھجن کور) کی بیٹی ہے۔ اس نے 15 دسمبر 2012 کو 'ڈیلی ٹائمز' میں شائع ہونے والے میرے آرٹیکل کا اردو ترجمہ پڑھا تھا۔ میں نے اس کے بتائے فون نمبر پر اس سے رابطہ کیا۔ اس کی خوشی دیکھ کر میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ اپنی ماں سے بات کرنے کو بے تاب تھی لیکن ابھی ایک مسئلہ اور تھا۔ دنیا گول ہے اور ہزاروں میل دور نسیم حسن امریکی شہر ہوسٹن میں محو خواب تھا جس کی وجہ سے جمیلہ بیگم کو انتظار کرنا پڑا۔ یوں میری زندگی کے طویل ترین انتظار کا آغاز ہوا۔ یہ چند گھنٹے 50 سال سے بھی طویل لگے۔ جمیلہ بیگم سے بات کر کے میرے یہی محسوسات تھے۔

بھارتی وقت کے مطابق دوپہر کو نسیم حسن نے رابطہ کیا۔ ماں اور بیٹی دونوں نے ایک دوسرے بات کی۔ جمیلہ بیگم اور اس کے دیگر بہن بھائی یہ سمجھتے رہے کہ ان کی والدہ طویل عرصہ پہلے مر چکی ہے۔ اس کی بڑی بہن خورشید بیگم (عمر 66 سال) اس وقت اپنے بیٹے کے ساتھ کینیڈا میں رہ رہی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی والدہ سے ملنے امریکہ پرواز کر گئی۔

جس وقت میں بھارت کیلئے روانہ ہوا تو اس کے بعد یہ ہوا کہ نسیم حسن نے طفیل اوپل سے بات کی جو شومئی قسمت تقسیم سے قبل راجہ سانسی میں رہتا تھا۔ وہ نہ صرف ہر بھجن کور کو جانتا تھا بلکہ اس نے 1946 میں اس کی شادی میں شرکت بھی کی تھی۔ پھر ان کی ملاقات بالٹی مور میں ہوئی جہاں دونوں پہلے ہی ایک دوسرے کو جانے بغیر قیام پذیر تھے۔ مسٹر اوپل اور ہر بھجن کور نے اتنے عرصے بعد بھی ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ طفیل اوپل کی بیٹی پھر رومی اور ہر بھجن سے رابطے میں رہی۔ طفیل اوپل کے داماد وسیم شیخ نے بشیر اے طارق کی مدد سے کراچی کے اردو اخبار 'جنگ' میں یہ کہانی شائع کرائی۔ چونکہ اس میں رابطے کیلئے میرا ای میل ایڈریس دیا گیا تھا اس لئے جمیلہ بیگم نے مجھ سے رابطہ کر لیا۔

روزنامہ 'جنگ' میں سٹوری کی اشاعت کے بعد مسٹر اوپل کے فیملی دوست خالد نے بھی چھان بین شروع کر دی۔ برسوں پرانا نام کوئلہ گودام اگرچہ تبدیل ہو چکا تھا لیکن خالد اب بھی اس جگہ کو جانتا تھا جہاں افضل خان مرحوم فیس کریم سپلائی کیا کرتا تھا۔ اس دکان کے مالک کو یاد آگیا کہ اس کا والد افضل خان کا ذکر کیا کرتا تھا جو برسوں پہلے جہاں فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ وہ ہر بھجن کور کے سب سے چھوٹے بیٹے رضوان کو بھی جانتا تھا جو اپنی والدہ سے بچھڑتے وقت دو سال کا تھا۔ جنگ میں کہانی پڑھ کر دکاندار نے رضوان سے رابطہ کیا جس کو اس کا یقین نہ آیا۔ وہ اسے محض افواہ ہی سمجھتا رہا۔ پھر جدید ٹیکنالوجی نے معجزہ کر دکھایا اور بچوں نے نہ صرف اپنی ماں سے بات کی بلکہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیا۔

اس کے بعد رومی سنگھ نے پاکستان جانے کیلئے اپنے اور اپنی والدہ ہر بھجن کور کیلئے ویزہ حاصل کر لیا۔ پہلے وہ 13 اپریل کو بھارت گئے اور امرتسر میں دربار صاحب پر سلام کیا۔ ایک ہفتے بعد 20 اپریل کو انہوں نے واہگہ سے سرحد پار کی اور پاکستان

میں داخل ہوئے۔ ہر بھجن کی سب سے بڑی بیٹی خورشید جو ان سے کینیڈا سے بالٹی مور جا کر پہلے ہی ملاقات کر چکی تھی، پاکستان میں ان کی منتظر تھی۔ ان سب نے مل کر گورونانک کی جائے پیدائش ننکانہ صاحب کا دورہ کیا۔ آخر کار یہ سب لوگ 22 اپریل کو کراچی گئے جہاں پورے خاندان کا 50 سال بعد دوبارہ ملاپ ہوا۔ اس کے بعد یہ لوگ کراچی سے حیدرآباد منتقل ہو گئے جو نسل پرستی کے پہلو سے زیادہ محفوظ شہر تھا اور جہاں خورشید کا نسبتاً بہتر اور بڑا مکان تھا۔ وہاں ان لوگوں نے سکون کے ساتھ رشتہ داروں کا اجتماع منعقد کیا۔ بعد ازاں رومی اور اس کی سوتیلی والدہ 30 اپریل 2013 کو امریکہ واپس لوٹ گئے۔

بد قسمتی سے مسٹر اوپل ہر بھجن کور اور اس کے بچوں کے درمیان ابتدائی رابطوں کے فوراً بعد چل بسے۔ ان دنوں وہ ہسپتال میں تھے اور اپنی زندگی میں ڈراپ سین نہ دیکھ سکے۔ البتہ انہوں نے، ان کے بچوں اور رومی سنگھ اور نسیم حسن۔۔۔۔۔ ان تمام نے بچھڑے خاندان کے زخموں پر مرہم رکھنے اور انہیں ملانے کے اس عمل میں حصہ لیا جس کا آغاز میری کتاب نے کیا تھا۔ گویا مذہب اور سیاست ایک طرف رہ گئے اور انسانیت حاوی آ گئی۔

ایک اور اہم لیکن نسبتاً کم ڈرامائی کہانی جو آپ کو سنانا ضروری ہے وہ سٹاک ہوم سے تعلق رکھتی ہے۔ جب میں 16 مارچ کو بھارت میں لیکچر ٹور پر جانے کیلئے سٹاک ہوم سے رخصت ہونے والا تھا تو میرے دوست ریاض چیمہ جن کی داستان آگے آپ پڑھیں گے نے درخواست کی میں بھارت میں ان کے والد عبداللہ چیمہ کے دوست کے بیٹے للت موہن جین سے بھی ملاقات ضرور کروں۔ خوش قسمتی سے ان دونوں خاندانوں کے درمیان بھی 60 سال سے زائد عرصے بعد رابطہ ہو رہا تھا۔ میں نے بھارت جا کر مسٹر للت موہن جین کو فون کیا جو ایک ریٹائر سنیئر سول افسر ہیں اور ملازمت سے فراغت کے بعد رضاکارانہ طور پر بھارت بوائز سکاؤٹس اینڈ گرلز گائیڈز آفس نئی دہلی میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے لنچ پر مدعو کیا۔ میں ان سے 13 مئی 2013 کو ان کے دفتر میں ملا۔ یہاں میں ان کا مسحور کن انٹرویو آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

"بنیادی طور پر ہمارا تعلق روہتک سے ہے جو تقسیم سے پہلے متحدہ پنجاب کا حصہ تھا لیکن اب ریاست ہریانہ میں شامل ہے۔ میرے والد پریم سنگھ جین اور عبداللہ چیمہ دونوں لاہور لاء کالج میں کلاس فیلو تھے۔ یہ دونوں 1928 یا 1929 میں کامیابی کے ساتھ مقابلے کا امتحان پاس کرنے کے بعد پنجاب جوڈیشل سروس (پی ایس جوڈیشل) کے پہلے بیچ میں شامل ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ حکومت ججوں کو نامزد کرتی تھی۔ میرے والد اور چیمہ صاحب گہرے دوست تھے اور میرے والد اکثر ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ 1940 کی دہائی کے شروع میں میرے بڑے بھائی کو گردوں کا مرض لاحق ہو گیا۔ میرے والد گڑ گاؤں میں تعیناتی چاہتے تھے تاکہ وہ قریبی شہر دہلی کے کسی ہسپتال میں ان کا علاج کرا سکیں۔ تاہم حکومت نے میرے والد کو شمالی پنجاب کے چھوٹے سے قصبے پنڈ دادنخان میں جبکہ چیمہ صاحب کو گڑ گاؤں میں تعینات کر دیا۔ چیمہ صاحب کو میرے والد کی پریشانی کا علم ہوا تو انہوں نے رضاکارانہ طور پر پیشکش کی کہ وہ پنجاب ہائی کورٹ کو خط لکھ کر پنڈ دادنخان تعیناتی کرا لیتے ہیں جبکہ میرے والد کو گڑ گاؤں بھجوانے کی درخواست کرتے ہیں۔ یوں میرے والد کی تعیناتی گڑ گاؤں ہو گئی اور بھائی کا دہلی میں کامیاب آپریشن ہوا۔ یہ اتنا بڑا احسان تھا جو آج بھی میرے خاندان کو یاد ہے۔

برسوں بعد میں دہلی میں چیمہ صاحب سے ملا۔ میرا خیال ہے یہ 1960 کا سال ہو گا جب میں دہلی یونیورسٹی میں ایم اے انگلش کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میرے والد نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ چیمہ صاحب تمہیں ملنے آ

رہے ہیں۔ میرے والد 1957 میں ریٹائر ہو چکے تھے لہٰذا چیمہ صاحب بھی اس وقت ریٹائر تھے۔ وہ دہلی میں اپنے پرانے ہندو اور سکھ دوستوں کو ملنے کیلئے آتے رہتے تھے۔ وہ میرے ہاسٹل آئے اور مجھے نہایت شفقت کے ساتھ دعائیں دیں۔

اب ایسا ہوتا ہے کہ جنوبی ایشیا کی علاقائی تنظیم سارک کے رکن ممالک باری باری تنظیمی ممالک کے سکاؤٹس-گائیڈ جمبوری کا اہتمام کر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو مدعو کرتے ہیں۔ 2009 میں پاکستان سے جوڈیشل سروس سے تعلق رکھنے والے شریف النفس انسان کی سرکردگی میں ایک وفد بھارت آیا۔ وہ میری طرح ریٹائر تھا اور مجھ جیسی سماجی سرگرمیوں میں خود کو مصروف رکھتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے والد بھی جوڈیشل سروس میں تھے اور ان کی مسٹر عبداللہ چیمہ کے ساتھ دوستی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ اس فیملی کو جانتا تھا اور بتایا کہ ان کا ایک بیٹا راولپنڈی میں رہتا ہے اور وہ اسے میرے بارے میں بتادے گا۔ ایک روز ان کا بیٹے کرنل (ر) اسلم چیمہ نے مجھے فون کیا اور ہم نے طویل گفتگو کی۔ چند ماہ بعد ان کے بڑے بھائی ریاض چیمہ نے سٹاک ہوم سے مجھے فون کیا۔

پنجاب کی تقسیم کی ایک اور المناک داستان ہے جس سے میں ذاتی طور پر آگاہ ہوں۔ مغربی پنجاب کے بترہ خاندان نے نقل مکانی کر کے کرنال میں سکونت اختیار کی جہاں میرے والد تعینات تھے۔ یہ تقسیم کے فوراً بعد کی بات ہے۔ ان کے بچے ہمارے ہم عمر تھے، نہایت خوبصورت اور صحتمند۔ ہم اکٹھے ہی کھیلا کرتے تھے۔ ایک روز ان کی بڑی بہن نے کرنال سے گزرنے والی نہر میں کود کر جان دے دی۔ یہ واقعہ ہم سب کیلئے انتہائی صدمے کا باعث بنا۔ یقیناً وہ مغربی پنجاب میں کسی المناک تجربے کے دکھ کی تاب نہیں لا سکی ہو گی۔ چند روز بعد ہم اور اس کے بھائی کھیل رہے تھے کہ اچانک انہوں نے کہا کہ وہ گھر جانا چاہتے ہیں۔ ابھی اتنا اندھیرا نہیں ہوا تھا، لہٰذا ہم نے کہا کہ اتنا اندھیرا تو نہیں۔ آپ ابھی مت جاؤ لیکن وہ چلے گئے۔ اگلے روز ہم نے سنا کہ تمام خاندان ماں، باپ اور بچوں نے خودکشی کر لی ہے۔ یقیناً ان کے ساتھ کوئی ایسا خوفناک واقعہ پیش آیا ہو گا کہ پہلے ایک خوبصورت لڑکی نے خودکشی کی پھر پورے خاندان نے اپنی زندگیاں گنوانے کا فیصلہ کیا۔ تقسیم نے کئی زندگیاں تباہ کر دیں۔

یوں ایک لحاظ سے تقسیم پنجاب کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہو گی۔ یہ نہ صرف یہاں اگست 1947 کو اختتام پذیر ہونے والے برطانوی راج بلکہ پوری دنیا میں انگریز سلطنت کا خونیں ترین حصہ ہے۔ صرف پنجاب میں 5 لاکھ سے 8 لاکھ افراد مارے گئے جبکہ ایک کروڑ افراد بے گھر ہوئے۔ میں خود کو ایک لحاظ سے ممتاز سمجھتا ہوں اور یہ مجھ پر قرض بھی تھا کہ میں نے تاریخ کے ایسے ملگجے لمحے میں اس دور کو کتابی شکل دی جب ہم میں سے کئی افراد جو اس دور کے عینی شاہد اور متاثرہ تھے وہ اب بھی اس کہانی کی باتیں کرتے ہیں۔

میں اس کتاب کے انگریزی ایڈیشن میں پہلے ہی بیشتر دوستوں اور مہربانوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کر چکا ہوں۔ اس اردو ایڈیشن کے توسط سے میں ان تمام مبصرین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے فراخدلانہ کلمات اور مشاہدات سے اس کتاب کو مقبول بنانے میں کردار ادا کیا۔ ان سب کا نام لینا یہاں ضروری نہیں کیونکہ میں پہلے ہی ان سے ذاتی طور پر رابطہ کر کے ان کا شکریہ ادا کر چکا ہوں۔ لیکن کتاب شائع ہونے کے بعد قارئین کرام کی بڑی تعداد مسلسل مجھ سے ای میل اور فیس بک کے ذریعے رابطہ رکھے ہوئے ہے۔ ان میں سے بعض کے ساتھ میری ملاقات ہوئی جبکہ دیگر کے ساتھ میں روزانہ کی بنیاد

پر رابطہ رکھے ہوئے ہوں۔ ان میں میرے پرانے ہم جماعت اور دوست شامل ہیں جیسے سفیر پاکستان توحید احمد، روٹری کلب کے خالد حیدر، خالد کریم چودھری، خواجہ شاہد، ذاکر محمد سلیم، جسٹس جاوید سر فراز، زاہد ممتاز، ناصر عزیز خان، عباس رشید، عباس شفیع، معین صلاح الدین، سمیع صلاح الدین، عظمت سعید، افضل امیر شاہ، منصور احمد، الطاف لالی، محمد احمد، منصور مرزا، خبیب احمد، محمود مبارک، احمد حیات کلیار، ڈاکٹر سیّد طارق بخاری، ڈاکٹر طارق رحمٰن، ڈاکٹر اکرام الحق، ہز ائمہ بخاری، صدیقہ بیگم اور ماہر علی۔ جبکہ نئے دوستوں میں مجاہد حسین سیّد، مشتاق صوفی، ڈاکٹر صغریٰ صدف، ڈاکٹر فاخرہ اعجاز، ڈاکٹر غزالہ رحمن، پروفیسر فرح ملاحی، طارق جٹالا، احمد رضا، توحید احمد چٹھہ، ضیغم سر فراز، افضل ساحر، اجمل کمال، ممتاز احمد سیّد، دانش جنید، پروفیسر ڈاکٹر ہربنس مکھیا، پروفیسر ڈاکٹر بھگوان جوش، پروفیسر ڈاکٹر پرمیندر سنگھ، ڈاکٹر امیت رنجن، نائن اندر سنگھ ڈھلوں، کنور شاہ رخ، رضا حبیب راجہ، شاہد محمود ندیم، مدیحہ گوہر، آغا غضنفر، ڈاکٹر کوثر ملک، عمر ملک، شمعون ذکریا، خالد احمد، عبدالرحیم بلوچ، چودھری مسعود اختر، ساجد شاہ، شبیر ڈار، شبیر شاہ، پروفیسر شبیر شاہ (مرحوم)، وسیم شاہ، حماد نجیب، واثق علی شاہ، ذوالفقار مرزا، گرپریت سنگھ، خواجہ شاہد، نصر فریدوں، سجیت بھٹ، اجے دیش پانڈے اور اجے بھردواج کا نام نمایاں ہے۔

پاکستان کی سب سے شاندار یونیورسٹی لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (لمز) کے ڈین ہومنٹیز اینڈ سوشل سائنسز ڈاکٹر انجم الطاف نے مجھے نہایت مہربانی کے ساتھ بطور وزٹنگ پروفیسر اپنی یونیورسٹی میں پڑھانے کی دعوت دی۔ میں 14 اگست 2013 سے تادم تحریر یہاں طلبا کو پڑھا رہا ہوں۔ لمز میں میرے سٹوڈنٹس نے پنجاب کی تقسیم کے کورس کو انتہائی اہم قرار دیا اور مجھے امید ہے کہ میں مستقبل میں اس کا اعادہ کروں گا۔ لاہور کو واپسی ایک ایسا تجربہ ہے جس کو ایک دن میں اپنی خود نوشت میں بیان کروں گا۔ اس حوالے سے میرے دوستوں کا اصرار ہے کہ میں اپنی کہانی لکھوں۔ اس تناظر میں کچھ نئے نیٹ ورک بھی متحرک ہوئے جن میں ایڈووکیٹ شمعون ذکریا اور پاکستان کے انتہائی مقبول مصنف خالد احمد بلکہ سفیر پاکستان توحید احمد قابل ذکر ہیں۔ یہ سب لوگ انمول اثاثہ ہیں جنھوں نے میری زندگی کو گہرے معنی عطا کیے۔

یہ بات میرے لیے باعثِ مسّرت ہے کہ اس اُردو ایڈیشن کو پیرا ماؤنٹ بکس شائع کر رہا ہے۔ پیرا ماؤنٹ کے روحِ رواں جناب اقبال صالح محمد سے میری دوستی ساٹھ کی دہائی سے ہے جب ہم دونوں ایف۔ سی۔ کالج، لاہور کے طالبعلم ہوا کرتے تھے۔ عابد علی، جنرل مینجر پبلشنگ اور اُن کی پیرا ماؤنٹ ٹیم نے انتہائی محنت اور دلچسپی سے اس کتاب کو تکمیل تک پہنچایا جو اپنی بہترین شکل میں آج آپ کے سامنے ہے۔

اشتیاق احمد

لاہور، 24 فروری 2014

کیلنڈر

جنوری 1947–دسمبر 1947

جنوری 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	

فروری 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
						1
2	3	4	5	6	7	8
9	10	11	12	13	14	15
16	17	18	19	20	21	22
23	24	25	26	27	28	

مارچ 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
30	31					1
2	3	4	5	6	7	8
9	10	11	12	13	14	15
16	17	18	19	20	21	22
23	24	25	26	27	28	29

اپریل 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
		1	2	3	4	5
6	7	8	9	10	11	12
13	14	15	16	17	18	19
20	21	22	23	24	25	26
27	28	29	30			

مئی 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
				1	2	3
4	5	6	7	8	9	10
11	12	14	14	15	16	17
18	19	20	21	22	23	24
25	26	27	28	29	30	31

جون 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30					

جولائی 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
		1	2	3	4	5
6	7	8	9	10	11	12
13	14	15	16	17	18	19
20	21	22	23	24	25	26
27	28	28	30	31		

اگست 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
31					1	2
3	4	5	6	7	8	9
10	11	12	13	14	15	16
17	18	19	20	21	22	23
24	25	26	27	28	29	30

ستمبر 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30				

اکتوبر 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	

نومبر 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
30						1
2	3	4	5	6	7	8
9	10	11	12	13	14	15
16	17	18	19	20	21	22
23	24	25	26	27	28	29

دسمبر 1947

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30	31			

1947 کے دوران بڑے واقعات

24جنوری:	وزیر اعظم پنجاب خضر حیات ٹوانہ نے مسلم نیشنل گارڈز اور آر ایس ایس پر پابندی لگادی۔ مسلم لیگ نے خضر حیات حکومت کے خلاف راست اقدام شروع کر دیا۔
20فروری:	برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ جون 1948 تک ہندوستان سے تاج برطانیہ کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔
26فروری:	مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی۔ تمام قیدی رہا کر دیے گئے۔
2مارچ:	خضر حیات نے استعفیٰ دے دیا جس سے ایک بڑا سیاسی اور آئینی بحران پیدا ہو گیا۔
3مارچ:	سکھ رہنما ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر کرپان لہرائی اور قیام پاکستان کا خیال مسترد کر دیا۔ اسی دن ایک عوامی اجتماع میں ہندو اور سکھ لیڈروں نے قیام پاکستان کی بھرپور مخالفت کا عہد کیا۔
4مارچ:	لاہور اور امرتسر میں ہندو سکھ مظاہرین اور مسلمان مخالفین کے درمیان پر تشدد جھڑپیں ہوئیں۔
5مارچ:	مظاہرے ملتان اور راولپنڈی تک پھیل گئے۔ جالندھر اور دیگر علاقوں میں بھی کم شدت کے واقعات ہوئے۔
5مارچ:	پنجاب کے گورنر سر ایوان جینکنز نے پنجاب میں گورنر راج نافذ کر دیا۔ جو 15 اگست تک اقتدار کی منتقلی تک برقرار رہا۔
6سے 13مارچ:	راولپنڈی، کیمپبل پور (اٹک) اور جہلم کے سکھوں کی اکثریت والے دیہات پر مسلح مسلمانوں نے حملے کیے۔ ان فسادات میں 2 سے 5 ہزار سکھ اور ہندو مارے گئے۔ ہزاروں سکھوں نے پنجاب کے مشرقی اضلاع اور خود مختار ریاستوں میں پناہ لے لی۔
8مارچ:	دہلی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے پنجاب کی تقسیم کے مطالبے کی منظوری دی گئی۔
24مارچ:	لارڈ لوئیس ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے آخری وائسرائے اور گورنر جنرل کا چارج سنبھال لیا۔
اپریل تا جون:	لاہور اور امرتسر میں چھرا گھونپنے، آگ لگانے اور پٹرول بم چلانے کے واقعات میں تیزی آنے لگی۔ مغربی پنجاب سے ہندو اور سکھ بڑی تعداد میں نقل مکانی کر کے محفوظ مقامات پر چلے گئے۔
15تا 16مئی:	محمد علی جناحؒ اور لیاقت علی خان نے مہاراجہ پٹیالہ اور دیگر سکھ لیڈروں سے ملاقاتیں کیں تاکہ سکھوں کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے پر قائل کیا جا سکے تاہم مذاکرات ناکام رہے۔

3جون:	ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند پلان پیش کیا جس کے تحت وسط اگست 1947 تک اقتدار بھارتی اور پاکستانی حکومتوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔
23جون:	پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں پنجاب کے دونوں حصوں کے ارکان نے تقسیم کے حق میں ووٹ دیا۔
8جولائی:	سر سیرل ریڈکلف باؤنڈری کمیشن کی صدارت کرنے کے لیے ہندوستان پہنچے۔
18جولائی:	برطانوی پارلیمنٹ نے آزادیِ ہند ایکٹ 1947 پاس کر لیا۔
21-31جولائی:	پنجاب باؤنڈری کمیشن نے کانگریس، مسلم لیگ، سکھوں اور کچھ اقلیتی گروہوں کی طرف سے مختلف علاقوں کے دعووں پر غور کیا۔
جولائی اور اس کے بعد:	ہنگامے دیہی علاقوں تک پھیل گئے اور پرانے پنجاب کے حصے بخرے ہونے لگے۔ حکومتی رٹ تیزی سے کم ہونے لگی۔ سکھوں کے جتھے (زیادہ تر گھڑ سوار) مشرقی پنجاب میں دندناتے رہے۔
یکم اگست:	بے سروسامان پنجاب باؤنڈری فورس کے میجر جنرل ریس نے برطانوی دور کے 12 اضلاع میں ہونے والے واقعات مانیٹر کرنے کا چارج سنبھال لیا۔ البتہ اس کا خود مختار ریاستوں پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔
12اگست:	گورنر پنجاب جینکنز نے مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کی بڑی تعداد میں نقل مکانی کی پہلی رپورٹ دی۔
15اگست:	اقتدار مشرقی اور مغربی پنجاب کی حکومتوں کے حوالے کر دیا گیا اور برصغیر میں برطانوی اقتدار کا سورج غروب ہو گیا۔
17اگست:	ریڈکلف ایوارڈ نے پاکستان اور بھارت کے درمیان جو سرحدی لکیر کھینچی وہ منظر عام پر آ گئی۔ اس سے کشیدگی میں تیزی آ گئی کیونکہ لاکھوں مسلمان اور سکھ نئی سرحد کے تحت غلط ملک میں آ گئے تھے۔
یکم ستمبر:	پنجاب باؤنڈری فورس تحلیل کر دی گئی۔ پاکستان اور بھارت کی حکومتوں نے دونوں طرف سے مہاجرین کے قافلوں کے بخیریت منزل پر پہنچنے کے لیے مشترکہ فوجی یونٹ تشکیل دے دیے۔
17اگست سے 31 دسمبر:	منقسم پنجاب کے دونوں طرف نسلی قتل عام ہوا۔
31دسمبر:	ایک کروڑ سے زائد غیر مطلوب پنجابیوں نے سرحد پار کی۔ 5لاکھ سے 8لاکھ کے لگ بھگ افراد قتل کر دیے گئے۔

پنجاب کی حکومتیں (یکم جنوری-31 دسمبر 1947)

حکومت متحدہ پنجاب (یکم جنوری۔14 اگست 1947)

گورنر: سر ایوان جینکنز۔انڈین سول سروس (آئی سی ایس)
چیف سیکرٹری: اختر حسین، آئی سی ایس
آئی جی پولیس: سر جان بینٹ، انڈین پولیس

وزیر اعظم (پریمیئر)

سر خضر حیات ٹوانہ (یکم جنوری تا 2 مارچ 1947)

وزراء

(5 مارچ 1947 کو گورنر راج کے نفاذ کے بعد کابینہ تحلیل کر دی گئی)

چودھری لہری سنگھ	پبلک ورکس
میاں محمد ابراہیم برق	تعلیم
بھیم سین سچر	خزانہ
نواب سر مظفر علی قزلباش	ریونیو
سردار بلدیو سنگھ	ترقیات

حکومت مغربی پنجاب (15 اگست تا 31 دسمبر 1947)

گورنر: سر فرانسس موڈی	آئی سی ایس
چیف سیکرٹری: حافظ عبد المجید	آئی سی ایس
آئی جی پولیس:	خان قربان علی خان انڈین پولیس

وزیر اعظم (پریمئیر)

نواب افتخار حسین، خان ممدوٹ

کابینہ

ممتاز محمد خان دولتانہ خزانہ	
سردار شوکت حیات خان	ریونیو
شیخ کرامت علی	تعلیم
میاں محمد افتخار الدین	مہاجرین و بحالیات
(18 ستمبر۔15 نومبر 1947)	

حکومت مشرقی پنجاب (15 اگست تا 31 دسمبر 1947)

گورنر: سر چندولال مدھولال تری ویدی	آئی سی ایس
چیف سیکرٹری: ملک راج سچدیو	آئی سی ایس
آئی جی پولیس: سنت پرکاش سنگھ	انڈین پولیس

وزیراعظم (پریمیئر)

ڈاکٹر گوپی چند بھرگاوہ

کابینہ

سردار سورن سنگھ	داخلہ، آبپاشی، توانائی
اشہر سنگھ مجھیل	ریونیو و بحالیات
چودھری لہری سنگھ	پی ڈبلیو ڈی، بلڈنگز، پبلک ورکس
پرتھوی سنگھ آزاد	سوشل ویلفیئر

تعارف

پنجاب کی تقسیم ہندوستان کی دو بڑی جماعتوں انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے درمیان برطانوی حکومت کی ثالثی میں ہندوستان کی مجموعی تقسیم پر اتفاق کے تحت عمل میں آئی۔ اس عمل میں پنجاب کے سکھ بھی شریک تھے۔ برطانوی حکومت نے 3 جون 1947 کو تقسیم ہند پلان کا اعلان کیا جس کی ہندوستان کی بڑی سیاسی قوتوں اور پنجاب کے سکھوں کے نمائندے بلدیو سنگھ نے توثیق کر دی۔ وسط اگست میں ہندوستان پر تاج برطانیہ کا راج ختم ہو گیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان بین الاقوامی سرحد کھینچی گئی۔ پہلے پنجاب میں اور چند روز بعد میں بنگال میں حد بندی کی گئی۔

1941 کی مردم شماری کے مطابق پنجاب کی کل آبادی بشمول خود مختار ریاستیں 3 کروڑ 39 لاکھ 22 ہزار 373 تھی۔ مسلمان مطلق اکثریت 53.2 میں تھے۔ ہندوؤں کی آبادی 29.1 فیصد (5.2 فیصد شیڈولڈ کاسٹ اور قبائلی آبادی سمیت) سکھوں کی آبادی 14.9 فیصد جبکہ عیسائیوں کی آبادی 1.4 فیصد تھی۔ برطانوی پنجاب 29 اضلاع اور 2 کروڑ 84 لاکھ 18 ہزار 819 نفوس پر مشتمل تھا۔ ان میں 57.1 فیصد مسلمان، 28.8 فیصد ہندو (6.6 فیصد شیڈولڈ کاسٹ اور اچھوتوں سمیت) سکھ 13.2 فیصد جبکہ عیسائی 1.7 فیصد تھے۔
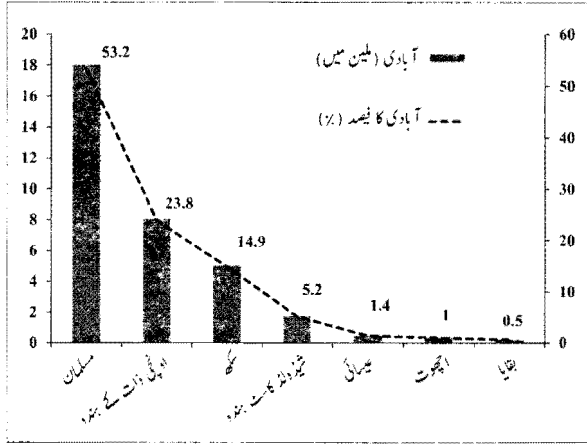
شکل 1: غیر منقسم پنجاب بشمول خود مختار ریاستوں میں آبادی کا رجحان، سال 19421۔
بمطابق مردم شماری انڈیا، پنجاب، 1941

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو پنجاب کی تقسیم بھی ہرگز نہ ہوتی۔ پنجاب کی تقسیم کی بات سکھ رہنماؤں نے مسلم لیگی قیادت کی طرف سے مسلمانوں کے الگ وطن کے قیام کے مطالبے کے رد عمل میں کی تھی۔ مسلمانوں کے الگ وطن میں پنجاب بھی شامل تھا۔ البتہ یہ بات ناگزیر نہیں تھی کہ اگر تینوں بڑے مذاہب اسلام، ہندوازم اور سکھ ازم کی قیادت متفق نہ ہوتی اور اکھٹے رہنے کا فیصلہ کرتی تو پنجاب لازماً تقسیم ہوتا۔

شکل 2: برطانوی پنجاب میں آبادی کا رجحان، سال 1942ء۔
بمطابق مردم شماری انڈیا، پنجاب، 1941
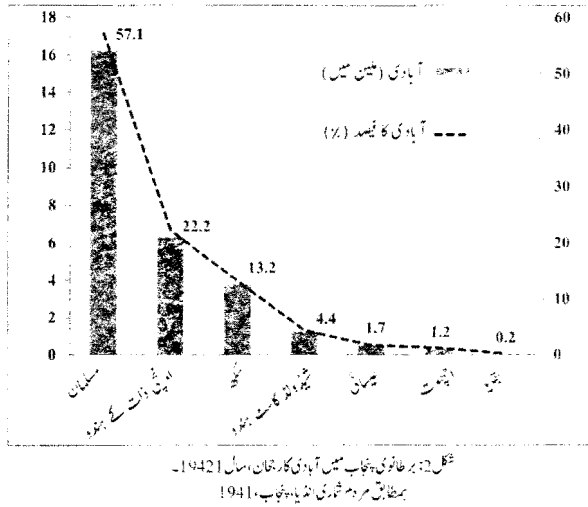
پنجاب کی تقسیم کے فیصلے کا اطلاق برطانوی پنجاب پر کیا گیا۔ یعنی براہ راست برطانوی حکومت کے زیر انتظام صوبہ۔ البتہ تقسیم کے عمل کے دوران جتنی بڑی تعداد میں شورش رونما ہوئی اس کے تناظر میں خود مختار ریاستوں کے لیے بھی الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ تقسیم کے عمل کے نکتہ عروج پر بھارتی پنجاب میں مسلمانوں کا وجود صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ ماسوائے ایک ننھی منی ریاست ملیر کوٹلہ (کل آبادی 88ہزار 109) کے جہاں مسلمان نواب حکمران تھا اور ایک اس سے بھی چھوٹی ریاست لوہارو جس کی آبادی محض 27ہزار 982 تھی۔ اگرچہ لوہارو کا نواب مسلمان تھا لیکن وہاں کی آبادی نے تقسیم کے وقت وہاں سے نقل مکانی کر لی۔ بالکل اسی طرح پاکستانی پنجاب اور ریاست بہاولپور سے ہندوؤں اور سکھوں کا صفایا ہو گیا۔ ریاست بہاولپور کی آبادی 13 لاکھ 41ہزار 209 تھی۔

پنجاب کا ایک اور مسحور کن پہلو یہ تھا کہ انگریز دور سے پہلے کا پنجاب لبرل اور کثیر المذاہب تھا۔ یہاں کے تینوں بڑے مذاہب۔ اسلام، ہندوازم اور سکھ ازم باہم شیر و شکر تھے۔ ان تینوں میں صوفی، بھگتی اور سنت تحریکوں نے گہرے اثرات مرتب کیے جو تصادم کی بجائے ہم آہنگی کی تبلیغ کرتے تھے۔ ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ قبل ازیں شمال مغربی پہاڑی درّوں سے آنے والے بیرونی حملہ آور ہندوستان پر حملوں سے پہلے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کرتے رہے تاہم جب 1849 میں انگریز پنجاب میں پہنچے تو یہاں مقامی افراد یعنی سکھوں کی حکومت تھی حالانکہ نصف صدی قبل پنجاب مغل حکومت کے زیر انتظام صوبہ تھا۔

"اس کے ساتھ ساتھ یہ تینوں مذاہب ایک دوسرے سے ملنے والی تکالیف کی بھی طویل فہرست پیش کر سکتے ہیں اور یوں اس تناظر میں 'تاریخی یادداشت' کسی حد تک سامنے لائی جا سکتی ہے۔ بہر حال جو بات بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ انگریز دور حکومت کے خاتمے سے پہلے پنجابیوں کی اکثریت ہزاروں دیہات، شہروں اور قصبوں میں پر امن انداز میں رہتی تھی۔ ایک مشترکہ پنجابی کلچر کی شناخت کا احساس غالب تھا لیکن یہ اتنا مضبوط ثابت نہ ہو سکا کہ وہ تقسیم کی خواہاں ان قوتوں کے مقابلے میں کھڑا ہو سکے جو بیسویں صدی میں کافی متحرک تھیں۔ پنجاب انتظامیہ نے 1945 اور اس کے بعد مسلسل یہ رپورٹیں پیش کیں کہ

تینوں مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد 'نجی فوجیں' تیار کر رہے ہیں۔ سکھوں کے پاس ہر وقت ایک اسلحہ، کرپان ہوتا ہے جسے وہ اپنا مذہبی حق سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی مسلمان، سکھ اور مشرقی پنجاب کے ہندی بولنے والے علاقوں کے ہندو نو آبادیاتی دور کی فوج میں بڑی تعداد میں شامل تھے۔ جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو ان میں سے تقریباً دس لاکھ فوجی اپنے اپنے دیہات کو واپس چلے گئے۔ اس کے علاوہ پنجاب کے طول و عرض میں غنڈے اور بدمعاش بھی پائے جاتے تھے۔ ان کے سیاستدانوں اور پولیس سے بھی رابطے تھے۔ یہی وہ حالات تھے جن میں 1945 کے دوسرے نصف کے دوران پنجاب میں انتخابی مہم شروع ہوئی جو فروری 1946 کو انتخابات پر منتج ہوئی۔ اس سے ایک کشیدہ صورتحال نے جنم لیا۔ مسلم لیگ جو تقسیم ہند اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کی بنیاد پر الگ وطن کے قیام کی حامی تھی نے پنجاب اسمبلی میں بھاری تعداد میں نشستیں جیت لیں لیکن مطلق اکثریت نہ ہونے کی وجہ سے وہ دیگر جماعتوں سے اتحاد کیے بغیر حکومت نہیں بنا سکتی تھی۔ ایسا نہ ہوا چنانچہ مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں نے سر خضر حیات خان ٹوانہ کی سربراہی میں مخلوط حکومت قائم کر لی جن کی اپنی جماعت یونینسٹ پارٹی انتخابات میں اکثریت نہیں حاصل کر سکی تھی۔ ایسی صورتحال سے عجیب مشکل پیدا ہو گئی۔ یعنی قانونی حیثیت اور جائز حیثیت، مخلوط حکومت بلاشبہ قانون کے تحت قائم کی گئی تھی جس میں پارلیمانی طریقہ کار ملحوظ خاطر رکھا گیا لیکن پنجاب کی مسلم اکثریت کی نظر میں یہ جائز اور نمائندہ حکومت نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ مسلم لیگ کی طرف سے مظاہروں اور تحریک کی شکل میں نکلا اور اس کا خاتمہ خضر حیات حکومت کی 2 مارچ 1947 کو برخواستگی کی صورت میں ہوا۔

حکومت کی رخصتی کے خلاف بطور احتجاج پنجاب کانگریس پارٹی اور سکھ جماعتوں کے کارکن سڑکوں پر نکل آئے اور نعرہ لگایا کہ وہ مسلم لیگ کو حکومت نہیں بنانے دیں گے۔ اس صورتحال سے تشدد میں اضافہ ہوا۔ بالخصوص ضلع راولپنڈی میں مسلمانوں کے مسلح گروہوں نے سکھ اقلیت کو بری طرح نشانہ بنایا۔ مجبوراً یہ لوگ مشرقی اضلاع جہاں سکھوں کی اکثریت تھی کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ بظاہر حکومت نے صورتحال کو 'کنٹرول' کر لیا لیکن پہلے والا امن اور ہم آہنگی دوبارہ کبھی بحال نہ ہو سکا۔ ایک اہم سوال جس کا ہر کوئی جواب چاہتا تھا یہ تھا کہ: کیا پنجاب پورے کا پورا پاکستان کو دے دیا جائے گا، جیسا کہ مسلم لیگ توقع کر رہی تھی یا پھر اسے پاکستان اور بھارت کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا جیسا کہ سکھ لیڈر اور انڈین نیشنل کانگریس کا مطالبہ تھا؟

مئی کے وسط کے بعد سے حملوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ دن گزرنے کے ساتھ یہ حملے بڑھنے لگے اور ان کی شدت میں اضافہ ہوا اور یہ مزید بے رحم اور منظم بھی ہونے لگے۔ یہ سلسلہ اس سال کے اختتام تک جاری رہا۔ سب سے زیادہ شدید دورانیہ اگست کے وسط سے پہلے والے چند ہفتوں کا تھا۔ اس وقت ایک برطانوی گورنر اقتدار میں تھا۔ جب اقتدار بھارت اور پاکستان کو سونپا گیا تو تشدد ڈرامائی انداز میں پھیل گیا اور دو یا تین ماہ تک صورتحال خراب ترین رہی۔ جو کچھ پنجاب میں رونما ہوا اس نے کلکتہ، بہار اور بعض دیگر مقامات پر 1946 کے فسادات کو پیچھے چھوڑ دیا۔ آخر کار دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلی بار آبادی کے اتنی بڑی تعداد میں قتل عام کا سانحہ رونما ہوا۔

یہ بات مد نظر رکھنا ہو گی کہ پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ یہاں کے عوام یا ان کے لیڈروں نے نہیں بلکہ مرکزی سطح پر دہلی میں انگریز حکومت، انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کی قیادت نے کیا۔ صرف پنجاب کے سکھوں سے وائسرائے ہند نے مشاورت کرنا ضروری سمجھا۔ سکھوں کا دعویٰ تھا کہ پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں سے زیادہ ان کی ثقافتی اور مذہبی جڑیں ہیں۔ حقیقت

یہ تھی کہ سکھ پنجاب میں ایک چھوٹی اقلیت جبکہ بھارت کے حوالے سے انتہائی چھوٹی اقلیت تھے۔ ہاں یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ انگریزی فوج میں سکھوں کی بڑی تعداد میں بھرتی نے انہیں اہم کیونٹی بنا دیا تھا۔ بالعموم پنجابی عوام سے تقسیم کے حوالے سے کوئی مشاورت نہیں کی گئی تھی اور ان کی اکثریت نے یہ سوچا تک نہیں تھا کہ انہیں اپنے گھروں اور آبائی مقامات سے بے دخل ہونا پڑے گا۔ اس امر کا اندازہ مجھے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے انٹرویو سے ہوا۔ تقسیم کے عمل کا بدترین پہلو یہ ہے کہ 14 اور 15 اگست کو تقسیم ہند کے دو روز بعد 17 اگست کو دونوں ملکوں کے درمیان سرحد کھینچنے والے ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان کیا گیا۔ اس رپورٹ کے منظر عام پر آنے کا وقت انتہائی نامناسب تھا کیونکہ یک دم لاکھوں افراد سرحد کے غلط طرف آ گئے تھے۔ انگریز حکومت جس نے کسی حد تک امن وامان کنٹرول کرنے کی کوشش کی منظر عام سے ہٹ گئی جس سے عام معصوم لوگ ان عناصر کے حملوں کا شکار بن گئے جنہوں نے مہینوں سے تشدد کی تیاری اور مشق کر رکھی تھی۔ اس کا نتیجہ ایسے قتل عام کی شکل میں نکلا جو مجھ سے سینئر صحافی، مصنف اور نقاد ریجی نلڈ میسی نے انتہائی جذباتی انداز میں بیان کیا۔ جن سے 5 جولائی 2006 کو میں نے ڈویلز میں Llanidloes میں ان کی رہائشگاہ پر ان کا انٹرویو کیا۔ ریجی نلڈ میسی کا تعلق لاہور کے عیسائی خاندان سے ہے۔ ان کا خاندان ان چند خاندانوں میں سے تھا جنہوں نے لاہور سے بھارت جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ ان کے والد نے محسوس کیا کہ محمد علی جناحؒ کے بعد پاکستانی حکمران ملک کو لازماً اسلامی ریاست بنانے کی کوشش کریں گے۔ ایسی ریاست لامحالہ طور پر ایسے اقدامات کرے گی جس سے مذہبی اقلیتوں کو مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میسی کے والد جو رائل انڈین ائیر فورس میں افسر تھے نے نہرو کے سیکولرازم پر زیادہ اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے بھارت ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا تاہم ان کے خاندان کے لیے لاہور چھوڑنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔

ریجی نلڈ میسی

میسی نے ستمبر 1947 کو لاہور سے روانگی کے وقت کی صورتحال کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"ستمبر 1947 میں لاہور کو الوداع کہنا اتنا آسان نہیں تھا۔ میری ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہم ٹرین سے نہیں گئے کیونکہ ٹرینوں کو لوٹا اور جلایا جا رہا تھا بلکہ ہم نے تانگے سے جانے کا فیصلہ کیا۔ تانگے پر ریڈ کراس کا نشان تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہم عیسائی ہیں ہم خود کو نسبتاً محفوظ سمجھ رہے تھے۔ چند ہندوؤں اور سکھوں نے بھی جان بچانے کے لیے ہمارے والا طریقہ استعمال کیا۔ جہاں کچھ لوگ مارنے کے لیے مذہب کا استعمال کر رہے تھے تو بعض دیگر افراد بچانے کے لیے مذہب کی آڑ لے رہے تھے۔ میں نے اس کے نتائج و عواقب اخلاقیات کے فلسفوں پر چھوڑ دیے ہیں۔ شالیمار باغ، جلو، باٹا نگر اور برکی سے گزرنے کے بعد سڑک کے اردگرد کے مناظر دہشتناک تھے۔ ہمیں گھنٹوں پکڑ کر رکھا گیا۔ لاکھوں ہزاروں لوگ بھارت اور اتنے ہی پاکستان کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سڑک کے کنارے لاشوں کے کٹے اعضا دیکھے۔ غم و اندوہ کے ان مناظر کو دانتے کی نظم Infero سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

"واہگہ بارڈر پار کرنے کے بعد اگر سچ بولوں تو مناظر مزید ہولناک تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ کے اکالیوں نے مشرقی پنجاب کے بے چارے مسلمانوں کا بلاامتیاز قتل عام کیا۔ ہزاروں مسلمان لڑکیوں سے زیادتی کی گئی۔ گاندھی کی چیخ و پکار اور تادم مرگ بھوک ہڑتال (مرن بھرت) کا کوئی اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ پنجاب پاگل پن کے باعث تشدد کی علامت بنا ہوا تھا۔

''میں اپنی موت تک انگریزوں کو معاف نہیں کروں گا جنہوں نے انتہائی مضحکہ خیز انداز میں بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا اور میرے وطن کو خون میں نہایا چھوڑ کر چلے گئے۔ پنجابی شاعرہ امرتا سنگھ نے اپنی شاعری میں اس صورتحال کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔''

ان مناظر کی میسی سے انٹرویو سے پہلے اور بعد میں کئی دیگر افراد نے بھی تصدیق کی۔ میں اس موقع پر گجر وال گاؤں نزد لدھیانہ میں جنوری 2005 میں سکھ لیڈروں سے ملاقات کا بھی انتہائی عاجزی کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انہوں نے واقعات کو جس طرح بیان کیا وہ میں آگے جا کر پیش کروں گا۔ یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ ان میں سے کئی سکھوں نے پاکستان والے علاقوں سے نقل مکانی کر کے گجر وال میں سکونت اختیار کی۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمان اقلیت کے ساتھ جرائم دوسری جانب کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔ یہ بات ابھی وجہ تنازع ہے کہ پنجاب کی تقسیم کے دوران کتنے ہندو، مسلمان اور سکھ تباہ و برباد ہوئے۔

مغربی پنجاب سے سکھوں اور ہندوؤں کو مٹانے کا مسلمان منصوبہ

پنجاب کے موضوع پر بھارتی حصے کی طرف سے دو رپورٹیں دستیاب ہیں۔ سردار گربچن سنگھ طالب نے سکھوں کی مذہبی تنظیم شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے لیے اعداد و شمار جمع کیے اور انہیں 453 صفحات میں 'مسلم لیگ کا 1947 میں پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں پر حملہ' Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab 1947 کے عنوان سے ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا (1991، اشاعت اول 1949)۔ اس رپورٹ کا مقصد ان الزامات کی تردید کرنا تھا کہ سکھوں نے مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا صفایا کرنے کے لیے کوئی منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے برعکس شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کی رپورٹ میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ مسلم لیگ چونکہ پورا پنجاب چاہتی تھی چنانچہ اس نے ان تمام علاقوں سے سکھوں اور ہندوؤں کو بید خل کرنے کا منصوبہ بنایا جو پاکستان کے حصے میں آتے تھے۔ رپورٹ میں نہ صرف مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں بلکہ مجموعی طور پر تمام مسلمانوں پر اس منصوبے میں شامل ہونے کا الزام لگایا ہے۔ رپورٹ میں بہت مفصل ڈیٹا موجود ہے لیکن ان واقعات کی تفصیل شامل نہیں جہاں سکھوں نے اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کیا جو بالآخر تقسیم پنجاب کے وقت خونریزی پر منتج ہوئے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ (1991: 243-4):

> سکھوں (اور ہندوؤں) کا انتقام بہت پرتشدد، تیز اور خوفناک حد تک تباہ کن تھا۔ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو اپنے ہم مذہبوں کے مغربی پنجاب اور بھارت کے دیگر حصوں میں گناہوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ یہ بہت بدقسمتی کی بات تھی اور اس کی کوئی منطق بھی موجود نہیں تھی لیکن افسانوں کے معاملے میں ہمیشہ منطق لوگوں کے افعال کا فیصلہ نہیں کرتی اور جب ایک بار عوام کا ذہن غضبناک ہو جاتا ہے تو وہ خوفناک حد تک انتقامی، غیر منطقی اور دیوانگی کا شکار ہو تا ہے۔ یہی کچھ مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کے ہاتھوں سکھوں اور ہندوؤں پر مظالم کے نتیجے میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔

بھارت میں تقسیم کے وقت کے فسادات پر تفصیلات کا دوسرا بڑا مجموعہ پنجاب ہائیکورٹ کے جسٹس جی ڈی کھوسلہ نے تیار کیا۔ Stern Reckoning کتاب 349 صفحات پر مشتمل ہے جو پہلی بار 1949 میں شائع ہوئی اور میں نے اس کا 1989 والا ایڈیشن دیکھا۔ اس میں ہندو مسلم کشیدگی اور کم از کم بیسویں صدی کے آغاز میں پائے جانے والے عدم اعتماد کا سراغ لگایا گیا ہے۔ ان کی تحقیق میں کہا گیا ہے کہ فسادات کا آغاز مسلم لیگ، اس کے رہنماؤں اور عہدیداروں نے یکطرفہ طور پر کیا جو وسط اگست تک جاری رہا۔

مشرقی پنجاب سے تمام مسلمانوں کو مٹانے کا سکھ منصوبہ

مشرقی پنجاب سے تمام مسلمانوں کو نکال باہر کرنے کے سکھوں کے منصوبے کا ایسے کئی افراد نے ذکر کیا ہے جو اس دور میں ان واقعات میں ملوث رہے۔ آنجہانی ہرکشن سنگھ سرجیت جن کا تعلق کیمونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) سے تھا، نے ایک انٹرویو میں مجھے بتایا کہ:

''اقلیتوں پر فرقہ وارانہ حملوں کی یقیناً منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ مجھے مشرقی پنجاب کے لوگوں کا زیادہ پتہ ہے کیونکہ میں وہیں رہتا تھا۔ میں نے یہ تمام دل فگار سرگرمیاں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اسی سازش میں مہاراجہ پٹیالہ ملوث تھا۔ خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کو نکال باہر کرنے کے بعد مشرقی پنجاب میں سکھ اپنی ریاست بنا سکتے ہیں۔''

پنجاب کی تقسیم کے فوراً بعد پاکستان میں شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی اور جسٹس کھوسلہ کے مقابلے میں کوئی رپورٹ شائع نہیں ہوئی البتہ حکومت نے 1948 میں تین مختصر رپورٹیں جاری کیں۔ ان میں Noteson Sikh Plan دوسری The RSS in Punjab اور تیسری رپورٹ The Sikhs in Action تھی۔ یہ رپورٹیں پنجاب میں فسادات کے دوران سی آئی ڈی کے جمع کردہ اعداد و شمار کی بنیاد پر تیار کی گئی تھیں۔ ان میں الزام لگایا گیا کہ سکھوں نے یقیناً مسلمانوں کا مشرقی پنجاب سے صفایا کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا اور یہ کہ کئی بم دھماکوں اور مسلمانوں کے خلاف حملوں میں راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) ملوث تھی۔ رپورٹ 'نوٹس آن سکھ پلان' میں کہا گیا کہ:

> سکھوں کا ہدف پنجاب میں سکھ اقتدار قائم کرنا تھا۔ ان کی یہ تمام تیاریاں صرف اور صرف مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ یہ بات قطعی طور پر کہنا مشکل ہے کہ ہندو جو سکھوں سے بڑی اقلیت تھے نے سکھوں کا اپنی قیمت پر مقصد حاصل کرنے میں ساتھ دیا تھا تاہم وقتی طور پر انہوں نے سکھوں کے ساتھ مشترکہ کاذ ضرور بنالیا تھا۔ یوں ان دونوں کی تیاریاں اور سرگرمیاں متوازی چلتی رہیں۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ بہرحال سازش میں شریک نہیں تھے تو بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے جس نے انہیں سکھوں کے ساتھ تعاون کی طرف راغب کیا جو سازش اور ایک مشترکہ کارروائی کا شاخسانہ تھا (1948: 1-2)۔

چودھری محمد علی جو تقسیم کونسل کی سٹیئرنگ کمیٹی میں پاکستان کی طرف سے رکن تھے اور بعد ازاں پاکستان کے وزیراعظم (1955-56) بھی بنے نے اپنی کتاب 'دی ایمرجنس آف پاکستان' میں لکھا ہے کہ سکھوں کی اعلیٰ ترین

قیادت خصوصاً پٹیالہ اور کپور تھلہ کے مہاراجے مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی بھیانک سازش میں شریک تھے۔

سابق چیف جسٹس آف پاکستان محمد منیر جو پنجاب باؤنڈری میں مسلم لیگ کے نامزد کردہ دو ارکان میں شامل تھے اپنی کتاب 'فرام جناح ٹو ضیاء' میں لکھتے ہیں کہ پنجاب میں بڑے پیمانے پر پہلا فرقہ وارانہ بلوہ مارچ 1947 میں راولپنڈی میں ہوا جہاں مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو نشانہ بنایا (1980:17) تاہم انہوں نے بھی یہی بات کی ہے کہ سکھوں نے پنجاب سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کا باقاعدہ منصوبہ بنا رکھا تھا۔

آئن کپلنڈ نے اپنے تحقیقی مضمون The Master and the Maharajas: The Sikh Princes and the East Punjab Massacre of 1947 (2002:657-704) میں خود مختار ریاستوں سے مسلمانوں کو نابود کرنے کے منصوبے کی تیاری اور اس پر عملدرآمد کی اندرونی تفصیل فراہم کی ہے۔ سکھ جتھوں (مسلح سکھ، زیادہ تر گھڑ سوار) کو شمالی پنجاب میں مارچ 1947 میں مسلمانوں کی طرف سے سکھ برادری پر حملوں کا انتقام لینے کے لیے نظریاتی طور پر تیار کیا گیا تھا۔ کچھ جتھوں کے پاس برین گنیں یہاں تک کہ مشین گنیں بھی تھیں۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ مشرقی پنجاب کی چھوٹی ریاست ملیر کوٹلہ کے مسلمان تباہی سے بچ گئے کیونکہ نواب کے ایک رشتہ دار اور لدھیانہ مسلم لیگ کے عہدیدار نے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ خود کو مسلح کر لیں کیونکہ سکھ ملیر کوٹلہ پر حملہ کر رہے تھے (Ibid: 684)۔ یہ بات سکھوں کی اس قدیم کہانی سے قطعی مختلف نظر آتی ہے کہ 300 سال قبل سکھوں کے دسویں گورو گوبند سنگھ نے نواب آف ملیر کوٹلہ کو گورو کے صاحبزادوں پر تشدد کرنے اور انہیں زندہ چنوانے کی مخالفت کرنے پر دعادی تھی۔ اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ سکھ ملیر کوٹلہ پر حملہ کریں۔ میں نے یہ بات ملیر کوٹلہ کے ارد گرد کے علاقوں میں رہنے والے کئی سکھوں سے انٹرویو کے دوران سنی تھی۔ سکھ ملیر کوٹلہ کی سرحد کے باہر کھڑے ہو کر وہاں جانے والوں کو تو نشانہ بناتے تھے لیکن ریاست کی حدود میں داخل ہونے والوں کو کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔ یعنی صرف مذہبی بنیاد پر قدغن ہی نہیں تھا بلکہ سکھوں کو علم تھا کہ ملیر کوٹلہ والے اچھی طرح مسلح بھی تھے۔

یہ بات بھی دلچسپی کی حامل ہے کہ پنجاب باؤنڈری فورس (پی بی ایف) جو امن عامہ کی صورتحال برقرار رکھنے کے لیے قائم کی گئی کے پاس کافی مقدار میں اسلحہ تھا نہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی مشترکہ نفری مناسب تعداد میں تھی۔ انگریز افسروں کی تعداد بھی تھوڑی تھی۔ اس فورس کا وجود تھوڑے عرصے یعنی یکم اگست سے یکم ستمبر 1947 تک برقرار رہا۔ اگرچہ اس نے 12 اضلاع میں جہاں یہ تعینات تھی میں کچھ افراد کی جانیں بچائی تھیں لیکن خود مختار ریاستوں میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ (Jeffrey,1974: 491-520)۔ اس وجہ سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ بعض خود مختار ریاستوں میں مسلمانوں کا اتنا زیادہ قتل عام کیوں ہوا۔

کتنی ہلاکتیں؟

پنجاب میں طویل عرصے تک سرکاری خدمات انجام دینے والے سنیئر بیوروکریٹ سرپینڈرل مون نے کہا ہے کہ مسلمانوں کی اموات ہندوؤں اور سکھوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ تھیں (1998: 293)۔ جسٹس کھوسلہ جنہوں نے پنجاب کے فسادات

پر زیادہ تر سکھوں اور ہندوؤں کے اعداد و شمار جمع کیے تھے، نے بھی اعتراف کیا کہ فسادات کے شروع میں سکھوں اور ہندوؤں کے جوابی حملوں میں مسلمانوں کی ہلاکتوں کی تعداد زیادہ ہو سکتی ہے۔ انہوں نے ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

> مغربی پنجاب میں مسلمانوں کا جانی نقصان غیر مسلموں سے کم نہیں تھا۔ بلاشبہ کئی لوگ یہ بڑھا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کا مجموعی جانی ضیاع مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کی ہلاکتوں سے کہیں زیادہ تھا۔ ہاں موخر الذکر کا املاک کا نقصان بہت زیادہ تھا۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ مسلمانوں پر حملے انتقامی تھے اور یہ مغربی پنجاب سے غیر مسلمانوں کو نکالنے کی سوچی سمجھی اور منظم منصوبہ بندی کے چند ماہ بعد شروع کیے گئے (Khosla 1989: 289-90)۔

پنجاب ہسٹری کانفرنس کے پینتیسویں سیشن جو مارچ 2003 میں پٹیالہ میں ہوا میں پیش کیے گئے ایک مقالے میں بھائی اردمان سنگھ جھبل نے تصدیق کی کہ مسلمانوں کی ہلاکتیں ہندوؤں اور سکھوں سے زیادہ تھیں۔ ان کے تخمینے کی بنیاد انسائیکلوپیڈیا آف سکھ ازم (Encyclopaedia of Sikhism) میں پیش کیے گئے شواہد تھے۔ جسے پروفیسر ہربنس سنگھ نے مرتب کیا اور اس کی جلد III پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ نے شائع کی (2002: 122-23)۔ پینڈرل مون کا اندازہ ہے کہ متحدہ پنجاب اور بہاولپور ریاست میں ایک لاکھ 80 ہزار سے 2 لاکھ تک افراد مارے گئے (1998: 293)۔ جی ڈی کھوسلہ نے یہ تعداد 5 لاکھ بتائی ہے (1989: 299) جبکہ پاکستانی فوج کے لیفٹیننٹ جنرل (ر) آفتاب احمد خان جو پنجاب باؤنڈری فورس کا بھی حصہ رہے اور پاکستان اور بھارت کی مشترکہ امدادی کارروائیوں میں بھی شمولیت اختیار کی نے 2 فروری 2007 کو لکھا کہ مشرقی پنجاب میں کم از کم 5 لاکھ مسلمان ہلاک ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کی اموات اس سے کہیں کم تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ہلاکتوں کی تعداد میں اضافہ بھی نظر آیا۔ کچھ لوگوں کا دعویٰ تھا کہ یہ تعداد 20 لاکھ سے زیادہ تھی۔ (Talbot 2008: 420)۔ تقسیم کے وقت ہندوستان میں تعینات مختلف انگریزوں نے یہ تعداد 6 لاکھ، 8 لاکھ اور 10 لاکھ بتائی ہے۔ (Roberts 1995: 129-130) سچ جو کچھ بھی ہے تاہم تقسیم ہند کے دوران سب سے بڑی تعداد میں ہلاکتیں پنجاب میں ہی ہوئیں۔

کتنے لوگوں نے سرحد پار کی؟

تقسیم کے وقت کتنے افراد نے سرحد پار کی اس بارے میں پینڈرل مون مختصراً لکھتے ہیں کہ:

> اس حوالے سے قابل اعتماد اعداد و شمار دستیاب نہیں لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ زیادہ جانیں مسلمانوں کی ضائع ہوئیں جبکہ سکھوں اور ہندوؤں کو جائیدادوں کا زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ جہاں تک ہجرت کرنے والے افراد کا تعلق ہے تو اس کی معقول حد تک درست معلومات دستیاب ہیں۔ اگست 1947 سے مارچ 1948 تک ساڑھے 40 لاکھ سکھوں اور

ہندوؤں نے مغربی پاکستان سے بھارت کو نقل مکانی کی جبکہ 60 لاکھ مسلمانوں نے بھارت سے پاکستان کو ہجرت کی۔ زیادہ تر ہجرت تین ماہ کے مختصر دورانیے یعنی وسط اگست سے وسط نومبر میں ہوئی (Moon 1998: 268)۔

شاہد جاوید برکی نے دونوں طرف سے سرحد پار کرنے والے افراد کی تعداد ایک کروڑ 40 لاکھ بتائی ہے تاہم اس میں غیر پنجابی بھی شامل ہیں (Burki 1980: 11)۔ آئن ٹالبوٹ جنہوں نے پنجاب بالخصوص تقسیم پر تحقیق کے لیے اپنی زندگی کا بڑا حصہ وقف کیے رکھا، نے مسلمانوں، سکھوں، ہندوؤں اور پنجابیوں سمیت تمام قومیتوں کی تعداد 18 ملین (ایک کروڑ 80 لاکھ) بتائی ہے۔ جب میں نے ان سے صرف پنجابیوں کی نقل مکانی کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے 19 مارچ 2010 کو ایک ای میل کے ذریعے بتایا کہ یہ تعداد 9 سے 10 ملین تھی۔ مغربی پاکستان کے سیکرٹری بورڈ آف اکنامک انکوائری ایم حسن نے 'مہاجرین کے اعداد و شمار اور متروکہ وقف املاک کے مسائل پر نوٹ' A Note on the Statistics of Refugeesand Evacuees Problem کے عنوان سے 31 اکتوبر 1947 کو لکھا کہ اگر مشرقی پنجاب سے تمام مسلمان نقل مکانی کر جاتے تو یہ تعداد 5.9 ملین ہوتی۔ اسی طرح اگر مغربی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کو مکمل طور پر بھارت جانا پڑا تو یہ تعداد 3.8 ملین ہوئی (Hassan 1993: 16)۔ گویا اس طرح 9.7 ملین پنجابیوں نے مجبوراً دونوں طرف سے اپنا گھر بار چھوڑا۔ ان میں سے کتنے مار ڈالے گئے یہ ایک الگ سوال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام اعداد و شمار کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پنجاب کی تقسیم کے نتیجے میں 9 سے 10 ملین افراد کو زبردستی اپنے گھروں سے محروم ہو کر کہیں اور جانا پڑا۔ محمد وسیم سمجھتے ہیں کہ مشرقی پنجاب سے 50 لاکھ 30 ہزار مسلمان مغربی پنجاب منتقل ہوئے۔ اس تعداد کے ساتھ مشرقی پنجاب میں ان کی آبادی 25.6 فیصد بنتی ہے (Waseem 1999: 211)۔

تقسیم پنجاب کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ بڑی تعداد میں خواتین کو نشانہ بنا کر اغوا کیا گیا۔ دشمن مذہب کی کم از کم 90 ہزار عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ کچھ کو بازیاب کر لیا گیا لیکن تمام خواتین بازیاب نہیں ہو سکیں۔ عائشہ جلال قرار دیتی ہیں کہ خواتین پر حملے مردوں کی بالادستی ظاہر کرنے کا شاخسانہ تھے۔ وہ لکھتی ہیں کہ "تمام تینوں مذاہب کے مرد بے چاری عورتوں پر اپنی بالادستی قائم ہونے سے نہایت مسرور تھے" (1998:13)۔

موجودہ ادب

صحافیوں لیری کولنز اور ڈومنیق لاپائر نے 'فریڈم ایٹ مڈنائٹ' Freedom at Midnight کے عنوان سے 1975 میں پورے ہندوستان میں تقسیم کے وقت ہونے والے فسادات پر لوگوں کی یادداشتیں مرتب کی ہیں جو نہایت معیاری تخلیق ہے۔ 1997 میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے پچاس سال مکمل ہونے کے موقع نے گویا ایک مہمیز کا کام کیا کیونکہ ایسا محسوس ہوا کہ جذبات اور طاقتور محسوسات کے مردہ بوجھ تلے دبنے والی آوازیں مزید خاموش نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ اس موقع پر پاکستان اور بھارت میں کئی متاثرہ افراد کے انٹرویو شائع کیے گئے۔ اسی پیرائے میں بھارت کی پنجابی حقوق نسواں کی بعض علمبرداروں نے چونکا دینے والا کام کیا ہے۔ اروشی بٹالیہ نے اپنی کتاب (The Others Side of Silence

1998) اور ریتو مینن اور کملا بھسین کی مشترکہ تخلیق Borders and Boundaries(1998) میں ایسی ہی خواتین کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے خواتین کی مشکلات پر تو توجہ مرکوز کی لیکن ویزے کی پابندیوں کی وجہ سے پاکستانی پنجاب سے تفصیلات جمع نہیں کر سکیں۔ اگرچہ بلاشبہ انہوں نے ایک طرف کے کرب کو بڑی اچھی طرح بیان کیا ہے۔

آئن ٹالبوٹ نے پنجاب کی تقسیم پر کئی تفصیلات لکھی ہیں۔ انہوں نے گر ہرپال سنگھ کے ساتھ مل کر Region and Partition:Bengal,Punjab and the Partition of the Sub Continent (1999) کے عنوان سے جو کتاب مرتب کی ہے اس میں میری تحقیق کے کچھ حصے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ میں نے وہ مواد اس کتاب میں بھی شامل کیا ہے۔ میں نے اسی طرح لاہور میں نسلی قتل عام اور جبری نقل مکانی پر اپنا آرٹیکل بھی شامل کیا ہے جو آئن ٹالبوٹ اور شنڈر تھندی کے ایڈیٹ کردہ مضامین People on the move: Punjabi Colonial and PostColonial Migration (2004) کا بھی حصہ ہے۔ آندرس بجورن ہنسن کی تصنیف Partition and Genocide: (Marifestation of Voilence Partition in Punjab 1937-47(2002) پنجاب کے چیف سیکرٹریوں کی طرف سے 1937 سے 1947 کے درمیان لکھی گئی پندرہ روزہ رپورٹوں پر مشتمل ہے۔ احمد سلیم نے بھی لاہور 1947 (2003) میں صیغہ واحد متکلم میں ایسے واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ کرپال سنگھ کی تصنیف 'دی پارٹیشن آف پنجاب (1989)' مشینری اور میکانزم سیٹ اپ کے ایک مورخ کی ایسی کاوش ہے جس میں انہوں نے صوبے کی تقسیم اور اس عرصے میں کیے گئے بڑے فیصلوں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کئی تخمینے بیان کیے ہیں لیکن اپنی ذاتی رائے نہیں دی۔ ان کی کتاب Select Documents on Partition of Punjab 1947 میں انہوں نے اپنی ریسرچ کے دوران کیے گئے نایاب انٹرویو مرتب کیے ہیں۔ میری ان سے ملاقات 2 جنوری 2004 کو ہوئی تھی۔

حکومت پاکستان نے بھی 1993 میں صیغہ واحد متکلم میں مختلف واقعات شائع کیے۔ The Journey to Pakistan: A Documentation on Refugees of 1947 آزادی کے وقت ہجرت کرنے والوں کی داستانیں ہیں۔ ایک کتاب 'ڈسٹر بنس ان دی پنجاب' 1995 میں شائع ہوئی۔ خواجہ افتخار نے 1980 میں اپنے آبائی شہر امرتسر کے بارے میں یادداشتیں 'جب امرتسر جل رہا تھا' شائع کیں۔ امرتسر پر مسلمانوں کا نکتہ نظر بیان کرنا ایک کربناک کام ہے۔ میری ابھی تک کسی ایسے امرتسری سے ملاقات نہیں ہوئی جس نے اپنے محبوب شہر امرتسر کی جدائی پر صدمے کا اظہار نہ کیا ہو۔ خواجہ افتخار نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ کتاب تب لکھی گئی جب جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت تھی اور 'اسلام پسندی' کو ریاستی نظریے کے طور پر فروغ دیا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ افغانستان میں مذہبی جذبات کے پھندے سے 'جہاد' کی بھی حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی۔ اس جہاد کی سرپرستی نہ صرف سعودی عرب بلکہ امریکہ نے بھی کی چنانچہ اس بات میں حیرت نہیں کہ خواجہ افتخار کی کتاب میں جو لہجہ استعمال کیا گیا ہے وہ ہندوؤں اور سکھوں پر مسلمانوں کی برتری کے وراثتی نظریے سے عبارت ہے۔ کچھ واقعات کی زبان اور بیان صدمے کا بھی باعث بن سکتا ہے لیکن ان کی تحقیق کی طاقت بیان کی تعمیر کے لیے پورے پاکستان سے شہادتوں کی تلاش میں مضمر ہے۔

میرے ساتھ ایک طویل انٹرویو میں خواجہ افتخار ایک بالکل بدلے ہوئے انسان نظر آئے۔ انہوں نے اس بات سے گفتگو کا آغاز کیا کہ امرتسر کے لوگ ہمیشہ محبت اور شفقت پر یقین رکھتے تھے۔ جب میں نے پوچھا کہ اس کا اطلاق شہر کے

ہندوؤں اور سکھوں پر بھی ہوتا تھا تو انہوں نے سختی کے ساتھ دعویٰ کیا کہ فسادات سے قبل امرتسر کے تینوں مذاہب کے افراد امن اور ہم آہنگی کے ساتھ رہتے تھے۔ اس کا ثبوت ان کی تحریر سے بھی ملتا ہے کہ جس میں انہوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو ظالم اور چالباز قرار دیا اور ان پر حملوں کو جائز کہا پھر بھی پوری کتاب میں جابجا انہوں نے کئی ایسے ہندوؤں اور سکھوں کا ذکر کیا جنہوں نے مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کئی بار امرتسر جا چکے ہیں بلکہ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لیکر گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں انکے ہندو دوستوں اور انکے بچوں نے ہمیں جو احترام دیا وہ امرتسریوں کی محبت اور شفقت کا برملا ثبوت ہے۔

محمد ایوب خان نے تقسیم پنجاب کے وقت جالندھر میں رونما ہونے والے واقعات کی تفصیل لکھی ہے۔ کتاب کافی مفصل ہے اور اس میں کافی مفید معلومات شامل ہیں۔ اگرچہ کتاب جانبدارانہ انداز میں تحریر کی گئی ہے تاہم اس میں یہ بات موجود ہے کہ جب جواہر لال نہرو نے جالندھر کا دورہ کیا تو انہوں نے حکم دیا کہ بے خانماں مسلم کمیونٹی پر حملے نہ کیے جائیں لیکن جب وہ گئے اور وزیر داخلہ سردار پٹیل جالندھر آئے تو انہوں نے نہرو کے برعکس حکم جاری کیا چنانچہ مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ 2003 میں حکیم محمد طارق محمود ابقری مجددی چغتائی نے بھی مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے بارے میں صیغہ واحد متکلم میں کتاب '1947 کے مظلوموں کی کہانی خود مظلوموں کی زبانی' لکھی۔

پاکستانی دانشوروں کی تقسیم پر تحقیق کی رفتار سست ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ بھارت میں تقسیم کا موضوع قومی نفسیات کا لازمی جزو ہے جبکہ پاکستان میں تقسیم کا کوئی ذکر شکوک کے ساتھ انسانی المیے کے طور پر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جس کام کی ہندو اور سکھ مذمت کرتے ہیں اسے دوسری طرف ہندوؤں کے استبداد سے مسلم قوم کی آزادی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اسے ہندو اور سکھ ساہوکاروں کے استحصالی شکنجے سے معاشی آزادی بھی قرار دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ 1947 کے المیے کو پاکستانیوں بالخصوص پنجابیوں نے واضح طور پر نظر انداز کیا ہے۔ انہوں نے بھی اس دور میں صرف مسلمانوں کے مصائب کا ذکر کیا۔

عموماً بھارتی سکالروں کا کانگریس کے سامراج مخالف نظریے اور اس موقف پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ بھارت اور پنجاب کی تقسیم میں انگریزوں کا ہاتھ تھا۔ پاکستانی دانشور بھی یہ ٹھوس مثال دے کر انگریزوں کی سازش کی مذمت کرتے ہیں کہ: ریڈکلف ایوارڈ نے مسلمان اکثریت والے بعض علاقے بالخصوص گورداسپور بھارت میں شامل کر دیے تا کہ بھارت اور کشمیر کے درمیان زمینی رابطہ قائم ہو سکے۔

اس سے پہلے تک تقسیم کے موضوع پر تحقیق زیادہ تر مؤرخین نے کی تاہم حالیہ عرصے میں سماجی امور کے ماہرین نے بھی اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ انہوں نے حملوں میں زندہ بچنے والوں اور عینی شاہدین کے تجربات اور واقعات پر توجہ مرکوز کی اور سیاسی چالوں کو موضوع بحث نہیں بنایا۔

میری تحقیق کا کردار

پنجاب کی تقسیم کے موضوع پر یہ پہلی موثر، جامع اور مفصل تحقیق ہے۔ اس دور کے اہم واقعات پر میں نے دونوں طرف عینی شاہدین کے جمع کیے گئے تاثرات کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی۔ یہاں یہ موقف پیش کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم تو ضروری

تھی لیکن پنجاب کی تقسیم کی کافی بنیاد موجود نہیں تھی۔ اس تحقیق کو تقسیم ہند کے تناظر میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کی تقسیم بنیادی طور پر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے لیڈروں کے درمیان تنازعے اور تصادم کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ تقسیم کے عمل کا مطالعاتی جائزہ جارحیت پسند مذہبی گروپوں بالخصوص ان کے رہنماؤں کی باہمی چپقلش کے حوالے سے لیا گیا ہے جو آزادی کے بعد پاکستان اور بھارت کو اقتدار کی منتقلی پر نو آبادیاتی کنٹرول کے خاتمے اور نئی مقامی انتظامیہ کے متعصبانہ کردار سے خوفزدہ تھے۔

یہ کتاب مسلمانوں اور سکھوں دونوں کی طرف اپنے اپنے علاقوں میں مخالف فریق کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے منصوبے بنانے کے الزامات پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ یعنی مسلم لیگ کا متحدہ یا منقسم پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں کو مکمل طور پر مٹانے کا منصوبہ یا مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو نکال باہر کرنے کا ہندوؤں اور سکھوں کا منصوبہ۔ حقیقتاً جب پنجاب کی تقسیم ہوئی تو یہی کچھ ہوا۔ اس کتاب میں تاریخ کے اس المناک باب کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کیوں اور کیسے وقوع پذیر ہوا۔ دوسرا یہ کہ میری تحقیق میں انفرادی اور اجتماعی دونوں شناختوں کے انتہائی گہرے سوال کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ کیا پرانا پنجاب انتہائی منقسم تھا یا ایک جامع کثیر النوع معاشرہ تھا؟ اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے تقسیم کے بعد مشرقی اور مغربی پنجاب کی فرقہ وارانہ شناخت کی سیاست کا تجزیہ کیا گیا۔ تحقیق میں اس تصوراتی سوال کا بھی احاطہ کیا گیا ہے کہ تقسیم کے المیوں کو قتل عام قرار دیا جائے یا نسل کشی۔

پنجاب کے دونوں حصوں میں تمام قسم کی کجیوں پر ریسرچ

پاکستانی محققین کے لیے ایسا کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ وہ بھارتی پنجاب میں جاکر فیلڈ ورک کریں۔ اسی طرح بھارتی ریسرچر بھی پاکستان میں آکر ڈیٹا جمع نہیں کر سکتے۔ میرے سویڈش شہری ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ میرے ساتھ تکنیکی طور پر بیوروکریسی کی طرف سے اس طرح کا سلوک نہیں کیا گیا جس طرح پاکستان اور بھارت کے شہریوں سے ایک دوسرے کے ملک میں ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے آزادانہ طور پر دونوں ملکوں کا دورہ کیا اور متعلقہ افراد سے گفتگو کی اور یوں پنجاب کے دونوں حصوں میں فیلڈ ورک پر مبنی مواد جمع کرنے کے قابل ہو سکا۔ پاکستان کے کئی دوروں میں 2003 سے 2005 میں احمد سلیم نے میری معاونت کی جبکہ بھارت میں مہندر پال سنگھ (وکی) نے مارچ 2004 اور جنوری 2005 میں میری مدد کی۔ نومبر 2005 میں مشرقی پنجاب میں ہتیش گوسین اور وریندر سنگھ میرے ساتھ رہے۔

مواد کے بنیادی ذرائع

انگریزوں نے پنجاب کی صورتحال پر مربوط انداز میں ریکارڈ جمع کیا جو انتظامی افسروں اور اہلکاروں نے صورتحال کا خود جائزہ لے کر تیار کیا تھا۔ میں نے کافی حد تک درج ذیل سرکاری ماخذ استعمال کیے۔

1. پنجاب کے گورنروں اور چیف سیکرٹریوں کی طرف سے وائسرائے ہند کو ہر پندرہ روز بعد لکھی جانے والی خفیہ رپورٹوں کا مکمل ریکارڈ موجود ہے۔ یہ رپورٹیں خفیہ ایجنسیوں کی جمع کردہ معلومات کی بنیاد پر تیار کی جاتی تھیں۔

ان کا آغاز اپریل 1936 سے ہوا اور آخری پندرہ روزہ رپورٹ 13 اگست 1947 کو لکھی گئی جو انگریز دور کے کسی افسر کے لیے سرکاری ڈیوٹی انجام دینے کا دوسرا آخری دن تھا۔ اس دور میں گورنر ہمیشہ انگریز ہوتا تھا جبکہ آخری برسوں میں چیف سیکرٹری ہندوستانی ہوتے تھے۔ میں نے خفیہ پندرہ روزہ رپورٹوں پر بہت زیادہ انحصار کیا۔ اس کے علاوہ گورنر کی رپورٹوں کو بھی کافی اہمیت دی کیونکہ ان میں سیاسی صورتحال اور فسادات کی معلومات کے ساتھ صوبے میں سب سے اعلیٰ انگریز افسر کی سوچ اور فہم و فراست کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس رپورٹ کو مکمل خفیہ رکھا جاتا تھا اور ہندوستانی سیاستدانوں کو اس تک رسائی نہیں ہوتی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ تمام پندرہ روزہ رپورٹیں اب برٹش لائبریری کے لائنل کارٹر نے شائع کر دی ہیں۔ انھوں نے نہایت دانشمندی کے ساتھ ٹیلی گرام اور سپیشل رپورٹوں کو بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔ پنجاب کے گورنروں کی خفیہ رپورٹوں پر مشتمل ان کی کتاب معلومات کا خزانہ ہے اور اب باآسانی دستیاب ہے۔ چیف سیکرٹریوں کی رپورٹیں زیادہ تر اس دور کے واقعات سے متعلق تھیں اور اکثر گورنر کی رپورٹیں بھی اس سے مماثل ہوتی تھیں۔ یہ اب مائیکروفلم پر دستیاب ہیں۔ میں نے اس کا کافی زیادہ استعمال کیا ہے۔ 15 اگست 1947 کو پاکستانی اور بھارتی حکومتوں نے کنٹرول سنبھال لیا اور اس وقت سے ایسی کوئی رپورٹ یا تو لکھی ہی نہیں گئی یا پھر انہیں خفیہ قرار دے دیا گیا۔ یوں پنجاب کے چیف سیکرٹریوں کی پندرہ روزہ رپورٹیں اب مائیکروفلم پر دستیاب ہیں۔

2. برطانیہ نے 1970 سے 1983 کے دوران 12 جلدوں میں ایک کتاب The Transfer of Power 1942-7 شائع کی۔ ان تمام جلدوں میں واقعات اور انتقال اقتدار کے لیے پاکستان اور بھارت کے ساتھ مذاکرات کا انتہائی ضخیم سرکاری ریکارڈ موجود ہے۔ اس کا بڑا حصہ پنجاب سے متعلق ہے۔ پنجاب کے اکثر گورنروں کی پندرہ روزہ رپورٹیں، ٹیلی گرام اور سپیشل رپورٹیں بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات اہم ہے کہ لائنل کارٹر کے مجموعے میں گورنروں کی رپورٹوں کے جواب میں وائسرائے یا کئی برطانوی عہدیدار کے جواب یا تبصرے شامل نہیں جبکہ 'ٹرانسفر آف پاور' میں یہ بھی شامل ہیں۔ یقیناً مسئلہ یہ ہے کہ جب انگریز اقتدار سے دستبردار ہو گئے تو پنجاب کے دونوں حصوں کا دستاویزی ریکارڈ دستیاب نہیں۔ میں نے دونوں ملکوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ اس بارے میں مشاورت کر کے بھی چیک کیا۔ زیادہ تر ہلاکتیں 14، 15 اگست کے بعد وقوع پذیر ہوئیں جو پولیس اور دیگر سرکاری محکموں میں متعصب افسروں کی سیاسی کارکنوں، مذہبی جنونیوں اور جرائم پیشہ عناصر سے سازباز پر مشتمل مربوط سرگرمیوں کا نتیجہ تھیں۔ چنانچہ یہ بات قابل فہم ہے کہ دونوں ملکوں بالخصوص پنجاب کے دونوں حصوں میں سرکاری عمال اپنے عملے پر الزامات کے شواہد ظاہر کرنے کے خواہاں نہیں تھے۔

3. متحدہ پنجاب کے دارالحکومت (اب پاکستانی پنجاب کا مرکزی شہر) لاہور سے کئی اخبارات شائع ہوتے تھے۔ 1947 میں لاہور آگ میں جل رہا تھا اور کئی قیمتی ریکارڈ ضائع ہو گیا۔ میں نے زیادہ تر انحصار کانگریس نواز انگریزی اخبار 'دی ٹریبون' Tribune اور مسلم لیگی اخبار 'دی پاکستان ٹائمز' The Pakistan Times پر انحصار کیا۔ ان کی فائلیں دستیاب ہیں۔ اگرچہ کچھ حصے مکمل نہیں تاہم ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اخبارات بعض

اوقات پابندیوں کے تحت خبریں شائع کرتے تھے جو پنجاب حکومت نے لگائی تھیں۔ ایک لحاظ سے جب جلاؤ گھیراؤ اپنی انتہا پر تھا تو پریس پر غیر اعلانیہ سنسر شپ بھی عائد تھی۔ معلومات کے ان بنیادی ذریعوں کے ساتھ میں نے ایسے کئی ثانوی ذرائع سے بھی مدد لی جن کا تقسیم ہند سے بالعموم اور تقسیم پنجاب سے بالخصوص تعلق تھا۔

زبانی تاریخ

1947 کے حالات کے عینی شاہدین یا متاثرین کی زبانی تاریخ یا تفصیلی انٹرویو کی شکل میں ذاتی تاثرات تقسیم کے موضوع پر حالیہ تحقیقاتی کام کی آزمودہ تکنیک ثابت ہوئی ہے۔ میری ریسرچ میں اس کا کافی استعمال کیا گیا ہے۔ میری ذاتی رائے میں اس طریقے کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ یہ انٹرویو دینے والے کی نجی اور جذباتی انداز میں شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ میں نے کسی مرد یا عورت کو صرف معلومات کے ایک ذریعے کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ کسی کہانی کے لازمی جزو کے طور پر لیا ہے۔ ہر ایسی کہانی اپنے اپنے معیار کے مطابق پڑھی جانی چاہیے۔

یقیناً ایک مسئلہ یہ ہے کہ انٹرویو دینے والے کا انتخاب کیسے کیا جائے۔ ہر حکمت عملی کی اپنی طاقت اور کمزوریاں ہوتی ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا میرے لیے مشکل نہ تھا کہ پنجاب کی کئی برادریوں کے نمائندہ افراد میں متعلقہ سوالنامہ تقسیم کرنا زیادہ مفید ثابت نہیں ہوگا۔ لوگوں کے لیے اپنے المناک اور صدمے سے بھرپور تجربات بیان کرنا آسان نہیں اور یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی طویل کہانی کا صرف ہاں یا نہیں میں جواب دے سکیں۔ اس طرح ان کے تجربے کی شدت مخصوص متبادل اور تسلسل میں بیان کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ کسی قطعی اجنبی سے یہ توقع بھی نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ کسی سوالنامے میں درج سوالات کے طویل جوابات دے۔ پوری تفصیل سے جواب حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ زبانی تاریخ جمع کی جائے۔ بڑے سوالات یہ تھے:

1. آپ کہاں اور کب پیدا ہوئے؟
2. جہاں آپ پیدا ہوئے کیا وہ مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگوں کا گاؤں یا علاقہ تھا؟
3. آپ دیگر مذاہب کے ساتھ اپنے تعلقات کو کیسے یاد کرتے ہیں؟
4. مسلمانوں اور سکھوں ہندوؤں کے درمیان خلیج کب پیدا ہونا شروع ہوئی؟
5. بتائیے 1947 میں کیا ہوا تھا؟
6. کیا آپ جانتے تھے کہ آپ کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑے گا؟
7. حملوں کی نوعیت کیسی تھی، کیا باہر سے لوگ ملوث تھے یا آپ کے ہمسایوں نے بھی حصہ لیا تھا؟
8. کیا آپ سیاسی جماعتوں کے کارکنوں، پولیس یا دیگر سرکاری اہلکاروں کے نام بتا سکتے ہیں جنہوں نے فسادات بھڑکانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا؟
9. کیا ایسے افراد کے نام بتا سکتے ہیں جنہوں نے مخالف مذہب کے افراد کی زندگی بچانے میں اہم کردار ادا کیا ہو؟
10. آپ پنجاب کی تقسیم کی وجوہات کی کس طرح وضاحت کریں گے؟

میں نے انٹرویو دینے والوں کو اپنے انداز میں کہانی بیان کرنے کا موقع دیا۔ انٹرویو کا اوسط دورانیہ ایک گھنٹہ تھا۔ سوالات کم سے کم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ کسی واقعے پر سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے موقف کا اخباری خبروں اور دیگر ذرائع سے موازنہ کر کے حقائق جمع کرنا مشکل نہیں۔ تاہم ایسا ہر کیس میں ممکن نہیں تھا کئی کیسوں میں مجھے محض ایک فرد کی بات پر انحصار کرنا پڑا۔ اگر مجھے پتہ چلتا کہ اس کا بیان کسی واقعے پر روشنی ڈالنے کے لیے اہم ہے۔ جہاں مجھے ماضی کی یادیں دہرانے میں کوئی شبہ محسوس ہوا وہاں میں ایسے واقعات کے انتخاب میں کافی محتاط رہا۔ جسم کے تاثرات اور بیان کا تحریری شکل میں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ بہترین کام یہ ہو سکتا ہے کہ ویڈیو ریکارڈنگ کی جائے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ انٹرویو آڈیو ٹیپ میں ریکارڈ کیے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ جتنے زیادہ افراد کے انٹرویو ممکن ہوں وہ کر لیے جائیں۔ کچھ ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اعتراف کیا کہ وہ پر تشدد کارروائیوں میں ملوث رہے اور کئی افراد کو حملہ کر کے ہلاک کرنے کا موجب بنے۔ میں نے ان کی اجازت سے ان کے اصل نام دیے ہیں۔ کچھ کیسوں میں نام ظاہر نہ کرنے کی درخواست کی گئی جس کا میں نے احترام کیا۔

اس کام میں میری کئی ساتھیوں نے معاونت کی جس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔ گفتگو کا آغاز ہم نے ایسے افراد سے کیا جن سے ہماری کوئی واقفیت تھی۔ اس کے بعد نئے افق کھلتے چلے گئے۔ چنانچہ ہم نے دائرہ کار وسیع کرتے ہوئے کئی متنوع آراء بھی شامل کر لیں۔ پہلے ہم نے شہروں اور قصبوں میں ملاقاتیں کیں پھر دیہات کا رخ کر لیا۔ پہلے احمد سلیم (پاکستان) اور مہندر پال سنگھ (بھارت) مختلف مقامات پر جا کر ابتدائی پوچھ گچھ کرتے، پھر میں سویڈن سے پرواز پکڑ کر وہاں پہنچ جاتا۔ اس کے بعد ہم پنجاب کے دونوں حصوں میں ہر روز مختلف دیہات کا دورہ کرتے۔ یہ سوچ کر کہ دونوں طرف کے پنجاب میں ہزاروں دیہات ہیں ہم نے اپنی سمجھ کے مطابق ایسے علاقوں کا انتخاب کیا جو فسادات سے زیادہ متاثر ہوئے تھے اور جہاں جانے میں ہماری سہولت بھی تھی۔ رابطوں سے آگے اور رابطے نکل آتے اور ہم اپنے سوالات کے جوابات کے لیے دلچسپی کے حامل افراد سے ملتے تھے۔ کئی بار میں راستے میں اچانک کھڑا ہو کر کسی معمر شخص سے بھی بات کر لیتا تھا۔

پنجاب میں کسی مرد کے لیے کسی خاتون تک رسائی حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا اور اگر یہ کسی اجنبی کا معاملہ ہو تو صورتحال اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہم نے زیادہ بات چیت مردوں سے کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حوالے سے خواتین محققین کے لیے ریسرچ کی کافی گنجائش ہے۔ جیسا کہ بھارتی حقوق نسواں کی علمبردار خواتین نے اس منفی پہلو سے پہلے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ بلاشبہ اس طرح فسادات کے دوران خواتین کی حالت زار پر ثانوی ادب بھی سامنے آیا ہے۔ ہم نے سیاستدانوں، ریٹائرڈ بیوروکریٹس، دیگر سرکاری ملازمین، اساتذہ، وکلا، دہقانوں، غریب طبقے کے افراد، لکھاریوں، پہلوانوں، سیاسی کارکنوں بلکہ ایسے افراد سے بھی ملاقاتیں کیں جنہوں نے مخالف گروپ کے افراد کو قتل کیا۔ دیہات میں بیشتر افراد ناخواندہ تھے۔ تقریباً تمام انٹرویو پنجابی زبان میں ہوئے جو میری بھی مادری زبان ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ مجموعی طور پر لوگ اس موضوع پر بات کرنا چاہتے تھے اور یہ بھی اکثر ہوتا کہ کوئی بوڑھا آدمی پرانی باتیں یاد کر کے رو پڑتا اور میری آنکھیں بھی نم ہو جاتیں۔ لیکن کبھی کبھار میں ان کے دہشتناک تجربات سن کر شرمسار ہو جاتا۔ ہمارے انٹرویو دینے والے زیادہ تر پینسٹھ سے پچیاسی سال کی عمر کے لوگ تھے۔ کئی مواقع پر میری بات سے لوگ پھٹ پڑتے۔ تب انہیں تقسیم کے وقت تین سے پانچ سال کی عمر میں اس دور کے واقعات یاد آجاتے۔

ایسا بالکل ممکن ہے کہ خوفناک واقعات کچی عمر میں بھی یاد رہ جائیں۔ چنانچہ میں نے ایسے افراد سے بھی بات کی جو 1947 میں ابھی بچپن میں تھے۔ بعض اوقات جب میں نے چیک کیا تو بڑے بھائی یا خاندان کے کسی اور بڑے فرد نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ یوں مجھ پر کھلا کہ کم عمر والے افراد زیادہ معلومات دے سکتے ہیں اس کے بعد بڑوں کو بھی پرانے واقعات یاد آ جاتے۔

میرا پورے خلوص کے ساتھ خیال ہے کہ جن افراد نے میرے ساتھ رضاکارانہ طور پر بات کی انہوں نے دیانتداری سے کام لیا۔ ہاں بعض مواقع پر لگا کہ انٹرویو دینے والا حقائق مسخ کر رہا ہے یا جھوٹ بول رہا ہے۔ ایسا ان کیسوں میں ہوا جہاں لوگوں کے سیاسی مقاصد تھے، میں سمجھتا ہوں کہ ایک تجربہ کار ریسرچر کو آسانی کے ساتھ دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں اتنا لمبا عرصہ گزرنے کے بعد تاریخیں اور واقعات گڈمڈ ہو سکتے ہیں۔ میرے انٹرویو کا آغاز 1997 میں ہوا اور یہ سلسلہ کتاب کی اشاعت تک جاری رہا۔

کتاب کی ہئیت اور ترتیب

اس تحقیقی کام کو اس انداز سے پر ترتیب دیا گیا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ عمل اور رد عمل کا منظم بیان ممکن ہو سکے اور ارادی اور غیر ارادی نتائج کی زنجیر بن سکے۔ پہلے کتاب میں تصوراتی اور تھیورٹیکل فریم ورک اور تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پنجاب میں رونما ہونے والے واقعات شامل کیے گئے ہیں: پنجاب کے اندر ہونے والے واقعات یا اس سے متعلق واقعات۔ یعنی دہلی میں جہاں ہندوستان کے مستقبل کے لیے کانگریس، مسلم لیگ اور سکھ لیڈروں میں مذاکرات ہو رہے تھے۔ یہ واقعات 3 مراحل میں ترتیب دیے گئے ہیں جو تقسیم پنجاب کے انتہائی اہم دورانیے کی تفصیل بتاتے ہیں۔

- پہلا مرحلہ: خونیں تصادم کی تشکیل کا عرصہ جنوری 1945 سے مارچ 1947 پر مشتمل ہے۔ اس عرصے میں وہ عمل شروع ہوا جس نے ایک طرف مسلمانوں کو جبکہ دوسری طرف ہندوؤں اور سکھوں کو متحد کر دیا۔ یہ صورتحال مارچ 1947 میں خونیں فسادات پر منتج ہوئی۔ یہ دورانیہ پکنے والے اس لاوے کے آثار بتاتا ہے جو انگریز انتظامیہ کی فسادات روکنے کے لیے پیشگی اقدامات کرنے میں ناکامی سے پک رہا تھا۔
- دوسرا مرحلہ: تقسیم کا اختتام: یہ اپریل 1947 سے 14 اگست 1947 کے درمیان کا عرصہ ہے جس کے دوران حکومت نے ابتدائی طور پر قانون نافذ کرنے کے اقدامات تو کیے لیکن امن قائم نہیں کیا کیونکہ قتل، آگ لگانے کے واقعات بعض مقامات پر ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ واقعات بڑھنے لگے اور بے رحم اور بدترین شکل اختیار کر گئے۔ مئی کے اواخر سے آگے ان میں انتہائی تیزی آ گئی۔ سر ایوان جینکنز نے 14 اگست کو پنجاب کے آخری انگریز گورنر کے طور پر ذمہ داریاں چھوڑ دیں۔
- تیسرا مرحلہ: نسلی قتل عام کا عرصہ 15 اگست سے دسمبر 1947 پر پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحد کے تعین کے لیے قائم کیے گئے ریڈکلف ایوارڈ کی رپورٹ 17 اگست 1947 کو منظر عام پر آئی۔ جس کے

فوری بعد تشدد میں ڈرامائی تیزی آگئی کیونکہ اب واضح ہوگیا تھا کہ کون سے گاؤں یا قصبہ کس ملک کی حدود میں آئے گا۔ نتیجتاً منقسم پنجاب میں شروع ہونے والا قتل عام نسل کشی کا رنگ اختیار کر گیا۔ 1947 کے آخر یا اس کے فوراً بعد دونوں طرف کے پنجاب میں مذہبی قتل عام کا کام مکمل کر لیا گیا۔

انٹرویوز

ہرکشن سنگھ سرجیت، نئی دہلی 21 اکتوبر 1999

پروفیسر کرپال سنگھ، چندی گڑھ، 2 جنوری 2005

رینجی نلڈ میسی، مڈویلز، بذریعہ ای میل 5 جولائی 2006، 4 اگست 2007 کو دوبارہ ای میل ارسال کی

لیفٹیننٹ جنرل آفتاب احمد خان، لاہور سے خط، 2 فروری 2007

آئن ٹالبوٹ 19 مارچ 2010 کو برطانیہ سے ای میل

References

Ali, Chaudhri Muhammad, *The Emergence of Pakistan*, Lahore; Research Society of Pakistan, (1973).

Burki, Shahid Javed, *Pakistan under Bhutto, 1971-1977*, New York: St. Martin's Press, (1980).

Butalia, Urvashi, *The Other Side of Silence: Voices from the Partition of India*, New Delhi: Penguin Books, (1998).

Chughtai, Hakim Muhammad Tariq Mehmood Abqary Mujadidi (compiler and editor), *1947 ke Muzalim ki Kahani khud Muzlumon ki Zabani* (*The Story of the 1947 Atrocities from the Victims' Themselves*), Lahore: Ilm-o-Irfan Publishers, (2003).

Collins, Larry and Lapierre, Dominique, *Freedom at Midnight*, New York: Avon Books, (1975).

Coupland, Ian, '*The Master and the Maharajas: The Sikh Princes and the East Punjab Massacres of 1947*', *Modern Asian Studies*, Vol. XXXVI, No. 3, Cambridge: Cambridge University Press, (2002).

Hansen, Anders Bjorn, *Partition and Genocide: Manifestation of Violence in Punjab 1937-1947*, New Delhi: India Research Press, (2002).

Iftikhar, Khawaja, *Jabb Amritsar Jall Reha Thaa* (*When Amritsar was Burning*), Lahore: Khawaja Publishers, (1991).

Jalal, Ayesha, '*Nation, Reason and Religion: The Punjabis' Role in the Partition of India*', *Economic and Political Weekly*, Vol. XXXIII, no. 12, 8 August 1998, Mumbai, (1998).

Jeffrey, Robin, '*The Punjab Boundary Force and the Problem of Order, August 1947*', *Modern Asian Studies*, Vol. VIII, No. 4, Cambridge: Cambridge University Press, (1974).

Jhubal, Bhai Aridaman Singh, '*Partition of Punjab: Role of Sikh Leadership; S. Amar Singh Jhubal and his Family*', *Journal of Sikh Studies*, Vol. XXVII, No. 2, Amritsar: Guru Nanak Dev University, (2002).

Khan, Muhammad Ayub, *Tarikh-i-Pakistan Aur Jullundur* (*The Pakistan Movement and Jullundur*), Lahore: Asatair, (2002).

Khosla, Gopal Das, *Stern Reckoning: A Survey of the Events Leading Up To and Following the Partition of India*, New Delhi: Oxford University Press, (1989, first published in 1949).

Menon, Ritu and Bhasin, Kamla, *Borders and Boundaries: Women in India's Partition*, New Delhi: Kali for Women, (1998).

Munir, Muhammad, *From Jinnah to Zia*, Lahore: Vanguard Books Ltd, (1980).

Robert, Andrew, *Eminent Churchillians*, London: Phoenix, (1995).

Salim, Ahmad (edit), *Lahore 1947*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, (2003).

Singh, Kirpal, *The Partition of the Punjab*, Patiala: Patiala University, (1989).

Singh, Kirpal, *Select Documents on Partition of Punjab – 1947*, Delhi: National Book Shop, (1991).

Talib, S. Gurbachan, *Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab 1947*, New Delhi: Voice of India, (1991, first published in 1950).

Talbot, Ian and Singh, Gurharpal (eds), *Region and Partition: Bengal, Punjab and the Partition of the Subcontinent*, Karachi: Oxford University Press, (1999).

Talbot, Ian and Thandi, Shinder (eds), *People on the Move: Punjabi Colonial, and Post-Colonial Migration*, Karach: Oxford University Press, (2004).

Tanwar, Raghuvendra, *Reporting the Partition of Punjab: Press, Public and Other Opinions*, New Delhi: Manohar, 2006.

Waseem, Mohammad, '*Partition, Migration and Assimilation: A Comparative Study of Pakistani Punjab*' in Talbot, Ian and Singh, Gurharpal (eds), *Region and Partition: Bengal, Punjab and the Partition of the Subcontinent*, Karachi: Oxford University Press, (1999).

Official documents

Carter, Lionel (compiler and editor), *Punjab Politics 1936-1947, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents*, all volumes, New Delhi: Manohar, (2004-2007).

Disturbances in the Punjab, Islamabad: National Documentation Centre, (1995).

The Journey to Pakistan: A Documentation on Refugees of 1947, Islamabad: National Documentation Centre, (1993).

Notes on the Sikh Plan, Lahore: Government Printing Press, (1948).

The RSS in the Punjab, Lahore: Government Printing Press, (1948).

The Sikhs in Action, Lahore: Government Printing Press, (1948).

Mansergh and Lumby, (eds), The 12-volume, *Transfer of Power*, British official documents Vol. I-IV.

Mansergh, N. and Moon, P., (eds.), *Transfer of Power*, British official documents Vol. V-XXII.

1

نسل کشی کا نظریہ

جبری ہجرت، نسل کشی اور قتل عام وہ عمل ہیں جن کا باہمی تعلق نیچے واضح کیا گیا ہے تاکہ ایسا نظریاتی فریم ورک تیار کیا جا سکے جس سے 1947 میں پنجاب میں ہونے والے واقعات کا تجزیہ ہو سکے۔ یہ بات مد نظر رہے کہ کوئی نسلی گروپ ایسے افراد پر مشتمل ہو سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاید یہ بالکل سچ نہ ہو لیکن نام نہاد مشترکہ آباؤاجداد یکجہتی کے جذبات پیدا کرنے کا موجب بن سکتے ہیں۔ جب اسی قسم کے جذبات ایسے افراد میں پائے جائیں جو ایک ہی مذہب، زبان یا ایسا ہی کوئی اور مشترکہ پہلو رکھتے ہوں تو اسے دیگر افراد سے مختلف نسلی گروہ کہا جائے گا۔ جب دو یا دو سے زائد ایسے گروہ جو نسلی، مذہبی، فرقہ وارانہ یا ایسا کوئی اور مشترکہ اصول رکھتے ہوں۔ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو ایسے واقعات بیان کرنے کی مستعمل اصلاح کو 'نسلی تصادم' کہیں گے۔(Ahmed,1998: 19-38) اتنا کہنا کافی ہو گا کہ نسلی قتل عام ایک مستعمل اصطلاح ہے جس سے مراد ہے مخصوص یا مختلف آبادی کو (قتل عام یا جبری نقل مکانی دونوں طرح) نسل، مذہب، فرقے یا دیگر ایسے عوامل کی بنیاد پر مخصوص علاقے میں مٹا دینا۔ جہاں تک پنجاب کے معاملے کا تعلق ہے تو یہاں مذہبی فیکٹر تھا جو سیاسی طرز کی نسل کشی کی بنیاد بنا۔

پنجاب کی تقسیم کا معمہ یہ ہے کہ اس صوبے کی تقسیم پر اتفاق آل انڈیا سطح پر ہندوستان کی مجموعی تقسیم کے طور پر کیا گیا۔ لیکن دراصل ایسا نہیں تھا بلکہ یہ ایسا فیصلہ تھا جس پر اعلیٰ سیاست کی سطح پر اتفاق کیا گیا لیکن پھر وہ عام انتظامی کام بن کر رہ گیا۔ پنجاب میں سکھ لیڈر بر ملا کہتے تھا کہ اگر ہندوستان کی تقسیم مذہب کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے تو پھر پنجاب کی بھی تقسیم ایسے ہو گی تاہم سکھ پنجاب میں ایک چھوٹی اقلیت تھے۔ پنجاب کی ایسی تقسیم جس پر مذاکرات کیے گئے ہوں اور محض سکھوں کی مسلط کردہ نہ ہوتی وہ انہیں بھی تقسیم کر دیتی۔ دوسری طرف مسلمانوں کی صوبے میں معمولی اکثریت تھی۔ مسلمان لیڈر پورے کا پورا پنجاب چاہتے تھے لیکن پنجاب کی تقسیم پر اس لیے رضامند ہو گئے کیونکہ بصورت دیگر پاکستان بھی وجود میں نہ آتا۔ پنجاب کی تقسیم رد کی جا سکتی تھی اگر صوبے کے تینوں بڑے مذاہب ہندوازم، اسلام اور سکھ مت پنجاب کی ثقافتی شناخت مل کر اپناتے جو ان کی مذہبی شناختوں پر برتری کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔ ایک اور امکان یہ تھا کہ مسلمان اور سکھ اقلیت پنجاب کو متحدہ رکھنے پر اتفاق کر لیتے۔ اس طرح ایک ایسی اکثریت وجود میں آتی جو پنجاب کی تقسیم کی مخالفت کرتی۔ پنجاب کی تقسیم تب بھی ہوتی تھی لیکن وہ انتہائی مشرق حصے میں ہندی بولنے والے ہندو جاٹوں کے علاقے میں ہونی تھی۔ مرکز میں وائسرائے کی زیر قیادت انگریز حکام کا یہ خیال نہیں تھا کہ اقتدار کا انتقال بڑے پیمانے پر نسلی بنیادوں پر ہو گا ۔ اگرچہ پنجاب حکومت بار بار خبردار کر چکی تھی کہ تقسیم ہوئی تو پنجاب میں بڑا خون خرابہ ہو گا۔ جب تقسیم کا عمل وقوع پذیر ہوا تو دونوں طرف ناپسندیدہ مذہبی اقلیتوں کا صفایا کر دیا گیا۔ ایسا کیونکر ہوا؟

ابتدائی نوعیت کا جواب یہ ہے کہ مارچ 1947 کے اوائل میں شمالی پنجاب میں سکھوں کی غالب اکثریت والے دیہات پر مسلح مسلمان ہجوم کی طرف سے بڑے پیمانے پر حملے کیے گئے جس سے ان دونوں مذاہب کے درمیان بدگمانی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد یہ خلیج پاٹنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے وہ ناکافی ثابت ہوئے۔ یوں متحدہ پنجاب کے امکانات معدوم ہوتے چلے گئے۔

جبری نقل مکانی

دنیا کے ہر خطے اور براعظم میں پوری تاریخ انسانی کے دوران مختلف افراد، گروہ اور کمیونٹیز بلکہ پورے کے پورے معاشرے نقل مکانی کرتے آئے ہیں۔ خوراک کی تلاش، فتح کی جستجو، غربت اور قانونی کارروائی سے فرار اور کئی وجوہات کی بنا پر لوگوں کی ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقلی ہوتی رہی ہے۔ رضاکارانہ اور جبری ہجرت میں فرق جاننا مفید ہو سکتا ہے۔ اگرچہ بعض کیسوں میں یہ جاننا مشکل ہوتا ہے کہ ہجرت کرنے کی سوچ کے پیچھے جبر کارفرما ہے یا فیصلہ اپنی آزادی سے کیا گیا۔ عام طور پر کسی فرد کے لیے ایسی جگہ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنا مشکل اور جذباتی ہوتا ہے جہاں وہ پیدا ہوا اور پلا بڑھا۔ چاہے اس نے ہجرت کا فیصلہ اپنی مرضی سے ہی کیوں نہ کیا ہو۔ ان دنوں اب یہ بات مغرب کے صنعتی آبادی والے شہروں کے معاملے میں شاید سچ نہ ہو۔ جہاں لوگ مسلسل نقل و حرکت کرتے ہیں لیکن کمیونٹی کی 'جڑوں' کا معاملہ ابھی مرا نہیں۔ تاریخی حوالے سے دیکھیں تو خانہ بدوش افراد اگرچہ ایک جگہ قیام نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی جانی پہچانی جگہوں کے درمیان موسمیاتی گردش کرتے تھے۔ وہ اپنی مخصوص جگہوں سے نکالنے کے کسی بھی عمل کی مزاحمت کرتے تھے۔ یہ جذباتی کیفیت برقرار ہے بلکہ مزید مضبوط ہوئی ہے کیونکہ آج کے دور میں مختلف ملکوں کی سرحدوں اور جدید ایجادات نے خانہ بدوشوں کی نقل و حرکت کو مشکل بنانا شروع کر دیا ہے۔

زراعتی معاشروں جیسا کہ 1947 میں تقسیم کے وقت کا پنجاب تھا۔ میں نقل و حرکت محدود تھی۔ اکثر لوگ ایسی آبادیوں میں رہتے تھے جہاں گاؤں کے حوالے سے شناخت بہت قریبی ہوتی تھی جبکہ مقامی برادری سے تعلق ان کی سرگرمی اور سوچ کے عمل کی تشکیل کرتا تھا۔ مقامی چیزوں کے ساتھ وابستگی نامیاتی تھی اور زمیندار برادریوں کے لیے ان کی شناخت کا ناگزیر حصہ تھی۔ 1947 کے پنجاب کے شہروں اور قصبوں میں صورتحال مختلف نہیں تھی۔ اگرچہ پنجاب کے کئی اضلاع کے پنجابی باشندے انگریزوں کی فوج میں شامل تھے اور انہوں نے پورے ہندوستان بلکہ بیرون ملک تک میں خدمات انجام دیں لیکن ان کا اپنے آبائی مقامات سے ناتا غیر متزلزل رہا۔ چنانچہ جب تقسیم کے وقت لوگوں کو جبراً اپنے گھروں سے بے دخل ہونا پڑا تو یہ تجربہ ان کے لیے ہولناک ثابت ہوا۔ مجھے اس کا بہت زیادہ اندازہ انٹرویو کرنے کے دوران ہوا۔ اکثر افراد اب بھی اس جگہ یا مکان کو یاد کرتے ہیں جہاں وہ پیدا ہوئے اور جو گھر انہوں نے یا ان کے خاندان نے بڑی محنت اور قربانیوں سے تعمیر کیا تھا۔ حتیٰ کہ غریب افراد کے لیے بھی اتنے برسوں کے بعد اپنے آبائی محلے کی یادیں بہت طاقتور تھیں۔ اپنے گھروں سے محروم ہونے کا ذکر کر کے کئی لوگ رو پڑتے تھے۔

نسلی بنیادوں پر صفایا

نسل کشی Ethnic Cleansing ایک ایسا عمل ہے جس میں کسی علاقے سے کسی آبادی کا جبری انخلا ہوتا ہے لیکن یہ خصوصی طرز کی نقل مکانی ہوتی ہے۔ یہ اصطلاح مخصوص مذہبی یا قومی کمیونٹی کی اپنی 'خاص سرزمین' کو اجنبی افراد سے پاک کرنے کے عزم کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ایسی کسی بھی خواہش کے پس منظر میں تصادم پر مبنی نسل پرستی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ جبکہ ایک نسلی گروہ ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ وہ ایک مشترکہ نسل اور ثقافت کے حامل ہیں۔ نسل پرستی کی اصطلاح ایسے طاقتور جذبات اور احساسات کو بیان کرتی ہے جو ایک مذہب، فرقے اور زبان سے نکلتے ہیں (Ahmed,1998: 26)۔ یہ مخصوص قسم کے احساسات ہیں جو حقیقی یا اپنے طور پر سمجھے جانے والے امتیازی سلوک اور بے انصافی کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔ نسل کشی ایک وسیع تر مفہوم کی حامل تہہ دار اصطلاح ہے جو نہ صرف آبادی کے انخلا کا احاطہ کرتی ہے بلکہ اس میں مذہبی، فرقہ وارانہ، لسانی یا اس جیسے کئی اور عوامل بھی شامل ہوتے ہیں۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے تو یہاں 'صفائے' کی بنیاد مذہب تھا کیونکہ بیشتر لوگ ایک ہی اور ملے جلے نسلی پس منظر کے حامل تھے۔ بالالفاظ دیگر مذہب پریشان کن نسل پرستی کا موجب بن گیا اور ایک تصوراتی خالص قوم کے لیے اس کا صفایا ضروری سمجھا گیا۔

اینڈریو بیل فیالکوف نے (1999) Ethinc Cleansing کے عنوان سے کتاب لکھی ہے لیکن اس موضوع پر بحث کے دوران انہوں نے 'آبادی کا صفایا' کا لفظ استعمال کرنے کو ترجیح دی ہے کیونکہ محض Ethnic اصطلاح سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ انہوں نے انسانی تاریخ کے ہر دور اور موجودہ دور میں آبادی کے صفائے کو وقوع پذیر مظہر قرار دیا ہے۔ نویں صدی قبل مسیح میں آشوریوں نے آشور ناسر پال دوم (859-883) کے دور میں مفتوح قوم کے ساڑھے 40 لاکھ افراد کی از سر نو آبادکاری کی۔ بلاشبہ آشوری قوم ایک مستقل پالیسی کے طور پر بڑے پیمانے پر نسلی صفائے کی خواہاں تھی۔ مشرق وسطی میں یہ روش آنے والی کئی بادشاہتوں میں برقرار رہی۔ اس وقت اس کا بڑا مقصد بغاوت کا سدباب کرنا تھا۔ (Ibid: 7-10) قرون وسطی میں علاقے کو خالص بنانے کے عمل میں منحرف گروہوں کی بغاوت کے خوف سے زیادہ مذہب کا عنصر نمایاں تھا جس کا نتیجہ مذہبی بنیادوں پر ریاست کی طرف سے صفائے کی صورت میں نکلا (Ibid:11)۔

اس تناظر میں ہم پندرہویں صدی میں ہسپانیہ سے مسلمانوں اور یہودیوں کی بے دخلی کی مثال دے سکتے ہیں۔ جہاں کیتھولک چرچ کو خالص کرنے کے لیے نہایت جذبے اور عظیم عزم کے ساتھ معاشی پہلو سے یہ کام کیا گیا (Mann,2005: 45-48)۔ اس قسم کی کوششیں ہم اسلامی دنیا میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ سولہویں صدی کے آغاز پر ایران میں صفویوں کی حکومت قائم ہوئی اور انہوں شیعیت کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا جس کے تحت ضروری تھا کہ سنی العقیدہ افراد یا تو اپنا عقیدہ تبدیل کر لیں یا ملک چھوڑ دیں۔ چنانچہ جہاں کئی افراد نے شیعہ عقیدہ قبول کر لیا وہاں بہت بڑی مقدار میں غیر شیعہ مسلمان ہمسایہ ملک افغانستان اور برصغیر کو نقل مکانی کر گئے۔ اسی طرح صلاح الدین ایوبی کے دور میں مصر اور شمال افریقہ میں شیعہ مسلمانوں کو جبراً عقیدے کی تبدیلی قبول کرنا پڑی۔ بیل فیالکوف کہتے ہیں کہ کسی آبادی کی جبری نقل مکانی کو 'صفایا' قرار دینے کے لیے اسے اضافی طور پر کسی امتیازی خاصیت پر مبنی ہونی چاہیے جو اسے غیر مطلوب بناتی ہو۔ ان کا موقف ہے کہ آبادی کے صفائے کا زیادہ غیر جانبدار تصور یہ ہے کہ کسی علاقے سے مخصوص گروہ کے افراد کی اراد تاً بے دخلی۔ وہ نسلی صفائے کے لیے طاقت کے

استعمال کو ضروری جزو نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اگر کسی جگہ پر دو یا زائد گروہ پر امن طریقے سے نہیں رہ سکتے تو ان کے انخلا کے لیے کوئی فارمولا تیار کرنا چاہیے۔ (کیسا فارمولا اور کس بنیاد پر، اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہتے)۔ البتہ ان کی بحث کا اہم نکتہ یہ ہے کہ کسی علاقے میں لوگوں کے صفائے میں ریاست اور اس کے عمال کا بھی کردار ہوتا ہے۔ وہ آگے جا کر لکھتے ہیں:

آبادی کا صفایا کسی علاقے سے غیر مطلوب گروہ جو مختلف مذہبی، لسانی، نسلی، جنسی یا طبقاتی شناخت رکھتا ہو کا منظم اور ارادتاً انخلا ہوتا ہے۔ یہ وجوہات صفائے کی تعریف پر پورا اترنے کے لیے ناگزیر ہیں (Bell-Fialkoff, 1999: 3)۔

اسی موضوع پر اپنی ممتاز تحقیق میں مائیکل مان (2005) قرار دیتے ہیں کہ جدید دور میں یہ روایت 'جمہوریت کے سیاہ رخ' کی نشاندہی کرتی ہے۔ نسلی صفایا وہاں ہوتا ہے جہاں نسل پرستی طبقے کی سماجی تقسیم کی بڑی شکل ہوتی ہے اور اس عمل میں نسلی قوم پرستی کے طبقات جیسے جذبات پیدا اور مربوط کیے جاتے ہیں۔ یہ دراصل اکثریت کی حکمرانی یا لوگوں کے اقتدار کے تصور کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جسے غلط فہمی کی بنیاد پر نسلی گروہ کی طاقت سمجھ لیا جاتا ہے۔ جب دو یا دو سے زائد نسلی گروہ ایک ہی علاقے پر ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہاں صرف اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس کا نتیجہ خونیں نسلی صفائے کی صورت میں نکلتا ہے۔ منظم تشدد کو جمہوریت کی مخصوص نسلی قوم پرست شکل سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ یوں جمہوریت کا ایک نسلی پہلو بھی سمجھا جاتا ہے اور کمزور گروہ کو قتل عام کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ مائیکل مان کا یہ مشاہدہ اہمیت کا حامل ہے تاہم وہ کتاب کے تصوراتی فریم ورک میں نسل پرستی (ایک ہی نسل اور ثقافت کا حامل گروہ) نسل کشی (کسی گروہ کی ثقافت کی تباہی) قتل عام (اکثریت کی طرف سے ارادتاً اقلیت کی ہلاکت) اور نسلی صفائے میں مزید تفریق کرتے ہیں۔ لگتا ہے کہ مصنف نسلی صفائے اور قتل عام کو باہم تبدیل ہونے والی اصطلاحات سمجھتا ہے بالخصوص جب نسلی صفایا 'خونیں نسل کشی' بن جاتا ہے۔ بلاشبہ نسلی صفائے اور قتل عام کے درمیان فرق کرنا اتنا آسان نہیں۔ اس پر بحث ہم اب کریں گے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ انیسویں صدی میں جب سے قوم پرستی عالمگیر مظہر کے طور پر ابھری ہے تو انتہائی قوم پرست جماعت یا تحریک کی طرف سے ریاست اور قوم کے درمیان اتفاق رائے کے لیے طاقت کے استعمال کا نتیجہ نسلی صفائے کی صورت میں نکلا ہے۔ جس بات پر بیشتر محققین زور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ نسلی صفائے کا عمل ریاستی حکام کی ملی بھگت کے بغیر ممکن نہیں جو یہ چاہتے کہ اپنے ملک سے ایسے افراد کو نکال باہر کریں جن کو وہ مذہب، نسل یا زبان کی بنیاد پر اجنبی یا غیر مطلوب سمجھتے ہیں۔ امریکی صحافی رائے گٹ مین (1993) کی رائے ہے کہ سربیا کے انتہائی قوم پرست عناصر نے 'نسلی صفائے' کی اصطلاح ایجاد کی جس کا مطلب 93-1992 میں کروشیائی باشندوں بالخصوص مسلمانوں کا بوسنیا ہرزیگوینا سے منظم انخلا، جنسی زیادتی، قتل، جلاؤ گھیراؤ کے واقعات پر پردہ ڈالنا ہے۔ اس دورانیے میں تقریباً دو سے ڈھائی لاکھ مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اور اس سے کہیں زیادہ تعداد میں لوگوں کو آبائی گھروں سے محروم کر دیا گیا۔ ابھی تک تاریخ اور مذہبی عقیدے کی متنازع تعریفوں کے برعکس باہمی شادیوں کے ذریعے مخصوص قسم کا نسلی اختلاط وقوع پذیر ہوا ہے اور کمیونسٹ علاقے میں یہ اختلاط عالمگیر اقدار اور نظریاتی تصورات کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ سربیا کے قوم پرستوں نے اپنے قہر کو اپنی

مشترکہ شناخت کے تمام آثار مٹانے کے لیے استعمال کیا۔ بلاشبہ ان کا ارادہ اپنے علاقے سے اجنبی افراد کا نام ونشان مٹا کر 'خالص' سرب قوم کو ابھارنا تھا۔

قتل عام

نسلی صفائے کی طرح قتل عام Genocide کی اصطلاح قدیم نوعیت کی حامل ہے اور اتنی ہی انسانی تہذیب پر بدنما داغ ہے۔ اس اصطلاح کا پہلی بار پولینڈ کے قانون دان رافائیل لیمکن نے 1944 میں ایک قوم یا نسلی گروپ کی تباہی کے طور پر کیا۔ قتل عام کا قانونی حوالہ پہلی بار نورم برگ کیس (47-1945) میں دیا گیا جس کا مقصد دوسری جنگ عظیم کے دوران اور بعد میں پولینڈ کی نازی پارٹی کے ارکان کی طرف سے سویلین آبادی یا نسلی، لسانی اقلیتوں کے بڑے پیمانے پر قتل عام کے ذمہ داروں کو سزا دینا تھا۔ اسی عرصے کے دوران جاپانی فورسز کے چین اور جنوب مشرقی اور مشرقی ایشیا کے مفتوحہ علاقوں میں مظالم میں ملوث اہم حکام پر مقدمہ چلا کر سزا دی گئی۔ جینو سائیڈ کے تصور کو بین الاقوامی قانون میں شناخت 9 دسمبر 1948 کو اقوام متحدہ کے قتل عام کے تدارک اور سزا کے موضوع پر کنونشن میں دی گئی۔ (اس معاہدے کے رکن ممالک نے 1951 میں کنونشن کی توثیق کی)۔

جینو سائیڈ کنونشن میں قتل عام کی تفصیلی تشریح کی گئی ہے جو مذہبی، لسانی، نسلی یا قومیتی گروپ کو ارادتاً قتل کرنے کے درج ذیل عوامل سے عبارت ہے:

ا۔ مخصوص گروہ کے افراد کو قتل کرنا۔
ب۔ اس گروہ کے افراد کو شدید ذہنی یا جسمانی نقصان پہنچانا۔
ج۔ اس گروہ کی مکمل یا جزوی تباہی کے لیے ارادتاً حالات پیدا کرنا۔
د۔ اس گروہ کی آبادی میں اضافہ روکنے کے اقدامات کرنا۔
ہ۔ اس گروہ کے بچوں کو اس جگہ سے زبردستی کسی اور مقام پر منتقل کرنا۔

فرانک چاک اور کرٹ جوہانسن (1990) Franck Chalk and Kurt Johansson نے قبل از تاریخ دور میں بھی خانہ بدوش اور مقامی دہقان افراد کے درمیان پر تشدد قتل عام کا سراغ لگایا ہے۔ چنانچہ مفتوحہ افراد کو یا تو ہلاک کر دیا گیا یا غلام کے طور پر فروخت کر دیا گیا۔ اس کا مقصد اپنے لیے خطرے کا خاتمہ کرنا تھا۔ ان مصنفین نے آشوریوں کی زیادتیوں کو قتل عام کے اقدامات قرار دیا ہے جبکہ بیل فیالکوف اس مظہر کو نسلی صفایا کہتے ہیں۔ قتل عام یا نسل کشی کی دیگر وجوہات میں کسی گروہ کو دہشت زدہ یا مغلوب کرنا بھی شامل ہیں۔ منگول جنگجو سردار چنگیز خان کو اس تکنیک کا بادشاہ قرار دیا جاتا ہے۔ نسل کشی کی ایک تیسری قسم معاشی دولت پر قبضہ کرنا ہے۔ یہ کام بھی ماضی بعید میں کیا گیا۔ چوتھی قسم اپنے عقیدے، نظریے یا تصور کو زبردستی مسلط کرنا ہے۔ یہاں متاثرہ افراد بیرونی عناصر نہیں اسی گروہ کے ارکان ہوتے ہیں۔ اس کا استعمال بدعتیوں یا سماجی نفرت

کی ملامت یعنی جادوگروں کے خلاف کیا جاتا ہے۔ جنہیں ہزاروں کی تعداد میں چرچ کے کرتا دھرتاؤں نے نذرِ آتش کر دیا۔ کسی قوم یا ریاست کی تشکیل کے دوران ان چاروں اقسام کا استعمال کیا جاتا ہے(Ibid: 33-40)۔

نسلی صفائے اور نسل کشی میں فرق کرنا

مخصوص تاریخی صورتحال میں یہ فرق کرنا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا کہ ایک علاقے سے غیر مطلوب افراد کو نکال باہر کیا جائے یا انہیں جسمانی طور پر صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ عملی معنوں میں تشدد میں شدت اس وقت آ سکتی ہے جب کوئی متاثرہ گروہ بحفاظت متعلقہ ملک تک پہنچنے میں ناکامی پر جابر گروہ کی مزاحمت کرتا ہے۔ ایسے تمام حالات میں نتیجہ سنگین قتلِ عام کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ دوسری صورت میں جہاں ایک ناپسندیدہ گروہ کو طبعی طور پر مٹانا مقصود ہو وہاں ممکن ہے یہ کام کرنے کی خواہاں ایجنسی کے پاس منصوبے پر عملدرآمد کے لیے درکار وسائل یا صلاحیت موجود نہ ہو۔ اس طرح مقہور گروپ بحفاظت سرحد پار کر کے محفوظ علاقے کی طرف جا سکتا ہے۔ نسل کشی اور نسلی صفائے کے تمام کیسوں میں ہتھیاروں اور ٹیکنالوجی کی قسم اہم کردار ادا کرتی ہے۔ حتیٰ کہ نسل کشی کے سب سے بدنام واقعے۔ یعنی یہودیوں کا ہولوکاسٹ۔ کو بعض سکالر سمجھتے ہیں کہ اس کا مقصد شروع میں یہودیوں کو جرمنی اور یورپ سے صرف بیدخل کرنا تھا لیکن جب غیر ہمدرد ملکوں نے یہودیوں کو پناہ دینے سے انکار کر دیا تو اس کا نتیجہ نسل کشی کی صورت میں نکلا(Gellately, 2003: 246-52; Melson 1992)۔ جہاں تک نظریاتی پہلو ہے تو اس اقدام کا مقصد یہودیوں کو بالآخر دیدِ غیر مطلوب نسل کے طور پر مہاجر حیثیت دینا تھا۔ لہٰذا ان کو کیمپوں میں منظم طریقے سے جمع کرنے سے اس بات کا اشارہ ملتا تھا کہ نسل کشی کا اصل ارادہ عملی شکل اختیار کرنے والا تھا (Lang, 2003)۔ اس لیے اس ایجنڈے کا اندازہ نظریاتی بیانات اور پراپیگنڈے سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن نسل کشی کو اکثر انتہائی خفیہ رکھا جاتا ہے اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے نسلی صفائے کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ کچھ دانشور یہ نہیں سمجھتے کہ قتلِ عام اس وقت کہلاتا ہے جب اس کا ارادتاً اعلان کیا جاتا ہے بلکہ وہ صرف نتیجے پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب کسی گروہ کا بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا جائے تو اس بربریت کو نسل کشی کہتے ہیں(Jonassohn and Björnson, 1999)۔

اس تناظر میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ موجودہ ریاستی حدود کے اندر اقتدار کی شراکت پر مذاکرات میں مکمل طور پر ناکامی کے بعد امن و امان کی مکمل تباہی کے نتیجے میں نسل کشی یا نسلی صفائے کا عمل شروع ہو سکتا ہے۔ بالالفاظ دیگر نسل کشی یا نسلی صفائے کا عمل کسی ثالثی کے تحت ہونے والے مذاکرات نہیں بلکہ ناکام مذاکرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی بھی صورت میں یہ بات اہم ہے کہ نسل کشی یا نسلی صفائے کی تعریف کو ایک دوسرے سے دور رکھنا چاہیے۔ نسلی صفائے کو مسابقتی قوم پرستی کے قابلِ فہم مضمرات سے متعلق وسیع اصطلاح کے معنوں میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا زیادہ تر تعلق جارح گروپ اور اس کے ریاست اور قوم سازی کے عزائم سے ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں نسلی قتلِ عام کا مقصد کسی گروہ کو اپنے علاقے سے جبراً بے دخل کرنے سے زیادہ ان کو صفحہ ہستی سے مٹانا ہوتا ہے۔ البتہ جیسا کہ اوپر بحث کی گئی ہے دونوں کے درمیان سرحد دھندلا سکتی ہے اور ایسے افراد کو جبری بے دخلی، قتلِ عام اور نسلی صفائے تینوں عمل سے گزرنا پڑ سکتا ہے اور نسلی صفائے کو نسلی قتلِ عام کے درمیان فرق کو اس تعریف سے الگ کیا جا سکتا ہے:

نسلی صفایا کم و بیش ایسا مربوط جبر ہوتا ہے جو ایک مخصوص علاقہ غیر مطلوب افراد اور گروپ جو نسلی، مذہبی، فرقہ وارانہ اور ایسے دیگر عوامل کے لحاظ سے مختلف ہوں سے خالی کرانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگرچہ پر امن طریقے سے ایک آبادی کی بید خلی سے بھی نسلی صفایا ممکن ہو سکتا ہے لیکن ایسا بندوبست ہاتھ میں نہیں رہتا بلکہ اس مقصد کے حصول کے لیے دہشت، آگ لگانے، جنسی زیادتی اور دیگر انتہاپسند طریقے بھی وسیع پیمانے پر استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اس کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ غیر مطلوب افراد اکثر آبائی علاقے سے جبری انخلا کی مزاحمت کرتے ہیں جبکہ نسلی قتل عام میں نسلی صفائے سمیت آبادی کی تباہی کے کام شامل ہوتے ہیں۔ نسلی صفائے کے تحت ایک علاقے سے پوری آبادی کا مکمل انخلا عمل میں لایا جاتا ہے۔

گروہوں میں تصادم کیوں ہوتا ہے اور یہ پر تشدد انداز کب اختیار کرتا ہے؟

چونکہ ہجرت، نسلی صفایا اور نسل کشی بنی نوع انسانی کے ہولناک غلط اقدامات ہیں اس لیے ہمیں نفسیاتی سماجی وضاحت کی ضرورت ہے کہ گروہ کیسے بنتے ہیں اور ان میں نفرت کب بیدار ہوتی ہے اور یہ آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نسلی صفائے اور نسلی قتل عام کے حالات کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔ فرد واحد سے بحث کا آغاز کریں تو ہمیں معلوم ہے کہ انسان عموماً دوسرے انسانوں کی صحبت پسند کرتا ہے اور مشترکہ شناخت احساس تحفظ کے لیے یکجہتی کی تقسیم میں نفسیاتی اور جذباتی ضرورت پوری کرتی ہے۔ قبیلہ، زبان، ایک نسل، مذہب، ذات، رنگت یقیناً وہ عوامل ہیں جن سے اجتماعی شناخت وجود میں آتی ہے اور یہ عمل موجودہ دور میں بھی جاری ہے۔ ایک ہی شناخت کی طرف رجحان بیرونی افراد (یعنی دیگر گروہوں) کی بید خلی کی راہ ہموار کرتی ہے۔ اس قسم کی شناخت اور گروہ بندی تقریباً تمام انسانی معاشروں میں پائی جاتی ہے چاہے ان کی ترقی اور گروہ بندی کی سطح کوئی بھی ہو (Ahmed,1998: 4)۔ سائنسی اصطلاح میں گروہ صرف افراد کی مجموعی تعداد کا نام نہیں بلکہ ان کی اپنی شخصیت اور شناخت ہوتی ہے اور گروہ کی بقا افراد سے تعلق کے تناظر میں دیگر گروہوں اور ان کے افراد کی بقا سے مسابقت کی حامل ہوتی ہے۔ البتہ گروہ پھلتے پھولتے ہیں اور آبادی میں اضافے، بیماری اور شکست وغیرہ جیسے عوامل میں باہم مربوط ہوتے ہیں۔

اب انفرادی اقدام شاذونادر ہی ریاست اور معاشرے سے مطالبہ کرنے میں کافی موثر ثابت ہو سکتا ہے چنانچہ انسان ان دونوں سیاسی مقاصد کے حصول اور الگ ریاست یا آزادی کے لیے اجتماعی کاوش کو ترجیح دیتے ہیں تاہم یہ سوال بدستور موجود رہتا ہے کہ: کیا گروہ بندی ایک رضاکارانہ چوائس ہے یا پھر افراد مختلف گروہوں میں پیدا ہوتے ہیں اور وہاں مستقل طور پر رہتے ہیں۔ معاشرتی علوم کے لٹریچر سے گروہ بندی اور شناخت کے دو مخالف مقاصد کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہیں، بنیادی نوعیت والی گروہ بندی Primordialists یا انسٹرومینٹلسٹ Instrumentalist یعنی عملی نوعیت والی گروہ بندی۔ بنیادی گروہ بندی والے یہ دلیل دیتے ہیں کہ نسلی مرکز پسندی انسانوں کے لیے فطری امر ہے۔ افراد رنگ، نسل، قبیلے کی مشترکہ خصوصیات کی بنیاد پر ہمیشہ گروہ بناتے آئے ہیں۔ یہ گروہ مختلف تاریخی تناظر میں اپنی بقا کو درپیش چیلنجوں کی بنا پر اپنی شناخت اور نسل پرستی کو فروغ دیتے ہیں (Connor,1994; Geertz,

1963; Shils, 1957)۔ یوں گروہ کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ایسے تجربات کی اجتماعی یاداشت ایسی حکمت ہائے عملی کی تیاری کا نکتہ حوالہ بن جاتا ہے۔ ایسے نکتہ نظر میں نسلی مرکز پسندی اور قبائلیت انسانی فطرت کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ گروہوں کا بنیادی تعلق سے عبارت طاقتور نظریہ جو سوشیو بیالوجی کہلاتا ہے نسلی قوم پرستی کے نارمل ہونے سے عبارت ہے۔ اس میں متحارب گروہوں کے درمیان دیرپا امن کا منفی رجحان پایا جاتا ہے، ایسے دلائل زیادہ شدت سے یہ بتاتے ہیں کہ انہیں علیحدہ کرنا اور انہیں خاص قوم-ریاست کے روپ میں ڈھالنا امن کے تحفظ کا بہترین طریقہ ہے (Kecmanovic, 1996; Kellas, 1998: 13-14)۔ البتہ امتیازی حیثیت کے حامل گروہوں کے لیے الگ ریاستوں کے اصول کا مطلب ہوگا دنیا بھر میں پائے جانے والے آٹھ ہزار سے زائد نسلی گروہوں کے لیے ہزاروں ریاستوں کا قیام۔

اس کے برعکس انسٹرومینٹلسٹ طبقہ یہ کہتا ہے کہ شناخت ایک سیال حیثیت کی حامل اور لچکدار ہوتی ہے لہٰذا اس کی کوئی مستقل سرحد نہیں ہوتی۔ اشرافیہ اور اشرافیہ کے دھڑوں میں اختیارات اور وسائل پر کھینچا تانی کی بجائے نئی شناخت کی تخلیق کے لیے (اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے) سیاسی عناصر مشترکہ ثقافتی عوامل کو ایکسپلائٹ کرتے ہیں (Brass, 1991; Steinberg 1981; Young 1976)۔ اس تناظر میں نسلی شناخت محض ایک سیاسی آلہ ہے اور انسانی فطرت کا لازمی جزو یا معروضی نہیں۔ ایسا تب ہوتا ہے جب سیاسی رہنما نام نہاد معروضی عوامل کو استعمال کرتے ہیں اور ثقافتی گروہوں کو جارحانہ پراپیگنڈے سے متحرک کرتے ہیں۔ یوں وہ اپنے اختلافات کے بارے میں موضوعاتی آگاہی حاصل کر لیتے ہیں اور تنازعات میں گھر جاتے ہیں۔ یہ طبقہ شناخت کو تعمیری انداز میں لیتا ہے (اگرچہ ایجاداتی نہیں) اس نکتہ نظر سے نسل پرستی کوئی آزادانہ کردار نہیں رکھتی اور صرف وسیع تر سیاسی پیرائے میں اس کا کوئی مطلب نکلتا ہے۔ یہ نظریے اور معاشی مفادات جیسی دیگر سیاسی وابستگی سے مختلف نہیں ہوتا۔ انسٹرومینٹلسٹ سوچ کو شناخت کی منطقی نوعیت سے صرف نظر کرنے پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شناخت تقریباً کبھی یک پہلوی نہیں ہوتی۔ ہر فرد کئی کئی شناختیں رکھتا ہے اور یہ تناظر وضاحت کرتا ہے کہ کون سا فیکٹر مخصوص وقت میں متعلقہ ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص زبان اور نسل کے لحاظ سے پنجابی ہو سکتا ہے جبکہ موروثی مذہبی وابستگی کے لحاظ سے مسلمان اور موروثی فرقہ وارانہ وابستگی کے لحاظ سے مسلم کمیونٹی کے اندر سنی العقیدہ ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص جو تمام پنجابی بولنے والوں کی گروہ بندی کرنا چاہتا ہے وہ اس شخص کو بھی شامل کرے گا اور یوں اس کی شناخت بطور پنجابی کرے گا۔ البتہ اس کے لیے اس کا مذہب یا فرقہ بذات اس سے بھی زیادہ اہم ہو سکتی ہے یا متبادل طور پر دیگر پنجابی بولنے والے اس حقیقت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیں گے کہ وہ شخص ان کی زبان کا مقامی مقرر ہے۔ وہ اسے کسی اور گروہ میں شامل کرنا پسند کر سکتے ہیں۔ اس طرح انفرادی شناخت منطقی ہوتی ہے اور حالات وواقعات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اعتماد اور یکجہتی کی قسم بھی مختلف صورتحال میں بدل سکتی ہے۔

اسی منطق کو نسلی گروہوں کی کثیر الجہتی اور منطقی نوعیت تک توسیع جا سکتی ہے۔ ان کے درمیان ربط حالات کے مطابق ہوگا اور اس کی اہمیت بھی تناظری ہوگی اور ان کی وابستگی کی اہمیت بھی مختلف اوقات اور مقامات پر مختلف ہوگی۔ جیسا کہ یورپی معاشروں میں ایک وقت میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ انفرادیت تباہ کن تھی تاہم سیکولر معاشروں میں اس کی شدت

اتنی زیادہ نہیں نظر آئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسیحی الگ شناخت سے دستبردار ہو گئے ہیں لیکن یہ انفرادی حیثیت امتیازی شہریت کی صورت میں سامنے نہیں آتی یا کسی ایک گروپ کی دوسرے گروپ کے خلاف قانونی کارروائی کے طور پر اس کا نتیجہ نہیں نکلتا۔ شمالی آئرلینڈ میں پائی جانے والی تفریق گاہے بگاہے پر تشدد کشیدگی کی شکل میں سامنے آتی رہتی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اگر شراکت اقتدار وہاں مستحکم ہو جاتی ہے تو ان کے مذہبی اختلافات شاید پر تشدد تصادم کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔

یہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے کہ نائن الیون 2001 کے امریکہ میں دہشت گردانہ حملے وہاں عیسائیوں اور مسلمانوں میں کشیدگی کا موجب بنے اور باہمی شکوک و شبہات نے جنم لیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی دنیا کے اندر تمام مسلمانوں نے باہمی یکجہتی کو فروغ دینا شروع کر دیا ہے۔ تیل کی دولت سے مالا مال عرب ریاستوں میں ہم مذہب مسلمان کارکنوں کے ساتھ بدنام زمانہ برے سلوک سے مسلمانوں میں ہم آہنگی کے نام نہاد تصور کا با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کو پاکستان سے مسلمان گروپوں کے دہشت گردانہ حملوں کا خوف ہوتا ہے لیکن خود ہندوؤں کے اندر علاقائی اور ذات برادری کے اختلافات بدستور فروغ پاتے رہتے ہیں۔ شمالی بھارت کے مہاجرین پر ممبئی میں انتہا پسند شیو سینا کے حملے مہاراشٹری قوم پرستی کی ایک مثال ہے۔ چنانچہ گروہ کی شناختوں کی تناظری، کثیر پہلوی اور تعلقاتی نوعیت ذہن نشین رکھنا اہم ہے۔ یہاں تک کہ تقسیم سے پہلے کے پنجاب میں مذہبی اختلافات گروہوں کی شناخت کا منظم پیمانہ نظر آتا ہے۔ دیگر الفاظ میں 1947 میں فرقہ وارانہ ہلاکتوں کے ٹھوس ثبوت سے قطع نظر یہ ماننے میں کوئی امر مانع نہیں کہ ایسا خونیں نتیجہ ناگزیر تھا۔

نسلی تصادم کا تناظر

یہ اخذ کر کے کہ نسل پرستی کی نوعیت تعلقاتی ہے تو وہ حالات یا تناظر جن میں پر تشدد تصادم وقوع پذیر ہوتا ہے بھی اہم ہیں۔ شناختوں کے تنوع کا مطلب خود بخود یہ نہیں کہ ان کے درمیان تصادم ہو گا۔ ڈیوڈ اے لیک اور ڈونلڈ روتھس چائلڈ David A. Lake and Donald Rothschild نے ان معاشرتی حالات کا تذکرہ کیا ہے جن میں نسلی تصادم انتہائی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نسلی تصادم، گروہوں کے درمیان اختلافات، دیرینہ نفرتوں اور صدیوں پرانی عداوتوں کے باعث براہ راست وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ ہمارا یہ موقف ہے کہ نسلی تصادم زیادہ تر مستقبل کے اجتماعی خوف سے ہوتا ہے۔ جیسے ہی کوئی گروہ جسمانی تحفظ کے لیے خطرہ محسوس کرتا ہے تو خطرناک اور مشکل سٹریٹیجک الجھنوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو اپنے اندر تشدد کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ جیسے ہی اطلاعات کا عمل ناکام ہوتا ہے تو قابل یقین عزم اور سکیورٹی کی الجھن کا مسئلہ سر اٹھا لیتا ہے۔ ریاست کمزور ہو جاتی ہے، یہ گروہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور تصادم کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ نسل پرستی کے ہرکارے اور سیاسی عناصر جو ان گروہوں کے درمیان سرگرم ہوتے ہیں وہ جسمانی عدم تحفظ ثقافتی غلبے اور قطبی

معاشرے کے خوف کو دوبارہ اجاگر کرتے ہیں۔ سیاسی یادیں، دیومالائیں اور جذبات خوف کو جلا بخشتے ہیں۔ نتیجتاً گروہوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ گروہوں کے درمیان اور گروہوں کے اندر سٹریٹجک تعلق بداعتمادی اور شکوک و شبہات کی مہلک صورتحال پیدا کرتا ہے جو ہلاکت انگیز تشدد کا شاخسانہ ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک گروہ کے ہاتھوں دوسرے گروہ کا منظم انداز میں قتل عام بھی ہو سکتا ہے(1998:4)۔

دونوں مصنفین زور دیتے ہیں کہ ایسی بیمار صورتحال نہ صرف افراد، گروہوں بلکہ ان کے لیڈروں کو بھی پھانس لیتی ہے (Ibid: 3-23)۔ تاریخی اعتبار سے ہر کیس میں صورتحال مختلف ہو سکتی ہے لیکن پنجاب کے تناظر میں ڈیوڈ لیک اور ڈونلڈ روتھس چائلڈ کی تعریف 1947 کی صورتحال کا زیادہ قریب سے احاطہ کرتی ہے۔

کثیر النوع معاشرہ

لیو کوپر (1982) نے کثیر النوع معاشرے Plural Society کا تصور یہ واضح کرنے کی ڈھانچہ جاتی اساس کے طور پر پیش کیا ہے کہ کس طرح بظاہر پرامن کثیر نسلی اور کثیر مذہبی معاشرے پرتشدد انداز میں پھٹ پڑتے ہیں اور قتل عام بھی ہوتا ہے۔ ایک کثیر النوع (Plural) معاشرہ وہ ہوتا ہے جو قابل شناخت گروہوں پر مشتمل ہوتا ہے اور جہاں ان گروہوں میں مستقل اور نفوذ پذیر تقسیم پائی جاتی ہے۔ یہ تقسیم نسلی اور مذہبی اختلافات سے جنم لیتی ہے۔ اکثر اوقات ان فاصلوں کے ساتھ سیاسی پس منظر میں عدم مساوات، معاشی ترقی اور مواقع کے عناصر بھی منسلک ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندو اور سکھ ایک کنویں سے جبکہ مسلمان دوسرے کنویں سے پانی بھریں گے۔ اچھوت بھی مختلف کنویں استعمال کریں گے۔ ہندوؤں کی طرف سے کھانے پینے کے سخت قواعد کے باعث وہ عموماً مسلمانوں کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے۔ حتیٰ کہ قدامت پسند سکھ بھی جو سبزی خور ہوں مسلمانوں کے ساتھ کھانا پسند نہیں کرتے (Ibid: 57-59)۔ ایسے اختلافات کو بظاہر مروجہ ضابطہ اخلاق کے طور پر قبول کیا جاتا ہے جن کی بنیاد روایت ہوتی ہے اس لیے اس پر غصے کا اظہار نہیں ہوتا۔

ایسے معاشرے لمبے عرصے تک پرامن رہ سکتے ہیں لیکن درون خانہ وہ کسی بھی وقت پھٹ سکتے ہیں۔ نتیجہ کمزور گروہ کے قتل عام کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ لیو کوپر کا خیال ہے کہ کثیر النوع معاشرے نوآبادیاتی مداخلت سے پہلے بھی وجود رکھتے تھے لیکن نوآبادیاتی پالیسی اور تبدیلی کے عمل نے تلخ فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دی اور جب سامراجی طاقتیں واپس چلی گئیں تو یہ معاشرے ہلاکت آمیز تشدد کی شکل میں پھٹ پڑے۔

کوپر نے مزید لکھا ہے کہ ریاستی عمال کے ملوث ہوئے بغیر بڑے پیمانے پر قتل عام ممکن نہیں البتہ معاشرے کے عام ارکان بھی دشمن گروہوں اور اپنی بقا کے لیے خطرہ عناصر کو مٹانے میں سرگرم ہو سکتے ہیں۔ ایسا پنجاب کے معاملے میں بھی سچ نظر آتا ہے لیکن وہ حالات جن میں ایسے مایوس کن رویے سامنے آتے ہیں پر تحقیق کرنے اور انہیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ پنجاب کو کثیر النوع معاشرے کی خاص قسم قرار دیتے ہیں جو 1947 میں پرتشدد انداز میں پھٹ پڑا۔ البتہ انہوں نے بتایا کہ پنجاب کے تمام باسیوں نے مخالف گروہوں کے خلاف ظالمانہ کردار ادا نہیں کیا (Ibid: 65-67)۔

ابہام سے بچنے کے لیے ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ایک کثیر النوع معاشرہ کثرت پسند Pluralist معاشرے جیسا نہیں۔ کثرت پسند معاشرہ مثبت معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور مستحکم کثیر الثقافت معاشروں کا ہم مترادف ہے۔ ایسا معاشرہ شہریوں کے مساوی حقوق کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ وہاں ثقافتی اور فرقہ وارانہ تنوع ہوتا ہے اور اس کا صنعتی لحاظ سے بھرپور مغرب میں مابعد جنگ جمہوریتوں کی کامیابی کے طور پر خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ گویا کوپر کا کثیر النوع معاشرہ دراصل کثرت پسند معاشرے کے برعکس ہے۔

پنجاب ایک جامع، روایت پسند کثیر الثقافت معاشرہ

کچھ دانشور پنجاب کو کثیر النوع معاشرہ قرار دینے کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ بتاتے ہیں کہ مغلوں کے دور (1526-1857) سے پنجاب کی منفرد اور جامع شناخت ابھرنا شروع ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ مشترکہ ثقافت اور بقائے باہمی کی روایات تھیں جن پر کئی مذہبی گروہ معاشرتی روایت کے طور پر سختی سے کاربند تھے لیکن ایسا لگتا ہے کہ زبان اور مشترکہ تہواروں پر مشتمل مشترکہ ثقافت مذہب اور ذات کی تقسیم سے گہنا گئی (Ballard,1999: 7-24;Grewal, 2004:12)۔ دراصل بسا اوقات خاندانی رشتے ہمدردی کے جذبات پیدا کرتے ہیں جیسا کہ پنجاب کی بڑی زرعی برادری جاٹ ہے جو مسلمان اور سکھ دونوں تھے یا پھر راجپوت تھے جو بڑی تعداد میں مسلمان اور ہندو تھے لیکن یہ بات بحیثیت مجموعی درست نہیں۔ اس تعلق سے بغض اور لاتعلقی کے جذبات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اونچی ذات کے ہندو جن کے کچھ رشتہ داروں نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی فیکٹر پنجاب یا دیہات میں کلی طور پر لاگو نہیں کیا جا سکتا (Williams, 2004)۔ تقسیم سے قبل کے پنجاب کی جامع ثقافت کے بارے میں میری سوجھ بوجھ یہ ہے کہ یہاں کے تینوں بڑے مذاہب کی قومی سطح کی بیوروکریسی میں منظم موجودگی نہیں تھی۔ ان کے مبلغین بھی مقامی تھے جن کی اپنی کمیونٹی میں جڑیں تھیں۔ ان کا کردار زیادہ تر عبادت، شادی، پیدائش اور اموات کی تقریبات تک محدود تھا۔ اس کے علاوہ روحانی بزرگوں اور شیطانی قوتوں پر بھی بڑے پیمانے پر اعتقاد تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ لوگ اکثر مذہبی تقسیم کے باوجود دوسرے مذہب سے دعاؤں کے طلبگار ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ طبی شعبے کے ماہرین یعنی ہندوؤں کے وید اور مسلمانوں کے حکما دوسرے مذہب کے مریضوں کا بھی معائنہ کرتے تھے۔ یہ علاج بہت سستا تھا اور اکثر مفت بھی ہوتا تھا۔ یہ روایت اس وقت بھی برقرار رہی جب جدید تعلیم یافتہ ڈاکٹروں نے اپنی پریکٹس شروع کی۔ اس کے علاوہ اساتذہ۔۔۔ ہندو، سکھ، مسلمان، عیسائی۔۔۔ کو تمام شاگردوں کی طرف سے انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ قبل از تقسیم پنجاب کے معاشرے کی نامیاتی نوعیت نے لوگوں کو قدامت پسندی کی ناخوشگوار پابندی سے بچنے اور خوشگوار انداز میں دوستانہ طور پر رہنے میں مدد دی۔ اس طرح اگرچہ پنجاب کا معاشرہ کثیر النوع تھا جہاں مختلف برادریاں قابل شناخت تھیں وہاں یہ مشترکہ روحانی اور اخلاقی اقدار سے منسلک ثقافتی اور جذباتی رشتوں کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ نتیجتاً وہ عوامل جو جامع پنجاب کے اندر شکست وریخت کا باعث بنے ان کی جڑیں اشرافیہ کے رہنماؤں کے سیاسی عزائم میں تھیں۔ یہ شکست وریخت انتظامی ڈھانچے کی کمزوری سے منسلک تھی اور عام آدمی اس سے دور تھا۔

پال براس نے پنجاب میں بڑے پیمانے پر جانی ضیاع کو 'سزا دینے والا نسلی قتل عام' retributive genocide قرار دیا ہے۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ یہ عمل خالصتاً انتقام کی فطری خواہش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک طرف شناخت، وقار، ثقافت اور دوسری جانب مختلف کرداروں کی طرف سے منصوبہ بندی اور متنوع مقاصد کا پیچیدہ کھیل تھا۔ واقعات کا تسلسل طویل تھا اور مختلف موضوعات اور مقاصد نے انہیں مختلف انداز میں راغب کیا (Brass 2003: 77-97)۔

نسلی صفائے کا تصور

ہم نے ایسی صورتحال سے اپنی بحث شروع کی تھی کہ جس میں غیر یقینی، اضطراب، خوف اور شبہات مختلف مذاہب جو اپنے اختلافات کے معاملے میں حساس تھے کے تعلقات پر منفی اثرات مرتب کرنے لگے تھے۔ اگرچہ ان مذاہب کے درمیان کچھ مشترکہ ثقافتی اقدار بھی پائی جاتی تھیں۔ ایسے حالات جن میں مختلف گروہوں کے درمیان تعلقات پرامن انداز سے تشدد میں تبدیل ہوتے ہیں، میں تغیر ممکن ہے تاہم کچھ اہم عوامل جو انہیں پر تشدد تصادم کی طرف مائل کرتے ہیں وہ ایسے منفی تاریخی اور معاشی سماجی اور ثقافتی عوامل ہیں جن کے باعث پرامن بقائے باہمی مزید برقرار نہیں رہ سکتی۔ ایسے حالات میں سامنے آنے والے خطرات اور چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے ایک سطح کی تیاری ضروری ہو جاتی ہے۔ اگر دو یا دو سے زائد گروہ علاقے اور قومی حقوق کے دعویدار ہوں تو اس کے لیے مختلف گروہوں کے درمیان اتحاد قائم کیے جا سکتے ہیں۔ اگر انفرادی طور پر پائی جانے والی بے چینی کا ازالہ نہ کیا جائے تو خطرہ ہوتا ہے کہ ایسے افراد اپنے ہم مذہب یا ہم فرقہ عناصر سے ناتا جوڑ سکتے ہیں یا معاشرتی یکجہتی کے اظہار کے لیے کسی بھی بندھن میں بندھ سکتے ہیں۔ اکثر واقعات میں لیڈروں، کارکنوں اور کسی سطح پر تنظیمی ربط سمیت عملی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ افراد کو بڑے پیمانے پر متحرک کرنے کے لیے ان کی اجتماعی مساعی ضروری ہے۔

سیاسی مہم جوؤں اور نسل پرستی کے علمبرداروں کی طرف سے گروہی اضطراب گہرا ہو سکتا ہے

یہ کہنا ممکن ہے کہ کسی گروہ کے تمام ارکان خود بخود اضطراب محسوس کرتے ہیں یا اس گروپ میں شامل نسل پرست عناصر کا جتھہ اس گروہ کی وکالت کا اظہار کرتا ہے یا پھر 'سیاسی مہم جو' پر عزم رہنما اور دانشور جو ان کارکنوں کے جذبے کے شاید حامی نہ ہوں ان جذبات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ اس تناظر میں پراپیگنڈے بالخصوص افواہوں کے کردار کا جائزہ لینا ہوگا تاکہ پتہ چل سکے کہ کس قسم کی سرگرمیاں اور عمل اضطراب اور خوف پیدا کر رہے ہیں۔ اگر مخالفین ایسے پراپیگنڈے کے سدباب کے قابل نہ ہوں تو وہ گروپ جو مخالف گروپ میں خوف وہراس اور ہیجان برپا کرنے میں سبقت لے جائے وہ فائدے میں رہتا ہے۔ طویل انتخابی مہم سے زیادہ کوئی بھی اور طریقہ ایک دوسرے کے خلاف بے نتیجہ حکمت عملی میں کامیاب ثابت نہیں ہوگا۔ اسی طرح جانبدار پریس بھی ایسے حالات میں تباہ کن کردار ادا کر سکتا ہے (Tanwar 2006:8-15)۔

لہٰذا ہیجان خیز چنگھاڑتی اخباری رپورٹنگ اور مضامین خوف اور بے یقینی پھیلانے کا خطرناک ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں اور یوں تصادم کی راہ ہموار کر سکتے ہیں۔ اگر ریاست انتخابی مہم اور میڈیا رپورٹنگ کے ضابطہ اخلاق پر سختی سے عملدرآمد نہیں

کراتی تو 'دشمن' کو مطعون اور تباہ کرنے کے عمل نہایت موثر ثابت ہو سکتے ہیں اور پہلے سے زوال پذیر بد اعتمادی کا عمل تیز تر ہو سکتا ہے۔ ایسے عمل حریف گروہوں کے درمیان شراکت اقتدار کے لیے فریم ورک کی تیاری کے عمل کو سخت زک پہنچا سکتے ہیں۔ اجتماعی اثرات یہ ہو سکتے ہیں کہ گروہ یا افراد زیادہ عدم تحفظ محسوس کرتے ہیں۔ ایسی صورتحال کے بارے میں مجموعی بحث اختلافات اور تقسیم کو بڑھاوا دیتی ہے۔ اگر صورتحال بدتر ہو جائے تو معاہدے (اگر ہوں تو) ٹوٹنے لگتے ہیں یا نظر انداز کیے جاتے ہیں۔

یہ کہنا کافی ہے کہ موئثر قیادت کے بغیر کارکن یا عام افراد ایسے خدشوں اور اضطراب کو تحریک یا سرگرمیوں میں نہیں بدل سکتے جس سے خطرات کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سیاسی مہم جوؤں کے پاس اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے ایسے خوف کو بڑھانے یا استعمال کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھار ماضی کی اصل یا بناوٹی مشکلات یا تکالیف کو حالات خراب کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

البتہ سیاسی مہم جو اپنا اثر و رسوخ صرف موجودہ نیٹ ورک یا سماجی ذرائع سے استعمال کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ایسے رابطے اس سطح تک فروغ پا سکتے ہیں جہاں وہ ایک صورتحال کو ایکسپلائٹ کر سکتے ہیں۔ یوں گروپ لیڈر گروہ کے ارکان پر اپنا اثر و رسوخ اور اختیار استعمال کر سکتے ہیں۔ عام طور پر یہ ایسے حالات ایجاد نہیں کرتے جو تصادم کا ماخذ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی مخصوص حالات کو استعمال کرتے ہوئے اسے تشدد کی طرف لے جانے کی صلاحیت کا انحصار معروضی حالات پر ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ صورتحال ان کے قابو سے باہر ہو جائے۔ بے یقینی کے ایسے تناظر اور صورتحال میں لیڈروں اور ان کے گروپوں کے عمل اور رد عمل کے ارادتاً اور غیر ارادی دونوں قسم کے نتائج و عواقب کے حامل ہو سکتے ہیں۔ جیسے جیسے صورتحال آگے بڑھتی ہے تو متحارب گروہوں کے درمیان ابلاغ بری طرح متاثر ہونے لگتا ہے۔

گروہوں کے درمیان ابلاغ کی ناکامی

رابطوں کی ناکامی اور اعتماد کے فقدان سے متحارب گروہوں کے درمیان تلخ تعلقات میں شدت آجاتی ہے۔ جب سیاست کا معمول کا انداز کافی نہیں ہوتا اور ایکشن کی خطرناک اقسام جنم لیتی ہیں تو وہ مختلف انداز میں نسلی گروہوں اور بلاشبہ افراد پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کچھ خود کو طاقتور اور برتر محسوس کرتے ہیں جبکہ بعض دیگر کمزوری اور لاچارگی۔ اس سب کا انحصار سیاق و سباق یا تناظر پر ہوتا ہے۔ جب جاری سیاسی مسابقت بند کمروں سے باہر عوام میں آجاتی ہے تو تصادم اور کشیدگی کو کم کرنے کا آزمودہ طریقہ کار بتدریج غیر موثر ہو جاتا ہے۔ غیر یقینی سیاسی مستقبل کے تناظر میں ایسا مجموعی اثر کافی زیادہ اور غیر مطابق ہو سکتا ہے۔ چاہے تشدد نہ ہو یا کم شدت کا ہو مظاہرے، جلوس اور نعرے بازی یہ سب ایسے دور میں مختلف معانی کے حامل ہوتے ہیں۔ جو چیز ایک گروہ کے نزدیک سیاسی عدم اطمینان کے اظہار کا پرامن اور جائز طریقہ ہو سکتا ہے وہ مخالف گروہ کے نزدیک خطرناک ہو سکتا ہے (Tanwar 2006: 8-15)۔

نتیجتاً حتمی نتائج حریف فریقوں کی طرف سے مقرر کیے گئے اہداف سے بہت مختلف ہو سکتے ہیں۔ دیگر الفاظ میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ نسلی صفایا یا نسلی قتل عام ہی مطلوبہ مقصد اور ہدف ہونا چاہیے لیکن اعتماد کے فقدان کی صورت میں ایک مخصوص

علاقے کی سرحدوں کے اندر شراکت اقتدار یا امن یا آبادی کے پرامن انتقال کے لیے مذاکرات میں ناکامی ایک متحرک عمل میں بدل سکتی ہے جس کے نتائج سماجی یا سیاسی عناصر کے قابو میں مزید نہیں رہیں گے۔ اس کا نتیجہ تشدد یا جوابی تشدد پھوٹنے کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

طوائف الملوکی اور شورش

جب ریاستی انتظامیہ بتدریج غیر موثر، متعصب اور فریق بن جاتی ہے تو طوائف الملوکی سر اٹھالیتی ہے۔ تب افراد اور گروہوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے طور پر اپنی بقا کے لیے اقدامات کریں۔ جیسے جیسے زندگی کے لیے خطرات حقیقی اور ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ سماجی سرمائے اور ہم آہنگی میں مزید کمی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر متصادم گروہ مفادات کے سماجی تحفظ کے لیے متعصبانہ طور پر متوازن اور انتہائی پر عزم ہوں تو اس مرحلے پر تشدد کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اکثر ایسی صورتحال رد عمل کی سیاست کو جنم دیتی ہے۔ یہاں رد عمل کو دو معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک تو میکانیکی عمل - رد عمل تعلقات اور اس کے ساتھ سوچنے کا جاہلانہ انداز دو سرا دو یا دو سے زائد نسلی گروہوں کی طرف سے ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ۔ ایسی صورتحال میں اندرونی رد عمل وقوع پذیر ہوتی ہے۔ جیسے جیسے صورتحال خراب ہوتی ہے تفریق کا آپشن سب سے پہلے سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ مصنف ہوبز نے اپنی کتاب Leviathan میں تفصیل سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ 'دشمن' افراد یا اجتماعی گروہ کا 'بے چہرہ' اور بلا امتیاز گروپ بن جاتا ہے۔ ایک ایسا ہدف جسے نشانہ بنانا یا قبل از وقت حملے کا قابل سمجھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ البتہ پے در پے جارحیت سے منظم قتل عام خود بخود واقع نہیں ہوتا۔ کسی گروہ کے خلاف بڑے پیمانے پر تشدد شروع ہونے سے پہلے مخالف گروہ کے خلاف کسی حد تک چیدہ چیدہ کارروائیاں ہوتی ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اکثر ایسے افراد جو عام حالات میں کسی مجرمانہ سرگرمی میں ملوث نہیں وہ بھی ایسے مواقع پر جارحانہ کارروائیوں میں حصہ لینے لگتے ہیں۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ بھی کسی لحاظ سے مطعون اور غیر انسانی رویوں کے عمل میں بے نقاب ہو چکے ہیں۔ ہم لوگ ہجوم کی نفسیات کے عزائم سے آگاہ ہیں لیکن یہ نفسیات بھی کسی معاشرے میں نظریے کی ترویج کے بتدریج عمل سے ماخوذ ہوتی ہے۔ لہذا ابتدائی رد عمل بھی برین واشنگ کے عمل کی پیداوار ہوتا ہے جو ممکن ہے عرصہ دراز پہلے سے شروع ہوا ہو۔ نسلی- قوم پرستی کے لہجے اور نظریے میں سیاسی مہم جوؤں کی طرف سے انخلا کا جو راستہ دیا گیا ہے وہ گروہ کے ارکان کے اجتماعی ہیجان اور نفسیات پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ یوں وہ ممکنہ خطرے کے خلاف متحرک ہو جاتے ہیں۔ انتہائی صورتحال میں اجتماعی ذہنی خلل کا اخراج منظم پیمانے پر قتل عام اور دیگر مظالم کی شکل میں ڈھل سکتا ہے۔ ابتدائی رد عمل حاوی ہو سکتا ہے اور گروہ یا جتھے کا حصہ ہونے کی حیثیت سے افراد دشمن کے خلاف مشترکہ کارروائی میں اطمینان محسوس کرتے ہیں۔

دوسن کیچمانووک Dusan Kechmanovic (1996: 101-50) نے اپنی تحقیق میں پوری تفصیل سے لکھا ہے کہ کس طرح قوم پرستی افراد اور گروہوں کی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہے اور انہیں جارحانہ رویوں کے لیے تیار کرتی ہے۔ وہ گروہ کا سامنا کرنے میں کمزوری اور ہجوم کے رویے میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ کرسٹوفر آر براؤننگ نے اس مظہر پر روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح جرمن پولیس بٹالین نے یہودیوں کے قتل عام کا منصوبہ تیار کیا اور اپنے گروہ کے طنز سے بچنے کے لیے مظالم

میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا (169-83 :1992)۔ بالفاظ دیگر گروہ یا ہجوم کی نفسیات کو رویے اور طرز عمل کے تعین کے لیے راحت کی ضرورت ہوتی ہے اور اکثر افراد اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن اس سے بھی اہم یہ ہے کہ وہ لوگ جو جرائم کرنے کے لیے تیار ہوئے انہیں طاقت کے استعمال کی صلاحیت یا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پیشگی خبردار ہونا قبل از وقت مسلح ہونا ہے

وہ گروہ جن پر پہلے حملہ کیا گیا اور وہ طویل عرصے تک مصائب کا شکار رہے ہوں سے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ پیشگی احتیاطی تدابیر کریں اور بدترین صورتحال کے لیے تیار ہوں۔ ایسی تیاری میں نہ صرف دفاع کرنا بلکہ حملہ کرنا بھی شامل ہو گا۔ ایسی بامقصد آگاہی اگرچہ ضروری ہے لیکن مستقبل کے تصادم کو منظم کرنے کے لیے کافی بنیاد فراہم نہیں کرتی۔ وہ حالات جن میں ایک گروہ کو ہتھیاروں اور انہیں استعمال کرنے کی تربیت لینے تک رسائی ہوتی ہے وہ ایسے حالات میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جب تک ریاست یا حکومت کنٹرول کے قابل ہوتی ہے تصادم کی تیاری چھپی یا مخفی رہتی ہے۔ جونہی ریاست کی اتھارٹی کمزور پڑتی ہے شورش سر اٹھا لیتی ہے۔ اس مرحلے پر گروہ دفاع کے ساتھ حملے کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں جو گروہ پیشگی خبردار ہوتے ہیں وہی قبل از وقت مسلح ہوتے ہیں۔

گروہوں کے اندر رابطوں کی ناکامی اور نقصانات

اب جہاں متصادم گروہوں کے درمیان رابطوں کی ناکامی کا عمل تیز ہوتا ہے وہاں گروہوں کے اندر بھی رابطوں کی ناکامی کی صورتحال یہ جاننے کے لیے نہایت اہم ہے کہ کس طرح مختلف گروہ ایسے حالات میں کتنا بھگتیں گے۔ یہ سمجھ کر کہ گروپ لیڈر ایسی دھماکہ خیز صورتحال میں کہیں بہتر طور پر لاحق خطرات سے آگاہ ہوں گے۔ جیسا کہ کسی متنازع علاقے کی تقسیم۔ یا یہ کہ وہ اپنے گروہ کے ارکان کو لاحق خطرات سے آگاہ کرنے میں ناکام رہیں جیسا کہ خطرے والے علاقے سے بحفاظت انخلا یا انہیں مسلح کرنا، تو ایسی صورتحال میں نقصانات بڑھ جائیں گے۔ یہ بھی محض سوچا جا سکتا ہے کہ لیڈروں کو غیر یقینی صورتحال اور پیشگی تجربہ نہ ہونے کے باعث کسی علاقے کی تقسیم کی صورت میں لاحق خطرات کا اندازہ ہو گا۔ ان حالات میں دوسرے گروہ کے مقابلے میں بھی بھاری نقصان ہو سکتا ہے جو اپنے لیڈروں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ وارننگ کے باعث خطرے سے آگاہ ہوتا ہے۔

نسلی صفایا: خلاصہ

اگر کسی علاقے کی تقسیم پر اصولی اتفاق ہو جائے لیکن سرحدوں کا تعین نہ ہو تو جاری نسلی تشدد میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی انتظامیہ جانبدار اور کسی گروہ یا گروہوں سے وابستگی رکھتی ہو تو حملہ کرنے کی گروہوں کی صلاحیت میں ڈرامائی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ معمول کی بات ہے کہ بڑی سلطنت یا ریاست میں سے نئی ریاست قائم ہونے پر وہاں سے فاتح افراد کے ہاتھوں مخالف گروہ کا بڑی تعداد میں جبری انخلا ہو۔ یہ مقصد اس وقت کامیابی کے ساتھ اور موئثر طریقے سے حاصل کیا جا سکتا ہے جب غیر مطلوب گروہ کو مٹانے کے عمل میں نام نہاد سول سوسائٹی، سیاستدان اور ریاستی عمال بھی شامل ہو جائیں۔

مطعون اور ناپسندیدہ گروپ کو جسمانی طور پر مٹانے کے منظم منصوبے کی تیاری اور ریاست کی طاقتور اور موثر بیورو کریسی اور فوج کی پشت پناہی کے بغیر کسی علاقے سے غیر مطلوب گروہ کے قتل عام کے بغیر بڑے پیمانے پر انخلا کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ ایسا ممکن ہے اگر خارجی راستے کھلے رکھے جائیں یہ بھی ممکن ہے کہ بعض افراد اپنی شناخت تبدیل کر لیں یا طاقتور افراد کی پناہ میں چلے جائیں۔

References

Abisaab, R. *Converting Persia: Religion and Politics in the Safavid Empire*. London: I. B. Tauris, (2004).

Ahmed, I., *State, Nation and Ethnicity in Contemporary South Asia*, London and New York: Pinter, (1998).

Aziz, K. K., *The Murder of History*, Lahore: Vanguard Books, (1993).

Bell-Fialkoff, A., *Ethnic Cleansing*, New York: St. Martin's Press, (1999).

Brass, Paul, *Ethnicity and Nationalism: Theory and Practice*, New Delhi: Sage Publications, (1991).

Brass, Paul, *'The Partition of India and Retributive Genocide in the Punjab, 1946-47: Means, Methods and Purposes'*, *Journal of Genocide Research*, London: Taylor & Francis, Cartex Publishing, (2003).

Browning, C. R., *The Path to Genocide*, Cambridge: Cambridge University Press, Canto edition, (1995).

Chalk, F., and Jonassohn, K., *The History and Sociology of Genocide: Analysis and Case Studies*, New Haven and London: Montreal Institute of Genocide Studies and Yale University Press, (1990).

Connor, W., *Ethnonationalism: The Quest for Understanding*, Princeton: Princeton University Press, (1994).

Geertz, C. (ed.), *Old Societies and New States*, New York: The Free Press, 1963.

Gellately, R., *'The Third Rich, the Holocaust, and Visions of Serial Genocide'* in Robert Gellately and Ben Kiernan (eds), *The Specter of Genocide: Mass Murder in Historical Perspective*, Cambridge: Cambridge University Press, (2003).

Gutman, R., *A Witness to Genocide*, Shaftesburg, Dorset: Element Book, (1993).

Hansen, A. B., *Partition and Genocide: Manifestation of Violence in Punjab 1937-1947*, New Delhi: India Research Press, (2002).

Hobbes, T., *Leviathan*, London: Penguin Classics, (1985).

Jonassohn, K., and Björnson, K. S., *Genocide and Gross Human Rights Violations*, New Brunswick and London: Transaction Publishers, (1999).

Jonsson, G. (ed), *East Timor: Nationbuilding in the 21st Century*, Stockholm: Centre for Pacific Asian Studies, (2003).

Kellas, J. G., *The Politics of Nationalism and Ethnicity*, New York: St Martin's Press, (1998).

Kecmanovic, D., *The Mass Psychology of Ethnonationalism*, New York and London: Plenium Press, (1996).

Kuper, L., *Genocide*, New Haven and London: Yale University Press, (1982).

Lake, D. A. and Rothchild, D. (eds), *The International Spread of Ethnic Conflict*, Princeton: Princeton University Press, (1998).

Lang, B., *Act and Idea in the Nazi Genocide*, Syracuse: Syracuse University Press, (2003).

Mann, M., *The Dark Side of Democracy: Explaining Ethnic Cleansing*, Cambridge: Cambridge University Press, (2005).

Melson. R., *Revolution and Genocide: On the Origins of the Armenian Genocide and the Holocaust.* Illinois: University of Chicago Press, (1992).
Naimark, N. M., *Fires of Hatred: Ethnic Cleansing in the Twentieth Century Europe,* Cambridge Mass., London: Harvard University Press, (2001).
Shils, E., *'Primordial, Personal, Sacred and Civil Ties'*, in *British Journal of Sociology*, (1957).
Steinberg, S., *The Ethnic Myth: Race, Ethnicity and Class in America,* New York: Atheneum, (1981).
Tanwar, Raghuvendra, 2006, *Reporting the Partition of Punjab 1947*, New Delhi: Manohar.
Williams, H., *'Freelance'* in *Times Literary Supplement,* 13 February 2004.
Young, C., *The Politics of Cultural Pluralism,* Madison: The University of Wisconsin Press, (1976).

2

انگریزوں سے پہلے اور نوآبادیاتی دور کا پنجاب

جدید دور کا پنجاب بنیادی طور پر سیاسی طرز انتظام کی نوعیت کا یونٹ ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں جو اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں وہ پوری طرح اس کا مفہوم ادا نہیں کرتیں بلکہ مبہم ہیں۔ قدیم ترین رگ وید دور میں اسے 'سپتا سندھو' یا سات دریاؤں کی سرزمین کہا جاتا ہے اور ان دریاؤں میں سندھ سب سے زیادہ اہم تھا۔ سب سے مقبول نام (فارسی میں پنج آب، پانچ دریا) پانچ بڑے دریاؤں کا حوالہ دیتا ہیں۔ ان میں جہلم، چناب، راوی، ستلج اور بیاس شامل ہیں۔ اس نام کا استعمال مغلوں نے شروع کیا جس کا مقصد ان پانچ دریاؤں کے درمیانی علاقے پر اپنے قبضے کو ظاہر کرنا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی سلطنت میں پنجاب میں ملتان اور کشمیر کے علاقے کو بھی شامل کرتا تھا۔ انگریزوں نے اپنے دور کے پنجاب کی سرحدیں مشرق میں دریائے جمنا تک بڑھادیں۔ ان تعریفوں کا جائزہ لیتے ہوئے جے ایس گریوال کہتے ہیں کہ:

> اگرچہ سرحدوں کی کوئی متفقہ تفصیل موجود نہیں، چاہے سب نے یکساں اصطلاح استعمال کی ہو، یہ سب مبہم ہیں۔ بہر حال ان سرحدوں کے تحت جمنا کو کبھی پار نہیں کیا گیا اور کوہ ہمالیہ اور سندھ کو اس سے باہر رکھا گیا۔ یوں آپ کہہ سکتے ہیں کہ خطہ پنجاب کو شمال اور شمال مغرب میں ہمالیہ نے گھیر رکھا ہے جبکہ مشرق میں جمنا آخری سرحد تھا جبکہ آراولی Aravalli کی پہاڑیاں اور صحرائے تھر مغرب اور جنوب مغرب میں پھیلے تھے (2004:2)۔

پنجاب کی نسلی ہیئت

جہاں تک قدیم ترین باشندوں کے نسلی اور مذہبی تعارف کا تعلق ہے تو 1000 سے 1500 قبل مسیح میں ہندیورپی باشندوں کی آمد کے تحت پروٹو آسٹریلوی اور بعد ازاں دراوڑی باشندے بھی یہاں موجود تھے۔ ہندوؤں کی چار ذاتیں برہمن، کھشتری، ویش اور شودر پر مشتمل تھیں اور یہ تقسیم اس وقت وجود میں آئی جب آریائی اور ہند آریائی باشندوں نے حملے کر کے ہندوستان کے اصل باشندوں کو شکست دی۔ نام نہاد اچھوت معاشرے کے ان طبقوں سے تعلق رکھتے تھے جنہیں ہندو اشرافیہ نے غیر انسانی درجہ دے رکھا تھا۔ البتہ ذات سسٹم نے بعد ازاں یونانیوں، ستھیوں، ہنوں، شاکوی، کوشانوں اور دیگر کئی چھوٹے گروہوں کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا تاہم کچھ مقامی گروہ بدستور الگ رہے اور اپنی علیحدہ قبائلی شناخت برقرار رکھی۔ ہندومت اور بدھ مت دونوں کی جڑیں گیارہویں صدی میں ایسی خطے میں ملتی ہیں جب شمال مغرب کے پہاڑی دروں سے ترکو- افغانوں کی قیادت میں ہندوستان پر حملے شروع کیے گئے۔ عرب باشندے اوائل آٹھویں صدی میں ملتان اور ملحقہ علاقوں میں آباد ہوگئے۔ اس تناظر میں پنجاب کے ثقافتی تنوع اور کثیر رنگی روایت پر بحث

کا آغاز محمود غزنوی کے ہاتھوں 1021ء میں لاہور کی فتح سے ہونا چاہیے۔ اس وقت سے آگے تک خطے میں مسلمانوں کی سکونت مستقل ہو گئی۔

مذہبی تعلقات

پنجاب میں قبول اسلام بتدریج ہوا اور اس کی رفتار میں چھٹی صدی اور بعد ازاں تیزی آ گئی۔ البتہ اس سے بہت عرصہ قبل صوفیوں کی تبلیغ سے کچھ قبیلے دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ عام طور پر طریقہ کار یہ تھا کہ پہلے کسی علاقے میں مسلمانوں کی حکمرانی قائم اور مستحکم ہوتی اس کے بعد صوفی تبلیغ اسلام شروع کر دیتے اور پرامن طریقے سے لوگوں کے دل جیت لیتے۔ انہوں نے برصغیر میں اسلامی تعلیمات کے ذریعے تمام انسانوں کے برابر ہونے کا نظریہ متعارف کرایا اور اسے ایک اخلاقی قدر کے طور پر قبولیت ملی۔ اگرچہ مساوات پر مبنی زیادہ سماجی ڈھانچے کی تخلیق میں اس طریقے کے معاون ہونے پر شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ مذہبی شخصیت گورکھ ناتھ کی کوششوں کے باعث ہندو مت اور بدھ مت کے درمیان پنجاب میں ہم آہنگی پیدا ہونے لگی، گورکھ ناتھ دسویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے درمیان یقیناً اسی خطے میں پیدا ہوئے تھے۔ گورکھ ناتھی جوگی یا سیلانی درویش صفت لوگ جہاں شیوائی ہندوؤں کے خدوخال کے حامل تھے وہاں انہوں نے بدھ مت اور اسلام کی تعلیمات بھی اپنائیں۔ مورخ واوڈی ولی کے مطابق گورکھ ناتھی جوگی توحید پرست، ذات برادری کے نظام کے مخالف اور عبادت میں پرہیز گار ہونے کے باعث مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان پُل بننے کی صلاحیت رکھتے تھے (Alhaq 1996: 286)۔ ہندوؤں کی اصلاحات کا ایک اور عمل جس نے پنجاب میں اہمیت حاصل کی وہ 'سنت' تھے۔ ان سنتوں کا تعلق بھگتی تحریک سے تھا جو جنوبی ہندوستان میں ہندوؤں بالخصوص چھوٹی ذات کے افراد نے شروع کی تھی۔ یہ ذات برادری کے نظام کے مخالف تھے۔ یہ بھگتی اس کے بعد شمالی ہندوستان اور پنجاب میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھے۔ ان کے پیروکاروں میں بعض مسلمان بھی شامل تھے۔ ان میں سے بھگت کبیر کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ خدا ایک ہے اور اس کی مخلوق کو اس سے ہرگز جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بھگتی لوگ فقیرانہ اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ پنجاب میں اس تحریک نے سکھ مت کے ارتقا کے بعد گہرے اثرات مرتب کیے جس کا اہم نیچے جائزہ لیں گے۔

صوفی ازم اور جامع ثقافت

برصغیر میں آنے والے صوفی چاہے وہ مشرق وسطیٰ سے آئے یا وسطی ایشیا سے وہ جنوبی ایشیا کی خدا اور فطرت میں ہم آہنگی کے فلسفے سے پہلے ہی متاثر جبکہ بعض کیسوں میں خالصتاً توحید کے نظریات کے حامل تھے۔ اسلام کے اندر صوفی مکتبہ فکر کے 4 بڑے سلسلے تھے۔ سہروردی، چشتی، نقشبندی، قادری ان کا نظریہ یہ تھا کہ مقامی رسوم ورواج کا اقرار کرتے ہوئے شریعت پر چلنا بھی نہایت اہم ہے۔ البتہ بعض صوفی اپنے طور پر کچھ ایسے امور بھی انجام دیتے جو اگر شریعت کے خلاف نہیں تو اس سے متصادم ضرور تھے۔ ایسے حلقوں میں وہ بنیادی تصور جس نے قبولیت حاصل کی وہ یہ ہے کہ آسمانی اور زمینی نظام ہائے کو کنٹرول کرنے والی مطلق ذات خدا ہی ہے (Ibid 1996: 283-464)۔

فکر کی یہ ٹرین سفر کرتے کرتے آخر کار صوفی پنجابی شاعر بلّھے شاہ (1758-1680) تک جا پہنچی۔ بلّھے شاہ کے مرشد شاہ عنایت کا تعلق قادریہ شطاریہ سلسلے سے تھا جو ہندومت میں خدمت خلق کے فلسفے سے متاثر ہے اور اس نظریے کو تصوف سے ہم آہنگ کر دیا۔ البتہ بلّھے شاہ نے اپنے مرشد کی تعلیمات سے روگردانی کرتے ہوئے کھلے عام مذہبی نظریات پر تنقید شروع کر دی (Ahmad, 2004)۔ ان کے درج ذیل اشعار کو بدعتی پہلو کا حامل سمجھا جاتا ہے:

گل سمجھ لئی تے رولا کی

ایہہ رام، رحیم تے مولا کی

دوسری طرف ایسے صوفی بھی پائے جاتے تھے جو سختی سے شریعت پر کاربند تھے۔ نقشبندی صوفی شیخ سلیم احمد سرہندی مجدد الف ثانی جو سولہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے مشرقی پنجاب (بھارت) کے قصبے سرہند میں مدفون ہیں نے مغلیہ دور میں سخت گیر اسلام کے احیا میں اہم کردار ادا کیا۔

پنجابی زبان

یہ بات واضح نہیں کہ پنجابی کا اجز أ منفرد زبان کے طور پر ہوا تھا تاہم اس کے مختلف لہجے ترکو-افغان حملہ آوروں کی آمد کے بعد دیکھنے میں آتے ہیں۔ برہمن سنسکرت جبکہ مسلمان عربی زبان مذہبی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ گورکھ ناتھی لوگوں سے مقامی لب و لہجے میں مخاطب ہوتے تھے (Grewal 2004: 11)۔ تیرہویں صدی کے مصنف اور صوفی شاعر امیر خسرو نے وسطی پنجاب کی زبان کو لاہوری قرار دیا تھا (Ibid: 10)۔ کچھ اور لہجے بھی تھے جو موجودہ دور میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ادبی اور مذہبی معاملات کے لیے پنجابی زبان کا استعمال چشتیہ سلسلے کے مشہور صوفی شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے دور میں شروع ہوا جبکہ شاہ حسین، سلطان باہو، بلّھے شاہ، میاں محمد بخش اور خواجہ غلام فرید نے پنجابی کے کئی لہجے اپنی زبان میں استعمال کیے۔

پنجاب میں رومانی داستانوں جیسا کہ ہیر رانجھا، پورن بھگت، سوہنی مہینوال بلکہ عرب کی داستان لیلیٰ مجنوں اور سندھ کے صحرا کے قصے سسی پنوں کو بڑے جوش و جذبے سے پڑھا جاتا ہے۔ ہیر رانجھا کے دو مشہور ترین مجموعے ہیں۔ ایک ہندو شاعر دمودر نے لکھا جبکہ دوسری 'ہیر' کے مصنف وارث شاہ ہیں۔ داستان ہیر میں ہندومت اور اسلام کی مشترکہ اقدار کا زبردست اظہار کیا گیا ہے کیونکہ ہیر کا عاشق رانجھا مایوسی کے عالم میں گورکھ ناتھی جوگیوں سے جا ملتا ہے۔ یہ قصہ آج بھی پنجاب کے دیہات اور قصبوں میں لوگوں کے اکٹھ میں گا کر پڑھا جاتا ہے۔ یہ بات ناقابل تردید ہے کہ معاشرے کے تمام طبقوں میں اپنے نظریاتی عقائد اور اصولوں کی پابندی کی جاتی تھی بالخصوص مذہبی علما اور ہر کمیونٹی کے ممتاز حلقوں میں۔ یا یہ کہ مذہبی رسوم کی ادائیگی کے حوالے سے ہر مذہب کی واضح حدود مقرر تھیں۔ مثلاً بنیاد پرست برہمنی ہندومت کی جڑیں زیادہ تر اونچی ذاتوں میں تھیں جبکہ اسلامی بنیاد پرستی کی نمائندگی سنی بنیاد پرست کرتے تھے اور ترک، افغان، مغل اور دیگر عناصر عرب نسل سے مقدس تعلق کا بھی دعویٰ کرتے تھے (Ahmed, 1999)۔

بلاشبہ پنجابی کو مذہب اور ادب کی زبان کے طور پر سب سے زیادہ پذیرائی سکھ مذہب کے آغاز سے حاصل ہوئی۔ پندرہویں صدی کے آخر میں نانک چند (1539-1469) جو تلونڈی (اب ننکانہ صاحب) کے ہندو کھتری گھرانے

میں پیدا ہوئے نے مذہبی اصلاح کی ایک تحریک شروع کی جو اب سکھ ازم کہلاتا ہے۔ گورونانک نے اپنی تحریک کے اظہار کے لیے جس زبان کا سہارا لیا اسے لاہوری پنجابی کہتے تھے۔ اس زبان کے مذہبی تحریروں میں استعمال کی روایت گورونانک کے جانشینوں نے بھی جاری رکھی۔ سکھوں کے چوتھے گوروانگد نے دیوناگری رسم الخط میں گورمکھی رسم الخط ایجاد کیا۔ صوفیوں اور دیگر مسلمان لکھاریوں نے فارسی رسم الخط اپنایا جبکہ ہندوؤں نے بدستور دیوناگری رسم الخط کا استعمال جاری رکھا۔ یوں مقبول پنجابی ثقافت کے ارتقا میں زبانی روایت نے اہم کردار ادا کیا جبکہ تحریری طریقہ تمام مذہبی حلقوں میں ناقابل رسائی رہا۔ بہرصورت پنجابی زبان پنجاب کی تاریخ کے کسی بھی دور میں ریاست یا حکومت کی سرکاری زبان نہیں رہی۔ حتیٰ کہ مشہور ترین سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھی فارسی کو درباری زبان کے طور پر استعمال کیا۔

پنجاب میں سکھ ازم

گورکھ ناتھی، بھگتی اور صوفی تحریکوں سے متاثر ہو کر گورونانک نے بھی اچھوت کلچر کو مسترد کرتے ہوئے ایک خدا کی عبادت کی تبلیغ کی۔ انہوں نے مسلمان اور ہندو مذہبی اور سیاسی اسٹیبلشمنٹ میں کرپشن کے ناسور کی مذمت کی۔ انہوں نے عوامی لنگر شروع کیے جہاں ان کے پیروکار جو زیادہ تر ہندو تھے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے (Singh,1986:49)۔ سکھ مت نے زیادہ تر پنجاب کی دیہی اور ہنر مند ذاتوں میں قبولیت حاصل کی۔ ان ذاتوں کو قبل ازیں ہندومت میں کمتر حیثیت حاصل تھی۔ زیادہ تعداد جاٹوں کی تھی (Singh,1963:89)۔ پہلے چار گوروؤں کے دور تک سکھ ازم ایک پرامن اور اصلاح پسند مذہب کے طور پر سامنے آیا بلکہ ان کی دیگر اصلاح پسند تحریکوں میں منفرد حیثیت پہچاننا بھی مشکل تھی۔ سکھ مت کے عقیدے اور اثرورسوخ کے چند مستقل مراکز اس کے آغاز پر ہی وجود میں آگئے تھے۔ سب سے اہم گولڈن ٹیمپل (دربار صاحب) ہے جو چوتھے گورورام داس نے امرتسر میں قائم کیا تھا۔ اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے والے دیگر اہم افراد میں مسلمانوں کے لاہور میں صوفی رہنما حضرت میاں میرؒ بھی شامل تھے۔ مغل شہنشاہ اکبر جو مذہبی نظریات میں برداشت کے لیے مشہور تھا وہ سکھوں کے پانچویں گوروارجن (1606-1563) کی تعلیمات سے کافی متاثر ہوا۔ شہنشاہ اکبر نے گوروارجن کو تحفے میں قیمتی تحائف اور زمینوں اور پیسے کی گرانٹ دی۔

گولڈن ٹیمپل میں اکال تخت (ابدی تخت) کی بنیاد چھٹے گورو ہرگوبند (1644-1595) نے رکھی۔ ان کے پاس دو تلواریں ہوتی تھیں جو روحانیت اور عارضی حاکمیت کے درمیان تعلق کی علامت تھیں (Ahmed,1990:108)۔ آہستہ آہستہ سکھ مت جو دہقانوں اور چھوٹے تاجروں کی حمایت پر استوار تھا، نے شمال مغربی ہندوستان میں بھی پھیلنا شروع کر دیا۔ اس پر اکبر کے بعد آنے والے مغل بادشاہوں کو تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے بعد میں آنے والے سکھ گوروؤں کے خلاف فوجی کارروائی کا بھی حکم دیا۔ نویں گوروتیج بہادر نے کشمیری پنڈتوں کی طرف سے ہتھیار اٹھالیے جنہوں نے الزام لگایا کہ انہیں بزور طاقت اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گوروتیج بہادر اور انکے چند ساتھیوں کو مغل دربار میں طلب کر لیا گیا اور مذہبی بحث کے دوران گورو نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے کہنے پر گورو کوئی کرامت ظاہر کرنے میں ناکام رہا

تا کہ اسکی روحانی طاقت کا ثبوت مل سکے جس پر شہنشاہ کے حکم پر گورو اور اسکے کچھ پیروکاروں کو سر عام پھانسی دے دی گئی (Singh,1963)۔

گورو تیج بہادر کے بیٹے اور سکھوں کے دسویں اور آخری گورو گوبند رائے (1708-1666) نے ایک منظم اور تربیت یافتہ فوج تیار کی جس کے بیشتر سپاہیوں کا تعلق غریب کاشتکار اور ہنر مند طبقے سے تھا۔ سکھوں نے اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں ریونیو اور دیگر ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا اور شمال ہندوستان میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھرے۔ گوبند رائے نے ہندو اور مسلمان سرداروں کے خلاف کئی لڑائیاں لڑیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان لڑائیوں کو پنجاب کے عوام میں مذہبی جنگوں (Crusades) کے طور پر نہیں دیکھا گیا۔ کیونکہ کئی مسلمان عمائدین جو مغلوں کے مخالف تھے نے بھی ان کا ساتھ دیا اور فوج میں کافی تعداد میں مسلمان اور ہندو سپاہی بھی شامل تھے۔ 1699 میں گورو گوبند رائے نے اپنے پیروکاروں کو شمالی پنجاب کے علاقے آنند پور میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ اس موقع پر انہوں نے سکھوں کو منفرد خطوط پر استوار کرنے اور انہیں بپتسمہ دینے کا فیصلہ کیا۔ انہیں ایک خاندان کا نام 'سنگھ' دیا گیا جس کا مطلب شیر ہے۔ بپتسمہ کا مطلب تھا کہ سکھ اپنی پہلی برادری یا شناخت چھوڑ کر خالصہ کے سپاہی بن کر رہیں گے اور دیگر تمام سماجی تعلقات ترک کر دیں گے۔ انہوں نے کئی منفرد شخصی شناخت بھی قائم کر لی جیسا کہ داڑھی اور سر کے بال نہ تراشنا، تلوار یا کرپان ہر وقت ساتھ رکھنا۔

مغلوں نے گوبند سنگھ کے خلاف ان کی زندگی کے خاتمے تک کارروائی جاری رکھی اور ان کے دو بیٹوں کے سر قلم کرا دیے۔ خود گورو بھی 1708 میں مسلمان قاتلوں کے لگائے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسے چنانچہ سکھوں کی مذہبی یاداشت میں مسلمانوں یا ترکوں (جیسا کہ مغلوں کو ترک سمجھا جاتا تھا) کو ان کے گوروؤں کے خلاف کارروائی کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ صرف ایک چھوٹی سی ریاست ملیر کوٹلہ کے مسلمان حکمران کو اس سے استثنیٰ حاصل تھا جس نے گورو گوبند کے بیٹوں پر تشدد اور ان کے قتل کی مخالفت کی تھی (Kholi 1986)۔ چنانچہ دسویں گورو نے حکم دیا کہ میرے پیروکار ملیر کوٹلہ کے مسلمانوں کو کبھی نقصان نہ پہنچائیں۔ تاہم کچھ سکھوں نے مسلمان حکمرانوں کی غلطیوں کا بدلہ لینے کو اپنا فرض سمجھ لیا اور بڑی تعداد میں مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ بندہ بہادر کے دور میں یہ کارروائی نہ صرف بڑے مسلمان زمینداروں کے خلاف کی گئی اور انکی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں بلکہ عام مسلمانوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ بندہ بہادر کے مظالم مسلم تاریخی نفسیات کا حصہ بن گئے جیسا کہ مسلمانوں کے ترجمانوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے (Ahmed,1990:108-9;Singh,1963:118)۔

جہاں تک سکھ ازم، اسلام اور ہندومت کے درمیان تعلقات کا تعلق ہے تو انگریز مورخ کننگھم سکھ مت کو مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھتا ہے۔ توحید پرستی اور عوام دوست روایات کی بنا پر بلاشبہ سکھ مت مقبول صوفی اسلام کے قریب ہے لیکن تاریخی اعتبار سے اسلام اور ہندومت کے درمیان کبھی لکیر نہیں کھینچی گئی اور کئی لوگ بدستور سکھ مت کو دونوں مذاہب کا ملغوبہ سمجھ کر اس میں شامل ہو گئے۔ ایک ہی ذات کے ہندو اور سکھ مذہب کے افراد میں شادیاں عام تھیں (Akbar, 1985: 131-33)۔ یہ روایت جدید دور میں بھی پائی جاتی ہے۔ ایک چیز بہر حال ہے کہ ہندو اور سکھ جاٹ ایک دوسرے کے ساتھ شادی نہیں کرتے۔ انگریزوں کے دور میں ہونے والی مردم شماری کے ریکارڈ میں سکھوں کو کبھی ہندو اور کبھی سکھ لکھا گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز پر ہندو اور سکھ پنجاب کے خطے میں اقلیت ہی تھے۔

اٹھارویں صدی کے دوران ایرانی اور افغان فوجوں کے پے در پے حملوں سے مغل سلطنت کو سخت نقصان پہنچا۔ پہلے نادر شاہ نے (1738 اور پھر 1739 میں) پنجاب اور مغل دارالسلطنت دہلی کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ اس کے بعد افغان مہم جو احمد شاہ ابدالی نے حملے کیے۔ ان حملوں سے پنجاب اور شمالی ہندوستان کے معاشرتی نظام میں زبردست خوف و ہراس پھیل گیا۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو بلا تفریق نشانہ بنایا گیا۔ بار بار حملوں سے مغلوں کے انتظامی اور عسکری ڈھانچے کا کوئی نام و نشان نہ رہا (Ahmed,1990:108-111)۔

سکھ جو ایک گشتی فوج کے طور پر جنگلوں میں مقیم تھے پنجاب کی سب سے طاقتور عسکری قوت بن کر ابھرے۔ سکھ طاقت کا عروج وہ تھا جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں 1799 میں پنجاب حکومت قائم ہوئی لیکن اس سے تقریباً تیس سال قبل سکھ پنجاب کے مختلف حصوں میں سیاسی طور پر منظم ہو چکے تھے۔ مثال کے طور پر لاہور اور قرب و جوار میں سکھ وار لارڈز کی ایک مثلث نے اقتدار قائم کر کے ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا تھا (Sheikh,2005)۔ سکھوں کے ایک چھوٹے فرقے کے حکمران طبقے میں تبدیل ہونے سے خود مختار ریاست وجود میں آگئی۔ جہاں تک مسلم اکثریت کا تعلق تھا تو ایک یہ نہایت غیر معمولی بات تھی۔ برصغیر کی مستحکم روایت کے مطابق مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مخالفین کو کچلنے کے لیے طاقت کا کھلا استعمال کیا جس کا مطلب تھا مسلمانوں کی ہلاکت، جو عمومی طور پر مغلوں یا افغان حملہ آوروں کے حامی تھے۔ بعض مواقع پر سکھوں نے اپنے گوروؤں کے ساتھ مغلوں کی بدسلوکی کا بدلہ لینے کے لیے مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بھی بے حرمتی کی۔ البتہ رنجیت سنگھ نے اس پالیسی سے فوراً لاتعلقی اختیار کر لی تا کہ جنوبی ایشیا میں تمام مذاہب کے لیے محافظ حکمران کے افسانوی تصور کو یقینی بنایا جا سکے۔

رنجیت سنگھ نے 1801 میں خود کو سلطنت لاہور کا مہاراجہ قرار دے دیا اور حکومت کی توسیع اور استحکام کے نئے دور کا آغاز کیا۔ اپنے تمام مخالفین کو کچلنے کے بعد اس نے مصالحت کی پالیسی کا آغاز کیا جس کے تحت اس نے وزارتی کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی شامل کیا اور انہیں مشیر بھی مقرر کیا۔ اہم عہدوں سمیت فوج میں ہر سطح پر مسلمان فائز کیے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رنجیت سنگھ نے ایک عادل اور دانا حکمران کی شہرت حاصل کر لی۔ پنجاب میں تینوں بڑے مذاہب کے لیے الگ عدالتوں کے قیام اور مفت ادویات سمیت کئی اصلاحات متعارف کرائی گئیں (Singh, 1985:48-50)۔ بادی النظر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں پنجاب میں شرح خواندگی ہندوستان کے دیگر حصوں سے زیادہ تھی۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی طرف سے کمیونٹی سکول چلائے جاتے تھے اور ظاہر ہوتا ہے کہ ان اداروں میں نہ صرف مذہب بلکہ ریاضی اور سائنس کے مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ پنجابی بڑا ذریعہ تعلیم تھا لیکن طلبا کو عربی، اردو، فارسی اور سنسکرت بھی پڑھائی جاتی تھی۔ رنجیت سنگھ کے دور میں ایک مشترکہ طاقتور پنجابی شناخت زندگی کے ہر شعبے میں پھل پھول رہی تھی (Sheikh,2010) تاہم پنجابی ثقافتی شناخت پر زور دینے کے باوجود ریاست کی سرکاری اور درباری زبان فارسی ہی رہی (Chaudhry,1977:II)۔

اسی دوران انگریزوں کا شمالی ہندوستان میں کنٹرول تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ رنجیت سنگھ کا انتقال 1839 کو ہوا جس کے بعد مختلف دعویداروں کے درمیان تاج کے حصول کی کشمکش شروع ہو گئی۔ بعض سکھ سرداروں نے اپنے زیر قبضہ علاقوں میں

بھاری ٹیکسوں کی وصولی شروع کر دی جس سے انتشار پھیل گیا۔ انگریزوں نے اس صورتحال کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور پنجاب پر حملہ کر دیا۔ انگریزوں اور سکھ فوجوں کے درمیان کئی لڑائیاں ہوئیں (چودھری، 1977)۔

انگریز دور

29 مارچ 1849 کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چھوٹے بیٹے دلیپ سنگھ اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت سلطنت پنجاب ایسٹ انڈیا کمپنی کے کنٹرول میں چلی گئی۔ اس وقت دارالسلطنت لاہور انتہائی زبوں حالی، معاشی بدحالی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ عمارتیں، سڑکیں، سیوریج، سسٹم اور دیگر سہولتیں خستہ حال نظر آتی تھیں۔ انگریزوں کی سرپرستی میں پنجاب اور بالخصوص لاہور کی حالت یکسر تبدیل ہو گئی کیونکہ انگریز اپنی ہندوستانی سلطنت کو افغان حملہ آوروں اور زار روس کی دستبرد سے بچانا چاہتے تھے۔ چنانچہ کئی سکھ سرداروں کو رشوت دے کر ساتھ ملایا گیا اور انہیں جاگیروں اور خود مختار ریاستوں کے مالکانہ حقوق دیے گئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ نہ صرف پنجاب کے سکھوں بلکہ کئی مسلمانوں اور ہندو سرداروں کو بھی 1857 کی بغاوت کچلنے کے صلے میں جاگیریں اور خطابات دیے گئے۔ وفادار عمائدین کو جاگیروں سے نوازنے کا نظام اس کے بعد بھی جاری رہا جس کے نتیجے میں پنجاب بھر میں جاگیرداروں کا ایک طاقتور طبقہ وجود میں آ گیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہنا چاہیے کہ انگریزوں نے بڑی چالاکی کے ساتھ پنجاب کے تینوں بڑے مذاہب کے مذہبی رہنماؤں کو ساتھ ملا لیا۔ بالخصوص علما اور مزاروں کے سجادہ نشینوں کو براہ راست سرپرستی میں لیتے ہوئے یقین دلایا گیا کہ امن وامان مقامی افراد کے سپرد ہو گا اور فوج میں سپاہی بھرتی کیے گئے۔ یہی طبقہ انگریزوں کا آخری وقت تک وفادار رہا (Ali,1970:193-240;Leigh,1922)۔

پنجاب کو برطانوی سلطنت کے دفاع کے لیے سٹرٹیجک طور پر اہم صوبہ سمجھا گیا۔ انگریزوں نے بلدیاتی اور سرکاری سکولوں میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ کیا جس سے پنجاب پر قبضے سے پہلے رائج تعلیمی نظام تبدیل کر دیا گیا۔ اس معاملے پر پنجاب انتظامیہ کے اعلیٰ حکام میں کافی بحث ہوئی۔ اس رائے نے زیادہ اہمیت حاصل کی کہ پنجابی چونکہ اردو کے قبیلے کی زبان ہے اور چونکہ انگریز حکومت پہلے ہی شمالی ہندوستان میں اردو زبان استعمال کر رہے ہیں اس لیے اسے پنجاب تک توسیع دے دی جائے۔ اس طرح وہ تمام پنجابی جو فوجی یا سول سروس کرنے کے خواہشمند تھے کو اردو زبان سیکھنا پڑی (Chaudhry1977)۔

انگریز دور کا پنجاب

انگریزوں کی فتوحات کے نتیجے میں بالآخر شمال مغربی دروں سے برصغیر کے خلاف حملہ آوروں کی کارروائیاں تھم گئیں۔ انگریزوں نے پنجاب کے بڑے حصوں پر براہ راست حکومت کی تاہم مقامی حکمرانوں سے معاہدوں کے نتیجے میں کچھ خود مختار ریاستیں بھی برقرار رہیں۔ انیسویں صدی کے نصف اور اس کے بعد تک مغربی پنجاب میں انگریزوں نے زبردست ترقیاتی کام کرائے۔ نہروں کا ایک وسیع جال بچھایا گیا۔ جو دنیا کا آبپاشی کا سب سے بڑا نظام ہے۔ امریکہ میں خانہ جنگی کے باعث وہاں سے برطانیہ کو کپاس کی برآمدات کا سلسلہ تھم گیا تھا جس سے پنجاب کو فائدہ پہنچا کیونکہ یہاں کے کسانوں کی کپاس پیدا کرنے

کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ مشرقی پنجاب کے گنجان آباد علاقوں سے لوگ منتقل ہو کر نہری علاقوں میں مقیم ہو گئے۔ ان میں ہزاروں سکھ اور مسلمان شامل تھے (Ali,1989;Bhatia,1987:83-89;Singh,1966:116-18)۔ البتہ مغربی پنجاب میں تبدیلی مقررہ فریم ورک کے اندر ہوئی۔ زمینوں کی ملکیت کی نجکاری اور معیشت کی کمرشلائزیشن کے علاوہ محدود پیمانے پر خود مختار صنعتکاری بھی ہوئی (Ali,1989)۔

نئے معاشی مواقع کے باوجود شمالی اور مشرقی پنجاب میں زیادہ آبادی، زرخیز زمین کی کمی اور کم پیمانے پر اراضی کی ملکیت کے مسائل موجود رہے۔ ماضی میں ایسے ہی غیر موزوں حالات میں پنجابیوں کو مقامی حکمرانوں اور بیرونی حملہ آوروں کی فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور کیا تھا۔ انگریزوں کی پالیسی نے اس رجحان کی مزید حوصلہ افزائی کی۔ سکھ، پنجابی مسلمان اور ہندو راجپوت جو جنگجو قوم سمجھے جاتے تھے کو برطانوی فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی گئی۔ در حقیقت نوآبادیاتی حکمت عملی کے تحت شمالی پنجاب میں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت معاشی ترقی کو روکا گیا تاکہ فوجیوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رکھا جا سکے۔

اس کے علاوہ زراعت کی کمرشلائزیشن بڑھنے کے ساتھ سود پر قرضہ دینے کے کام کو بھی خوب فروغ دیا گیا۔ زیادہ تر ساہوکار ہندو یا سکھ تھے۔ سرسری طور پر جائزہ لیں تو معاشی شعبے جیسا کہ تجارت، پرچون اور بڑے پیمانے پر فرمیں اور کمپنیاں ہندوؤں اور سکھوں کے کنٹرول میں تھیں۔ یوں پنجاب کے دیہی اور شہری علاقوں میں دکانیں ان کے پاس تھیں۔ کاشتکاری کا زیادہ تر کام مسلمانوں اور سکھوں کے سپرد تھا ماسوائے مشرقی پنجاب کے جہاں ہندو جاٹ زرعی شعبے پر غالب تھے۔ بڑے جاگیر دار مسلمان تھے یا پھر سکھ تھے۔ لیکن پنجاب کے مختلف حصوں میں ہندو بھی پائے جاتے تھے۔ معاشرے کے تمام طبقے ساہوکاروں کے مقروض تھے لیکن بالخصوص مسلمان معاشی معاملات پر ساہوکاروں کے غلبے پر نالاں تھے۔

اپنی مشہور کتاب The Punjab Peasant: In Prosperity and Debt میں میلکم ڈارلنگ نے لکھا ہے کہ پنجاب میں 50 فیصد مقروض کسان مسلمان تھے۔ لاہور کے رہائشی بولاقی شاہ نے مخصوص قسم کے قرض خواہوں کی تفصیل بتائی ہے۔ اس وقت شاید ہی کوئی ایسا زمیندار ہو گا جو ساہوکاروں کا مقروض نہ ہو۔ بظاہر قرضہ دینے والوں کو لالچی انسانوں کے روپ میں پیش کرنا محض سیاسی پراپیگنڈہ لگتا ہے کیونکہ میں نے جتنے افراد کے انٹرویو کیے ان کی نظر میں ساہوکاروں کا رویہ الگ الگ تھا۔ ان میں سے کئی ساہوکار مشکل میں لوگوں کے کام آنے کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔

مجموعی طور پر ہندوؤں کی تاجر ذاتیں کھتری اور اروڑہ اور انہی برادریوں کے سکھ کاروبار پر چھائے تھے۔ جدید تعلیم اور کاروبار سیکھنے کا ہندوؤں اور سکھوں نے سب سے پہلے آغاز کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہندوؤں اور سکھوں نے جدید کاروبار پر پہلے سے زیادہ گرفت مضبوط کر لی۔ کاروبار میں ہندوؤں اور سکھوں کی شراکت داری معنی خیز ہے جبکہ مسلمان تقریباً اس عمل سے باہر تھے (Moon1998:288)۔ سرکاری ملازمتوں میں بھی ہندو اور سکھ مسلمانوں سے آگے تھے۔ 1931 میں پنجاب کی نصف سے زائد آبادی ہونے کے باوجود سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی 20 فیصد تھی (Talha,2000:9)۔ یہ صورتحال تقسیم ہند تک برقرار رہی۔ دیناناتھ ملہوترا لکھتے ہیں کہ:

برسوں بعد شاید 1944 میں محمد علی جناح ؒ لاہور کا دورہ کیا اور اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ میں مسلمانوں کے بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ میں بھی چند دوستوں کے ساتھ ان کا خطاب سننے چلا گیا کیونکہ وہ مسلمانوں کے نئے لیڈر تھے۔ ان کی تقریر بالکل واضح اور زوردار تھی، انہوں نے اس امکان کو قطعاً مسترد کر دیا کہ ہندوستان ایک ہی ملک ہو گا جس میں مسلمان اور ہندو دونوں مل کر رہیں گے۔ انہوں نے مسلمان نوجوانوں سے کہا کہ وہ پاکستان کے حصول کے لیے قربانیاں دینے کو تیار رہیں۔ انہوں نے روزمرہ کی زندگی سے کئی مثالیں دیں اور کہا کہ: کیا آپ جانتے ہیں کہ پنجاب میں ایک بڑا بنک ہے جس کا نام پنجاب نیشنل بنک ہے یہ غلط نام ہے۔ درحقیقت یہ پنجاب ہندو نیشنل بنک ہے۔ آپ کو اس بنک میں کوئی مسلمان ملازم نہیں ملے گا۔ یہ ہندو قوم کا بنک ہے۔ مسلمانوں کو اپنی منزل الگ متعین کرنا ہو گی (2004: 58)۔

مذہبی احیائے نو

جہاں انگریز حکومت نے مذہبی معاملات میں غیر جانبداری کی روایت جاری رکھی وہاں کئی مسیحی چرچوں نے خود کو پنجاب میں مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ پنجاب میں زیادہ تر غریب اور اچھوت طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد نے ترک مذہب کر کے عیسائیت قبول کی۔ بعض اونچی ذات کے افراد کو بھی عیسائیت نے متاثر کیا جیسا کہ ریاست کپور تھلہ کے حکمران خاندان کے کچھ افراد نے بھی مذہب تبدیل کر لیا۔ یہ صورتحال سامنے آنے پر ہندو، مسلمان اور سکھ لیڈر معاشرتی اصلاح کے سوال پر توجہ دینے پر مجبور ہو گئے۔ ان میں سے ہر کوئی خود احتسابی کرنے لگا جس سے مثالی ہندو مت، اسلام، بدھ مت، سکھ مت اور دیگر مذاہب کے احیا کا آغاز ہوا (Bhatia,1987:114-20;Farquhar1967)۔ انیسویں صدی میں عیسائی مبلغوں کی طرف سے تند و تیز تبلیغ اور پھر اسلام قبول کرنے کے مسلسل واقعات کے بعد ہندوؤں نے بھی کئی اصلاحاتی اقدامات کیے۔

پنجاب کی آبادی میں 1881 سے 1941 کے درمیان ہندوؤں کی تعداد میں کمی اور سکھوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی تعداد بڑھنے پر یہاں کی اونچی ذاتوں کے ہندوؤں کو سخت تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ اس بات پر حیرانگی نہیں ہونی چاہیے کہ ہندوستان کے دوسرے کونے گجرات میں شروع کی گئی آریا سماج تحریک پنجاب میں بھی نظر آئی۔ جس کا اونچی ذات کے ہندو طبقے نے والہانہ خیر مقدم کیا۔ ہندو مذہب کو بتوں کی پوجا سے نجات دلانے کی خواہش اور مذہبی صحیفے، قدیم تاریخ اور دیومالا کی نظرثانی شدہ تشریح کے ذریعے ہندوؤں کی تین بڑی 'جڑواں' ذاتوں کے درمیان سماجی فاصلے ختم کرنے میں کافی کامیابی حاصل ہوئی جس کے باعث تازہ تازہ اسلام یا عیسائیت قبول کرنے والے بعض ہندو دوبارہ آبائی مذہب کی طرف واپس آ گئے (Bhatia,1987:114-20: Farquhar,1967)۔

آریا سماج تحریک کو ہندوؤں کی شہری آبادی میں کافی حامی مل گئے جبکہ ہندوؤں کی اکثریت دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی روایت پر گامزن رہی۔ ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں یہاں تک کہ سکھوں کو دوبارہ ہندو بنانے کا اچھوتا منصوبہ متعارف کرایا۔ ہندوؤں کی 'شدھی' تحریک کے جواب میں مسلمانوں نے تبلیغ کا آغاز کر دیا۔ ہندوؤں کی ایک تحریک برہمو سماج بھی شروع ہوئی جس کی جڑیں بنگال میں تھیں۔ یہ تحریک مغربی منطق پسندی کی سوچ پر زیادہ عمل پیرا ہونے پر زور دیتی تھی۔ پنجاب میں اسے انتہائی امیر طبقے میں کافی پذیرائی ملی اور اسے دوبارہ ہندو

مذہب کی طرف مراجعت میں کچھ کامیابی بھی ملی مثلاً لاہور میں دیال سنگھ کالج اور لائبریری کے بانی نے دوبارہ ہندو مذہب قبول کر لیا تھا۔

جہاں تک پنجاب کے مسلمانوں کا تعلق ہے تو جہاں اونچی ذات کے خاندانوں نے سر سید احمد خان کی تعلیمی اصلاحات کا مثبت جواب دیا وہاں بنیاد پرست طبقوں کو وہابی تحریک نے متاثر کیا جو اوائل انیسویں صدی میں پنجاب میں وارد ہوئی تھی جو سید احمد شہید بریلوی کی عسکریت پسند تحریک کے نتیجے میں مضبوط ہوئی (Ahmed,1999:218-222)۔ اسی طرح پنجاب کے ضلع گورداسپور کے علاقے قادیان میں بیسویں صدی کے شروع میں احمدیہ فرقے نے جنم لیا جس نے خود مختار مذہب کی شناخت حاصل کر لی۔ اس نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے کسی بھی تصور کی مخالفت کی اور اسے عموماً انگریز حکومت کا وفادار ہی سمجھا گیا۔ اگرچہ مرزا غلام احمد نے اپنے مذہبی کیرئیر کا آغاز سنی مبلغ کے طور پر کیا اور ٹھوس دلائل کے ساتھ عیسائی اور ہندو عالموں سے مناظرے کیے تاہم بعد ازاں انہوں نے خود کو (نعوذ باللہ) پیغمبر (مسیح موعود) کہلوانا شروع کر دیا اور ایسے کئی متنازعہ اقدامات کیے جسے سنی عقیدے کے مرکزی دھارے میں قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کو بدعتی قرار دیا (Ibid:233-234)۔ احمدیہ فرقے کی درخواست پر مردم شماری میں ان کا الگ خانہ رکھا گیا۔

سکھوں میں اکال دل اور سنگھ سبھا تنظیمیں سکھ مذہب کے مذہبی اور فرقہ وارانہ مفادات کی نمائندگی کرتی تھیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر رہے کہ 1920 کے عشرے میں ہندوؤں اور سکھوں میں اس وقت تلخ تصادم شروع ہو گیا جب آریا سماج نے سکھوں کو ہندو مت کا ہی ایک فرقہ قرار دیا۔ سکھوں نے جواب دیا کہ ہم ہندو نہیں۔ اسی عرصے میں سکھوں کے کئی فرقے بھی ابھر کر سامنے آئے (Bhatia,1987:121-202)۔ بھارت میں آج بھی یہ سوال کیا جاتا ہے کہ: "کیا سکھ مت ہندو مت کا اقلیتی فرقہ ہے یا کوئی الگ مذہب ہے"۔

تقسیم کے فسادات سے قبل فرقہ وارانہ تصادم

مذہبی شناخت کو بنیاد پرستی کا رنگ دینے سے گاہے بگاہے فرقہ وارانہ کشیدگی بلکہ تصادم تک پیدا ہوتا رہا۔ پنجاب کے مرکزی شہر اور دارالحکومت میں رونما ہونے والے دو واقعات اہم ہیں۔ ایک تو 1926 میں توہین آمیز کتاب (نعوذ باللہ) 'رنگیلا رسول' تھی جس میں گستاخانہ مواد شامل تھا۔ پھر 6 اپریل 1929 کو ایک مسلمان نوجوان علم دین نے کتاب کے پبلشر کو چھریاں مار کر قتل کر دیا (Malhotra, 2004: 4)۔ راجپال کے بیٹے دیناناتھ ملہوترا نے مجھے بتایا کہ اصل میں کتاب کا مصنف ایک ہندو پنڈت چموپتی تھا۔ جس نے یہ کتاب 1920 میں ایک مسلمان کی طرف سے بھگوان کرشن اور آریا سماج کے بانی سوامی دیانند کے خلاف توہین آمیز کتاب کے جواب میں لکھی۔ دیناناتھ ملہوترا کے والد راج پال نے وعدہ کیا کہ وہ کتاب کے مصنف کا نام صیغہ راز میں رکھے گا جس سے مسلمانوں کا غضب پبلشر پر ٹوٹ پڑا۔ کتاب کی اشاعت پر راجپال کو 18 جنوری 1927 کو انگریز حکومت کی طرف سے اشتعال انگیزی پھیلنے کے جرم میں 18 ماہ قید اور ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی لیکن اس سزا سے لاہور کے نوجوان مسلمان علم دین کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا اور اس نے راجپال کو قتل کر دیا۔ لاہور کے ہندوؤں نے اس کی آخری رسومات میں بہت بڑی تعداد میں حصہ لی (Ibid:2)۔

جب علم دین کے خلاف قتل کے مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو ان کا دفاع میاں فرخ حسین نے کیا۔ سیشن کورٹ نے ملزم کو موت کی سزا سنائی۔ ان دنوں مشہور شاعر علامہ اقبالؒ اور میاں عبدالعزیز علم دین کو بچانے کے لیے مسلمانوں کی کوششوں کی قیادت کر رہے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے محمد علی جناحؒ سے کہا کہ وہ بومبے سے لاہور آکر لاہور ہائی کورٹ میں علم دین کا مقدمہ لڑیں۔ جناحؒ نے رضامندی ظاہر کر دی۔ عدالت میں محمد علی جناحؒ کا موقف تھا کہ علم دین ایک ان پڑھ نوجوان ہے جو حضرت محمدؐ کے خلاف توہین آمیز زبان پر مشتعل ہو گیا لہٰذا اسے پھانسی نہیں چڑھانا چاہیے۔ البتہ انہوں نے علم دین کے اقدام (یعنی کسی کو قتل کرنا) کی حمایت نہ کی۔ 17 جولائی 1929 کو لاہور ہائی کورٹ نے اپنے حکم میں سیشن کورٹ کی سزا کا فیصلہ برقرار رکھا۔ علم دین نے حکومت کو رحم کی اپیل بھیجی جو مسترد کر دی گئی چنانچہ علم دین کو 31 اکتوبر 1929 کو میانوالی میں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا اور وہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے ہنگامے شروع کر دیے اور مطالبہ کیا کہ میت لاہور لائی جائے ۔ مسلمان رہنماؤں کی اس یقین دہانی کہ جلوس اور مظاہرہ پرامن ہو گا میت علم دین کے ورثا کے حوالے کر دی گئی اور انہیں لاہور میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ علم دین کے ورثا نے علامہ اقبالؒ کو نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں ایک گناہگار آدمی ہوں اس لیے نماز جنازہ کسی پرہیزگار کو پڑھانی چاہیے۔ علامہ اقبالؒ نے علم دین کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ مولانا ظفر علی خان نے بھی جنازے میں علم دین کے جذبے کی زبردست تحسین کی۔ ان دو برسوں کے درمیان مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات کافی کشیدہ رہے (Nagina,1988)۔

مسجد / گوردوارہ شہید گنج کا تنازع

مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان لاہور میں ایک گوردوارہ تعمیر کرنے پر کشیدگی پھیل گئی۔ اس گوردوارے کے بارے میں مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ یہاں پہلے ایک مسجد تھی جسے رنجیت سنگھ کے دور میں شہید کر کے گوردوارہ تعمیر کیا گیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اس تنازع میں شدت آنے لگی۔ اس واقعے پر مسلمانوں کے جذبات کو میاں مصطفی کمال پاشا نے مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس کا آغاز لاہور میں اپنے خاندان کے سیاست میں کردار سے کیا ہے۔

میاں مصطفی کمال 'پاشا'

''میں 1928 کو لاہور کے مشہور آرائیں خاندان میں پیدا ہوا۔ والدین نے میرا نام مصطفی کمال رکھا لیکن لوگوں نے (مشہور ترک لیڈر کمال اتاترک کی یاد میں) مجھے 'پاشا' کہنا شروع کر دیا۔ میرے دادا نورالدین کاڈا ایک مشہور شخصیت تھے۔ پنجابی میں کاڈا کا مطلب ڈھونڈ نکالنے والا ہے۔ اگر کسی مسئلے کا کوئی حل نہ نکلتا تھا تو میرے دادا کو ثالث مقرر کیا جاتا تھا اور وہ پیچیدہ مسئلے کا بھی ایسا حل نکالتے کہ تمام فریقوں کے لیے قابل قبول ہوتا۔ میرے والد میاں فیروزالدین کو 1919 میں اس الزام میں جیل بھیج دیا گیا کہ انہوں نے کینٹ کے علاقے میں ایک فتویٰ تقسیم کیا تھا جس میں انگریز فوج میں شمولیت کو حرام قرار دیا گیا تھا۔ جیل میں کبھی وہ ماشکی یا کبھی خدمتگار کا بہروپ بدل کر مختلف بیرکوں میں چلے جاتے، چنانچہ انہیں باغی قرار دے کر موت کی سزا سنائی گئی۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ خود کو فاتر العقل انسان کے طور پر پیش کریں جس پر انہوں نے عمل کیا۔

میرے دادا نے بھی موقف اختیار کیا کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے اور وہ بھی ذہنی طور پر ٹھیک نہیں اس لیے اسے رہا کیا جائے۔ ممتاز احرار رہنما شورش کشمیری نے بھی میرے والد پر ایک آرٹیکل لکھا جس میں انہوں نے یہ کہانی پیش کی۔

"میرے والد نے مسجد شہید گنج کے تنازعے کے دوران اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ پنجاب کا گورنر ایمرسن دراصل امر سنگھ تھا۔ اس لیے وہ سکھوں کی حمایت کر رہا تھا، چنانچہ انہیں منٹگمری جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ میرے والد نے 1937 کے لگ بھگ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ انہوں نے مجلس احرار جو کانگریس نواز مسلمانوں کی نمائندہ سمجھی جاتی تھی کے مقابلے میں مولانا ظفر علی خان اور احمد سعید کرمانی کے والد سے مل کر مجلس اتحاد ملت بنائی۔"

1935 میں مسلمانوں اور سکھ جنونیوں کے درمیان مسجد / گوردوارہ شہید گنج کا تنازع ایک خونریز تصادم میں تبدیل ہو گیا۔ دونوں مذاہب کے نزدیک یہ جگہ مقدس سمجھی جاتی تھی۔ فسادات میں کئی افراد مارے گئے اور کئی روز تک امن وامان کی صورتحال مخدوش رہی۔ اس کی بازگشت 1936 میں بھی سنی جاتی رہی۔ کئی ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں نے بتایا کہ ہنگاموں کے دوران متعدد افراد کو چھرا گھونپ کر ہلاک کر دیا گیا۔ پروفیسر چمن لال اروڑا جن کا آبائی گھر لاہور میں تھا، نے مجھے 4 جنوری 2005 کو جالندھر میں ملاقات کے دوران بتایا کہ شہید گنج کے تنازعے نے مسلمانوں اور غیر مسلموں بالخصوص سکھوں کے ساتھ بد اعتمادی کی فضا قائم کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ:

"برانڈرتھ روڈ پر میرے ایک ہندو ہمسائے نے مظاہرین کے مطالبے کے برعکس دکان بند نہ کی۔ جس پر مسلمان فسادیوں نے اسے قتل کر ڈالا۔ مسلمان نہایت جارحانہ موڈ میں تھے اور غیر مسلم کافی عدم تحفظ کا شکار تھے۔ سکھ بھی اتنے ہی انتشار پسند تھے لیکن وہ بہت چھوٹی اقلیت تھے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں اور سکھوں میں اجنبیت وہاں سے شروع ہوئی جو آگے تک برقرار رہی۔ مسلمان لیڈر ایسے پر تشدد رویے کے نتائج کا پوری طرح اندازہ نہ لگا سکے۔ علامہ اقبالؒ نے فسادیوں کو پر امن کرنے کی بجائے مزید اشتعال دلایا۔"

گورنر ایمرسن نے اپنی پندرہ روزہ خفیہ رپورٹ میں 16 نومبر 1936 کو لکھا کہ:

> آئندہ اسمبلی انتخابات میں لاہور میں شہید گنج کا تنازعہ دوبارہ سر اٹھا سکتا ہے، اس کی سب سے زیادہ ذمہ دار اتحاد ملت تنظیم ہے۔ یہ تنظیم جولائی 1935 میں شہید گنج کے واقعے کے دوران قائم کی گئی تھی۔ اس تنظیم نے الیکشن کے لیے کئی امیدوار نامزد کیے ہیں۔ موجودہ حالات میں تو ان کی کامیابی کے بہت کم امکانات ہیں کیونکہ شہید گنج کے واقعے کے بارے میں لوگوں کے احساسات کی شدت میں کمی آئی ہے اور تنظیم کا اثرورسوخ بھی کم ہوا ہے۔ چنانچہ انتخابات میں اپنی کامیابی کے امکانات میں اضافے کے لیے یہ لوگ اس تحریک کو دوبارہ زندہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں اور انہوں نے کھلے عام سول نافرمانی کی باتیں شروع کر دی ہیں (Carter, 2004: 58)۔

لاہور ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں شہید گنج پر سکھوں کا حق تسلیم کر لیا لیکن مسلم سکھ تعلقات بدستور کشیدہ رہے اور جب تقسیم پنجاب کا تنازعہ گمبھیر ہو گیا تو ایسے عوامل نے سکھوں کو یہ فیصلہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا کہ وہ مسلمانوں کی بجائے

ہندوؤں اور کانگریس کا ساتھ دیں۔ اسی طرح راولپنڈی اور ملتان میں بھی مسلمانوں اور سکھوں اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان جھڑپیں ہوئی تھیں۔ راولپنڈی میں 1926 جبکہ ملتان میں 1929 میں پہلا تصادم ہوا۔ امرتسر میں مذہبی بنیادوں پر 1940 میں تصادم ہوا۔ گوجرانوالہ، جالندھر اور دیگر قصبوں میں بھی کشیدگی اور جھڑپوں کے واقعات رونما ہوئے۔ کچھ اور مقامات پر بھی گاہے بگاہے لڑائیاں ہوئیں تاہم ان پر کنٹرول پالیا گیا۔ اسی ضمن میں مقامی لیڈروں اور عمائدین نے اہم کردار ادا کیا (Ibid: 67)۔

فلاح و بہبود کی سرگرمیاں

پنجاب کی صورتحال کی پیچیدگی کا اندازہ تمام مذاہب فلاح و بہبود کے اقدامات کی حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے۔ ہندو اس شعبے میں آگے تھے۔ انہوں نے ہسپتال، مفت ڈسپنسریاں، گھوڑوں اور مویشیوں کے لیے پانی کے حوض تعمیر کیے۔ صرف لاہور میں سر گنگارام ہسپتال، جانکی دیوی ہسپتال، گلاب دیوی ہسپتال اور گوالمنڈی میں ڈاکٹر کھیڑا ڈسپنسری ہندوؤں نے بنائے تھے۔ دیال سنگھ کالج بھی سکھ مت سے ہندو مذہب قبول کرنے والے دیال سنگھ نے تعمیر کرایا۔ مسلمان اور سکھ مزاروں اور گوردواروں پر بلاجھجک نیاز تقسیم کرتے تھے۔ سکولوں اور کالجوں میں تعلیم سے متعلق سامان کی فراہمی میں عیسائی آگے تھے۔ مختصر یہ کہ جدید پنجاب کے تمام مکینوں میں ایک گونہ خیر سگالی کی فضا پائی جاتی تھی۔

جہاں تک فلاح عام کا تعلق ہے تو نئے دور کے پنجاب کی تاریخ میں ایک نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور وہ ہے سر گنگارام کا نام، میں گنگارام کی پڑپوتی شیلا فلیتھر سے 7 جولائی 2006 میں برک شائر کاؤنٹی (لندن کا نواح) کے علاقے میں ملا ہوں جو برطانوی پارلیمنٹ کے ایوان بالا دارالامرا کی رکن تھیں۔ انہوں نے لاہور کو ان الفاظ میں یاد کیا:

بیرونیس شیلا فلیتھر

''میں 13 فروری 1934 کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ میری داستان حیات کا میرے خاندان کی لاہور اور اس کے باسیوں سے وابستگی سے گہرا تعلق ہے۔ ان دنوں کسی کو دوست بنانے یا نہ بنانے میں مذہبی شناخت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا تھا۔ نہ صرف امرا میں بلکہ عام لوگوں کے درمیان بھی خیر سگالی اور ہم آہنگی کی فضا پائی جاتی تھی۔ ہمارا بڑا گھر آج کل شیر پاؤ پل کے نام سے مشہور علاقے میں تھا۔ (مطلب گلبرگ کا علاقہ)۔ وہاں میرے والد نے کئی کارخانے لگا رکھے تھے۔ برف خانہ، کٹلری فیکٹری، بیکری اور سوڈا واٹر کا کارخانہ، اپنے آباؤاجداد کے انسان دوست فلسفے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے مالکان اور فیکٹری ملازمین میں دوستانہ تعلق قائم کر رکھا تھا۔ فیکٹری ورکروں کے لیے کوارٹروں کی ایک لمبی قطار تھی جبکہ انتظامی عہدوں پر فائز ملازمین کے لیے نسبتاً بڑے مکانات بھی تعمیر کیے گئے تھے۔ ہمارے ملازمین میں ہر عقیدے کے افراد شامل تھے جو اپنے مکانات میں رہتے تھے۔ ہمارے خاندانی دوستوں میں کئی مسلمان تھے اور کئی افراد کو ہم اپنے خاندان کا فرد ہی تصور کرتے تھے۔ مجھے بالخصوص ایک شیعہ خاندان یاد ہے جس کے ساتھ ہمارے گہرے مراسم تھے اور میں ان کی ایک لڑکی کے ساتھ امام باڑہ جاتی تھی۔ میری والدہ جو بنیاد پرست ہندو تھیں وہ عام

طور پر مسلمانوں کے گھر کھانا پسند نہیں کرتی تھیں لیکن وہ مسلمان حکیم کے گھر کھا لیتی تھیں۔ اسی خاندان کے اظہر علی حکیم آج بھی لاہور میں مقیم ہیں۔

"میں نے 1992 میں پہلی بار اور پھر 1996 اور 1998 میں لاہور کا دورہ کیا۔ پرانی عمارتیں بدستور وہاں تھیں۔ صرف لاہور شہر بھارتی شہروں کی طرح گنجان آباد ہو چکا تھا۔ یہاں انگلینڈ میں بھی میرے کئی اچھے پاکستانی دوست ہیں اور ان میں سے کئی یہ جان کر خوش ہوتے ہیں کہ میں گنگارام کی اولاد ہوں۔"

لیڈی فلیتھر نے اپنی یادداشتیں بتاتے ہوئے کہا کہ ان کے خاندان کو مئی 1947 میں ہنگامے عروج پر پہنچنے کے بعد لاہور چھوڑنا پڑا۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئیں کہ میں (مصنف) نے 1962 میں گنگارام ہسپتال سے ہی اپنڈکس کا آپریشن کرایا تھا۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ گنگارام ہسپتال کے قریبی علاقے مزنگ کے مکین بشمول میرے دادا الحاج میاں علم دین نے ہسپتال میں 100 بستروں کا وارڈ بنانے کے لیے عطیات دیے تھے۔

سلمٰی محمود نے 'پنجاب کا ایک عظیم بیٹا' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں گنگارام کے حالات زندگی بیان کیے ہیں۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان تھے جنہوں نے سخت محنت کی۔ پیسے کمائے اور پھر بہت کچھ خیرات کیا۔ تعلیمی شعبے میں ان کی خدمات کا ذکر ہو تو انہوں نے لیڈی میکلیگن سکول برائے گرلز تعمیر کرایا۔ جس کا ایک حصہ تمام مذاہب کی بچیوں کے لیے وقف تھا۔ ہیلی کالج آف کامرس کی تعمیر گنگارام کی طرف سے کئی لاکھ روپے کے عطیے سے ممکن ہو سکی۔ D.A.V. کالج کے لیے بھی انہوں نے کثیر عطیہ دیا۔ اب یہ اسلامیہ کالج سول لائنز کے طور پر جانا جاتا ہے۔ سلمٰی محمود لکھتی ہیں کہ:

> گنگارام کا سب سے متاثر کن فلاحی اقدام گنگارام مفت ہسپتال کی تعمیر تھا۔ انہوں نے کوئنز روڈ اور لارنس روڈ کے سنگم پر 1921 میں اراضی خریدی۔ اس کے بعد ایک لاکھ 31 ہزار 500 روپے کی لاگت سے عمارت مکمل کر کے بلا تفریق مذہب اور ذات ضرورتمند مریضوں کے علاج کے لیے کھول دی گئی۔ 1923 میں اس ہسپتال کے انتظامی معاملات گنگارام ٹرسٹ سوسائٹی نے سنبھال لیے اور آج یہ لاہور میں میو ہسپتال کے بعد علاج و معالجہ کی سہولیات کی فراہمی میں دوسرا بڑا ہسپتال ہے۔ میری والدہ بھی وہاں کافی عرصے تک انتظامی عہدے پر فائز رہیں اور میرے دونوں بچوں نے بھی گنگارام ہسپتال میں ہی جنم لیا۔ اس لیے اس ہسپتال کی ہمارے دل میں کافی قدر و منزلت ہے (TheFridayTimes, 2-10April2010)۔

تینوں مذاہب کے درمیان سماجی تعلقات

ذاتی اور مقامی سطح پر تینوں مذاہب کے درمیان روزمرہ کے معاملات میں رابطے ہوتے تھے۔ زراعتی شعبے میں گاؤں کی زرعی پیداوار میں مختلف برادریوں کے خدمات سرانجام دینے والے افراد کو حصہ دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خوشی و غمی کے موقع پر بھی مل جل کر کام کیا جاتا تھا۔ مسلمان ہندوؤں کا تیار کردہ کھانا کھا لیتے تھے اور البتہ ہندو صرف کھانے کا کچا سامان قبول کرتے تھے۔ محلوں اور دیہات میں سماجی رابطے اور تعلقات کار دوستانہ تھے۔ قصبوں اور دیہات میں علاقے کے بڑے جمع ہو کر مشترکہ

مسائل پر مشاورت اور فیصلے کرتے تھے۔ ایسے دیہات بھی تھے جہاں مسلمان اور ہندو کھیتی باڑی مل جل کر کرتے تھے۔ دکاندار زیادہ تر ہندو اور کچھ کچھ سکھ تھے۔

تاہم شاید زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اہل پنجاب اپنے اپنے سماجی یا ثقافتی بندھنوں میں منظم تھے۔ بزرگ روحانی شخصیات اور بدروحوں پر سب کا اعتقاد تھا۔ عام دیہاتی باشندے ایک دوسرے سے مشکل میں مدد مانگتے تھے، یوں ان کے درمیان باہمی اور وسیع تر وفاداری کا تعلق تھا۔ جہاں ہندو اور سکھ دونوں مسلمانوں کے بزرگوں کے مزارات پر حاضری دیتے تھے۔ وہاں مسلمان بھی روحانی اور جسمانی امراض یا مشکلات کے حل کے لیے پنڈتوں اور سادھوؤں سے رجوع کر لیتے تھے۔ مسلمان اور ہندو دونوں سکھ مت کے بانی بابا گورو نانک کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ کئی سکھ اور ہندو مسلمان بزرگوں کے مرید تھے۔ اس کا اندازہ آپ اس کہانی سے لگا سکتے ہیں جو مجھے 7 جنوری 2005 میں پٹیالہ میں امریک چند آہلووالیہ نے سنائی:

''ہمارا خاندان ممتاز سکھ شخصیت بندہ بہادر کے دور میں سرہند سے پٹیالہ میں منتقل ہوا تھا۔ میری پیدائش 1925 میں ہوئی۔ ہم راسخ العقیدہ ہندو لیکن پیر حضرت سخی سرور کے مرید بھی تھے۔ جن کا مزار ڈیرہ غازی خان میں ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تو اپنے والدین کے ساتھ وہاں دربار پر جاتا تھا۔ ہندو، مسلمان اور سکھ ایک کنبے کی طرح رہتے تھے۔ ان کے درمیان بہت زیادہ پریم پیار تھا۔ مسلمان ہمیں کھانے کے لیے بغیر پکائے ہوئے سامان بشمول گوشت بھیجتے تھے جبکہ وہ ہمارا پکا کھانا بلا جھجک تناول کر لیتے تھے۔ ہم گوشت صرف بکرے اور بھیڑ کا کھاتے تھے (یعنی گائے کا گوشت نہیں) چاہے وہ حلال ہی کیوں نہ ہوتا۔ پٹیالہ میں کئی مسلمان (قصاب) رہتے تھے اور ہم ان سے حلال گوشت خرید لیتے تھے۔''

انگریز محقق سر ڈینزل ابیٹسن (1994) نے اپنی کتاب 'پنجاب کی ذاتیں' میں لکھا ہے کہ پنجاب میں مقیم مسلمان، سکھ اور ہندو دیہی برادریوں کی اکثر گوتیں ایک ہی تھیں۔ البتہ ہندوؤں کی تاجر اور برہمن ذاتوں سے مسلمان بننے کی تعداد بہت کم تھی۔ یہ صورتحال پنجاب کے مختلف علاقوں میں مختلف تھی۔ جاگیردار ایک طاقتور طبقہ تھا جو کاشتکاروں اور ہنرمندوں سے معاوضے پر اور بلا معاوضہ کام لیتا تھا اور یہ لوگ خود نو آبادیاتی نظام کے رکھوالے کے طور پر کام کرتے تھے۔ زیادہ تر جاگیردار مسلمان تھے جبکہ تھوڑی تعداد ہندوؤں اور سکھوں کی بھی تھی۔ وہ دیہی علاقوں میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے تھے اور انگریز فوج کے لیے بھرتیاں بھی کرتے تھے۔

قبل از تقسیم پنجاب کی یادیں

بزرگ انقلابی لیڈر دادا امیر حیدر جن کا بچپن راولپنڈی کے قریب پوٹھوہار کے علاقے میں گزرا تھا نے سکھ اور ہندو سیٹھوں جن سے مسلمان قرضہ لیتے تھے کا ذکر کیا ہے۔ تاہم انہوں نے اپنے ساتھ بنیاد پرست ہندو خاندانوں کے مشفقانہ سلوک بالخصوص ایک مندر کے پروہت برہمن کی مہربانی کی بھی تفصیل بتائی ہے۔ جب دادا امیر حیدر اپنے سوتیلے باپ کے برے سلوک سے تنگ آکر گھر سے فرار ہوئے تو انہی ہندوؤں نے انہیں پناہ دی۔ اگرچہ ان کے ساتھ نہایت محبت کا برتاؤ کیا گیا تاہم مسلمان ہونے کے ناتے کھانا الگ برتن میں دیا جاتا تھا لیکن وہ اسے ہندوؤں کا تعصب نہیں بلکہ مذہبی عقیدہ سمجھتے ہیں (Gardezi, 1989: 22-33)۔

ضلع گجرات سے تعلق رکھنے والے پرکاش ٹنڈن (73 :1988) سمجھتے ہیں کہ پنجاب کے برہمن کوئی مراعات یافتہ طبقہ نہیں تھا بلکہ وہ محض پجاری تھے اور خیرات پر گزارا کرتے تھے۔ وہ تصدیق کرتے ہیں کہ پنجابی مسلمان اور غیر مسلم ایک جگہ پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ہندوؤں کی کھانے کی عادات میں ناپاکی کے عنصر کو کافی اہمیت حاصل تھی اور اونچی ذات کے ہندو ان عادات کا ہم مذہب نچلی ذاتوں پر بھی اطلاق کرتے تھے۔ پنجاب میں 1930 کے عشرے تک برہمن اور کھتری ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ دوسری طرف ایک ہی ذات کے ہندو اور سکھ نہ صرف ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے بلکہ باہمی شادیاں بھی کرتے تھے۔ دوسرے مذہب میں شادیوں کا رواج بھی تھا۔ خصوصاً تجارت پیشہ ذاتوں کھتری اور اروڑہ کے افراد آپس میں شادیاں کرتے تھے۔ کچھ دیہات یا علاقوں میں مکمل طور پر مسلمان، سکھ یا ہندو آباد تھے جبکہ بعض دیہات یا شہروں میں کثیر المذاہب افراد مقیم تھے۔ سکھ اور ہندو زمیندار مسلمانوں کو مزارع، کاریگر اور دیگر چھوٹے موٹے کاموں کے لیے رکھتے تھے۔ ہندو کی خدمتگار مسلمان ذاتوں کے لیے ججمانی سسٹم jajmani system رائج تھا۔

مجموعی طور پر تمام مذاہب کے درمیان امن و بھائی چارے کی فضا پائی جاتی ہے۔ وزیر اعظم نواز شریف کا خاندان امرتسر سے 20 کلومیٹر دور تحصیل ترن تارن کے گاؤں جاتی امرہ کا واحد مسلمان خاندان تھا۔ دادا امیر حیدر بتاتے ہیں کہ:

> جی، میرے والد بتاتے ہیں کہ ان کے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بڑے دوستانہ تعلقات تھے۔ انہوں نے کبھی ہمارے خلاف مذہبی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ شادی مرگ اور دیگر سماجی اجتماعات کے موقع پر ہمارے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جاتا۔ ہم کسی امتیاز اور تعصب کے بغیر ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے تھے۔ غیر مسلم ہمارے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتے تھے جیسا کہ گاؤں کے دیگر افراد کے ساتھ کرتے تھے (Warraich, 2008:29)۔

ممتاز بھارتی فلمساز اوپی دتا نے بھی بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ کیسے شمالی پنجاب کے قصبہ چکوال میں بین المذاہب تعلقات دوستانہ اور باہمی احترام پر مبنی تھے۔ وہ ایک واقعہ لکھتے ہیں:

> یہ کہا جاتا ہے کہ سماجی قوانین نافذ نہیں کیے جاتے بلکہ یہ خود بخود رائج ہو جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت 1930 کی دہائی میں چکوال کے معاشرے سے ملتا ہے۔ اس کہانی کا آغاز سکول ٹیچر رام سرن داس کی لے پالک بیٹی کے اقدام خودکشی سے ہوا۔ وہ لڑکی مایوسی کا شکار تھی کیونکہ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا والد اس کے متوقع شوہر کے جہیز کا مطالبہ پورا کرنے کے قابل نہیں۔ اس نے اپنے باپ کو شرمندگی سے بچانے کے لیے خودکشی کا فیصلہ کیا۔ اپنی محدود تنخواہ سے رام سرن داس بمشکل اپنے کنبے کو دو وقت کی روٹی فراہم کر سکتا تھا۔
>
> چکوال کے باسی آپس میں مل جل کر اور برہمن سنگھ سیستانی، ماسٹر گیان چند، تری لوکھی ناتھ ایڈووکیٹ، برہان الدین خوجا، امین قریشی (قصبے کی واحد مٹن شاپ کا مالک) قاضی عمر اور ماسٹر بدھا رام جیسے سیانوں کی رہنمائی میں زندگی بسر کر رہے

تھے۔ چکوال کے شہریوں نے متفقہ قرارداد پاس کی کہ ہر دلہن کو والد کے سماجی رتبے سے قطع نظر صرف 500روپے کا جہیز دیا جائے گا۔ خلاف ورزی کرنے والے کا سماجی بائیکاٹ کیا جائے گا اس طرح بظاہر قدامت پسند نظر آنے والا معاشرہ حقیقت میں روشن خیال تھا(Dutta, 2000: 4)۔

پنجاب پولیس کے سابق آئی جی راؤ عبدالرشید نے مشرقی ضلع روہتک کے گاؤں کلانور کے سماجی حالات کی دلچسپ منظر کشی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

ہمارا گاؤں کلانور مسلمان راجپوتوں کا مضبوط گڑھ تھا۔ یہ بہت سخت گیر راجپوت تھے۔ وہ اپنے خون کو خالص رکھنے میں زبردست احتیاط کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اگر کوئی رشتہ آتا تو وہ بڑی باریکی میں جا کر تسلی کرتے کہ وہ راجپوت ہے۔ کلانور ایک بڑا گاؤں تھا جس کی آبادی 10ہزار تھی۔ مسلمان راجپوتوں کی آبادی نصف تھی۔ تمام زمینیں مسلمانوں کی ملکیت تھیں۔ ہندو تاجروں جن کا کاروبار کلکتہ تک پھیلا ہوا تھا، نے مسلمانوں کی زمینوں پر گھر بنا رکھے تھے۔ وہ سالانہ ایک روپیہ یا سو روپیہ علامتی کرایہ دیتے تھے۔ جب ہندوؤں میں کوئی شادی ہوتی تھی تو وہ دلہے کو گھوڑے پر بیٹھا کر سلامی کے لیے مسلمانوں کے پاس لاتے تھے۔ وہ مٹھائیاں اور دیگر اشیا بھی ساتھ لاتے۔ یہ ایک رسم تھی جس کے بغیر شادی کی تقریب مکمل نہیں ہوتی تھی۔ کسی ہندو کے پاس گھوڑے پر بیٹھنے کا یہ آخری موقع ہوتا تھا۔ ورنہ غیر مسلم راجپوتوں کو گھڑ سواری کی اجازت نہیں تھی۔

ہمارے ہندو راجپوتوں کے ساتھ خونی رشتے تھے۔ ہم ایک ہی برادریوں سے تعلق رکھتے تھے۔ پنچایتوں میں مسلمان اور ہندو راجپوت اکٹھے بیٹھ کر فیصلے کرتے اور فیصلے سناتے۔ تحریک پاکستان شروع ہونے سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ امتیاز تھا تو راجپوتوں اور غیر راجپوتوں کا تھا۔ وہاں راجپوت (ہندو اور مسلمان دونوں) خود کو افضل سمجھتے تھے کیونکہ ان کے پاس زمینیں تھیں، تاہم جیسے ہی تحریک پاکستان میں تیزی آئی تو دونوں میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ایک گاؤں میں ہندو راجپوت نوجوانوں نے مسجد کو آگ لگا دی۔ اس پر ان کے بزرگوں کو زبردست افسوس ہوا۔ چنانچہ ایک پنچایت طلب کی گئی جس میں ہندو مسلمان بڑوں نے شرکت کی۔ ہندو عمائدین نے واقعے پر معافی مانگتے ہوئے مسجد کی حرمت کی پیشکش کی چنانچہ بھائی چارے کی فضا ایک بار پھر قائم ہو گئی۔ ایک ہندو راجپوت نے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ "ہم ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ ایک انقلاب کی وجہ سے ہمارے راستے جدا ہو گئے (یعنی کچھ مسلمان ہو گئے) اور باقی ہندو رہے۔ اب ایک اور انقلاب برپا ہونے والا ہے۔ کیوں نہ ہم دوبارہ ایک ہو جائیں؟۔ تم لوگ اپنے خونی رشتہ داروں کو چھوڑ کر دوسرے ملک کیوں جانا چاہتے ہو؟" یہ اپیل نہایت خلوص کے ساتھ کی گئی تھی، ہمارے کچھ بزرگ جو راسخ العقیدہ مسلمان لیکن پرانی روایات اور تہذیب کے بھی اتنے قائل تھے، نے ان سے کہا کہ "بھائیو ہم تمہاری دعوت پر غور کریں گے اور بعد میں جواب دیں گے"۔ اس پر میرا مرحوم بڑا بھائی کھڑا ہوا اور بزرگوں سے مخاطب ہو کر بولا "کیا آپ اپنا مذہب تبدیل کرنے کے خواہاں ہیں؟" انہوں نے کہا کہ "نہیں" "تب وہ بولا" تو پھر اس مسئلے پر غور کرنے والی کون سی بات ہے۔" اس کے بعد بھائی نے پوری پنچایت سے مخاطب ہو کر کہا "چونکہ دونوں فریقوں کے لیے اپنا اپنا مذہب نہایت عزیز ہے۔ اس لیے ہم خود مذہب تبدیل کریں گے نہ آپ سے مذہب تبدیل کرنے کی توقع کریں گے"(Rashid, 2010: 15-19)۔

چودھری محمد بشیر

''میں ضلع گورداسپور کی تحصیل پٹھانکوٹ کے گاؤں مکھن پور میں 1932 میں پیدا ہوا۔ ہمارے گاؤں کی آبادی نصف مسلمانوں اور نصف ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ ہمارا گھرانہ آرائیں کاشتکاروں میں ممتاز تھا۔ گاؤں میں مسلمان گجر بھی مقیم تھے۔ ہندو زیادہ تر برہمن اور کھتری تھے۔ ہم ہر ممکن طریقے سے ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی چشمک پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس حقیقی محبت اور ہمدردی پائی جاتی تھی۔ مجھے بالخصوص اپنا ہمسایہ پنڈت بو اُدتا یاد ہے۔ وہ پیسے قرضے پر دیتا تھا لیکن دل کا بہت اچھا انسان تھا۔ ایک بار الرجی کے باعث میری آنکھیں متورم ہو گئیں۔ میں رونے لگا تو اس نے اپنے گھر کی چھت سے آواز دے کر کہا ''بیٹا مت رو، میں تمہاری مدد کروں گا''۔ پھر وہ کوئی دوائی لے کر آیا اور میری آنکھوں میں ڈال دی۔ میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ پاکستان مجھے بہت اچھا لگا لیکن میرا دل اب بھی بھارت میں میرے گاؤں میں ہے۔''

رانا محمد راشد

''میں راجپوت برادری سے تعلق رکھتا ہوں اور 21 دسمبر 1928 کو موضع موغیہ راجپوت ضلع ہوشیارپور میں اپنے ننھیال کے گھر میں پیدا ہوا۔ ہمارا پورا گاؤں مسلمانوں کا تھا اور آرائیں برادری کی اکثریت تھا۔ البتہ زیادہ تر زمینیں ہماری ملکیت تھیں اور ہم (یعنی راجپوت) وہاں کے چودھری تھے۔ میں نے کپورتھلہ کی تحصیل بنگا میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں بیشتر اساتذہ اور طلبا ہندو تھے۔ ہمارے استاد نہایت نیک لوگ تھے۔ جب ہم میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے تو ہمارے استاد پنڈت شام سوروپ نے پیشکش کی کہ اگر تم 5، 6 طلبا مل جاؤ تو میں تمہیں گھر پر بھی اضافی پڑھا سکتا ہوں۔ چنانچہ ہم پانچ لڑکے جو سب مسلمان تھے جمع ہو گئے۔ ماسٹر جی ہر صبح ہمارے پاس آتے اور دوپہر تک پڑھاتے رہتے۔ انہوں نے ہم سے کوئی فیس نہیں لی۔ ان کے گاؤں اور ہمارے گھر کے درمیان ایک قبرستان تھا۔ جہاں ہم اکٹھے ہوتے تھے۔ جب میں تقسیم پنجاب کے دوران پاکستان آ گیا تو میں نے چیچہ وطنی سے ماسٹر جی کو خط لکھ کر بتایا کہ میرے والدین راستے میں ہی موت کا شکار ہو گئے ہیں اور ہم یہاں بالکل بے سروسامانی کی حالت میں پڑے ہیں۔ 20 روز بعد ماسٹر جی کا جواب آیا کہ جب انہوں نے اپنی والدہ کو یہ تفصیل بتائی تو صدمے کے مارے انہوں نے پورا دن کچھ نہ پکایا۔''

احد ملک

''میں 1936 کو جالندھر شہر میں پیدا ہوا۔ ہم ڈوگر برادری کے ہیں اور ہمارے والد کا بنیادی طور پر تعلق ہوشیارپور کی تحصیل دسووا سے تھا۔ ہماری والدہ آرائیں اور جالندھر کی رہنے والی تھیں۔ ہمارا گھر کوچہ ہاشم پور کے محلہ اقرار خان میں تھا۔ میں ایک ایسے علاقے میں پلا بڑھا جہاں سیاسی سرگرمیاں کافی زیادہ تھیں۔ ہندو اور مسلمان الگ الگ محلوں میں رہتے تھے۔ لالہ بہاری مل کا ہمارے محلے میں دودھ کا کاروبار تھا۔ اصل میں وہ جالندھر کے لیے دودھ کا سب سے بڑا اسپلائر تھا۔ وہ بہت اچھا انسان تھا اور ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک دوائی تھی اور وہ ہر کسی کو دانت کا درد ہونے پر دیتا تھا۔ وہ روئی پر

دوائی رکھ کر مسوڑھوں پر لگاتا تھا جس سے درد معجزانہ طور پر جاتا رہتا۔ رمضان میں اگر کسی غریب مسلمان گھرانے کا کوئی بچہ اس کی دکان پر جاتا تو وہ بلا معاوضہ اسے دودھ دے دیتا۔ وہ صحیح معنوں میں خدا خوف انسان تھا۔ اس کا بیٹا محکمہ دفاع میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ میرے والد دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریز فوج کی طرف سے فلسطین میں تعینات تھے۔ میری والدہ ان کے بارے میں بہت پریشان تھیں چنانچہ انہوں نے بہاری مل کے بیٹے سے مدد کی درخواست کی۔ اس طرح چند روز میں میرے والد کا تبادلہ ہندوستان میں ہو گیا۔ بہاری مل کے علاوہ بھی کئی اچھے ہندو تھے۔ ان میں سے کئی مثلاً پریم سہگل جو عظیم گلوکار کے ایل سہگل کے بھائی تھے میرے بڑوں کے دوست تھے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اکثر ہندو ہم سے جسمانی طور پر فاصلہ رکھتے تھے۔ جب ہم ہندو حلوائی کی دکان پر جاتے تو وہ ہمیں چھونے سے گریز کرتے۔ ایک بار 1945 میں ہم لاہور سے فرنٹیر میل پر واپس آئے۔ جالندھر سٹیشن پر پہنچے تو رات پڑ چکی تھی۔ ایک تانگے والے نے جو مسلمان جاٹ تھا، نے کہا کہ آپ لوگ تانگے پر چڑھیں، اس اثنا میں فرنٹیئر میل سے ہی آنے والی ایک ہندو خاندان وہاں آ گیا اور تانگہ سالم کرانے کی کوشش کی۔ کوچوان نے کہا کہ آپ لوگوں نے بھی جانا ہے تو ساتھ بیٹھ جائیں یا پھر پیدل جائیں۔ چنانچہ وہ طوعاً و کرہاً بیٹھ گئے لیکن ہمارے ساتھ چھونے سے مکمل طور پر بچتے رہے۔ اگرچہ قصبے میں مالی طور پر ہندو سب سے تگڑے تھے اور ان کی فیکٹریاں اور کاروبار تھے لیکن کچھ مضبوط مسلمان خاندان بھی تھے۔ جن کی اپنی زمینیں اور پھل سبزی کی مارکیٹیں تھیں۔ البتہ مسلمان زمیندار ہندوؤں کے مقروض تھے۔"

سید اعجاز حسین جعفری

"میرا تعلق ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر کے قصبہ مہتاب پور کے حکیم خاندان سے ہے۔ ہمارا گاؤں بڑا مثالی تھا۔ جہاں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی امن اور بھائی چارے کے ساتھ رہتے تھے۔ کوئی دشمنی نہیں صرف محبت تھی۔ ہمارے بڑے آنکھوں کا آپریشن کرتے تھے۔ تمام باراتیں ہماری حویلی میں اترتی تھیں اور پورا دن مہمانوں کی وہاں دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ اس کا کسی قسم کا کرایہ نہیں لیا جاتا تھا۔ ہندو اور سکھ محرم کی مجالس میں شرکت کرتے تھے جبکہ ہم ہندوؤں اور سکھوں کے تہواروں میں حصہ لیتے تھے۔ ہم ان کے اور وہ ہمارے گھروں میں کھاتے پیتے تھے۔

"تقسیم سے کچھ عرصہ پہلے میرے والد نے میرے ٹیچر گورداس رام پنڈت سے درخواست کی وہ مجھے کوئی ہنر سیکھانے میں مدد دیں۔ انہوں نے مجھے لاہور کے علاقے دھرم پورہ میں مقیم ایک سکھ ہرنام سنگھ کے پاس بھیج دیا تاکہ میں گھڑیوں کی مرمت کا کام سیکھ لوں۔ جب تقسیم کا وقت بالکل قریب آیا تو لوگوں کو پتہ چلا کہ ہندوستان دو ملکوں میں بٹنے والا ہے۔ لاہور میں رہتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ صورتحال جلد بگڑ جائے گی۔ چنانچہ میں واپس جالندھر گیا اور اپنے خاندان اور رشتہ داروں کو لاہور لے آیا۔ اگرچہ نکودر تحصیل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن میں سمجھتا تھا کہ ہم لاہور میں زیادہ محفوظ ہوں گے کیونکہ مسلمان یہاں زیادہ طاقتور ہیں۔ جب ہم اپنا محلہ چھوڑ رہے تھے تو ہندو اور سکھ ہمارے پاس آئے اور میرے والد سے کہا کہ حکیم صاحب آپ کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ اگر کوئی آپ پر حملہ کرے گا تو اسے پہلے ہماری لاشوں سے گزرنا پڑے گا۔ میرے والد نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ حالات ٹھیک ہونے پر ہم واپس آ جائیں گے۔ افسوس ایسا کبھی نہ ہو سکا۔

جب ہم لاہور پہنچے تو میں گھڑی ساز ہرنام سنگھ سے ملنے گیا لیکن اسے اور اس کے اہل خانہ کو چند روز قبل ہی ہلاک کیا جا چکا تھا۔ وہ بہت اچھا انسان تھا۔ وہ ہر وقت گرنتھ صاحب کی تلاوت کرتا رہتا تھا اور مجھے اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا تھا۔ وہ بہت اچھے دن تھے اور لوگ بھی بہت اچھے تھے۔ میں اب بھی اپنا آبائی علاقہ دیکھنے کے لیے ترستا ہوں لیکن اب میری بینائی کم ہو گئی ہے اور میں کبھی اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا۔ یہ یادیں اب میرے ساتھ قبر میں ہی جائیں گی۔"

محمد فیروز ڈار

"بنیادی طور پر ہم وزیر آباد کے رہنے والے ہیں جہاں ہمارے دادا 1870 میں کشمیر سے منتقل ہوئے تھے لیکن میرے والد ریلوے میں ملازم تھے اور ان کی تعیناتی راولپنڈی میں تھی اور میں یکم اپریل 1936 کو ریلوے کالونی میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والد ٹرین ڈرائیور رہے تھے۔ میرے تین بڑے بھائی اور دو بڑی بہنیں تھیں۔ ریلوے کالونی ریلوے سٹیشن کے قریب تھی۔ ہم سب ہندو، سکھ، مسلمان عیسائی حتیٰ کہ انگریز ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ مذہبی تہواروں کے موقع پر سب ایک دوسرے کو مٹھائیاں بھیجتے تھے۔ میرے بھائی ہندو اور سکھ دوست ہمارے گھر میں آتے جاتے تھے اور ہمارے درمیان کبھی کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ صرف ایک ضابطے کا ہر کسی کو خیال رکھنا پڑتا تھا کہ ہمیں ہندوؤں کی رسوئی میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ عید کے موقع پر میں اپنے ہندو، سکھ اور عیسائی دوستوں کو مسجد لے جاتا تھا جہاں تمام بچوں کو مٹھائی کھانے کو ملتی۔ اسی طرح کرسمس پر ہم چرچ جاتے جہاں ہمیں چاکلیٹ دی جاتی تھی۔ ہم لوگ مندر اور گوردوارہ بھی جاتے تھے۔ ہمارے ہمسائے میں چاچا شیر سنگھ اور ان کی بیوی لیلا کور رہتے تھے۔ لیلا چاچی اکثر ہمارے گھر آتی تھیں اور وہ ہماری والدہ کی بڑی بہن جیسی تھیں۔ چاچا شیر سنگھ کی صحت خراب رہتی تھی۔ میں اور میرے والد ایک بار ریلوے ہسپتال لاہور میں ان سے ملنے گئے تھے۔ ہمارا ان کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ ہسپتال کے برآمدے میں لیلا کور کھانا پکا رہی تھیں۔ ہمارے محلے میں بابو سری رام بھی رہتے تھے۔ ان کا بیٹا ہمیشہ میرا قریبی دوست تھا۔ جب میں ان کے ہاں جاتا تو باورچی خانے میں جانے سے گریز کرتا تھا۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے اس کی والدہ مجھے کہتی تھی کہ "فوزی جب تم گوشت پکاؤ تو ہمیش کو بھی کھلایا کرو تاکہ یہ مضبوط ہو جائے" (ہندو گوشت نہیں کھاتے) میں نے یہ بات اپنی ماں کو بتائی تو اس کے بعد جب بھی ہم نے گوشت پکایا وہ ہندو دوست کو بھی کھلایا۔

"جب میری والدہ کا انتقال ہوا تو تمام مذاہب کے افراد افسوس کے لیے آئے۔ اس کے کافی عرصے بعد تک محلہ دار ہندو اور سکھ خواتین راستے میں مجھے روک کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی تھیں جو پنجاب میں یتیم یا بے آسرا بچوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ میری ماں کا ذکر نہایت افسردگی سے کرتی تھیں۔ یہ کسی نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ ایک دن راولپنڈی کی گلیوں میں خون بہے گا اور سکھ اور ہندو ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائیں گے۔ 1945 کے بعد سے حالات عجیب و غریب ہونے لگے تھے۔ ہم نے سنا کہ ہندوستان آزاد ہونے لگا ہے لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ کہانیاں گردش کرنے لگیں کہ ایک مسلمان ملک پاکستان کے نام سے وجود میں آنے والا ہے اور اس کی معجزانہ علامتیں سامنے آرہی ہیں۔ کبھی سنا کہ ایک جگہ بچھڑا پیدا ہوا ہے جس کے ماتھے پر پاکستان لکھا ہے۔ ایک اور حیرت انگیز کام یہ ہوا کہ ہندو اور سکھ ملازمین کا مشرقی پنجاب تبادلہ ہونا شروع ہو گیا۔ کئی ہمارے ہمسائے 1947 سے پہلے ہی راولپنڈی چھوڑ کر جا چکے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد حیرت کا اظہار کرتے کہ

آخر ہو کیا رہا ہے؟۔ مثال کے طور پر بابو سری رام اور دیگر ہندو افسران کا تبادلہ دہلی کر دیا گیا جبکہ کچھ مسلمان اور انگریز افسر اچانک راولپنڈی میں تعینات کر دیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ ہر کسی کو کسی نہ کسی حد تک پتہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہاں تک ہندو اساتذہ کا بھی تبادلہ دہلی کر دیا گیا۔ ان تبدیلیوں کے باوجود کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ تقسیم سے اتنی خونریزی بھی ہو سکتی ہے۔

"ہندوؤں اور سکھوں نے جائیداد یں بیچ کر روانگی شروع کر دی تھی۔ یہ غالباً 1946 کا سال ہوگا۔ 1945-46 کے انتخابات سے ریلوے کالونی کے معاملات پر زیادہ اثر نہیں پڑا لیکن مجھے یاد ہے کہ میرے والد ووٹ ڈالنے وزیر آباد ضرور گئے کیونکہ وہاں ہماری جائیداد تھی۔"

رکشت پوری

"میں 24 فروری 1924 کو لاہور کے علاقے شاہ عالمی دروازے میں پیدا ہوا۔ ہم عقیدے کے لحاظ سے رادھا سوامی ہیں۔ ہم کسی باضابطہ مذہب پر یقین نہیں رکھتے ہیں بلکہ روحانیت اور انسانیت کو مانتے ہیں۔ رادھا سوامی مکتبہ فکر کے ماننے والوں کا مضبوط گڑھ بیاس کا خطہ تھا جو اب مشرقی پنجاب میں واقع ہے۔ جب ہمارے عقیدے کے گروہ کے سربراہ باباجی نے لاہور کا دورہ کیا تو ان کے ایک تہائی پیروکار مسلمان تھے۔ جی ہاں ہر عقیدے کے افراد نے رادھا سوامی تحریک میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ہم بھگت کبیر، گورونانک، بلھے شاہ اور دیگر صوفیوں کے ماننے والے ہیں۔ جب تقسیم ہند ہوئی تو باباجی نے اپنے مسلمان پیروکاروں کو پاکستان بھیج دیا لیکن ہدایت کی کہ تم اپنی شناخت ظاہر نہ کرنا۔ ایسا کرنا ضروری تھا کیونکہ مشرقی پنجاب میں مسلمان شناخت کے ساتھ رہنا نہایت خطرناک بن چکا تھا۔"

پنجاب میں ایک اور دلچسپ مذہبی تحریک حسینی برہمنی تحریک تھے۔ حسینی برہمنوں کو میہل برہمن کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کے مشہور قبیلوں میں دت، بالی، چھبڑ، وید شامل ہیں اور ایک زمانے میں یہ پورے پنجاب میں پائے جاتے تھے۔ دیگر پنجابی برہمنوں کے برعکس یہ لوگ زراعتی پیشے سے وابستہ رہے اور پولیس اور فوج میں ملازمتیں بھی کرتے تھے۔ ان کی خاندانی داستانوں میں سے ایک دیومالا یہ ہے کہ ان کے آباؤاجداد میں سے کچھ بزرگ خطہ عرب میں مقیم ہو گئے تھے اور ان کے ایک بزرگ رحاب سدھو دت اور ان کے بیٹوں نے حضورؐ کے نواسے امام حسینؓ کا کربلا کے میدان میں جنگ میں ساتھ دیا تھا اور لڑتے لڑتے جان دے دی۔ ان میں سے کچھ افراد بچ گئے اور واپس پنجاب لوٹ آئے۔

اس خاندان کے 3 مختلف افراد نے یہ کہانی معمولی ردوبدل کے ساتھ مجھے سنائی۔ ان میں بھارت کے مشہور اداکار سنیل دت، پروفیسر وی این دت اور سینئر صحافی جمنا داس اختر شامل ہیں۔ حسینی برہمن عقیدے کے لحاظ سے ہندو ہی رہے تاہم یہ لوگ سانحہ کربلا کی یاد میں مجالس ضرور منعقد کرتے ہیں۔ تقسیم سے قبل پنجاب میں حسینی برہمنوں کی دوہری شناخت کو ان اشعار میں واضح کیا گیا ہے۔

واہ دت سلطان
ہندو کا دھرم
مسلمان کا ایمان
آدھا ہندو آدھا مسلمان

مصنف مشکور صابری نے مجھے بتایا کہ وہ بچپن میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں سالانہ لیلارام ڈرامہ فیسٹیول میں بھگوان رام کا کردار ادا کرتے تھے۔ شروع شروع میں بنیاد پرست ہندو سیخ پا ہوئے لیکن میں نے رام کا کردار اتنا شاندار طریقے سے ادا کیا کہ مجھے مستقل اس کردار کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ 1930 کے عشرے میں کیمبل پور (اٹک) کے ایک گاؤں کے سکول یعنی دھرم شالہ میں ایک مسلمان لڑکی نور بھری کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی گئی تاہم اسے باہر ہندو لڑکیوں کے ساتھ باہر بیٹھ نا پڑتا تھا کیونکہ یہ دراصل لڑکوں کا سکول تھا۔ اس وقت یہ غیر معمولی کامیابی تھی کیونکہ خواتین بالخصوص مسلمان خواتین ،وہ بھی دیہی علاقوں، میں تعلیم حاصل کرنے کے واقعات بہت کم ملتے ہیں۔

تقسیم سے پہلے کا لاہور

آغا اشرف کی خود نوشت ''ایک دل ہزار داستان'' کا آغاز 1920 کی دہائی میں اندرون لاہور میں بچپن کی یادوں سے ہوا (1989:16-24)۔ مقامی سکولوں میں تمام عقائد کے بچے مل کر پڑھتے تھے۔ انہوں نے دیال سنگھ سکول کے اپنے ہندو اور سکھ اساتذہ کا انتہائی احترام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ وہ کبھی کبھار ہندو، مسلمان اور سکھ ہم جماعتوں کے ساتھ سکول سے بھاگ کر چلے جاتے اور ہندوؤں کے مندروں میں گھومتے رہتے۔ ان دنوں اندرون شہر (یعنی فصیل کے اندر والا لاہور) میں شراب نوشی، افیون کھانے، جوئے اور ایسی دیگر بری عادات کا رواج عام تھا۔ خود آغا اشرف بھی شرابی دوستوں میں بیٹھ کر خوشی محسوس کرتے تھے۔

ایک اور اہم خود نوشت 'میرا شہر لاہور' میں یونس ادیب نے 1930 کی دہائی کے بعد کے حالات اور اندرون شہر کے معاشرے کا احاطہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لڑکپن کے دور میں وہ بلا روک ٹوک ہندو مندروں اور برہمنوں کے گھر میں آ جا سکتے تھے۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ لوگوں نے بنیاد پرست ہندو ازم، سکھ ازم اور اسلام سے پہلو تہی کرتے ہوئے ایک منفرد طرز زندگی اختیار کر لیا تھا جس کے باعث ہم آہنگی کا مثالی طرز معاشرت وجود میں آیا، مقامی محلوں میں کسی تعصب کے بغیر غریب اور بے بس افراد کی امداد کی جاتی تھی۔ اگرچہ کبھی کبھار مذہبی احساس تفاخر دوسرے مذہب کے افراد سے کوئی امداد قبول کرنے میں مانع ضرور ہوتا تھا۔ لاہور کی کثیر الثقافت نوعیت پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ ہندو محرم کے جلوس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرتے تھے جبکہ مسلمان منٹو پارک میں سالانہ رام لیلا میلے میں جوق در جوق شرکت کرتے تھے (1991:36-40)۔ کئی تو دیوالی اور دسہرے کے تہوار میں بھی شامل ہوتے تھے۔ وہ لوگ جو معاشرے سے فرار کے خواہاں تھے ان کے لیے صوفیوں کے مزارات تکیے، ہندوؤں اور سکھوں کے بے عقیدہ افراد کے گروہوں، افیون کھانے والوں کے ڈیروں کی پناہ گاہیں موجود تھیں۔ محروم افراد کے لیے ان پناہ گاہوں میں بنیاد پرست عقائد اور رسوم کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ یونس ادیب اسی منظر نامے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

> مجھے بالخصوص لالہ گنپت رائے یاد ہیں جن کا مخصوص ہندوانہ لباس اور شباہت ہوتی تھی۔ وہ تنگ پاجامہ اور لمبا کرتا پہنتے تھے۔ ایک واسکٹ اور سر پر ٹوپی بھی ہوتی تھی۔ ان کے چہرے کو دیکھتے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ وہ انتہائی شفیق اور دوستانہ انسان

ہیں۔ یہ ان کا معمول تھا کہ جب وہ کوچہ درزیاں کی مسجد کے پاس سے گزرتے تھے تو وہ تھوڑا سا جھک کر اپنے ہاتھ سے مسجد کی سیڑھیوں کو تعظیم دیتے(Ibid:163)۔

میں نے تقسیم سے پہلے کے اندرون شہر کے ایک سابق مکین معروف ماہر تعلیم پروفیسر شوکت علی سے بات چیت کی۔ یہ ملاقات 29 جولائی 2002 کو امریکی شہر مینز فلیڈ میں ان کے بیٹے کے گھر پر ہوئی۔

پروفیسر شوکت علی

''میں بھاٹی گیٹ کے ایک غریب محلے میں غریب مسلمان گھرانے میں 1923 میں پیدا ہوا۔ محلہ جلوٹیاں کوچہ نکرچیاں اندرون شہر کا ہندو اکثریتی آبادی والا علاقہ تھا۔ ہم پانچ بھائی بہن تھے اور گھر میں صرف میری ماں سلائی کڑھائی جیسے چھوٹے موٹے کام کر کے پیسے کماتی تھی، اس علاقے میں ڈھائی سو سے زائد خاندان رہتے تھے جن میں صرف پانچ مسلمان تھے۔ ہمارے ہندو ہمسائے بہت مہربان اور خدا خوف لوگ تھے۔ تقریباً ان تمام ہندوؤں کے گھروں میں ایک گائے ضرور تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہماری والدہ غریب عورت ہے، وہ ہمیں مفت دودھ، مکھن اور دہی دیتے تھے۔ ہولی اور دیوالی جیسے مقدس تہواروں کے موقع پر ہمیں مٹھائیاں بھی دی جاتی تھیں۔ مجھے ایک بھی ایسا موقع یاد نہیں جب انہوں نے ہمارے جانے پر اپنے گھر میں ناگواری کا اظہار کیا ہو۔ صرف ہمیں رسوئی میں جانے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ وہ صرف ہندوؤں کے لیے مخصوص ہوتی تھی اور مسلمانوں کو باورچی خانہ میں نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ یہ دراصل ان کے مذہبی عقیدے کا معاملہ تھا اور اس میں سرمو کوئی تعصب یا امتیاز کا عنصر شامل نہیں تھا۔ ہندو عورتیں ہمارے گھر آ کر گھنٹوں میری ماں کے ساتھ باتیں کرتی تھیں۔

''میں دیال سنگھ ہائی سکول میں پڑھا۔ جہاں میرے بیشتر دوست ہندو طلبا تھے۔ سکول میں امتیازی سلوک کا شائبہ تک نہیں ملتا تھا اور ہمارے اساتذہ نہایت اچھے، مہربان اور مدد کرنے والے تھے۔ سکول سید مٹھا بازار میں واقع تھا اور مجھے بھاٹی گیٹ سے پیدل چل کر وہاں جانا پڑتا تھا، یہ میری بڑی خواہش تھی کہ میں استاد بن جاؤں لیکن گھر کے حالات کافی حوصلہ شکن تھے۔ میری ماں نے میری خواہش پوری کرنے کے لیے زیادہ کام شروع کر دیا جبکہ سید مٹھا بازار میں ہی رہنے والے چچا بھی ہماری مالی مدد کرتے تھے چنانچہ میں نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لے لیا جہاں میں آہستہ آہستہ بی اے (آنرز) کلاس میں پہنچ گیا۔ میرے دو ہندو اساتذہ مجھ پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور مجھے محنت کرنے کی ترغیب دی۔ ایک پروفیسر پریم کرپال تھے جنہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے والد رائے بہادر ایشور داس پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ وہ ریس کورس روڈ پر رہتے تھے۔ پروفیسر پریم کرپال ہم میں سے بعض طلبا کو اضافی پڑھائی کے لیے گھر بھی بلوا لیتے تھے۔ میرے سوا دیگر لڑکے متمول خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ صرف میں نے شلوار قمیض اور سر پر ترکی ٹوپی پہن رکھی ہوتی تھی۔ وہاں ان کے گھر میں ہمیں کافی اور مغربی ممالک کی سوغاتیں کھانے کو دی جاتی تھیں۔ یہ چیزیں میں نے کبھی پہلے نہیں کھائی تھیں۔ اسی طرح دوسرے پروفیسر لاجپت رائے نیر تھے۔ میں ان کے گھر بھی جاتا تھا جو مزنگ چونگی کے پاس میانی صاحب کے قریب تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ نہایت شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔''

کلدیپ کمار چوپڑہ

"میرے ناناجان بلی رام کھلر ضلع لاہور کے دیہی علاقے کاہنہ کاچھا کے ایک بڑے زمیندار تھے۔ 7 گاؤں ان کی جاگیر میں شامل تھے۔ ان کے دو کزن دولت رام کھلر اور جگن ناتھ کھلر لاہور کے معروف وکیل تھے۔ ناناجی کی کئی سرائیں تھیں جہاں مسافر بلا معاوضہ قیام کرتے اور انہیں کھانا بھی مفت ملتا تھا۔ ہماری زمینوں پر کام کرنے والوں میں زیادہ تر مسلمان تھے۔ ہم انہیں رہائش، مناسب معاوضہ اور اناج دیتے تھے۔ یہ مسلمان میرے ناناجی کی حویلی میں بھی کام کرتے تھے۔ میرے ناناجی حقہ پینے کے عادی تھے۔ ان کے مسلمان زمیندار دوست بھی ان کے ساتھ ہوتے اور کبھی کبھار یہ محفل پوری رات جاری رہتی۔ وہ کھانا پینا بھی ایک ساتھ کرتے تھے۔ ایک بار میری نانی اماں بیمار پڑ گئیں۔ ان دنوں میری والدہ دودھ پیتی بچی تھیں چنانچہ میری ماں کو ایک مسلمان دایہ نے کم از کم دو ماہ تک اپنا دودھ پلایا چونکہ کاہنہ کاچھا بھارتی سرحد سے زیادہ دور نہیں چنانچہ ہمارے خاندان نے 1947 میں بحفاظت سرحد پار کرلی۔ بعد ازاں میرے ماموں اندر سین نے 1956 میں کاہنہ کاچھا کا دورہ کیا۔ میرے نانا کے ایک مزارعے نے حویلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ انہوں نے ماموں کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور کہا کہ آپ لوگ واپس پاکستان آجائیں۔ میری ماں جو ہنس راج مہلا کالج لاہور میں پڑھتی رہیں۔ اب بھی کہتی ہیں کہ ان کی زندگی کا بہترین حصہ لاہور میں گزرا۔"

دوسری طرف میرے دادا ملکھی رام چوپڑہ جو حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ میں رہتے تھے کو برے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ انڈین ریلوے میں افسر تھے۔ انہیں تقسیم ہند کے ہنگاموں کے دوران چھرا گھونپ کر قتل کر دیا گیا۔ ان کے بچوں نے جب اپنے باپ کا اپنی آنکھوں کے سامنے خون ہوتے دیکھا تو وہ دہشت زدہ ہو کر جس طرف سینگ سمائے بھاگ گئے۔ اس وقت میرے والد کی عمر محض 18 سال تھی۔ انہوں نے ہاتھ پاؤں مار کر کسی نہ کسی طرح بھارتی سرحد کے اندر فیروزپور پہنچنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ وہ کئی ماہ تک سو نہ سکے اور رات کو ڈراؤنے خواب دیکھتے تھے اور ذہنی تناؤ کا شکار رہے۔ اس کے باوجود سرحد کے آر پار میرے بزرگوں کے دل میں پاکستانیوں کے لیے زیادہ نفرت نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ (1947) تاریخ کا ایک لمحہ تھا جس میں بربریت حاوی ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی کہتے ہیں کہ تقسیم نہیں ہونی چاہیے تھی۔

'لاہور: ایک گمشدہ شہر' کتاب کے مصنف سوم آنند تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں اپنے بینکار باپ فقیر چند کے ساتھ رہ گئے تھے۔ میری ان سے ملاقات دہلی میں ہوئی جہاں میں نے ان کے ساتھ تقسیم اور 1947 کے حالات پر بات چیت کی۔ یہاں میں ان کی کتاب میں سے کچھ اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دو ندیوں کی طرح تھے جو ایک ساتھ بہتے تھے لیکن کہیں ملتے نہیں تھے (1998:3)۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> ملیچھ مسلمانوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے روزمرہ کی زندگی میں ہندوؤں نے کئی پابندیاں قائم کر رکھی تھیں۔ مثال کے طور پر میری ماں کسی مسلمان کو رسوئی میں داخل نہیں ہونے دیتی تھیں۔ مسلمانوں کے ہاتھ کی پکی کوئی چیز قبول نہیں کی جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح ہمسائے مسلمانوں کی طرف سے کوئی خصوصی ڈش میرے والد کے لیے بھیجی جاتی تھی تو وہ ڈائننگ ٹیبل سے آگے نہیں جاتی تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ کسی مسلمان عورت کو خود کو چھونے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ البتہ

میرے بچپن میں یہ رویہ پڑھے لکھے مرد ہندوؤں میں دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ (عورتیں ان معاملات میں ہمیشہ زیادہ قدامت پسند ہوتی ہیں)۔ کچھ عشروں قبل ان قاعدوں پر سب ہی سختی سے عمل کرتے تھے چاہے وہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہی کیوں نہ ہوں۔ ہندوؤں کی نافذ کردہ ان نامعقول پابندیوں کو مسلمانوں نے قدرت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ ان کی پرانی نسل ہندوؤں سے تعلقات میں اپنی حدود جانتی تھی اور مسلمان اپنے برتنوں میں ہندوؤں کو پانی کی بھی پیشکش نہیں کرتے تھے۔ ہندو ہمیشہ مسلمانوں کی انتہا پسندی کی شکایت کرتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ جو دیواریں انہوں نے خود کھڑی کی ہیں اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا۔۔۔

پنجاب کے ہندوؤں کو یہ محسوس کرنے میں کئی صدیاں لگ گئیں کہ ان کا مسلم مخالف رویہ کتنا ضرر رساں اور نامعقول تھا۔ اس ضمن میں تبدیلی کی پہلی لہر 1930 کے عشرے میں تحریک خلافت کے دوران محسوس کی گئی۔ اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھائی چارے کی روح کو آنے والے برسوں میں نقصان پہنچا لیکن معاشرتی سطح پر شہروں میں رہنے والی اشرافیہ نے اپنے ضابطہ اخلاق میں مثبت تبدیلیاں ضرور کر لیں۔ اس میں زیادہ ہاتھ مغربی تعلیم کا تھا۔ اسی تبدیلی کا اثر میرے والد پر بھی ہوا تھا۔ جب وہ جوان تھے تو میری ماں بتاتی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان انہیں ہاتھ لگا تا وہ اپنے کپڑے تبدیل کر لیتے لیکن میرے لڑکپن میں ماڈل ٹاؤن (لاہور) میں ان کے کئی مسلمان دوست تھے اور وہ اپنی بیوی کے رویے کو پسماندہ قرار دیتے تھے (Ibid:3-5)۔

متنازعہ کتاب 'رنگیلا رسول' کے پبلشر راج پال کے بیٹے دینا ناتھ ملہوترا نے 1940 کی دہائی کے لاہور کے ماحول کے بارے میں میرے ساتھ بڑی تفصیل کے ساتھ بات چیت کی۔ انہوں نے سوم آنند کے ان خیالات کی تصدیق کی کہ کچھ ہندو روایات میں مسلمانوں کی تضحیک کا پہلو نکلتا تھا۔ میں ان کی کتاب سے اقتباس پیش کر رہا ہوں:

لاہور میں موسم گرما کے دوران اچھے ہندو خاندانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان رضاکار نسبت روڈ پر کیوڑا اور صندل والے ٹھنڈے پانی کی ریڑھی لگاتے اور ہر گزرنے والے کو نہایت شائستگی سے پانی کی پیشکش کرتے لیکن یہ دعوت صرف ہندوؤں کے لیے ہوتی تھی۔ اگر کوئی مسلمان چاہے وہ اچھے لباس میں ہی کیوں نہ ہوتا پانی مانگتا تو اسے ایک گھٹیا گلاس میں پانی پیش کیا جاتا۔ یہ پانی ایک گز لمبے بمبو سے ڈالا جاتا تھا۔ یہ بہت توہین آمیز اور بے عزتی والا طرز عمل ہوتا تھا۔ ایسے رویے سے مسلمانوں نے امتیازی سلوک محسوس کرنا شروع کر دیا۔ یہی وہ حالات تھے جن میں مسلم کمیونٹی نے جناحؒ کے (الگ وطن کے قیام کے) مشورے پر کان دھرنا شروع کر دیے تھے (Malhotra,2004:59)۔

اپنی رام کتھا 'Truth, love and Little Malice' میں مشہور سکھ صحافی مصنف اور مورخ خشونت سنگھ (انتقال: 20 مارچ 2014) نے اوائل بیسویں صدی کے پنجاب کے معاشرے کی کئی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ اس کتاب کا ایک پورا باب لاہور پر ہے جہاں وہ وکالت کی پریکٹس کامیاب بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ خشونت سنگھ 1915

میں ضلع جہلم کے چھوٹے گاؤں ہڈالی میں پیدا ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم میں جتنے فوجی ان کے گاؤں سے بھرتی ہوئے وہ کسی اور گاؤں سے نہیں ہوئے۔ ان میں سے کئی نے انگریز وائسرائوں کے ساتھ باڈی گارڈ کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ خشونت سنگھ نے بتایا کہ گاؤں میں مسلمانوں کے 300 کے لگ بھگ گھر تھے جبکہ پچاس گھرانے ہندو یا سکھ تھے۔ غیر مسلم افراد تجارت، دکانداری اور قرضہ دینے کے کام کرتے تھے۔ خود ان کا گھرانہ گاؤں کا سب سے امیر گھر تھا۔ ان کا گھر اینٹوں سے بنا ہوا تھا جبکہ باقی ماندہ تمام گھر گارے سے بنے ہوئے تھے (یعنی کچے تھے)۔ وہ لکھتے ہیں: "ہم سکھ اور ہندو ہڈالی کے مسلمانوں کے ساتھ غیر آرام دہ لیکن پر امن انداز میں رہتے تھے۔ ہم ان کے بڑوں کو چچا اور چچی کہتے تھے اور وہ بھی ہمارے بزرگوں کو ایسے ہی مخاطب کرتے تھے۔ ہم شادی اور مرگ کے سوا شاذونادر ہی ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے تھے (2002:5)۔

تقسیم سے قبل کے لاہور کے بارے میں لکھتے ہوئے خشونت سنگھ نے اپر مڈل کلاس کے بارے میں کافی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جہاں ہندو اور سکھ آپس میں عام دوستی اور گھریلو تعلق رکھتے وہاں کسی مسلمان کا قریبی دوست ہونا بہت کم نظر آتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> منظور قادر کے ساتھ ہماری دوستی کے باوجود مجھے مسلمانوں اور ہندوؤں سکھوں کے درمیان عمومی تقسیم پر کوئی واہمہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن اور لائبریری میں مسلمان وکلا ہندو اور سکھ وکیلوں سے الگ کارنر پر براجمان ہوتے تھے۔ شادیوں اور فوتیدگیوں میں بھی تو ہم پرستانہ انداز میں لوگ مکس نظر آتے تھے اور زیادہ تر دکھاوا ہی ہوتا تھا۔ مسلم لیگ کی طرف سے قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد یہ خلیج مزید گہری ہوتی چلی گئی (Ibid:105)۔

پریم دھاون

ممبئی فلم انڈسٹری کے سینئر رائٹر اور میوزک ڈائریکٹر پریم دھاون نے مجھے بتایا کہ نوجوانی میں ان کے لاہور جیل میں بند انقلابیوں سے رابطے تھے کیونکہ ان کے والد وہاں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ پھر میں نے مشہور ایف سی کالج لاہور سے 1942 میں گریجویشن کر لی اور مارکس ازم کا فلسفہ اختیار کر لیا۔ 1930 اور 1940 کے عشرے کے لاہور کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ:

"ایف سی کالج (فارمین کرسچن کالج) ایک کاسموپولٹین کی طرح تھا جہاں ہر مذہب کے طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ہم ماحول سے بہت اچھی طرح لطف اندوز ہوتے اور لاہور کے دیگر حصوں کی طرح یہاں بھی ویسے ہی حالات تھے۔ یہ یقیناً برداشت اور روشن خیالی کا شہر تھا۔ میں 1943 میں بمبے چلا گیا۔ (واضح رہے کہ جہاں ممبئی لکھا ہے وہاں مراد موجودہ شہر ہے اور جہاں بمبے لکھا ہے اس سے مراد تقسیم سے پہلے والا شہر ہے۔ نام چند برس پہلے ہی تبدیل ہوا ہے۔) مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ محض چار سال بعد ہندوؤں اور سکھوں کو ہمیشہ کے لیے لاہور چھوڑنا پڑے گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا، بتائیں کیا ہونا چاہیے تھا؟"

سردار شوکت علی

کالج میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار میرے ساتھ مرحوم پاکستانی کمیونسٹ لیڈر سردار شوکت علی نے بھی کیا تھا۔ وہ پریم دھاون کے کلاس فیلو تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میری 2001 میں ممبئی میں پریم دھاون سے ملاقات ہوئی ہے تو ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انہوں نے کہا کہ:

"پانچویں کلاس تک میں نے قصور میں تعلیم حاصل کی۔ 1939 میں مجھے تحصیل اجنالہ، امرتسر کے رام سکھ داس کالج میں داخل کرا دیا گیا جہاں میرے بھائی ریونیو کے محکمے میں قانونگو تھے۔ یہ میرے لیے خوشگوار تجربہ تھا۔ وہاں مسلمان اکثریت میں تھے لیکن ہندو اور سکھ بھی زیر تعلیم تھے۔ ہم ایک ہی کھانا کھاتے تھے۔ پھر میں نے ایف سی کالج لاہور میں داخلہ لے لیا جہاں میری کلاس میں پریم دھاون بھی تھا۔ مجھے اور میرے چند دوستوں کو کمیونسٹ تحریک نے کافی متاثر کیا۔"

طاہرہ مظہر علی خان

طاہرہ مظہر علی خان جو متحدہ پنجاب کے پہلے وزیر اعظم (پریمیئر) کی صاحبزادی اور ممتاز دانشور اور سوشلسٹ رہنما ہیں۔ اپنے تاثرات اس طرح بیان کرتی ہیں:

"میری پیدائش شمالی پنجاب کے قصبے 'واہ' میں ہوئی جو ہمارا آبائی علاقہ تھا لیکن میں لاہور میں پلی بڑھی۔ میں نے کوئین میری سکول میں تعلیم حاصل کی جہاں امیر خاندانوں کی لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ کون سکھ اور کون ہندو ہے۔ ہم ایک دوسرے کے تہوار مناتے تھے۔ ہندو تنظیم مہا سبھا کے لیڈر راجا نریندر ناتھ خود کو میرے والد کے بھائی کہتے تھے۔ وہ ہمارے بہت بہت اچھے خاندانی دوست تھے۔ ہمارے گھر میں دو باورچی خانے تھے۔ ایک مسلمانوں جبکہ دوسرا سکھوں اور ہندوؤں کے لیے تھا۔ یہ بات درست ہے کہ ہندو ہم لوگوں کو باورچی خانے میں نہیں جانے دیتے تھے۔ بعد ازاں میں کانگریس پارٹی کے کمیونسٹ ونگ میں شامل ہو گئی جہاں ہر عقیدے سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوست تھے اور مذہبی اختلاف کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔"

پشپا ہنس

معروف پنجابی گلوکارہ اور اداکارہ پشپا ہنس نے لاہور کی یادوں کو ان الفاظ میں تازہ کیا ہے:

"ہمارا گھر فین روڈ پر تھا۔ میرے والد بیرسٹر تھے۔ میں نے گلوکاری کا آغاز لاہور ریڈیو سٹیشن سے کیا۔ مشہور بالی ووڈ اداکارہ اوم پرکاش ان دنوں فتح محمد اور ایک مشہور مسلمان جس کا نام میں بھول گئی ہوں کا کردار ادا کرتے تھے۔ یہ وقت کا مشہور ترین پروگرام تھا۔ فیروز پور سے تعلق رکھنے والے میاں حمید الدین 13 فین روڈ پر ہمارے گھر کے قریب رہتے تھے۔ وہ بہت قابل وکیل تھے۔ ان کی بیٹی کشور حمید میری بہترین دوست تھی۔ میں اور وہ دونوں مل کر روزہ رکھتی تھیں۔ تعلیم یافتہ طبقے میں مذہبی اختلاف کا کوئی گزر نہیں تھا۔ ہم بہت اچھی طرح رہے تھے۔ ہم تقسیم کے بعد بھی کافی عرصہ تک ایک دوسرے سے رابطے میں رہے لیکن اب مجھے معلوم نہیں کہ کشور کہاں ہے۔ امید ہے کہ وہ زندہ اور اچھی صحت میں ہو گی۔

"جب میں نے مشہور پنجابی نغمے 'ساری رات تکدی آں تیری راہ' اور 'چناں کتھے گزاری اے رات وے' گائے تو پاکستان سے میرے مداحوں نے بار بار ریڈیو سے گانا چلانے کی فرمائشیں بھیجیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک بار میں نے جموں بارڈر پر بھارتی فوج کے جوانوں کے لیے بھی پرفارم کیا تو سرحد کی دوسری طرف پاکستانی فوجیوں نے درخواست کی کہ ایک سپیکر کا رخ سرحد کی دوسری طرف کر دیا جائے۔ بھارتی فوج نے ایسے ہی کیا اور ہمارا وہ وقت بہت اچھا گزرا۔"

انٹرویوز

جمنا داس اختر، دہلی 20 اکتوبر 1999
پریم دھاون، ممبئی 22 اکتوبر 1999
سنیل دت، ممبئی 20 اکتوبر 2001
پروفیسر شوکت علی، مینز فیلڈ
میسا چوسٹس، امریکہ 29 جولائی 2002
نور بھری، لاہور 17 اپریل 2003
چودھری محمد بشیر، لاہور، 18 اپریل 2003
رانا محمد راشد، لاہور 18 اپریل 2003
سید اعجاز حسین جعفری، لاہور 22 اپریل 2003
طاہرہ مظہر علی خان، لاہور 25 اپریل 2003
سردار شوکت علی، لاہور 3 مئی 2003
دینا ناتھ ملہوترا، 15 مارچ 2004
پشپا ہنس، نئی دہلی 31 مارچ 2004
مشکور صابری، ملتان 22 دسمبر 2004
پروفیسر چمن لال اروڑہ، جالندھر 4 جنوری 2005
امریک چند آہلو والیہ پٹیالہ 7 جنوری 2005
رکھشت پوری، دہلی 10 جنوری 2005
پروفیسر وی۔ این دتا، تجربہ کار تاریخ دان، نئی دہلی، 10 جنوری 2005
وی این دت، شیلا فلیتھر، برک شائر کاؤنٹی، 7 جولائی 2006
احد ملک، اسٹاک ہوم، 13 جنوری 2006
میاں مصطفی کمال پاشا، لاہور، 14 جنوری 2005
محمد فیروز ڈار، سولنا، سویڈن، 18 فروری 2007
کلدیپ کمار چوپڑہ، اسٹاک ہوم، 20 اپریل 2011

References

Adeeb, Y., *Mere Shehr Lahore* (*My City of Lahore*), Lahore; Atish Fishan Publications, (1991).

Ahmad, S. *Great Sufi Wisdom: Bulleh Shah*, Islamabad: Saeed Ahmad, (2004).

Ahmed, I., *'Sikh Separatism in India and the Concept of Khalistan'* in Haellquist, K. R. (ed.), *NIAS Report 1990*, Copenhagen: Nordic Institute of Asian Studies, (1990).

Ahmed, I., *State, Nation and Ethnicity in Contemporary South Asia*, London and New York: Pinter Publishers, (1998).

Ahmed, I, *'South Asia'* in David Westerlund and Ingvar Svanberg (eds.), *Islam Outside the Arab World*, pp. 212-252, Richmond: Curzon Press, (1999).

Alhaq, Shuja, *A Forgotten Vision: A Study of Human Spirituality in the Light of the Islamic Tradition*. Chippenham, Wiltshire: Minerva Books, (1996).

Akbar, M. J., *India: The Siege Within*. Harmondsworth: Penguin Books, (1985).

Ali, I., *History of the Punjab* (*1799-1947*), Delhi: Low Price Publication, (1970).

Ali, I., *The Punjab under Imperialism 1885-1947*, Karachi: Oxford University Press, (1989).
Anand, S., *Lahore: Portrait of a Lost City*, Lahore: Vanguard Books Ltd, (1998).
Ashraf, A., *Aik Dil Hazaar Dastan (One Heart and a Thousand Stories)*, (Lahore; Atish Fishan Publications, (1989).
Bhatia, S., *Social Change and Politics in Punjab: 1898-1910*, New Delhi: Enkay Publishers Pvt. Ltd. (1987).
Chaudhry, N. A., *Development of Urdu as Official Language in the Punjab (1849-1974)*, Lahore: Government of the Punjab, (1977).
Darling, S. M., *The Punjab Peasant in Prosperity and Debt*, New Delhi: Manohar Book Service, (1978).
Dutta, O. P., *'Chakwal Fondly Remembered'*, *The South Asian*, http://www.the-south-asian.com/July-Aug2000/Chakwal_memories_4.htm, Delhi, (7 August 2000).
Farquhar, J. N., *Modern Religious Movements in India*, Delhi: Munshiram Manoharlal, (1967).
Gardezi, H. N., *Chains to Lose. Life Struggles of a Revolutionary: Memoirs of Dada Amir Haider Khan*, New Delhi: Patriot Publishers, (1989).
Grewal, J. S. *'Historical Geography of the Punjab'* in *Journal of Punjab Studies*, Vol. II, no. 1, Spring (2004).
Ibbetson, S. D., *Punjab Castes*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, (1994).
Jones, K. W., *Arya Dharm: Hindu Consciousness in 19th-Century Punjab*, DelhI: Manohar, (1989).
Kholi, S. S., *The Life and Ideals of Guru Gobind Singh*, Delhi: Munshiram Monoharlal, (1986).
Lahori, Tahir, *Sohna Shehr Lahore (The Lovely City of Lahore)*, Lahore; Sang-e-Meel Publications, (1994).
Leigh, M. S., *The Punjab and the War*, Lahore: Government Printing Press, (1922).
Malhotra, D. N., *Dare to Publish*, New Delhi, (2004).
Moon, Penderal, *Divide and Quit*, New Delhi: Oxford University Press, (1998).
Nagina, Z. I., *Ghazi Ilam Din Shaheed*, (Lahore; Jang Publishers Press, (1988).
Rashid, Rao, *Jo Meiney Dekha: Pakistani Syasat aur Hukumrani ki Haqiqat (What I Saw: The Inside Story of Pakistani Politics and Governance)*, Lahore: Jamhoori Publications (2010).
Sheikh, M., *'The 30-Year Rule of the 'Three Hakeems'* in *Dawn*, Karachi, 25 June (2005).
Sheikh, M, *'When the 'Wild' Proved More Educated'*, *Dawn*, Lahore edition, 24 January 2010.
Singh, G., *Religion and Politics in the Punjab*, New Delhi: Deep & Deep Publications, (1986).
Singh, K., *A History of the Sikhs, Vol. I, 1469-1839*, Princeton: Princeton University Press, (1963).
Singh, K., *A History of the Sikhs*, Vol. II, *1839-1964*, Princeton: Princeton University Press, (1966).
Singh, K., *Ranjit Singh: Maharajah of the Punjab 1780-1839*, New Delhi: Orient Longman, (1985).
Singh, K, *Truth, Love and a Little Malice*, New Delhi: Viking, (2002).
Talha, N., *Economic Factors in the Making of Pakistan*, Karachi: Oxford University Press, (2000).
Warraich, S., *The Traitor Within: The Nawaz Sharif Story in His own Words*, Lahore: Sagar Publishers, (2008).

Official Documents

Carter, L., *Punjab Politics 1936-1939. The Start of Provincial Autonomy: Governors' Fortnightly Reports and Other Key Documents*, Delhi: Manohar, (2004).

3

تقسیم پنجاب کا آغاز 1900-1944

تفصیلی تناظر

ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے 1857 کی بغاوت کامیابی سے کچلنے کے بعد ہندوستان 1858 میں باضابطہ طور پر تاج برطانیہ کی عملداری میں آیا۔ بغاوت کا آغاز کمپنی کی 'بنگالی فوج' کے چند سپاہیوں کی بغاوت سے ہوا تھا۔ جس کے بعد چند خود مختار حکمرانوں اور مذہبی علما نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا۔ پنجاب میں بھی چند بغاوتیں ہوئیں لیکن کامیابی کے ساتھ کچل دی گئیں۔ ان بغاوتوں کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعاون بھی نظر آتا ہے تاہم انگریز حکمرانوں کی طرف سے مختلف مذاہب کے افراد کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کرنے کی حوصلہ افزائی کی پالیسی کی سرپرستی کے باعث یہ سلسلہ زیادہ دیر آگے نہ چل سکا۔ انگریز دور کا ہندوستانی نظام حکومت بنیادی طور پر دو طرح کے سیاسی انتظامات پر مشتمل تھا۔ ایک تو برطانوی حکومت کے براہ راست انتظامی کنٹرول والے علاقے اور دوسرا سینکڑوں خود مختار ریاستیں۔ ان ریاستوں نے مختلف معاہدوں کے تحت انگریزوں کی بالادستی قبول کر رکھی تھی۔ انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے احیائے نو کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ جس سے ان مذاہب کے درمیان احساس تنہائی مزید گہرا ہو گیا۔

ہندوستان کی کل آبادی میں ہندوؤں کی تعداد اندازاً دو تہائی تھی۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کو تشویش تھی کہ ایشیا کے دیگر خطوں میں پان اسلام ازم کی جو تحریک پھیلتی جاری ہے وہ ہندوستان پہنچ جائے گی اور ہندوستانی مسلمانوں کی مدد سے برصغیر کو تقسیم کر دیا جائے گا۔ پہلے ہی اواخر انیسویں صدی میں بنیاد پرست ہندوؤں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کی ہندومت کو واپسی یقینی بنائے بغیر متحدہ ہندوستانی قوم کا قیام ممکن نہیں۔ کچھ حلقے چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو مغربی ایشیا کی طرف دھکیل دیا جائے لیکن ان میں سے سب سے زیادہ افراد نے مسلمانوں کی زبردستی پرانے مذہب میں شمولیت یعنی شدھی کی وکالت کی(Jones1989)۔ ہندوستان میں مسلمان اقلیت کی کل آبادی 24.9 فیصد تھی۔ ان میں سے بیشتر افراد ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ جو زیادہ تر نچلی ذاتوں، چرواہوں اور دہقان قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے جبکہ بہت چھوٹی سی تعداد میں وہ مسلمان تھے جن کا دعویٰ تھا کہ ان کے آباؤاجداد وسطی، جنوب مغربی اور مغربی ایشیا سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے (یعنی ہندو پس منظر کے حامل نہیں تھے)۔ مسلمانوں کے لیے الگ ریاست یا کئی ریاستیں قائم کرنا بھی بعض مسلمانوں کے نزدیک پرکشش تصور تھا۔ علیحدہ وطن کا مطالبہ کرنے والوں میں سب سے ممتاز شخصیت علامہ اقبالؒ تھے جو پنجاب میں مقیم تھے لیکن ان کا نسلی پس منظر کشمیری برہمن کا تھا۔ 1930 میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب میں انہوں نے مشہور خطبہ دیا جس میں کہا گیا کہ:

ہندوستانی مسلمانوں کا الگ وطن کے قیام کا مطالبہ بالکل جائز ہے۔۔۔ میں پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل الگ ریاست قائم ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ تاج برطانیہ کے اندر یا اس کے کنٹرول کے بغیر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا الگ وطن مجھے ان کا مقدر نظر آرہا ہے(Pirzada,1970: 159)۔

ایک اور پنجابی چودھری رحمت علی الگ مسلمان ریاست کے قیام کے ممتاز علمبردار تھے۔ 1933 میں انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی کے چند دیگر طلبا سے مل کر 'اب یا کبھی نہیں' کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں مسلمانوں کے الگ وطن 'پاکستان' کا خیال پیش کیا گیا۔ لفظ پاکستان دراصل پنجاب، سندھ، بلوچستان اور کشمیر سے اخذ کیا گیا تھا۔ چودھری رحمت علی نے قدامت پسند برطانوی سیاستدانوں میں مسلمانوں کے الگ وطن کی لابنگ شروع کردی۔ 1935 میں اپنے برطانوی ہم مکتب کو انہوں نے لکھا کہ:

ہم پاکستانی از منہ قدیم سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی قومی آزادی کی اپنی امنگوں کے مطابق خواہاں رہے۔ پاکستان وجود میں آنے کے بعد سے برقرار ہے۔ اس کا قانون، مذہب، روحانی اور ثقافتی آئیڈیل ہندوستان سے مختلف ہے۔ بحیثیت قوم ہمارا کوئی بھی پہلو، ان سے مماثل ہے نہ ان کی ہمارے ساتھ کوئی قدر مشترک ہے۔ انفرادی عادات اور قومی زندگی میں ہم ان سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح دیگر اقوام عالم سے الگ ہیں(Aziz,1978: 23-4)۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 جو 1937 کے انتخابات کی بنیاد فراہم کرتا ہے سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ انگریزوں کا ہندوستان سے رخصت ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس ایکٹ میں یہ نکات بھی شامل تھے:

1. ہندوستان ایک کنفیڈریشن ہوگا جہاں صوبوں میں براہ راست برطانوی حکومت کا کنٹرول ہوگا جبکہ خودمختار ریاستیں Princely States بھی ہوں گی۔
2. گورنر جنرل بدستور تمام انتظامی مشینری کا سربراہ ہوگا اور اسے وسیع تر قانونی، مالیاتی اور انتظامی اختیارات حاصل ہوں گے۔
3. صوبوں کو ان کے متعلقہ موضوعات میں خودمختاری حاصل ہوگی۔
4. صوبوں میں مکمل طور پر منتخب وزارتیں قائم ہوں گی تاہم سیکشن 93 کے تحت گورنر اگر محسوس کرتا ہے کہ صوبائی انتظامیہ اپنا کام ٹھیک طرح انجام نہیں دے رہی تو وہ گورنر جنرل (وائسرائے) کی مشاورت سے صوبے کی سول انتظامیہ کا کنٹرول سنبھال سکتا ہے۔ گورنر راج چھ ماہ بعد خودبخود ختم ہو جائے گا تاہم برطانوی پارلیمنٹ قرارداد منظور کر کے اس دورانیے میں ایک سال تک توسیع کر سکتی ہے۔

1937 کے صوبائی انتخابات

ہندوستان کی دونوں بڑی جماعتوں انڈین نیشنل کانگریس (قیام 1885) اور آل انڈیا مسلم لیگ (قیام 1906) نے 1937 کے اوائل میں صوبائی انتخابات میں حصہ لیا۔ کانگریس نے اس الیکشن میں اپنے ان دعوؤں کو آزمایا کہ وہ ہندوستان کے تمام طبقوں کی نمائندہ جماعت ہے جبکہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ آزمایا۔ کانگریس نے اعلان کیا کہ وہ ملک میں جاگیرداری کا خاتمہ کر دے گی۔ یہ بات بڑے جاگیرداروں کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ شمال مغربی ہندوستان میں پنجاب جیسے مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمان جاگیردار اس بات سے بہت نالاں ہوئے۔ کانگریس نے ہندو اکثریت والے صوبوں میں زبردست کامیابی حاصل کی اور 1585 میں سے 711 عام نشستیں جیت لیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے مخصوص 58 نشستوں کے لیے بھی انتخاب لڑا لیکن صرف 26 سیٹیں ملیں۔ مسلم لیگ کو مسلم اکثریت والے صوبوں یعنی پنجاب، سندھ اور این ڈبلیو ایف پی میں بری طرح ہزیمت اٹھانا پڑی۔ اسے پنجاب میں سے صرف 2 نشستیں ملیں اور وہ بھی بعد ازاں ایک رہ گئی کیونکہ ایک رکن فلور کراسنگ کر گیا۔ سندھ اور صوبہ سرحد میں کچھ نہ ملا۔ ان صوبوں میں مسلمان رہنماؤں کے غلبے والی علاقائی جماعتوں نے کامیابی حاصل کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کو ہندو اکثریت والے صوبوں میں زبردست پذیرائی ملی اور اس نے 485 مخصوص نشستوں میں سے 108 سیٹیں جیت لیں (Allana,1977: 149)۔

کانگریس نے پہلے چھ صوبوں اور بعد ازاں آٹھ صوبوں میں حکومت قائم کر لی۔ اس بات کے کچھ شواہد ملتے ہیں کہ متحدہ صوبہ یوپی (جسے اب اتر پردیش کہتے ہیں) میں مخلوط حکومت بنانے کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتہ ہوا تھا لیکن جب ہر جگہ مسلم لیگ کو بری طرح ناکامی ہوئی تو کانگریس معاہدے سے مکر گئی۔ ناقدین سمجھتے ہیں کہ کانگریس نے یہ بہت بڑی سیاسی غلطی کی (Jalal 1985; Seervai 1989; Wolpert 2002)۔ سچائی کچھ بھی تھی لیکن یہ ہر لحاظ سے غیر دانشمندانہ فیصلہ تھا جس سے اس خوف نے سر اٹھایا کہ مستقبل میں کانگریس متحدہ ہندوستان میں یک جماعتی حکومت قائم کرے گی۔ مسلم لیگ نے الزام لگایا کہ کانگریس کی حکومتیں بالخصوص متحدہ صوبوں میں مسلمانوں کے مفادات، ثقافتی شناخت کو نقصان پہنچا رہی ہیں چنانچہ اس نے مسلمانوں کے الگ وطن کے قیام کے تصور پر مسلمانوں کے جذبات کو ابھارنا شروع کر دیا۔ اس نے زور دیا کہ 'ہندو راج' کے نفاذ کا راستہ روکنا چاہیے۔ محمد علی جناحؒ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مسلمان مذہبی اقلیت نہیں بلکہ قطعی الگ قوم ہیں۔ لہٰذا انہیں حق خود ارادیت ملنا چاہیے۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے اپنی اشرافیہ والی سوچ بدلی اور نچلی سطح تک سیاست کرنے کی ٹھان لی۔ 20 مارچ 1938 کو رضاکاروں پر مشتمل "نیشنل گارڈز" کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس کے ارکان کو سبز رنگ کی وردی پہننا ہوتی تھی جس پر سفید چاند تارا آویزاں ہوتا تھا (Allana,1977: 175)۔

دوسری طرف کانگریس نے یہ کہا کہ مسلم لیگ دراصل انگریز نواز مسلمان جاگیرداروں کی نمائندگی کرتی ہے اور عام مسلمانوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں چنانچہ اس نے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے جوابی مہم شروع کر دی۔ اس نے جمعیت علمائے ہند جیسی جماعتوں کو مسلم لیگ کے مقابلے میں میدان میں لا کھڑا کیا۔ مجلس احرار میں شامل بنیاد پرست مسلمانوں کو انگریز حکمرانی اور مسلم لیگ دونوں کے خلاف استعمال کیا گیا (Report of Court of Inquiry 1954: 254)۔ مسلم لیگ کو چاپلوسوں کی جماعت کہا گیا۔ مسلم لیگ نے جواب میں کہا کہ کانگریس کی آڑ میں ہندو راج قابل قبول نہیں۔ مسلمانوں کو

معاشی طور پر بدحال کرنے کے لیے ہندو ساہو کاروں کے مظالم کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ 1937 سے آگے تک محمد علی جناح نے مسلسل یہ موقف اختیار کیے رکھا کہ مسلمان محض ایک اقلیت نہیں بلکہ ہر لحاظ سے ہندوؤں سے الگ قوم ہیں۔ اس انتہائی قسم کی قطبیت کا نتیجہ 1947 میں ہندوستان، بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی صورت میں نکلا۔

پنجاب

1901 میں پانچ سرحدی اضلاع پشاور، کوہاٹ، بنوں، ہزارہ اور ڈیرہ اسماعیل خان کو الگ کر کے علیحدہ صوبہ شمال مغربی سرحدی صوبہ (این ڈبلیو ایف پی) قائم کیا گیا۔ ضلع دہلی کو 1911 میں دارالحکومت بنانے پر پنجاب سے الگ کر دیا گیا۔ پہلے مرکزی دارالحکومت کلکتہ تھا۔ اس کے بعد 14 اگست 1947 تک برطانوی حکومت نے خود مختار چھوٹی ریاستوں سمیت پورے پنجاب کو صوبہ پنجاب قرار دے دیا۔ صوبہ پنجاب کا کل رقبہ 3 لاکھ 57 ہزار 692 مربع کلو میٹر تھا۔ برطانوی حکومت کی عملداری والا علاقہ 2 لاکھ 56 ہزار 640 مربع کلو میٹر پر مشتمل تھا۔ یہ علاقے درج ذیل تھے:

1. راولپنڈی ڈویژن، کیمبل پور (اٹک)، راولپنڈی، جہلم، گجرات، میانوالی اور شاہ پور کے اضلاع پر مشتمل تھی۔
2. ملتان ڈویژن میں منٹگمری، لائل پور، ملتان، جھنگ، مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے اضلاع شامل تھے۔
3. گوجرانوالہ، لاہور، شیخوپورہ، سیالکوٹ، امرتسر اور گورداسپور کو لاہور ڈویژن میں شامل کیا گیا۔
4. جالندھر ڈویژن میں فیروز پور، جالندھر، لدھیانہ، ہوشیار پور اور کانگڑہ کے اضلاع شامل تھے۔
5. انبالہ ڈویژن انبالہ، حصار، روہتک، کرنال، گڑگاؤں اور شملہ کے اضلاع پر مشتمل تھی۔

لاہور اور جالندھر ڈویژن وسطی اضلاع پر مشتمل تھیں۔ وہاں مسلمان معمولی اکثریت میں تھے۔ ان دونوں ڈویژنوں کے علاوہ راولپنڈی ڈویژن کے ضلع جہلم اور گجرات جبکہ ملتان ڈویژن کے ضلع لائل پور میں لاہوری پنجابی زبان لہجے میں معمولی ردوبدل کے ساتھ بولی جاتی تھی۔ سکھوں کی بھی ان دو ڈویژنوں میں کافی تعداد آباد تھی جبکہ مسلمانوں کی واضح اکثریت والے ضلع راولپنڈی میں بھی سکھوں کی بہت آبادی موجود تھی۔ ملتان ڈویژن میں ملتانی یا سرائیکی لہجہ تھا جبکہ راولپنڈی میں اسے پوٹھوہاری بولی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ کیا یہ بالکل الگ زبانیں ہیں یا پنجابی کا ذرا مختلف لہجہ ہیں۔ دوسری طرف انبالہ ڈویژن میں ہندی بڑی زبان تھی۔ حتیٰ کہ روہتک، حصار، گڑگاؤں اور کرنال کے مسلمان جنہیں میو کہتے ہیں ہندی کا دیہاتی لہجہ بولتے تھے اور موٹا گوشت (یعنی گائے کا) نہیں کھاتے تھے۔ انبالہ ڈویژن میں ہندو واضح اکثریت میں تھے۔ اس لحاظ سے انگریزوں کا پنجاب خالصتاً پنجابی بولنے والوں کا مسکن نہیں بلکہ انتظامی لحاظ سے ایک یونٹ تھا۔ ہندو ہر جگہ پائے جاتے تھے لیکن راولپنڈی اور ملتان ڈویژن میں ان کی تعداد خاصی کم تھی۔ پنجاب کو تاج برطانیہ کا 'وفادار ترین' صوبہ ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ گورنر کی مرکزی حیثیت کے ساتھ برطانوی انتظامیہ نے ہر قسم کے فرقے کی سرپرستی کا منظم نظام رائج کیا۔ دیہی علاقوں کو واضح حیثیت دی گئی تھی۔ یوں Land Alienation Act of 1901 دیہات کی کاشتکار اور غیر کاشتکار ذاتوں

میں واضح تقسیم کرتا تھا۔ اس قانون کے تحت غیر کاشتکار ذاتوں پر زرعی زمینوں کی ملکیت حاصل کرنے پر پابندی تھی۔ اس کے نتیجے میں پنجاب میں کاشتکار ذاتوں کا اثر ورسوخ اور طاقت کافی مضبوط تھی۔ اس کے صلے میں یہ لوگ برطانوی فوج کو سپاہی اور سامان سپلائی کرتے تھے۔ ہندوستانی فوج کا نصف حصہ پنجابی سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ جنگ عظیم اول اور دوم میں انہی لوگوں نے انگریزوں کو بھرپور مالی امداد بھی کی۔

پنجاب کی مردم شماری رپورٹیں

انگریز دور کے محکمہ مردم شماری کی رپورٹیں نہ صرف اہم معلومات کی فراہمی کا ذریعہ ہیں بلکہ ہندوستان کے موضوع پر تحقیق میں بھی مسحور کن حد تک معاون ثابت ہوتی ہیں۔ بلاشبہ یہ رپورٹیں نوآبادیاتی نکتہ نظر سے تیار کی گئی تھیں لیکن ان کا ایک شاطرانہ پہلو یہ ہے کہ جب مذہبی انفرادیت کا معاملہ ہو تو آبادی کے موازنے کے وقت برطانوی انتظامیہ کے براہ راست کنٹرول والے علاقوں کو خصوصی حیثیت نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس پورے پنجاب یعنی صوبہ پنجاب کا مجموعی ٹیبل دیا گیا ہے۔ تقابلی ٹیبل میں یہ بات دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ برطانیہ کے زیر انتظام علاقوں کو محض ایک چیز کے طور پر پیش کیا گیا۔ مردم شماری کرنے والے حکام کی یہ سوچ عجیب لگتی ہے کیونکہ انگریزوں کی زیادہ تر سرگرمیاں ان کے اپنے زیر انتظام علاقوں میں ہوتی تھیں۔ مردم شماری میں بالعموم توجہ ذاتوں پر مرکوز کی گئی اور ان کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ 1947 میں پنجاب کی تقسیم سے متعلق جو تفصیل دی گئی ہے۔ اس پر سرحدی کمیشن کے سامنے متعلقہ فریقوں نے جو تفصیلی بحث کی اور تنازع اٹھایا وہ انگریزوں کے زیر انتظام علاقوں سے متعلق تھی۔ ان میں بہاولپور اور بیکانیر کے سوا خود مختار ریاستوں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ البتہ ان کا نکتہ نظر آبپاشی کے نظام اور آبی ذخائر کے حوالے سے ضرور تسلیم کیا گیا۔ جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں وہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہیں۔

صوبہ پنجاب میں آبادی کا تناسب (1901 سے 1941)

سال	مسلمان	ہندو*	سکھ	عیسائی	دیگر
1901	49.6	41.3	8.6	0.3	0.2
1911	51.1	35.8	12.1	0.8	0.2
1921	51.1	35.1	12.1	1.3	0.1
1931	52.4	30.2	14.3	1.5	1.6
1941	53.2	29.1	14.9	1.5	1.3

*ہندوؤں میں شیڈول کاسٹس شامل ہیں۔

Source: Censusof India,1941,Vol.VI,Punjabtable,page46.

برطانوی حکومت کے زیر انتظام علاقوں میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی کا تناسب 1881 سے 1941

سال	مسلمان	ہندو	سکھ	عیسائی
1881	51.72	40.29	6.56	-

1931	56.54	26.83	12.99	1.74
1941	57.06	26.56	13.22	1.77

نوٹ: ان علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا۔ نیچے جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں وہ 'دی پارٹیشن آف دی پنجاب 1947، جلد اول' میں سے لیے گئے ہیں۔ یہ سرکاری دستاویز میاں محمد سعد اللہ نے ترتیب دی تھی۔

1881	52.75
1891	51.83
1901	52.31
1911	55.29
1921	55.27
1931	56.98
1941	57.06

ان اعداد و شمار کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ 1881 سے 1941 کے دوران ہندوؤں کی تعداد میں تیزی سے کمی آئی لیکن اس کمی کا مسلمانوں کی آبادی بڑھنے سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ مسلمانوں کی تعداد قدرتی انداز میں آہستہ آہستہ بڑھی۔ اصل میں ہندوؤں کی بڑی تعداد نے سکھ مت قبول کر لیا تھا۔ قبل ازیں ہم بحث کر چکے ہیں کہ ماضی میں ہندوؤں اور سکھوں کی شناخت زیادہ مختلف نہیں تھی لیکن چھبیسویں صدی کے آغاز میں یہ صورتحال تبدیل ہونا شروع ہو گئی تھی۔

ہندو مت سے ہی نکلنے والوں میں عیسائی اور ادھرمی افراد تھے۔ یہ دونوں تحریکیں تھیں اور ان کی طرف راغب ہونے والوں میں اکثریت نچلی ذات کے ہندوؤں یعنی اچھوتوں کی تھی۔ یہ بات حیران کن نہیں کہ مسلمانوں کی بڑھتی تعداد پر ہندوؤں کو تشویش لاحق ہو گئی۔ پنجاب کی حکومت نے یہ بات نوٹ کی کہ مذاہب کی بعض تنظیمیں اپنے عقیدے کے افراد کی تعداد بڑھا چڑھا کر پیش کرتی تھیں۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کا شکوہ تھا کہ مردم شماری کے اعداد و شمار تعصب پر مبنی تھے اور حکومتی اہلکاروں نے مردم شماری کرتے ہوئے جانبداری سے کام لیا۔

پنجاب کی تقسیم کی تجاویز

آریا سماج کے رہنما لالہ لاجپت رائے نے نومبر دسمبر 1924 میں لاہور کے انگریزی اخبار 'دی ٹریبون' میں کئی آرٹیکل تحریر کیے جن میں کہا گیا کہ میری تجویز یہ ہے کہ پنجاب دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مغربی پنجاب جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کی حکومت ہو جبکہ مشرقی پنجاب کو ہندوؤں اور سکھوں کی عملداری میں دے دیا جائے (Aziz, 1995: 145)۔ انہوں نے یہ بھی تجویز کیا کہ این ڈبلیو ایف پی، سندھ اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کے صوبے قائم کیے جائیں۔

کرپال سنگھ کے مطابق لاجپت رائے کو ستمبر 1924 میں این ڈبلیو ایف پی کے علاقے کوہاٹ میں مسلمانوں کی طرف سے ہندو اکثریت پر خونریز حملوں پر افسوس تھا چنانچہ وہاں سے ہندو اور سکھ نقل مکانی کر کے راولپنڈی میں آباد ہو گئے (9:172)۔ لاجپت رائے خود مختار مسلمان ریاستوں کی بات نہیں کر رہے تھے بلکہ انہوں نے ہندوستان کے اندر ہی مسلمانوں کی خود مختاری

کی تجویز دی تھی(Singh, 1989:10) لیکن ممتاز مؤرخ کے کے عزیز نے 14 دسمبر 1924 میں اپنے آرٹیکل میں کہا کہ لاجپت رائے نے تقسیم ہند کی واضح اور برملا تجویز دی تھی(Aziz,1995:145-146)۔

دوسری طرف ہندوؤں کی اکثریت اور ہندی بولنے والی انبالہ ڈویژن کے بارے میں بعض ممتاز مسلمان رہنماؤں کا خیال تھا کہ اسے پنجاب سے الگ کر دینا چاہیے۔ انگریز خود بھی اس تناؤ کو محسوس کرتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے الگ کر دیا جائے تاکہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جائے۔ علامہ اقبال نے اس تجویز کی حمایت کی۔ دیگر ممتاز مسلمان رہنماؤں میں نواب سر محمد شاہنواز خان شامل تھے(Singh 1989: 12)۔ ایسی تجاویز کی صرف ہندوؤں بلکہ سکھوں نے بھی مخالفت کی کیونکہ اس پر عملدرآمد سے پنجاب میں ان کی آبادی میں زبردست کمی آجاتی۔ اس سے پہلے 1930-31 میں لندن گول میز کانفرنس میں شریک سکھ نمائندے نے انبالہ ڈویژن کو الگ کرنے کے خیال کو ان الفاظ سے مسترد کیا کیونکہ اس طرح پنجاب خالصتاً مسلمان صوبہ بن جاتا۔ انہوں نے کہا کہ:

> اگر مسلمان اس صوبے جہاں وہ معمولی اکثریت میں ہیں میں مخصوص اکثریت کے سوا کوئی تجویز قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تو ہم بھی علاقائی حدود میں تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں جس کے تحت راولپنڈی ڈویژن اور ملتان ڈویژن (منٹگمری اور لائل پور کے اضلاع چھوڑ کر) کو پنجاب سے الگ کر دیا جائے۔ یہ ڈویژنیں مسلمانوں کی اکثریت کی ہیں اور نسلی پس منظر کے لحاظ سے شمال مغربی سرحدی صوبے کے قریب ہیں (quoted in Ibid: 11-12)۔

جیسا کہ شروع میں بتایا گیا کہ پنجاب میں سکھوں کی خواہشات کو مدنظر رکھنا ضروری تھا کیونکہ صوبے کی تیسری بڑی کمیونٹی ہونے کے ناتے اور بالکل الگ شناخت ہونے کے باعث پنجاب کی نئی حد بندی کے معاملے میں سکھ لیڈروں کی رائے کافی اہمیت کی حامل تھی۔ برطانوی فوج میں ان کی بڑی تعداد موجود تھی اس لحاظ سے یہ صوبے کی اہم کمیونٹی تھی۔ اگرچہ 1920 کی دہائی میں آریا سماج کی طرف سے سکھوں کو ہندو مذہب کا حصہ قرار دینے کی تحریک میں دونوں مذاہب میں تلخ کشیدگی ہوئی تھی تاہم سکھ رہنماؤں نے واضح کیا کہ وہ ہندو نہیں۔ البتہ وہ مسلمانوں کو ہی پنجاب میں اپنا بڑا حریف سمجھتے تھے۔

نوآبادیاتی دور میں سیاسی جماعتوں کے ارتقا کا ایک اہم موڑ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام تھا۔ دونوں بڑی جماعتیں اپنی اپنی طرز کی مسابقانہ قوم پرستی کی نمائندگی کرتی تھیں۔ کانگریس خود کو سیکولر اور تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت سمجھتی تھی جبکہ مسلم لیگ صرف مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں علاقائی جماعتیں بھی تھیں۔

پنجاب یونینسٹ پارٹی اور پنجابیت

پنجاب یونینسٹ پارٹی (اب کے بعد اسے صرف یونینسٹ پارٹی لکھا جائے گا) کا قیام 1923 میں عمل میں آیا تھا۔ 1946 کے انتخابات تک غیر منقسم پنجاب میں اس کو بالادستی حاصل رہی۔ اسے پنجابیت (یعنی مشترکہ پنجابی ثقافت) کی بنا پر عوامی حمایت

حاصل تھی۔ پنجاب کو انگریزوں کا وفادار ترین 'شمشیر بکف بازو' سمجھا جاتا تھا کیونکہ انگریز فوج میں نصف تعداد ہندو، سکھ اور مسلمان پنجابیوں کی تھی۔ اس پارٹی کے بانی سر فضل حسین (وفات 1936) نے بین المذاہب ہم آہنگی کی بنیاد رکھی تھی، لیکن پارٹی نے نہ صرف ہندو اور مسلمان زمینداروں، کسانوں بلکہ شہروں میں مقیم ہندوؤں کے مفادات کی نگرانی کی۔ سکھ اس میں شامل نہیں تھے (Oren 1974: 397; Ali1970: 425-81; Hussain, no date of publication given)۔

میں نے ممتاز مسلم لیگی سید افضل حیدر اور دہلی میں مشہور مورخ پروفیسر وی این دت سے تفصیلی انٹرویو کیے۔ دونوں نے کہا کہ سر فضل حسین ایک غیر معمولی پنجابی رہنما تھے۔ میں نے سر فضل حسین کے صاحبزادے عظیم حسین کا بھی لندن میں انٹرویو کیا۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ ان کے مرحوم والد ہندوستان کے اتحاد پر یقین رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ پنجاب کے مسلمانوں کی بہتری کے لیے بھی کام کرتے رہے۔

سر فضل حسین بذات خود جاگیر دار نہیں تھے اور انہوں نے اپنی تعلیم پر میرٹ کے ذریعے سیاست میں اپنا مقام بنایا۔ پنجاب کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے تعلیمی لحاظ سے پسماندہ مسلمانوں کے لیے بڑے تعلیمی اداروں میں کوٹہ سسٹم متعارف کرایا۔ اس فیصلے پر ہندوؤں نے ناراضگی کا اظہار کیا لیکن سر فضل حسین نے پنجاب قانون ساز اسمبلی میں اپنی زبردست تقریروں کی مدد سے اپنی پالیسی جاری رکھی۔ وہ مذہب کو سیاسی رنگ دینے اور پنجاب کی تقسیم کی کسی بھی تجویز کے سخت مخالف تھے۔ اس لیے انہیں تمام برادریوں میں انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے جانشین سر سکندر حیات خان جو پنجاب کے بڑے جاگیر دار تھے بھی اگرچہ ایک عملی سوچ کے حامل سیاستدان سمجھے جاتے ہیں تاہم وہ بھی مذہبی بنیادوں پر پنجاب کی تقسیم کے سخت مخالف تھے (Ali, 1970:425-81; Hussain, no date of publication given)۔

1909 سے بعد تک پنجابی مسلمانوں سمیت ہندوستانی مسلمانوں نے مخصوص نشستوں کے لیے الگ الگ ووٹ دیے۔ 1935 ایکٹ کے تحت صوبے میں گورنر کے ماتحت مکمل طور پر منتخب وزراء لگائے گئے۔ گورنر ہمیشہ انگریز ہی ہوتا تھا اور اسے ہر دور میں مکمل اختیارات حاصل رہے۔ حق رائے دہی کا دائرہ کار بتدریج وسیع کیا گیا لیکن 1937 تک جب انتخابات ہوئے تو ہندوستانی آبادی کے صرف 10 فیصد کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر محدود ووٹ ڈالنے کا حق حاصل تھا۔ سر سکندر حیات خان صوبہ پنجاب کے پہلے پریمیئر (وزیر اعظم) منتخب ہوئے (کچھ انگریز بھی پریمیئر اور بعض دیگر وزیر اعلیٰ رہے)۔ سر سکندر حیات کانگریس پارٹی کی بنیاد پرستی کو ناپسند کرتے تھے۔ کانگریسی لیڈر جواہر لال نہرو نے جاگیر داری ختم کرنے کے لیے اراضی کی اصلاحات متعارف کرانے کی دھمکی دی جو یونینسٹ پارٹی کے لیے ناقابل قبول تھی۔ یہاں تک کہ سر فضل اور سکندر حیات دونوں مسلم لیگ کو بھی ایک ہاتھ دور رکھتے تھے لیکن بعد ازاں کانگریس کی مقبولیت کے خوف سے سر سکندر نے جناح سکندر معاہدہ 1937 پر دستخط کر دیے جس کے تحت پنجاب اسمبلی میں یونینسٹ پارٹی کے ارکان مسلم لیگ کا رکن بننے پر آمادہ ہو گئے اور یوں انہوں نے قومی سطح پر مسلم لیگ کے ہاتھ مضبوط کیے۔ اس کے ذریعے یونینسٹ پارٹی نے پنجاب میں اپنی سیاسی ترجیحات پر عملدرآمد جاری رکھا (Carter, 2004:142-7)۔

سر سکندر سمجھتے تھے کہ پنجاب کا بہترین مفاد انگریز اقتدار کے تسلسل میں ہے۔ وہ کچھ عرصے کے لیے صوبے کے گورنر بھی رہے جو انگریز دور میں ایک غیر معمولی بات تھی۔ یونینسٹ پارٹی کی حکومت کے دوران حکومتی امور میں مسلمانوں کا عمل دخل تیزی سے بڑھا۔ اگرچہ 1940 کے عشرے تک سکھ اور ہندو بدستور آگے تھے۔ البتہ کچھ شعبوں مثلاً پولیس میں

مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی سے کہیں زیادہ تھی۔ جب دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی تو سر سکندر انگریزوں کے مضبوط دست و بازو بن کر ابھرے۔ گورنر سر ہنری کریک نے اپنی 13 ستمبر 1939 کی وائسرائے کو رپورٹ میں لکھا کہ سر سکندر کو امید ہے وہ انگریز فوج کے لیے پانچ لاکھ فوجی بھرتی کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پنجاب کے اعتدال پسند ہندوؤں کی طرح سر سکندر بھی توقع کر رہے تھے کہ کانگریس بھی انگریزوں کا جنگ میں ساتھ دے گی چنانچہ انہوں نے اپنی کابینہ میں 2 کانگریس ارکان کو بھی شامل کر لیا اور یوں پنجاب میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو مزید پھیلایا (Ibid: 378)۔ طاہر لاہوری لکھتے ہیں کہ 1930 کی دہائی میں مسلمان، ہندو اور سکھ سب سیاستدان اعلیٰ معیار کی دیانتداری پر یقین رکھتے تھے وہ کہتے ہیں کہ:

> وزیر خزانہ سر منوہر لال تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا ایک بنک ملازم تھا لیکن اسے کوئی بڑا عہدہ حاصل نہیں تھا۔ اگر وزیر خزانہ چاہتے تو بیٹے کو اعلیٰ منصب دلا سکتے تھے۔ سر چھوٹو رام وزیر بننے سے پہلے چھوٹی سی زرعی اراضی کے مالک تھے۔ جب وہ وزارت سے الگ ہوئے تو ان کی زمین کا رقبہ اتنا ہی تھا۔ سب رہنما مضبوط کردار کے مالک تھے۔ مسلمان رہنما بھی مثالی اور مضبوط کردار کے حامل تھے۔ سر سکندر حیات کا بیٹا فوج میں میجر تھا (4-223 :1994)۔

سیاسی پہلو سے دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ تمام مذاہب کے پنجابی یا کم از کم اشرافیہ پنجابیت یا پنجابی اتحاد کے لیے دوستانہ جذبات رکھتے تھے اور فرقہ وارانہ اختلافات کو مسترد کرتے تھے۔ البتہ کانگریس پارٹی نے فیصلہ کیا کہ جنگ میں انگریزوں کا ساتھ نہ دیا جائے چنانچہ اس کے وزیروں نے 1939 میں استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد منظر نامہ تبدیل ہونا شروع ہو گیا کیونکہ قومی سطح پر کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ میں مسابقت کا لازمی طور پر اثر پنجاب کی سیاست پر پڑنا تھا۔ اس وقت تک کانگریس اور مسلم لیگ کا پنجابیوں پر اثر و رسوخ زیادہ قابل توجہ نہیں تھا۔

یونینسٹ پارٹی کے تیسرے اہم ترین لیڈر متحرک ہندو سر چھوٹو رام تھے جن کا تعلق انبالہ ڈویژن کی ہندی بولنے والی کمیونٹی سے تھا۔ وہ ہریانہ کے جاٹوں کے رہنما تھا اور ان کی ہمدردیاں اونچی ذات کے ہندوؤں کی بجائے کاشتکار کمیونٹی سے تھیں۔ انہوں نے قرضوں میں جکڑے کسانوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے کئی اقدامات کیے (Gopal 1988)۔ انگریز پہلے ہی انتقال اراضی ایکٹ 1901 منظور کر چکا تھا جس کے تحت زرعی اراضی کے ساہوکاروں اور غیر کاشتکار ذاتوں کو انتقال پر پابندی تھی لیکن محض اس اقدام سے ساہوکاروں کو کسی فرنٹ مین کے ذریعے زمینیں ہتھیانے سے نہیں روکا جا سکتا تھا چنانچہ کاشتکار بدستور ان سود خوروں کے شکنجے میں کسے رہے۔ سینئر کمیونسٹ لیڈر اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کے جنرل سیکرٹری ہر کشن سنگھ سرجیت نے ان دنوں کی صورتحال کو اس طرح بیان کیا ہے:

"1940 کے عشرے میں کانگریس پارٹی پنجاب میں شہری تاجر طبقے کا مضبوط گڑھ تھی اور دیہی علاقوں پر اس کا کم ہی اثر و نفوذ تھا۔ 1936 میں جب سر چھوٹو رام نے قرضوں کی معافی کا بل اسمبلی میں متعارف کرانے کی کوشش کی تو کانگریس کے ارکان نے اس کی بھرپور مخالفت کی۔ محمود علی (معروف ٹراٹسکائی مصنف طارق علی کے چچا) اور میں دہلی آئے اور مولانا آزاد سے ملاقات کی جنہوں کانگریس کے ارکان کو بل کی حمایت کرنے کی ہدایت کی۔ ان 13 کانگریسی ارکان میں سے 7 کمیونسٹ

تھے۔ انہوں نے تو بل کی حمایت لیکن دیگر چھ ارکان نے ووٹ نہ ڈالا۔ تاہم یہ بل بڑے کانگریسی رہنماؤں کی حمایت کے بغیر ہی منظور کر لیا گیا۔ اگرچہ ساہوکاروں کے واجب الادا قرضوں سے معافی مل گئی لیکن کاشتکاروں کو فصلوں کی کاشت کے موسم میں پھر بھی پیسے کی ضرورت رہتی اور ساہوکاروں نے اپنا دھندہ جاری رکھا۔"

پنجاب کانگریس

کانگریس کو 1946 کے آخری انتخابات تک پنجاب میں برائے نام حمایت حاصل تھی اور جو حمایت حاصل تھی وہ شہری علاقوں تک محدود تھی اور تمام مذاہب کے قوم پرست اس کی طرف راغب ہوئے۔ البتہ پنجاب میں وسیع النظر قومی بیداری کی بجائے پنجاب میں مختلف مذاہب کے احیائے نو نے سیاسی عمل اور موبلائزیشن کی طرف روٹ کا کام کیا اور اس کا اطلاق کانگریس پر بھی ہوا۔ پال ویلس نے اس صورتحال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> قوم پرستی کی تحریک کی بجائے سماجی بیداری اور سیاسی عمل کے آغاز میں مذہبی گروہوں نے ابتدائی تبدیلی کے عنصر کے طور پر کام کیا۔ انہی حلقوں نے کانگریس پارٹی کی بجائے سیاسی قیادت کی بڑی تعداد پیدا کی اور 20ویں صدی کے پہلے 2 عشروں میں فرقہ وارانہ معاملات جن کا بنیادی عنصر قوم پرستی کی سیاست تھی کی تشکیل میں کردار ادا کیا (1976:390)۔

انہوں نے کانگریس میں ہندوؤں کے دو دھڑوں کی نشاندہی کی ہے۔ ایک دھڑا لالہ لاجپت رائے بھرگاوہ کا تھا جو قوم پرستی کی تحریک کو ہندوانہ رنگ دینے اور مسلمانوں کو رعایت نہ دینے کا حامی تھا جبکہ ستیہ پال گروپ ملک کی آزادی کے مفاد میں پنجاب میں مسلمانوں سے قریبی تعلقات کار کا حامی تھا۔ ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو 1919 میں سانحہ جلیانوالہ باغ سے پہلے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کو آپس میں جوڑنے کے بھی قائل رہے۔ لاجپت رائے بھرگاوہ دھڑے کا پنجاب میں ہندو مہاسبھا اور قومی سطح پر سردار پٹیل سے قریبی رابطہ تھا۔ کانگریس کے یہ دونوں دھڑے اونچی ذات کے شہری علاقوں والے ہندوؤں پر مشتمل تھے اور وسطی پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی وہ اساس تھی جس سے مہاسبھا نے اپنے ارکان بھرتی کیے۔

دوسری طرف ستیہ پال دھڑے نے قوم پرست مسلمانوں کو قریب لانے کی کوشش کی۔ قومی سطح پر جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد ان کی پشت پر تھے۔ بعد ازاں 1928 میں لاجپت رائے جب آنجہانی ہو گئے تو دائیں بازو کے دھڑے کی قیادت ڈاکٹر گوپی چند بھرگاوہ نے سنبھال لی جبکہ ڈاکٹر ستیہ پال کے انتقال کے بعد بھیم سین سچر کانگریس کے پنجاب میں بائیں بازو کے لیڈر بن گئے (Ibid: 389-402)۔ بھرگاوہ گروپ کے کئی کانگریسی ارکان ساہوکار اور کئی مالیاتی سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ البتہ کانگریس پورے ہندوستان میں استعماری نظام کے خلاف وسیع تر جذبات کی نمائندگی کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پنجاب میں انگریز اقتدار کے مخالف مسلمان بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے بالخصوص سانحہ جلیانوالہ باغ اور تحریک خلافت کے تناظر میں پنجاب کانگریس کے چند ممتاز مسلمان رہنماؤں میں ہی مولوی عبدالقادر قصوری (صدر)، میاں افتخار الدین (صدر)، ڈاکٹر سیف الدین کیچلو (صدر)، ڈاکٹر محمد عالم (جنرل سیکرٹری) اور شیخ محمد حیات شامل تھے۔ شیخ محمد حیات

سینئر لیڈر مولانا ابو الکلام آزاد کے بہت قریبی تھے۔ ان کی صاحبزادی محمودہ بیگم نے 2004 میں میرے ساتھ اپنے والد کی پارٹی سے طویل رفاقت پر تفصیلی بات چیت کی۔ مشہور پنجابی شاعر استاد دامن بھی پنجاب کانگریس سے منسلک رہے۔

میں نے جب پاکستانی پنجاب کے معمر افراد سے بات چیت کی تو مجھے زبردست حیرانگی ہوئی کہ انگریز مخالف کئی مسلمان جن کا تعلق جہلم، گجرات، لدھیانہ، امرتسر، ملتان، گوجرانوالہ، جالندھر اور دیگر علاقوں سے تھا وہ کانگریس سے وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ کانگریس کے اتحادیوں میں الاحرار، دیوبند اور اہلحدیث مکتبہ فکر کے بنیاد پرست پنجابی علما بھی شامل تھے۔ البتہ 1940 میں قرارداد لاہور جس میں پاکستان کے قیام کی بات کی گئی تھی کی منظوری کے بعد کئی مسلمان کانگریس کو خیرباد کہہ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ 1930 سے 1940 کے درمیان گورنر کی ارسال کردہ کئی رپورٹوں میں کانگریس پارٹی، گاندھی اور نہرو کے دوروں کو مطعون کرتے ہوئے مایوسی کا اظہار کیا گیا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ گورنر ایمرسن نے پنڈت جواہر لال نہرو کو مہاتما گاندھی سے زیادہ خطرناک لیڈر قرار دیا تھا (Carter, 2004: 69)۔

پنجاب مسلم لیگ

پنجاب مسلم لیگ کا 1938 تک صوبے میں کوئی باقاعدہ دفتر تک نہیں تھا۔ مثال کے طور پر گورنر ایمرسن نے وائسرائے لنلیتھگو Linlithgow کے نام 19 اکتوبر 1936 کو ایک خفیہ رپورٹ میں کہا کہ مسلم لیگ اور کانگریس زیادہ اہم جماعتیں نہیں ہیں (Carter, 2004: 47-56)۔ البتہ آل انڈیا کی سطح پر مسلم لیگ کے بعض اہم رہنماؤں کا تعلق پنجاب سے تھا۔ جیسا کہ سر محمد شفیع، جو بڑے زمیندار اور مشہور بیرسٹر تھے اور محمد علی جناحؒ کے قد کے رہنما تھے (Shahnawaz, 2002)۔ سر محمد شفیع دائیں بازو کے رہنما تھے جو جداگانہ طرز انتخاب اور انگریزوں سے تعاون کے بڑے حامی تھے۔ علامہ اقبال بھی پنجاب سے مسلم لیگ کے قومی سطح کے لیڈر تھے۔ اس کے باوجود مسلم لیگ پنجاب کی سیاست میں پیچھے ہی رہی اور 1937 کے انتخابات میں اسے صوبے سے صرف دو نشستیں مل سکیں۔

اس کے بعد مسلم لیگ کو ہندوستان بھر میں اور بلاشبہ پنجاب میں زبردست پذیرائی ملی اور دانشور طبقہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ 1940 میں جب مسلم لیگ کی طرف سے الگ وطن کا خیال پیش کیا گیا تو مسلمان دانشور اور شہری طبقہ جوق در جوق اس میں شامل ہو گیا۔ البتہ 1943 تک ممتاز مسلمان جاگیردار بدستور یونینسٹ پارٹی میں رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب ان زمینداروں نے محسوس کیا کہ انگریزوں نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کو نمائندہ جماعت کے طور پر بتدریج زیادہ اہمیت دینا شروع کر دی ہے تو انہوں نے پینترا بدلتے ہوئے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی (Talbot,1996)۔

سکھ پنتھی پارٹیاں

سکھوں کو جداگانہ انتخابی حیثیت 1919 میں دی جا چکی تھی اور پنجاب میں ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ انہیں نشستیں ملیں (Grewal, 2000: 132)۔ سکھ پنجاب کی سیاست میں انقلابی غدر پارٹی کے ذریعے داخل ہوئے لیکن یہ دراصل 1925 میں گوردواروں کو ہندو پنڈتوں کے کنٹرول سے آزاد کرنے کی تحریک تھی جس نے سکھوں کو سیاسی میدان میں

داخل کیا اور اس کے نتیجے میں اکالی پارٹی قائم کی گئی۔ سکھوں نے اگرچہ 1942 تک کانگریس سے اپنانا تا قائم رکھا تاہم اکالی یا پنتھی سکھوں نے ہی اپنی کمیونٹی کے مذہبی مفادات کی نگرانی کی۔ اکالیوں کے کئی گروپ تھے اور ان سب کو اجتماعی طور پر پنتھی جماعتیں کہتے تھے۔ سکھ کانگریس سے اس وقت الگ ہوئے جب اس نے ہندوستانی فوج میں مقامی افراد کی بھرتی کی مخالفت کی۔ فوج کی نوکری کئی سکھوں کے روزگار کا ذریعہ تھی اور ان کی بڑی تعداد فوج میں ملازم تھی چنانچہ انہوں نے اکالیوں کی حمایت کی۔ یہ اختلاف اس وقت عروج پر پہنچ گیا جب 1942 میں کانگریس نے انگریزوں کے خلاف 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک شروع کی۔ جب میں نے چندی گڑھ میں پروفیسر کرپال سنگھ سے ملاقات کی تو ہم نے پنجاب کی صورتحال پر تفصیلی تبادلہ خیال کیا۔ (کرپال سنگھ کا انٹرویو آگے آئے گا)۔

چھوٹی سیاسی تنظیمیں اور جماعتیں

انگریز مخالف اسلامی جذبے کے حامل مسلمانوں نے مجلس احرار (1929) میں شمولیت اختیار کی۔ مجلس کے کانگریس سے قریبی رابطے تھے۔ کچھ دیگر فسطائیت سے متاثر لیکن انگریز مخالف مسلمان نیم مسلم جماعت خاکسار تحریک میں شامل ہو گئے (Haafiz 2001:167-200;217-34)۔ دوسری طرف پہلے ہندو مہاسبھا اور بعد ازاں راشٹریہ سیوک سنگھ پنجاب کی سیاست میں متحرک رہیں لیکن ان کا کردار محدود ہی رہا۔ ان جماعتوں کا غضب صرف مسلمانوں کے خلاف تھا اور پنجاب کی تقسیم کے وقت آر ایس ایس صوبے میں دہشت گردی میں کافی سرگرم رہی (Ali 1970: 674-79)۔ یہ تنظیم بم تیار کرنے اور انہیں بلا امتیاز چلانے میں ماہر تھی۔

پنجاب کے کمیونسٹ کھلے عام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کی بنا پر کانگریس کے ونگ کے ذریعے سیاست میں شامل رہے۔ 1941 میں جب ہٹلر نے روس پر حملہ کیا تو ہندوستان کے دیگر حصوں کی طرح پنجاب کے کمیونسٹوں نے بھی جنگ میں روس کی حمایت کی تاہم انگریز حکومت نے ان پر کڑی نگاہ رکھی۔ پنجاب کے کمیونسٹوں (ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں) کا ادیب طبقے اور ریلوے یونین میں کچھ اثر و نفوذ تھا (Josh 1979)۔

23 مارچ 1940 کی قرارداد لاہور

اگرچہ مسلمانوں کے الگ وطن کا خیال 1930 میں سامنے آ چکا تھا اور 1938 میں اس میں کافی تیزی بھی آ گئی تھی لیکن اس نے ٹھوس شکل مسلم لیگ کی 23 مارچ 1940 کو قرارداد کی منظوری کے بعد اختیار کی۔ پہلی بار عوامی سطح پر الگ ملک کا مطالبہ کیا گیا (Malik 2001) اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ:

> آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں یہ اتفاق پایا گیا ہے کہ اس ملک میں کوئی بھی آئینی منصوبہ قابل عمل یا مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو گا جو درج ذیل اصولوں کے منافی ہو گا: یہ کہ جغرافیائی طور پر بنائے گئے خطوں کو ایسی 'خود مختار ریاستوں' میں تقسیم کیا جائے جو آزاد اور خود مختار ہوں (Allana:1977: 226-7)۔

ولی خان کے مطابق احمدیہ کمیونٹی کے سرکردہ لیڈر اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن سر محمد ظفر اللہ خان کو وائسرائے لنلیھنگو نے ہدایت کی کہ وہ ایک یاداشت تیار کریں جس میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کے الگ وطن کے قیام کا مطالبہ کرنے کا مشورہ دیا گیا ہو(Khan 1987:29-30)۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھیں اور انگریز کانگریس پارٹی جو جنگ میں تعاون نہیں کر رہی تھی پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے۔ اس وقت احمدیہ کمیونٹی کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے احمدیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار نہ کریں۔ گورنر سر ہنری کریک نے 25مارچ1940 کو اپنی پندرہ روزہ رپورٹ میں لکھا کہ:

> میری یونینسٹ پارٹی کے رکن اسمبلی اور احمدی لیڈر پیر اکبر علی کے ساتھ آج دلچسپ گفتگو ہوئی۔۔۔۔ پیر اکبر علی نے مجھے دو اہم معلومات دیں جو شاید آپ کی دلچسپی کی بھی حامل ہوں۔ انہوں نے کہا کہ احمدیوں نے ہمیشہ خاکسار تحریک کو خطرناک سمجھا اور ایک بھی قادیانی اس کا رکن نہیں۔ دوسرا یہ کہ احمدیوں کو ان کے مذہبی لیڈر نے ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ مسلم لیگ میں ہرگز شامل نہ ہوں۔ خود اکبر علی کو صرف چھ ماہ کی مدت کے لیے یونینسٹ پارٹی کے رکن کے طور پر شامل ہونے کی اجازت دی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمدیوں کے سربراہ کو جلد احمدیوں کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کی اجازت دینی چاہیے (Carter 2005:101)۔

تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ قرارداد لاہور، پنجاب اور مجموعی طور پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں اہم موثر ثابت ہوئی۔ پنجابی ہندوؤں اور سکھوں نے الگ مسلمان ریاست کے قیام کے تصور پر سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ اس قرارداد کو ہندوؤں اور سکھوں کے اخبارات نے 'قرارداد پاکستان' قرار دیا۔ دوسری طرف مسلم لیگ کی مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ (سی آر اسلم، احمد بشیر، راما نند ساگر اور امر ناتھ سہگل سے انٹرویو)۔ طاہر لاہوری لکھتے ہیں کہ جب مسلم لیگ نے 1940 میں قرارداد منظور کی تو مسلمانوں اور ہندوؤں میں تقسیم کا آغاز ہو گیا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے قیام کی تجویز کی زبردست مخالفت کی جبکہ مسلم لیگ اچانک مسلمانوں میں انتہائی مقبول جماعت بن گئی (1994: 224-5)۔

البتہ شیعہ اور احمدی کمیونٹی نے سنیوں کی برتری والی ریاست پاکستان کے قیام پر تحفظات کا اظہار کیا۔ اس کا صاف اظہار شیعہ لیڈر سید علی ظہیر اور محمد علی جناحؒ کے درمیان جولائی 1944 میں ہونے والی خط و کتابت سے ہوتا ہے (Allana 1977: 375-9)۔ آل پارٹیز شیعہ کانفرنس کی کونسل آف ایکشن نے 25دسمبر 1945 کو ایک قرارداد منظور کر کے تخلیق پاکستان کی مخالفت کی (Bakshi 1997: 848-9)۔ البتہ اہل تشیع کی اکثریت نے اپنی وفاداریاں مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ کر لیں اور امید کی کہ پاکستان فرقہ واریت سے پاک ہو گا۔ شروع میں احمدی بھی الگ مسلم ریاست کے قیام کی حمایت کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار رہے تاہم جناحؒ کی طرف سے احمدی لیڈر سر ظفر اللہ خان کو قائل کرنے کے بعد احمدیوں نے بھی قیام پاکستان کا مطالبہ شروع کر دیا۔ پاکستان کے قیام کی حمایت کا فیصلہ 1947 میں تقسیم سے محض کچھ عرصہ

قبل ہی کیا گیا(Court of Inquiry 1954: 1966-7)۔اس کے بعد احمدیوں نے پاکستان کے مطالبے کے حق میں اپنا پوراوزن ڈال دیا۔ ایسے گروہوں کو جناحؒ نے یقین دلایا کہ پاکستان کسی مخصوص فرقے کا ملک نہیں ہو گا۔

بہر صورت 23مارچ 1940 کو قرارداد لاہور کی منظوری کے بعد مسلم سیاست کی توجہ فیصلہ کن طور پر مسلم اقلیت والے صوبوں کی بجائے شمال مغربی ہندوستان میں مسلم اکثریت والے علاقوں پر مرکوز ہو گئی۔ گورنر ہنری کریک نے یکم اپریل 1940 کو وائسرائے کے نام ایک طویل ٹیلی گرام میں کہا کہ:"مسلمانوں کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم ہونا چاہیے۔اب کوئی بہت ہی جرأتمند مسلمان لیڈر ہی کھلے عام اس کی مخالفت یا اس فیصلے پر تنقید کر سکتا ہے"(Carter 2005: 108-9)۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سر سکندر حیات خان ایسی کسی تجویز کے مخالف تھے لیکن وہ 23مارچ 1940 کو پورے ہندوستان سے پنجاب میں جمع ہونے والے مسلمان لیڈروں کے میزبان تھے، اس لیے انہوں نے یکسر اس فیصلے کو مسترد نہ کیا۔ ہر لحاظ سے پنجاب اب الگ مسلمان ریاست کی جدوجہد میں اہم ترین صوبہ بن گیا تھا۔ یہ بات حیران کن نہیں کہ وہ کمیونٹی جو تقسیم کے فیصلے کو اپنے مفادات کے لیے نقصان دہ سمجھتی تھی وہ سکھ تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی اکثریتی مطلق العنانیت کے خلاف واویلا مچانا شروع کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے 1940 اور 1941 میں مسلسل اپنا پراپیگنڈہ جاری رکھا اور جب سر سٹیفورڈ کرپس اپنے وفد کے ساتھ 1942 میں ہندوستان آئے تو سکھوں کے ایک وفد نے انہیں یاداشت پیش کی جس میں انہوں نے کہا اگر انگریز حکومت تخلیق پاکستان کے مطالبہ کے آگے جھک گئی تو انگریزوں کے مفادات کچلے جائیں گے۔

انہوں نے شکایت کی کہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت غیر حقیقی ہے۔ صوبے کے مغربی خطے میں کچھ علاقے صرف انتظامی وجوہات کی بنا پر شامل کیے گئے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی کا تناسب مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ انہوں نے یاداشت میں لکھا، 'ہم پنجاب کی متحدہ ہندوستان سے علیحدگی کے کسی بھی اقدام کی ہر طرح سے مزاحمت کریں گے۔ ہم اپنے مادر وطن کو کبھی ان لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے جو اس کی بے حرمتی کریں گے'(Mansergh and Lumby 1970: 582-8; Kirpal Singh 1972: 26-7)۔اس یاداشت پر صدر سکھ آل پارٹیز کمیٹی بلدیو سنگھ، ماسٹر تارا سنگھ، جوگندر سنگھ، اجل سنگھ اور موہن سنگھ (سابق وفاقی سیکرٹری) نے دستخط کیے۔ انہوں نے ایک الگ نوٹ میں اپنے دلائل مزید واضح کیے تاہم طوعاً و کرہاً انہوں نے ہندوستان کی تقسیم کی مکمل مخالفت کرنے کی بجائے پنجاب کے دو صوبے بنانے کی تجویز دی۔ جس کی مغرب میں سرحد دریائے راوی ہو جبکہ مشرق میں ہندو سکھ اکثریت والا صوبہ ہو(Ibid: 27-31)۔

خضر حیات کابینہ

کانگریس نے 9اگست 1942 کو 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک شروع کی لیکن اس کا کوئی خاص اثر پنجاب پر نہیں پڑا البتہ پنجاب کے چند کارکن اور لیڈر جیل میں ضرور ڈال دیے گئے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ گورنر کی کسی خفیہ رپورٹ میں 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک کے اثرات کا ذکر نہیں ملتا۔ اسی دوران وزیر اعظم سر سکندر حیات کی 26دسمبر 1942 کو اچانک موت سے پنجاب میں

سیاسی بحران پیدا ہو گیا۔ ان کے جانشین سر خضر حیات خان ٹوانہ بھی اپنے پیشرو کی طرح ہندوستان بالخصوص پنجاب کی تقسیم کی مخالفت کی وہ انگریزوں کے اقتدار کے مسلسل فوائد پر یقین رکھتے تھے۔ تاہم سر ٹوانہ میں سر سکندر جیسی سیاسی خوبیاں موجود نہیں تھیں اور انہیں یونینسٹ پارٹی کے اندر سے قیادت کے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا(Talbot 1996)۔

خضر حیات ٹوانہ اور محمد علی جناح ؒ کے درمیان 1943 اور 1944 میں اس وقت تصادم ہوا جب جناح ؒ نے جناح سکندر پیکٹ 1937 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پنجاب میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش کی۔ سر خضر حیات نے جناح ؒ کے فرقہ وارانہ طرز عمل اور پاکستان کے مطالبے کی سخت مزاحمت کی لیکن یونینسٹ پارٹی کے اندر سے اپنے ہی لیڈر اور سر سکندر کے بیٹے سردار شوکت حیات کی قیادت میں طاقتور جاگیرداروں کے چیلنجوں کے باعث 1943 میں سر خضر حیات کی پوزیشن کافی کمزور ہو گئی تھی(Talbot 1996: 113-124)۔ جب انگریزوں کی رخصتی کا وقت قریب آیا تو جاگیرداروں نے اپنی وفاداریاں مسلم لیگ کی جھولی میں ڈال دیں کیونکہ وہ کانگریس کی حکمرانی والے متحدہ ہندوستان میں نہیں رہنا چاہتے تھے جس نے اقتدار میں آکر جاگیرداری نظام ختم کرنے کو اپنی اولین ترجیح قرار دے رکھا تھا۔

دوسری طرف مسلم لیگ نے پاکستان کے قیام کو بدحال مسلمانوں کے تمام معاشی اور معاشرتی مسائل کے نسخہ اکسیر کے طور پر پیش کیا(Ibid)۔ اس سے پہلے 1944 میں پنجاب کے گورنر برٹرینڈ گلینسی نے نوٹ کیا کہ اس رجحان میں تیزی آتی جارہی ہے۔ انہوں نے 26 اکتوبر 1944 کو اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ:

> میں اس نکتے پر خاص طور پر زور دے رہا ہوں کہ مجھے حالیہ دورہ دہلی میں اندازہ ہوا کہ خام نظریہ پاکستان زبردست خطرات میں گھرا ہے۔ اس نظریے پر جتنا غور کریں یہ اتنا ہی دلچسپ نظر آتا ہے لیکن بظاہر یہ مسلمانوں کے مفادات کے لیے تباہ کن دکھائی دیتا ہے۔ کوئی بھی اس بات کو مسترد نہیں کر سکتا کہ جنگ کے بعد سیاسی شورش برپا ہو سکتی ہے لیکن جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے تو یہاں کوئی خطرناک صورتحال نہیں پائی جاتی۔ البتہ مجموعی طور پر نظریہ پاکستان پر عمل پیرا ہونے میں بہرحال خطرات مضمر ہیں۔ البتہ اس نظریے پر مسلم اکثریت والے صوبے میں جہاں غیر مسلموں کے انتہائی باغی عناصر بھی موجود ہیں عملدرآمد کا مطلب یہ ہے کہ ہم انتہائی شدت والی نوآبادیاتی شورش کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس تناظر میں میرا مشورہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس بات پر قائل کریں کہ انہیں مرکز میں مساوی یا کافی نمائندگی دی جائے گی جبکہ ہندوؤں کو سمجھایا جائے کہ وہ اتحاد اور سکیورٹی کے لیے پہل کرنے پر تیار رہیں(Carter 2006: 106-7)۔

انٹرویوز

امرناتھ سہگل، دہلی 20 اکتوبر 1999

راما نند ساگر، دہلی 25 اکتوبر 1999 اور ممبئی 18 اکتوبر 2001

سی آر اسلم (ممتاز پاکستانی کمیونسٹ لیڈر) لاہور 14 دسمبر 1999

عزیز مظہر، لندن 18 مئی 2002

طاہرہ مظہر علی خان، لاہور 25 اپریل 2002

کرنل ریٹائرنادر علی، 5 اپریل 2003

سید افضال حیدر، لاہور 13 اپریل 2003

احمد بشیر، لاہور 22 اپریل 2003

ہرکشن سنگھ سرجیت (جنرل سیکرٹری کمیونسٹ پارٹی مارکسسٹ آف انڈیا) 18 اکتوبر 1999

محمودہ بیگم، 9 دسمبر 2004

پروفیسر کرپال سنگھ، چنڈی گڑھ 2 جنوری 2005

پروفیسر وی این دت، نئی دہلی 10 جنوری 2005

اعظم حسین (فرزند سر فضل حسین) لندن 6 جون 2005

References

Ahmed, Ishtiaq. '*Let's not forget Jallianwala Bagh*', Lahore: *Daily Times* (13 April 2003).

Ali, I., *History of the Punjab (1799-1947)*, Delhi: Low Price Publications, (1972).

Allana, G. (ed.), *Pakistan Movement: Historic Documents*, Lahore: Islamic Book Service, (1977).

Aziz, K. K. (ed.), *Complete Works of Rahmat Ali*, Islamabad: National Commission on Historical and Cultural Research, (1978).

Aziz, K. K., *History of Partition of India*, Vol. I, New Delhi: Atlantic Publishers and Distributors, (1995).

Bakshi, S. R. (compiler), '*Resolution adopted by Council of Action of the All-Parties Shia Conference*', held at Poona, 25 December 1945, in *The Making of India and Pakistan: Ideology of the Hindu Mahasabha and other Political Parties*, Vol. III, New Delhi, Deep & Deep Publications, (1997).

Batalvi, A. H., *Hamari Qoumi Jidojehed* (*Our National Struggle*), Lahore: Pakistan Times Press, (no year of publication given).

Gopal, M., *Sir Chhotu Ram: A Political Biography*, New Delhi: B. R. Publications, (1988).

Grewal, J. S., '*Punjabi Muslims and Partition*' in Amrik Singh (ed.), *The Partition in Retrospect*, Delhi: Aanamika Publishers & Distributors (P) Ltd, (2000).

Haafiz, Takiuddun, *Pakistan ki Syasi Jamaaten Aur Tehriken* (*The Political Parties and Movements of Pakistan*), Lahore: Classic, (2001).

Husain, A., *Mian Fazl-i-Husain: Glimpses of Life and Works 1898-1936*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, (no date of publication given).

Jalal, Ayesha, *The Sole Spokesman*. Cambridge: Cambridge University Press, (1985).

Jones, K. W., *The New Cambridge History of India: Socio-Religious Reform Movements in British India*, Cambridge University Press, Cambridge, () (1989).

Josh, Bhagwan, *Communist Movement in Punjab (1926-47)*, Delhi: Anupama Publications, (1979).

Wali, Khan, *Facts are Facts: The Untold Story of India's Partition*, New Delhi: Vikas Publishing House Pvt Ltd, (1987).

Lahori, Tahir, *Sohna Shehr Lahore* (*The Lovely City of Lahore*), Lahore; Sang-e-Meel Publications, (1994).

Malik, M. A., *The Making of the Pakistan Resolution*, Karachi: Oxford University Press, (2001).

Oren, Stephen, '*The Sikhs, Congress, and the Unionists in British Punjab, 1937-1945*', *Modern Asian Studies*, Vol. VIII, No III, Cambridge: Cambridge University Press, (1974).

Pirzada, Syed Sharifuddin (ed), *Foundations of Pakistan: All-India Muslim League Documents, 1906-1947*, Vol. II, Karachi: National Publishing House Ltd, (1970).

Seervai, H. M., *Partition of India: Legend and Reality*, Bombay: Emmanem Publications, (1989).

Shahnawaz, Begum Jahanara, *Father and Dougher: A Political Biography*, Karachi: Oxford University Press, (2002).

Singh, Kirpal, *The Partition of the Punjab*, Patiala: Publication Bureau Punjabi University, (1989).

Talbot, Ian, *Khizr Tiwana: The Punjab Unionist Party and the Partition of India*, Richmond, Surrey: Curzon, (1996).

Wallace, Paul, *'Communalism, Factionalism and National Integration in the Pre-Independence Punjab Congress Party'* in Harbans Singh and N. Gerald Barrier (eds), *Punjab Past and Present: Essays in Honour of Dr. Ganda Singh*, Patiala: Punjab University, (1976).

Wolpert, Stanley, *Jinnah of Pakistan*, Karachi: Oxford University Press, (2002).

Official Documents

Carter, Lionel, (edit.), *Punjab Politics 1936-1939, The Start of Provincial Autonomy: Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents*, Delhi: Manohar, (2004).

Carter, Lionel, (edit.), *Punjab Politics 1940-1943, Strains of War, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents*, Delhi: Mahohar, (2005).

Carter, Lionel (ed), *Punjab Politics, 1 January 1944 – 3 March 1947, Last Years of the Ministries, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents*, New Delhi: Manohar, (2006).

Census of India, 1931, Vol. XVII, *Punjab Part 1*, Lahore: 'Civil and Military Gazette' Press, (1933).

Census of India, 1941, Vol. VI, *Punjab, tables*, Simla: Manager of Publications, Delhi, (1941).

Mansergh, N. and Lumby, W. W. R., (eds), *The Transfer of Power*,January-April 1942, Vol. I, London: Her Majesty's Stationery Office, (1970).

Sadullah, Mian Muhammad (compiler), *The Partition of the Punjab 1947*, Vol. I, *official documents*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, Lahore, (1993).

The Punjab Alienation of Land Act , 1901, Lahore: Government Printing Press, (1901).

The Report of the Court of Inquiry constituted under Punjab Act II of 1954 to enquire into the Punjal Disturbances of 1953 (also known as *Munir Report*), Lahore: Government Printing Press, (1954).

پہلا مرحلہ: پنجاب لہولہان، جنوری 1945–31 مارچ 1947

تعارف

پنجاب کی تقسیم کے عمل کا پہلا مرحلہ جنوری 1945 سے مارچ 1947 پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے بیسویں صدی کے آغاز پر مذہبی احیائے نو کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ ان بیداری کی تحریکوں نے مذاہب کے درمیان اختلافات کو نمایاں کیا جس سے بین المذاہب کشیدگی نے جنم لیا۔ بعض مواقع پر تشدد آمیز واقعات بھی رونما ہوئے۔ ایسے رجحان کو 1945 کی انتخابی مہم میں مزید تقویت ملی۔ مسلم لیگ نے اگرچہ یونینسٹ پارٹی کے خلاف تند و تیز مذہبی بنیاد پر مہم چلائی لیکن اس کے ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کو بھی مطعون کیا گیا۔ اس مہم سے جہاں اکثریتی مسلمانوں کے اندر احساس برتری پیدا ہوا وہاں مذہبی اقلیتوں میں خوف اور تناؤ نے جنم لیا۔ انتخابات کے نتائج نے مذہبی کشمکش کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ اگرچہ مسلم لیگ مسلمانوں کا واضح انتخاب بن کر ابھری لیکن حکومت بنانے کے لیے اس جو عددی اکثریت درکار تھی وہ نہ مل سکی۔ شکست خوردہ یونینسٹ پارٹی نے پنجاب کانگریس اور سکھ جماعتوں سے اتحاد کر لیا تاکہ مخلوط حکومت بنائی جا سکے۔ یہ صورتحال مسلم لیگ کے لیے ناقابل قبول تھی چنانچہ اس نے راست اقدام کی دھمکی دے دی۔ جب 1947 کو خضر حیات حکومت نے مسلم لیگ نیشنل گارڈز پر پابندی لگا دی تو پنجاب میں بڑے پیمانے پر مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں مزید شدت آتی چلی گئی۔

20 فروری کو برطانوی حکومت نے عندیہ دیا کہ وہ جون 1948 سے پہلے ہندوستان کا اقتدار ہندوستانیوں کے حوالے کر دے گی۔ خضر ٹوانہ نے محسوس کیا کہ انگریزوں کے اس اعلان سے قطعی نئی صورتحال پیدا ہو گئی ہے چنانچہ انہوں نے 2 مارچ کو پنجاب کی وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ مسلم لیگ نے حکومت بنانے کے لیے اتحادی ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے نتیجے میں 4 مارچ کو لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ ایسے پر تشدد واقعات امرتسر، راولپنڈی اور ملتان میں بھی ہوئے۔ کئی دیگر شہری علاقوں میں بھی کم سطح پر تصادم ہوا تاہم لاہور اور امرتسر میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کا تصادم ایک ہی شدت کا تھا۔ ملتان میں ہندو اقلیت اکثریتی مسلمانوں کا عشر عشیر بھی نہیں تھی۔ راولپنڈی میں بھی صورتحال ایسی ہی تھی یعنی مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا۔ اصل میں مجموعی طور پر سکھوں کو برتر حیثیت حاصل تھی لیکن ہنگامے شروع ہونے پر دیہات میں مسلمان، سکھوں کے دیہات پر حملے کرنے لگے۔ اگرچہ گورنر اور چیف سیکرٹری کی پندرہ روزہ خفیہ رپورٹوں میں خبردار کیا گیا کہ تمام مختلف طبقوں کی طرف سے 'نجی فوجیں' تیار کی جا رہی ہیں تاہم ان انٹیلی جنس رپورٹوں کے باوجود انتظامیہ نے صورتحال پر قابو پانے کے لیے ٹھوس اقدامات نہ کیے۔ بہر حال دس، پندرہ روز کے اندر حکومت نے امن و امان کی صورتحال بحال کر دی۔ 1946 میں کلکتہ سے لوٹ مار، قتل و غارت اور جلاؤ گھیراؤ کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ پورے ہندوستان میں پھیل گیا اور پنجاب میں بھی پہنچ گیا۔ اسی پہلے مرحلے میں پنجاب کی تقسیم کی منطق نے بھی ٹھوس شکل اختیار کر لی۔ یعنی اگر ہندوستان تقسیم ہوا تو پنجاب کی قسمت میں بھی بٹوارہ لازمی ہو گا۔

پنجاب کی تقسیم سے متعلق سکھوں کے مطالبے کی حمایت میں کانگریس کی 8 مارچ کی قرارداد

اس منطق کو کانگریس کی 8 مارچ 1947 کی قرارداد سے مزید تقویت ملی۔ ورکنگ کمیٹی نے پنجاب کی تقسیم سے متعلق سکھوں کے مطالبے کی مکمل حمایت کی تھی۔ قرارداد میں کہا گیا کہ پنجاب میں حالیہ المناک پر تشدد واقعات اس امر کے متقاضی ہیں کہ ایسی صورتحال کا آئندہ سد باب کیا جائے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ غیر مسلم اکثریت والا علاقہ مسلم اکثریت والے علاقے سے الگ ہو جائے(Pakistan Times, 10 March 1947)۔

اس قرارداد کی منظوری کے ساتھ پنجاب کا معاملہ اب صوبائی مسئلہ نہیں رہا تھا بلکہ قومی سطح کا معاملہ بن گیا۔ سکھوں کی طرح اب کانگریس بھی پنجاب کے مستقبل کو ہندوستان کے مستقبل سے منسلک کرنے لگی تھی۔ البتہ پنجاب کی قسمت سے متعلق حتمی فیصلہ اب بھی کئی ماہ دور تھا۔

4

پنجاب کے انتخابات اور اتحادی حکومت،

1945-46

وسیع تر تناظر

برطانیہ میں جولائی 1945 کے عام انتخابات میں حکمران کنزرویٹو پارٹی کو شکست ہوئی اور جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد لیبر پارٹی اقتدار میں آگئی۔ وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی اس بات کے حق میں تھے کہ برطانیہ کو جلد ہندوستان کو خیر باد کہہ دینا چاہیے چنانچہ انہوں نے اقتدار ہندوستانیوں کے سپرد کرنے کے لیے اقدامات شروع کر دیے۔ ان کی ترجیح یہ تھی کہ ہندوستان بدستور متحد اور برطانیہ کی دولت مشترکہ کا رکن رہے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو دونوں آزاد ملکوں یعنی پاکستان اور ہندوستان کو سختی سے تجویز کیا جائے کہ وہ دولت مشترکہ کا حصہ بنیں۔ اسی تناظر میں دہلی میں 21 اگست کو ہندوستان میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ جس کے بعد پورے ملک میں انتخابی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ البتہ کانگریس کے لیے منفی پہلو یہ تھا کہ اگست 1942 میں 'ہندوستان چھوڑ دو' کی تحریک شروع ہونے کے بعد کانگریس کی بڑی قیادت جیلوں میں تھی۔ یہ تحریک مہاتما گاندھی نے اس امید پر شروع کی تھی کہ انگریز دباؤ میں آکر اقتدار کانگریس کے سپرد کر دیں گے۔ کانگریس متحدہ ہندوستان کی حامی تھی جبکہ مسلم لیگ پاکستان کے قیام پر مصر تھی۔

انتخابات دو مرحلوں میں ہوئے۔ پہلے آئین ساز اسمبلی کے لیے ووٹ ڈالے گئے پھر صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب کیا گیا۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہی دراصل پنجاب کے مستقبل سے متعلق تھے چنانچہ مسلم لیگ نے آئین ساز اسمبلی کی کارروائیوں میں حصہ نہ لیا اور پاکستان کے مطالبے پر توجہ مرکوز رکھی۔ انتخابی نتائج نے دونوں جماعتوں کے دعوؤں کو مزید واضح کر دیا۔ کانگریس کو صوبوں میں 1585 میں سے 905 نشستیں ملیں (Allana,1977: 396)۔ مسلم لیگ کے نتائج اس سے بھی زیادہ متاثر کن تھے۔ مسلمانوں کے لیے مخصوص نشستوں 495 میں سے 440 نشستیں مسلم لیگ کے حصے میں آئیں۔ اس کے بعد ایسا آئینی فارمولہ تیار کرنے کے لیے پوری شدومد سے کام شروع ہو گیا جو دونوں جماعتوں کے لیے قابل قبول ہو لیکن یہ ناممکن ثابت ہوا۔

انگریزوں کی رخصتی کا ٹاپ سیکرٹ پلان–27 دسمبر 1945

خفیہ ایجنسیوں اور ہندوستان میں انگریز فوج کے کمانڈر انچیف جنرل آکن لیک Auchinleck نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ 1946 کے موسم سرما میں بڑے پیمانے پر گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ وائسرائے ویول کو مختلف جماعتوں کے درمیان مذاکرات سے زیادہ امید وابستہ نہیں تھی اور چاہتے تھے کہ حکومت خود ہی آئینی ایوارڈ کا اعلان کرے۔

27دسمبر 1945کو اپنے 'رخصتی پلان' پر مشتمل انتہائی خفیہ مراسلے میں انہوں نے برطانیہ کے وزیر امور ہند لارڈ پیتھک لارنس کو لکھا کہ مسلم لیگ کی طرف سے مختلف امور پر نمائندگی کے ضرورت سے زائد تقاضوں اور کانگریس کی طرف سے گورنر جنرل کا ویٹو اختیار ختم کرنے کے مطالبوں سے امن وامان کی صورتحال نہایت خراب ہو سکتی ہے (Mansergh and Moon,1976: 700)۔ اس صورتحال سے بچنے کے لیے انہوں نے ایک پلان تجویز کیا جس کے تحت حکومت کو آئینی مسائل کے حل کے لیے خصوصی ایوارڈ پیش کرنا تھا۔ انہوں نے لکھا کہ:

> ہمیں دو نکاتی اصول پر عملدرآمد کرنا ہو گا۔
>
> ا۔ اگر مسلمان مسلم اکثریتی علاقوں میں حق خود ارادیت کا مطالبہ کریں تو اسے مان لیا جائے۔
>
> ب۔ بصورت دیگر غیر مسلم بڑی آبادی کے ان کی خواہش کے برخلاف پاکستان میں مقیم رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا (Ibid)۔

آگے جاکر وہ اس خفیہ مراسلے میں مزید لکھتے ہیں:

> اگر ان اصولوں پر عملدرآمد کیا جاتا ہے تو اس کا اثر یہ ہو گا کہ پنجاب کی دو ڈویژنیں (جالندھر اور انبالہ) اور تقریباً پورا مغربی بنگال بشمول کلکتہ متحدہ ہندوستان (کانگریس کی حکومت والا علاقہ) میں شامل ہو سکے گا۔ یوں مسلمانوں کی اکثریت میں پاکستان کی کشش جلد ختم ہو جائے گی اور جناحؒ کے بقول صرف 'چھان' باقی رہ جائے گا (Ibid)۔

انہوں نے برطانوی حکومت سے اجازت مانگی کہ وہ اسے مذاکرات شروع کرنے کا اختیار دے تاکہ وہ (وائسرائے) پنجاب اور بنگال دونوں صوبوں کی تقسیم کا اعلان کر کے جناحؒ کو دھمکا سکیں۔ انہوں نے مراسلے میں لکھا کہ:

> اس بات کا امکان موجود ہے کہ جناحؒ تاج برطانیہ پر زور دیں کہ وہ حقیقی معنوں میں مسلم علاقوں کی حدبندی کا منصوبہ واضح کریں۔ ایسی درخواست سے نمٹنے کے لیے میرے خیال میں ہمیں تفصیلی حدبندی پر تیار رہنا چاہیے۔ یہ مشکل ہے اور حدبندی کی ہر لکیر پنجاب میں سکھوں کے لیے انتہائی مسائل پیدا کر سکتی ہے تاہم میں اپنی تجاویز جلد بھیجوں گا (Ibid: 701)۔

لارڈ ویول نے سوچا کہ ایسی حکمت عملی جناحؒ کو متحدہ ہندوستان میں ان کے مسلمان حامیوں کے لیے بہترین شرائط پیدا کرنے کے ترغیب دے گی۔ البتہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے انہوں نے ہندوستان چھوڑنے کے خیال کی مخالفت کی۔ انہوں نے زور دیا کہ حکومت کی طرف سے حدبندی ایوارڈ کو دنیا تو تسلیم کرے گی لیکن اس بات کا امکان نہیں کہ مسلم لیگ بھی اسے تسلیم کر لے چنانچہ اس کا نتیجہ مذہبی بنیادوں پر تصادم کی صورت میں نکل سکتا ہے (Ibid)۔

ویول کا سرحدوں کی حد بندی کا پلان—7 فروری 1946

اپنے 'بریک ڈاؤن' پلان جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کے تسلسل میں وائسرائے ویول نے وزیر امور ہند پیتھک لارنس کو لکھا کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت والے حقیقی علاقوں کی حد بندی کی جائے تو ان میں یہ علاقے شامل ہونے چاہئیں (Ibid: 912):

1. (اے) سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ، برطانیہ کے زیر کنٹرول بلوچستان، راولپنڈی، ملتان اور لاہور ڈویژن لیکن امرتسر اور گورداسپور ضلع چھوڑ کر، (بی) بنگال میں چٹاگانگ اور ڈھاکہ ڈویژن، راجشاہی ڈویژن (جل پیگوری اور دارجلنگ ضلع چھوڑ کر) پریذیڈنسی ڈویژن کے اضلاع مرشد آباد اور جیسور، آسام اور سہلٹ ضلع۔
2. پنجاب میں واحد مسلم اکثریت والا ضلع جو اس حد بندی کے تحت پاکستان میں شامل نہیں ہوگا وہ گورداسپور ہے۔ (51 فیصد آبادی مسلمان ہے)۔ جغرافیائی بنیادوں پر گورداسپور کو ہر صورت میں امرتسر کے ساتھ ملایا جائے اور سکھوں کے مقدس شہر ہونے کی وجہ سے امرتسر کو پاکستان سے باہر رکھنا چاہیے لیکن اس سلسلے میں امرتسر کی اہمیت کے پیش نظر پنجاب کی ڈویژنل بنیادوں پر حد بندی ہونی چاہیے۔ چونکہ لاہور ضلع کی آبپاشی اپر باری دوآب نہر سے ہوتی ہے جس کے ہیڈورکس گورداسپور میں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات تھوڑی عجیب لگتی ہے لیکن مسائل سے بچنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔
3. سب سے بڑا مسئلہ سکھوں کے مذہبی مقامات ہیں جو سرحد کے دونوں اطراف میں واقع ہیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جسے کسی بھی قسم کا پاکستان (یعنی شکل جیسی بھی ہو) حل نہیں کر سکتا (Ibid)۔

وائسرائے ویول نے اس کے بعد خود مختار ریاستوں سمیت پنجاب میں سکھوں کی تعداد بتائی جو 51 لاکھ 16 ہزار تھی۔ اس میں سے 14 لاکھ 60 ہزار پاکستان میں ہوں گے اور باقی ماندہ بھارت میں۔ انہوں نے لکھا کہ راولپنڈی جہاں سکھوں کی سب سے زیادہ آبادی یعنی 64 ہزار رہے اسے، اس کے علاوہ نہری آبپاشی والا ضلع لائل پور (فیصل آباد) جہاں 2 لاکھ 63 ہزار سکھ ہیں اور منٹگمری (ساہیوال) جہاں ایک لاکھ 75 ہزار سکھ ہیں وہ پاکستان میں ہی شامل رہیں کیونکہ ان اضلاع میں مسلمانوں کی واضح اکثریت آباد ہے۔ جہاں تک بنگال میں کلکتہ (23 فیصد مسلمان آبادی) کا تعلق ہے تو اسے بھارت میں شامل کیا جائے یا اگر فریقین مذاکرات سے کسی معاہدے پر پہنچ جاتے ہیں تو کلکتہ کو آزاد بندرگاہ قرار دے دیا جائے (Ibid: 913)۔ البتہ برطانوی حکومت نے مذاکرات کے ذریعے معاملات طے کرنے کی بجائے حد بندی ایوارڈ کے ذریعے علاقوں کی تقسیم کر کے مسلم لیگ کی حوصلہ شکنی کرنے کا ویول کا یہ منصوبہ نظر انداز کر دیا۔ یہ بات کبھی واضح نہیں ہو سکی کہ ایسا کیوں ہوا؟

کابینہ مشن پلان

مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ڈیڈلاک کے حل کے لیے ایک اور کوشش کرتے ہوئے برطانوی کابینہ کے ارکان لارڈ پیتھک لارنس، سر سٹیفورڈ کرپس اور مسٹر اے وی الیگزینڈر پر مشتمل وفد ہندوستان بھیجا گیا جو 23 مارچ 1946 کو وہاں پہنچا۔ کابینہ مشن

نے اقتدار کی منتقلی ترجیحاً ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے طویل مذاکرات کیے۔ یہ بات حیران کن نہیں کہ کانگریس ہندوستان کو مضبوط وفاق کے ساتھ متحد رکھنے کے اپنے موقف پر ڈٹی رہی جبکہ مسلم لیگ دو اکائیوں پر مشتمل الگ وطن پاکستان کے قیام کے لیے اصرار کرتی رہی۔ چنانچہ کابینہ مشن نے 16 مئی 1946 کو اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا۔ اس نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ مسترد کر دیا کیونکہ ایسی مجوزہ ریاست میں شمال مغربی حصے میں 37.93 فیصد جبکہ شمال مشرقی علاقوں میں 48.31 فیصد غیر مسلم افراد بھی مقیم ہوتے۔(Mansergh and Moon, 1977: 584) اس کے علاوہ 2 کروڑ مسلمان بھی بھارت میں باقی رہ جاتے۔ اس تناظر میں مشن نے پھر غیر مسلم اکثریت والے علاقے نکال کر ایک چھوٹا پاکستان بنانے پر غور کیا جس میں مغربی بنگال بھی شامل نہ ہو تاہم یہ تجویز بھی مسترد کرتے ہوئے وفد نے یہ تبصرہ کیا کہ:

> ہم اس بات پر بھی قائل ہوئے ہیں کہ ایسا کوئی حل جو پنجاب اور بنگال کی بنیادی تقسیم پر مشتمل ہو ان صوبوں میں مقیم بڑی آبادی کی خواہشات کے منافی ہو گا۔ بنگال اور پنجاب کی اپنی الگ مشترکہ زبان، طویل تاریخ اور روایات ہیں۔ اس کے علاوہ پنجاب کی تقسیم سے سرحد کی دونوں طرف رہنے والے سکھ بھی تقسیم ہو جائیں گے۔ لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ چھوٹا یا بڑا خود مختار پاکستان بنانا مذہبی مسائل کا قابل قبول حل نہیں(Ibid: 585)۔

کابینہ مشن کی رپورٹ میں ہندوستان کی تقسیم مسترد کرنے کے حق میں کئی انتظامی، معاشی اور فوجی وجوہات بیان کی گئی تھیں۔ یہ کہ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان 1500 کلو میٹر کا فاصلہ ہو گا اور بھارت کے ساتھ جنگ کی صورت میں پاکستان شدید خطرات کا شکار ہو گا اور دفاعی طور پر کمزور ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ خود مختار ریاستوں کو منقسم ہندوستان کے ساتھ الحاق میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا(Ibid)۔

کابینہ مشن کی دیگر سفارشات کے ساتھ رپورٹ میں یہ شقیں بھی نمایاں تھیں۔

1. ہندوستان متحد ہونا چاہیے۔ اس میں برطانیہ کے زیر انتظام علاقے اور خود مختار ریاستیں دونوں شامل ہوں۔ متحدہ ہندوستان کو خارجہ امور، دفاع، مواصلات اور حکومتی امور چلانے کے لیے ریونیو اکٹھا کرنے کا اختیار حاصل ہو۔
2. اس کے علاوہ دیگر تمام معاملات صوبوں کے حوالے کیے جائیں۔
3. خود مختار ریاستوں کے پاس بھی اوپر بتائے گئے موضوعات چھوڑ کر تمام اختیارات ہونے چاہئیں۔
4. صوبوں کو انتظامی اور قانون سازی کے معاملات میں آپس میں گروپ بنانے کی آزادی ہونی چاہیے۔ وہ مل کر اپنے امور چلائیں(Ibid: 587)۔
5. یونین اور صوبائی گروپوں کے دساتیر میں یہ شق شامل ہونی چاہیے کہ اس کی قانون ساز اسمبلی اکثریتی ووٹ سے ہر دس سال بعد آئین کی دفعات پر نظر ثانی کر سکے(Ibid)۔

6. صوبائی اسمبلی میں تین گروپوں کو نمائندگی ملنی چاہیے۔ جنرل (ہندو اور دیگر)، مسلمانوں اور سکھوں کے نمائندے، ہر گروپ اپنے نمائندے خود منتخب کرے۔
7. صوبوں کی طرف سے تین گروپ بنائے جائیں۔ گروپ اے میں ہندو اکثریت والے صوبے مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، سی پی اور اڑیسہ شامل ہوں۔ گروپ بی مسلم اکثریت والے صوبوں شمالی مغربی پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے اور سندھ پر مشتمل ہو۔ گروپ سی میں بھی مسلمانوں کی اکثریت والے صوبے یعنی شمال مشرقی بنگال اور آسام شامل ہوں۔

اس کے بعد آئین ساز اسمبلی کے حوالے سے کئی شقوں کا ذکر کیا گیا جو جو فیڈریشن کے آئین کی تیاری کے لیے تشکیل دی جانی تھی۔ کانگریس نے 24 مئی 1946 کو ایک قرارداد میں واضح کیا کہ وہ ان تجاویز سے متفق نہیں کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ خود مختار ہندوستان میں "ہر صورت میں مضبوط مرکز کی حامل اتھارٹی ہونی چاہیے جو اقوام عالم میں قوم کی پوری طاقت اور وقار کے ساتھ نمائندگی کر سکے" (Ibid: 679-80)۔ سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے 25 مئی 1946 کو برطانوی وزیر برائے امور ہند پیتھک لارنس کے نام ایک خط میں لکھا کہ:

> کابینہ مشن کے پلان میں سکھوں کو مکمل طور پر مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ گروپ بی پنجاب، این ڈبلیو ایف پی اور بلوچستان پر مشتمل ہے۔ کابینہ مشن یہ تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ تشویش نہایت حقیقی ہے کہ انہیں ہمیشہ کے لیے ہندو حکمرانی کے نیچے آنا پڑے گا لیکن دوسری طرف کیا سکھ ہمیشہ کے لیے مسلمان اکثریت کا اقتدار برداشت کریں؟ اگر برطانوی حکومت سکھوں کے جذبات سے آگاہ نہیں ہے تو سکھ اپنی اذیت کے ازالے کے لیے دیگر اقدامات کرنے پر مجبور ہوں گے تاکہ مسلمانوں کی ہمیشہ کے لیے حکمرانی سے محفوظ رہ سکیں (Ibid: 696-7)۔

دوسری طرف مسلم لیگ نے 6 جون 1946 کو ایک قرارداد منظور کی جس میں اس افسوس کا اظہار کیا گیا کہ پاکستان کے مطالبے کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا گیا لیکن کم و بیش یہ تجاویز تسلیم کی جاتی ہیں کیونکہ ان میں تصور پاکستان کی عکاسی ہوتی ہے کیونکہ گروپ بی اور سی میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے چھ مسلم صوبے موجود ہیں (Ibid: 837)۔ مسلم لیگ آئین سازی کے عمل میں شریک ہونے پر بھی رضامند ہو گئی۔ 16 جون کو کابینہ مشن نے تجویز کی کہ عبوری دور کے لیے حکومت تشکیل دی جائے۔ محمد علی جناح نے عبوری حکومت میں مسلم لیگ کے لیے 50-50 کے تناسب سے نمائندگی کا مطالبہ کیا چونکہ دونوں بڑی جماعتوں کے درمیان اختلافات پائے جاتے تھے (Moore 1983: 556-7)۔ اس لیے وہ عبوری حکومت کی تشکیل پر متفق نہ ہو سکیں۔ اس صورتحال میں کابینہ مشن نے فیصلہ کیا کہ دونوں جماعتوں کے ممتاز افراد اور کچھ اقلیتوں کے نمائندوں کو عبوری حکومت میں شمولیت کی دعوت دی جائے۔ کابینہ مشن نے زور دیا: "عبوری حکومت کے قیام کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ وہ کسی مذہبی مسئلے کے حل

کے لیے ایک نظیر سمجھی جائے۔ بلکہ یہ موجودہ مسئلے کے حل کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ ہے اور اس کا مقصد بہترین مخلوط حکومت قائم کرنا ہے"(Ibid: 954)۔

25 جون کو کانگریس پارٹی کی ورکنگ کمیٹی نے عبوری حکومت کے قیام کی تجویز مسترد کر دی لیکن آئینی تجاویز بہرحال اس نے قبول کر لیں اور کہا کہ وہ کابینہ پلان کی اپنی تشریح کرے گی۔ اسی روز مسلم لیگ نے عبوری حکومت کی پیشکش قبول کر لی لیکن کانگریس کا یہ فیصلہ مسترد کر دیا کہ وہ پلان کی اپنی تشریح کرے گی(Ibid: 1032-49)۔ 10 جولائی کو نہرو نے بمبے میں پریس کانفرنس میں کہا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی میں شمولیت اختیار کرے گی لیکن شمولیت کسی معاہدے کی پابندی سے آزاد ہو گی اور ہر قسم کے متوقع حالات کا سامنا کرے گی(Azad, 1989: 164)۔ یہ فقرہ حکومتی دستاویز میں معمولی فرق کے ساتھ دیا گیا ہے(Mansergh and Moon 1979: 25)۔ مسلم لیگ نے 29 جولائی کو ایک بیان میں کہا کہ اسے نہرو کے الفاظ سے انتہائی مایوسی ہوئی ہے کہ کیونکہ اس سے ہندوستان میں اقلیتوں کا مستقبل غیر یقینی صورتحال کا شکار ہو جائے گا۔ کچھ روز بعد مسلم لیگ نے کابینہ پلان کی حمایت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا اور دھمکی دی کہ پاکستان کے قیام کے مطالبے سے عملدرآمد کے لیے راست اقدام بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس نے راست اقدام کے لیے 16 اگست تک کی مہلت دی۔

مسلم لیگ کو اس وقت شدید مایوسی اور حیرت ہوئی جب وائسرائے ویول نے جواہر لال نہرو کو عبوری حکومت قائم کرنے کی دعوت دے دی۔ 13 اگست کو نہرو نے جناح کو خط لکھا کہ وہ بھی عارضی قومی حکومت کے قیام میں ان سے تعاون کریں (Ibid:135-9)۔ راست اقدام کی کال سے خونریز فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے جس کے باعث عبوری حکومت کے قیام کے عمل میں عارضی طور پر تعطل آ گیا۔

کلکتہ میں قتل عام

اگرچہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تقسیم ہند کے مسئلے پر چپقلش ناگزیر تھی لیکن سماجی تعلقات کی بربریت کی بنیاد پر فرقہ وارانہ فسادات کے عوام کی نفسیات پر اہم اور پریشان کن اثرات کا ٹھیک طور پر اندازہ نہ لگایا گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے مسلمانوں کے ساتھ تصادم کے اکادکا واقعات 1946 کے انتخابات سے ہی ہو رہے تھے لیکن مجموعی طور پر بین المذاہب ہم آہنگی اب بھی پائی جاتی تھی۔ 16 اگست کو مسلم لیگ کے راست اقدام کے اعلان سے کئی روز پہلے ہی کلکتہ میں حالات بدتر ہونے لگے تھے۔ اس بات کے کافی شواہد موجود ہیں کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کے رہنماؤں نے اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ بنگال کے وزیراعظم حسین شہید سہروردی جن کا تعلق مسلم لیگ سے تھا، نے 16 اگست کو صوبے میں عام تعطیل کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے دیگر لیگی رہنماؤں کے ساتھ اس روز عوامی جلسوں سے بھی خطاب کرنا تھا۔ دوسری طرف کانگریس کے لیڈر مسٹر کے رائے نے ہندو دکانداروں سے کہا کہ وہ اپنی دکانیں کھلی رکھیں۔ سکھ لیڈروں نے بھی سکھ کمیونٹی سے کہا کہ وہ مسلمانوں کو منہ توڑ جواب دیں(Tuker,1950: 154-56)۔ یہ صورتحال دھماکہ خیز اور اشتعال آمیز تھی۔

16 اگست 1946 کی صبح کو مسلمان بڑی تعداد میں کلکتہ شہر میں داخل ہونے لگے جبکہ ہندوؤں نے رکاوٹیں کھڑی کر کے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ چند چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں۔ اس دوران اوشٹرلونی Ochterlony یادگار میں ایک

بڑا ہجوم جمع ہو گیا جہاں حسین شہید سہروردی اور دیگر لیگی رہنماؤں نے اجتماع سے خطاب کیا۔ اس جلسے کے بعد مسلمانوں نے ہندوؤں کی دکانوں پر حملے شروع کر دیے اور ہندو آبادیوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ ہندوؤں نے مزاحمت کی لیکن نامی گرامی غنڈوں کی قیادت میں مسلمانوں نے حملے جاری رکھے (Mansergh and Moon,1979: 239-40; 293-304)۔ اس کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے نہایت غضبناک انداز میں جواب دیا جس میں کئی مسلمان مارے گئے۔ ان جھڑپوں میں 2 ہزار سے 4 ہزار افراد ہلاک اور 15 ہزار سے زائد زخمی ہوئے جبکہ ایک لاکھ افراد گھروں سے محروم ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ تمام مذاہب میں موجود زیر زمین جرائم پیشہ افراد نے بھی قتل عام کی کارروائیوں میں حصہ لیا۔ کلکتہ میں ہونے والی ہلاکتوں کا سلسلہ وبا کی طرح ہندوستان کے دیگر حصوں تک پھیل گیا۔ بمبے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں تصادم ہوا۔ جھڑپوں میں دونوں طرف سے سینکڑوں افراد مارے گئے۔ مشرقی بنگال کے علاقے نواکھلی میں مسلمانوں نے حملے کر کے 400 ہندوؤں کو جان سے مار ڈالا۔

بہار میں مسلمانوں کا قتل عام

فرقہ وارانہ جنونیت اب بہار جا پہنچی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ یہاں مسلمانوں پر خون آشام انتقامی حملے کرتے ہوئے پہلے 27 ستمبر اور پھر 25 اکتوبر کو انہیں نشانہ بنایا گیا۔ ہلاکتوں کا یہ سلسلہ نومبر کے پہلے ہفتے تک جاری رہا۔ بعض مبصرین کے مطابق یہ ہندو ور کر تھے جو کلکتہ میں مسلمانوں کے قہر سے بھاگ کر بہار آئے اور مسلمانوں پر جوابی قیامت ڈھادی (Mansergh and Moon, 1980: 38-9)۔ بہار کے گورنر سر ایچ ڈاؤ نے اپنی رپورٹ میں قرار دیا کہ کانگریس کی صوبائی حکومت نے تشدد روکنے کے لیے نیم دلانہ اقدامات کیے ہیں اور 9 نومبر تک 2 ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ بعد ازاں پیتھک لارنس نے بتایا کہ یہ تعداد 5 ہزار تھی اور مرنے والے تقریباً تمام کے تمام مسلمان تھے۔ فوج کی مشرقی کمان کے سربراہ سر فرانسس ٹوکر نے بہار کے حملوں کی ہولناک تفصیل دی ہے۔ انہوں نے لکھا:

> 1946 میں رونما ہونے والے دہشتناک واقعات میں سے بہار کا سانحہ سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ ہندوؤں کے ہجوم نے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان قلیل مسلمانوں پر حملے کیے جو اپنے آباؤ اجداد کے دور سے یہاں ہندوستانیوں کے ساتھ بھائی چارے اور ہم آہنگی سے رہ رہے تھے۔ اس بات کا ابھی تعین نہیں کیا جا سکا کہ اس منظم قتل و غارت کے پیچھے کون سا منصوبہ ساز تھا۔ جو ہم جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ طے شدہ منصوبے اور شیڈول کے مطابق کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انتہائی مسلح گروپوں کے لیے اتنے منظم انداز میں جمع ہونا اور ظالمانہ کارروائی کرنا ممکن نہ ہوتا (1950: 81-2)۔

فرانسس ٹوکر کا خیال تھا کہ ہندو مہاسبھا اس قتل و غارت کی منصوبہ ساز تھی جبکہ مارواڑی ہندو جن کے کاروبار پر کلکتہ میں حملے کیے گئے۔ انہوں نے اس کام کے لیے سرمایہ فراہم کیا (Ibid: 182)۔ نومبر کے اوائل میں پنڈت جواہر لال نہرو نے صوبہ بہار کا دورہ کیا اور متاثرہ علاقوں میں جلسوں سے خطاب کے دوران ان کے اثر و رسوخ نے کشیدہ صورتحال میں کافی کمی

لانے میں مدد کی(Ibid:186)۔ جہاں تک فوجی آپریشن کا تعلق ہے تو فرانسس ٹوکر نے بتایا کہ کارروائی میں کرنل وینگ کی زیر قیادت جن فوجیوں نے حصہ لیا وہ تقریباً تمام ہندو تھے جنہوں نے اپنے ہم مذہب افراد کے خلاف نیم دلی سے کارروائی کی جبکہ مخالف عقیدے والوں کے خلاف پورے جوش و جذبے سے کام لیا گیا (Ibid:190)۔

گڑھ مکتیشور میں مسلمانوں کا قتل عام

مسلمانوں کے قتل عام کا ایک اور واقعہ 6 نومبر کو اتر پردیش کے صوبہ پنجاب کی سرحد کے قریبی علاقے گڑھ مکتیشور میں ہوا۔ وہاں مسلمان ریڑھی بانوں پر حملے کر کے آخری شخص تک کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پنجاب کے ضلع روہتک اور حصار میں ہندو جاٹوں نے حملہ کر کے کئی مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد کئی قریبی دیہات کو نشانہ بنایا گیا۔ ہلاکتوں کا یہ سلسلہ 15 نومبر تک جاری رہا۔ اس کی وجہ سیاسی نہیں تھی بلکہ ہندو جاٹ عیدالاضحیٰ کے موقع پر گائے کی قربانی دینے پر اشتعال میں آ گئے(Tuker,1950: 195)۔

15 نومبر 1946 کو مسلم لیگ کے ترجمان اخبار 'ڈان' میں جناحؒ کا ایک بیان شائع ہوا کہ موجودہ بدتر ہوتی صورتحال کا ایک ہی حل ہے کہ ہندوستان کو 2 ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ سانحہ بہار کے بعد آبادی کے تبادلے پر جلد از جلد سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے(Mansergh and Moon,1980: 73-5)۔

عبوری حکومت

اس دوران وائسرائے ہند کی سربراہی میں عبوری حکومت قائم ہو گئی جس کے نائب صدر جواہر لال نہرو تھے۔ نئی حکومت نے 24 اگست 1946 کو اقتدار سنبھالا۔ نئی حکومت نے دوبارہ کوشش کی کہ مسلم لیگ بھی حکومت میں شریک ہو جائے۔ مسلم لیگ نے اس شرط پر کابینہ میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کی کہ اسے ہندوستان میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کا درجہ دیا جائے۔ اس شرط کو منظور کر لیا گیا چنانچہ 15 اکتوبر کو مسلم لیگ بھی کابینہ میں شامل ہو گئی۔ مسلم لیگی وزراء میں نوابزادہ لیاقت علی خان (جن کی جاگیر ہی بعد ازاں بھارت بننے والے علاقوں میں رہ گئی)، آئی آئی چندریگر (بمبے)، عبدالرب نشتر (این ڈبلیو ایف پی)، راجہ غضنفر علی خان (پنجاب) اور جوگندر ناتھ منڈل (بنگال سے اچھوت رہنما) شامل تھے(Ibid: 729-30)۔ 25 اکتوبر کو کابینہ کی تشکیل نو کی گئی اور مسلمانوں کے علاوہ سکھوں اور دیگر اقلیتوں کو نمائندگی دی گئی۔ ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے یہ آخری کوشش کی گئی تھی۔ مسلم لیگ کو 5 وزارتیں ملیں جن میں اہم وزارت خزانہ بھی شامل تھی جو لیاقت علی خان کو سونپی گئی تاہم کابینہ کے ارکان کے درمیان شکوک و شبہات اور اختلافات بدستور شدید رہے۔ اگرچہ وہ ایک ہی کابینہ کے رکن تھے لیکن مسلم لیگ اور کانگریس کے وزراء مخالف سمت میں چلتے رہے۔ اس ضمن میں خصوصی ذکر وزیر خزانہ لیاقت علی خان کی بجٹ تجاویز تھیں جن میں جان بوجھ کر ایسے اقدامات شامل کیے گئے کہ ان کا ہدف تاجر اور صنعتکار برادری ہو کیونکہ یہ لوگ کانگریس کی مالی معاونت کرتے تھے(Azad,1964-94)۔ شراکت اقتدار کے فارمولے کی عدم موجودگی میں تقسیم ہند ناگزیر ہو گئی اور اس کی سب سے زیادہ قیمت پنجاب کو ادا کرنا پڑی۔ اسی تناظر میں پنجاب میں رونما ہونے والے واقعات کو دیکھنا پڑے گا۔

پنجاب

برطانوی حکومت کی طرف سے 1946 کے شروع میں انتخابات کرانے کے اعلان پر پنجاب میں ملاجلا ردعمل دیکھنے میں آیا۔ جہاں مسلم لیگ نے زبردست جوش و جذبے کا اظہار کیا وہاں حکمران یونینسٹ پارٹی نے سرد مہری دکھائی۔ اس وقت پنجاب کے وزیر اعظم سر خضر یورپ میں تھے۔ وہ 29 جولائی کو اتحادی ممالک کی امن کانفرنس میں شرکت کے لیے پیرس کی طرف رواں دواں تھے۔ انہوں نے یورپ میں کئی ہفتے تک قیام کیا اور ستمبر کے وسط میں واپس آئے۔ کانگریس نے اعصاب شکن انتخابی مہم میں غیر منظم انداز میں حصہ لیا کیونکہ 1942 میں شروع کی گئی 'ہندوستان چھوڑدو' تحریک کے نتیجے میں مرکز اور پنجاب میں کانگریس کے کئی رہنما جیل میں تھے۔ اس کے علاوہ پارٹی میں دائیں بازو اور بائیں بازو کی دھڑے بندی بھی چل رہی تھی۔ انتخابات سے کچھ عرصے قبل ہی کانگریس پر پابندی اٹھالی گئی۔ سکھ حسب معمول پاکستان بنانے کے مطالبے کی پوری شدومد کے ساتھ مخالفت کررہے تھے۔ جہاں تک پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا تعلق تھا تو وہ بھی مختلف رہنماؤں کے پارٹی چھوڑنے سے مسائل کا شکار تھی۔ سب سے زیادہ دھچکہ 9 جنوری 1945 کو سر چھوٹو رام کے انتقال سے ہوا۔ ان کی عدم موجودگی میں ہندی زبان بولنے والی ہندو جاٹوں کی ڈویژن انبالہ کی آواز اٹھانے والا کوئی نہ رہا۔ سکھ جماعتوں کے اتحاد سکھ پنتھی پارٹیوں جن میں اکالی سب سے بڑا گروپ تھا، نے الیکشن اس نعرے کے ساتھ لڑا کہ سکھوں کی الگ ریاست قائم کی جائے۔

فضا مکمل طور پر مسلم لیگ کے حق میں بدل گئی

دوسری طرف سیاسی فضا مکمل طور پر مسلم لیگ کے حق میں بدل گئی تھی۔ کانگریس کی عدم موجودگی اور یونینسٹ پارٹی سے آنے والے بڑے جاگیرداروں اور سجادہ نشینوں کی پارٹی میں شمولیت سے مسلم لیگ کو مسلمانوں تک یہ پیغام کسی روک ٹوک کے بغیر پہنچانے کا موقع مل گیا کہ پاکستان کے قیام سے انہیں ہر قسم کے امتیازی سلوک اور استحصال سے نجات مل جائے گی۔ پنجاب کے گورنر گلینسی نے 16 اگست 1945 کو اپنی پندرہ روزہ خفیہ رپورٹ میں کہا کہ:

> مسلم لیگ بڑے پیمانے پر پراپیگنڈے میں مصروف ہے۔ کانگریس اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو زبردست طریقے سے بدنام کیا جارہا ہے۔ جناح ؒ اور ان کے حامی انتخابات میں زور و شور سے شریک ہیں جبکہ کانگریس نسبتاً ٹھنڈے طریقے سے چل رہی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس صورتحال سے الجھن کا شکار ہوں کیونکہ یہ الیکشن اس لحاظ سے خطرات کے حامل ہیں کہ بالخصوص مسلمانوں کی حد تک یہ جھوٹ کی بنیاد پر لڑے جارہے ہیں۔ ممکن ہے کہ خام حالت میں پاکستان غیر منطقی ہو، بلا تشریح ہو اور ہندوستان بالخصوص مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہو لیکن اس کے باوجود پاکستان کے بطور سیاسی نعرے کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ انتخابات میں مسلمانوں سے یہ سوال کیا جائے گا کہ ''کیا آپ مسلمان ہیں، کافر ہیں یا غدار ہیں؟'' اس نعرے کا یونینسٹ پارٹی کے پاس کوئی جواب نہیں۔ اگر پاکستان ایک ناگزیر حقیقت بن جاتا ہے تو اس کا نتیجہ زبردست خونریزی کی شکل میں نکلے گا۔ غیر مسلم بالخصوص سکھ محض بڑھکیں نہیں مار رہے وہ ایسی کسی حکومت

کے آگے سر نہیں جھکائیں جو خود کو 'محمدی راج' قرار دے۔ چنانچہ میرا مشورہ ہے کہ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔ بہتر ہو گا کہ حکومت کوئی ایکشن لے اور نظریہ پاکستان کے غبارے سے ہوا نکال دی جائے(Carter, 2006:141-2)۔

گورنر گلینسی کا برطانوی حکمرانوں کے اس طبقے سے تعلق تھا جو سختی سے یہ سمجھتے تھے کہ پنجاب کو کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست سے دور رکھنا چاہیے اور صوبے میں امن اور ہم آہنگی کے لیے یونینسٹ پارٹی کی بین المذاہب یگانگت کے فارمولے کو بہترین فارمولہ سمجھا جائے۔ انہوں نے تجویز دی کہ برطانوی حکومت اس مؤقف پر سختی سے کاربند رہے کہ اگر ہندوستان کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کرنا پڑتا ہے تو پنجاب کا بٹوارہ بھی انہی بنیادوں پر ہونا چاہیے۔ اس قسم کا مطالبہ مسلم لیگ کو پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہونے پر مجبور کر سکتا ہے۔ گورنر نے لکھا:

> پنجاب میں دو ڈویژنیں (انبالہ اور جالندھر) دیگر پانچ ڈویژنوں کے برعکس رہی ہیں جن کے ایک بھی ضلع میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں ہے۔ اس بڑے علاقے میں امرتسر کو بھی ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔ اس عملی منظر کشی کو بطور مثال پیش کرنے سے زبردست مدد مل سکتی ہے۔ ان خطوط پر چلنے سے کم از کم یونینسٹ پارٹی کو قیام پاکستان کے خلاف آواز اٹھانے میں کافی سہولت مل جائے گی۔ اس صورتحال میں ووٹر بھی متحرک ہو جائے گا۔ میرے خیال میں کوئی بھی پنجابی خوشدلی سے صوبے کی تقسیم اس طرح پسند نہیں کرے گا کہ لفظ 'پنجاب' ہی غائب ہو جائے۔ میں اس بات کا زبردست حامی ہوں کہ مسلمانوں کے تمام تحفظات دور کرنے کے لیے مرکز میں انہیں بھرپور نمائندگی دی جائے۔ میرے نزدیک اس طرح حقیقی پاکستان وجود میں آ سکتا ہے نہ کہ وہ پاکستان جس کی وکالت جناحؒ اور انکے حامی کر رہے ہیں(Ibid:142)۔

اس وقت پنجاب میں بمشکل 11 فیصد آبادی ووٹ ڈالنے کی اہل تھی۔ اس کے علاوہ پنجابی باشندے ایک حیثیت میں ووٹ نہیں ڈالنے والے تھے بلکہ انہیں الگ الگ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرنا تھا کیونکہ سکھوں اور مسلمانوں کی اپنی اپنی مخصوص نشستیں تھیں جبکہ کانگریس نے تمام نشستوں پر امیدوار کھڑے کرنے کے ساتھ سکھ اور مسلم نشستوں پر بھی امیدوار کھڑے کرنا تھے۔ اس کے ساتھ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اہل پنجاب سے کبھی یہ رائے نہیں لی گئی کہ ممکن ہے پنجاب کو تقسیم کر دیا جائے گا چنانچہ کسی جماعت کے منشور میں یہ بات شامل نہیں تھی۔ اگرچہ سکھ کئی برسوں سے دھمکی دے رہے تھے کہ اگر پاکستان بنا تو پھر پنجاب کی تقسیم بھی ضرور ہو گی۔ لہٰذا ہندوستان کی تقسیم کے اہم پہلو پر عوامی سطح پر رائے لینے کے لیے کوئی بحث شروع نہیں کی گئی کہ پنجاب بھی تقسیم ہو سکتا ہے۔

اسلام بطور انتخابی نعرہ

مشہور صحافی عزیز مظہر کے مطابق مورخ اور مصنف ڈاکٹر محمد باقر نے جناحؒ کو مشورہ دیا کہ وہ اگر مسلمانوں میں اپنی مقبولیت بڑھانے چاہتے تو اسلام کو بطور نعرہ استعمال کریں۔ پرولتاری ادیب قمر یورش کا یہ کہنا ہے کہ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر وہ

شخصیت تھے جنہوں نے یہ تجویز دی کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے گرد جمع کرنے کے لیے اسلام کو بطور نعرہ استعمال کیا جانا چاہیے۔ ان دنوں جو نعرے تخلیق کیے گئے تھے ان میں یہ بھی شامل تھا۔ 'پاکستان کا نعرہ کیا؟ لا الہ الا اللہ' جو سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے شاعر اصغر سودائی نے تخلیق کیا تھا۔ 1970 کی دہائی میں اس میں معمولی ترمیم کرتے ہوئے اسے 'پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ' بنا دیا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پنجاب میں کئی دانشوروں نے محمد علی جناحؒ کو یہ مشورہ دیا ہو۔ پنجاب میں شاعر علامہ اقبال کا کافی اثر و رسوخ تھا اور ایک طویل عرصے سے پنجاب کے عوام مسلمانوں کے شاندار ماضی سے متعلق ان کی شاعری کے رومانس میں مبتلا رہے اور مسلمانوں کے ماضی کے دوبارہ احیا اور ان میں نئی روح پھونکنے کی ضرورت پر زور دیا جا رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں اقبال کے حامیوں نے یقیناً مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ کرنے کے لیے انتخابی مہم میں اسلام کے نعرے لگائے تھے۔ یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ جناحؒ جو زبردست سیاسی سوجھ بوجھ کے حامل رہنما تھے اور ابھی تک اپنی انتخابی مہم کو آئینی دلائل تک محدود رکھے ہوئے تھے نے بھی یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر حمایت حاصل کرنے کے لیے جذباتی اسلام نعرے اور اپیلیں اہم ہیں۔ عزیز مظہر، حکم قریشی، سید احمد سعید کرمانی اور کئی دیگر لوگ جو ان دنوں نوجوان طالبعلم تھے اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں کافی فعال تھے نے تصدیق کی ہے کہ جلسوں اور جلوسوں میں 'پاکستان کا نعرہ / مطلب کیا' کا نعرہ فلک شگاف انداز میں لگایا جاتا تھا چنانچہ جب انتخابی ریلیاں شروع کی گئیں تو اسلامی نعرے پوری شد و مد کے ساتھ لگائے جانے لگے۔ 13 ستمبر کو گورنر گلینسی نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ:

> مسلم لیگی انتہاپسندی کی بنیاد پر اپنا پراپیگنڈہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ نظریہ پاکستان کی حمایت کے لیے مذہبی رہنماؤں اور مذہبی عمارتوں کو آزادانہ استعمال کیا جا رہا ہے اور مخالف خیالات رکھنے والوں کو مطعون کیا جا رہا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ فرقہ وارانہ جذبات تشویشناک ہیں۔ پاکستان بننے کے امکانات سامنے دیکھ کر سکھ کافی بوکھلاہٹ کا شکار ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ خود کو کسی مسلم راج میں شامل کرنے کے اقدام کی مزاحمت کریں گے (Ibid: 145)۔

گورنر گلینسی کی 29 ستمبر کی رپورٹ میں انتہائی کشیدگی اور تشدد پر مبنی انتخابی مہم کی زیادہ تفصیلات دی گئی ہیں۔ مسلم لیگ نے مخلوط حکومت پر الزام لگایا کہ وہ مسلمان ووٹروں کو مسلم لیگ کی حمایت کرنے میں ان کی حوصلہ شکنی کر رہی ہے جبکہ ہندوؤں نے شکایت کی کہ مسلمان ملازمین مسلم لیگ کی شہہ پر ان کے خلاف پراپیگنڈہ میں شریک ہیں۔ مسلم لیگ کی مخالف تنظیموں... خاکسار تحریک اور الاحرار کے بارے میں گورنر نے تبصرہ کیا کہ خاکسار اور احرار کے رہنما بھی مسلسل مسلم لیگ کو اپنی تقریروں میں نشانہ بنا رہے ہیں((Ibid: 148)۔

27 اکتوبر کی رپورٹ میں گورنر گلینسی نے انتخابی مہم میں مسلم لیگ کی طرف سے غیر مسلموں کو دی جانے والی دھمکیوں میں اسلام کے استعمال کا تذکرہ کیا ہے:

بین المذاہب تعلقات بد ستور کشیدگی کا شکار ہیں۔ وزیر ترقی بلدیو سنگھ نے مجھ سے ملاقات میں چند روز قبل انبالہ ڈویژن میں مسلم لیگ کے سپورٹروں کے اس دعوے کے اثرات پر بات کی کہ پاکستان جلد حقیقت بننے والا ہے اور یہ کہ اس کے بعد شریعت کا قانون نافذ ہو گا اور غیر مسلموں کو بھی اپنی شکایات لے کر مساجد میں آنا پڑے گا (Ibid: 151)۔

گلینسی نے اپنی اس تجویز کا ایک بار پھر اعادہ کیا کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ اس بات کا اعلان کر دے کہ اگر ہندوستان کا بٹوارہ مذہبی بنیادوں پر کیا گیا تو پنجاب کو بھی اس طرح تقسیم کیا جائے گا کیونکہ صرف یہی مسلم لیگ کی طرف سے 'اسلام خطرے میں ہے' کے خطرناک نظریے کا بروقت اور درست جواب ہو گا (Ibid)۔ یہ بات سازشی پہلو کی حامل ہے کہ حکومت برطانیہ نے کبھی اس تجویز کا جواب نہیں دیا۔ برطانیہ کی طرف سے اب تک شائع کردہ وائسرائے ویول، وزیر امور ہند لارڈ پیتھک لارنس اور گورنر پنجاب گلینسی کے درمیان خط و کتابت کے منظر عام پر آنے والے ریکارڈ میں اس حوالے سے کوئی بات سامنے نہیں آتی۔

بظاہر گلینسی نے ایسا مشورہ کبھی سر خضر حیات ٹوانہ کو خود نہیں دیا۔ جو اس کی غمازی کرتا ہے کہ برطانوی حکام اپنے اعلیٰ افسروں کی منظوری کے بغیر ہندوستانی شخصیات سے کوئی حساس بات نہ کرنے کی پالیسی پر سختی سے عملدرآمد کرنے کے قائل تھے۔ پنجاب کانگریس سے متعلق گلینسی کا خیال تھا کہ اس کے مقررین انتخابی مہم کی بجائے دیگر معاملات پر وقت ضائع کر رہے تھے۔ وہ جاپان کی طرف سے ہندوستانی افراد جو برما میں قید ہوئے تھے پر مشتمل انڈین نیشنل آرمی کی حمایت میں لگے ہوئے تھے۔ کانگریس انڈونیشیا میں انگریزوں کی مداخلت کی بھی مذمت کر رہی تھی۔

بہت بڑے جاگیردار اور یونینسٹ پارٹی کے ممتاز رہنما سر فیروز خان نون جو 15 ستمبر تک وائسرائے کونسل میں دفاع کا قلمدان سنبھالے رہے نے گلینسی سے بات چیت میں کہا کہ وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہتے ہیں کہ وہ پاکستان کے قیام پر بالکل یقین نہیں رکھتے جیسا کہ مسلم لیگ دعوے کر رہی ہے (Ibid: 152)۔ تاہم انہوں نے اپنا یہ موقف عوامی سطح پر بیان کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ 27 دسمبر کے مراسلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیروز خان نون بھی میدان عمل میں کود پڑے تھے اور مسلم لیگ کی اسلامی پہلوؤں سے حمایت کرنے لگے تھے۔ گلینسی نے لکھا کہ:

> مسلمانوں میں سے مسلم لیگ والوں نے ووٹروں میں مذہبی امتیاز پیدا کرنے کے لیے کوششیں تیز کر دی ہیں۔ پیروں اور ملاؤں کو صوبہ بھر کے دورے پر بھیجا جا رہا ہے تاکہ مسلم لیگ کی مخالفت کرنے والوں کو کافر قرار دیا جا سکے۔ قرآن کو غیر معمولی طور پر مسلم لیگ کی علامت کے طور پر پیش کیا جانا لگا ہے۔ فیروز (خان نون) اور دیگر رہنما کھلے عام یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلم لیگ کو ووٹ دینے کا مطلب حضور اکرم ﷺ کو ووٹ ڈالنا ہے۔ جو حالات نظر آ رہے ہیں وہ جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں، ہندوستان کے امن اور مستقبل کے لیے زہر قاتل ہیں اور یونینسٹ پارٹی والوں کے لیے ان کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہو گا (Ibid: 160)۔

سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے کے بارے میں گلینسی نے لکھا کہ:

اس کی ایک مثال مشہور فوجی ٹھیکیدار سر مراتب علی کا بیٹا سید امجد علی ہے۔ وہ طویل عرصے تک یونینسٹ پارٹی کا سیکرٹری رہا اور انتخابات میں اسے یونینسٹ پارٹی کی سپورٹ حاصل رہی لیکن چند ہفتے قبل وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گیا کہ اسے ضلع فیروزپور سے الیکشن کا ٹکٹ دیا جائے گا، اس یقین دہانی کو مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ نے مسترد کر دیا چنانچہ سید امجد علی فوراً واپس یونینسٹ پارٹی میں آ گیا ہے اگرچہ اسے زیادہ پذیرائی نہیں ملی (Ibid)۔

اسی پندرہ روزہ رپورٹ میں اطلاع دی گئی کہ انتخابات میں اپنے مفادات کے براہ راست ٹکراؤ سے بچنے کے لیے اکالیوں اور کانگریس کے درمیان مذاکرات بھی کہیں نظر نہیں آ رہے۔ البتہ کچھ حلقوں میں سکھوں نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی ہے کہ وہاں یا تو اکالی امیدوار یا پھر کانگریسی امیدوار کیمونسٹوں کے خلاف الیکشن لڑیں۔ اس کے علاوہ ہندو مہا سبھا کی حمایت بھی عملاً غائب ہو چکی ہے۔ کانگریس کی اب تقریباً تمام ہندو حمایت کر رہے ہیں۔ کانگریس نے انبالہ ڈویژن میں بنیوں (مہاجنوں) کی بجائے ہندو جاٹوں کو آگے لانے فیصلہ کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کانگریس دراصل سر چھوٹو رام کے علاقے جو اس سے قبل یونینسٹ پارٹی کے لیے مخصوص تھے میں حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پنجاب میں مسلم لیگ کی انتخابی مہم کارکنوں کے تین قسم کے گروپوں کے سپرد تھی۔ ایک گروپ صوبہ متحدہ (یوپی) کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسلمان طلبا پر مشتمل تھا یہ لوگ بڑی تعداد میں رضاکارانہ طور پر شہر شہر اور گاؤں گاؤں جا کر نظریہ پاکستان کی تشہیر کرتے اور اسے ہندوؤں کی غلامی سے بچنے کا ذریعہ قرار دیتے۔ میں نے 30 دسمبر 2005 کو شیخوپورہ کے زمیندار چودھری نذیر احمد ورک کا انٹرویو کیا تو انہیں اگرچہ علی گڑھ کے رضاکاروں کے اپنے شہر آمد کی ٹھیک تاریخ یا مہینہ تو یاد نہیں تھا لیکن انہوں نے مجھے درج ذیل تفصیل بتائی:

ایک روز پاجامہ اور شیروانی پہنے دو ڈھائی سو کے لگ بھگ طلبا ہمارے قصبے (شیخوپورہ) میں آئے۔ مین بازار میں آ کر انہوں نے بگل بجایا اور لباس تبدیل کر کے مسلم لیگ نیشنل گارڈز کا یونیفارم پہن لیا۔ اس کے بعد ان کے گروپ لیڈر نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا "دوستو جس جگہ سے میں آیا ہوں (یعنی علی گڑھ) وہ کبھی پاکستان کا حصہ نہیں بنے گا لیکن شیخوپورہ تو بہر صورت پاکستان میں شامل ہو گا۔ اوئے خضر ٹوانہ۔ سنو ہم سر بکفن ہو کر شیخوپورہ آئے ہیں۔ ہم پاکستان حاصل کر کے رہیں گے۔ گولی چلاؤ ہماری چھاتی تیار ہے" اس کے بعد وہ 2،2 افراد کی ٹولیاں بنا کر پھیل گئے کیونکہ دفعہ 144 نافذ تھی اور 'لے کے رہیں گے پاکستان، دینا ہو گا پاکستان، پاکستان زندہ باد' کے نعرے لگاتے ٹرین پر سوار ہو گئے۔ وہ تو چلے گئے لیکن ہم شیخوپورہ کے طلبا ان کی کارکردگی سے زبردست متاثر ہوئے اور ہم بھی وہی نعرے لگاتے رہے۔ ہمارے کچھ دوستوں کو گرفتار بھی کر لیا گیا۔

نوجوانوں کا دوسرا گروپ مسلمان کیمونسٹوں کا تھا جو کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کے اس فیصلے کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہوا کہ پاکستان کا مطالبہ دراصل لینن کے کسی محروم قوم کے حق خود ارادیت کی حمایت کے نظریے سے مطابقت رکھتا ہے کیونکہ مسلمان معاشی طور پر پسماندہ قوم ہیں۔ پنجاب پراونشل کانگریس کمیٹی کے متحرک صدر میاں افتخار الدین جو پنجاب کے کیمونسٹوں

کے سرپرست اعلیٰ تھے نے 25 اگست 1945 کو مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ ممتاز پنجابی کمیونسٹ عبد اللہ ملک نے اس موضوع پر میرے ساتھ 19 دسمبر 2001 میں لاہور میں تفصیلی بات چیت کی۔ انہوں نے وضاحت کی کہ کمیونسٹوں نے مسلم لیگ کے جلسوں میں تقریریں کی تھیں جن میں اس تصور کو نمایاں کیا گیا کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہو گا جو انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کے عنصر سے پاک ہو گا۔

مسلم لیگ کی طرف سے تشکیل دیا گیا تیسرا اور شاید سب سے اہم گروپ علما اور پیروں (مشائخ) کا تھا۔ پاکستان کے حق میں پراپیگنڈہ کرنے کے لیے ممتاز پیروں پر مشتمل مشائخ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ان میں پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف، پیر فضل علی شاہ جلالپور شریف (ضلع جہلم)، پیر ناظم الدین تونسہ شریف، مخدوم رضا شاہ آف ملتان اور دیگر سجادہ نشین شامل تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کئی ممتاز سیاستدانوں نے بھی اپنے ناموں کے ساتھ اولیا کرام کی نسبت لکھنا شروع کر دی جیسا کہ نواب ممدوٹ آف پیر ممدوٹ شریف، شوکت حیات، سجادہ نشین واہ شریف، فیروز خان نون آف دربار سرگودھا شریف اور نواب محمد حیات قریشی نے خود کو سجادہ نشین سرگودھا شریف لکھنا شروع کر دیا (Court of Inquiry 1954: 255)۔

اس کے علاوہ سنی مکتبہ فکر کے ذیلی فرقے بریلوی کے پیروکاروں جن کا پیروں کے ساتھ قریبی تعلق تھا کو میدان میں اتار دیا گیا (Gilmartin, 1989; Talbot, 1996)۔ پراپیگنڈے کی نوعیت مختلف مقامات پر مختلف تھی تاہم ایک بات مشترک تھی اور وہ تھی ایک اسلامی ریاست کے قیام پر زور، مسلم لیگ پیروں اور ملاؤں کو اتنی بڑی تعداد میں سامنے لائی کہ یونینسٹ پارٹی کے حامیوں کو سراسیمگی کے عالم میں سر خضر حیات سے مداخلت کے لیے التجایہ اپلیں کرنا پڑیں۔ مایوسی کی کیفیت میں یونینسٹ ہیڈ کوارٹر کو ملتان سے بھیجے گئے ایک ٹیلی گرام میں کہا گیا: 'براہ کرم کچھ اور مولوی بھجوا دیں'، اس سے صورتحال کے خطرناک ہونے کا واضح اشارہ ملتا ہے (Gilmartin, 1979: 515)۔ کئی ہندوؤں اور سکھوں جن سے میری ملاقات ہوئی نے مجھے بتایا کہ مسلمان ہمیں کہتے تھے کہ اسلامی ریاست پاکستان میں غیر مسلموں کو جزیہ دینا پڑے گا اور ان کے دیوانی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ شرعی عدالتیں کیا کریں گی۔

مشہور ہندی ادیب بشام ساہنی نے 23 اکتوبر 2001 کو میرے ساتھ ملاقات میں مسلم لیگ کی طرف سے راولپنڈی شہر اور مضافاتی علاقوں میں پیر مہر علی شاہ کی سرگرمیوں کے حوالے سے بتایا۔ مہر علی شاہ نے غیر مسلموں سے کہا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو گی لیکن غیر مسلم جزیہ ادا کر کے امن اور سلامتی کے ساتھ رہ سکیں گے۔ بریلوی علما اور مشائخ کے علاوہ دیوبند مکتبہ فکر کے بھی بعض جید منحرف علما جیسا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی تھے نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور قیام پاکستان کی تحریک میں پوری توانائی کے ساتھ حصہ لیا۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں میں اپنی مقبولیت بڑھانے کے لیے منظم حکمت عملی اختیار کی اور جو لوگ مردم شماری میں مسلمان قرار دیے گئے ان سب کو اس مہم میں شریک کر لیا گیا۔ حتیٰ کہ احمدیوں کو جنہیں سنی اور شیعہ بدعتی قرار دیتے تھے کو بھی شامل کر لیا گیا۔

یونینسٹ پارٹی والوں نے بہت دیر کے بعد مذہبی جارحیت کا جواب اپنے علما، احرار اور خاکسار انتخابی مہم میں شامل کیے۔ حالانکہ ماضی میں ان کا آپس میں جارحانہ تعلق رہا تھا۔ وزیر اعظم خضر حیات نے اپنے جلسوں میں تقریر کے آغاز سے پہلے بسم اللہ پڑھنا شروع کر دی لیکن ایسے ہتھکنڈوں کا کوئی خاص اثر نہ ہوا کیونکہ یونینسٹ پارٹی غیر مذہبی نظریے کی حامی

سمجھی جاتی تھی اور اس کی طرف سے انتخابی مہم میں مذہب کے استعمال کو موزوں نہ سمجھا گیا (Talbot, 1996: 147)۔
2 فروری 1946 کو گورنر گلینسی نے وائسرائے ویول کو لکھا کہ:

مسلم لیگ کے مقررین اپنی تقریروں میں بتدریج زیادہ جارحانہ انداز اپنانے لگے ہیں۔ مولوی پیر اور طلبا پورے صوبے میں پھیل کر دھمکی دے رہے ہیں کہ مسلم لیگ کو ووٹ نہ دینے والے مسلمان نہیں رہیں گے۔ ان کے نکاح ٹوٹ جائیں گے اور انہیں کمیونٹی سے مکمل طور پر بے دخل کر دیا جائے گا... یہ اندازہ لگانا آسان نہیں کہ الیکشن کے نتائج کیا ہوں گے لیکن جس جارحانہ اور خطرناک انداز میں مسلم لیگی اپنی انتخابی مہم میں اسلام کا استعمال کر رہے ہیں اسے مد نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کی نشستیں زیادہ ہوں گی اور یونینسٹ پارٹی کی نمائندگی میں نمایاں کمی آئے گی (Carter, 2006, 171)۔

اس سے اگلی پندرہ روزہ رپورٹ میں 28 فروری کو گلینسی تحصیل جہلم سے مسلم لیگی امیدوار راجہ خیر مہدی خان کی طرف سے چسپاں کیے گئے پوسٹر کا انگریزی ترجمہ شامل کیا ہے۔ جس میں خیر مہدی نے واضح طور پر اپیل کی کہ مسلمان مذہبی اختلافات پس پشت ڈال کر مسلم لیگ کو ووٹ ڈالیں۔ یہ پوسٹر عباس علی شاہ جو جہلم کا ممتاز خطیب تھا نے تحریر کیا تھا۔

مسلم لیگ زندہ باد، پاکستان زندہ باد
بسم اللہ الرحمن الرحیم، مسلمانو تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے
حق و باطل کے اس معرکے میں تمہیں دین و دنیا میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے

دین	دنیا
ایک طرف اللہ پر ایمان اور تمہارا ضمیر ہے	دوسری طرف تم لوگوں کو جاگیروں اور مراعات کی پیشکش کی گئی ہے
نیکی اور پرہیز گاری ایک طرف ہیں	دوسری طرف سے تمہیں نمبرداری اور ذیلداری کی پیشکش کی جارہی ہے
ایک طرف نیک مقصد ہے	دوسری طرف معاشی فوائد اور حیثیت ہے
ایک طرف تمہارے لیے پاکستان ہے	دوسری طرف کفرستان ہے
ایک طرف مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی سے بچانے کا مسئلہ در پیش ہے	دوسری طرف صرف فرد واحد کی ذاتی انا ہے
ایک طرف آپ نے تمام کلمہ گو افراد کو متحد کرنا ہے	دوسری طرف بتوں کی پوجا اور ذات برادری کا مسئلہ ہے
ایک طرف حضرت محمدؐ اور حضرت علیؓ ہیں	دوسری طرف بلدیو سنگھ اور خضر حیات ہیں

ایک طرف تمام مسلمانوں کے اتحاد اور بھائی چارے پر غور ہو رہا ہے — دوسری طرف بیوروکریسی کا ہڑاونڈ ا اور سرکاری عمال کی دہشت ہے
ایک طرف مسلم لیگ اور پاکستان کے عشاق ہیں — دوسری جانب کانگریس اور یونینسٹ پارٹی کے مداح ہیں
ایک طرف سبز ہلالی پرچم کی عزت ہے — تو دوسری جانب خضر حیات کی وزارت ہے

اس بات کو مدنظر رکھو اور پارٹی اور ذاتی اختلافات کو اپنے مذہب کے نام پر الگ رکھ دو۔ تم کو اپنے ایمان کی طاقت کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ تحصیل جہلم میں تمہارے ووٹ کا صحیح حقدار مسلم لیگی امیدوار ہے۔۔۔ یعنی راجہ خیر مہدی خان(Ibid: 174-5)۔

جسٹس کھوسلہ رپورٹ میں مشہور صحافی بریلز فورڈ کے فروری 1946 میں اخبار 'دی ٹربیون، لاہور' میں شائع ہونے والی رپورٹ کا طویل اقتباس درج کیا گیا ہے۔ جس میں تصدیق کی گئی ہے کہ مسلم لیگ نے ووٹروں کو متاثر کرنے کے لیے مذہب کا پوری شدومد سے استعمال کیا گیا۔ بریلز فورڈ نے لکھا ہے کہ:

> تین بڑی طاقتیں جاگیر دار، حکومت (پنجاب) اور مسلم لیگ مسلمان کاشتکاروں کو متاثر کرنے کے لیے برسرپیکار ہیں۔ ان تینوں قوتوں میں سے صرف مسلم لیگ کسان کے جذبات پر اثرانداز ہو سکی ہے اور مسلم لیگ کے نام پر ہر جگہ ہلچل نظر آرہی ہے۔ مسلم لیگ نے عام مسلمانوں میں یہ خوف پیدا کر دیا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ ملاؤں نے کسانوں کو کہا ہے کہ ان کی نجات مسلم لیگ کو ووٹ دینے میں ہے۔ بسا اوقات تو یہ لوگ قرآن ہاتھ میں پکڑ کر سڑکوں پر گشت کرتے ہیں۔ میں نے خود گاڑیوں پر لاؤڈ سپیکر رکھتے ہوئے یہ نعرہ سنا ہے،' کافر ہندو مردہ باد' اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس صوبے کی مسلمانوں کو مذہبی جذبات نے گرفت میں لے لیا ہے۔ جو آبادی میں معمولی اکثریت میں ہیں۔ یہ لوگ پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں(1991:94)۔

چنانچہ یہ بات حیران کن نہیں کہ ایسی مہم سے ہندوؤں اور سکھوں میں دہشت پھیل گئی ہو جو تمام مغربی اضلاع میں ہر طرف چھوٹی چھوٹی تعداد میں آباد تھے۔ میرے انٹرویوز سے یہ بات سامنے آئی کہ غیر مسلموں نے پہلی بار محسوس کیا کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے۔ جہلم کے دیہی علاقوں، گجرات، میانوالی، ڈیرہ غازی خان اور راٹک میں ہندو اور سکھ دکانداروں نے اپنے کاروبار فروخت کرنا اور بیوی بچوں کو 1945 کے دوسرے نصف سے مشرقی پنجاب میں رشتہ داروں کی طرف بھیجنا شروع کر دیا تھا تاہم اکثر غیر مسلم اس امید پر بیٹھے رہے کہ شاید سیاستدان اس معاملے کا آئینی حل تلاش کر لیں۔

انتخابی نتائج

گورنر پنجاب نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ 24 فروری 1946 کے انتخابی نتائج نے درست ثابت کر دیے۔ پنجاب اسمبلی کی 86 مخصوص مسلم نشستوں میں سے 75 مسلم لیگ نے جیت لیں اور ایوان کی سب بڑی پارٹی بن گئی تاہم مجموعی برتری کے لیے اس کو پھر بھی 10 نشستوں کی کمی کا سامنا تھا۔ بعد ازاں یونینسٹ پارٹی کے 2 ارکان وفاداریاں تبدیل کر کے مسلم

لیگ میں آ گئے اور یوں کل تعداد 77 ہو گئی۔ سب سے زیادہ نقصان حکمران یونینسٹ پارٹی کو ہوا جس کی پنجاب اسمبلی میں تعداد 18 نشستوں تک محدود ہو گئی۔ کانگریس نے بھی اچھے نتائج دیے اور 50 نشستیں حاصل کیں جبکہ پنتھی سکھوں کو 23 سیٹیں ملیں۔ 7 نشستیں آزاد امیدوار جیت گئے۔ کمیونسٹ پارٹی کو اپنی چاروں نشستوں سے ہاتھ دھونا پڑ گئے جبکہ احرار کے امیدواروں کو کانگریس کی مالی اور سیاسی حمایت کے باوجود مخصوص نشستوں پر ایک بھی سیٹ نہ ملی۔ یہ بات واضح ہو گئی کہ مسلمان ووٹر مسلم لیگ کی پشت پر تھے جبکہ ہندوانبالہ کے جاٹوں سمیت کانگریس کے سپورٹر تھے۔ اسی طرح سکھوں نے پنتھی پارٹی کو ووٹ دیا۔

مخلوط حکومت کا قیام

پنجاب کے چیف سیکرٹری ایچ ڈی بھنوٹ (ہندوستانی عیسائی تھے) نے اپنی پندرہ روزہ رپورٹ میں 28 فروری کو لکھا کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل جو مرکز میں کانگریس کے ممتاز لیڈر تھے انتخابی نتائج سے بہت مایوس ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ ہم مسلم لیگ کے ساتھ ہرگز نہیں چلیں گے۔ بہرحال مسلم لیگ، کانگریس اور سکھ اکالیوں کے درمیان نتائج کے فوراً بعد شراکت اقتدار پر اختلافات شروع ہو گئے لیکن حیرت کی بات نہیں کہ یہ جماعتیں مخلوط حکومت کے قیام پر متفق نہیں ہوئی تھیں۔ گورنر گلینسی نے 7 مارچ 1946 کو اپنی خفیہ رپورٹ میں لکھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کے لیڈر نواب ممدوٹ نے میرے ساتھ 6 مارچ کو ملاقات کی اور صوبے میں حکومت سازی کے امکانات پر بات چیت کی کیونکہ ان کی جماعت نے پنجاب اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے گورنر کو بتایا کہ سکھ پنتھی پارٹی کے ساتھ مذاکرات اس لیے ناکام ہو گئے تھے کیونکہ سکھوں نے مطالبہ کیا کہ آپ وہ علاقے واضح کریں جو 'خالصتان' کا حصہ بنیں گے۔ یہ ایسا مطالبہ ہے جس پر کسی صورت میں بھی عملدرآمد نہیں کیا جا سکتا (Ibid: 176)۔ نواب ممدوٹ نے ایوان میں 87 ارکان کی حمایت کا دعویٰ کیا جن میں 76 مسلم لیگ کے تھے جبکہ 2 ہندو ارکان تھے جو یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو گئے۔ اس کے علاوہ 4 شیڈولڈ کاسٹس کے نمائندے، 2 ہندوستانی عیسائی اور ایک سکھ رکن اسمبلی تھا۔

گلینسی نے ممدوٹ کے دعوے پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ گورنر نے ان کو شیڈولڈ کاسٹ کے دونوں ہندو ارکان کی تحریر دکھائی جس میں انہوں نے کہا کہ وہ بدستور یونینسٹ پارٹی کا حصہ تھے۔ جب شیڈولڈ کاسٹ کے 4 ارکان کا ذکر ہوا تو ممدوٹ نے اعتراف کیا کہ انہیں ان کی حمایت کا پورا یقین نہیں۔ عیسائی ارکان میں سے صرف ایک کی حمایت کا انہیں یقین تھا (Ibid:176-7)۔ یوں مسلم لیگ کو صرف 80 ارکان کی حمایت حاصل تھی۔ دوسری جانب جب گورنر نے سر خضر، بھیم سین سچر اور بلدیو سنگھ سے ملاقات کی تو انہیں 94 ارکان اسمبلی کی واضح حمایت حاصل تھی۔ البتہ گلینسی نے محسوس کیا کہ اس تعداد میں مبالغہ ہے اور اصل تعداد 90 بنتی ہے۔ جو بہر صورت مسلم لیگ کی 80 ارکان کی تعداد سے 10 زیادہ ہے۔ چنانچہ گورنر نے خضر حیات کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔

اس طرح 11 مارچ 1946 کو ایک مخلوط حکومت وجود میں آئی جس میں سر خضر حیات ٹوانہ پنجاب پریمیئر تھے۔ کابینہ میں یونینسٹ پارٹی کے 3 مسلمان ارکان سر خضر ٹوانہ، مظفر علی قزلباش اور محمد ابراہیم برق، کانگریس کے 2 وزیر بھیم سین

سچر اور لہری سنگھ جبکہ پنتھی پارٹی کا ایک وزیر سردار بلدیو سنگھ شامل تھے۔ مسلم لیگ نے حکومت کو مسترد کرتے ہوئے ایک تحریک چلائی جس میں یہ ظاہر کیا گیا کہ مخلوط حکومت غیر نمائندہ تھی کیونکہ صوبے کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ اس کا حصہ نہیں۔ اس صورتحال میں حکومت نے دفعہ 144 ضابطہ فوجداری نافذ کردی جس کے تحت 5 یا 5 سے زائد افراد کے اکٹھے ہونے، عوامی جلسہ کرنے یا اسلحہ لے کر چلنے پر پابندی تھی۔

8 اپریل 1946 کو سر ایوانز جینکنز جو سول سروس کے سینئر افسر تھے نے سر برٹرینڈ گلینسی کی جگہ گورنر پنجاب کا منصب سنبھال لیا۔ ایوانز جینکنز اپنے پیشرو گلینسی اور دیگر انگریز حکام کی طرح ایک عملی انسان تھے اور کانگریس کو ناپسند کرتے تھے۔ یہ کراہت کانگریس کی طرف سے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک شروع کرنے کی وجہ سے فزوں تر ہو گئی تھی۔ دوسری طرف جینکنز کے مسلم لیگ کے بارے میں خیالات امن وامان اور فرقہ وارانہ بھائی چارے کے حوالے سے کافی مثبت تھے۔ گلینسی کی طرح جینکنز کا بھی خیال تھا کہ پنجاب کا زیادہ مفاد متحد رہنے اور تین بڑے مذاہب کی قیادت میں مشترکہ حکومت بنانے میں ہے۔ اپنی پہلی پندرہ روزہ رپورٹ میں جینکنز نے 15 اپریل کو یہ تاثرات بیان کیے:

> دیہی علاقے میں عام آدمی میں سیاست اور پنجاب کے مستقبل کے بارے میں بہت کم تفکر دیکھنے کو ملتا ہے۔ البتہ اگر لاہور اور امرتسر میں کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو اس کا دائرہ بہت جلد پھیل جائے گا۔ بالخصوص سکھ اپنے مذہبی جلوسوں (جن میں دیہاتی جوق در جوق شامل ہوتے ہیں) کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں (Ibid:182)۔

ہمیں اس رپورٹ میں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ پنجاب میں کانگریس کے رہنما بھیم سین سچر یونینسٹ پارٹی کو پسند نہیں کرتے تھے اور مسلم لیگ کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہتے تھے لیکن انہیں ملال ہوا کہ ایسی کوئی ڈیل نہیں ہو سکی (Ibid:183)۔ مسلم لیگ اور سکھوں کے درمیان ڈیل کے معاملے پر جینکنز نے لکھا کہ:

> ماسٹر تارا سنگھ نے خالصتان جس میں سکھوں کی آبادی کی منتقلی ہو یا دریائے جمنا سے دریائے چناب تک ایک ایسی نئی ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ سکھ محکوم نہ ہوں۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ جتنا ممکن ہو خاموش رہیں۔ میں نے ان سے (دیگر رہنماؤں کی طرح) بھی پوچھا کہ کیا آپ پنجاب کو کئی صوبوں میں تقسیم کرنا پسند کریں گے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا کبھی منطقی جواب نہیں مل سکتا (Ibid)۔

اس رپورٹ میں گورنر نے انکشاف کیا کہ اگرچہ اعلیٰ سرکاری افسروں نے انتخابات میں غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا تاہم چھوٹے سرکاری ملازمین میں سے 80 فیصد مسلمانوں نے مسلم لیگ کی انتخابی مہم چلائی۔ البتہ انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر بینٹ اپنی پولیس فورس کے مورال سے مطمئن ہیں تاہم انہوں نے نشاندہی کی ہے کہ 70 فیصد اہلکار مسلمان ہیں جبکہ نان افسر گریڈ میں 73 فیصد مسلم ہیں۔ تعداد میں یہ تناسب با آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے (Ibid:186)۔ دوسرے

الفاظ میں گورنر پولیس میں مسلمانوں کی زیادہ نمائندگی کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ امن وامان کی صورتحال خراب ہونے پر مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ بعد ازاں سکھوں اور ہندوؤں نے شکایت کی کہ دنگافساد کے دوران مسلمان پولیس اہلکاروں نے اپنے ہم مذہب افراد کا ساتھ دیا۔

اگلی پندرہ روزہ رپورٹ میں 2 مئی کو گورنر جینکنز نے حصار، کرتارپور (ضلع جالندھر)، امرتسر اور ملتان میں فرقہ وارانہ واقعات کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ انہوں نے لکھا کہ "تمام مذاہب کے ارکان بڑے پیمانے پر فسادات کی تیاریاں کر رہے تھے اور 'رضاکاروں' پر مشتمل 'نجی فوجوں' کی تشکیل کی بھی باتیں کی جا رہی ہیں" (Ibid: 186)۔ بین المذاہب کشیدگی بڑھانے میں ہر مذہب کے پریس (اخبارات و جرائد) کا بھی ذکر کیا گیا۔ جہاں تک خضر حیات کی کابینہ میں شامل وزرا کا ذکر ہے گورنر جینکنز نے لکھا کہ بھیم سین سچر اور لہری سنگھ انتظامیہ پر کھلے عام تنقید کر رہے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ یہاں وہ ایک بار پھر اپنی سرگرمیوں کے سیاسی مضمرات کا اندازہ لگانے میں ناکام رہے ہیں۔ ہاں مسلم سرکاری ملازمین جن میں پولیس کی بھاری تعداد بھی شامل ہے کانگریس کو ناپسند کرتی ہے اور ان کی ہمدردیاں مسلم لیگ کے ساتھ ہیں (Ibid)۔ مجموعی طور پر یہ تاثر بالکل واضح تھا کہ مخلوط حکومت کے وزرا میں ایک ٹیم کے طور پر کام کرنے کے جذبے کا فقدان تھا۔

وائسرائے ویول کے نام 27 مئی کو خصوصی خفیہ مراسلے میں جینکنز نے بتایا کہ سکھ برادری کابینہ مشن کے 16 مئی کے پلان پر مایوس ہے کیونکہ اس منصوبے کے تحت وہ گروپ بی کے مسلم اکثریت والے صوبوں میں چلے جائیں گے تاہم اس خط میں سکھ مفادات کے حوالے سے خصوصی تحفظات کا اظہار نہیں کیا گیا۔ سردار بلدیو سنگھ نے گورنر کو بتایا کہ وہ مضبوط مرکز پر یقین رکھتے ہیں اور اس خدشے کا اظہار کیا کہ مسلمان اپنے گروپ کو مضبوط یونین بنانے کا مطالبہ کریں گے جو پاکستان کے قیام کا باعث بنے گا۔ جناحؒ نے بلدیو سنگھ سے رابطہ کر کے مضبوط 'گروپ بندی' میں تعاون کے لیے کہا جس کے عوض مسلمان سکھوں کو سرکاری ملازمتوں میں غیر معمولی حصہ دینے پر تیار تھے۔ گروپ بی مسلح افواج میں 40 فیصد حصے کا حامل تھا اور جناحؒ نے سکھوں کو وہاں بھی مناسب حصہ دینے کا وعدہ کیا لیکن بلدیو سنگھ نے اس پیشکش کو غیر حقیقی طور پر کشش قرار دیا اور سوچا کہ سکھوں کو ایسے وقت پر قائل کرنا مشکل ہے جب ان کے مسلمانوں کی برتری سے متعلق اندیشے عروج پر پہنچ چکے ہیں۔ گورنر نے محسوس کیا کہ سکھ اگر تعاون نہیں کرتے تو گروپ بی تشکیل پانے پر اتفاق نہیں ہو سکے گا۔ سکھوں اور مسلمانوں میں تصفیے کے امکانات بتدریج کم ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی وجہ سکھ لیڈروں کے تند و تیز بیانات تھے جو وہ خود کو اپنی کمیونٹی کا حقیقی نمائندہ ثابت کرنے کے لیے داغتے رہتے تھے (Ibid: 204-7)۔

15 جون کی رپورٹ میں گورنر نے بتایا کہ سکھ لیڈروں کے امرتسر میں 9 اور 10 جون کے اجلاسوں کی انٹیلی جنس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکالی سکھوں میں دو دھڑے پائے جاتے ہیں۔ گیانی گروپ کی قیادت گیانی کرتار سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ کر رہے تھے جبکہ 'ناگوک گروپ' ادھم سنگھ ناگوک اور اشہر سنگھ مجھیل کی قیادت میں متحرک تھا۔ ایک تیسرا گروپ بھی تھا جس میں قوم پرست یا کانگریس کے حامی سکھ شامل تھے۔ ان اجلاسوں سے پہلے اتحاد کے لیے سنجیدہ کوششیں کی گئیں تاہم اس میں جزوی کامیابی ملی۔ سکھ لیڈروں نے اشتعال انگیز تقریروں میں کابینہ مشن پلان کی کڑی مذمت کی۔ انگریزوں

کے خلاف گوریلا لڑائی کی بھی دھمکیاں دی گئیں۔ بعض سکھ اخبارات نے مشورہ دیا کہ سکھوں کو ایک یا دو ضلعوں پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ گورنر نے رپورٹ میں لکھا، "مجھے کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے اشتعال انگیز مشورے ادھم سنگھ ناگوک اور اسکے ہمنواؤں نے دیے تھے"(Ibid: 217)۔

دوسری طرف سمجھدار سکھوں کا خیال تھا کہ فوری فیصلہ کرنے کی بجائے حالات کا انتظار کرنا چاہیے اور یہ کہ انگریزوں کے خلاف 'راست اقدام' سے صرف پنجاب حکومت کے ساتھ تصادم ہوگا اور بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ سکتے ہیں۔ بالآخر ایک مشاورتی کمیٹی تشکیل دی گئی تاکہ کابینہ مشن، کانگریس اور مسلم لیگ سے مذاکرات کیے جا سکیں جبکہ انگریزوں کے خلاف کارروائی کے لیے ایک کونسل آف ایکشن بھی تشکیل دی گئی۔ البتہ یہ کونسل اس وقت تک انتظار کرتی جب تک مشاورتی کمیٹی سکھوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے تصفیے کی پوری کوشش نہ کر لیتی(Ibid)۔

29جون کی پندرہ روزہ رپورٹ میں گورنر نے لکھا، "سکھ اپنی نجی فوج تشکیل دینے میں مصروف ہیں جس میں شامل ہونے والے کو اپنے خون کے ساتھ وفاداری کے حلف پر دستخط کرنا پڑتے تھے"(Ibid: 226)۔ دوسری طرف کانگریس اور مسلم لیگ نسبتاً خاموش تھیں۔ گورنر نے محسوس کیا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ریٹائر ہونے والے فوجیوں میں ملازمت نہ ملنے پر بے اطمینانی پھیل رہی تھی۔ 15 جولائی کی رپورٹ میں جینکنز نے لکھا کہ سب سے زیادہ اشتعال انگیز تقریریں سکھ رہنما کر رہے تھے۔ البتہ کانگریس کے سکھ لیڈر رنجن سنگھ گل اور پرتاپ سنگھ کائروں اس بات کی کوششیں کر رہے تھے کہ سکھ کانگریس کا ساتھ دیں۔ مسلمانوں کے متعلق جینکنز نے محسوس کیا کہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مذاکرات معطل ہونے پر نالاں تھے اور گورنر نے لکھا چونکہ مسلم لیگ نے کابینہ مشن پلان منظور کر لیا ہے چنانچہ اسے کانگریس کو چھوڑ کر تنہا حکومت بنانے کی دعوت دینی چاہیے۔ گورنر نے لکھا:

> اس طرح سے انہیں کئی انگریز سویلین افراد، فوجی افسروں اور تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ہمدردیاں حاصل ہو رہی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا، اگرچہ یہ لوگ نتائج پر خوش ہیں۔ ہندو بالخصوص خوش ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جناح ؒ کو بری طرح ہزیمت اٹھانا پڑی ہے(Ibid: 250)۔

29جولائی کی رپورٹ میں گورنر نے پنجاب اسمبلی میں مختلف جماعتوں کے جوڑ توڑ کی تفصیل لکھی۔ کانگریس نے گوجرانوالہ میں زبردست تحریک شروع کی جبکہ لاہور اور امرتسر میں ہڑتالوں کی اطلاعات ہیں۔ پنجاب کے چیف سیکرٹری ایچ ڈی بھنوٹ نے 31جولائی کو اپنی رپورٹ میں لکھا کہ موجودہ صورتحال کی سب سے تشویشناک بات آر ایس ایس اور مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی سرگرمیوں میں اضافہ ہے۔ نومبر کے بعد آر ایس ایس (راشٹر سوئم سیوک سنگھ) کی ممبر شپ دگنی ہو کر 28ہزار ہو گئی ہے۔ اس ہندو تنظیم کے ارکان قتل سمیت فرقہ وارانہ تشدد کی وارداتوں میں ملوث ہیں۔ آر ایس ایس کی کچھ شاخیں مسلح بھی ہیں۔ اسی طرح نیشنل گارڈز کی تعداد جو 1945میں 3ہزار تھی اب 10ہزار سے بھی بڑھ چکی ہے۔ مسلم لیگ اسی سال کے آخر تک اس تعداد میں 5لاکھ تک اضافے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ان دونوں تنظیموں کی دیہات سمیت کئی مقامات پر شاخیں موجود ہیں اور اسی لیے انہیں کافی

خطرناک سمجھنا چاہیے۔ چیف سیکرٹری نے یہ بھی بتایا کہ ایک قوم پرست مسلم رہنما مولانا داؤد غزنوی جو پنجاب کانگریس کی صوبائی کمیٹی کا صدر تھا اب مسلم لیگ میں شامل ہو چکا ہے۔

وائسرائے ویول کے نام 31 اگست کو خصوصی رپورٹ میں جینکنز نے نہرو کی 10 جولائی کے بمبے میں اشتعال انگیز بیان کا حوالہ دیا جس میں نہرو نے اعلان کیا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی میں شرکت کے بعد اپنے کسی وعدے کی پابند نہیں رہے گی۔ انہوں نے کہا کہ اس بیان سے پنجابی مسلمانوں میں تشویش پھیل گئی ہے اور وہ نہرو کی دھمکی سے رونما ہونے والی انقلابی تبدیلیوں پر چوکنا ہو گئے ہیں (Ibid: 268-9)۔ اسی طرح کئی مسلمانوں نے مسلم لیگ کی طرف سے راست اقدام کے فیصلے پر بھی مایوسی ظاہر کی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے راست اقدام کی حمایت کرتے ہوئے قانون توڑنے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں جبکہ صوبائی مسلم لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ مظاہرے پر امن ہوں گے۔ ایک تجویز یہ ہے کہ یہ دن مذہبی مقامات پر منایا جائے۔ اس فیصلے میں بھی خطرات پوشیدہ ہیں کیونکہ 'اسلام خطرے میں ہے' کا نعرہ بلند کیا جائے گا اور ہجوم کو مشتعل کیا جائے گا۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے تو سوشلسٹوں کا فارورڈ بلاک بدستور قابل اعتراض زبان استعمال کر رہا ہے (Ibid: 270)۔

31 اگست کی رپورٹ میں جینکنز نے وائسرائے ویول کو بتایا کہ اس مہینے میں میرا زیادہ وقت امن وامان کی صورتحال درست کرنے پر صرف ہوا۔ مسلمانوں نے شکوہ کیا ہے کہ مخلوط حکومت نے جیا پرکاش جیسے بہار سے آنے والے ان مظاہرین کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا جنھوں نے انگریزوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کیں جبکہ مسلم لیگ کے جارحانہ تقریریں کرنے والے رہنماؤں کے خلاف کارروائی کی گئی۔ گورنر نے خدشہ ظاہر کیا کہ اگر حکومت نے غیر جانبدارانہ انداز میں کام نہ کیا تو مسلمانوں میں غم وغصہ بڑھ سکتا ہے۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ ''ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مسلمان لیڈر وہ لوگ ہیں جو کئی نسلوں سے حکومت وقت کے ساتھ دوستانہ روابط قائم کیے رہے۔ اگر ان کے پاس کانگریس کی طرح پیشہ ور فسادی افراد ہوتے تو ہمیں آج سے پہلے بھی زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا (L/P&J/5/249)۔

اسی تاریخ کی پنجاب کے چیف سیکرٹری کی رپورٹ میں اگست کے دوسرے پندرھواڑے کے حالات کے بارے میں بتایا گیا کہ پنجاب بھر میں مسلم لیگ نے 16 اگست کو 'راست اقدام' پر امن طریقے سے منایا اور بڑے پیمانے پر کہیں نقل وحرکت نہیں ہوئی۔ البتہ مساجد سے جہاد کے اعلانات ضرور ہوئے۔ سکھ اگرچہ کانگریس کے کافی قریب ہو چکے تھے البتہ محمد علی جناح ؒ کی طرف سے ماسٹر تارا سنگھ کو ملاقات کی دعوت دینے سے دلچسپی میں کافی اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ ایسے شہروں اور دیہات میں کشیدگی زیادہ محسوس کی جا سکتی ہے جہاں مختلف مذاہب کے افراد ایک ہی تناسب میں آباد ہیں۔ کلکتہ میں فسادات کی خبروں سے صورتحال گھمبیر ہو گئی ہے۔ مختلف برادریوں کو تصادم سے روکنے اور نتائج سے آگاہ کرنے کی بجائے حالات خونریزی اور شاید خانہ جنگی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

31 اگست کو خصوصی رپورٹ میں گورنر نے امن وامان کی مجموعی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے نشاندہی کی کہ ہندو- سکھ گروپ اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات مسلسل بڑھ رہے ہیں جس سے ان میں تناؤ اور اندیشہ ہائے جنم لے رہے

ہیں۔ مسلمان مرکز میں کانگریس کی قیادت میں عبوری حکومت کے قیام کو ہندوؤں کے سامنے انگریزوں کا غیر مشروط سرنگوں ہونا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کانگریس کو حکومت بنانے کی دعوت دینا پارلیمانی روایات کے بھی منافی ہے چونکہ کانگریس نے کابینہ مشن پلان کو مسترد کر دیا تھا جبکہ مسلم لیگ نے اسے قبول کیا تھا لیکن اس کے برعکس کانگریس کو ہی حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ مسلمانوں نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ ہندوؤں کو نیا نیا اقتدار (یعنی مسلمانوں کی سینکڑوں سال کی حکومت اور انگریز اقتدار کے بعد) ملا ہے اور وہ اسے مسلمانوں کے منظم استحصال کے لیے استعمال کریں گے۔ انگریز حکومت کے اس رویے سے مسلمانوں میں اس شبے نے گھر کر لیا ہے کہ انگریزوں اور کانگریس کے درمیان گہرا گٹھ جوڑ ہو چکا ہے (Ibid: 272-3)۔ رپورٹ میں لکھا تھا کہ کلکتہ میں حالیہ فرقہ وارانہ فسادات سے ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی کو مزید ہوا ملی ہے۔ کلکتہ فسادات پر ہندوؤں کے ردعمل کے بارے میں جینکنز نے لکھا:

> کلکتہ کے فسادات پر ہندوؤں کا پراپیگنڈہ غیر معمولی تیز اور موثر ہے اور اسے بالخصوص اخبار 'سٹیٹس مین' کی زبردست حمایت حاصل ہوئی ہے۔ پنجابی مسلمانوں نے مسلم لیگی لیڈروں کے خون میں نہانے کے کارٹون اور ہندو عورتوں کی چھاتیاں کاٹنے یا دیگر مظالم کے الزامات پر یقین نہیں کیا۔ نہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کلکتہ کے واقعات کے تمام تر ذمہ دار مسلمان ہیں جیسا کہ ہندو پریس کی خبروں اور مضامین میں تاثر دیا گیا ہے۔

> ہندو بغلیں بجا رہے ہیں۔۔۔ دوسرے فاتح ہیں اور مسلمانوں کی تذلیل اور تضحیک کے لیے جو کچھ بس میں ہے وہ کریں گے۔ وہ (یعنی ہندو) انتہائی احمق ہوں گے اگر یہ سوچیں گے کہ پنجاب میں انگریزوں کے تعاون سے مسلمانوں کو دبالیں گے اور اس ضمن میں کانگریس لیڈر غیر محتاط گفتگو کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ کانگریس کے سکھوں سے معاہدے کا ہندوؤں کا تحفظ یقینی بنانے کے طور پر خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ بالخصوص وسطی پنجاب میں ہندو پریس بہت گستاخانہ اور فرقہ وارانہ ہے۔ اس طوفان کے نیچے (جیسا کہ شہری ہندوؤں میں ہمیشہ نظر آیا) خوف کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس باقاعدہ تصادم کو عملی رخ دینے میں خود سری اور بے یقینی کے اس ملاپ سے زیادہ کسی اور چیز کا ہاتھ نہیں ہو سکتا (Ibid: 273)۔

گورنر نے نوٹ کیا کہ سکھوں میں کم از کم تین دھڑے پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ باضابطہ طور پر سکھوں کا الحاق کانگریس سے ہے لیکن کچھ سکھ اب بھی مسلمانوں سے ناتا توڑنے کے مخالف ہیں تاہم حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ حالیہ تنازعات میں سکھوں نے بہر حال ہندوؤں کا ہی ساتھ دیا۔ سکھ اخبارات کا رویہ انگریز اور مسلمان دشمن نظر آتا ہے اور پنجاب میں سب سے زیادہ اشتعال انگیزی سکھ مقررین ہی پھیلا رہے ہیں۔ گورنر نے لکھا: "ہمارے پاس بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ ہنگاموں کے ثبوت موجود ہیں۔ مسلمان کانگریس کی اعلیٰ قیادت کی طرف سے ڈکٹیشن ہرگز قبول نہیں کریں گے" (Ibid: 274)۔

گورنر نے تجویز دی کہ پنجاب میں ایسی حکومت ہونی چاہیے جس میں تینوں بڑے مذاہب کی نمائندگی ہو کیونکہ اسمبلی میں تینوں برادریوں کی حمایت موجود ہے جبکہ دیہات میں پایا جانے والا تعصب بھی اس سے منسلک ہے۔ میرا مشورہ ہے

کہ ایسی حکومت حقیقی مشترکہ مفاد کی بنا پر مخلوط ہونی چاہیے یا پھر از سر نو منظم شدہ اور مضبوط یونینسٹ پارٹی کو آگے لانا ہو گا۔ موجودہ وزارت کا حقیقی مشترکہ مفاد نہیں اور وہ محض ایک چھوٹی عددی اکثریت کی بنا پر اقتدار میں ہے (Ibid)۔ اس کے بعد جینکنز نے وہ طریقہ تجویز کیا ہے جس سے انتظامی مشینری فرقہ وارانہ تصادم سے ممکنہ طور پر نمٹ سکتی ہے:

> مسلمان سرکاری ملازمین (جن میں 70 فیصد پولیس اہلکار شامل ہیں) کی زیادہ تر ہمدردیاں مسلم لیگ کے ساتھ ہیں جبکہ انگریز ملازمین بھی کانگریس کی طرف سے مشترکہ جدوجہد کا ساتھ دینے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہیں۔ ہم آخر کس طرح اہم عہدوں بشمول پولیس پر فائز مسلمانوں کی وفاداریوں کا تعین کر سکتے ہیں، یہ کہنا ممکن ہے انڈین سول سروس کے ایک عام انگریز افسر کا رویہ واضح طور پر سمجھنا ہو گا۔ وہ (یعنی انگریز ملازم) صرف اپنا کام کرے گا اور اگر اسے حمایت کا یقین دلایا جائے تو وہ غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی ہنگامی صورتحال سے نمٹ سکتا ہے۔ البتہ وہ کسی ایسی پالیسی کا حصہ نہیں بنے گا جسے وہ غیر اخلاقی اور غیر منصفانہ سمجھتا ہے۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے اور باہر سے کوئی مداخلت نہیں کی جا رہی۔ یہ انگریز افسر مضبوط ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے عالی مرتبت شاہ انگلستان کی حمایت درکار ہے اور اگر اسے بڑی مسلمان آبادی کے منظم انداز میں استحصال یا اس پر جبر کے لیے کہا جائے گا تو وہ ہرگز نہیں ایسا کرے گا۔ کسی ہنگامی صورتحال میں فوج کے مسلمان سپاہیوں کا موجودہ (کانگریس) حکومت کی حمایت کے حوالے سے کیا ردعمل ہو گا وہ ابھی غیر واضح ہے۔ انبالہ میں رائل انڈین ائیر فورس کے مسلمان ائیر مینوں کی مسلم لیگ نواز قرارداد کی اگرچہ تردید کی گئی ہے تاہم سول انٹیلی جنس نے اپنی رپورٹ میں اس تردید کو قابل قبول نہیں گردانا ہے۔ یہ بھی نظر آیا ہے کہ کم از کم ایک ضلع (نام نہیں دیا گیا) میں رخصت پر گئے مسلمان فوجیوں سے رابطہ کیا گیا ہے حتیٰ کہ غیر متزلزل وفاداری کے حامل مسلمان سپاہی بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ ان فوجیوں کے حوالے سے بھی وہی خطرات لاحق ہیں جو دیگر تمام مسلمانوں کے بارے میں ہیں یعنی مذہبی بنیادوں پر اپیلیں۔ جمعہ کے خطبات میں خطبا اور بااثر پیر صاحبان لازماً ان خطرات کی نشاندہی کریں گے جو اس وقت اسلام کو لاحق ہیں اور ایسی اپیل کی محض چند ہی مسلمان مزاحمت کریں گے (Ibid: 276-77)۔

انتظامی اصطلاح میں گورنر نے دراصل یہ دلائل دیے تھے کہ اگر فرقہ وارانہ خونریزی سے محفوظ رہنا ہے تو کانگریس کی اعلیٰ قیادت اور عبوری حکومت کو پنجاب کی سیاست اور انتظامی امور سے باہر رکھنا ہو گا۔ اگر پنجاب میں ممکنہ تصادم کو ٹالنا ہے تو ہندو، سکھ اور مسلم پریس کو ایک دوسرے کے خلاف مسلسل اشتعال انگیز مواد شائع کرنے سے روکنے کا حکم دینا ہو گا۔ سیاسی وابستگی سے قطع نظر جلسوں میں اشتعال انگیز تقریریں کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کرنا ہو گی۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور راشٹریہ سیوک سنگھ جیسی نجی فوجوں کو کچلنا ہو گا جبکہ ضلعی انتظامی افسروں کو امن وامان سے متعلق اختیارات کے استعمال میں معاونت فراہم کرنا پڑے گی۔ انہوں نے خبردار کیا کہ یہ اقدامات اگر نہ اٹھائے گئے تو صورتحال قابو سے باہر ہو سکتی ہے (Ibid: 278)۔ اسی تناظر میں جینکنز نے لکھا کہ:

اگر کوئی شورش برپا ہو گی تو مجھے یقین ہے کہ وہ شہروں میں انتہائی بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات سے شروع ہو گی۔ وسطی پنجاب کے سکھ دیہات اور مشرقی علاقے کے جاٹ سب سے پہلے اس میں شامل ہوں گے جس کے بعد شمالی اور مغربی اضلاع کے مسلمان دیہات بھی اس میں شریک ہو جائیں گے۔ ایک نہایت تجربہ کار انٹیلی جنس افسر سمجھتا ہے کہ بڑی شورش کے بعد مختلف سیاسی رہنماؤں کو قتل کیا جائے گا تاہم یہ محض اس کی اپنی رائے ہے (Ibid: 279)۔

14 ستمبر کی پندرہ روزہ رپورٹ میں گورنر نے ملتان اور جالندھر میں چھوٹے پیمانے پر بدامنی کی اطلاعات دیں تاہم اس صورتحال سے خود ہی نمٹ لیا گیا۔ کئی دیگر علاقوں میں زبردست کشیدگی تھی لیکن تصادم کہیں نہیں ہوا۔ پنجاب مسلم لیگ طویل ڈائریکٹ ایکشن کے لیے اعلیٰ قیادت کی ہدایات کی منتظر تھی تاہم وہ اس ضمن میں کانگریس کے حکومت سے عدم تعاون کا ماڈل اپنانا چاہتے ہیں اور ان کا ہدف سکھ یا ہندو نہیں بلکہ حکومت ہو گی (Ibid: 280)۔ البتہ بھیم سین سچر نے گورنر سے ملاقات میں خدشہ ظاہر کیا کہ مسلمان 9، 10 اور 11 ستمبر کو ہندوؤں کا قتل عام شروع کرنے کی سازش بنا رہے ہیں۔ کانگریس کی لاہور شاخ اسے (بھیم سین کو) مسلسل خوفناک افواہوں سے آگاہ کر رہی تھی (Ibid)۔ سچر چاہتا تھا کہ تمام اضلاع میں آئی این اے (انڈین نیشنل آرمی) کا مذہبی ہم آہنگی کا سٹیج ڈرامہ بھیجا جائے تاکہ لوگ ہم آہنگی کی خوبصورتی سے آگاہ ہو سکیں۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ہر شہر کے محلے میں دفاع کمیٹی تشکیل دی جائے جس کا انچارج پولیس انسپکٹر ہو۔ دوسری طرف گورنر کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کا ارادہ تھا کہ وہ کانگریس کے آئی این اے کے لیے نرم گوشے کو فوج کے وفادار مسلمان سپاہیوں کی ہمدردیاں جیتنے کے لیے استعمال کرے۔ اس ضمن میں جینکنز نے لکھا کہ:

میں نے بھیم سین سچر کو یقین دلایا کہ ہماری سول انٹیلی جنس بہت اچھی ہے۔ اگرچہ حالات میں گڑبڑ کسی وقت بھی ہو سکتی ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ مسلم لیگی رہنما فرقہ وارانہ فسادات چاہتے ہیں۔ ہمیں بدامنی سے نمٹنے کے بارے میں منصوبے کا پیشگی علم ہونا چاہیے لیکن پورا صوبہ افواہوں سے بری طرح جل رہا ہے اور ہندو خود کو خوفزدہ محسوس کر رہے ہیں (Ibid: 3)۔

قائم مقام چیف سیکرٹری (جو دراصل صوبائی ہوم سیکرٹری تھے) اے اے میکڈونلڈ نے 14 ستمبر کو اپنی پندرہ روزہ خفیہ رپورٹ میں لکھا کہ پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس یکم اور 2 ستمبر کو ہوا جس میں سول نافرمانی کی تحریک کو عملی شکل دینے پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ حکومت کو ٹیکسوں کی ادائیگی بند کرنے، امن وامان قائم کرنے میں عدم تعاون، سماجی بائیکاٹ اور غیر مسلموں کی بنائی اشیا کا بائیکاٹ کرنے پر غور کیا گیا۔ اس بات پر غور کیا گیا کہ کتنا جانی نقصان ہو سکتا ہے اور زخمی یا گرفتار افراد کو امداد فراہم کرنے کے لیے چندہ کیسے جمع کیا جائے۔ صوبائی مسلم لیگ کے سربراہ کو تمام اختیارات سونپ دیے گئے ہیں اور ان (کی گرفتاری کی صورت میں) کے جانشین کی بھی نامزدگی کر دی گئی ہے۔ اجلاس میں ایک قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں عبوری حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر ضلع اور شہر میں مسلم لیگ کے اجلاس طلب کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا (L/P&J/5/249)۔ چیف سیکرٹری نے

اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ مسلمانوں کی اکثریت مسلم اخبارات اور مساجد سے کیے گئے پراپیگنڈے سے بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ انہوں نے تبصرہ کیا کہ:

> جہاد شروع ہونے کا خطرہ مسلسل بڑھ رہا ہے اور مذہبی جنون کی طرف رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے... منظم اور کھلے عام پراپیگنڈہ اس کے علاوہ ہے، اس پر خاموشی سے عملدرآمد کیا جا رہا ہے اور فوج سے چھٹی پر آئے سپاہیوں سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت رابطے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یہ بات بھی علم میں آئی ہے کہ دیہی علاقوں میں سینہ بہ سینہ یہ پیغام پھیلایا جا رہا ہے کہ ہندو اقتدار میں آ گئے ہیں اور مسلمانوں سے دھوکہ کیا گیا ہے۔ اسلام خطرے میں ہے اور مسلمانوں کو لڑنا ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمانوں کے نتائج سے بے خوف عزم میں اضافہ ہوا ہے (Ibid)۔

30 ستمبر کی رپورٹ میں گورنر نے لکھا کہ مسلم لیگ کی طرف سے راست اقدام سے دستبردار ہونے کا کوئی امکان نہیں اور راجہ غضنفر علی خان اور غلام مصطفٰی جیلانی جیسے ممتاز مسلم لیگی رہنما مایوس کن تقریریں کر رہے ہیں۔ راجہ غضنفر کے بارے میں گورنر نے لکھا کہ:

> راجہ غضنفر کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جن کی تعداد ہندوستان میں دنیا کے کسی اور ملک سے زیادہ ہے اور ایسے افراد کی عوامی سطح پر بقا ہمیشہ سرپرائز دینے میں ہے۔ کسی عاقل شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ نجی یا عوامی زندگی میں اس پر اعتبار کرے لیکن مجمعے میں بولنے اور ہجوم کو ہنسانے کا فن اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اس کا شمار مسلم لیگ کے خطرناک ترین رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف انگریزوں کو ہدف تنقید بناتا ہے بلکہ فرقہ وارانہ خیالات کا بھی اظہار کرتا ہے۔ اس کی حالیہ تقریریں اس قابل ہیں کہ اس کے خلاف کارروائی کی جائے تاہم وزیر اعظم اس وقت تک کوئی ایکشن نہیں لینا چاہتے جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی تصفیہ نہیں ہو گا۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ راجہ غضنفر راست اقدام کو 'جہاد' کے طور پر منظم کرنا چاہتا ہے جس کی مسلمان زبردست حمایت کرتے ہیں (Ibid: 284-285)۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بنگال سے مسلم لیگ کے رہنما خواجہ ناظم الدین بھی لاہور آئے ہوئے تھے اور انہوں نے مقامی رہنماؤں کو ہدایت کی کہ وہ راست اقدام کی تیاری کریں جو اس وقت شروع ہو گا جب محمد علی جناح حکم دیں گے (Ibid: 285)۔ وزیر اعظم خضر حیات ٹوانہ یورپ کے دورے سے واپس آ چکے تھے اور 16 ستمبر کو شملہ پہنچے۔ جینکنز نے لکھا کہ:

> وہ (وزیر اعظم پنجاب) برے مسلمانوں کے خلاف اس وقت تک قانونی کارروائی نہیں کرنا چاہتے جب تک کانگریس لیگ تصفیے کے بارے میں حتمی فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ اسی وجہ سے وہ مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے خلاف

ایکشن نہیں لے رہے اور متنازعہ لیڈر جے پر کاش نارائن اور اس کے قریبی ساتھیوں کے پنجاب میں داخلے پر پابندی نہیں لگائی جا رہی (Ibid: 286)۔

گورنر نے 14 اکتوبر کی پندرہ روزہ رپورٹ میں لکھا کہ مجموعی طور پر ماہ رواں کا پہلا نصف خاموشی سے گزرا، البتہ ہانسی ضلع حصار میں کچھ گڑبڑ دیکھنے میں آئی جہاں ایک ہلاکت ہوئی جبکہ 30 افراد زخمی ہوئے۔ صوبے کے دیگر حصوں میں پولیس کی بھرپور کوششوں اور فوج کے تعاون کے ساتھ امن برقرار رکھا گیا ہے۔ راست اقدام منانے کی مسلم لیگ کی تیاریاں جاری ہیں اور ضلعی سطح پر اجلاسوں میں لوگوں کی بڑی تعداد شریک ہو رہی ہے (Ibid: 289)۔ صوبے میں کسی جگہ ہنگامے پھوٹ پڑنے کی صورت میں حکومتی تیاریوں کے بارے میں گورنر نے لکھا:

میں نے اور پریمئیر نے 14 اکتوبر کو شمالی کمانڈ کے فوجی سربراہ جی او سی انچیف کے ساتھ ملاقات کی اور ان سے پنجاب میں انگریز فوج کی تعیناتی کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ موجودہ منصوبے کے تحت صوبے کے چار مقامات سیالکوٹ، لاہور، فیروزپور اور جالندھر میں فوج کی چار بٹالین تعینات کی جائے گی۔ اس وقت صوبے کے حساس علاقوں میں راولپنڈی، لاہور، جالندھر اور انبالہ شامل ہیں۔ امرتسر کو لاہور جبکہ ملتان کو کراچی میں تعینات دستوں سے کنٹرول کیا جائے گا۔ جنرل گریسی (آرمی چیف) جو دہلی جا رہے ہیں نے ہمارے خیالات سے آگاہی حاصل کی ہے اور کہا کہ وہ حکومت کی خواہشات پر عملدرآمد کی پوری کوشش کریں گے۔ وزیر اعظم خضر نے کہا کہ وہ فوج کی مزید دو بٹالین چاہتے ہیں تاہم اس بات میں شبہ ہے کہ کیا فوج کے پاس مزید کوئی نفری دستیاب ہو گی یا نہیں (Ibid: 290)۔

اس کے علاوہ پریمئیر نے مرکز میں قائم عبوری حکومت کی طرف سے پنجاب کے معاملات میں مداخلت پر تین مرتبہ اعتراض کیا۔ انتظامی افسروں کے ساتھ ایک اجلاس میں وزیر اعظم نے ممکنہ خانہ جنگی سے نمٹنے کے لیے تین تجاویز پیش کیں۔ اول یہ کہ برطانوی حکومت یا وائسرائے ایک بیان میں اعلان کریں کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے معاملات کی اس وقت تک ذمہ دار رہے گی جب تک اس کی ذمہ داری پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعے کالعدم نہ کر دی جائے یا پھر آئین ساز اسمبلی ہندوستان کا آئین نہ تیار کر لے جسے برطانوی حکومت تسلیم کر لے۔ دوم انگریز اور ہندوستان کی اعلیٰ بیوروکریسی میں بے چینی اس طرح ختم ہو سکتی ہے اگر حکومت بروقت واضح ہدایات جاری کرے کہ اعلیٰ افسروں کو کن حالات میں کس طرح کام کرنا ہے۔ پریمئیر نے یہ بھی کہیں سنا ہے کہ انگریز فوجی افسر یہ کہتے پائے گئے ہیں کہ اگر 'نہرو راج' آ گیا تو وہ جلد کوچ کر جائیں۔ یہی تبصرے انگریز سول افسر بھی کرتے ہیں (Ibid: 291)۔
چیف سیکرٹری نے 14 اکتوبر کو اپنی رپورٹ میں لکھا کہ مسلم لیگ نے جہاد کی دعوت دینے کا پراپیگنڈہ مزید تیز کر دیا ہے۔ عبوری حکومت کو عوام کے سامنے منفی انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اسے ہندو حکومت کہا جا رہا ہے چونکہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کالج کھل چکے ہیں اس لیے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے رضاکار گارڈز کی تیاری کا ضابطہ کار

جاری کر دیا ہے جس میں دیگر معاملات کے علاوہ طلبا سے یہ عہد بھی لیا جا رہا ہے کہ وہ قیام پاکستان کی منزل پانے کے لیے جان تک قربان کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ خواتین کو بھی منظم کیا جا رہا ہے۔ نرسوں اور ابتدائی طبی امداد کی فراہمی کے تربیتی پروگرام کو منظم کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے (L/P&J/5/249)۔ انہوں نے رپورٹ میں لکھا کہ:

> جو رپورٹیں موصول ہوئی ہیں ان کے مطابق مساجد اور عوامی مقامات میں زبردست جذباتی اپیلیں کی جا رہی ہیں۔ جہاد کی کال دینے کے ساتھ بعض مقرر ہندوؤں کے غلبے کے خطرے سے خبردار کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اگر ہندو کا غلبہ ہوا تو مساجد مسمار کر دی جائیں گی اور مسلمانوں کو جبراً ہندو مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا (Ibid)۔

چیف سیکرٹری نے یہ بھی کہا کہ سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے یہ بیان دیا ہے کہ جناح کو انگریزوں کا ایجنٹ قرار دینے کا الزام غلط تھا۔ جو اس بات کا اشارہ ہے کہ اکالی مسلم لیگ کے ساتھ ڈیل کرنے کے خواہاں ہیں۔ یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اگر آئینی پلان میں پیشرفت ہوتی ہے تو سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کا ساتھ دے سکتے ہیں کیونکہ گروپ بی میں دونوں قوموں کے مشترکہ مفادات ہیں اور یہ پہلو بھی ہے کہ یہ دونوں جنگجو قومیں ہیں (Ibid)۔ اس تبصرے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس وقت تک پنجاب کی سیاست متحرک حالت میں تھی اور کوئی مستحکم اتحاد نہیں وجود میں آیا تھا۔

گورنر کی 31 اکتوبر کی رپورٹ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلم لیگ کی عبوری حکومت میں شمولیت پر آمادگی سے جو مثبت صورتحال سامنے آئی وہ مشرقی بنگال (نواکھلی) میں ہونے والے فسادات سے متاثر ہو گئی۔ اس کے علاوہ 24 اکتوبر کو دیوالی کی رات لدھیانہ میں بھی فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ ان ہنگاموں کا آغاز روایتی جوئے پر تلخ کلامی سے ہوا۔ ایک ہندو یا پھر شاید سکھ نے بازی میں بہت بڑی رقم جیت لی لیکن ہارنے والے مسلمانوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اس کو چھرے مار دیے گئے۔ اس کے بعد 27 اکتوبر کو مزید تصادم ہوا جس میں 30 افراد زخمی ہوئے اور 7 اموات ہوئیں (Carter, 2006: 292-3)۔

دوسری طرف ڈی اے وی اور سناتم دھرم کالج کے ہندو طلبا نے 29 اکتوبر کو 'یوم نواکھلی' منایا جبکہ لاہور میں جلوس نکالا گیا جس کے شرکا نے 'خون کا بدلہ خون' جیسے اشتعال انگیز نعرے لگائے۔ سابق وزیر پنجاب سر گوکھل چند مسلمان مخالف جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔ لاہور کے ہندو سمجھتے تھے کہ انہوں نے بھرپور تیاری کر رکھی ہے اور تصادم کرنے کے درپے تھے۔ گورنر اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ میں بمشکل اس پر یقین کر سکتا ہوں کہ یہ سچ ہے تاہم میرے سمیت یونیورسٹی کے ٹیچنگ سٹاف کے کئی ارکان سمجھتے ہیں کہ بعض اساتذہ کے رویے میں بے اعتدالی اور غیر ذمہ داری کا عنصر کافی زیادہ پایا جاتا ہے (Ibid: 293-4)۔

13 اور 14 نومبر کی پندرہ روزہ رپورٹ میں گورنر جینکنز نے سیالکوٹ میں قیام کے دوران لکھا کہ:

> فرقہ وارانہ کشیدگی پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ میں آپ جناب (وائسرائے) سے اتفاق کرتا ہوں کہ اس کی ذمہ دار کانگریس ہے۔ ان لوگوں نے کئی برسوں سے پرتشدد سوچ کی حوصلہ افزائی کرنے کا وطیرہ اپنایا ہوا ہے۔ کسی بھی بڑے شہر میں اب

کوئی چھوٹا واقعہ بھی آگ بھڑکا سکتا ہے اور اس بات کے غالب خدشات موجود ہیں کہ اگر تصادم شروع ہوا تو اس کے اثرات دیہات تک بھی پہنچ جائیں گے (Ibid: 296)۔

اس رپورٹ میں ایک واقعے کا بھی ذکر ہے جس میں لاہور کے چند ہندو طلبا نے ایک مسلمان قصاب کو نشانہ بنایا جو اپنی سائیکل کے کیریئر پر گوشت لے کر جا رہا تھا۔ اس وقت تک سب سے گھمبیر واقعہ ضلع روہتک انبالہ ڈویژن میں رونما ہوا تھا۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ایک مزار کی بے حرمتی کی جس کے نتیجے میں 11 نومبر کو چھرا گھونپنے کے واقعات ہوئے۔ اس دوران ہندو جاٹ کلہاڑیوں اور ڈنڈوں سے مسلح ہو کر آ گئے۔ انہوں نے ایک چھوٹے ریلوے سٹیشن پر حملہ کر کے مسلمان اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر کو قتل کر دیا جبکہ ہندو سٹیشن ماسٹر سے رقم چھین لی (Ibid: 297)۔

پنجاب کابینہ میں کانگریس کے ارکان کا ذکر کرتے ہوئے لہری سنگھ کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ عوامی مقامات پر بھڑکیں مارتا تھا کہ پنجاب حکومت دراصل کانگریس کے وزرا چلا رہے تھے۔ پنجاب کے کئی علاقوں کا ذکر کرتے ہوئے گورنر نے بتایا کہ حکومت کے پرانے سپورٹر کافی ناخوش ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل اب سیاسی جماعتوں کے ہاتھ میں ہے جنہیں یہ لوگ ناپسند کرتے ہیں اور ان کا ساتھ دینے میں چنداں دلچسپی نہیں رکھتے (Ibid: 298)۔

وائسرائے ویول نومبر کے آخر میں انگلستان چلا گیا چنانچہ 30 نومبر کی رپورٹ قائم مقام وائسرائے سر جان کول ولی Sir John Colville کے نام ہے۔ اس عرصے کا اہم ترین واقعہ پنجاب پبلک سیفٹی آرڈیننس کا 19 نومبر کو نفاذ ہے۔ اس کا مسودہ گورنر نے تیار کیا اور گورنمنٹ ایکٹ آف انڈیا 1935 کے تحت اس کا نفاذ کیا گیا۔ وزیر اعظم نے گورنر کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات استعمال کریں اور پنجاب اسمبلی کی منظوری حاصل نہ کریں کیونکہ اس کی ضابطے کی موشگافیوں میں تاخیر ہو سکتی ہے (Ibid: 302)۔ نئے آرڈیننس کے تحت حکومت نے کھدائی اور اسلحہ لے کر چلنے پر پابندی لگا دی۔ چنانچہ مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے چند رضاکاروں کو کہا گیا کہ وہ گھر جائیں اور اپنا یونیفارم تبدیل کر لیں جبکہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے کچھ ارکان کو گرفتار کر لیا گیا۔ جینکنز لکھتے ہیں: "یہ شاید پہلا بڑا واقعہ ہے جس میں گورنر نے کابینہ کی حمایت سے اپنے صوابدیدی اختیارات کا استعمال کیا" (Ibid)۔

ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جب وزیر اعظم پنجاب دہلی گئے تو وہاں عبوری حکومت کے وزرا کا فرقہ وارانہ انداز دیکھ کر انہیں دھچکا لگا۔ انہوں نے سوچا کہ اس کا حل صرف عبوری حکومت کی برطرفی اور اقتدار میں انگریز انتظامیہ کی سخت نگرانی کی بحالی ہے۔ آخری حل کے طور پر انہوں نے سوچا کہ پنجاب کو خود مختار قرار دے کر براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت کر دیا جائے (Ibid: 303)۔ شوکت حیات کے شراب نوشی کے عادی ہونے کے بارے میں جینکنز نے لکھا کہ میں نے حال ہی میں انہیں ہٹانے کی سفارش کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ "شوکت ایک چھوٹا انسان ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ بے ایمان ہے لیکن وہ بہت سازشی بھی ہو سکتا ہے" (Ibid)۔

پنجاب کے نئے چیف سیکرٹری اختر حسین نے چارج سنبھالنے کے بعد اپنی پہلی پندرہ روزہ رپورٹ میں لکھا کہ، "فرقہ وارانہ کشیدگی مزید بڑھ گئی ہے لیکن اس کی وجہ پنجاب کے باہر ہونے والے واقعات ہے۔ بالخصوص ہندو کافی جارحانہ موڈ

میں تھے کیونکہ گڑبڑ زیادہ تر ان علاقوں میں ہوئی تھی جہاں ہندو اکثریت میں تھے (روہتک کا علاقہ)۔ ہندو دیہاتیوں نے آتشیں اسلحہ استعمال کرکے کچھ مسلمانوں کو قتل بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ بعض مسلمانوں کو جبری ہندو بنانے کی بھی اطلاعات موصول ہوئیں۔ گڑھ مکتیشور کے علاقے کی خبریں ملنے پر فسادات تمام علاقوں میں پھیل گئے۔ البتہ پنجاب سیفٹی آرڈیننس کے نفاذ سے کافی مثبت اثرات مرتب ہوئے کیونکہ اس کے تحت جلوس نکالنے اور اسلحہ لے کر چلنے پر پابندی لگادی گئی تھی۔ روہتک میں فرقہ وارانہ بدامنی برقرار رہی۔ اس کے علاوہ محرم کا مہینہ کسی بڑے ناخوشگوار واقعے کے بغیر بخیریت گزر گیا صرف ایک جگہ پر مسلمان فرقوں کے مابین محرم کا تعزیہ گزارنے پر تنازعہ پیدا ہوا جس کی وجہ سے جلوس پر پابندی لگادی گئی۔ چیف سیکرٹری نے لکھا: ''محرم کے پر امن گزرنے میں امن کمیٹیوں کا بڑا ہاتھ ہے اور کئی مقامات پر ہندوؤں نے محرم کے جلوسوں کی میزبانی بھی کی'' (L/P&J/5/249.)۔

چیف سیکرٹری نے بتایا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں غیر مسلموں کے خلاف فسادات کے بعد کچھ خوفزدہ ہندو خاندان نقل مکانی کرکے پنجاب آئے ہیں (Ibid)۔ دوسری طرف آر ایس ایس نے پنجاب کے کئی علاقوں میں اپنی متاثر کن موجودگی ظاہر کی ہے کیونکہ آر ایس ایس کے سربراہ نے صوبے کا دورہ کیا ہے۔ انٹیلی جنس ایجنسیوں کی ایک مفصل رپورٹ 'آر ایس ایس پنجاب میں' نام کے کتابچے میں دی گئی ہے جو پنجاب حکومت نے 1948 میں شائع کیا۔ اس میں لکھا تھا کہ:

> نومبر 1946 میں آر ایس ایس کے سربراہ مادھوراؤ گولوالکر کے دورہ پنجاب کے موقع پر تنظیم نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ مادھوراؤ نے ملتان، منٹگمری، راولپنڈی، جہلم، دھرم شالہ، امرتسر، ہوشیارپور، جگراں، لائل پور، شیخوپورہ، سیالکوٹ اور لاہور کے دورے کیے۔ ان مقامات پر اندازاً 25 ہزار رضاکاروں نے مادھوراؤ کا استقبال کیا جبکہ آر ایس ایس کی پریڈ دیکھنے کے لیے 40 ہزار افراد کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ ان مہمانوں میں ہندو اور سکھ دونوں شامل تھے۔ کچھ مقامات پر جہاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں نے دفعہ 144 نافذ کر رکھی تھی وہاں آر ایس ایس نے خفیہ اجلاس کیے۔ کانگریس کو بنگال اور دیگر شہروں میں ہندوؤں سے بدسلوکی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا اور اس بات کا عزم کیا گیا کہ اگر ہندو اپنی بقا چاہتے ہیں تو انہیں بے رحمی کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنا ہوگا (6-5 :1948)۔

پنجاب میں آر ایس ایس کی ماضی کی سرگرمیوں کا حوالہ دیتے ہوئے اس رپورٹ میں یہ دلچسپ فقرہ کہا گیا ہے: ''یہ تحریک حکومت مخالف نہیں اور اس کے کارکنوں نے کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک میں 1942 میں حصہ نہیں لیا'' (Ibid:5)۔

14 دسمبر کی پندرہ روزہ رپورٹ میں گورنر جینکنز نے دہلی میں پنجاب کے عوام کے مستقبل پر سیاستدانوں میں مسلسل کھینچا تانی کے اثرات واضح کیے ہیں۔ انہوں نے ایک بیوروکریٹ کے طور پر معمول سے ہٹ کر یہ محسوسات بیان کیے، ''عام آدمی چاہے وہ مسلمان ہے، سکھ ہے یا ہندو ہے وہ مستقبل کے بارے میں تشویش کا شکار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وسیع پیمانے پر خونریزی کے بغیر تصفیہ نہیں ہوگا۔ اس خون خرابے میں سیاستدانوں کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ عام آدمی کے لیے یہ تباہ کن ہوگا'' (Carter, 2006: 307)۔

گورنر نے راولپنڈی ڈویژن کے اضلاع، کیمبل پور اور میانوالی کا دورہ کیا جہاں سے انگریز فوج کے لیے بھرتی کا زیادہ حصہ ملتا تھا۔ صرف راولپنڈی ڈویژن سے فوج میں 70ہزار افراد بھرتی ہوئے جبکہ باقی ماندہ تمام اضلاع سے ملا کر 40ہزار فوجی بھرتی ہوئے۔ ان علاقوں میں انگریزوں کے لیے حمایت اب بھی کافی مستحکم تھی اور یہ لوگ چاہتے تھے کہ انگریز ہندوستان سے واپس نہ جائیں۔ وہ لکھتے ہیں ''یہ محسوسات بڑھ رہے ہیں کہ ہندوستان شورش کی طرف بڑھ رہا ہے اور انگریزوں کو اس کے تدارک کے لیے لازماً کچھ کرنا چاہیے'' (Ibid: 308)۔

30دسمبر کی رپورٹ میں جینکنز نے لکھا کہ کانگریس کی قریبی اتحادی مسلم جماعت مجلس احرار کے ارکان نے لاہور میں اپنے اجلاس کے دوران اپنے مستقبل پر تبادلہ خیال کیا اور انٹیلی جنس رپورٹوں کے مطابق وہ بہت بے اطمینانی محسوس کر رہے ہیں۔ گورنر نے لکھا کہ:

قوم پرست مسلمان اس بات کے قائل ہیں کہ بہار کے فسادات حکومت بہار کی طرف سے پہلے سے طے شدہ تھے اور جے پرکاش نارائن اس منصوبہ بندی کے کرتادھرتاؤں میں سے ایک تھا۔ ان کا مسلم لیگ میں شمولیت کا کوئی ارادہ نہیں، تاہم احرار یہ نہیں سمجھتے کہ وہ کانگریس کے ساتھ لمبا عرصہ چل سکتے ہیں(Ibid: 310)۔

جہاں تک پنجاب مسلم لیگ کا تعلق ہے تو جینکنز نے لکھا کہ نواب ممدوٹ کی قیادت کو ان کے حریفوں شوکت حیات خان اور فیروز خان نون نے چیلنج کر دیا ہے۔ وہ انہیں قیادت سے ہٹانے کے درپے ہیں لیکن انہیں کامیابی اس لیے نہیں ملی کیونکہ یونینسٹ پارٹی کے ضلعی عہدیدار نواب ممدوٹ کے ساتھ ہیں (Ibid)۔ گوردوارہ انتخابات میں اکالیوں کو بھاری اکثریت ملی ہے اور اس وقت کرتار سنگھ اور ناگوک گروپ میں کشمکش عروج پر ہے(Ibid)۔ شاہ پور (راولپنڈی ڈویژن) کے دورے میں جو کہ خضر حیات کے قبیلے ٹوانہ کا مضبوط گڑھ تھا جینکنز نے کئی افراد سے بات چیت کی اور سابق فوجیوں کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب بھی کیا۔ اس کے بعد گورنر نے لکھا کہ:

''یہ لوگ مرکز میں ہندوؤں کا غلبہ برداشت نہیں کریں گے لیکن وہ اپنے دل میں پاکستان بنانے کا بھی کوئی خاص جذبہ نہیں رکھتے نہ ہی وہ برطانوی اقتدار کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ مجھ سے بار بار پوچھا گیا کہ آپ (انگریز) آخر ہندوستان کیوں چھوڑنا چاہتے ہیں اور کیا وجہ ہے کہ آپ اقتدار چھوڑ رہے ہیں'' (Ibid: 311)۔ گورنر نے نوٹ کیا کہ راولپنڈی ہمیشہ سے ایک خطرناک علاقہ رہا ہے اور 1926 میں یہاں کافی فرقہ وارانہ خون خرابہ ہوا تھا اور جتنا مجھے علم ہے تو ان ہنگاموں میں بڑی تعداد میں دیہاتی مسلمانوں نے بھی حصہ لیا تھا(Ibid: 311)۔

چیف سیکرٹری اختر حسین نے اپنی 30دسمبر کی رپورٹ میں لکھا کہ نیشنل گارڈز اور آر ایس ایس کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ نیشنل گارڈز کی تعداد جو 1945 میں 15ہزار تھی وہ 1946 کے آخر تک بڑھ کر 46ہزار ہو چکی ہے (L/P&J/5/249)۔

ضلع ہزارہ میں ہندوؤں اور سکھوں کا قتل عام

14 جنوری 1947 کی گورنر کی رپورٹ میں پنجاب کی سرحد کے ساتھ متصل صوبہ سرحد کے علاقے ہزارہ میں فسادات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں زیادہ تر سکھ اور کچھ ہندو خاندانوں کو فرار ہو کر پنجاب میں پناہ لینا پڑی۔ شروع میں وزیراعظم خضر حیات ٹوانہ نے ان پناہ گزینوں کی کوئی ذمہ داری لینے سے پہلو تہی کی۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت نے اگر ایسا کیا تو ان پر الزام آئے گا کہ وہ صوبہ سرحد کے ہندوؤں کی تو مدد کر رہے ہیں لیکن انہیں بہاری مسلمان یاد نہیں جنہوں نے بہار میں خونیں فسادات کے بعد پنجاب میں پناہ لینے کی درخواست کی تھی تاہم گورنر نے ان پر زور دیا کہ وہ افراد جو بے سروسامان ہیں اور پیدل چل کر آئے ہیں اور ان کا کوئی سہارا بھی نہیں ہے، انہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ خضر حیات پناہ گزین کیمپ قائم کرنے پر رضامند ہو گئے (Ibid: 321)۔

جہاں تک وزیراعظم پنجاب خضر حیات کی شخصیت کا تعلق ہے تو گورنر جینکنز نے اس بات پر مایوسی کا اظہار کیا کہ جب سے (اپریل 1946) میں گورنر بنا ہوں، وزیراعظم نے کسی جلسہ عام سے خطاب نہیں کیا۔ ان کی اس سستی سے اتحادی حکومت کمزوری کا شکار ہوئی ہے۔ دوسری طرف خضر حیات نے گورنر کو انگریزوں کی رخصتی کے بعد کے پنجاب کی ہولناک منظر کشی کی۔ جینکنز نے وزیراعظم کے خیالات کو ان الفاظ میں بیان کیا:

> انہوں نے مجھے چند روز قبل کہا کہ ان کے خیال میں مرکزی (مخلوط) حکومت نااہل ہے اور ملک کا انتظام چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور یہ کہ انگریز افسروں کی کمانڈ کے بغیر ہندوستانی فوج جلد ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گی۔ انہوں نے پنجاب کو خودمختار ریاست بنانے کا ایک مبہم سا خیال بھی پیش کیا اور کہا کہ ایسا کیا جاسکتا ہے (Ibid: 323-4)۔

امر سنگھ اور مدن لال سنگھ

15 مارچ 2004 کو دو سکھوں امر سنگھ اور مدن لال سنگھ نے میرے ساتھ ملاقات میں اپنے خیالات بیان کیے۔ وہ اس وقت دہلی میں مقیم ہیں تاہم بنیادی طور پر ان کا تعلق راولپنڈی سے تھا۔ انہوں نے ہزارہ سے راولپنڈی آنے والوں کی حالت زار سے متعلق اپنی یادداشتیں بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

"ہندو اور سکھ راولپنڈی آئے اور بڑے بالوں کی وجہ سے شمال مغربی سرحدی صوبے میں مسلمانوں کے غیر انسانی رویے کی داستانیں سنائیں۔ کئی ہندو یا سکھ عورتیں بچوں سمیت اغوا کی گئیں اور پھر کبھی بازیاب نہیں ہوئیں۔ کچھ عورتوں سے زیادتی بھی کی گئی۔ کچھ روح فرسا واقعات میں عورتوں کی چھاتیاں کاٹ ڈالی گئیں اور ان کے نازک حصوں کو تیز دھار ہتھیاروں سے زخمی کیا گیا۔ ہم نے متاثرہ افراد کو گوردواروں اور مندروں میں قیام کرایا۔ کچھ افراد کو ہندوؤں کے گھروں میں ٹھہرایا گیا یا وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس چلے گئے۔ وہ سب راولپنڈی میں سکونت پذیر نہ ہوئے بلکہ مشرقی پنجاب کے علاقوں امرتسر، پٹیالہ، کپورتھلہ اور دیگر سکھ ریاستوں کی طرف ہجرت کر گئے۔ جب مارچ 1947 میں مسلمانوں نے حملے شروع کیے تو مزید کئی افراد بھی نقل مکانی کر کے وہاں چلے گئے۔ اگست 1947 میں سکھوں نے جب انتقامی حملوں کا آغاز کیا تو ہزارہ سے نقل مکانی کر کے مشرقی پنجاب جانے والے سکھ سب سے آگے تھے۔"

انٹرویوز

ہشام ساتی، دہلی 23 اکتوبر 2001
عبداللہ ملک، لاہور، 9 دسمبر 2001
عزیز مظہر، لندن (اصل تعلق لاہور سے تھا) 18، 19 مئی 2002
امر سنگھ، دہلی 15 مارچ 2004
مدن لال سنگھ، دہلی 5 مارچ 2004
حکم قریشی، لاہور، 30 اکتوبر 2005
سید احمد سعید کرمانی، لاہور، 31 اکتوبر 2005
چودھری نذیر احمد ورک، شیخوپورہ، 30 دسمبر 2005

References

Allana, G., *Pakistan Movement: Historic Documents*. Lahore: Islamic Book Services, (1977).

Azad, M. A. K., *India Wins Freedom*, Lahore: Vanguard Boos Pvt LTD, (1989).

Gilmartin, David, *'Religious Leadership and the Pakistan Movement in the Punjab' Modern South Asian Studies*, Vol. XIII, No. 3, Cambridge: Cambridge University Press.

Gillmartin, David, *Empire and Islam: Punjab and the Making of Pakistan*. Delhi: Oxford University Press, (1989).

Khosla, G. D., *Stern Reckoning: A Survey of the Events Leading Up To and Following the Partition of India*. New Delhi: Oxford University Press, (1991).

Moore, R. J., *'Jinnah and the Pakistan Demand', Modern Asian Studies*, Vol. XVII, No. 4, pp. 529-561, Cambridge: Cambridge University Press, (1983).

Talbot, I., *Khizr Tiwana: The Punjab Unionist Party and the Partition of India*. Richmond, Surrey: Curzon, (1996).

Tuker, Sir Francis, *While Memory Serves*, London: Cassell and Company Ltd. (1950).

Official Documents

Carter, Lionel, *Punjab Politics 1 January 1944-3 March 1947: Last Years of the Ministries (Governor's Fortnightly Reports and other Key Documents)*. New Delhi: Manohar (2006).

Mansergh, N. and Moon, P., (eds), *The Transfer of Power,1 August 1945-22 April 1946*, Vol. VI, London: Her Majesty's Stationery Office, 1976.

Mansergh, N. and Moon, P., (eds), *The Transfer of Power ,23 March-29 June 1946*, Vol. VII, London: Her Majesty's Stationery Office, (1977).

Mansergh, N. and Moon, P., (eds), *The Transfer of Power , 3 July-1 November 1946*, Vol. XIII, London: Her Majesty's Stationery Office, (1979).

Mansergh, N. and Moon, P., (eds), *The Transfer of Power , 4 November 1946-22 March 1947*, Vol. IX, London: Her Majesty's Stationery Office, (1980).

RSS (Rashtriy Swayam Sewak Sangh) in the Punjab, Lahore: Government Printing Press, (1948).

Microfilm

Fortnightly Reports of Punjab chief secretary for 1946 (which also include reports of the Punjab governor) in the Political Department Miscellaneous (also known as Political and Judicial records) under the designation L/P & J/5/249, London: British Library.

Newspapers

The Pakistan Times, Lahore, 10 March 1947

5

راست اقدام، 24 جنوری - 26 فروری 1947

پنجاب کے وزیر اعظم سر خضر حیات خان ٹوانہ مسلم لیگ کی طرف سے اپنی حکومت کو ملنے والے چیلنج سے سختی کے ساتھ نمٹنے سے گریزاں تھے اور گورنر نے ان کے اس رویے کو غیر فیصلہ کن اور سست قرار دیا تھا۔ البتہ جنوری 1947 میں خضر حیات کی مسلم لیگ کے بارے میں سوچ میں ڈرامائی تبدیلی آئی کیونکہ حکومت کو ایسی اطلاعات ملی تھیں کہ نجی سطح پر قائم کیے گئے مسلح جتھے سیاسی جماعتوں کی ہدایت پر اسلحہ جمع کر رہے تھے۔ دوسری طرف پارلیمانی محاذ پر یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہو سکی تھی کہ مسلم لیگ نے ایوان میں اکثریت حاصل کر لی ہے یا دیگر امیدواروں کو ساتھ ملا کر مخلوط حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہے۔ اسی طرح دسمبر یا جنوری میں مسلم لیگ کی کسی سرگرمی سے یہ اشارہ نہیں ملتا تھا کہ وہ پنجاب حکومت گرانے کے لیے اس راست اقدام پر عمل کرنا چاہتی ہے جس کی دھمکی وہ کئی ماہ سے دے رہی تھی۔ ممکن ہے کہ ہزارہ میں ہونے والے خونریز فسادات کے بعد خضر حیات نے محسوس کیا ہو کہ پنجاب بھی تصادم کی سمت میں بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پیشگی اقدام کرنے کی ٹھان لی (Moon, 1998: 75)۔

24 جنوری کو پنجاب حکومت نے مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور آر ایس ایس پر پابندی کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ پولیس نے نیشنل گارڈز کے مرکزی دفتر کی تلاشی کے لیے چھاپہ مارا۔ مسلم لیگی رہنما دفتر کی چابیاں پولیس کے سپرد کرنے ہی والے تھے کہ اس دوران سینئر لیگی رہنما میاں افتخار الدین آدھمکے اور دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر تلاشی دینے سے انکار کر دیا۔ اسی اثنا میں دیگر رہنما نواب ممدوٹ، ملک سر فیروز خان نون، سید امیر حسین شاہ، بیگم شاہنواز، شوکت حیات خان اور ممتاز دولتانہ بھی آ گئے اور پولیس کے کام میں رکاوٹ ڈالی۔ ان سب کو گرفتار کر لیا گیا (Carter, 2006: 328)۔ نیشنل گارڈز کے ہیڈ کوارٹر کے اندر پولیس نے 100 آہنی ہیلمٹ برآمد کیے۔ جب پنجاب کے سیکرٹری داخلہ نے سول لائنز پولیس سٹیشن کا دورہ کیا اور گرفتار لیگی رہنماؤں سے ملاقات کی تو وہ انتہائی غصے اور تلخی کے عالم میں تھے اور انہوں نے اعلان کیا کہ وہ خضر حیات کو ہر قیمت پر اقتدار سے نکال باہر کریں گے (Ibid)۔

مسلم لیگی قیادت کی گرفتاری سے پورے صوبے میں بڑے پیمانے پر سول نافرمانی کی تحریک پھیل گئی۔ راست اقدام حقیقت بن کر سامنے آ چکا تھا۔ حکومت نے پنجاب کے تمام اخبارات پر مظاہروں کی خبریں شائع کرنے پر پابندی لگا دی۔ دفعہ 144 بھی نافذ کر دی گئی تاکہ مظاہرے روکے جا سکیں تاہم دنوں اور ہفتوں میں صورتحال قابو سے باہر ہو گئی۔ فطری بات تھی کہ صوبائی دارالحکومت لاہور مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا گڑھ بن گیا۔ شہر کے مختلف علاقوں میں مظاہرے اور ہڑتالیں ہونے لگیں۔ اس دوران مسلمان طلبا، جن کی اکثریت اسلامیہ کالج سے تھی نے نیلا گنبد انارکلی میں مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو پولیس نے انہیں دھر لیا۔ (عزیز مظہر اور حکم قریشی سے انٹرویو)۔

عبوری حکومت کے وزیر راجہ غضنفر علی خان نے بھی زیر حراست افراد سے ملاقات کی اور بعد میں تبصرہ کیا کہ جیل میں ماحول پکنک جیسا تھا۔ عبوری حکومت کے ایک اور رکن سردار عبدالرب نشتر نے بیان جاری کیا: "ایسا لگتا ہے پنجاب حکومت نے مسلم لیگ کی تنظیم کو کچلنے کی ایک اور کوشش کی ہے لیکن میں واضح کر دوں کہ اللہ کے فضل سے حکومت ناکام ہو گی۔ ہندوستان کے مسلمان اس جماعت کا سر نیچا نہیں ہونے دیں گے" (Dawn, 26 January 1947)۔ پنجاب مسلم لیگ کے قائم مقام صدر شیخ صادق حسن نے امریکی نیوز ایجنسی ایسوی ایٹڈ پریس کو بتایا کہ مسلم لیگ کی جدوجہد تشدد اور فرقہ واریت سے پاک ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے پارٹی قیادت سے ہدایات موصول ہوئی ہیں کہ جب ضروری ہو تو دفعہ 144 توڑ دیں۔ پولیس کی طرف سے اگر گولیاں بھی چلائی جائیں تو پسپائی اختیار نہیں کرنی (Ibid)۔

دوسری جانب حکومت کو خدشہ تھا کہ اسلحہ ممتاز سیاستدانوں کے ذاتی گھروں میں جمع کیا گیا ہے۔ اسی روز پولیس نے مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے صوبائی سالار سید امیر حسین شاہ کی برڈووڈ روڈ پر رہائشگاہ کا محاصرہ کر لیا اور تلاشی کی کوشش کی۔ اس وقت مسلم لیگ کی ممتاز خواتین لیڈی شفیع، فاطمہ بیگم، لیڈی ذوالفقار علی اور بیگم کمال الدین خاتون خانہ بیگم نسیم امیر حسین شاہ کے ساتھ گھر کے اندر تھیں (Dawn, 26 January)۔ انہوں نے پولیس کو تلاشی دینے سے انکار کر دیا۔ ایک طویل انٹرویو میں بیگم نسیم امیر حسین شاہ اور طالبعلم رہنما راجہ تجمل حسین جو گھر کے باہر کھڑے تھے نے بتایا کہ ان خواتین نے کئی گھنٹے تک مزاحمت کی اور جب صوبائی صدر مسلم لیگ شیخ صادق حسین نے مداخلت کی تو پولیس کو رہائشگاہ کے اندر جانے دیا گیا۔ اسی دوران کچھ اسلحہ کپڑوں میں چھپا کر عقبی دروازے سے نکال دیا گیا۔ پولیس نے تجمل حسین اور دیگر طلبا کو گرفتار کر لیا۔

اسی روز راولپنڈی، جالندھر، لائل پور، فیروز پور، شملہ اور روہتک میں نیشنل گارڈ اور آر ایس ایس کے دفاتر اور تنظیمی عہدیداروں کے گھروں پر بھی چھاپے مارے گئے۔ تاہم کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہ ہوئی۔ امرتسر میں اشتعال انگیز مواد، کچھ چاقو اور وردیاں مسلم لیگ آفس سے برآمد ہوئیں۔ لدھیانہ میں بھی کچھ قابل اعتراض تحریری مواد ملا۔ (Dawn, 26 January) پورے صوبے میں احتجاج اور مظاہرے جاری تھے۔ جالندھر میں کئی مسلمان طلبا کو مظاہروں پر پابندی توڑنے اور لاؤڈ سپیکر کے استعمال پر گرفتار کر لیا گیا۔ (انٹرویو: ملک عبدالاحد)۔ ملتان میں طلبا نے مسلم لیگی لیڈروں کی رہائی کے لیے مظاہرہ کیا اور اس دوران دکانیں بند رہیں۔ اسی طرح فیروز پور میں ہڑتال کی گئی۔ مرکزی عبوری حکومت کے وزیر نوابزادہ لیاقت علی خان نے ایک بیان میں کہا کہ نیشنل گارڈز کو پرائیویٹ آرمی قرار دینا احمقانہ اور اس کا آر ایس ایس سے موازنہ قطعاً غیر منصفانہ ہے (Dawn, January 27، ملک عبداللہ اور خورشید عباس گردیزی سے انٹرویو)۔

کراچی سے محمد علی جناح نے سخت مذمتی بیان جاری کرتے ہوئے لیاقت علی خان کے موقف کی تائید کی۔ انہوں نے خبردار کیا کہ ایسی دست درازی اور بلاجواز کارروائی ہندوستان کے تمام مسلم آبادی والے علاقوں میں ہولناک ثابت ہو گی اور میں وائسرائے سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ فوری طور پر مداخلت کر کے صورتحال کو کنٹرول کریں بصورت دیگر سخت نتائج برآمد ہوں جن کی تمام تر ذمہ داری تاج برطانیہ اور خود وائسرائے پر عائد ہو گی (Dawn, January 28)۔ لازمی بات ہے کہ یہ پیغام پنجاب کے وزیر اعظم تک بھی پہنچا چنانچہ انہوں نے تمام لیگی رہنماؤں کو 26 فروری کو رہا کرنے کا حکم دے دیا تاہم ان سب لیڈروں نے اس وقت تک سنٹرل جیل سے جانے سے انکار کر دیا جب تک کہ دیگر مرد و خواتین رہنماؤں کو رہا نہیں کر دیا جاتا۔ البتہ حکومت

نے مطالبہ ماننے کی بجائے ان رہنماؤں کو زبردستی اٹھا کر جیل سے باہر پھینک دیا۔ نواب ممدوٹ نے کہا کہ مسلم لیگ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گی جب تک حکومت نیشنل گارڈز پر پابندی غیر مشروط طور پر واپس نہیں لے گی۔ اس دوران خواتین نظر بندوں کو بھی رہا کر دیا گیا لیکن انہوں نے بھی احتجاج کیا کہ ان کے ساتھ گرفتار مردوں کو بھی چھوڑا جائے (Ibid)۔ یہ بات واضح نظر آ رہی تھی کہ مسلم لیگ کوئی بڑا مقصد حاصل ہونے تک تحریک ختم کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

حکومت نے ایک بار پھر 27 اور 28 جنوری کی درمیانی رات کو مسلم لیگ کے بڑے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ 28 جنوری کو نیشنل گارڈز پر پابندی اٹھالی گئی۔ البتہ مسلم لیگ کی ایکشن کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ پنجاب کی خود سر حکومت کے خلاف تشدد سے پاک احتجاج جاری رکھا جائے گا (Dawn, 30 January)۔ مزید کئی افراد نے رضاکارانہ گرفتاریاں پیش کیں۔ فیروز خان نون کی آسٹریلوی نژاد اہلیہ کو ایک مظاہرے کی قیادت کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔ پنجاب کے گورنر سر ایون جینکنز نے 28 جنوری کو وائسرائے ویول کے نام ٹیلی گرام میں وضاحت کی کہ صرف نیشنل گارڈ اور آر ایس ایس پر آخر پابندی کیوں لگائی گئی ہے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ:

> کانگریس کے رضاکار پنجاب میں زیادہ منظم شکل میں نہیں ہیں اور ان پر پابندی لگانا بھی زیادہ مناسب نہیں جبکہ آر ایس ایس خالصتاً ہندو فوج ہے۔۔۔ سکھوں کے اکالی جتھے اگرچہ کئی برسوں سے موجود ہیں لیکن ایڈہاک بنیادوں پر قائم ہیں اور زیادہ متحرک نہیں ہیں۔ پابندی لگانے کا مقصد صرف ان دو متحرک نجی فوجوں کو روکنا تھا جو فرقہ وارانہ پہلو سے سرگرم ہیں (Carter, 2006: 331)۔

اس مرحلے پر پنجاب انتظامیہ کے مطابق صرف دو نجی فوجیں اس سطح پر تھیں کہ ان کے خلاف کارروائی فرقہ وارانہ شورش روکنے کے لیے ناگزیر تھی۔ بہر حال مشرقی شہر لدھیانہ میں ہڑتالیں اور مظاہرے جاری رہے اور ایک مظاہرے میں ایک ہزار برقعہ پوش عورتوں نے بھی شرکت کی۔ امرتسر میں انگریز افسر سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس ایس ایف رابنسن اس وقت زخمی ہو گیا جب مسلم لیگ کے 28 جنوری کے جلوس میں ایک شخص نے اسے جھنڈے والا ڈنڈا دے مارا (Carter, 2006: 334; Dawn, 30 January)۔ اس کے نتیجے میں امرتسر میں کئی گرفتاریاں ہوئیں۔ راولپنڈی میں بھی کئی مقامی رہنما پکڑے گئے جبکہ فیروز پور میں 57 مسلم لیگیوں کو حراست میں لیا گیا۔

اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مسلم لیگ خضر وزارت کا خاتمہ کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ 30 جنوری کو کئی ہزار افراد کا مجمع موچی گیٹ پر جمع ہو گیا تاکہ جلوس نکالا جا سکے۔ بیگم شاہنواز لکھتی ہیں کہ اجلاس کے بعد میں اور دیگر رہنما سول سیکر ٹریٹ کی طرف گئے۔ ہمارے ساتھ 10 ہزار سے زائد افراد کا جلوس تھا۔ وہ جلوس کو سیکرٹریٹ کے گیٹ کے اندر لے گئیں اور شرکا سے خطاب کرنے ہی لگی تھیں کہ یورپی پولیس نے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ درمیان میں آ گئیں تاکہ لاٹھی چارج روک سکیں۔ انہوں نے حکام کو یقین دلایا کہ جلوس کے شرکا پر امن رہیں گے۔ بعد ازاں وہ لوگ پر امن منتشر ہو گئے۔ پولیس اس موقع پر تھوڑے فاصلے پر چلی گئی۔ وہ لکھتی ہیں:

میں نے چالیس منٹ تک خطاب کیا اور حکومت، گورنر اور دیگر حکام کو مخاطب ہو کر کہا کہ آؤ اور امت مسلمہ کا انقلاب دیکھو۔ میں نے محسوس کیا کہ مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد تھے اور پاکستان ان کا مقدر بن چکا تھا۔ مسلمان کبھی ہندو اکثریت کی حکمرانی برداشت نہیں کریں گے کیونکہ وہ محروم طبقے کا حصہ بننے کی کوئی خواہش نہیں رکھتے تھے (Shahnawaz, 2002: 196)۔

اس کے بعد سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ساٹھ افراد نے گرفتاری پیش کی اور ان سب کو سول لائن پولیس سٹیشن لے جایا گیا۔ گرفتاریوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور ان میں پنجاب کے پریمیئر کے چچا میجر نواب ممتاز ٹوانہ اور خضر حیات کے مرشد پیر صاحب گولڑہ شریف بھی شامل تھے۔ مسلم لیگ وزیر آباد کا صدر بھی گرفتار ہو گیا۔ پھلوال اور فیروز پور میں بھی گرفتاریاں ہوئیں۔ لوگ مسلسل گرفتاریاں دے رہے تھے۔

29 جنوری کو حکومت نے دہلی سے شائع ہونے والے مسلم لیگ کے ترجمان انگریزی اخبار ڈان کی اشاعت پر پندرہ روز کے لیے پابندی لگا دی۔ 30 جنوری کو پیر صاحب تونسہ شریف خواجہ شجاع الدین کو گرفتار کر لیا گیا۔ بااثر گیلانی پیروں کے خاندان کے کچھ ارکان کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں جذبات ابھارنے والی نظمیں پڑھنے والے شاعر اسحاق لہر کو گرفتار کر لیا گیا۔ جالندھر میں مسلسل آٹھ روز تک ہڑتال جاری رہی۔ گجرات میں جہاں خان بوسال اور نوابزادہ اصغر علی خان کو حراست میں لے لیا گیا وہاں یہ بھی اطلاع ملی کہ ہزاروں دیہاتی عدالتوں میں گرفتاری پیش کرنے کے لیے جا رہے تھے۔ پولیس لاٹھی چارج سے پہلی ہلاکت شملہ میں ہوئی۔ جالندھر میں گرفتار مسلم لیگیوں نے جیل حکام کی بدسلوکی کے خلاف احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دی۔

اس صورتحال میں سب سے ڈرامائی واقعہ مرحوم سکندر حیات خان کی بیٹی زاہدہ حیات کی طرف سے یکم فروری کو گورنر ہاؤس کے گیٹ پر مسلم لیگ کا پرچم لہرانا تھا، وہ 'مردہ باد خضر حکومت' کے نعرے لگا رہی تھیں (Tribune, 3 February)۔ ملتان میں گردیزی پیروں اور گیلانی خاندان کے ارکان کو بھی گرفتار کیا گیا۔ ان گرفتاریوں کیخلاف ایک لاکھ سے زائد مظاہرین نے سڑکوں پر آکر احتجاج کیا۔ نواب محمد خان لغاری اور ڈیرہ غازی خان کے دیگر جاگیرداروں نے عدالتوں میں خود گرفتاریاں پیش کیں۔ اب اس بات میں بہت کم شک وشبہ باقی رہ گیا تھا کہ تحریک صوبے کے طول وعرض میں پھیل رہی تھی اور مسلمان عمائدین جو پہلے احتجاجی سیاست سے لاتعلق تھے اب عدالتوں میں گرفتاریاں پیش کر رہے تھے۔ 2 فروری کو جناح نے کراچی سے ایک بیان میں وائسرائے سے اپیل کی کہ وہ پنجاب میں شہری آزادیاں بحال کرائیں۔ انہوں نے پنجاب کے نوجوان مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ "فرقہ وارانہ تصادم سے گریز کریں اور اپنی تحریک مکمل طور پر پرامن رکھیں" (Dawn, 4 February)۔ اس دور میں مسلم لیگ نے 'شہری آزادیاں بحال کرو' کا نعرہ بلند کیا لیکن چونکہ راست اقدام شروع ہو چکا تھا اس لیے ماورائے آئین اقدامات نئی شکلوں میں اختیار کیے گئے۔ لاہور میں ٹریفک جام کر دی جاتی اور ہندوؤں اور سکھوں کو گاڑیوں پر مسلم لیگی پرچم لہرانے پر مجبور کر جاتا تھا۔ چند غیر مسلم راہگیروں کو بھی ہراساں کیا گیا تاہم مجموعی طور پر تحریک پرامن ہی رہی (Tribune, 5 February)۔

گجرات میں نیشنل گارڈز کے سالار صوبہ سید امیر حسین شاہ کی قیادت میں مظاہرین کے گروہ مقامی مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں گھس کر 'شہری آزادیاں زندہ باد' اور 'خضر حکومت مردہ باد' کے نعرے لگاتے اور کام میں خلل پیدا کرتے۔ اتوار 2 فروری

کو ایک ڈی ایس پی کی سربراہی میں پولیس کی بھاری نفری نے امیر علی شاہ کے گھر پر چھاپہ مار کر انہیں گرفتار کرنا چاہا لیکن ان کے گاؤں معین الدین پور کی سادات برادری کی بڑی تعداد نے مزاحمت کی اور پولیس کو واپس بھجوا دیا۔ پولیس نے اگلے روز پھر چھاپہ مارا تو ہزاروں مردوں اور خواتین نے اس کا راستہ روک لیا تاہم امیر حسین شاہ نے خود کو پولیس کے حوالے کرتے ہوئے اپنے حامیوں سے کہا کہ وہ اپنی جدوجہد پرامن اور غیر فرقہ وارانہ انداز میں جاری رکھیں۔(Dawn, 6 February، معین الدین پور کے بزرگوں سے 5 اپریل 2003 کو انٹرویو)۔

ڈیرہ غازی خان میں بلوچ لیڈر سردار حاجی جمال خان لغاری جنہوں نے نواب اور سر کے خطابات واپس کر دیے تھے نے 60 ہزار قبائلیوں کے ساتھ مظاہرہ کیا۔ اس جلوس میں ایک ہزار افراد بندوقوں اور رائفلوں سے مسلح بھی تھے۔ انہوں نے سول لائنز کے علاقے میں ڈپٹی کمشنر ہاؤس کے سامنے سے مارچ کیا لیکن حکام نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ ایسی اطلاعات بھی ملنا شروع ہو گئی تھیں کہ پولیس میں موجود مسلمان اہلکار خواتین کے خلاف سخت کارروائی کرنے سے انکاری تھے۔ فروری کے پہلے ہفتے تک صوبہ بھر میں 13 ہزار افراد گرفتار کیے جا چکے تھے(Dawn, 7 February)۔ کئی پیر صاحبان بھی تحریک میں شامل ہو گئے۔ پیر صاحب سیال شریف کو 6 فروری کو سرگودھا سے گرفتار کیا گیا۔ مسلمانوں کی اقلیتی آبادی والے اضلاع سے بھی لوگ مسلم لیگ کی تحریک میں شامل ہو گئے تھے اور گرفتاریاں پیش کیں۔ انبالہ اور گڑگاؤں میں مسلم لیگ کے عہدیدار حتیٰ کہ رکن قانون ساز اسمبلی (ایم ایل اے) چودھری مہتاب خان بھی گرفتار کر لیے گئے۔ 6 فروری تک مسلم لیگ کے 79 ایم ایل ایز میں سے 74 جیلوں میں تھے۔ سون پت، جالندھر اور شملہ کی جیلوں میں بھوک ہڑتالیں کی گئیں۔ راست اقدام کا پندرھواں یوم یعنی 7 فروری پورے پنجاب میں 'یوم شہید شملہ' کے طور پر منایا گیا۔ جہاں لاٹھی چارج سے ایک مسلمان ہلاک ہوا تھا۔ 6 فروری میں پنجاب حکومت نے اخبارات کی دس روزہ سنسرشپ کا حکم دیا تاکہ مسلم لیگی تحریک سے متعلق خبروں کی اشاعت روکی جا سکے۔ اس سے پہلے 27 فروری کو سرکاری جرائد کے بعد تمام اخبارات پر پندرہ روز کے لیے پابندی لگائی گئی تھی تاہم نیا حکم نامہ ایک انگریز کی ملکیت اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ سمیت لاہور کی تمام اخبارات کے لیے تھا(Dawn, 9 February)۔

پنجاب سے باہر کے صوبوں سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگ کے تین انتہائی سینئر رہنما خواجہ ناظم الدین، محمد اسماعیل خان اور صدیق بھی 7 فروری کو لاہور پہنچ گئے۔ ان کی آمد سے خضر حکومت کے خلاف تحریک میں مزید ابال آ گیا۔ انہوں نے بادشاہی مسجد میں ایک لاکھ افراد کے اجتماع سے خطاب کیا۔ مسلم لیگ سے اظہار ہمدردی کے طور پر لاہور میں انجمن قصاباں، سبزی مارکیٹ ایسوسی ایشن اور فروٹ منڈی ایسوسی ایشن نے سوموار 10 فروری سے کاروبار معطل کرنے کا اعلان کر دیا۔ (Dawn, 9 February)۔ روزنامہ ڈان کے 10 فروری کے شمارے میں پنجاب کے مختلف علاقوں میں خواتین، قیدیوں اور طلبا پر لاٹھی چارج کی خبریں شائع ہوئیں۔ 8 فروری کو وزیر امور ہندوستان پیتھک لارنس کے نام ایک تار میں گورنر جینکنز نے لکھا کہ لاہور میں ہجوم کا رویہ مزید جارحانہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہندو اور سکھ خوفزدہ ہیں۔ گورنر نے محسوس کیا کہ مسلمان مسلم راج قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے تبصرہ کیا کہ اس تحریک کے نتیجے میں پنجاب کی تقسیم کے سکھوں کے مطالبے میں شدت آ سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اس وقت پنجاب کی سرحدوں کی جو جغرافیائی صورتحال ہے اس میں کسی ایک کمیونٹی کا یہاں اقتدار قائم کرنا قطعی ناممکن ہے۔ طویل المدت متبادل یہ ہو سکتا ہے کہ یونینسٹ اصولوں کے تحت مسلمانوں کا غلبہ ہو یا پھر تقسیم ہو جس سے ناقابل برداشت مسائل پیدا ہوں گے۔ جاری تحریک سے دوسرے آپشن کی صرف غیر مسلموں کے جھکاؤ میں اضافہ ہو گا جبکہ مسلم لیگ اور مسلمانوں کا طویل المدت رد عمل بھی غیر معمولی ہو سکتا ہے۔ مسلم لیگ دراصل متحدہ پنجاب میں مسلمانوں کی قیادت کے امکانات بتدریج کم کر رہی ہے اور اب سکھ الگ صوبے کا مطالبہ مزید شدت سے کریں گے لیکن کسی میں کوئی ایسا دماغ نہیں جو یہ بات سمجھ سکے۔(Carter, 2006: 343)

پنجاب میں صورتحال اب واضح طور پر قابو سے باہر ہو چکی تھی اور پنجاب سیفٹی آرڈیننس (اکتوبر) 1946 کی کھلے عام خلاف ورزی کی جا رہی تھی۔ 10 فروری کو طلبا لاہور کے مال روڈ پر کھڑے ہو گئے اور ہر قسم کی ٹریفک جام کر دی۔ اس روز لاہور ہائیکورٹ کی عمارت سے یونین جیک اتار کر مسلم لیگ کا پرچم لہرا دیا گیا۔ چنانچہ پرنسپل اسلامیہ کالج سول لائنز ڈاکٹر عمر حیات اور کئی طلبا کو گرفتار کر لیا گیا۔ بیڈن روڈ پر ایک گھر سے اینٹ پھینکنے کے نتیجے میں مرنے والے مسلمان طالبعلم عبدالمالک کے جنازے میں ہزاروں تانگہ ڈرائیوروں، طلبا، خواتین اور بچوں نے شرکت کی۔ مرنے والے کی تدفین قبرستان میانی صاحب میں کی گئی۔ مختلف علاقوں میں غائبانہ نماز جنازہ میں دو لاکھ ریکارڈ افراد نے حصہ لیا (انٹرویو)۔ جہلم میں پولیس کے لاٹھی چارج سے ایک مسلمان لڑکے محمد شریف کی ہلاکت کی اطلاعات بھی موصول ہوئیں۔ پنجاب کے دیگر حصوں میں ہڑتال کی گئی۔

10 فروری کو پولیس کانسٹیبل نمبر 1751 ناصر الدین دیگر پچاس ساتھی اہلکاروں سمیت مکمل یونیفارم میں گرفتاری دینے سامنے آ گئے۔ ان میں پانچ پولیس اہلکار نچلی ذات کے ہندو بھی تھے (Dawn,13 February)۔ جھنگ میں بھی ایک مسلمان نوجوان پولیس تشدد سے لگنے والے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا (Ibid)۔ مسلم لیگ پنجاب کے قائم مقام صدر ملک شوکت علی کو بھی 13 فروری کو گرفتار کر لیا گیا۔

سول ملٹری گزٹ (انگریزی اخبار) کے 12 فروری کے اداریے میں کہا گیا:

مسلم لیگ کی تحریک (ایجی ٹیشن)۔۔۔ صوبے کے امن اور پنجاب حکومت کی آئینی سلامتی کے لیے خطرناک ہے اور وہ وقت دور نہیں جب آنسو گیس کے گولوں کی جگہ بندوق کی گولیاں لے لیں گی۔ مظاہرین موجودہ نرم حکومتی پالیسی سے کھیل رہے ہیں جس سے غنڈہ ازم کی راہ ہموار ہو رہی ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان نے خبردار کیا کہ پنجاب میں رونما ہونے والے واقعات پورے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر دہرائے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جدوجہد تشدد سے پاک ہو گی۔ انہوں نے پنجاب میں مسلم لیگ کو حکومت سے باہر رکھنے پر خضر حیات انتظامیہ کی مذمت کی حالانکہ مسلم لیگ اکثریت کی نمائندہ جماعت اور

پنجاب اسمبلی کی سب سے بڑی پارٹی تھی۔ انہوں نے توقع ظاہر کی کہ مسلم لیگ کی تحریک کے نتیجے میں صوبائی حکومت ختم ہو جائے گی(Dawn, 15 February)۔

12 فروری کو پنجاب کے گورنر نے لارڈ ویول کے نام ایک تار میں یہ تجزیہ پیش کیا:

> مسلمانوں کی تحریک کے سامنے ہندو اور سکھ زیادہ دیر کھڑے نہیں رہ سکیں گے۔ ڈاکٹر گوپی چند بھر گاوہ نے ذاتی طور پر وزیر اعظم کو خط لکھ کر کہا ہے کہ اگر حکومت تحریک کو دبا نہیں سکتی تو ہندو خود میدان میں اتر آئیں گے۔ تارا سنگھ نے اخباری بیان میں کہا کہ سکھوں کی زندگی شدید خطرے میں ہے اور انہیں اپنی 'فوج'، میری کمان میں بحال کرنی چاہیے۔ "ہمیں دبایا جارہا ہے۔ لیکن غیر مسلموں کی متحرک مداخلت میں جو میرے نزدیک اب یقینی ہے میں کچھ تاخیر کرنی چاہیے۔ لہری سنگھ نے بھی آج میرے ساتھ ملاقات کر کے کہا کہ ہندو اب زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکیں گے(TOP, Vol.IX: 680)۔

امرتسر میں 13 فروری کو صدر پنجاب کانگریس کمیٹی ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے اعلان کیا کہ: پاکستان کے قیام کا منصوبہ سیاسی، معاشی اور سماجی ہر لحاظ سے ناقابل عمل ہے(Pakistan Times, 15 February)۔ انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ کانگریس نے جواہر لال نہرو کے اس منصوبے پر سنجیدگی سے عمل نہیں کیا جس کے باعث مسلمانوں سے عوامی سطح پر رابطے کیے جاسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلم لیگ کی گود میں جا پڑے ہیں۔ بحیثیت مسلمان میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان متحدہ ہندوستان میں زیادہ فائدے میں رہ سکتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ مسلم لیگ کے اس پراپیگنڈے پر کان نہ دھریں کہ 'اسلام خطرے میں ہے' اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کو اپنے معیارات اور عقیدے میں خالص ہونے کی بنا پر کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا اور ہندوستان کے لوگوں سے تو بالکل کوئی خطرہ نہیں۔ دراصل ہمارے مذہب کے لیے سب سے بڑا خطرہ غاصب اور استعماری چرچل (برطانوی وزیر اعظم) گروپ سے ہے(Ibid)۔

پنجاب میں کشیدگی میں اضافہ جاری رہا۔ 14 فروری کو پولیس نے امرتسر میں ایک لاکھ مظاہرین کے جلوس پر گولی چلا دی۔ اگرچہ کوئی ہلاکت نہیں ہوئی تاہم کافی افراد زخمی ہو گئے۔ مظاہرین سول لائنز کی طرف جانے کی کوشش کر رہے تھے پولیس نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ ہجوم ڈپٹی کمشنر کی عدالت اور جی پی او پر مسلم لیگ کا پرچم لہرانا چاہتا تھا اور مظاہرین نے دفتر میں فائلوں کو نقصان پہنچایا۔ چنانچہ پولیس نے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔

16 فروری کو سکھ پنتھک بورڈور کنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس میں مسلم لیگ کے احتجاجی رویے کو مسترد کر دیا جو ان کے نزدیک سکھ کمیونٹی کے خلاف بھی استعمال ہو سکتا تھا۔ انہوں نے حکومت سے سخت کارروائی کا مطالبہ کیا۔ مسلم لیگ کے قائم مقام صدر رداؤد غزنوی نے تبصرہ کیا: "اگر حکومت مظاہروں اور اجلاسوں پر پابندی ختم کر دے تو مجھے امید ہے کہ تحریک رک جائے گی"(Dawn, 18 February)۔ 17 فروری کو پولیس نے نہ صرف لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کیا بلکہ فائرنگ بھی کی۔ کئی مسلمان زخمی ہو گئے جبکہ ایک ہلاک ہو گیا(Dawn, 19 February)۔ اسی روز مسلم لیگ کے شرپسندوں نے راولپنڈی کے قریب فرنٹیئر میل نذر آتش کرنے کی کوشش کی(Civil & Military Gazette, 18 February)۔ سیالکوٹ اور گوجرانوالہ میں بھی فسادات کی اطلاعات موصول ہوئیں۔

17 فروری کو راجہ غضنفر علی خان اور خواجہ ناظم الدین نے لاہور میں مشترکہ پریس کانفرنس میں مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ اپنی تحریک کے دوران وہ ہتھکنڈے استعمال نہ کریں جن کی لیگی قیادت نے اجازت نہیں دی۔ انہوں نے کہا کہ:

> ایسا لگتا ہے کہ پنجاب کے مخصوص حصوں بالخصوص گجرات، جہلم، راولپنڈی اور سرگودھا کے اضلاع میں لوگوں کی بڑی تعداد نے ٹرینوں کو لیٹ کرنے کی مہم شروع کر دی ہے۔ یہ کام نیشنل گارڈز کے کارکنوں نے کیا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ اس عمل کو مسلم لیگ کی صوبائی قیادت کی تائید حاصل ہے اور یہ صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک کا حصہ ہے۔ ہم واضح کر دیں کہ ٹرینوں کو روک کر لیٹ کرنے کے اقدام کی ابھی تک مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت نے ہرگز منظوری نہیں دی (Dawn, 19 February)۔

اس دوران لاہور میں مسلمانوں کے اخبارات کے ایڈیٹروں فیض احمد فیض (پاکستان ٹائمز)، اختر علی خان (زمیندار)، حمید نظامی (نوائے وقت)، نور الٰہی (احسان) اور عبدالحمید (ایسٹرن ٹائمز) نے ایک احتجاجی بیان میں کہا کہ 28 جنوری سے حکومت نے لاہور کے اخبارات کو ہدایت کی ہے کہ وہ مسلم لیگ کی احتجاجی تحریک سے متعلق صرف ایسا مواد شائع کریں جو حکومت جاری کرے۔ یہ پابندی 16 فروری کو ختم ہونا تھی لیکن 15 فروری کو ایک نیا حکم نامہ جاری کر دیا گیا کہ وہ حکم نامہ جو قبل ازیں دس روز کے لیے موثر تھا اب پورے مہینے کے لیے نافذ العمل ہو گا۔ (Pakistan Times,19 February)۔

برطانوی حکومت کا 20 فروری کو انتقال اقتدار کا اعلان

جب پنجاب میں مسلم لیگ کا راست اقدام عروج پر تھا تو برطانوی حکومت نے 20 فروری کو لندن سے اعلان جاری کر دیا کہ ہندوستان میں اقتدار 1948 کے وسط تک مقامی قیادت کو منتقل کر دیا جائے گا۔ ایک بیان میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ کابینہ مشن پلان کو نئی حکومت کے قیام کی بنیاد استوار کرنے کا موقع نہیں دیا گیا جبکہ آئین ساز اسمبلی بھی کسی فارمولے پر متفق ہونے میں ناکام رہی۔ شاہ معظم کی حکومت یہ بات واضح کرنا چاہتی ہے کہ برطانیہ جون 1948 سے پہلے پہلے ہندوستان میں اقتدار ذمہ دار ہندوستانیوں کے حوالے کر دے گی (Mansergh and Moon, 1980: 774)۔

اس بیان کا ملا جلا ردعمل سامنے آیا۔ مسلم لیگ نے محسوس کیا کہ یہ دراصل پاکستان کی جنگ جیتنے کے مترادف ہے جبکہ کانگریس نے محسوس کیا کہ ایسا بیان مسلم لیگ اور جناح کو زیادہ حقیقت پسند اور لچکدار ہونے پر مجبور کریگا۔ سکھ بالخصوص نہایت مایوسی کا شکار تھے کیونکہ بیان میں سکھوں کے الگ صوبے کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی تھی۔ (Tribune, 4 February) جہاں تک وزیر اعظم خضر حیات ٹوانہ کا تعلق تھا تو انہوں نے غیر یقینی معاملات پر مایوسی کا اظہار کیا، انہوں نے برطانوی حکومت کے بیان کو 'دیوانے کی بڑ' قرار دیا۔ 21 فروری کو انہوں نے بیان کو ایک ایسا خطرہ کہا جسے برطانیہ نے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ البتہ گورنر جینکنز نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اسے حتمی فیصلہ سمجھیں جس پر ہر صورت میں عملدرآمد ہو گا۔

24 فروری کو امرتسر میں تحریک نے پرتشدد شکل اختیار کرلی

سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ قانون شکنی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ امرتسر میں اس کی شدت دیگر علاقوں سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ خواجہ افتخار نے اپنی کتاب 'جب امرتسر جل رہا تھا' میں بتایا کہ مسلمان مظاہرین ایم اے او کالج میں جمع ہو جاتے جہاں پرنسپل دلاور حسین انہیں بھرپور تعاون فراہم کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے جلوس میں رکاوٹ ڈالنے والے انگریز پولیس افسر سے برہمی کا بھی اظہار کیا۔ مظاہرے پر راستے میں پولیس نے لاٹھی چارج کر کے شرکا کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ مظاہرین اور پولیس کے درمیان ایک روز اس وقت کشیدگی بڑھ گئی جب مسلمان خواتین بھی مظاہرے میں شریک تھیں۔ یہ لوگ پاکستان کے حق میں اور انگریز حکومت کے خلاف نعرے لگا رہے تھے کہ انگریز ایس پی پولیس رابنسن کا قہر ان پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے ٹاؤن ہال کی طرف بڑھنے والی خواتین پر اپنی چھڑی چلائی تو ایک نوجوان مسلمان ایاز محمود نے جوش میں آکر اس کا ہاتھ روک دیا۔ اس نے ایک پولیس اہلکار سے لاٹھی چھین کر رابنس کے سر پر دے ماری۔ ایس پی زمین پر گر گیا۔ چوٹ کی وجہ سے وہ امرتسر کے ہسپتال میں ایک ہفتے تک کومے میں رہا۔ اس کی کھوپڑی چٹخ گئی تھی۔ وہ کافی عرصے بعد ٹھیک ہوا۔ ایاز محمود پر اقدام قتل کا مقدمہ چلایا گیا لیکن انہیں 14 اگست کو پاکستان اور بھارت کے درمیان قیدیوں کے تبادلے میں رہائی مل گئی (1991: 73-79)۔

بہر حال احتجاجی تحریک آگے بڑھتی رہی اور ہر گزرتے دن میں اس کا دائرہ کار بھی بڑھ رہا تھا اور انداز بھی جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔ 24 فروری کو تحریک نے سول نافرمانی کا ایک ماہ مکمل کر لیا۔ عام قصبوں اور شہروں میں ہڑتالیں کی گئیں جبکہ امرتسر، جالندھر اور راولپنڈی میں صورتحال زیادہ خراب تھی۔ امرتسر میں اس روز تشدد میں کافی تیزی رہی۔ جینکنز نے 28 فروری 1947 کو اپنی پندرہ روزہ رپورٹ میں لکھا:

> امرتسر میں رونما ہونے والے واقعات زیادہ قابل ذکر ہیں۔ مظاہرین کے ایک بڑے ہجوم نے سول سٹیشن پہنچ کر پولیس پر خوفناک حملے شروع کر دیے۔ ایک سکھ کانسٹیبل جو ایک جگہ ڈیوٹی پر تعینات تھا اور مظاہرین کے خلاف کارروائی میں ملوث نہیں تھا اس کو تشدد کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ کئی پولیس افسروں پر بھی حملے کیے گئے۔ مجموعی طور پر 55 پولیس اہلکار زخمی ہوئے جن میں سے 3 کی حالت تشویشناک ہے جبکہ ایک اہلکار مارا گیا۔ پولیس کو کئی مواقع پر فائرنگ بھی کرنا پڑی۔ مظاہرین میں سے 110 افراد زخمی ہوئے جبکہ ایک شخص مارا گیا اور ریوالور کی گولیاں لگنے سے 11 افراد شدید زخمی ہو گئے۔ جو شخص ہلاک ہوا وہ ایک پولیس افسر کو نیچے گرا کر مارنے کے درپے تھا کہ اس پر فائر کر دیا گیا۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (جو ایک مسلمان ہے) کے سر پر شدید چوٹ آئی۔ ان واقعات کے دوران فوجیوں کی ایک کمپنی پاس موجود تھی لیکن مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اسے کیوں طلب نہیں کیا گیا (Carter, 2006: 365-6)۔

سکھ کانسٹیبل کے بہیمانہ قتل پر سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے قرار دیا کہ مسلم لیگ کی تحریک سیاسی نہیں بلکہ فرقہ وارانہ ہے۔ تین یوم بعد انہوں نے خبردار کیا کہ خانہ جنگی کا خطرہ موجود ہے اور مطالبہ کیا کہ انگریزوں کو پنجاب کا کنٹرول سکھوں کو واپس کر دینا

چاہیے۔ پہلے ہی خفیہ رپورٹوں میں نجی فوجوں کی برق رفتاری سے بھرتی کی اطلاعات دی جارہی تھیں(Talbot, 2004:82)۔ سکھ کانسٹیبل کی ہلاکت پر خواجہ افتخار نے واقعات کا مختلف پہلو بیان کیا ہے۔ انہوں نے اصرار کیا ہے کہ اس روز ہجوم کی تعداد بھی زیادہ تھی اور اس کا موڈ بھی جارحانہ تھا۔ انہوں نے عملاً انتظامیہ کو پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض سرکاری ملازمین کو بھی پکڑ کر مظاہرین نے ان کی پٹائی کر دی۔ اس کے نتیجے میں پولیس اہلکار بوکھلا گئے اور مظاہرین کو دیکھ کر بھاگ گئے۔ ان میں سے بعض نے جھاڑیوں کی آڑ میں چھپ کر پیچھے سے گولیاں چلائیں اور کچھ درختوں پر چڑھ کر فائرنگ کرنے لگے۔ مسلمانوں کے حوصلہ بلند ہو گئے اور انہوں نے برطانوی پرچم نیچے اتار کر مسلم لیگ کا پھریرا لہرا دیا۔ ایک مسلم نوجوان محمد شریف امرتسر جیل کی دیوار پر چڑھ گیا اور وہاں مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے کی کوشش کی لیکن اسے گولی مار دی گئی۔(Iftikhar,1991: 82-83)۔ شریف کی موت سے مظاہرین غضبناک ہو گئے اور انہوں نے "لے کے رہیں گے پاکستان، دینا پڑے گا پاکستان اور پاکستان کا مطلب کیا؟ لاالہ الا اللہ" کے نعرے لگائے۔ خواجہ افتخار لکھتے ہیں کہ ایسی برافروختہ صورتحال میں سکھ کانسٹیبل ہجوم کے ہتھے چڑھ گیا جسے جان سے مار دیا گیا۔

گورنر یا چیف سیکرٹری پنجاب دونوں میں سے کسی نے اپنی رپورٹ میں اس مسلم نوجوان کی ہلاکت کا ذکر نہیں کیا جو امرتسر جیل کی دیوار پر چڑھ گیا تھا۔ البتہ مجھے انٹرویو دینے والے کئی ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں نے جیل کی دیوار پر چڑھنے والے نوجوان کی ہلاکت کا ذکر کیا لیکن کسی بھی نے اس واقعے کا تعلق سکھ کانسٹیبل کی موت سے نہیں جوڑا۔ صرف خواجہ افتخار کی کتاب میں یہ تعلق جوڑا گیا ہے۔ چنانچہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ آیا دونوں ہلاکتیں ایک ہی روز ہوئیں یا کانسٹیبل کی ہلاکت دراصل محمد شریف کی موت کا فوری ردعمل تھا۔ 30 دسمبر 2004 کو میری ملاقات قدیم لاہور کے علاقے رنگ محل کے رہائشی بزرگ علی بخش موچی سے ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ شریف کا تعلق اس کی برادری سے تھا۔ اس نے کہا کہ محمد شریف پہلا مسلمان تھا جس نے پاکستان کے لیے اپنا خون بہایا تاہم اسے اس واقعے کی اصل تاریخ یاد نہیں تھی۔

25 فروری کو مشرقی شہر انبالہ جو اس سے قبل پرامن تھا میں سخت کشیدگی پھیل گئی۔ سینکڑوں مرد و خواتین پر مشتمل ہجوم نے ڈنڈوں اور سوٹوں کے ساتھ پولیس سٹیشن پر دھاوا بول دیا۔ پولیس نے گولی چلادی جس سے کئی افراد زخمی ہو گئے(Ibid)۔ 28 فروری کے پاکستان ٹائمز اخبار نے خبر شائع کی کہ انبالہ میں لاٹھی چارج کے نتیجے میں دو خواتین ہلاک ہو گئیں۔ اسی روز لاہور میں مظاہرین نے چاقوؤں کا آزادانہ استعمال کیا۔ ایک شخص نے ایس پی پولیس کو چھرا گھونپنے کی کوشش کی جو کانسٹیبل نے ناکام بنادی۔ اسی روز خواتین، بچوں اور نوجوانوں کے ہجوم نے سیکرٹریٹ پر دھاوا بول دیا۔ احتجاجی تحریک میں شامل افراد میں مزنگ لاہور کے میاں محمد سلیم اور عارف کھوکھر بھی تھے(انٹرویوز)۔

احتجاجی تحریک ختم کرنے کی کوششیں

پنجاب کے طول و عرض میں پھیلے راست اقدام سے قطع نظر خضر حیات ٹوانہ اور مسلم لیگی رہنماؤں کے درمیان رابطوں کا سلسلہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا۔ مسلم لیگ کے نئے کرتا دھرتا ـــ ملک سر فیروز خان نون، سردار شوکت حیات، بیگم جہاں آرا شاہنواز اور دیگر ـــ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے یونینسٹ پارٹی کے روح رواں تھے اور ذاتی سطح پر مسلمان زمینداروں کے آپس میں

کافی دوستانہ روابط تھے۔ تاہم سیاسی ڈیڈلاک واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ اس کے حل کے لیے بنگالی مسلم لیگی رہنما خواجہ ناظم الدین جن کے وزیر اعظم خضر حیات سے قریبی تعلقات تھے کی خدمات طلب کی گئیں۔ البتہ خواجہ ناظم الدین سے ملاقات وزیر اعظم نے نہیں بلکہ گورنر نے 18 اور 19 فروری کو کی۔ انہوں نے مختلف امکانات پر تفصیلی تبادلہ خیال کیا۔ گورنر نے 28 فروری کی اپنی رپورٹ میں لکھا کہ: "ابتدائی بات چیت کے دوران تو خواجہ ناظم الدین نے اعتراف کیا کہ انہیں معلوم نہیں کہ پاکستان بنانے کا مقصد کیا ہے۔ حتیٰ کہ مسلم لیگ میں بھی کسی کو پتہ نہیں۔ لہٰذا مسلم لیگ کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ اقلیتوں کے ساتھ دیرپا مذاکرات کر سکے (Carter, 2006: 366-7)۔ البتہ دونوں رہنماؤں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ پبلک سیفٹی آرڈیننس کی جگہ دوسرا کوئی قانون لا کر معاملے کا تصفیہ نکالا جا سکتا ہے اور جلسوں پر پابندی ختم ہونی چاہیے (Ibid: 367)۔ تاہم وزیر اعظم یہ ماننے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے اور اس لیے مذاکرات بے نتیجہ ختم ہو گئے۔"

اسی اثنا میں پولیس کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل جینکن (گورنر کا نام جینکنز جبکہ پولیس افسر کا نام صرف جینکن تھا) کو فیروز خان نون کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں انہیں مطلع کیا گیا کہ ممدوٹ اور فیروز نون مسلم لیگ کی طرف سے تصفیہ کرانے کی پوزیشن میں ہیں۔ وزیر اعظم کی طرف سے اختیار ملنے پر ڈی آئی جی جینکنز نے قصور سب جیل میں ممدوٹ اور نون سے ملاقات کی۔ اگرچہ ان کی بات چیت کا لہجہ مناسب تھا لیکن وہ چاہتے تھے کہ ممتاز دولتانہ بھی وہاں موجود ہوں۔ چنانچہ دولتانہ کو بھی لاہور بلایا گیا جہاں ان سب کی ملاقات ہوئی۔ دولتانہ نے نسبتاً سخت موقف اپناتے ہوئے مطالبہ کیا کہ پوری پنجاب مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بلایا جائے۔ یہاں تک کہ قصور سب جیل میں اس کا بھی بندوبست کر دیا گیا جہاں 20 فروری کو پوری کونسل کا اجلاس ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ مولانا داؤد غزنوی جو گرفتار نہیں تھے کو ہدایات لینے کے لیے محمد علی جناح کے پاس بھیجا جائے (Pakistan Times, 25 February)۔

ایک عوامی بیان میں جناح نے 24 فروری کو پنجاب کے مسئلے کا ایک حل تجویز کیا۔ انہوں نے پنجاب مسلم لیگ کے اس مطالبے کی حمایت کی کہ جلسوں اور عوامی جلوسوں پر پابندی ختم کی جائے اور امن عامہ آرڈیننس کو باقاعدہ قانون سازی کے لیے پنجاب اسمبلی کے سامنے رکھا جائے اور تمام گرفتار زیر حراست اور سزا یافتہ سیاسی کارکنوں کو فوراً رہا کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ مسلم لیگ جلوسوں پر فوری پابندی ختم کرنے پر زور نہیں دے رہی لیکن اعلان کیا کہ صورتحال معمول پر لانے کے لیے دیگر تین نکات پر عملدرآمد ضروری ہے (Pakistan Times, 26 February)۔ جناح نے وہی شرائط پیش کیں جو قبل ازیں گورنر جینکنز اور ناظم الدین میں زیر بحث آچکی تھیں۔

احتجاجی تحریک 26 فروری کو ختم کر دی گئی

بہر حال ان رابطوں کے نتیجے میں معاملہ 25 فروری کی شب تک طے پا گیا تاہم اس کا اعلان بوجوہ اگلے روز 26 فروری کو کیا گیا۔ چنانچہ احتجاجی تحریک فوراً ختم کر دی گئی۔ اس کے ساتھ وزیر اعظم خضر حیات ٹوانہ کی طرف سے ایک بیان جاری کیا گیا کہ "ان کی حکومت سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی بلکہ ایسی سرگرمیوں کے نتیجے میں فرقہ واریت پھیلنے کا تدارک کرنا چاہتی تھی۔ پنجاب پبلک سیفٹی آرڈیننس اس لیے نافذ کیا گیا تاکہ کلکتہ، مشرقی بنگال، بہار، یوپی اور روہتک کے علاقوں

میں رونما ہونے والے واقعات کا پنجاب میں اعادہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت کی طرف سے جون 1948 تک اقتدار ہندوستان کی قیادت کے سپرد کرنے کے 20 فروری کے اعلان سے ایک نئی صورتحال پیدا ہوئی جو اس بات کی متقاضی تھی کہ تمام قیادت سر جوڑ کر بیٹھے اور فیصلہ کرے کہ پنجاب کا مستقبل کیا ہونا چاہیے" (Pakistan Times, 27 February)۔

یوں احتجاجی تحریک 24 جنوری سے 26 فروری تک 34 روز جاری رہی۔ حکومت نے 27 فروری سے مسلم لیگی رہنماؤں کو رہا کرنا شروع کر دیا تاہم منتشر ہونے کی بجائے انہوں نے عوامی جلسے سے اسی روز قصور میں خطاب کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ جلسہ مسلم لیگی رہنماؤں اور ان کے عزائم کے لیے بڑھتی مسلمانوں کی حمایت کا واضح ثبوت تھا۔ وہاں اعلان کیا گیا کہ 2 مارچ کو پورے پنجاب میں مسلم لیگ کا یوم فتح منایا جائے گا۔ 28 فروری کو میاں افتخار الدین نے امرتسر میں بڑے جلسے سے خطاب کیا اور مطالبہ کیا کہ خضر حیات استعفیٰ دیں اور نئے انتخابات کرائے جائیں۔ دیگر لیگی رہنما بھی اس مطالبے میں ان کے ہمنوا بن گئے۔

وزیراعظم خضر حیات ٹوانہ مستعفی ہو گئے

مسلم لیگ کی احتجاجی تحریک نے پنجاب کے وزیراعظم کے صبر اور اعصاب سے بھاری قیمت وصول کی۔ کچھ ہی دنوں بعد 2 مارچ کی نصف شب کو انہوں نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا جس پر گورنر نے مسلم لیگی رہنما نواب افتخار حسین ممدوٹ کو ایوان میں اکثریت ثابت کر کے حکومت سازی کی دعوت دی۔ افتخار ممدوٹ نے کانگریس کے ارکان اور سکھ نمائندوں سے تعاون کے لیے مذاکرات شروع کیے لیکن ان کے اندیشے دور کرنے میں ناکام رہے بلکہ انہوں نے عزم کیا کہ مسلم لیگ کو اقتدار میں نہیں آنے دیا جائے گا۔ 26 فروری کو نیویارک ٹائمز کے نمائندے کو امرتسر میں انٹرویو میں سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے بلاجھجک جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ سکھ اپنی نجی فوج منظم کر رہے تھے اور کہا:

> مجھے نہیں لگتا کہ ہم خانہ جنگی سے بچ سکتے ہیں۔ اگر مسلمان پنجاب میں اپنا اقتدار چاہتے ہیں تو پھر کوئی تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ ہم کسی بھی حالات میں مسلمانوں پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ سکھوں کے پاس مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے نکال باہر کرنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن ہم صرف مشرقی پنجاب تک محدود کیوں رہیں؟ ہم انہیں پورے پنجاب سے نکال دیں گے (Pakistan Times, 2 March)۔

مسلم لیگ کے راست اقدام کے مقاصد

27 فروری کے اداریے میں پاکستان ٹائمز لاہور نے مسلم لیگ اور حکومت کے درمیان تصفیے کو عام آدمی کی شہری آزادیوں کی فتح قرار دیا۔ دوسری طرف کانگریس نواز ہندو اخبار 'ملاپ' نے اس سیاسی تحریک کو غنڈوں کی تحریک قرار دیا جو اپنی اشتعال انگیزی کے باوجود سکھوں اور ہندوؤں کی حمایت حاصل نہیں کر سکی (Pakistan Times, 1 March)۔

گورنر کی کسی رپورٹ یا مسلم لیگ کے ذرائع سے پتہ نہیں چلتا کہ تحریک کے دوران کس قسم کے نعرے لگائے گئے۔ اس دور میں لاہور میں موجود سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ انٹرویو کے دوران انہوں نے یاد کر کے یہ نعرے بتائے:

پاکستان کا نعرہ کیا؟ لا الہ الا اللہ
جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ کبھی کبھار پاکستان کا مطلب کیا کا نعرہ بھی لگتا تھا۔
سینے پر گولی کھائیں گے، پاکستان بنائیں گے
لے کے رہیں گے پاکستان، جیسے لیا تھا ہندوستان
خون سے لیں گے پاکستان
مریں گے، مر جائیں گے پر پاکستان بنائیں گے

پنجاب کے مخصوص اکھڑ لہجے میں وزیر اعظم پنجاب کے خلاف بھی جارحانہ نعرے لگائے گئے۔

خضر دلا ہائے ہائے
خضر کنجر ہائے ہائے
خضر کتا اپنی ماں نال ستا

کرنل (ر) نادر علی کے مطابق گجرات میں جو نعرے لگائے گئے وہ اس سے بھی زیادہ تضحیک آمیز تھے۔

چلو بھائی چلو، اک چیز ملے گی
کیا بھائی کیا؟
خضر کی بیٹی۔۔۔ واہ بھائی واہ

مسلمان خواتین جن کی اکثریت برقع پوشوں کی تھی نے بھی مظاہروں میں حصہ لیا۔ ایک موقع پر لیڈی شفیع اور دیگر خواتین وزیر اعظم کی رہائشگاہ پر پہنچ گئیں اور اس کی موت کا سیاپا ڈالا۔ جب خضر حیات نے 2 کو استعفیٰ دیا تو مسلم لیگ کی احتجاجی تحریک کا رخ ڈرامائی طور پر تبدیل ہو گیا۔ اب یہ نعرے لگنے لگے "تازہ خبر آئی اے، خضر ساڈا بھائی اے"۔
انٹرویو دینے والے مسلمانوں کے ذہن میں اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ مسلم لیگ کو اقتدار میں دیکھنا چاہتے تھے۔ عام طور پر ذہنوں میں یہ بات پائی جاتی تھی کہ پاکستان بننے سے وہ جادوئی لمحہ آئے گا جب ذات برادری کی لعنت اور اقتصادی استحصال سے نجات ملے گی اور اسلامی انصاف اور یکجہتی کا دور دورہ ہو گا (انٹرویو: میاں محمد سلیم، عارف کھوکھر، اسلم شاہد، عزیز

مظہر، حکم قریشی، سید احمد سعید کرمانی)۔ دوسری طرف ہندو اور سکھ مسلم لیگ کی تحریک کو دہشت کے ایسے دور کا ابتدائیہ قرار دیتے ہیں جہاں مسلم لیگ کے اقتدار میں پاکستان میں انتہا پسندوں کو ان (اقلیتوں) کے خلاف کھلی چھوٹ دی جائے گی (انٹرویو: اجمیر سنگھ، ہربنس کمار اروڑہ بیش دیوکپور، گوپی ناتھ شرما)۔ ایس جی پی سی کی رپورٹ میں مصنف سردار گوربچن سنگھ طالب لکھتے ہیں کہ: "یہ سب نعرے جیسا کہ سکھ رہنماؤں نے بجا طور پر نشاندہی کی ہے دراصل ہندو اور سکھ اقلیتوں کے خلاف تھے۔ جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قیام کے مخالف تھے" (Talib,1950: 19, 59-60)۔

کھوسلہ نے اپنی رپورٹ میں تبصرہ کیا: "تحریک بنیادی طور پر تو خضر وزارت کے خلاف تھی لیکن چونکہ کانگریس اور اکالی جماعتیں ان کی اتحادی تھیں اس لیے تحریک نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا" (1989:96)۔ انہوں نے بھی اوپر درج کیے گئے اشتعال انگیز نعروں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ انتظامیہ کا مظاہرین کے خلاف رویہ لچکدار تھا۔ ان میں سے کئی افراد کو گرفتار کر کے لاہور سے باہر جا کر چھوڑ دیا جاتا۔ سکھ کانسٹیبل کی موت کے بعد ماسٹر تارا سنگھ نے اس تحریک کو سیاسی کی بجائے مذہبی قرار دیا اور پنجاب میں خانہ جنگی چھڑنے کی تنبیہ کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ پنجاب واپس سکھوں کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ انگریزوں نے پنجاب سکھوں سے ہی چھینا تھا (Talbot, 2004: 82)۔ انہوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں راست اقدام کی دھمکی بھی دی (Carter, 2006: 350)۔

پنجابی عیسائی ایف ای چودھری جو پاکستان ٹائمز کے سینئر فوٹو گرافر تھے نے مسلم لیگ کی احتجاجی تحریک کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے:

"پاکستان ٹائمز کا پہلا شمارہ 5 فروری 1947 کو شائع ہوا لیکن ہم نے مسلم لیگ کی تحریک سے متعلق تصاویر 24 جنوری سے ہی لینا شروع کر دی تھیں۔ جب پولیس نے لکشمی چوک پر مسلم لیگ کے دفتر میں گھسنے کی کوشش کی تو میاں افتخار الدین نے ان کا راستہ روکا۔ اس کے نتیجے میں سخت الفاظ کا تبادلہ ہوا اور میاں افتخار الدین نے ایس ایس پی کو تھپڑ رسید کر دیا۔ میں نے اس واقعے کی تصویر کھینچ لی جو گزٹ کے 5 فروری کے شمارے میں شائع ہوئی۔ احتجاجی تحریک عمومی طور پر پر امن ہی رہی۔ ہر گزرتے روز کے ساتھ مظاہرین کی تعداد بڑھتی گئی اور یہ بات واضح ہوتی جا رہی تھی کہ پاکستان کا قیام امکانات بن کر سامنے آ رہا تھا۔ پنجاب اسمبلی کے سپیکر ایس پی سنگھا نے مسلم لیگ اور کانگریس سکھ سیاستدانوں کے درمیان ثالثی کرانے کی بھرپور کوشش کی لیکن جب 3 مارچ کے بعد تارا سنگھ نے کرپان لہرائی تو صورتحال قابو سے باہر ہو گئی۔ اس وقت شاید ہی کسی کو اندازہ تھا کہ آخر میں کتنے زیادہ لوگ زندگی سے ہاتھ دھو دیں گے۔ زخمی ہوں گے یا بے گھر ہو جائیں گے۔ ان دنوں ایک انگریز سی آئی ڈی افسر مسٹر سیویج تھا جس نے مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں کو ایک دوسرے پر حملوں کی شہ دی۔"

احتجاجی تحریک پر گورنر کا نکتہ نظر

15 فروری 1947 کی پندرہ روزہ رپورٹ میں گورنر جینکنز نے مسلم لیگ کے راست اقدام (Direct Action) کا گہرائی سے تجزیہ اور جائزہ پیش کیا۔ کچھ نکات میں بعض مشاہدات کا اعادہ بھی کیا گیا۔ 1941 کی پنجاب کی

مردم شماری کی مدد سے انہوں نے ایک سادہ سا جدول بنایا جس میں پنجاب کی پانچ ڈویژنوں میں شورش کی تفصیل بتائی گئی۔

پنجاب کی آبادی ملین میں: مردم شماری 1941		
ڈویژن	مسلمان	دیگر
راولپنڈی + ملتان	90لاکھ	20لاکھ
لاہور	40لاکھ	30لاکھ
جالندھر + انبالہ	30لاکھ	70لاکھ
کل تعداد	ایک کروڑ60لاکھ	ایک کروڑ20لاکھ

اس کے بعد گورنر نے لکھا:

اس تعداد کو مد نظر رکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ پنجاب میں موجودہ سرحدوں کے ساتھ کوئی ایک کمیونٹی کسی اور کو فتح کیے بغیر حکومت نہیں کر سکتی۔ پرامن متبادل یہ ہو سکتے ہیں کہ یا تو پنجاب متحدہ رہے اور مسلمان، ہندو اور سکھ مل کر حکومت کریں، بصورت دیگر صوبے کو دو یا پھر تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔۔۔ مسلم لیگ اب تک کے جائزے کے مطابق پورے پنجاب پر مسلمانوں کا غیر منقسم اقتدار چاہتی ہے لیکن ایسا دیگر مذاہب کے ساتھ اتفاق رائے کے بغیر ممکن نہیں اور مجھے شبہ ہے کہ کیا ایسا بزور قوت ہو گا؟ مسلم لیگ کے ارکان عوامی سطح کی نسبت اپنی نجی مجلسوں میں گفتگو کے دوران زیادہ کھل کر بات کرتے ہیں اور ان میں سے بعض مسلم لیگ کی باضابطہ پالیسی (یعنی پنجاب کو متحد رکھ کر مسلمانوں کی حکومت لانا) کے حوالے سے مشکلات کو محسوس کرتے ہیں تاہم یہ حقائق اپنی جگہ پر برقرار ہیں کہ 1946 کے انتخابات پاکستان کے مطالبے کے نعرے کی بنیاد پر لڑے گئے اور اس وقت سے اب تک ہندوؤں اور سکھوں کی تشفی کے لیے ایک بھی لفظ نہیں بولا گیا۔ حتیٰ کہ انتہائی لبرل مسلم لیگی رہنماؤں کے نزدیک بھی مسلمانوں کا پنجاب میں غیر منقسم اقتدار ہونا چاہیے جہاں اقلیتوں سے حسن سلوک کیا جائے گا(Carter, 2006: 345)۔

انتخابات کے بعد مسلم لیگ کے اقتدار میں آنے میں ناکامی کی سب سے بڑی وجہ اس کی مذہبی پہلوؤں پر عدم مفاہمت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مقامی کانگریس نیشنلسٹ مسلمان رکن کو کابینہ میں شامل کرنے کے معاملے پر مسلم لیگ سے راہیں جدا کرے گی (جیسا کہ مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں کانگریس کا نامزد نیشنلسٹ پارٹی کا رکن وزیر بنانے کی مخالفت کی تھی)(Carter, 2006: 345)۔

دوسری طرف جینکنز کی رائے یہ تھی کہ مسلم لیگ اور سکھوں کے درمیان مذاکرات میں ابتدائی طور پر مسلم لیگ کی طرف سے پیش کی گئی شرائط قابل قبول نہیں تاہم مسلم لیگ نے بیک جنبش قلم سکھوں کے مستقبل کو زیر بحث لانے یا انہیں کوئی یقین دہانی کرانے سے انکار کر دیا۔ سکھوں نے محسوس کیا کہ وہ ایسی پارٹی کی حمایت نہیں کر سکتے جو ایک مسلمان

ریاست میں سکھوں کو کمتر سمجھے (Ibid: 345-6)۔ گورنر نے بتایا کہ پنجاب کے 29 میں سے 25 اضلاع میں مسلم لیگی عہدیداروں نے شکایت کی کہ انتخابی مہم کے دوران خضر حکومت کی طرف سے ان لوگوں کو نشانہ بنایا گیا۔ ممکن ہے کہ یہ شکایت کسی حد تک درست ہو لیکن مسلمان افسروں نے عمومی طور پر انتخابات میں مسلم لیگ ہی کی حمایت کی تھی۔ مسلم لیگ کی انتخابات میں بھرپور کامیابی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ خضر حیات کی طرف سے مبینہ مداخلت نے نتائج پر زیادہ اثرات مرتب نہیں کیے۔ چنانچہ اس الزام کہ مسلم لیگ کی شہری آزادیوں پر قدغن لگانے نے اس کی سیاسی حمایت میں اضافہ کیا، میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی۔

ایک ضمنی ٹاپ سیکرٹ نوٹ میں جینکنز نے 16 فروری کو یہ تجزیہ کیا:

> اس وقت (پنجاب میں) تین فریق ہیں — مسلم لیگ جو بڑی اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے اور جو صوبے میں غیر منقسم اقتدار چاہتی ہے۔ پنتھی سکھ جو مسلمانوں کی غیر منقسم حکمرانی کی بزور مزاحمت کریں گے اور تیسرا فریق کانگریس ہے جو مسلم لیگ کی طرح آل انڈیا تنظیم کا حصہ ہے لیکن فی الوقت سکھوں کی حمایت کرے گی۔ پنجاب کی موجودہ جغرافیائی صورتحال میں کوئی بھی فریق بزور طاقت دوسرے کو فتح کیے بغیر تن تنہا حکومت نہیں کر سکتا اور پرامن حل یہ ہو سکتے ہیں۔ (اے) ایک مخلوط حکومت بنائی جائے جو مذہبی اثرورسوخ سے پاک اور تمام فریقوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ (بی) صوبے کی تقسیم۔ اگر پنجاب کو ہندوستان کی تقسیم سے ہٹ کر ڈیل کیا جائے تو ایسا ممکن ہے کہ تمام فریقوں کو ان میں سے کسی ایک آپشن کو قبول کرنے پر قائل کر لیا جائے تاکہ برطانیہ سے اقتدار کی منتقلی میں مذہبی شناخت سے پاک مشترکہ حکومت وجود میں آسکے لیکن برطانوی حکومت کے (20 فروری کو کیے گئے انتقال اقتدار جون 1948 تک یقینی بنانے کے) اعلان سے پنجاب کے لیے یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ اپنی سمت خود متعین کر سکے بلکہ اس اعلان سے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کی حوصلہ افزائی ہو گی کہ وہ پورے ہندوستان کے مفادات کو صوبائی مفادات سے منسلک کریں۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کی طرف سے حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ وہ سمجھوتہ کرنے سے گریز کرے تاکہ اس کی مختلف صوبوں میں مسلم اقلیت میں بارگیننگ کی صلاحیت میں اضافہ ہو۔ اسی طرح پنجاب کانگریس ہندوؤں کی بالادستی والی موثر مرکزی حکومت کے قیام کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گی (Ibid: 353)۔

بلاشبہ چند ماہ بعد گورنر کا یہ اندازہ درست نکلنے والا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم دراصل پنجاب کی تقسیم سے منسلک تھی۔ البتہ جینکنز نے بڑے واضح طور پر ان مشکلات کی طرف اشارہ کیا جب جون میں ہندوستان کی تقسیم کا عمل وقوع پذیر ہوتا۔ اس کے نتیجے میں بنگال اور پنجاب کی بھی تقسیم ہوتی۔ انہوں نے لکھا:

> مقررہ تاریخ پر ہندوستان چھوڑنے کا شاہ معظم کی حکومت کے فیصلے کے نتیجے میں ہم سب جو کئی برسوں سے یہاں کام کر رہے ہیں کو بھی جانا پڑے گا۔ یہ بہت خطرناک فیصلہ ہے۔ تاریخ مخصوص کرنے سے مخالف فریقوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ

کرنے کی کھلی چھوٹ مل جائے گی۔ انتقال اقتدار اس وقت تک ناممکن ہے جب تک یہ واضح طور پر طے نہ ہو جائے کہ 1948 میں کن فریقوں کو حکومت سپرد کی جائے گی اور انہیں حکومت کرنے کے لیے ابھی سے تیار نہ کیا جائے (Ibid: 354)۔

باالفاظ دیگر گورنر یہ کہنا چاہتا تھا کہ 1948 میں انتقال اقتدار کے وقت متحدہ یا منقسم ہندوستان میں فعال حکومت کی موجودگی ضروری ہے تاکہ پنجاب میں خونریزی کو روکا جا سکا۔ ہمیں آگے جا کر پتہ چلے گا کہ جو واقعات رونما ہوئے اس میں یہ خدشہ حقیقت بن کر سامنے آیا۔

اگلی پندرہ روزہ خفیہ رپورٹ جو راست اقدام ختم ہونے کے فوراً بعد لکھی گئی میں گورنر جینکنز نے محسوس کیا کہ احتجاجی تحریک کے نتیجے میں مسلمانوں اور ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان خلیج بڑھ گئی ہے۔ 27 فروری کو سکھ لیڈر سردار سورن سنگھ سے ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے گورنر نے ان کی سوچ کے بارے میں کہا:

مسلمانوں کی تن تنہا پنجاب پر قبضے کی خواہش سے سکھ سخت نالاں ہیں اور وہ انہیں اس کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ حالیہ احتجاجی تحریک سے پاکستان کی ہر قسم کی برہنگی ظاہر ہو گئی ہے اور اس سلوک کا پتہ چلا ہے جس کی سکھوں سمیت تمام اوّن مسلمانوں سے توقع رکھتی ہیں۔ اس (سورن سنگھ) نے تسلیم کیا ہے کہ خانہ جنگی سے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلے گی لیکن اسے ابھی تک یقین نہیں کہ کسی موثر معاہدے کی عدم موجودگی میں سکھ کسی شرط پر مسلمانوں کے پارٹنر بن سکیں گے۔ اس نے پنجاب کی تقسیم کی تجویز کو ناپسند کیا ہے لیکن وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ تقسیم اپنی تمام کجیوں کے باجود غالباً واحد علاج ہے (Ibid: 369)۔

گورنر جینکنز کا خیال تھا کہ خضر حکومت اور مسلم لیگ کے درمیان تصفیے سے ہندوؤں اور سکھوں کو مطمئن ہو جانا چاہیے کیونکہ صرف ان تینوں بڑے مذاہب پر مشتمل حکومت ہی پنجاب میں امن کی ضمانت ہے۔ دوسری طرف پریمیئر خضر ٹوانہ سمجھتے تھے کہ اگر سکھوں کو منا لیا جائے تو کانگریس کے لیڈر کوئی پریشانی پیدا نہیں کریں گے لیکن مسلم لیگ چھوٹی ذاتوں کے تعاون سے حکومت قائم کرنا چاہتی تھی۔ سر خضر کا خیال تھا کہ مسلم لیگ پنجاب جناح کی خواہش سے ہٹ کر کوئی فیصلہ نہیں کرے گی کیونکہ صوبائی عہدیدار فیصلہ کرنے میں زیادہ آزاد نہیں۔ خضر نے اپنے ایک مشترکہ دوست کے توسط سے نواب ممدوٹ کو مشورہ دیا کہ مسلم لیگ سکھوں کو مشتعل کرنے سے گریز کرے لیکن ان کے خیال میں مسلم لیگ اسی مشورے کو در خور اعتنا نہیں جانے گی۔

البتہ جینکنز سمجھتے تھے کہ احتجاجی تحریک اتنی کامیاب نہیں ہوئی جتنا کہ مسلم لیگ دعویٰ کرتی ہے اور کئی اضلاع میں عملاً کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی جبکہ صرف 6 اضلاع خصوصاً گجرات، لاہور، امرتسر اور جالندھر میں سخت حالات خراب ہوئے۔ یہ تحریک خالصتاً فرقہ وارانہ تھی۔۔۔ اور اکثر عام و خاص افراد کا خیال ہے کہ اس کا مقصد مسلم راج قائم کرنا تھا (Ibid: 368)۔

چیف سیکرٹری اختر حسین کے تاثرات

چیف سیکرٹری اختر حسین نے 4 مارچ 1947 کو فروری کے آخری پندرہ ایام کے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا کہ مسلم لیگ کی ایجی ٹیشن سے تمام اضلاع متاثر ہوئے تھے اور بعض مقامات پر صورتحال انتہائی گمبھیر رہی (L/P&J/5/250)۔ انہوں نے لکھا کہ اس مہم میں ارادتاً سول نافرمانی کی گئی اور قانون کو خالصتاً غیر جمہوری سیاسی عمل کے ذریعے توڑا گیا۔ 24 مارچ کی رپورٹ میں اس مہینے کے پہلے نصف کے واقعات کا احاطہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا: "اگرچہ کئی حلقوں کو مسلم لیگ کے بیہودہ رویے اور ہتھکنڈوں سے صدمہ پہنچا ہے لیکن بلاشبہ اسے اکثر مسلمانوں کی ہمدردیاں ملی ہیں" (Ibid)۔ قوم پرست مسلمان اور خاکسار احتجاجی تحریک کے مخالف رہے جبکہ کانگریس کے سوشلسٹ حلقوں نے اسے برطانوی 'بچہ جمہورا' کا سرکس قرار دیا۔ چیف سیکرٹری لکھتے ہیں:

> سب سے قابل ذکر اور خطرناک ردعمل سکھوں نے ظاہر کیا۔ ان کی ناراضگی تلخ تھی اور سکھوں کے بارے میں مسلم لیگ کے رویے سے اس کے مقاصد سے ان کے احساسات مجروح ہوئے اور ان کا یہ خیال راسخ ہو گیا کہ مسلمان مظاہرین کو سوچ سمجھے منصوبے کے تحت سکھوں کے خلاف ابھارا گیا (Ibid)۔

اختر حسین نے بالخصوص امرتسر کے مسلمانوں کے سکھوں کے خلاف معاندانہ رویے کا ذکر کیا اور کہا:

> مسلمانوں نے حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سکھوں کی تذلیل کی، سکھ پولیس اہلکاروں کو نشانہ بنا کر تشدد کیا اور ایک سکھ کانسٹیبل کا قتل بھی کر ڈالا۔ اس واقعے کے سنگین نتائج مرتب ہوئے اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اگر مسلم لیگ کی تحریک ختم نہ ہوتی تو سکھوں اور مسلمانوں میں مذہبی بنیادوں پر تصادم ناگزیر تھا (Ibid)۔

ان تفصیلات سے بالکل واضح ہے کہ پنجاب کی صورتحال آتش فشانی تھی لیکن پنجاب کے تینوں بڑے مذاہب میں اس بات کا یقین نہیں پایا جاتا تھا کہ ان کے لیڈر کوئی سمجھوتہ یا ایڈجسٹمنٹ کر سکتے تھے۔ جہاں تک مسلم لیگ اور کانگریس کا تعلق تھا تو پنجاب کی قیادت اپنی اعلیٰ قیادت کے فیصلوں کی مرہون منت تھی اور اپنے فیصلے کرنے میں آزاد نہیں تھی۔ سکھ کسی بھی حالت میں مسلمانوں کا غلبہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے سکھوں کو سبق سکھانے کی حکمت عملی تیار کی۔

انٹرویوز

عزیز مظہر، لندن 18 مئی 2002

میاں محمد سلیم، لاہور 14 اپریل 2003

عارف کھوکھر، لاہور 14 اپریل 2003

ایف ای چودھری، لاہور 23 اپریل 2003

بیگم نسیم امیر حسین شاہ، 25 اپریل 2003

راجہ تجمل حسین، 27 اپریل 2003

حکم قریشی، لاہور 30 اکتوبر 2005

سید احمد سعید کرمانی، لاہور 31 اکتوبر 2005

احد ملک، سٹاک ہوم 13 جنوری 2006

References

Iftikhar, Khawaja. *Jabb Amritsar Jall Reha Thaa* (*When Amritsar was Burning*). Lahore: Khawaja Publishers, (1991).

Moon, Penderel, *Divide and Quit,* New Delhi: Oxforc University Press, (1998).

Shahnawaz, Jahan Ara, *Father and Daughter: A Political Autobiography,* Karachi: Oxford University Press, (2002).

Talbot, Ian, *'Violence, Migration and Resettlement: The Case of Amritsar'* in Talbot, Ian and Thandi, Shinder (eds), *People on the Move: Punjab Colonialism, and Post-Colonial Migration.* Karachi: Oxford University Press, (2006).

Kholsa, Justice G. D., *Stern Reckoning,* (1989).

Talib, S. Gurbachan Singh, *Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab 1947,* New Delhi: Voice of India, (1991).

Official Documents

Carter, Lionel, *Punjab Politics 1 January 1944 -3 March 1947: Last Years of the Ministries* (*Governor's Fortnightly Reports and other Key Documents*). New Delhi: Manohar (2006).

Mansergh, N. and Moon, P., (eds), *The Transfer of Power , 4 November 1946-22 March 1947,* Vol. IX, London: Her Majesty's Stationery Office, (1980).

Newspapers

Dawn, Delhi, 1947.

The Pakistan Times, Lahore, 1947.

The Tribune, Lahore, 1947.

Milap, Lahore, 1947.

The Civil and Military Gazette, Lahore, 1947.

6

مارچ کے فسادات : لاہور

لاہور کو ہمیشہ ہی خصوصاً سولہویں صدی سے پنجاب کے مرکزی شہر کی حیثیت حاصل تھی جب مغلوں نے اسے اپنا صوبائی دارالحکومت قرار دیا۔ لاہور کی تاریخ بہت قدیم ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ بھگوان رام کے بیٹے لاو نے اس کو آباد کیا تھا۔ یہ 1799 میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں سکھ حکومت کا بھی دارالسلطنت تھا۔ بلاشبہ 1857 میں انگریز راج کے قیام کے بعد شہری منصوبہ بندی اور ترقی میں بھی لاہور کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ گورنر اور اعلیٰ سول اور فوجی افسر لاہور ہی میں بیٹھتے تھے۔ چنانچہ یہ برطانوی تخت کی طاقت اور وقار کی علامت تھا۔ انگریزوں کی سرپرستی میں لاہور قدیم فصیل سے باہر بھی تیزی کے ساتھ پھیلتا چلا گیا۔ قدیم لاہور کے باہر چاروں طرف ایک گہری خندق تھی لیکن انگریزوں نے بیرونی طرف گرین بیلٹ اور باغوں کے حصار کا بھی اضافہ کر دیا۔ جوں جوں شہر پھیلا تو قریبی دیہات اور ڈیرے اس میں شامل ہوتے گئے۔ سب سے جدید اور پر تعیش علاقہ سول لائنز کا تھا۔ شہر کے بڑے تعلیمی اداروں میں پنجاب یونیورسٹی، کئی آرٹس، سائنس، کامرس انجینئرنگ اور میڈیکل کالج شامل تھے۔ مال اور انارکلی مصروف تجارتی اور کاروباری علاقے تھے۔ اس کے علاوہ اجناس، خوراک اور فروٹ کی منڈیاں تھی جبکہ مغلپورہ میں ریلوے ورکشاپس تھیں۔

لاہور کی فلم انڈسٹری بھی فروغ پانے لگی اور اس کا مقابلہ بمبے اور کلکتہ کے فلم سٹوڈیوز سے ہونے لگا۔ (انٹرویو بی آر چوپڑہ، 4 جنوری 1997)۔ انگریز پریذیڈنسی کی طرز پر لاہور کی تعمیر نو پر بھی غور کر رہے تھے۔ جیسا کہ دیگر جدید شہروں کلکتہ، دہلی، بمبے اور مدارس میں کیا گیا تھا (Daeshsel, 2004: 26-27)۔ پورے پنجاب سے مختلف شعبوں کے کامیاب افراد یہاں مقیم ہو گئے۔ مختلف خودمختار ریاستوں کے شاہی خاندانوں نے صوبائی دارالحکومت میں اپنے محلات تعمیر کر لیے۔ کئی ریٹائرڈ افسروں، کامیاب تاجروں اور کاروباری شخصیات نے پنجاب کے اس سب سے بڑے شہر میں اپنے گھر بنا لیے۔

آبادی کے اعداد و شمار سے لاہور شہر اور ضلع میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ظاہر ہوتی تھی لیکن کسی اجنبی پر لاہور آمد پر یہ تاثر پڑتا تھا کہ شہر میں ہندو اکثریت میں ہیں کیونکہ یہاں کی 75 فیصد جائیدادیں، عمارات، کاروبار اور ترقیاتی سکیمیں ہندوؤں کی ملکیت تھیں (Ahmed, 1999: 127)۔ حتیٰ کہ چھوٹی سے اقلیت سکھوں کی مالی حالت مسلمانوں سے بہتر تھی۔ لاہور کے کئی ہندو یہ بھی سمجھتے تھے کہ سکھوں کو ساتھ ملا کر ان کی شہر میں اکثریت تھی۔

اگرچہ سکھ بھی دیہات میں نمایاں تعداد میں آباد تھے تاہم لاہور ضلع میں بھی مجموعی طور پر مسلمان واضح اکثریت میں تھے۔ چنانچہ ہندو جہاں زیادہ تر شہروں میں آباد تھے وہاں مسلمان شہروں اور دیہات دونوں جگہ پر کافی تعداد میں تھے۔ البتہ مجموعی طور پر سکھ زیادہ تر گاؤں کے باسی تھے۔ ضلعی انتظامیہ کا سربراہ انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر جے سی ڈبلیو ایو سٹاس تھا۔

1941 کی مردم شماری کے مطابق آبادی کا تناسب		
لاہور شہر کی کل آبادی بشمول لاہور میونسپلٹی اور لاہور کینٹ	**تعداد**	**فیصد تناسب**
تمام مذاہب کی کل آبادی	671,659	100
مسلمان	433,170	64.50
ہندو بشمول شیڈول کاسٹس	188,222	28
سکھ	34,021	5
دیگر بشمول عیسائی، بے مذہب، جین، پارسی	14,245	2.50
ضلع لاہور	**تعداد**	**فیصد تناسب**
تمام مذاہب	16,95,375	100
مسلمان	10,27,772	61
ہندو بشمول شیڈول کاسٹس	2,87,351	17
سکھ	3,10,646	18
دیگر بشمول عیسائی، ادھرمی، جین، پارسی	69,606	4

2مارچ1947: یوم فتح اور خضر حیات ٹوانہ کا استعفیٰ

خضر وزارت اور مسلم لیگ کے درمیان 26 فروری کو ہونے والے تصفیے کے باوجود پنجاب کے حالات پوری طرح معمول پر نہ آئے۔ ہندو اور سکھ لیڈر دونوں مسلم لیگ کی حکومت بننے کے امکانات بڑھنے پر ملول اور تناؤ کا شکار تھے۔ دوسری طرف شہری علاقوں جہاں سول نافرمانی کی تحریک کئی ہفتے تک زوروں پر رہی میں آباد مسلمان یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ پاکستان بلاشبہ ایک حقیقت بن کر سامنے آنے والا تھا۔ اب معاملہ کیا نہیں بلکہ کب والا رہ گیا تھا۔ مسلم لیڈر غیر یقینی کی کیفیت میں اس بات پر نازاں تھے کہ پاکستان کے مطالبے کے پیچھے انہوں نے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو متحرک کیا تھا اور جو دباؤ قائم ہوا اسے اب قائم رہنا چاہیے۔ بہر صورت لاہور بدستور آتش فشانی کیفیت کا شکار رہا اور سیاسی سرگرمیاں عروج پر رہیں۔ مخلوط حکومت ابھی تک اقتدار میں تھی لیکن مسلم لیگ اس کا حصہ نہیں تھی۔ چنانچہ راست اقدام سے کچھ بھی نمایاں تبدیلی دیکھنے میں نہ آئی۔ 2مارچ 1947 کو اتوار کا دن تھا اور مسلم لیگ نے اسے 'یوم فتح' کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔

اس وقت میاں مقصود احمد، میاں محمد سلیم اور عارف کھوکھر نوجوان تھے۔ میرے ساتھ انٹرویو کے دوران انہوں نے مجھے تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی اس پر اعتمادی سے آگاہ کیا جو احتجاجی تحریک کے نتیجے میں آئی تھی۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے 46-1945 کے عام انتخابات اور راست اقدام دونوں میں فعال کردار ادا کیا۔ میں نے اس طلبا تنظیم کے ممتاز رہنما (سنیئر صحافی) عزیز مظہر سے بھی انٹرویو کیا۔ 1947 میں وہ اسلامیہ کالج سٹوڈنٹس یونین کے جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ بعد ازاں میری نمائندگی کرتے ہوئے احمد سلیم نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اس دور کے سیکرٹری سید احمد سعید کرمانی سے بھی انٹرویو

کیا۔ وہ بعد میں پاکستان بننے پر پنجاب کے وزیر قانون بھی بنے۔ ان دونوں (عزیز مظہر اور کرمانی) نے تصدیق کی پاکستان کے قیام کے موضوع پر مسلمان نوجوان نسل میں زبردست جذباتی جوش پایا جاتا تھا۔ البتہ اس وقت تک کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ خونریزی لاکھوں افراد کی جان لے گی اور ان گنت لوگ محفوظ ٹھکانوں کی تلاش میں نقل مکانی کریں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مسلمان طلبا میں کبھی ہندوؤں اور سکھوں کو لاہور سے نکال باہر کرنے کی بات زیر بحث نہیں آئی۔ البتہ روزانہ کی بنیاد پر ہونے والے مظاہروں میں اسلامی رنگ ضرور غالب تھا۔

بہر حال اس روز اندرون شہر کی بیرونی دیوار کے قریب موچی گیٹ پارک میں لوگ یوم فتح منانے کے لیے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اس روز اتوار تھا۔ جب مسلم لیگ کے لیڈروں نے کہا کہ راست اقدام کی عظیم کامیابی دراصل پاکستان کے قیام کی طرف کامیاب پیشقدمی ہے تو شدت جذبات سے ہجوم میں خوشی اور شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اس اجتماع سے خطاب کرنے والوں میں شیڈول کاسٹس کے 2 لیڈر سردار ہری سنگھ نربھائی اور چودھری سکھ لال بھی شامل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو چھوٹی ذاتوں کی بھرپور حمایت کا یقین دلایا۔ اس کے علاوہ میاں افتخار الدین، فیروز خان نون، شوکت حیات، بیگم شاہنواز حتیٰ کہ عبوری مرکزی حکومت کے وزیر صحت راجہ غضنفر علی خان نے بھی خطاب کیا۔ راجہ غضنفر نے اپنی تقریر میں کہا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو وہ یہ چاہیں گے انگریز جون 1948 نہیں بلکہ اسی سال جون 1947 تک ہندوستان سے نکل جائیں۔(Pakistan Times, 4 March)

مقررین نے اقلیتوں کو یقین دلایا کہ مستقبل کے پاکستان میں ان کے تمام حقوق محفوظ ہوں گے۔ شام کو مسلمانوں کے گھروں، دکانوں اور اداروں میں یوم فتح کی خوشی میں چراغاں کیا گیا (Pakistan Times, 4 March)۔

وزیر اعظم خضر حیات نے 2 مارچ کی صبح کو گورنر جینکنز سے ملاقات کی اور انہیں احمدی کمیونٹی کے سرکردہ رہنما سر ظفر اللہ خان سے اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا۔ ظفر اللہ ان دنوں لاہور ہی میں تھے۔ دونوں رہنماؤں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ مسلم لیگ کو راست اقدام کے باعث پیدا ہونے والی صورتحال کی سنگینی کا احساس دلایا جائے۔ خضر حیات نے بعد ازاں کانگریس کے رہنما بھیم سین سچر اور سکھ لیڈر سورن سنگھ سے ملاقات کی اور انہیں اپنے استعفیٰ دینے کے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ دونوں خضر حیات کی اس بات پر کافی مایوس ہوئے تھے۔ سچر نے جینکنز کو کہا کہ ''کانگریس اس وقت تک مسلم لیگ سے کوئی تعاون نہیں کر سکتی جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ (پاکستان میں) اقلیتوں سے مساوی سلوک کیا جائے گا اور انہیں کمتر نہیں سمجھا جائے گا'' (Carter, 2007a, p.51)۔ اسی روز رات سوا دس بجے خضر حیات نے گورنر سے ملاقات کی اور اپنا اور اپنے وزرا کا استعفیٰ پیش کر دیا۔ انہوں نے پھر یہ کہا کہ شاہ معظم کی حکومت کے 20 فروری کے بیان سے ہندوستان میں نئی صورتحال پیدا ہوئی ہے چنانچہ پنجاب کے رہنماؤں کو مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے(Pakistan Times, 4 March)۔

3 مارچ: ماسٹر تارا سنگھ کی بڑھک

وزیر اعظم خضر حیات کے استعفے کی خبر پر اگلے روز لاہور مسلم لیگ نے کافی خوشی کا اظہار کیا لیکن خلاف توقع ایک روز قبل وزیر اعظم کے خلاف ہتک آمیز نعرے لگانے والوں نے اگلے روز یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا کہ ''تازہ خبر آئی اے۔۔۔ خضر ساڈا بھائی اے''۔

کچھ عرصے سے مسلم لیگ کے اندر بھی چپقلش جاری تھی۔ فیروز خان نون اور شوکت حیات پارٹی معاملات سے نواب ممدوٹ کو بے دخل کرنا چاہتے تھے لیکن ممدوٹ کو دیگر پارٹی رہنماؤں اور پنجاب بھر میں مسلم لیگی عہدیداروں کی نچلی سطح پر حمایت حاصل تھی۔ چنانچہ وہ متفقہ طور پر پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی کے لیڈر منتخب ہو گئے جبکہ شوکت حیات اور میاں نوراللہ بالترتیب ڈپٹی لیڈر اور سیکرٹری بن گئے۔ گورنر نے نواب ممدوٹ کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ انہوں نے پنتھی پارٹی کے اسمبلی میں لیڈر سردار سورن سنگھ سے رابطہ کر کے مسلم سکھ مخلوط حکومت بنانے میں تعاون کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے یقین دلایا کہ مسلم لیگ نے کبھی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں پر مسلمانوں کا غلبہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ "ہم ایک خوشحال اور ترقی یافتہ پنجاب کی تعمیر کے لیے تمام فریقوں کا تعاون حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے" (Pakistan Times, 5 March)۔

گورنر پنجاب جینکنز نے 5 مارچ کے ایک ٹیلی گرام میں وائسرائے ویول سے کہا کہ نواب ممدوٹ اتحادی حکومت کے قیام کے لیے عیسائی اور شیڈول کاسٹس ارکان اسمبلی پر انحصار کر رہے ہیں۔ ایسی حکومت کو کانگریس اور سکھ ارکان کی سخت مزاحمت کا سامنا پڑ سکتا ہے۔ جو سول نافرمانی کی تحریک چلائیں گے اور نتیجتاً پورے پنجاب میں مذہبی تفرقے کی بنیادوں پر فسادات پھوٹ پڑیں گے (Carter, 2007a: 57)۔

مسلم لیگ اور سکھوں کے درمیان مذاکرات بے ثمر رہے۔ کانگریس نے متحدہ ہندوستان پر اپنے کامل یقین کے مؤقف کا اعادہ کیا اور ہر ایسی حکومت کے قیام کی مخالفت کی جو مذہبی بنیادوں پر استوار ہو یا مخصوص طبقے کی بالادستی کی خواہاں ہو۔ (Pakistan Times, 5 March)۔ اسی دوران پنجاب اسمبلی کے سکھ ارکان کا ایک اجلاس ہوا جس میں مسلم لیگ سے تعاون نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان دھڑوں کی حمایت کے بغیر مسلم لیگ حکومت بنانے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی اور پنجاب اسمبلی میں اکثریت ثابت نہیں کر سکتی تھی۔

اس موقع پر اسمبلی عمارت کے باہر مسلمان محاصرہ کیے کھڑے تھے اور نعرے لگا رہے تھے کہ مسلم لیگ ہر قیمت پر حکومت بنائے گی۔ صورتحال اس وقت گمبھیر ہو گئی جب سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ دیگر سکھ ارکان سمیت عمارت سے باہر آئے اور ہجوم کے سامنے اپنی کرپان لہرائی۔ اس واقعے کی مجھے انٹرویو دینے والے تقریباً تمام افراد نے تصدیق کی جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ اس وقت ماسٹر تارا سنگھ نے حقیقتاً کیا کہا تھا اس کے متضاد الفاظ سامنے آئے ہیں لیکن ان کا پیغام بہر حال واضح تھا اور وہ تھا پاکستان کو مسترد کرنا۔ جسٹس کھوسلہ لکھتے ہیں کہ ماسٹر تارا سنگھ نے چیخ کر کہا "کٹ کے دیں گے اپنی جان مگر نہیں دیں گے پاکستان۔" اخبار دی ٹربیون نے 4 مارچ کو یہ منظر تھوڑا سا مختلف بیان کیا ہے:

> ماسٹر تارا سنگھ اجلاس والے کمرے سے باہر آئے اور زور زور سے نعرے لگائے "پاکستان مردہ باد، ست سری اکال" پھر وہ مین گیٹ سے باہر جاتے منتشر ہو گئے۔ جیسے ہی تارا سنگھ اور دیگر سکھ ارکان اسمبلی نے نعرے لگائے تو اسمبلی کے باہر کھڑے مسلمانوں میں اشتعال پھیل گیا اور انہوں نے بھی جوابی نعرے بازی شروع کر دی اور دشنام طرازی بھی کی۔ اس موقع

پر پولیس نے مداخلت کی اور ان افراد کو قابل اعتراض الفاظ کہنے سے منع کیا۔ دریں اثنا میاں افتخار الدین اور میاں ممتاز دولتانہ وہاں آئے اور ہجوم کو سمجھایا بجھایا کہ وہ جوابی مظاہرے کرنے سے گریز کریں (The Tribune, 4 March)۔

پنجاب کی تقسیم کی پوری داستان میں ماسٹر تارا سنگھ کی پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر لگائی گئی بڑھک سے زیادہ ڈرامائی کوئی اور لمحہ نہیں۔ میرے ساتھ بات کرنے والے موقع پر موجود تمام مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی افراد نے بھی شہادت دی کہ سکھ لیڈروں کی فلمی طریقے سے جارحیت سے وہ صورتحال بے قابو ہونے والی تھی جس پر اب تک انتظامیہ نے کنٹرول کیا ہوا تھا۔ اس وقت نانک سنگھ بروچہ اتفاق سے وہاں موجود تھا۔ مسلمانوں کا ایک بڑا ہجوم مال روڈ پر جمع تھا اور ماسٹر تارا سنگھ کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ البتہ نانک سنگھ کو سکھ حلیے کے باوجود کسی نے کچھ نہ کہا۔

یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ ایس جی پی ایس کی رپورٹ میں اس واقعے کا نمایاں طور پر ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ اس رپورٹ کے کئی صد صفحات صرف مسلمانوں اور مسلم لیگ کو مطعون کرنے کے لیے سیاہ کیے گئے تھے۔ تاہم اس واقعے کی تاریخی اعتبار سے حیثیت اتنی مسلم ہے کہ رپورٹ کے مصنف نے اس کا ذکر الگ باب میں کیا لیکن وہاں بھی یہ واقعہ دراصل نواب ممدوٹ کے خلاف مسلم لیگ پنجاب کے فنڈز کے غلط استعمال اور بدعنوانی کے کیس سے متعلق تفصیل کا ذیلی حصہ ہے (1991: 446)۔

دی ٹریبون نے 3 مارچ کے واقعات کی تفصیل لکھتے ہوئے مزید بتایا کہ اسمبلی عمارت کے قریب ہونے والے اس واقعے کے فوراً بعد ایم ایل اے سردار دلیپ سنگھ نے پارٹی میں ایک قرارداد پیش کی کہ "مسلم لیگ کی پنجاب میں اس وقت تک حکومت بننے کی ہر ممکن طریقے سے مخالفت کی جائے گی جب تک وہ سکھوں کے وطن پنجاب میں مسلمانوں کی برتری یا پاکستان کے قیام کے منصوبے پر عمل پیرا رہے گی"۔(The Tribune, 4 March)

بعد ازاں اس روز سکھ پرانی انار کلی کے قریب کپور تھلہ ہاؤس کے باہر جمع ہو گئے تاکہ اپنے رہنماؤں کی تقریریں سن سکیں۔ یہ تقریریں انتہائی اشتعال انگیز تھیں۔ ماسٹر تارا سنگھ نے کہا:

> اے ہندوؤ اور سکھو تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ جاپیوں (Japs) اور نازیوں کی طرح اپنی تباہی کے لیے تیار رہو۔ ہماری دھرتی خون مانگ رہی ہے اور ہمیں اپنے خون سے دھرتی کی پیاس بجھانا ہو گی۔ ہم نے مغلستان کو کچل کر رکھ دیا اور اب پاکستان کو پاؤں تلے روندیں گے۔ دنیا میں ہمیشہ اقلیتوں کی حکمرانی رہی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں سے ان کی سلطنت چھین لی جبکہ سکھوں نے مسلمانوں سے حکومت چھین لی اور اپنی طاقت کے ذریعے مسلمانوں پر حکمرانی کی۔ سکھ اب دوبارہ ان پر حکومت کریں گے۔ ہم ان پر حکمرانی کریں گے اور لڑ کر حکومت حاصل کریں گے، میں نے نقارہ بجا دیا ہے، مسلم لیگ کو ختم کر دو (The Partition of the Punjab, Vol.II, 1993: 138)۔

ایک اور سکھ لیڈر گیانی کرتار سنگھ نے کہا، "آج مذہبی جنگ (کروسیڈ) شروع ہو گئی ہے۔ 100 سال پہلے قلعہ لاہور پر ہمارے پہلے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ دوبارہ اب قلعے پر لہرائیں گے۔ ہماری تلوار (کرپان) فیصلہ کرے گی کہ کیا مسلمان حکمرانی

کریں گے۔ سکھ کبھی گورو گوبند سنگھ کا سر نیچا نہیں ہونے دیں گے" (Ibid: 351)۔ ایک ہندو لیڈر چودھری کرشن گوپی دت نے اعلان کیا، "کیا یہاں کوئی ایک بھی مائی کا لال ہے جو ہمیں ہماری ماؤں کی گود سے چھین کر نواب ممدوٹ کی جھولی میں ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ ایسے حالات پیدا کر دو کہ مسلم لیگ کے لیے اپنی وزارت قائم کرنا ناممکن ہو جائے" (Ibid: 35)۔

3 مارچ کی شام کپور تھلہ ہاؤس میں ہونے والے اجتماع میں کانگریس کے رہنما بھی موجود تھے۔ اپنی تقریروں میں وہ بھی مسلم لیگ کی حکومت قائم ہونے کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ البتہ انہوں نے فرقہ وارانہ اختلافات چھیڑنے سے گریز کیا۔ مثال کے طور پر سینئر کانگریسی لیڈر ڈاکٹر گوپی چند بھر گاوہ جو رکن اسمبلی بھی تھے نے کہا کہ "وہ تمام پنجابی جو نظریہ پاکستان پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ اپنی دکانیں اور کاروبار بند رکھ کر اینٹی پاکستان دن منائیں اور جلسے کریں اور قومی پرچم لہرائیں" (Pakistan Times, 5 March)۔ اس موقع پر یہ طے کیا گیا کہ 11 مارچ کو بطور 'اینٹی پاکستان ڈے' منایا جائے گا۔

اندرون لاہور گھومتے ہوئے مجھے اور احمد سلیم کو کسی نے ایک بزرگ حاجی عبدالرحمن گل کا پتہ بتایا جو شاہ عالمی گیٹ کا رہائشی تھا اور جس کی خاندان تقسیم سے قبل اسی مقام پر سکونت پذیر تھا۔ ہم نے عبدالرحمان گل سے 30 دسمبر 2004 کو ملاقات کی۔ بعد ازاں میری نمائندگی کرتے ہوئے احمد سلیم نے 29 ستمبر اور 15 اکتوبر کو عبدالرحمان سے مزید ملاقاتیں کیں۔ یہ شخص لاہور میں 1947 کو رونما ہونے والے واقعات کا اہم چشم دید گواہ ہے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ لاہور میں ہونے والے فسادات شروع ہونے کی وجہ ہندوؤں اور سکھوں کا جارحانہ رویہ تھا۔ میں نے کتاب میں کئی جگہ ترتیب کے لحاظ سے حاجی عبدالرحمان کی بیان کردہ تفصیل شامل کی ہے۔ عبدالرحمان گل خود بھی شاہ عالمی گیٹ میں آگ لگانے کی سازش میں ملوث تھا تا کہ سکھوں اور ہندوؤں کو جون کے اختتام تک لاہور سے بے دخل کیا جا سکے۔

حاجی عبدالرحمان گل

"3 مارچ 1947 کو ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر کرپان لہرائی اور پاکستان کے خلاف نعرے لگائے۔ اسی روز بعد ازاں انہوں نے دیگر ہندو اور سکھ رہنماؤں کے ساتھ الگ اجتماع میں اشتعال انگیز تقریریں بھی کیں۔ اس کے بعد یہ لوگ ایک جلوس کی شکل میں نعرے لگاتے ہندوؤں اور سکھوں کے مضبوط گڑھ شاہ عالمی کی طرف چل پڑے۔ جب یہ شاہ عالمی گیٹ سے باہر بانساں والے بازار پہنچے تو انہوں نے بانس کے ڈنڈے بیچنے والی دکانیں لوٹ لیں۔ انہی ڈنڈوں کے ساتھ انہوں نے شاہ عالمی گیٹ کے باہر مٹی کے برتنوں اور سبزی والی دکانوں میں توڑ پھوڑ کی۔ پھر وہ گیٹ کے اندر داخل ہو کر کاغذ منڈی کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں ایک مسلمان راشن ڈپو کا مالک نواب بٹ اور دیگر مزدور گندم کی بوریاں لوڈ کر رہے تھے۔ مظاہرین نے حملہ کر کے نواب بٹ کو قتل کر ڈالا۔ مزدوروں اور ریڑھیوں کے مالکان کو بھی بری طرح تشدد کر کے زخمی کر دیا گیا۔

"ہجوم نے اس کے بعد نواں بازار میں ایک مسلمان کی پکوڑہ شاپ پر حملہ کیا لیکن اس نے جرأت کا مظاہر کرتے ہوئے کڑھتا تیل ان پر پھینکا اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ واقعہ مجھے کئی دیگر عینی شاہدین نے بھی بتایا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک تانگہ بان پر بھی حملہ ہوتے دیکھا۔ میں اس وقت رنگ محل مشن ہائی سکول سے واپس آ رہا تھا اور اپنے بھائیوں کو اسی سکول سے ساتھ لا رہا تھا۔ تانگہ مچھی ہٹہ کی طرف جا رہا تھا لیکن ہندوؤں نے اسے جا لیا اور تانگہ بان کی پشت میں چھرے گھونپ

دیے۔ وہ زخمی ہو کر سڑک پر گر پڑا۔ میرے ذہن میں اس کی شکل آج بھی زندہ ہے۔ اس کا چہرہ زمین کی طرف تھا۔ تیسرا قتل ایک موسیقار کا ہوا جو گاماواجیانوالہ (شادی بیاہ پر بینڈ بجانے والا پیشہ ور گروپ) کے لیے کام کرتا تھا۔ اس بینڈ باجے والے کو چوڑا کھوہ کے پاس نشانہ بنایا گیا۔ لہٰذا اس روز تین مسلمان شہید کیے گئے۔ کشیدگی اب پورے علاقے میں پھیل گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ نوجوان مسلمان نواب بازار سے نواب بٹ اور موسیقار کی لاش اٹھا کر میو ہسپتال لے گئے۔ زخمیوں کو بھی ایمرجنسی میں پہنچایا گیا۔ البتہ تانگہ بان کی لاش کے ساتھ کیا ہوا اس کا مجھے علم نہیں۔

"میرے والد بلا جٹ شاہ عالمی سے باہر اپنے ڈیرے پر تھے وہ ماضی میں بھی فرقہ وارانہ تنازعات میں ملوث رہے تھے اور ہندو انہیں اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے تاہم اس کے باوجود بعض ہندو ان کے دوست بھی تھے۔ بہر حال کچھ ہندوؤں نے منصوبہ بنایا کہ لاہور میں پیدا ہونے والی فرقہ وارانہ کشیدگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلا جٹ کو قتل کر دیا جائے۔ ان میں سے ایک نے مکان کی چھت سے چلا کر کہا 'بلے پہلوان مجھے یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ تمہارے اہل خانہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔' میرے والد نے جواب میں چیخ کر کہا 'اگر میرے بچے ہلاک کیے گئے تو کسی ہندو ماں اور باپ کا کوئی بچہ زندہ نہیں رہے گا'۔ اسی اثنا میں میرے سارے ماموں اور چچا ڈیرے پر جمع ہو گئے۔

"ہندو چاہتے تھے کہ میرے والد کو دھوکہ دہی سے شاہ عالمی دروازے کے اندر جانے پر مجبور کر دیں جہاں ہندوؤں کا ایک مسلح جتھہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ والد نے خطرہ بھانپ لیا اور اندرون شاہ عالمی گیٹ جانے کی بجائے قریبی پولیس چوکی میں چلے گئے تا کہ چوکی انچارج دلدار علی شاہ سے صورتحال پر بات کر سکیں۔ دلدار شاہ ایک اچھا اور بہادر انسان تھا اور وہ مشکل میں گرفتار ہر شخص کی مدد کرتا تھا۔ میرے والد یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا دلدار شاہ پولیس کا کوئی دستہ شاہ عالمی گیٹ میں ساتھ بھجوا سکتا تھا۔ چونکہ وہ قتل سمیت کئی فوجداری مقدمات میں ملوث رہے تھے اس لیے وہ ہر احتیاطی اقدام کر کے وہاں جانا چاہتے تھے۔ شادی کے بعد اب چونکہ ان کی بیوی بچے تھے اس لیے وہ قانون سے الجھنے سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ دلدار شاہ نے معذرت کی کہ اس وقت اس کے پاس بندوق بردار پولیس اہلکاروں کی کافی تعداد موجود نہیں۔ چنانچہ والد صاحب واپس اپنے ڈیرے پر آ گئے۔ اس دوران موچی دروازے کے مسلمان نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد وہاں جمع ہو گئی۔ میرے والد نے ان سے کہا کہ 'میری بیوی بچوں کو قتل کر دیا گیا ہے اور میں شاہ عالمی گیٹ کے اندر اپنے گھر جانا چاہتا ہوں تو کیا تم میرے ساتھ جاؤ گے'، انہوں نے انکار کر دیا۔ لہٰذا میرے والد اور چاچے اور ماموں بدترین صورتحال کے لیے خود کو تیار کرنے لگے۔ انہوں نے سر پر پگڑیاں باندھیں اور ڈنڈوں اور دیگر ہتھیاروں سے لیس ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ٹھیک اس وقت میرے والد کے دو ہندو دوست ہنس راج جو سگریٹ فروش تھا اور لالہ چنی لال جو اچار فروش تھا وہاں آ گئے اور سمجھایا کہ وہاں جانے کی غلطی مت کرنا کیونکہ کچھ ہندو تمہاری جان کے درپے ہیں۔ ہم خود وہاں جا کر تمہارے کنبے کے بارے میں حالات جانچ کر آتے ہیں۔ لہٰذا میرے والد مان گئے۔ اس کے بعد وہ دونوں ہندو دکاندار ہمارے گھر آئے اور باہر سے آواز لگائی کہ 'کاکا تم ٹھیک ہو؟' میں نے جواب دیا 'ہاں چاچا جی لیکن میرے والد کہاں ہیں؟' انہوں نے بتایا کہ وہ بھی خیریت سے ہیں۔ اسی دوران والد، چچاؤں اور ماموؤں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر صورت میں اندرون شاہ عالمی گیٹ جائیں گے۔ ٹھیک اس وقت چوکی کے اہلکار وہاں پہنچ گئے اور ہوائی فائرنگ شروع کر دی جس سے ہجوم تتر بتر ہو گیا۔ میرے والد اور انکل سب گھر آئے اور ہمیں زندہ سلامت دیکھ کر سکھ کی سانس لی۔

"3 مارچ کی رات 4مارچ کا پورا دن اور 5مارچ کی شام تک ہم گھر میں ہی مقید رہے۔ 3مارچ کو رات کا کرفیو لگا دیا گیا تھا تاہم 5مارچ سے دن کو بھی کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ 5مارچ کو وہی دونوں ہندو دوست ہمارے گھر آئے اور انکشاف کیا کہ ہمارے محلے کٹڑہ سوسیاں Katra Susian پر حملہ کر کے تمام مسلمانوں کو جان سے مارنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں فوراً حالات معمول پر آنے تک گھر خالی کر کے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ میرے والد جو انتہائی اکھڑ مزاج اور اڑیل انسان تھے نے کہا کہ میرے بچوں کو ہاتھ لگانے والوں کو پہلے میری لاش سے گزرنا ہو گا۔ یہ محسوس کر کے کہ میرے ابا کو قائل کرنا آسان نہیں وہ دونوں میرے دادا چودھری فضل دین کے پاس گئے جو ہمارے ساتھ والے گھر میں رہتے تھے۔ ان ہندوؤں نے اپنی پگڑیاں دادا کے پاؤں میں رکھتے ہوئے التجا کی کہ بلے سے کہہ دیں کہ وہ گھر چھوڑ دے اور آپ سب کو یہاں سے لے جائے۔ میرے والد نے دادا کی بات کبھی نہیں ٹالی تھی چنانچہ جب انہوں نے حکم دیا کہ گھر خالی کر دو تو انہوں نے مان لیا۔ عصر کے وقت ہم نے گھروں کو تالے لگائے اور نواں بازار میں اپنے عزیزوں کے گھر منتقل ہو گئے۔ ہم صرف تن کے کپڑوں کے ساتھ گھر سے نکلے اور یہ امید رکھ رہے تھے کہ واپسی ایک دو روز میں ہو جائے گی لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی۔ ہماری واپسی کئی ماہ بعد پاکستان بننے کے بعد ہی ممکن ہو سکی۔ اس لحاظ سے شاہ عالمی دروازے کے ہم پہلے پناہ گزین تھے۔"

جب میں نے عبدالرحمان گل کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ اخبارات اور سرکاری ذرائع میں لاہور میں ہنگامے شروع ہونے کی تاریخ 4مارچ بتائی گئی ہے اور جو واقعات آپ بتا رہے ہیں اس میں 3مارچ کا کوئی ذکر نہیں تو عبدالرحمان گل نے وضاحت کی کہ باقاعدہ طور پر فرقہ وارانہ فسادات 4مارچ کو ہی شروع ہوئے جبکہ 3مارچ کو صرف پرانی انارکلی میں اجتماع کے بعد واپس جاتے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر کچھ حملے کیے جن میں محدود انسانی جانوں کا ضیاع ہوا۔ انہوں نے یہ شبہ بھی ظاہر کیا کہ لوہاری گیٹ پولیس سٹیشن کے ایس ایچ او پنڈت دیوی داس نے ان واقعات کی ایف آئی آر درج نہیں کی ہو گی جس کی وجہ سے صورتحال اعلیٰ حکام کے نوٹس میں نہیں آئی ہو گی۔ میں (مصنف) سمجھتا ہوں کہ عبدالرحمان کی بات ممکن ہے کہ اصولی طور پر ٹھیک ہو کیونکہ پنجاب میں فسادات کا ڈیٹا جمع کرتے ہوئے عام لوگوں سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ پولیس ریکارڈ اور خفیہ رپورٹوں سے کہیں زیادہ تھیں۔

دوسری طرف 5مارچ کو گورنر پنجاب کی طرف سے وائسرائے ویول کو ارسال کیے گئے ٹیلی گرام میں بتایا گیا کہ کرفیو 3مارچ نہیں بلکہ 4مارچ کو لگایا گیا۔ ان شواہد کی روشنی میں بالآخر میں اس حتمی نتیجے پر پہنچا کہ عبدالرحمان نے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا وہ 3مارچ نہیں بلکہ 4مارچ کو رونما ہوئے ہوں گے۔ 4مارچ کو نواب ممدوٹ کے ساتھ ملاقات کی تفصیل پر مشتمل نوٹ میں گورنر جینکنز لکھتے ہیں کہ:

> خان افتخار حسین ممدوٹ کی درخواست پر میری ان سے آج شام 6:05 بجے ملاقات ہوئی۔ سہ پہر کو شاہ عالمی گیٹ اور لوہاری گیٹ کے علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی اطلاعات موصول ہوئیں، اصل حقائق کا ابھی تک پتہ نہیں لگایا جا سکا تاہم متعدد مسلمان مرنے کی اطلاعات ضرور ملی ہیں۔ خراب صورتحال کے باعث پولیس کا کنٹرول ختم ہو گیا ہے اور اب کوتوالی کے علاقے میں فوجی دستے گشت کر رہے ہیں اور رات 8 بجے سے صبح 7 بجے تک کرفیو لگا دیا گیا ہے (Carter, 2007a: 232-3)۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ عبدالرحمان گل کو تاریخوں کی بابت مغالطہ لگ رہا ہو اور ایسا امکان اس صورت میں بڑھ جاتا ہے جب واقعات کو نصف صدی کے بعد یاد کیا جائے۔ ایک اور ممکنہ وضاحت یہ ہو سکتی ہے کہ 3 مارچ کو فسادات شروع ہونے کی تاریخ قرار دے کر انٹرویو دینے والا یہ ثابت کرنا چاہتا ہو کہ ہنگاموں کا آغاز دراصل ہندوؤں اور سکھوں نے کیا تھا۔ ایسی ارادی کوشش خارج از امکان نہیں قرار دی جا سکتی۔ بہر صورت میں نے تینوں مؤثر وضاحتیں یہاں پیش کر دی ہیں۔ ایک بات بہر حال ٹھیک ہے کہ عبدالرحمان نے غلط واقعات نہیں بتائے کیونکہ میں نے کئی ملاقاتوں میں مختلف اوقات میں ہونے والی بات چیت سے اخذ کیا کہ ان کی مین سٹوری ٹھیک قرار دی جا سکتی ہے۔

4 مارچ کو ہنگامے پھوٹ پڑے

بلاشبہ 4 مارچ کی صبح لاہور میں اس جارحانہ اور کشیدہ صورتحال کے ساتھ طلوع ہوئی جس کا لاوا کئی ماہ سے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ 3 مارچ کی شام کو ہونے والے جلسے میں ہندوؤں اور سکھوں نے مشترکہ فیصلہ کیا تھا کہ اگلے روز ہندو اور سکھ طلبا گورنمنٹ کالج کے قریب گول باغ میں جمع ہوں گے اور اپنے مسائل کا اظہار کریں گے۔ گورنر جینکنز نے برطانیہ کے وزیر امور ہند لارڈ پیتھک لارنس کو ایک تار ارسال کیا جس کی ایک کاپی وائسرائے ویول کو بھی بھیجی گئی۔ انہوں نے تار میں لکھا:

> گزشتہ روز 3 مارچ کو لاہور میں مسلمان پرجوش اور خوش تھے۔ غیر مسلم بالخصوص سکھ زیادہ مشتعل تھے اور رات کو غیر مسلموں کا ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں کانگریس اور سکھوں کے لیڈروں نے اشتعال انگیز تقریریں کیں۔
>
> آج 4 مارچ کو یہاں فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات ہوئے۔ صبح کے وقت طلبا جن کی اکثریت ہندوؤں کی تھی کا پولیس سے تصادم ہوا اور بعد ازاں مشتعل طلبا نے پولیس دفتر پر دھاوا بول کر توڑ پھوڑ کی جس سے 30 پولیس اہلکار زخمی ہو گئے اور 2 چل بسے۔ پولیس نے گولی چلا دی جس سے 3 افراد زخمی ہوئے۔ دوپہر کو لاہور شہر میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ ابھی تک 6 پولیس اہلکار ہلاک ہونے کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ 59 زخمی ہوئے جن میں سے 20 کی حالت زیادہ تشویشناک ہے۔ پولیس ابھی تک صورتحال پر قابو پانے میں لگی ہے اور مجھے مکمل حالات کا علم نہیں۔ فوجی دستے بھی تیار حالت میں کھڑے ہیں۔
>
> کانگریس اور سکھ جماعتیں مسلمانوں کی حکومت کے خلاف مزاحمت کر رہی ہیں۔ ابھی تک نواب ممدوٹ نے مخلوط حکومت بنانے میں کوئی پیشرفت نہیں کی اور وہ اب نچلی ذاتوں اور عیسائیوں کے ارکان کو ساتھ ملا کر وزارت بنانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ صورتحال گھمبیر ہے اور بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ تصادم ناگزیر نظر آ رہا ہے۔ میں نے ممدوٹ سے کہا کہ وہ ایوان میں اپنی اکثریت ثابت کریں کیونکہ اس کے بغیر ان کی حکومت زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔ ان حالات کا متبادل دفعہ 93 کا نفاذ ہے جو اگرچہ اطمینان بخش نہیں لیکن پنجابی شاید اسے قبول کر لیں (Carter, 2007a: 55)۔

ویمل ایسار Vimal Issar جو ان دنوں سکول میں جاتی تھیں نے اپنی یادیں سناتے ہوئے بتایا کہ وہ اور ان کی دیگر ہم جماعت لڑکیاں تانگے پر اندرون لاہور سے اپنے سکول میں جاتی تھیں۔ اس روز ہم نے حالات خراب دیکھ کر تانگہ واپس موڑ لیا۔ اسی طرح اقبال سنگھ جو دیال سنگھ کا طالب علم تھا وہ کالج جاتے ہوئے جھڑپوں میں پھنس گیا لیکن پھر کوشش کر کے بحفاظت قلعہ گجر سنگھ میں اپنے گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ امر ناتھ سہگل اس وقت گورنمنٹ کالج کے اندر تھا جب پولیس نے ہندو اور سکھ مظاہرین پر گولی چلائی۔

اگلے روز وائسرائے ویول کے نام ایک ٹیلی گرام میں گورنر جینکنز نے انہیں مطلع کیا کہ لاہور میں رات 10 بجے سے صبح 7 بجے تک کرفیو لگا دیا گیا ہے اور عوامی اجتماعات، جلوسوں اور پانچ سے زائد افراد کے جمع ہونے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ 4 اور 5 مارچ کی راتیں سکون سے گزریں لیکن 5 مارچ کی صبح کو فرقہ وارانہ تشدد ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ لاہور سے کچھ فاصلے پر کاموکی، ضلع گوجرانوالہ میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہجوم نے ٹرین روک کر ایک بوگی کو آگ لگا دی۔ اسی تار میں گورنر نے وائسرائے کو بتایا کہ امر تسر میں 6 اور 7 مارچ کو فسادات کا خطرہ موجود ہے کیونکہ سکھوں نے ہولی اور ''ہولا'' تہوار کے موقع پر جارحانہ مظاہروں کی منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ ملتان سے بھی ایسے واقعات کی خبریں موصول ہو رہی ہیں۔

روزنامہ ٹربیون نے 5 مارچ 1947 کی اشاعت میں ایک روز قبل کے واقعے کی خبر دیتے ہوئے لکھا کہ مسلمانوں کے متوقع اقتدار کے خلاف اقلیتوں کا پہلا مظاہرہ ہوا۔ پولیس نے سات مواقع پر گولی چلائی جبکہ درجن بھر مرتبہ لاٹھی چارج کیا۔ دیانند اینگلو ویدک کالج (D.A.V.) کا سال چہارم کا طالبعلم رتن چند فائرنگ سے ہلاک ہو گیا۔ وہ اس وقت ہاسٹل میں کھڑا تھا۔ شام کو پولیس نے لاجپت رائے ہال کے سامنے سے فائرنگ کی۔ گول باغ میں گولی لگنے سے زخمی ہونے والا ایک اور طالبعلم ہسپتال میں چل بسا۔ 160 افراد زخمی ہوئے جن میں سے 27 کو میو ہسپتال اور گنگارام ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ چوک متی کے قریب ہندوؤں اور سکھوں کے ایک جلوس پر حملہ کیا گیا۔ چنانچہ میدان جنگ لگ گیا اور چاقوؤں اور چھریوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ تقریباً 60 سے 70 افراد زخمی ہوئے جن میں سے چھ ہسپتال میں جا کر چل بسے۔ دو کانسٹیبلوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ شام کو کشیدگی میں کچھ کمی آ گئی کیونکہ ضلع مجسٹریٹ (ڈپٹی کمشنر) مسٹر ایوسٹاس نے اگلے دس روز کے لیے 8 بجے سے صبح 7 بجے تک شہر میں کرفیو نافذ کر دیا۔ مسٹر ایوسٹاس نے نصف شب سے کچھ پہلے اخبار دی ٹربیون کے نمائندے کو بتایا کہ 'صورتحال کنٹرول میں ہے'۔ فوج کو طلب کر کے تیار حالت میں کھڑا کر دیا گیا۔

جسٹس کھوسلہ نے اس ضمن میں ایک اور پہلو پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ 4 مارچ کو صبح 10 بجے طلبا نے انارکلی بازار سے گول باغ کی طرف ریلی شروع کی۔ وہ 'پاکستان مردہ باد' کے نعرے لگا رہے تھے۔ پولیس نے ضلع کچہری کی طرف جانے والے راستے مکمل بند کر رکھے تھے۔ جب مظاہرین کو ضلع کچہری کی طرف نہ جانے دیا گیا تو وہ گورنمنٹ کالج کے سامنے کھڑے ہو گئے اور یہ تاثر دیا کہ وہ ہڑتال کر رہے ہیں۔ کالج کے پرنسپل مسٹر بخاری نے پولیس طلب کر لی جس نے ہجوم پر فائر کھول دیا۔ فائرنگ سے کئی ہلاکتیں ہوئیں۔ غیر مسلموں کے ایک اور گروپ کا دوپہر کے وقت نیشنل گارڈز سے تصادم ہوا۔ اس کے

بعد شہر کے کئی حصوں میں غیر مسلموں کو چھرا گھونپنے کے کئی واقعات ہوئے جس سے باقاعدہ فسادات شروع ہو گئے۔ سوا (سرخ) بازار اور چوک رنگ محل میں ہندوؤں کی کئی دکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ شام تک میو ہسپتال میں غیر مسلموں کے زخمی یا ہلاک ہونے والے 37 افراد لائے گئے (Khosla, 1989: 101)۔

5 مارچ کو گورنر راج کا نفاذ

وائسرائے ویول کے ساتھ مشاورت کے بعد گورنر جینکنز نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کی دفعہ 93 کے تحت صوبے کا انتظام خود سنبھال لیا۔ اس قانون کے تحت ہنگامی حالات میں گورنر راج لگایا جا سکتا تھا۔ یہ گورنر راج 14 اگست تک برطانوی اقتدار ختم ہونے تک نافذ رہا۔ گورنر کی طرف سے مسلم لیگ کو حکومت بنانے سے روکنے پر کافی تنازعہ پایا جاتا ہے۔ گورنر کا موقف یہ تھا کہ مسلم لیگی رہنما نواب ممدوٹ انہیں یہ قائل کرنے میں ناکام رہے کہ ایوان میں ان کو مستحکم اکثریت حاصل تھی۔ ممدوٹ اور جینکنز کے درمیان 5 مارچ کو ہونے والی خط و کتابت کا لہجہ کافی تیز تھا جس میں نواب ممدوٹ گورنر کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کے 80 ارکان تھے۔ چار ارکان شیڈول کاسٹس، ایک یورپی رکن اور دو ہندوستانی رکن بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ جب اسمبلی کا اجلاس شروع ہو گا تو حمایت کرنے والے ارکان کی تعداد 100 تک پہنچ جائے گی۔ جینکنز نے جواب دیا کہ آپ واضح طور پر ثابت کریں کہ آپ کو مطلوبہ تعداد کی ارکان حمایت حاصل ہے اور ان ارکان کے نام تحریری طور پر پیش کریں اور جو ارکان مسلم لیگ کے نہیں تھے ان کی طرف سے تحریری بیان دیا جائے کہ وہ ایوان میں مسلم لیگی امیدوار کو اعتماد کا ووٹ دیں گے (Carter, 2007a: 57) تاہم ممدوٹ مصر رہے کہ ان کے پاس 90 ارکان کی حمایت موجود ہے جو 100 تک بڑھنے کی امید ہے۔ گورنر نے 5 مارچ کو یہ جواب دیا:

> میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایسی کوئی حکومت جو ایوان کا اعتماد نہ رکھتی ہو وہ ہمارے موجودہ مسائل نہیں کر سکتی اور اب یہ آپ (ممدوٹ) پر ہے کہ آپ کو اضافی وقت میں دیگر فریقوں سے مذاکرات کرنا چاہئیں۔ میں یہ بھی مشورہ دینا چاہوں گا کہ آپ اور ہندو اور سکھ رہنماؤں کی طرف سے حالیہ فرقہ وارانہ فسادات کی مذمت میں بیان جاری ہونے سے بھی مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ بالخصوص آپ کی طرف سے بیان کا زیادہ خیر مقدم کیا جائے گا (Carter, 2007a: 238)۔

اس تجویز پر ممدوٹ نے فوری طور پر عمل کیا اور امن کی اپیل کی۔ ان کے بعد میاں افتخار الدین اور ممتاز دولتانہ نے بھی بھیم سین سچر اور سورن سنگھ سے کہا کہ امن کی بنیاد رکھنے کے لیے تمام مذاہب کے نمائندہ ارکان پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی جائے۔ وہ رضامند ہو گئے چنانچہ ان رہنماؤں کی 6 مارچ کو دیوان بہادر ایس پی سنگھا، سپیکر پنجاب اسمبلی اور عیسائی رہنما کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ کمیٹی کے دیگر ارکان میں ماسٹر تارا سنگھ اور ڈاکٹر گوپی چند بھرگاوہ شامل تھے۔ اینگلو انڈین رکن اسمبلی سی ای گبن کو کمیٹی کا ایلچی مقرر کیا گیا تاکہ وہ امرتسر جا کر تارا سنگھ سے ملاقات کریں۔ البتہ پولیس نے انہیں بتایا

کہ امرتسر میں فرقہ وارانہ فسادات کے باعث فی الحال ماسٹر تارا سنگھ سے رابطہ کرنا ممکن نہیں۔ کچھ دنوں بعد ماسٹر تارا سنگھ لاہور آئے اور امن کمیٹی سے ملاقات کی لیکن مسلم لیگ، کانگریس اور سکھوں کے درمیان اختلافات کی خلیج برقرار رہی۔

جینکنز کی طرف سے انہی دنوں وائسرائے ویول کو بھیجے گئے تار میں بتایا گیا کہ حالات اب قابو میں تھے۔ البتہ اکا دکا چھرا گھونپنے کے واقعات ہوتے رہے۔ اس سے پہلے لاہور ایریا کمانڈر نے دوپہر 2 بجے فوج کی دو بٹالین نفری تعینات کر کے حکم دیا کہ امن وامان بحال کیا جائے اور مظاہرین کو غیر مسلح کیا جائے۔ کمانڈر نے رپورٹ دی کہ جیسے ہی فوج نے گشت شروع کیا تو شر پسند سڑکوں سے کھسک گئے۔ کرفیو میں اگلے مسلسل 48 گھنٹے کی توسیع کر دی گئی۔ میں نے جن متعدد ہندوؤں اور سکھوں سے انٹرویو کیے ان میں ایک نکتے پر خاص طور پر روشنی ڈالی گئی کہ مسلمانوں کی اکثریت والی پولیس نے مسلم لیگ کی 34 روزہ احتجاجی تحریک میں تو ایک بھی گولی نہیں چلائی جبکہ لاہور میں غیر مسلم طلبا کے مظاہرے پر پہلے روز ہی گولی چلا دی گئی جس سے کئی نوجوان زخمی اور ہلاک ہوئے۔

بہر حال 5 مارچ کے بعد تشدد اندرون لاہور کے کئی حصوں میں پھیل گیا۔ کناڑی بازار، کیسرا بازار اور رنگ محل میں دکانیں لوٹنے اور جلانے کے کئی واقعات ہوئے۔ جب ہندوؤں نے مزاحمت کی کوشش کی تو ایک سب انسپکٹر پولیس کی نفری کے ساتھ وہاں آیا اور فائرنگ شروع کر دی۔ ایک ہندو نوجوان نے سب انسپکٹر کو روکنے کی کوشش کی تو اس نے فائرنگ کر دی جس سے نوجوان موقع پر ہلاک ہو گیا(Khosla,1989:102)۔ چنانچہ پورے شہر میں کشیدگی پھیل گئی۔ سکول بند ہو گئے اور والدین نے بچوں کو گھروں تک محدود کر دیا۔ سکھوں اور کانگریس کی طرف سے 11 مارچ کو یوم احتجاج منانے کی تیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں کیونکہ حکومت نے ہر قسم کے مظاہروں اور اجتماعات پر پابندی لگا دی تھی۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ تصادم، خونریزی اور پرتشدد واقعات کے باوجود لاہور کا بیشتر علاقہ پرامن ہی رہا۔ کئی علاقوں میں عمائدین نے مل کر اتفاق کیا کہ وہ اپنے علاقے میں تشدد کی اجازت نہیں دیں گے۔ لاہور کے کئی ہندوؤں کی جانب سے یہ اپیل جاری کی گئی:

> ہم زیر دستخطی کوچہ میلا رام اندرون بھاٹی گیٹ کے رہائشی ہندو خضر حیات حکومت کے استعفے کے بعد 4 مارچ سے پیدا ہونے والی صورتحال اور مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں میں سیاسی اختلافات کے نتیجے میں خونریزی اور جلاؤ گھیراؤ کی مذمت کرتے ہیں۔ ہم اپنے مسلمان ہمسایوں کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اقلیت ہونے کے باوجود ہماری حفاظت کی۔ انہوں نے مشکل کے وقت ہمیں درکار تمام سہولیات بھی فراہم کیں۔ امید کرتے ہیں کہ مستقبل میں بھی وہ ایسی ہی مہربانی کا ثبوت دیں گے۔ ہم اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ جن علاقوں میں اکثریت میں ہیں وہاں مسلمانوں کی اسی طرح حفاظت کریں۔ ایسے حسن سلوک سے نہ صرف کمیونٹی کو فائدہ پہنچے گا بلکہ ہندو، مسلم، سکھ اتحاد کو بھی فروغ ملے گا اور ہمارا صوبہ ترقی کرے گا۔
>
> (دستخط) منوہر لال، بنارسی لال، رام رتن آنند، ویشو اسوری، مدن گوپال، جھنڈو رام، سرداری لال چھڈہا، رام لوبایا سوری، مول چند اور دیگر(Pakistan Times, 8 March)۔

مسلم لیگ کے لیڈروں نے ایک بار پھر امن کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یقین دلایا کہ اقلیتوں کا تحفظ ان کے نزدیک مقدم ہے اور مسلمان ان کی حفاظت کریں گے۔ دہلی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی طرف سے پنجاب کی تقسیم سے متعلق سکھوں کے مطالبے کی حمایت کی خبروں پر فطری بات ہے کہ پنجاب کے لیڈروں نے ملاجلا ردعمل ظاہر کیا۔ مسلم لیگ پنجاب نے اسے محض دباؤ کا ہتھکنڈا اور چیلنج سمجھا۔ دوسری طرف کانگریس اور لاہور کے سکھ لیڈروں نے ایک بیان میں پاکستان کے مطالبے کی سخت مخالفت کی۔ ایک مشترکہ بیان میں کہا گیا کہ وہ کسی بھی صورت میں مسلم لیگ کی حکومت کے قیام کی موہوم سی امید کی بھی حمایت نہیں کریں گے اور ہم پاکستان کی کسی بھی شکل یا صورت میں قیام کی مخالفت کرتے ہیں۔ 14 مارچ کو نہرو اور بلدیو سنگھ نے لاہور کا دورہ کیا اور متاثرہ علاقوں میں گئے۔ انہوں نے پنجاب کے دارالحکومت میں بڑھتے تشدد پر تشویش کا اظہار کیا۔

انٹرویوز

بی آر چوپڑہ، ممبئی 4 جنوری 1997

امر ناتھ سہگل، دہلی 20 اکتوبر 1999

نانک سنگھ بروچہ، ممبئی 23 اکتوبر 1999

عزیز مظہر، لندن 19،18 مئی 2002

میاں مقصود احمد، لاہور 3 اپریل 2003

میاں محمد سلیم، لاہور 4 اپریل 2003

عارف کھوکھر، لاہور 4 اپریل 2003

حاجی عبدالرحمان گل، لاہور 30 دسمبر 2004، 29 ستمبر 2005، 15 اکتوبر 2005

حکم قریشی، لاہور 20 مارچ 2005

سید احمد سعید کرمانی، 21 مارچ 2005

وِمل ایسار، دہلی 30 اکتوبر 2005

اقبال سنگھ، دہلی 31 اکتوبر 2005

References

Ahmed, Ishtiaq, *'The 1947 Partition of Punjab: Arguments put Forth before the Punjab Boundary Commission by the Parties Involved'* in Ian Talbot and Gurharpal Singh (eds), *Region and Partition: Bengal, Punjab and the Partition of the Subcontinent*, Karachi: Oxford University Press, (1999).

Daeschsel, Markus, *'De-urbanizing the City: Colonial Congnition and the People of Lahore'* in Talbot, Ian and Thandi, Shinder, *People on the Move: Punjabi Colonialism, and the Post-Colonial Migration*, Karachi: Oxford University Press, (2004).

Gujral, S., *A Brush with Life: An Autobiography*, Delhi: Viking Books, (1997).

Kholsa, G. D., *Stern Reckoning*, Delhi: Oxford University Press, (1989).
Talib, S. G. S., *Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab 1947*, New Delhi: Voice of India, (1991).

Official Documents

Mansergh, N. and Moon, P. (eds.), *The Transfer of Power 1942-47*, Vol. IX, 4 November 1946 to 22 March 1947, London: Her Majesty's Stationery Office, (1980).
Carter, Lionel, (ed), *Punjab Politics, 3 March – 31 May 1947, At the Abyss, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents*, New Delhi: Manohar, (2007a).
Census of India, 1941, Vol. XI, *Punjab*, Simla: Government of India Press, (1941).

Newspapers

The Pakistan Times, Lahore, 1947.
The Tribune, Lahore, 1947.

7

مارچ کے فسادات : امرتسر اور جالندھر

تقسیم سے پہلے امرتسر پنجاب کا دوسرا بڑا شہر اور تجارتی مرکز تھا۔ ایک صدی پہلے امرتسر کی آبادی لاہور سے زیادہ تھی۔ مذہبی نکتہ نظر سے یہ سکھ مذہب کا اہم ترین شہر ہے کیونکہ سکھوں کا مقدس ترین مقام گولڈن ٹیمپل (دربار صاحب) امرتسر میں واقع ہے۔

شہر کے ارد گرد دیہات میں بھی سکھ بڑی تعداد میں آباد تھے۔ ہندو اور سکھ زیادہ تر فصیل کے اندر والے علاقوں میں مکین تھے جبکہ مسلمان زیادہ تر دروازوں کے ارد گرد اور ریلوے لائن کے قریب شریف پورہ جیسے علاقوں میں رہتے تھے۔ اگرچہ ہندو اور سکھ نسبتاً امیر تھے تاہم کاروباری سرگرمیوں میں مسلمان بھی پیچھے نہیں تھے چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شہر میں معاشی توازن مکمل طور پر غیر مسلموں کے حق میں تھا۔ شہر میں ہندو، سکھ اور مسلمان لگ بھگ ایک ہی تناسب میں آباد تھے جبکہ ضلع امرتسر میں مجموعی طور پر مسلمان اقلیت میں تھے۔ یہ لاہور ڈویژن کا واحد ضلع تھا جس میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی۔ لاہور اور امرتسر کے درمیان فاصلہ 48 کلومیٹر ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان تجارتی، زمینی اور ریل کے رابطے کافی فعال تھے۔ مارچ 1947 میں ضلع امرتسر کی ضلعی انتظامیہ کا انچارج انگریز ڈپٹی کمشنر جے ڈی فریزر تھا۔

1941 کی مردم شماری کے تحت آبادی کی تفصیل

امرتسر شہر (بشمول امرتسر بلدیہ اور کنٹونمنٹ)	تعداد	تناسب (%)
تمام مذاہب کی کل آبادی	390,930	100
مسلمان	183,850	47
ہندو بشمول شیڈوسل کاسٹس	58,010	36.80
سکھ	58,769	15
دیگر مذاہب، بشمول عیسائی، بے مذہب، جین، پارسی	4319	1.10
امرتسر ضلع	**تعداد**	**تناسب (%)**
تمام مذاہب کی کل آبادی	1,413,876	100
مسلمان	657,695	46.50
ہندو بشمول شیڈول کاسٹس	216,778	15.30
سکھ	510,845	36.10
دیگر مذاہب، بشمول عیسائی، بے مذہب، جین، پارسی	28,540	2

2مارچ کو خضر حیات حکومت کے خاتمے اور پنجاب اسمبلی کی عمارت کے باہر ماسٹر تاراسنگھ کے کرپان لہرانے کی خبر اسی روز امرتسر پہنچ گئی کیونکہ امرتسر کے کئی رہائشی روزانہ لاہور میں کام کرنے کے بعد واپس جاتے تھے۔ سکھ گزشتہ کئی ہفتوں سے مسلمانوں کو سڑکوں پر مظاہرے کرتے دیکھ کر کافی جذباتی اور کبیدہ خاطر تھے لیکن ماسٹر تاراسنگھ کی طرف سے مسلمانوں کو للکارنے کے بعد صورتحال آتش فشانی بن چکی تھی۔ اب صرف ایک تیلی دکھانے کی دیر تھی اور دونوں فریق آپس میں ٹکرا جاتے۔ ایسا ہی ایک موقع 4مارچ کو آ گیا جب اکالی سکھ ایک تانگے پر بیٹھ کر ڈھول بجاتے امرتسر کے بڑے چوراہوں پر جا رہے تھے۔ خواجہ افتخار کے مطابق (1991: 95) یہ سکھ یہ نعرے لگا رہے تھے۔

جو مانگے پاکستان
اس کو دیں گے قبرستان
نہیں بنے گا پاکستان
بن کے رہے گا سکھستان

جب یہ لوگ شہر کے مرکز ہال بازار کے مقام گول ہٹی پر پہنچے تو انہوں نے ڈھول ایک بار پھر پیٹا جس سے ایک ہجوم ان کے گرد جمع ہو گیا۔ تب ان میں سے ایک سکھ نے مسلمانوں کے خلاف تقریر کی۔ کرپان بنانے کے ماہر دکانداروں نے موقع پر موجود سکھوں میں کرپانیں تقسیم کیں۔ مسلمانوں نے بھی جوابی نعرے لگائے۔

بن کے رہے گا پاکستان
لے کر رہیں گے پاکستان (Ibid: 96)

اس کے نتیجے میں گول ہٹی چوک پر کئی اولین پرتشدد واقعات میں سے ایک رونما ہوا۔ مسلمانوں نے اینٹیں، پتھر اور سوڈا واٹر کی بوتلیں پھینکیں جبکہ سکھوں نے کرپانوں سے حملہ کیا۔ اطلاع پر پولیس پہنچ گئی اور بازار بند کرنے کا حکم دیا۔ یہ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ کسی اور جگہ فوارہ چوک پر سکھوں نے 7مسلمانوں کو قتل کر دیا ہے۔ گولڈن ٹیمپل کے نزدیک ایک مسلمان تانگہ ڈرائیور کو کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ یہ بھی افواہیں پھیل گئیں کہ ہندو انتہاپسندوں نے ایک اور مسلمان کو مار ڈالا۔ ایسی خبروں سے مسلمان میں زبردست اشتعال پھیل گیا۔ چنانچہ معراج دین عرف بھولا، انور منٹو، موس پہلوان، نصیر خان، بشیر پہاڑیا، مولوی حسن، رفیق گوٹیاں والا، جاوا، گوگی اور گامی انتقام لینے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ گویا پورا شہر میدان جنگ بن گیا۔ اینٹوں، چاقوؤں، تلواروں اور سوڈا واٹر والی بوتلوں کا کھلے عام استعمال کیا گیا۔ خواجہ افتخار کے مطابق اس تصادم میں غیر مسلم بھاگ نکلے۔ مسلمانوں کے سورما سکھوں کے ہاتھوں مرنے والے اپنے ہم مذہب افراد کی لاشیں بھی اٹھا کر لے آئے۔ جب وہ واپس آ رہے تھے تو ان کی ایک بار پھر سکھوں اور ہندوؤں سے مڈبھیڑ ہو گئی اور محاذ دوبارہ کھل گیا۔ یہاں مسلمانوں نے اپنے ہم

مذہبوں کے ہلاک وزخمی ہونے کا بھرپور انتقام لیا۔ مرنے والے غیر مسلموں کی لاشیں یا تو کنوؤں میں ڈال دی گئیں یا چھکڑوں پر لاد کر بانج ناتھ ہائی سکول کے قریب ایک نالے میں پھینک دی گئیں(Ibid: 97)۔

مہان سنگھ گیٹ اور چوک فرید پر ہونے والا تصادم

امر تسر اب مسلح مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے جتھوں کا گڑھ بن چکا تھا۔ برج پھلا سنگھ کے اکالیوں جو بندوقوں اور خنجروں سے لیس تھے نے مہان سنگھ گیٹ کے مسلمانوں پر 5مارچ کو حملہ کیا لیکن کٹرہ مہان سنگھ، کچا ڈبگراں اور چیل منڈی کے مسلمانوں نے مل کر انہیں پسپا کر دیا۔ دونوں طرف سے کئی افراد ہلاک اور زخمی ہوئے تاہم افتخار احمد نے دعویٰ کیا کہ سکھوں کا اس لڑائی میں زیادہ نقصان ہوا۔ اگلے روز سکھوں نے فرید چوک کے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مشہور اکالی لیڈر اودھم سنگھ ناگوک اور امر تسر کے مشہور ہندو غنڈے بجلی پہلوان کے بیٹے مدن نے گولڈن ٹیمپل کے مقام سے اس حملے کا آغاز کیا۔ یہ لوگ بندوقوں، نیزوں اور دیگر ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے بھی بھرپور مزاحمت کی گئی اور خواتین بھی اس میں شامل ہو گئیں۔ دونوں طرف ہلاکتیں بھی ہوئیں اور افراد زخمی بھی ہوئے۔ چوک فرید میں لڑائی کے بعد واپس جاتے ہوئے سکھوں اور ہندوؤں نے کٹرہ جمائل سنگھ کے مقام پر مسلمانوں کی کئی دکانوں اور عمارتوں کو آگ لگا دی جس سے لاکھوں روپے کا نقصان ہوا(Iftikhar, 1991: 100-107)۔ یورپی مورخ آئن ٹالبوٹ جنہوں نے کچھ سال قبل امر تسر پر تحقیق کی۔ انہوں نے بڑی تفصیل سے ان پر تشدد واقعات کا احاطہ کیا ہے۔ خواجہ افتخار اور ایک دوسرے مصنف چودھری محمد سعید کا حوالہ دیتے ہوئے آئن ٹالبوٹ نے لکھا کہ 6مارچ کو امر تسر آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو گیا(2004: 83-84)۔

ایس جی پی سی رپورٹ

ایس جی پی سی کی رپورٹ میں واقعات کو کسی اور پہلو سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں دعویٰ کیا گیا کہ امر تسر مسلم لیگ کے رکن مسلمانوں نے 3مارچ کو ایک کمیٹی تشکیل دی جسے زخمیوں کو طبی امداد فراہم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ مسلمانوں نے طویل منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ مسلمان اسلحہ اور پٹرول بھی ذخیرہ کر رہے تھے اور اس کام میں انہیں حکومتی عہدیداروں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ مسلمان سکھوں کے اہم ترین شہر میں ان کے حوصلے پست کرنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پاکستان قائم کرنے کے عظیم تر مقصد کے خلاف مزاحمت کو کمزور کرنے کا مقصد بزور طاقت حاصل ہو جاتا۔ رپورٹ میں الزام لگایا گیا کہ مسلم لیگ نے 4مارچ کو حملے کی تیاری مکمل کر لی اور اگلے روز 5مارچ کو کارروائیاں کرنے کی تاریخ مقرر کی گئی۔ رپورٹ میں یہ الزام لگایا گیا کہ اس روز تین یا چار سکھ شرومنی اکالی دل کی طرف سے مسلم لیگ کے پاکستان بنانے کے فیصلے پر غور کے لیے جلسہ عام کا اعلان کر رہے تھے کہ چوک مونی پر مسلمانوں نے ڈنڈوں سے حملہ کر دیا جس سے ایک شخص بھائی منگل سنگھ ہلاک ہو گیا(1991: 144-6)۔ رپورٹ کے مطابق ہزاروں مسلمانوں نے پورے شہر میں چھوٹے چھوٹے گروپ بنانا شروع کر دیے تھے اور شہر میں داخلے کے تمام راستے بند کر دیے۔

4 بجے شام کو ہندوؤں اور سکھوں کو کسی وجہ کے بغیر نشانہ بنایا گیا اور مرکزی تجارتی علاقے ہال بازار میں کئی کو ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ہر طرف لوٹ مار شروع کر دی۔ کوتوالی پولیس سٹیشن قریب ہونے کے باوجود پولیس خاموش تماشائی بنی رہی۔ اس کے بعد 5 بجے فیکٹریوں میں کام کر کے باہر آنے والے کئی سکھ مزدوروں کو قتل کر دیا گیا۔ یوں مردہ خانے میں 18 لاشیں بھیجی گئیں جو اس سے پہلے والی لاشوں کے علاوہ تھیں۔ کئی لاشیں یا تو جلادی گئیں یا کنوؤں اور گندے جوہڑوں میں پھینک دی گئیں (Ibid: 147-8)۔

ایس.جی.پی.سی رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ امرتسر میں ہندو اور سکھ آبادی عین شہر کے وسط میں تھی جبکہ ان کے ارد گرد ایک دائرے میں مسلمانوں کے محلے تھے۔ چنانچہ جب گڑبڑ شروع ہوئی تو مسلمانوں کو گھیرے میں آئے ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کرنے میں کافی برتری حاصل رہی۔ اس کے علاوہ حملہ آوروں میں سے کئی افراد نے مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے یونیفارم اور سٹیل کے ہیلمٹ پہنے ہوئے تھے اور یہ کہ امرتسر میں مسلمانوں کے ڈاکٹروں اور دیگر طبی عملے نے غیر مسلم زخمیوں کا علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ٹرین پر حملہ

ان دنوں امرتسر کے نواحی علاقے اور مسلمان آبادی شریف پورہ کے پاس آنے والی ایک ٹرین پر بہیمانہ حملہ کیا گیا جس میں ہندوؤں اور سکھوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ یہ مارچ کے اوائل میں امرتسر میں فرقہ وارانہ تشدد کا ایک اور واقعہ تھا۔ میں نے اس واقعے کے بارے میں امرتسر اور لاہور کے کئی افراد سے بات کی۔ انہوں نے یاد کرتے ہوئے بتایا کہ واقعہ شریف پورہ میں ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے آنے والے دنوں میں تصادم میں زبردست شدت آئی۔ البتہ حیران کن طور پر سرکاری دستاویزات بالخصوص گورنر اور چیف سیکرٹری کی رپورٹ میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ایس.جی.پی.سی رپورٹ میں ٹرین حملے کی تاریخ 6 مارچ دی گئی ہے اور الزام لگایا گیا کہ مسلمانوں نے نہ صرف ہندو اور سکھ مردوں بلکہ بچوں اور عورتوں کو بھی ہلاک کیا۔ (صفحہ 151)، جسٹس کھوسلہ (صفحہ 102) اور لاہور کے اخبار ٹریبون (8 مارچ 1947) نے بھی واقعے کی تاریخ 6 مارچ بتائی۔

خواجہ افتخار نے اپنی کتاب 'جب امرتسر جل رہا تھا' میں ٹرین پر حملے کے واقعے کو کچھ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ حملہ دراصل 6 اور 7 مارچ کو چوک پراگ داس پر مسلمانوں کے قتل عام کا انتقام تھا لیکن جب خواجہ افتخار یہ واقعے بیان کرتے ہیں تو اسے چوک پراگ داس کے واقعے کا شاخسانہ قرار نہیں دیتے بلکہ ایک اور واقعے کا ذکر کرتے ہیں (Iftikhar,1991:110)۔ وہ بتاتے ہیں کہ شریف پورہ کے مسلمان اپنے محلے کے تحفظ کے لیے ریلوے لائن کے پاس عسکری تربیت کی مشق کرتے تھے۔ جب اس روز ڈیرہ بابا نانک سے ٹرین شریف پورہ پہنچی تو اس کے اوپر سوار شخص حمید نے ایمرجنسی لیور کھینچ کر ٹرین کو کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے ٹرین کے اوپر سے چلا کر شریف پورہ میں کھڑے مسلمانوں سے کہا کہ ان بوگیوں میں کچھ ایسے ہندو اور سکھ بھی بیٹھے ہیں جنہوں نے ڈیرہ بابا نانک سٹیشن پر مسلمانوں پر مظالم ڈھائے۔ یہ سن کر کئی نوجوان ٹرین پر چڑھ گئے۔ ایک نے ڈرائیور کو چھرا گھونپ دیا جبکہ دیگر نے ڈیرہ بابا نانک سٹیشن کے بدمعاشوں کو جا لیا۔ البتہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق عورتوں اور بچوں کو کچھ نہ کہا گیا (1991: 135-6)۔

میں نے ڈیرہ بابا نانک پر مسلمانوں پر مبینہ حملے کے واقعے کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کی لیکن مجھے کسی دستاویز یا کسی انٹرویو دینے والے سے اس بارے میں کچھ بھی نہیں پتہ چلا۔ چنانچہ مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں دیکھیں تو یہ خلاصہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ واقعہ چوک پراگ درس کے تصادم کا ردعمل تھا اور 6 مارچ کو وقوع پذیر ہوا۔ یہ ممکن ہے کہ افتخار خواجہ کو تاریخوں کا کوئی مغالطہ ہوا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس تشدد کا الزام ہندوؤں اور سکھوں پر لگانے کے لیے انہیں ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہو۔

چوک پراگ داس پر مسلمانوں کا قتل عام

امرتسر کی بگڑتی صورتحال کو مزید تیز کرنے میں چوک پراگ داس میں مسلمانوں پر تشدد کے واقعے کا بڑا ہاتھ تھا۔ خواجہ افتخار نے لکھا کہ 5 مارچ کو ایم اے او کالج (امرتسر) میں مسلم لیگ کے کرتا دھرتا شیخ صادق حسن کی صدارت میں مسلمان عمائدین کا اجلاس ہوا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوؤں یا سکھوں کی اکثریت والے علاقے میں مقیم مسلمانوں کو محفوظ مقامات پر منتقل کر دیا جائے۔ کئی خاندانوں نے اس فیصلے پر عمل کرتے ہوئے شریف پورہ میں سکونت اختیار کرلی۔ ان میں وہ بھی لوگ شامل تھے جو پہلے پراگ داس اور چوک مناسنگھ میں رہتے تھے جو ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں میں گھرے ہوئے تھے۔ البتہ امام مسجد مولوی محمد یوسف اور بعض دیگر افراد نے علاقہ چھوڑنے سے انکار کر دیا اور سکھوں اور ہندوؤں سے معاہدہ کیا کہ امن قائم رکھا جائے گا۔ یہ لوگ قوم پرست تھے اور مجلس احرار سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے غیر مسلموں سے اچھے تعلقات تھے (1991:105-6)۔

خواجہ افتخار الزام لگاتے ہیں کہ امام مسجد اور دیگر افراد کا اعتماد دو سکھوں مہندر سنگھ اور دھیان سنگھ نے توڑا جو مقامی امن کمیٹی کے رکن تھے۔ وہ مسلمانوں کو اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ اپنے ہتھیار ان کے حوالے کر دیں۔ ان سکھوں نے ان مسلمان گھرانوں کی بھی تلاشی لی جو ان کے نزدیک ناقابل اعتماد تھے۔ چنانچہ چوک پراگ داس کے مسلمان نہتے ہو گئے اور اپنا دفاع کرنے کے قابل نہ رہے۔ اس کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے ایک اجلاس میں گزشتہ دو یوم کے واقعات کا جائزہ لیا۔ بعض افراد نے تاریخی حوالے دیتے ہوئے ماضی میں مسلمانوں کے مظالم کا ذکر کیا جس سے ہجوم میں اشتعال انگیز جذبات پھیل گئے۔ 7 مارچ کی علی الصبح سکھوں اور ہندوؤں جن میں سابق فوجی اور خود مختار ریاستوں سے آنے والے رضاکار شامل تھے نے چوک پراگ داس میں مسلمانوں پر پوری شدت سے حملہ کر دیا۔ (Iftikhar,1991: 110)۔ بندوقوں، چاقوؤں، بھالوں اور کرپانوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ کئی مسلمانوں کو چھرے گھونپ کر ہلاک کر دیا گیا جبکہ بعض دیگر کو زندہ جلا دیا گیا حتیٰ کہ بوڑھوں اور خواتین کو بھی نہ بخشا گیا۔ کئی مسلمان خواتین کو برہنہ سڑکوں پر گھمایا گیا اور پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ کئی عورتوں نے خود کو سکھوں کے حوالے کرنے کی بجائے اپنی زندگی خود ختم کر لی۔ چوک مناسنگھ کے رہائشی مسلمانوں سے بھی ایسے ظالمانہ طریقے سے نمٹا گیا۔ مجموعی طور پر مختلف قبرستانوں میں مثلہ شدہ لاشیں دفن کی گئیں (Ibid: 120)۔

انسان دوستی کی چند مثالیں

البتہ خواجہ افتخار کے مطابق کچھ غیر مسلموں نے انسانیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کئی مسلمانوں کی جانیں بھی بچائیں۔ ان میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کارکن باوا گھنشام سنگھ بھی شامل تھا۔ اس نے سینکڑوں مسلمانوں کو اپنے گھر میں چھپا کر ان کی جانیں بچائیں (Ibid: 118-9)۔ ایک اور بے بے ڈاکٹرنی تھی جس نے کئی مسلمانوں کو بچایا۔ اگرچہ خواجہ افتخار نے ہسپتالوں میں غیر مسلم طبی عملے کی بے حسی اور تعصب کا ذکر کیا ہے تاہم انہوں نے دو ڈاکٹر بھائیوں پروشوتم دت اور نارائن داس کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ دونوں نے بندوقیں اٹھا کر ہسپتال میں داخل زخمی مسلمانوں پر حملہ کرنے والوں کو روکا۔ ڈاکٹر پروشوتم دت نے شرپسندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> تمہارا رویہ انتہائی بزدلانہ ہے۔ مذہبی نفرت اور سیاسی رنجش نے تمہیں پاگل بنا دیا ہے۔ تم بھول چکے ہو کہ دنیا میں انسانیت نام کی بھی کوئی چیز ہے۔ تم نے خود کو اتنا نیچے گرا لیا ہے کہ تمہاری مردانگی تمہیں زخمیوں اور لاچار افراد پر حملہ کرنے سے بھی نہیں روک رہی۔ تمہیں اس شرمناک رویے پر شرم آنی چاہیے۔ ایک دن تم لوگ اس حرکت پر پچھتاؤ گے لیکن انسانیت تمہیں معاف نہیں کرے گی۔ تم اب بھی نادم ہو سکتے ہو اور واپس لوٹ جاؤ۔ بصورت دیگر جب تک ہم دونوں بھائی زندہ ہیں اور ہماری بندوقوں میں گولیاں ہیں ہم تمہیں ہسپتال میں زخمیوں کے قریب نہیں جانے دیں گے (1991: 140-1)۔

خواجہ افتخار لکھتے ہیں کہ ہاتھی گیٹ میں مسلمانوں کے ہتھے چڑھنے والی دو سکھ لڑکیوں کو امرتسر مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری میر انور سعید نے بچایا۔ امرتسر کی انتظامیہ اتنے بڑے پیمانے پر فسادات پھوٹ پڑنے پر سخت پریشان تھی چنانچہ اگلے روز تمام عقائد کے سرکردہ رہنماؤں کو صورتحال پر غور کے لیے جمع کیا گیا۔

ایک اور داستان مسلمان ڈاکٹر عبدالرؤف سے متعلق ہے۔ وہ کٹڑا کرم سنگھ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی طرح غیر مسلم زخمیوں کے علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ خواجہ افتخار لکھتے ہیں کہ:

> ڈاکٹر صاحب نے علاقے کے مسلمانوں کو عسکری تربیت دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کا گھر مقامی "مجاہدین" کا مرکز تھا۔ ایک دن مجاہدین نے ان کے گھر کے سامنے 200 کے لگ بھگ غیر مسلموں کو گھیر لیا۔ اس موقع پر حملے میں یہ بحث چھڑ گئی کہ قیدی بننے والوں سے کیسا سلوک کیا جائے۔ چنانچہ یہ معاملہ ڈاکٹر صاحب کے نوٹس میں لایا گیا۔ انہوں نے فیصلہ سنایا کہ ان کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ ان کے پاس موجود اور کسی سامان کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ خواتین اور بچوں کو ہرگز ہراساں نہ کیا جائے، مجاہدین نے اصرار کیا کہ قیدیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جائے اور انہیں خوبصورت خواتین کی بے حرمتی کرنے کی اجازت دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے زور دیا کہ آپ مثالی اسلامی اخلاقیات اور بڑے پن کا مظاہرہ کریں چنانچہ مجاہدین کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور انہوں نے غیر مسلموں کو کوئی گزند نہ پہنچایا (1991: 141-2)۔

ماسٹر تارا سنگھ قاتلانہ حملے میں بچ نکلا

خواجہ افتخار نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ میر انور سعید ایک میٹنگ میں دو لڑکیوں کو لے کر آئے جہاں ان کا والد ٹھاکر گیان سنگھ بھی موجود تھا۔ وہ اپنی بچیوں کو زندہ دیکھ کر حیران ہوا اور میر سعید کا شکریہ ادا کیا تاہم ٹھیک اس وقت ماسٹر تارا سنگھ وہاں آئے اور صورتحال کو ایکسپلائٹ کرنے کی کوشش کی تاہم لڑکیوں نے واضح کیا کہ مسلمانوں نے ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی۔ اسی وقت کئی مسلمان لیڈر بھی وہاں آ گئے اور سیر حاصل بحث کی گئی جس میں دونوں اطراف سے اغوا کی گئی خواتین کی واپسی پر بات چیت ہوئی۔

جب اجلاس ختم ہوا اور ماسٹر تارا سنگھ رخصتی کی تیاری کر رہے تھے تو عبداللہ خان نے میر انور سعید کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ ماسٹر تارا سنگھ کو کسی طرح اس کی کار پر لفٹ لینے پر رضامند کریں لیکن گھی کے تاجر مدھی گھی والا نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ وہ کسی بھی حالات میں اپنے 'پیارے لیڈر' کو مسلمانوں کا مرہون منت نہیں ہونے دے گا۔ یوں عبداللہ خان کا منصوبہ ناکام ہو گیا ورنہ خواجہ افتخار کے بقول "مسلمانوں کا سرخیل قاتل اس روز جہنم واصل ہو جاتا" (Ibid:122)۔

ایسے سازشی اقدامات پر خواجہ افتخار کوئی تبصرہ نہیں کرتے اور ان کی پوری کتاب ہولناک واقعات سے بھری ہے جن میں مسلمانوں کے بے رحمانہ رویوں کی ہلکے پھلکے تفریحی انداز میں تفصیل بتائی گئی ہے۔ انہوں نے اس بات کی بھی مذمت کی کہ فسادات کے فوراً بعد جواہر لال نہرو نے امرتسر کا دورہ کیا اور اظہار ہمدردی کرنے کی بجائے یہ کہا کہ چوک پراگ داس پر ہونے والے انسانیت سوز واقعات کے ذمہ دار تمام فریق ہیں۔ انہوں نے امرتسر کی انتظامیہ پر تنقید کی کہ اس نے جانبدار اور متعصب ملازمین کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی (Ibid: 144-46)۔

ایس جی پی سی رپورٹ میں چوک پراگ داس کا بالواسطہ ذکر

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ایس جی پی سی رپورٹ میں مسلمانوں کے مظالم کا تو بڑھا چڑھا کر ذکر کیا گیا ہے لیکن مسلمانوں پر ہونے والے حملوں کے واقعات کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں چوک پراگ داس کے واقعات کا یوں ذکر کیا گیا ہے:

> حملے کے پہلے روز مشتعل سکھوں نے کئی مسلمانوں کو اس علاقے میں ہلاک کیا جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے علاقے کے سنگم پر واقع تھا اور سکھوں کے زیر اثر علاقے سے زیادہ دور نہیں۔ ایک سو سے زیادہ ایسے مسلم خواتین اور بچوں جن کے مرد یا تو مارے گئے یا جان بچانے کے لیے فرار ہو گئے تھے کو سکھوں نے دو تین روز تک اپنی مہمانداری میں رکھا کیونکہ لڑائی 2، 3 روز تک جاری رہی اور ہر قسم کے رابطے منقطع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد انہیں سکیورٹی کے ساتھ پولیس سٹیشن بھجوا دیا گیا۔ خواتین نے سکھوں کی بہادری اور حسن سلوک کی تعریف کی (1991:156)۔

اس فقرے میں 'حملے کا پہلا دن' کہا گیا ہے جس سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ ایس جی پی سی کی رپورٹ میں سکھوں اور ہندوؤں کے مسلمانوں پر پہلے حملے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مارچ کے فسادات کے عینی شاہدین کے تاثرات

پروفیسر وی این دت

"جب تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کے باہر کرپان لہرائی تو اس وقت میں گورنمنٹ کالج کے نئے ہاسٹل میں مقیم تھا۔ میرے مسلمان دوستوں نے مجھے بتایا کہ اب مسئلہ ضرور پیدا ہو گا۔ مزنگ کے علاقے میں ایک شخص مارا گیا۔ کسی نے اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا تھا میں پروفیسر سراج الدین کے پاس گیا جن کے والد کے امرتسر میں ہمارے خاندان کے ساتھ قریبی تعلقات تھے، وہ بستر پر لیٹے تھے اور ایک پٹھان ساتھ کھڑا تھا۔ انہوں نے میرے آنے کا مقصد پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ اخبار 'دی ٹربیون' نے رپورٹ دی ہے کہ ہال بازار اور متصل علاقوں میں دفعہ 144 نافذ کر دی گئی ہے اور میں وہاں جانا چاہتا ہوں کیونکہ ہمارا گھر ہال بازار (امرتسر) کے بالکل قریب تھا۔ میں نے پوچھا کہ اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ انہوں نے کچھ لمحوں کے لیے توقف کیا اور پھر بولے 'ہم سکھوں کی بد سلوکی کو معاف نہیں کریں گے۔ ویشوا جب میں نے تمہیں دیکھا تو (تمہارے ہندو ہونے کی بنا پر) مجھے سخت غصہ چڑھ گیا۔ اپنی زندگی خطرے میں ڈالنی ہے تو چلے جاؤ۔'

"قریب کھڑے پٹھان کی آنکھیں نفرت اور حقارت سے بھری ہوئی تھیں جس سے میرے رگ و پے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ میں ناکام و مراد لوٹ آیا۔ میں اپنے مسلمان دوست یعقوب کے پاس گیا تو وہ مجھے سٹوڈنٹس فیڈریشن والوں کے پاس لے گیا جنہوں نے مجھے ریڈ کراس کا ایک بیج دیا۔ میں نے وہ بیج چھاتی پر لگایا اور 9:15 بجے صبح چلنے والی فرنیٹئر میل پکڑنے کے لیے ریلوے سٹیشن چلا گیا۔ میں امرتسر گیا تو پتہ چلا کہ ہمارے ہمسائے کا گھر جلا دیا گیا تھا اور میرے والد کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ میری ملاقات ایک وکیل گیان چند کپور سے ہوئی۔ جس نے مجھے بتایا کہ والد صاحب محفوظ تھے۔ میں اپنی بہن کے گھر گیا تو والد وہیں ملے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جوتوں کا دکاندار مسلمان بابو چھت سے چھپ چھپا کر ہمارے گھر آیا اور خبردار کیا کہ آپ کی زندگی خطرے میں ہیں۔ اس لیے بہتر ہو گا آپ یہاں سے نکل جائیں لیکن والد نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ایم اے او کالج کے پرنسپل دلدار حسین آئے۔ وہ میرے والد کے قریبی دوست تھے۔ انہوں نے کہا، 'خدارا یہاں سے چلے جاؤ ورنہ مسلمان غنڈے منٹو اور مٹو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔' ہندوؤں کی طرف سے بجلی پہلوان غنڈوں کا سرخیل تھا۔ پھر میری بہن جو مجیٹھا روڈ پر رہتی تھی نے اپنے شوہر کو بھیجا کہ وہ والد صاحب کو جا کر لے آئے۔ اس کے علاوہ ایس پی رائے بہادر بدری ناتھ نے کچھ پولیس اہلکار بھی بھیج دیے۔ کٹرا شیر سنگھ اور ہال بازار کے علاقے متاثر ہوئے۔ بعض ممتاز وکیل اسی جگہ رہتے تھے۔ میرے والد کا کاروبار ہال روڈ پر تھا۔"

رپودامان سنگھ Ripudamman Singh

"امرتسر میں گڑبڑ 4 مارچ کو شروع ہوئی جب کچھ سکھ ڈھول بجا کر پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ اسی روز کچھ ہلاکتیں بھی ہوئی تھیں اور پورے شہر میں خوف و ہراس تھا۔ ہر گزرتے وقت کے ساتھ کشیدگی بڑھ رہی تھی اور ہر طرف سے قتل اور خون خرابے کی اطلاعات آ رہی تھیں۔ دونوں اطراف سے بربریت کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ البتہ میں چوک پراگ داس کے

سانحے کا عینی شاہد ہوں۔ یہ بات سچ ہے کہ مسلمانوں کا بوڑھوں، خواتین اور بچوں کی تمیز کیے بغیر قتل عام کیا گیا۔ بدنام اکالی لیڈر اودھم سنگھ ناگوک اور ہندو جرائم پیشہ گروہ ان مظالم میں پیش پیش تھے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ امرتسر تمام مذاہب کے جرائم پیشہ گروہوں کا گڑھ تھا۔ ماضی میں یہ لوگ تصادم سے بچنے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان لوگوں کے درمیان شہر کے مختلف علاقوں پر کنٹرول کی دشمنی موجود تھی چنانچہ جیسے ہی یہ لوگ اپنے ہم مذہب افراد کے تحفظ کے لیے متحرک ہوئے تو مخالف گروپ کے علاقے میں ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے۔ انہوں نے 'دشمن' کے قطعاً بے گناہ اور کمزور افراد کو چن چن کر نشانہ بنایا۔ میں نے 5 اور 6 مارچ کو ہندوؤں اور سکھوں کی مسخ شدہ لاشیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ البتہ چوک پراگ داس میں مسلمانوں پر حملہ قطعی غیر متناسب تھا۔ یہ حقیقی معنوں میں خون کا غسل تھا۔ اس کی منصوبہ بندی بڑی تفصیل سے کی گئی تھی۔ مجھے یقین نہیں لیکن میں نے سنا ضرور ہے کہ چوک پراگ داس پر حملے میں بعض خود مختار سکھ ریاستوں کے باقاعدہ فوجی بھی ملوث تھے۔

"اکالیوں نے کسی مسلمان لڑکی یا خاتون کو نہیں بچایا بلکہ ان کے پورے آپریشن میں لڑکیاں اور خواتین اولین نشانہ تھیں۔ یہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رہنما باوا گھنشام سنگھ تھے جنہوں نے کئی مسلمان خواتین اور بچوں کی جان بچائی۔ صرف ایک گلی میں 300 مسلمانوں کو بچایا گیا۔ میں ان دنوں لڑکا تھا۔ چوک پراگ داس کے واقعات مجھے ذہنی طور پر مفلوج بنانے کا باعث بنے کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے انسانیت کی بدترین طریقوں سے تذلیل ہوتے دیکھی۔ کئی ماہ تک یہ مناظر میری آنکھوں میں رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے مارکس ازم کے سیکولر نظریات میں روحانی پناہ حاصل کی۔ میں نے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ کسی بھی حالات میں بے گناہ انسانوں کو جان سے مارنے سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

"میں آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ سردار پٹیل کی طرف سے خفیہ فنڈ سے امرتسر میں بم بنانے والی فیکٹریاں بھی قائم ہو چکی تھیں۔ مجھے یہ تو یقین نہیں کہ اس کام میں کانگریس کے دیگر لیڈر بھی شامل ہوں گے لیکن سردار پٹیل کسی شک و شبے کے بغیر اس میں ملوث تھے۔"

دیوی داس مانگٹ

"چوک پراگ داس میں مسلمانوں پر حملہ دراصل ان کارروائیوں کا جواب تھا جو مسلمان 4 مارچ سے کر رہے تھے۔ ان میں سے بدترین واقعہ امرتسر سٹیشن پر ٹرین پر حملہ تھا۔ مسلمان عسکریت پسندوں نے ٹرین میں ان مردوں، خواتین اور بچوں تک کو نہ چھوڑا جو محض عام مسافر تھے۔ جب یہ خبریں ہم تک پہنچیں تو نوجوان ہندوؤں اور سکھوں کے غم و غصے کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ہمارے بڑوں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا ہاتھ اگر اب بھی نہ روکا گیا تو ان کے مظالم میں کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے۔ مسلمان بڑے جارحانہ موڈ میں تھے۔ مجھے مہندر سنگھ اور دھیان سنگھ کی طرف سے قوم پرست مسلمان کے ساتھ کیے گئے ان کو تصادم سے مستثنیٰ قرار دینے کے کسی معاہدے کی خلاف ورزی کا تو علم نہیں۔ لیکن بہر حال یہ ایک غیر متوازن لڑائی تھی۔ وہ مسلمان جو اپنے محلوں میں ہی رہے وہ آسان ہدف ثابت ہوئے۔ میں بوڑھوں، خواتین اور بچوں سے کیے جانے والے برے سلوک پر شرمسار ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے بڑوں کو چاچا یا چاچی کہتے تھے اور ان کے بچے بھی ہمارے بڑوں کو ایسے

ہی مخاطب کرتے تھے۔ مجموعی طور پر امر تسر کے باسیوں میں بھائی چارے کی فضا پائی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ غنڈے بدمعاش بھی بڑوں کی عزت کرتے اور خواتین سے زیادتی پر وہ خود بھی ملزم کو کڑی سزا دیتے تھے لیکن جب فرقہ وارانہ جنگ چھڑ گئی تو پھر انسانیت حیوانیت میں بدل گئی۔"

موہن سنگھ راہی

"مسئلہ 4 مارچ 1947 کو شروع ہوا جب سکھوں کی ایک ٹولی ڈھول بجاتے پاکستان کے مطالبے کی مخالفت میں نعرے لگا رہی تھی۔ 6 مارچ کو ہولی تھی۔ جس وقت ہندو اور سکھ تہوار منانے کی تیاریاں کر رہے تھے تو مسلمانوں نے ریلوے ورکشاپ کے سکھ ورکروں پر حملہ کر کے ان میں سے بعض کو قتل کر ڈالا۔ ایک ٹرین پر بھی حملہ ہوا جس میں امر تسری مسلمانوں نے بے رحمی کے ساتھ بے گناہ ہندوؤں اور سکھوں کو ہلاک کر دیا۔ بعد میں مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کی عمارتوں کو آگ لگا دی۔ چوک پراگ داس پر کچھ ہندوؤں نے مسلمانوں کو نشانہ بنایا۔ ایک روز قبل مسلمانوں نے راہگیر ہندوؤں اور سکھوں پر لوٹے پھینکے۔ جبکہ سکھوں نے مسلمانوں پر کرپانوں کے ساتھ حملہ کیا اور حقیقتاً پراگ داس چوک کے مسلمانوں کے ساتھ بربریت کا مظاہرہ کیا گیا۔"

گورچرن داس اروڑہ

"مسلم لیگ پورے پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کو مٹانے کے درپے تھی لیکن امر تسر میں اسے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ سچ ہے کہ جارحیت کا آغاز 4 مارچ کو اس وقت ہوا جب پرجوش سکھ ڈھول بجاتے لوگوں کو مسلم لیگ کے خلاف منظم ہونے کی دعوت دے رہے تھے۔ لیکن یہ دراصل ردعمل تھا اور اس کی مسلمانوں کو توقع رکھنی چاہیے تھی۔ 1946 کے انتخابات میں غیر متوقع کامیابی کے بعد مسلم لیگ کی قیادت لاہور اور امر تسر کے درمیان مسلسل آتی جاتی تھی۔ صورتحال خراب کرنے کے ذمہ دار یہی مسلم لیگی لیڈر تھے۔ چوک پراگ داس پر حملہ اس وقت کیا گیا جب مسلمانوں نے امر تسر کے نواح میں ٹرین روک کر سکھوں اور ہندوؤں کو بے دریغ ذبح کیا۔ مسلمان بدمعاشوں نے بے رحمی کے ساتھ معصوم افراد کا قتل عام کیا۔ اگرچہ بعد میں انہیں اس کی بھاری قیمت چکانا پڑی لیکن بہر حال مارچ میں مقابلہ برابر ہی رہا۔"

افتار سنگھ جج

"میں پیدا تو امر تسر میں ہوا لیکن میں نے تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ امر تسر میں ہمارا گھر محلہ پراگ داس میں تھا۔ یہ گھر امیر کشمیری مسلمانوں جنہیں لاکھڑا کہتے تھے کی رہائشگاہ کے قریب تھا۔ ان لوگوں نے کشمیری شال کے کاروبار میں کافی پیسہ بنایا تھا۔ بعض امر تسری مسلمان بہت امیر تھے۔ فسادی لاکھڑوں (مراد لکھ پتی) کے گھروں کو آگ لگانے آئے تو میرے دادا جو انتہائی مذہبی انسان تھے نے شرپسندوں کے سامنے احتجاج کیا اور کہا، 'اگر تم نے کشمیریوں کے گھر جلانے ہیں تو

میرا مکان بھی جلا دو۔ لہٰذا تم لوگ باز رہو اور انہیں جانے دو۔' اس کے بعد شر پسند دوبارہ کلہاڑیوں، نیزوں اور خنجروں کے ساتھ مسلح ہو کر آئے لیکن میرے چچا سوجان سنگھ ان مسلمانوں کو اپنے گھر لے آئے۔ اس طرح کشمیریوں کے گھر تو تباہ کر دیے گئے لیکن ان کی جانیں بچ گئیں۔"

خواجہ افتخار کی کتاب 'جب امرتسر جل رہا تھا' زیادہ تر ان مسلمانوں کے تاثرات پر مشتمل ہے جو امرتسر سے لاہور پاکستان کے دیگر علاقوں میں آباد ہوئے تھے۔ یوں اسے ایک لحاظ سے مسلم لیگ نواز نکتہ نظر کہا جا سکتا ہے۔ میں نے اس کتاب میں موجود کئی افراد سے بات چیت کی ہے۔ وہ لوگ افتخار کے بیان کردہ واقعات کی نوعیت سے متفق تھے۔ ان کے واقعات کی کچھ تفصیلات زیادہ اہم نہیں اور مخصوص واقعات کی تفصیل بتاتے ہیں۔

نیچے میں نے دو مزید انٹرویو دیے ہیں۔ پہلا انٹرویو احرار پارٹی کے کارکن کا ہے جسے پاکستان کے قیام سے چنداں ہمدردی نہیں تھی جبکہ دوسرا غیر سیاسی مسلمان تھا۔

قمر یورش

"یہ بات سچ ہے کہ سکھوں نے 4 مارچ کو اشتعال انگیزی کا آغاز کیا لیکن در حقیقت اشتعال انگیزی مسلم لیگ کی طرف سے طویل عرصے سے جاری تھی جس نے سیاسی مہم میں مسلمان غنڈوں کو گھسیڑ دیا تھا۔ جنوری میں غیر مسلموں کے خلاف جارحیت اور ہر گزرتے دن کے ساتھ رونما ہوتے دیگر پر تشدد واقعات سے غیر مسلم خوف کا شکار تھے۔ ہمارا گھر غیر مسلم آبادی کی اکثریت والے علاقے میں تھا لیکن ہمیں ایک بھی بار ڈرایا دھمکایا نہیں گیا۔ 4 مارچ کے بعد عظیم پرانا امرتسر جو استعماریت مخالف جذبات کی زبردست روایات کا امین تھا وہ زبردست فرقہ وارانہ محاذ میں تبدیل ہو گیا۔ مارچ کے شروع کے ایام میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا قتل عام دراصل کئی ماہ پہلے سے جاری مسلم لیگ کی اشتعال انگیزی کا نتیجہ تھا۔ لاہور کے مسلم لیگی لیڈر آئے روز امرتسر آتے اور وہاں کے مسلمانوں کو ایک ہی پیغام دیتے کہ: ہندوؤں اور سکھوں کو چیلنج کرو اور انہیں شکست دو۔"

شیخ عبدالوہاب

"ہم ایسے علاقے میں مقیم تھے جہاں سب عقائد کے لوگ رہتے تھے۔ وہاں کے بڑوں نے اس بات کا عہد کیا کہ حالات کچھ بھی ہوں وہ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوں گے اور باہر سے آنے والوں کو اپنے علاقے میں گڑبڑ نہیں کرنے دیں گے۔ مارچ کے فسادات کے دوران تمام فریقوں سے تعلق رکھنے والے بدمعاشوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ لوگ زیادہ تر بے گناہ افراد کو نشانہ بناتے تھے۔ متاثرہ افراد میں سے بعض قریبی دیہات کے مزدور ہوتے تھے جنہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا ایک عیسائی دوست آرتھر ہوتا تھا جو تقریباً ہر روز مجھ سے ملنے آتا تھا۔ اسے جرائم پیشہ مسلمانوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا حالانکہ وہ بے چارہ کہتا رہا کہ وہ عیسائی ہے لیکن اس کی کسی نے نہ سنی۔ دونوں طرف (ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں) سے بہادری کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا۔ ہمارے محلے میں کسی کا قتل نہیں ہوا اور آرتھر کو اس گلی میں مارا گیا جو ہمارے محلے سے منسلک تھی۔ اس کے والد ایک مشن سکول میں کام کرتے تھے۔ مجھے آج تک آرتھر کے غمزدہ والدین کے پتھرائے چہرے

یاد ہیں۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کریں۔ وہ گورداسپور سے امرتسر منتقل ہوئے تھے اور آرتھر کی موت کے بعد دوبارہ وہاں چلے گئے۔ اسے شاید 6 یا 7 مارچ کو قتل کیا گیا تھا۔ میں اس کی موت پر انتہائی نادم ہوں اور آج تک اس صدمے سے نہیں نکل سکا۔ مسلم لیگ 1946 کے عام انتخابات کے بعد سے سکھوں اور ہندوؤں کو اشتعال دلا رہی تھی۔ اس لیے مارچ میں فسادات بھڑک اٹھنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ہمارا بنیادی طور پر تعلق گوجرانوالہ سے تھا چنانچہ ہم جون کے آخر میں وہاں واپس چلے گئے۔"

گورنر جینکنز اور امرتسر

6 مارچ کو ایک تار میں گورنر جینکنز نے وائسرائے ویول کو پنجاب کے مختلف علاقوں میں ہونے والے واقعات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ امرتسر میں صورتحال نہایت سنگین ہے۔ کاروباری مراکز میں آگ لگائی جارہی ہے۔ شرپسند اسلحے کا استعمال کر رہے ہیں اور لوٹ مار میں بھی ملوث ہیں۔ آج 10:30 بجے 10 افراد ہلاک اور 65 زخمی ہوئے (Carter, 2007a: 59)۔ 8 مارچ کو انہوں نے وائسرائے ویول کو ٹیلی گرام کیا کہ امرتسر میں صورتحال بدستور خراب ہے۔ فوج کی دو بٹالین نفری اب بھی شہر میں موجود ہے (Ibid: 68-9)۔ 9 مارچ کی ایک مفصل رپورٹ میں گورنر نے بتایا کہ سرکاری ہسپتال میں 100 افراد کی ہلاکت کی اطلاع آئی ہے۔ 64 مسلمان، 31 سکھ، 4 ہندو اور عیسائی ایک (Ibid: 73)۔ 13 مارچ کو جینکنز نے امرتسر کا دورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ "آج دوپہر کو میں نے امرتسر کا دورہ کیا۔ شہر میں کرفیو لگا تھا۔ نقصانات بہت زیادہ ہیں اور ملبہ ہٹانے اور غیر محفوظ جلی عمارتیں منہدم کرنے میں کافی تگ و دو کرنا پڑے گی" (Ibid: 78)۔

ان رپورٹوں میں چوک پراگ داس کے واقعے کا کوئی واضح ذکر نہیں۔ البتہ بہت دن بعد 30 اپریل کو اتنا کہا گیا کہ: "ابتدائی دنوں کے فسادات میں چوک پراگ داس نام کے علاقے میں ایک مسجد نذر آتش کی گئی اور کئی مسلمانوں کو قتل کیا گیا" (Carter, 2007a: 152)۔

جالندھر

مجھے اپنی ریسرچ کے سلسلے میں مارچ کے مہینے میں جالندھر میں رونما ہونے والے بڑے واقعات کا سراغ لگانے میں کافی مدد ملی۔ جالندھر سٹی اور کنٹونمنٹ میں مسلمان 59 فیصد آبادی کے ساتھ اکثریت میں تھے۔ ایس جی پی سی کی 1991 کی رپورٹ میں صفحہ 20 اور 21 پر ایک سرٹیفیکیٹ کی نقل بھی موجود ہے جس میں جالندھر مسلم لیگ نے ایک خاتون کو نیشنل گارڈ کے رضاکار کی تربیت مکمل ہونے کا سرٹیفیکیٹ جاری کیا ہے۔ اس تربیت میں نہ صرف ڈرل کرنے بلکہ آتشیں اسلحے سمیت ہتھیاروں کے استعمال کی ٹریننگ لینا بھی شامل تھا۔ جالندھر مسلم لیگ کا مضبوط گڑھ تھا۔ اگرچہ کانگریس اور راشٹریہ سیوک سنگھ بھی یہاں کافی منظم تھیں۔ اس شہر کے باسی محمد ایوب خان نے اپنی کتاب 'تحریک پاکستان اور جالندھر' میں ان واقعات کو بیان کیا ہے۔ ایوب خان کے مطابق ماسٹر تارا سنگھ کی 3 مارچ 1947 کی تقریر کے بعد جالندھر میں حالات کافی خراب ہو گئے۔ 4 مارچ کی رات کو ہندو اور سکھ جلوس لے کر سڑکوں پر نکل آئے۔ وہ مسلمانوں کے علاقوں میں اس قسم کے پاکستان مخالف نعرے لگاتے جارہے تھے، "جو کوئی مانگے پاکستان، اس کو ملے گا قبرستان، راج کرے گا خالصہ" (Khan, 2002: 258)۔ اس وقت

مسلمان گھروں میں سوئے ہوئے تھے اور انہوں نے مشتعل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اگلے روز بھی اشتعال انگیزی جاری رہی۔ اسلامیہ کالج کی ایک بس جس میں مسلمان طالبات سوار تھیں کو ہندو اور سکھ طلبا نے گھیر کر پتھراؤ کیا اور گندے الفاظ بھی استعمال کیے۔ پتھر لگنے سے کئی طالبات اور ڈرائیور زخمی ہوگئے البتہ وہ کسی طرح سول ہسپتال پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہندو ڈاکٹروں نے توزیادہ تردد نہ کیا البتہ تھوڑی دیر میں پورے شہر سے مسلمان ڈاکٹرز خمیوں کے علاج کے لیے آن پہنچے۔ لڑکیوں کو کافی زخم آئے تھے۔ جالندھر کے نوجوان انتقام لینے کے درپے تھے لیکن ان کے بزرگوں نے انہیں کوئی جلد بازی کرنے سے روک دیا۔ اسی روز شرپسندوں نے کئی مسلمانوں کو قتل کر ڈالا(Ibid: 259-60)۔

لابھ سنگھ کا قتل

البتہ اکالی لیڈر سردار لابھ سنگھ نے دوسرے سکھ رہنما دربارا سنگھ کے ساتھ مسلمانوں کے علاقے کا دورہ کیا۔ وہ سکھ نوجوانوں کے شرمناک سلوک پر معافی کے خواست گزار ہوئے۔ پولیس کو انٹیلی جنس رپورٹ ملی کہ سردار لابھ سنگھ کو قتل کرنے کی سازش ہو رہی ہے تاہم وہ بروقت کوئی اقدام کرنے میں ناکام رہی۔ لابھ سنگھ کو مسلمان نوجوان بشیر جولاہا نے قتل کر دیا۔ پولیس نے کئی مسلمان نوجوانوں کو شبہ میں پکڑا اور سیشن کورٹ نے انہیں سزائے موت سنادی۔ اس فیصلے کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی گئی لیکن اس پر سماعت ہونے سے پہلے سے تقسیم ہند وقوع پذیر ہوگئی۔ بعد ازاں پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کے درمیان قیدیوں کے تبادلے کے نتیجے میں ان مسلمانوں کو بھی رہائی مل گئی۔

سردار لابھ سنگھ کے قتل کے واقعے کا ذکر 10 مارچ کے گورنر جینکنز کے وائسرائے ویول کو بھیجے گئے تار میں کیا گیا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ پولیس کے دو افسروں نے امرتسر میں ماسٹر تارا سنگھ سے ملاقات کی تو وہ لابھ سنگھ کے قتل پر کافی سیخ پا تھے۔ انہوں نے کہا کہ 'خانہ جنگی' پہلے ہی شروع ہو چکی ہے۔ انہوں نے بڑے پیمانے پر سکھوں کے مظاہروں اور پولیس سٹیشنوں پر حملے کی بھی دھمکی دی(Carter, 2007a: 76)۔

انٹرویوز

خواجہ افتخار، لاہور 17 اپریل 2003

گورچرن داس اروڑہ، امرتسر 24 مارچ 2004

موہن سنگھ راہی، امرتسر 25 مارچ 2004

دیوی داس مانگٹ، امرتسر 25 مارچ 2004

رپوداما ن سنگھ، امرتسر 26 مارچ 2004

شیخ عبدالوہاب، لاہور 24 دسمبر 2004

قمر یورش، لاہور 26 دسمبر 2004

افطار سنگھ جج، دہلی 10 جنوری 2005

پروفیسر وی این دت، دہلی 10 جنوری 2005

References

Iftikhar, Khawaja, *Jabb Amritsar Jall Raha Tha* (*When Amritsar was Burning*), Lahore: Khawaja Publishers.

Khan, Muhammad Ayub, *Tarikh-i-Pakistan Aur Jullundur* (*The Pakistan Movement and Jullundur*), Lahore: Asatair, (2002).

Kholsa, G. D., *Stern Reckoning,* Delhi: Oxford University Press, (1989

Talbot, Ian, *'Violence, Migration and Resettlement: The Case of Amritsar'* in Ian Talbot and Shinder Thandi (eds.), *People on the Move: Punjabi Colonial, and Post-Colonial Migration,* Karachi: Oxford University Press, (2004).

Talib, S. G. S., *Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab 1947,* New Delhi: Voice of India, (1991).

Official Documents

Carter, Lionel, (ed), *Punjab Politics, 3 March – 31 May 1947, At the Abyss, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents,* New Delhi: Manohar, (2007a).

Census of India, 1941, Vol. VI, *Punjab*, Simla: Government of India Press, (1941).

Newspapers

The Pakistan Times, Lahore, 1947.

The Tribune, Lahore, 1947.

8

مارچ کے فسادات : ملتان

پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات کا تیسرا بڑا مرکز قدیم تاریخی شہر ملتان تھا۔ جنوبی پنجاب کے اس شہر کا نواحی علاقہ اس صحرائی پٹی کا حصہ ہے جو سندھ اور اس کے بعد سرحد پار بھارتی ریاست راجستھان تک پھیلی ہوئی ہے۔یہاں کا موسم گرم اور خشک ہے۔ ملتان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قدیم دیومالا مہابھارت کے وقت ایک بڑی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ پنجاب کے دیگر شہروں اور قصبوں کی طرح ملتان کو بھی کئی بار جنگی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یونان، عرب اور وسط ایشیا سے آنے والے حملہ آوروں نے ہر دور میں اسے نشانہ بنایا۔ یہ بھی روایت ہے کہ ہندوؤں کے مشہور تہوار دیوالی کا آغاز بھی ملتان سے ہوا تھا۔ آٹھویں صدی کے آغاز میں محمد بن قاسم کی قیادت میں عرب فوج نے ملتان سمیت سندھ کو فتح کر لیا۔

کچھ عرصے کے لیے ملتان اسماعیلی شیعوں کی حکومت کا دارالحکومت بھی رہا۔ گیارہویں صدی میں سُنّی ترک افغان حملہ آور محمود غزنوی نے ملتان اور گردونواح کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں کئی افغان اور بلوچ قبائل نے بھی ملتان اور نواحی علاقوں میں سکونت اختیار کر لی۔ ملتان صوفیوں کی بڑی تعداد میں موجودگی کے حوالے سے بھی شہرت کا حامل ہے۔ جنھوں نے یہاں اپنی خانقاہیں قائم کی تھیں۔ اس وقت بھی ملتان میں کئی مزار موجود ہیں۔ مغلیہ دور حکومت میں ملتان میں زبردست امن اور خوشحالی کا دور دورہ رہا جبکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ (1839-1799) اور انگریزوں کے وقت میں بھی ملتان شہر پھلا پھولا۔

انگریزوں نے جنوبی پنجاب میں کئی نہریں کھدوائیں اور آبپاشی کا نظام قائم کیا جس کی وجہ سے ضلع ملتان میں زراعت کو زبردست فروغ ملا۔ شمالی پنجاب کے گنجان آباد علاقوں کے کئی آبادکاروں کو ملتان کے نہری علاقوں جن میں منٹگمری (ساہیوال) مشہور ہے میں زمینیں الاٹ کی گئیں۔ علاقے کے لوگ سرائیکی زبان بولتے ہیں جو بعض افراد کے نزدیک مختلف زبان ہے جبکہ کچھ لوگ اسے پنجاب کا ہی ایک لہجہ قرار دیتے ہیں۔ بہرحال پنجابی بولنے والے کئی خاندان انگریز دور میں اور تقسیم کے بعد ہندوؤں اور سکھوں کے جانے پر یہاں آباد ہوئے۔ راولپنڈی کی طرح ملتان بھی مسلمان آبادی کے لحاظ سے بڑی ڈویژن تھی۔

ملتان میں فسادات 5 مارچ کو شروع ہوئے۔ زیادہ تر مسلمانوں نے (اکثریت ہونے کی وجہ سے) ہندوؤں اور سکھوں پر حملے کیے۔ اگرچہ شہر کا علاقہ زیادہ متاثر ہوا البتہ گردونواح کی بستیوں پر بھی حملے کیے گئے۔ ہندوؤں کا بے پناہ جانی اور مالی نقصان کیا گیا۔ شہر میں چند ہی ہندو تھے۔ ضلعی انتظامیہ کا سربراہ ڈپٹی کمشنر اے جے بی آرتھر (آئی سی ایس) تھا۔

1941 کی مردم شماری کے لحاظ سے آبادی کا تناسب		
ملتان بشمول کنٹونمنٹ کا علاقہ	**تعداد**	**تناسب فیصد**
تمام مذاہب	142,768	100
مسلمان	81,383	57
ہندو اور شیڈول کاسٹس	56,258	39.41
سکھ	2,665	1.87
عیسائی، ادھرمی، جین، پارسی، بودھ، یہودی اور دیگر	2,462	1.72
ضلع ملتان	**تعداد**	**تناسب**
تمام مذاہب	1,484,333	100
مسلمان	1,157,911	78
ہندو اور شیڈول کاسٹس	242,987	16.37
سکھ	61,628	4.15
عیسائی، ادھرمی، جین، پارسی، بودھ، یہودی اور دیگر	21,727	1.46

ملتانی ہندو بڑے پرامن لوگ تھے جنہوں نے کبھی عسکریت پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آر ایس ایس اگرچہ وہاں متحرک تھی لیکن اسے بہت کم ہندوؤں کی حمایت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے ملتان میں مارچ کے فسادات زیادہ تر یکطرفہ تھے۔ پاکستان ٹائمز اور دی ٹربیون میں سے کسی اخبار نے ملتان کے واقعات تفصیلاً نہیں لکھے۔ جبکہ کھوسلہ اور ایس جی پی سی رپورٹیں بعد میں لکھی گئیں۔ میں نے یہ واقعات انٹرویو کی مدد سے ترتیب دیے ہیں۔ پہلے ان مسلمانوں کا ذکر ہے جو ان دنوں ملتان میں مقیم تھے پھر ان ہندوؤں کی آپ بیتی ہے جو ملتان چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

مسلمانوں کے انٹرویو

سید خورشید عباس گردیزی

”1947 کے ہنگاموں سے پہلے ملتان میں حالات نہایت پرامن تھے۔ ملتان کی آبادی صرف 90 ہزار تھی۔ ملتان میں سکھ بہت کم تھے۔ اگرچہ تجارت اور کاروبار پر ہندوؤں کا غلبہ تھا لیکن اکثریت کے طور پر مسلمان سیاسی اور ثقافتی زندگی پر حاوی تھے۔ شہر میں مضبوط صوفی روایات اور مقامی ثقافت نے پرامن بقائے باہمی اور باہمی احترام کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہندو بھی اسی طرح مزاروں پر حاضری دیتے تھے جس طرح مسلمان دیتے تھے۔ مسلمان جاگیرداروں کے پاس ہندو اکاؤنٹنٹ ہوتے تھے جنہیں ڈمبر کہتے تھے۔ چنوں رام ہمارا ڈمبر تھا۔ وہ ہمیں نہایت عزت و احترام کے ساتھ مخاطب کرتے تھے اور ہمارے لیے 'پیر جی' کے لفظ استعمال کرتے تھے۔ بعض بڑے ہندو زمیندار بھی تھے اور کچھ کاشتکار تھے۔ مسلمان کاشتکار ہندو ساہوکاروں کے مقروض ہوتے تھے۔ ہندو بڑے مکانات تعمیر کرنے اور شادی کی پرتعیش تقریبات پر بے دریغ پیسہ خرچ کرتے تھے۔ ایسی روایات کی نقالی

مسلمان بھی کرنے کی کوشش کرتے جو اس چکر میں بالکل کنگال ہو جاتے تھے۔ البتہ کئی کامیاب مسلمان بزنس مین بھی تھے۔ چنانچہ ملتان میں صرف جاگیر دار اور مزاروں کے متولی ہی نہیں تھے بلکہ کاروباری شعبے میں بھی مسلمانوں کی کئی ممتاز شخصیات موجود تھیں۔

''ملتان میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز 1946 کے انتخابات سے ہوا۔ اس سے پہلے مسلمان زمیندار پنجاب یونینسٹ پارٹی کے رکن اور انگریزوں کے وفادار تھے۔ اس کے علاوہ 1945 میں مسلم لیگ میں شمولیت کی ایک لہر پیدا ہوئی اور 1947 تک شاید ہی کوئی بڑا زمیندار ایسا ہو جو مسلم لیگ میں شامل نہ ہوا ہو۔ ہمارا گردیزی قبیلہ شیعہ مکتبہ فکر کا ہے لیکن ہماری جڑیں صوفی ازم میں ہیں۔ دیگر اہل تشیع کی طرح ہم بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے کیونکہ ہمارا ایمان تھا کہ جناح خود شیعہ ہیں۔ اس لیے پاکستان فرقہ واریت سے پاک ملک ہو گا۔ ملتان کے مسلمانوں کی کل آبادی کا 25 فیصد اہل تشیع پر مشتمل تھا۔ کانگریس کا ملتان میں کوئی خاص عمل دخل نہیں تھا۔

''میں مارچ 1947 میں ایمرسن کالج میں پڑھ رہا تھا۔ پریاورت اور اشوک کمار کھنہ میرے ہندو کلاس فیلو اور قریبی دوست تھے۔ یہ بہت اچھے اور شریف لوگ تھے۔ ان میں سے کچھ حلال گوشت بھی کھا لیتے تھے۔ شہر میں ایک بہت مشہور ہندو دکاندار بھی تھا جو اسلامی طریقے کے مطابق گوشت حلال کر کے کھاتا تھا۔ ان دنوں ملتان کا ڈپٹی کمشنر ایک انگریز مسٹر آر تھر تھا۔ پولیس کے زیادہ تر اہلکار پنجابی تھے جن کا تعلق پنجاب کے دیگر علاقوں سے تھا۔ ہماری مقامی زبان اور ثقافت سرائیکی ہے جسے ملتانی بھی کہتے ہیں۔ سرائیکی بولنے والے بہت کم افراد پولیس میں ملازم تھے۔

''پنجاب اسمبلی کے باہر ماسٹر تارا سنگھ کی طرف سے کرپان لہرانے کے بعد ملتان بھی بے چینی کی گرفت میں آ گیا۔ پہلی جھڑپ بوڑھ گیٹ پر ہوئی جہاں متعدد گردیزی گھرانے رہتے تھے۔ ہندوؤں کا ایک جلوس پاکستان مخالف نعرے لگاتے وہاں آیا۔ برف فروش مسلمان عبد الکریم، ایک اور شخص مستقیم اور اللہ ڈیوا Allah Diwa کمہار نے مظاہرین کو للکارا۔ اس موقع پر ایک قصاب محمد رمضان چھریاں لے آیا جس سے خونریزی شروع ہو گئی۔ دو مظاہرین کو قتل کر دیا گیا۔ ایک سکھ نے ہیجانی انداز میں لاش سے لپٹ کر کہنا شروع کر دیا 'تو زندہ ہے، تو زندہ ہے'۔ اس ردعمل سے فساد میں شدت آ گئی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی بعض املاک کو بھی آگ لگا دی چونکہ ہندوؤں کے گھر بڑے بڑے تھے اور وہ ان میں محصور ہو گئے تھے اس لیے مسلمانوں نے گھروں کو جلانا شروع کر دیا، اس کے نتیجے میں کئی افراد مارے گئے۔ ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کی جائیدادوں کو نذر آتش کیا۔ مثال کے طور پر چمڑے اور رنگسازی کے بڑے صنعتکار خاندان خواجگان کی عمارتوں کو ہندو جتھوں نے آگ لگا دی۔ انہوں نے مسلمانوں کے مضبوط گڑھ میں بھی حملے کیے اور انہیں جانی نقصان پہنچایا۔ دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی مدد بھی کی لیکن اس کے بعد صورتحال پھر کبھی معمول پر نہیں آ سکی۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ مقامی ملتانیوں کو کبھی سمجھ نہیں آئی کہ ان فسادات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ میرے خیال میں ہنگاموں کے پیچھے 'خفیہ ہاتھ' کارفرما تھا۔ بلاشبہ جلاؤ گھیراؤ میں ہندوؤں کا زبردست نقصان ہوا اور ان میں سے کچھ نے اسلام قبول کر لیا۔ ان نومسلموں کو دیندار مسلمان کہتے تھے۔''

عطااللہ ملک

"1940 کی دہائی سے پہلے ملتان میں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ شہر میں ہندو بڑی تعداد میں رہتے تھے لیکن بڑی اکثریت بہر حال مسلمانوں ہی کی تھی۔ ہم لوگ امن وہم آہنگی کے ساتھ رہتے تھے۔ ہندو دیوالی جیسے اپنے تہواروں کے موقع پر مٹھائیاں کرتے تھے جبکہ مسلمان بھی اپنے مذہبی تہواروں پر ایسا ہی برتاؤ کرتے تھے۔ مسلمان جاگیر دار انگریزوں کے وفادار تھے اور ایسی کسی بھی تحریک کے مخالف تھے جس سے انگریزوں کے راج پر زد پڑتی ہو۔ اگرچہ کانگریس بھی ملتان میں موجود تھی لیکن انگریز مخالف سب سے متحرک تنظیم مجلس احرار تھی جس میں تمام قوم پرست مسلمان شامل تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ مجلس احرار اور کانگریس کا مقصد ایک ہی تھا یعنی سامراجی اقتدار کا خاتمہ۔ جاگیر دار عموماً ہندو ساہوکاروں کے مقروض ہوتے تھے اور عام طور پر ان کی جائیدادیں ہندوؤں کے پاس رہن رکھی ہوتی تھیں۔ اگرچہ سر چھوٹو رام کی اصلاحات کے نتیجے میں ساہوکار کمزور ہوئے تھے لیکن انہوں نے مسلمان فرنٹ مینوں کے ذریعے اپنا دھندہ جاری رکھا۔ 46-1945 کے انتخابات کے دوران مسلم لیگ نے بریلوی مکتبہ فکر کے مولویوں کو انتخابی مہم میں شامل کر لیا۔ جو 'پاکستان کا نعرہ کیا؟ لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر' کے نعرے لگاتے اور لوگوں کو جمع کر کے پاکستان کے حق میں قائل کرتے، یہ ایک نئی بات تھی کیونکہ بریلویوں نے اب تک عموماً خود کو سیاست سے الگ رکھا تھا اور انہیں جاگیر داروں اور پیروں کا وظیفہ خوار سمجھا جاتا تھا۔ اب وہ مسلمان ووٹروں کے ساتھ زمین اور آسمان کے وعدے کر رہے تھے اور ہندوؤں اور سکھوں کو کافر قرار دے رہے تھے۔ انہوں نے مستقبل کے پاکستان کو اسلام کا قلعہ قرار دیا۔ جہاں جہاد کے ذریعے حقیقی اسلام نافذ کیا جانا تھا۔ یہ سب لغو تھا کیونکہ یہی مولوی کچھ عرصہ قبل انگریز راج اور جاگیر داروں کے گن گا رہے تھے۔

"کئی جاگیر داروں جیسا کہ علی حسین گردیزی، ممتاز دولتانہ اور علمدار حسین گیلانی (سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے والد) نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تاہم کچھ جاگیر دار بدستور یونینسٹ پارٹی میں رہے۔ صرف ایک چھوٹا زمیندار ابراہیم برق یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوا لیکن اس نے ملتان شہر کی بجائے ضلع ملتان میں مسلمانوں کی مخصوص نشست پر الیکشن لڑا تھا۔ باقی تمام نشستیں مسلم لیگی امیدواروں نے جیت لیں۔ مسلم لیگ نے قوم پرست مسلمانوں سے نمٹنے کے لیے غنڈہ گرد عناصر بھی بھرتی کیے تھے۔ یہ سچ ہے کہ احرار کے مقررین نے مسلم لیگ کے مسلمانوں کے تنہا نمائندہ ہونے کی حیثیت کو چیلنج کیا تھا۔ ہمارا نکتہ نظر یہ تھا کہ جاگیر داروں نے کبھی سامراج مخالف تحریک میں حصہ نہیں لیا اور اب ہندو مسلم اتحاد کو سبوتاژ کرنے کے لیے میدان میں نکلے ہیں اور ان کا اسلامی تعلیمات کے مطابق سماجی تفریق سے پاک معاشرہ قائم کرنے کے عمل سے کوئی علاقہ نہیں۔ میں 1947 میں ایمرسن کالج میں زیر تعلیم تھا جہاں مخلوط تعلیم رائج تھی۔ 5 مارچ کو بوہڑ گیٹ پر غیر مسلموں پر پہلے حملے میں ایک سکھ نانک سنگھ کو مسلمانوں نے ہلاک کر دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ غیر مسلم مظاہرین نے پاکستان مخالف نعرے لگائے لیکن سول نافرمانی کی تحریک کے دوران مسلم لیگیوں نے بھی کانگریس کے خلاف نعرے لگائے تھے لیکن کسی ہندو یا سکھ نے ان پر حملہ نہیں کیا تھا۔ اب جبکہ خضر حیات حکومت کے خاتمے کے خلاف غیر مسلموں نے احتجاج کیا تو مسلم لیگی ارکان نے تشدد شروع کر دیا۔"

سیٹھ کلیان داس کا قتل

عطااللہ ملک نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ مارچ 1947 میں سب سے شرمناک اور قابل افسوس واقعہ سیٹھ کلیان داس کا قتل تھا۔ وہ ایک ممتاز ہندو اور بڑے جاگیر دار تھے۔ ان کا گھر ریلوے سٹیشن کے قریب تھا اور ان کے مسلمانوں کے ساتھ بہت دوستانہ مراسم تھے۔ ان کو تمام مذاہب میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کئی بار انہیں مسلمانوں کے تنازعات کے حل کے لیے بھی ثالث کے طور پر بلایا جاتا تھا لیکن مارچ میں مسلم لیگ نیشنل گارڈز جن میں سے کئی ارکان پولیس کے سابق ٹاؤٹ اور جرائم پیشہ عناصر تھے نے ان دوستانہ تعلقات کو تہس نہس کر ڈالا۔ انہوں نے سیٹھ کلیان داس کے گھر کا محاصرہ کر کے انہیں بے دردی سے ہلاک کر دیا۔

"اس وقت کانگریس پنجاب کے صدر ڈاکٹر سیف الدین کچلو بھی شہر میں تھے اور کلیان داس کے مہمان تھے۔ کسی نے سیف کچلو کو پہچان کر کہا کہ یہ مسلمان ہیں۔ کئی حملہ آوروں نے ان کی تذلیل ضرور کی لیکن جان سے مارنے سے گریز کیا۔ انہوں نے سیف کچلو کے کپڑے اتار کر تسلی کر لی کہ ان کے ختنے ہوئے ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ اگر تم مسلم لیگ کی رکنیت کے فارم پر دستخط کر دو تو تمہاری جان بخشی کر دی جائے گی بصورت دیگر قتل کر دیا جائے گا۔ ٹھیک اس لمحے ہم قوم پرست مسلمان موقع پر پہنچ گئے۔ سیٹھ کلیان داس اور ان کے اہل خانہ کی لاشیں اپنے ہی خون میں نہائی ہوئی تھیں۔ دوسرا منظر بھی کریہہ تھا۔ وہ ٹھگ ڈاکٹر کچلو کا جسمانی معائنہ کر رہے تھے۔ وہ مکمل طور پر برہنہ تھے اور حملہ آوروں سے تحمل مزاجی کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارے آنے سے ان کی زندگی بچ گئی۔ ہم قوم پرست اور مسلم لیگی ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے تھے کیونکہ بہر حال ملتان ان دنوں ایک چھوٹا شہر تھا۔ ان میں سے کچھ پہلے احرار تھے اور اب مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے۔ ہمارے کچھ رہنماؤں نے مسلم لیگیوں کو قائل کر لیا کہ کسی مسلمان کا قتل جائز نہیں۔ یوں ڈاکٹر کچلو بچ گئے۔ (یہ واقعہ مصنف کو ڈاکٹر کچلو کے صاحبزادے توفیق کچلو نے بھی 2005 میں سنایا۔ وہ دہلی کے مضافاتی علاقے میں مقیم تھے۔ آزادی کے بعد ڈاکٹر سیف الدین نے بھارت میں قیام کو ترجیح دی اور وہیں 1963 میں ان کا انتقال ہوا)۔

"ملتان کے مضافاتی علاقے بستی نو میں ہندوؤں کو بڑی تعداد میں ہلاک کیا گیا۔ ان کے پاس کافی زیادہ زمینیں بھی تھیں۔ 10 سے 20 ہندوؤں کو قتل کیا گیا۔ ہندوؤں نے بھی جوابی کارروائیاں کیں۔ آر ایس ایس کے کارکن ہندوؤں کے علاقوں میں عسکری مشقیں کرتے رہے تھے۔ کئی مسلمانوں کو آر ایس ایس نے ہلاک کر دیا۔ مسلمانوں کی طرف سے زیادہ حملے میاں عبداللہ آرائیں اور رزانو شاہ کی قیادت میں کیے گئے۔ ان واقعات کے فوری بعد نہرو نے ملتان کا دورہ کیا۔ وہ پہلے مسلمانوں کے کیمپ کی طرف آئے جہاں ایک نوجوان نے ان کی لعن طعن کی۔ انہوں نے تحمل کے ساتھ تنقید برداشت کی اور طبی عملے (غالباً ہندوؤں) کو حکم دیا کہ اس نوجوان کی ہر ممکن مدد کی جائے۔ پھر وہ ہندوؤں کے امدادی کیمپ گئے اور حملوں میں بچ جانے والوں سے ملاقات کی۔ ایک ہندو لڑکی نے ہندو کمیونٹی کے ساتھ غیر انسانی اور ظالمانہ سلوک پر چیخ چیخ کر احتجاج کیا۔ نہرو سے جھکا کر سنتے رہے اور پھر خاموشی سے وہاں سے چل دیے۔"

ارشد ملتانی

"تقسیم ہند سے پہلے مختلف مذاہب کے درمیان کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ملتان میں کئی ہندو مخیر شخصیات تھیں جبکہ مسلمان جاگیر دار اپنے مفادات کے تحفظ کے خواہاں تھے۔ مسئلہ مارچ 1947 سے شروع ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ملتان میں قتل ہونے والا پہلا شخص سکھ تھا۔ اگرچہ شہر میں سکھ بڑی تعداد میں نہیں تھے۔ زیادہ تر ہندو تھے۔ جن کی اکثریت صوفیوں اور مزاروں کی معتقد تھی۔ میرے خیال میں پولیس (امیر) ہندوؤں پر حملے کرنے کی شہ دلانے میں ملوث تھی۔ وہ لوٹ مار میں اپنا حصہ لیتی تھی۔ چونکہ ملتان میں ہندو اقلیت میں تھے اس لیے وہ خود کو مذہبی طور پر آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے سختی سے اپنی رسومات نہیں ادا کر سکتے تھے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ ہم اکٹھے بیٹھ کر کھاتے پیتے نہیں تھے۔ 1947 سے پہلے ملتان ایک پرامن شہر تھا۔"

ملتان کے سابق ہندو مکین

پریم چند کھنہ

"ملتان ایک پرامن شہر تھا۔ محبت اور اچھے لوگوں سے بھرا شہر، سرائیکی زبان اور ثقافت بہت خوبصورت ہے۔ ہم نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا اور ہمیں صوفیوں کے شہر سے جانا پڑے گا۔ ہمارے بزرگ ملتان کے قدیم باشندے تھے لیکن 1947 میں جو کچھ ہوا اس کی مسلمان بیرونی حملہ آوروں کے حملوں کے سوا کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ ہمارے مسلمان ہمسایوں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ حتیٰ کہ ہم اکٹھے کھاتے پیتے تھے۔ میرے والد مسلمان اولیا پر زبردست اعتقاد رکھتے تھے اور باقاعدگی کے ساتھ صوفیوں کے مزاروں پر حاضری دیتے تھے۔ 1946 کی انتخابی مہم تک ملتان میں ماحول کشیدہ نہیں تھا لیکن مسلمان اکثر یونینسٹ پارٹی کے خلاف بدزبانی کرتے تھے۔ انہوں نے عوامی جلسوں میں غیر مسلموں کے خلاف اشتعال دلانے کے لیے ملاؤں کو استعمال کیا۔ میں نے 5 مارچ کو ایک جلوس میں شرکت کی جس میں زیادہ تر تعداد ہندو طلبا کی تھی۔ یہ سچ ہے کہ جلوس میں کئی طلبا نے 'قائد اعظم مردہ باد' کے نعرے لگائے۔ بوہڑ گیٹ میں اس جلوس کا مسلمانوں کے ساتھ خونی تصادم ہوا جس میں مسلمانوں نے چھریوں اور چاقوؤں کا استعمال کیا۔ کچھ افراد ہلاک اور کچھ زخمی ہو گئے۔ یہ سارا نقصان ہمارا ہوا۔ اس کے بعد مشتعل مسلمان ہندوؤں کی دکانوں کو آگ لگانے لگے اور کئی کو چھرا گھونپ دیا گیا۔ سیٹھ کلیان داس کے قتل سے خوف وہراس پھیل گیا اور کئی متمول ہندوؤں نے اپنے خاندانوں سمیت مشرقی پنجاب میں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے ملتان اپریل میں چھوڑا اور جالندھر میں قیام پذیر ہو گئے۔ میں ہمیشہ ملتان واپس جا کر اپنا شہر دیکھنے کا خواہاں رہا لیکن مارچ 1947 میں جو خوف مجھ پر طاری ہوا وہ اب بھی برقرار ہے۔"

گردھاری لال کپور

"آج بھی میرے تصور میں بوہڑ چوک پر بے دردی سے قتل ہونے والے نانک سنگھ اور دیگر ہندوؤں کی لاشیں موجود ہیں۔ اس علاقے میں میرے والد کی دکان تھی اور دکان کی پچھلی گلی میں ہمارا گھر تھا۔ ہندو اور سکھ لاہور میں (خضر حیات) حکومت کے

خاتمے کے خلاف پرامن احتجاج کر رہے تھے کہ مسلمانوں نے ان پر دھاوا بول دیا۔ ان میں سے کئی بدنام جرائم پیشہ لوگ تھے۔ میں 5 مارچ کے جلوس میں شامل نہیں تھا لیکن جب مسلمانوں نے حملہ کر دیا تو خوف وہراس پھیل گیا اور ہندو اور سکھ ہر طرف بھاگنے لگے۔ میں اور میرا کزن امرت لال بھی ان کے ساتھ بھاگنے لگے کیونکہ مسلمان بلا تفریق تمام ہندوؤں کا تعاقب کر رہے تھے۔ یہ بڑا روح فرسا منظر تھا لیکن کچھ مسلمانوں نے ہمیں بچا کر چھپا دیا۔ پولیس کا رویہ نہایت جارحانہ تھا اور اس نے ہندوؤں اور سکھ کو حملہ آوروں سے بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔

"پھر مارچ کے وسط سے صورتحال بہتر ہونا شروع ہوگئی کیونکہ تمام مذاہب کے بڑوں نے ملاقات کی اور امن کے قیام پر اتفاق کر لیا۔ البتہ اس ابتدائی حملے کے بعد ہندو اور سکھ اقلیت ہمیشہ خوف کا شکار رہی اور سوچ رہی تھی کہ پاکستان بننے کے بعد نہ جانے ان کے ساتھ کیسا سلوک ہو۔ وہ جانتے تھے کہ ملتان ڈویژن اور ضلع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اگر پنجاب تقسیم ہوتا ہے تو انہیں صوبے کی غیر موزوں طرف رہنا پڑے گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خاندانوں کو مشرقی پنجاب میں محفوظ مقامات کی طرف بھیجنا شروع کر دیا۔ میری والدہ، 2 بہنوں اور مجھے اپریل کے آغاز میں شرن پور بھیج دیا گیا جو پرانے پنجاب کا حصہ تھا۔ میرے والد اور چچا ملتان میں ہی رہے۔ وہ جولائی کے اختتام پر ہمارے پاس آن پہنچے۔ البتہ ہمارے کئی رشتہ داروں کو اگست میں قتل کر دیا گیا۔"

بھولاناتھ گلاٹی

"بوہڑ بازار کے قریب ہماری دکان تھی اور بیشتر گاہک مسلمان ہی تھے۔ مسلمان خواتین پوری طرح نقاب اوڑھ کر آیا کرتی تھیں لیکن دکان کے اندر آ کر وہ چہرہ بے نقاب کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں آتی تھیں۔ ہم انہیں احترام سے بی بی جی کہتے تھے کیونکہ بیشتر خواتین کا تعلق پیروں کے گھرانے سے ہوتا تھا۔ ایک خاتون نے (بہن بن کر) میرے والد کے ہاتھ میں راکھی بھی باندھی تھی۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ اکثر والد سے کہتی تھی کہ میں اس بچے (بھولاناتھ) کو گود لینا چاہتی ہوں۔ والد جواب میں کہتے تھے، 'بی بی جی یہ آپ کا ہی بچہ ہے۔' 5 مارچ کو اچانک گڑبڑ کا آغاز ہوگیا۔ اس وقت میں اپنی دکان میں تھا۔ مجھے کچھ دیر میں چیخوں اور شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس وقت تک مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ میری زندگی کا افسوسناک ترین دن ہوگا۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو میری ماں کا انتقال ہوگیا۔ میں ماں باپ کا اکلوتا بچہ تھا۔ اگرچہ میرے والد جلوس میں شریک نہیں ہوئے تھے لیکن کسی نے انہیں قتل کر ڈالا۔ وہ صرف گھر سے باہر حالات کا جائزہ لینے نکلے تھے۔ میرا ایک مسلمان دوست سرور میرے لیے فرشتہ ثابت ہوا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کے والد میرے والد کو جانتے تھے۔ انہوں نے میرا بڑا خیال رکھا۔ پھر میرے چچا کشن جو ریلوے میں ملازم تھے۔ وہ لدھیانہ سے ملتان آئے تو انہیں ہماری مشکل کا علم ہوا۔ ہم نے اپنی دکان فروخت کر دی اور اپریل کے شروع میں لدھیانہ چلے گئے۔ میں کبھی مسلمانوں پر حملوں میں ملوث نہیں رہا تاہم لدھیانہ مہاجر کیمپ میں مقیم کئی افراد کو جانتا تھا جو لدھیانہ میں مسلمانوں کے محلوں میں کارروائیاں کرتے رہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے اور اپنے رشتہ داروں کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ میں نے کسی کارروائی میں اس لیے حصہ نہ لیا کیونکہ مجھے خون خرابے سے ڈر لگتا تھا۔ کبھی کبھی

میں خواب میں ملتان اور اپنے مرے ہوئے باپ کو دیکھتا ہوں۔ وہ پگڑی پہنتے تھے اور مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میں 13 سال کا تھا جب ملتان میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ میں اب بھی سرائیکی بول سکتا ہوں کیونکہ میرا چاچا جی میرے ساتھ گھر میں سرائیکی ہی بولتے تھے۔"

کھوسلہ اور ایس جی پی سی رپورٹ

کھوسلہ رپورٹ میں بھی ملتان میں غیر مسلموں پر حملوں کو کافی بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہندو اور سکھ طلبا نے 2 مارچ کو پرامن جلوس نکالا۔ یہ لوگ ایک روز قبل لاہور میں سکھ اور ہندو طلبا پر فائرنگ کے واقعے پر احتجاج کر رہے تھے۔ رپورٹ میں انسان دوست سیٹھ کلیان داس کے بہیمانہ قتل اور انکے مسلمان مہمان ڈاکٹر سیف کچلو سے بدسلوکی کے واقعے کو خصوصی طور پر بیان کیا گیا ہے (5-104 :1989)۔ ایس جی پی سی میں ملتان کے حالات تفصیلاً نہیں بیان کیے گئے (شاید اسکی وجہ سے یہ ہو کہ ملتان میں بہت کم سکھ رہتے تھے)۔ البتہ تشدد سے متاثرہ علاقوں کی فہرست میں ملتان کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

گورنر جینکنز

وائسرائے ویول کے نام 6 مارچ کو ایک تار میں گورنر پنجاب جینکنز نے ملتان میں 100 ہلاکتوں اور بڑے پیمانے پر زخمیوں کی اطلاع دی۔ دو روز بعد 8 مارچ کو انہوں نے بتایا کہ ملتان میں 140 لاشیں برآمد ہوئی ہیں۔ گورنر نے اندازہ لگایا کہ ہلاکتیں 200 کے لگ بھگ ہیں جبکہ 500 افراد زخمی ہوئے (Carter, 2007a: 69)۔ 10 مارچ کو گورنر نے ملتان کا دورہ کیا اور رپورٹ دی کہ حالات پرامن ہیں۔ ملتان کے اردگرد کے دیہات میں اکادکا واقعات کی رپورٹیں ملی ہیں۔ کچھ روز بعد انہوں نے بتایا کہ حالات دوبارہ بگڑ رہے ہیں۔ 4 مارچ کو پندرہ روزہ رپورٹ میں گورنر نے ملتان کے بارے لکھا: "ملتان میں بھی حالات خراب ہیں، لیکن مجموعی طور پر صورتحال کنٹرول ہے۔ ایک یا دو دن پہلے فوج کے ایک دستے نے گھیراؤ کی کوشش کرنے والے مظاہرین پر فائرنگ کر دی جس سے کافی ہلاکتیں ہوئیں۔ اس کے موثر اثرات پڑنے چاہئیں" (Carter, 2007a: 81)۔ 17 مارچ کو انہوں نے لکھا، "ملتان میں صورتحال اس وقت بگڑ گئی جب غیر مسلم طلبا کے ایک جلوس نے 'قائداعظم مردہ باد' کے نعرے لگائے۔ دوپہر 12 سے سوا 3 بجے تک اندازاً ڈیڑھ سو افراد — تقریباً تمام کے تمام ہندو — اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے تھے البتہ امرتسر کی بہ نسبت نقصان کافی کم رہا" (Ibid: 85)۔ اس کے بعد گورنر نے ملتان میں حالات بہتر ہونے کی رپورٹیں بھیجنا شروع کر دیں۔ 31 مارچ کو رپورٹ میں انہوں نے نئے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کو لکھا ہے "صوبہ پنجاب کے حالات اب کنٹرول میں ہیں۔"

انٹرویوز

سید خورشید عباس گردیزی، ملتان 21دسمبر2004
ارشد ملتانی، ملتان22دسمبر2004
عطااللہ ملک، ملتان22دسمبر2004
پریم چند کھنہ، دہلی9جنوری2005
گردھاری لال کپور، دہلی9جنوری2005
بھولاناتھ گلاٹی، دہلی9جنوری2005

References

Kholsa, Gopal Das, , *Stern Reckoning,* Delhi: Oxford University Press, (1989).
Talib, Sardar Gurbachan Singh., *Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab 1947 (SGPC report)* , New Delhi: Voice of India, (1991).

Official Documents

Carter, Lionel, (ed), *Punjab Politics. 3 March – 31 May 1947, At the Abyss, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents.* New Delhi: Manohar, (2007a).
Census of India, 1941, Vol VI, *Punjab,* Simla: Government of India Press, (1941).

9

مارچ کے فسادات: راولپنڈی اور ملحقہ دیہی علاقے

راولپنڈی سطح مرتفع پوٹھوہار اور شمال مغربی کوہستانی سلسلے کے درہ خیبر کو جانے والے راستے کے عین اوپر واقع ہے۔ ماضی میں وسط ایشیا سے اکثر حملہ آوروں نے اسی راستے سے گزر کر ہندوستان کے مشرقی اور جنوبی علاقوں میں حملے کیے۔ آثار قدیمہ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ویدی اور بودھ تہذیبیں خطہ پوٹھوہار میں کافی پھلی پھولی تھیں۔ بودھ تہذیب کا بڑا علمی مرکز ٹیکسلا راولپنڈی سے صرف 20 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس تناظر میں راولپنڈی ہر دور میں ثقافتی، سٹریٹجک اور عسکری اہمیت کا حامل علاقہ رہا لیکن بہرحال لگتا ہے کہ یہ ہر دور میں ایک چھوٹا قصبہ ہی رہا۔

انگریز دور میں جب راولپنڈی کو شمال مغربی ہندوستان کی بڑی چھاؤنی بنا کر اسے شمالی کمان کا مرکز بنایا گیا تو شہر کی اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ قبائلی علاقوں، وسط ایشیا اور افغانستان میں اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے انگریزوں اور روس کے درمیان جو بدنام زمانہ 'گریٹ گیم' ہوئی اس میں راولپنڈی کو بطور انٹیلی جنس مرکز استعمال کیا گیا۔ 1947 میں انگریز فوجیوں سمیت برطانوی فوج کی بڑی تعداد راولپنڈی چھاؤنی میں تعینات تھی۔ 1941 کی مردم شماری کے مطابق راولپنڈی شہر کی کل آبادی ایک لاکھ 85 ہزار 42 تھی۔ 49 ہزار نفوس دو چھاؤنیوں راولپنڈی اور چکلالہ میں مقیم تھے۔ یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ کیا مارچ 1947 میں یہ باضابطہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ انگریز فوج فرقہ فسادات کچلنے میں مداخلت نہیں کرے گی۔ پہلا دوٹوک فیصلہ اس وقت ہوا جب فیلڈ مارشل آکن لیک Auchinleck نے وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کو 26 جون 1947 کو ایک نوٹ لکھا۔ محمد علی جناح کی اس خواہش کہ انگریز فوج کو فوری طور پر ہندوستان سے نہیں نکلنا چاہیے کے حوالے سے فیلڈ مارشل چاہتے تھے کہ حکومت مسلم لیگ پر واضح کر دے کہ وہ کسی بھی صورت میں فرقہ وارانہ تصادم میں مداخلت نہیں کرے گی (Mansergh and Moon,1982: 660-61)۔ ایسا ممکن ہے کہ 1947 میں پہلے ہی خفیہ فیصلے یا خاموش مفاہمت کے تحت طے کر لیا گیا ہو کہ ہندوستان میں انگریزی فوج صرف برطانوی یا یورپی باشندوں کی حفاظت تک محدود رہے گی۔ اس وقت راولپنڈی میں کئی سو یورپی اور برطانوی خاندان موجود تھے۔

راولپنڈی سول انتظامیہ کا ڈویژنل اور ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ مذہبی تناسب سے راولپنڈی ڈویژن میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت تھی۔ یہی صورتحال ضلع راولپنڈی کی تھی، البتہ راولپنڈی شہر میں سکھ اور ہندو اکثریت میں تھے۔ امیر ترین افراد سکھ تھے، کاروبار اور سود پر قرضہ دینے کا زیادہ کام انہی کے ہاتھ میں تھا۔ بیشتر دکانیں، تجارتی عمارتیں اور رہائشی سکیمیں ان کی ملکیت تھیں۔ یہ لوگ چند نسلوں پہلے ہندو کھتری اور اروڑہ ذات سے سکھ مذہب کی طرف منتقل ہوئے تھے۔ مشرقی پنجاب کے سکھ ان سکھوں کو 'پاپا' کہتے تھے۔ زیادہ تر ہندو چھوٹے دکاندار تھے، اگرچہ کئی سنار بھی تھے۔ راولپنڈی کی مسلم آبادی غریب تھی، ان کی اکثریت ہنرمندوں اور کم اجرت والے مزدوروں پر مشتمل تھی۔

یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ اس علاقے سے انگریز فوج میں بھرتی ہونے والی جنگجو قوموں کے افراد کا تعلق راجپوت، گکھڑ اور اعوان ذاتوں سے تھا۔ ان میں سے زیادہ تر افراد ضلع راولپنڈی کے باسی تھے (Tan, 2005)۔ راولپنڈی شہر اور ضلع کے رہنے والے افراد سے انٹرویو کے دوران مجھے پتہ چلا کہ سپہ گری علاقے کا واحد ذریعہ معاش تھا کیونکہ زراعت کا شعبہ اتنا ترقی یافتہ نہیں کہ اسے بطور روزگار اپنایا جاسکے۔ خطہ پوٹھوہار کی بنجر، پتھریلی اور سخت زمین کی آبپاشی کا واحد ذریعہ بارش ہے۔ اس کے علاوہ زمین کا رقبہ بھی کم تھا۔ کچھ افراد نے مجھے بتایا کہ انگریزوں نے دانستہ طور پر ان دیہی علاقوں میں اقتصادی ترقی کی حوصلہ شکنی کی تاکہ بیروزگار افراد انگریز فوج کے لیے چارے کا کام کرسکیں۔ بعض مواقع پر جب ڈیم اور آبپاشی کے منصوبے بنانے کی کوشش کی گئی تو فوج کے دباؤ پر منصوبے ترک کرنا پڑے۔ دیہی علاقوں میں تجارت اور دکانیں زیادہ تر سکھوں کی ملکیت تھیں جبکہ کچھ کاروبار ہندوؤں کا تھا۔ راولپنڈی شہر اور ضلع کے مسلمان سکھ ساہوکاروں کے بری طرح مقروض تھے۔

1947 میں جنگ عظیم کے خاتمے پر جنوب مغربی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور دنیا کے دیگر مقامات پر تعینات راولپنڈی ڈویژن کے فوجی واپس آنا شروع ہوگئے۔ کچھ بدستور بیرون ملک مقیم رہے۔ آبائی علاقوں کو واپس آنے والے سابق فوجیوں کو اندازہ ہوا کہ یہاں معاشی مشکلات ختم ہونے کی بجائے پہلے سے بڑھ گئی تھیں۔ چنانچہ کئی ریٹائر فوجی راولپنڈی شہر آکر روزگار کے متلاشی رہتے (انٹرویو، فیروز ڈار)۔ انہی میں سے کئی فوجی ضلع راولپنڈی، ملحقہ اضلاع کیمپبل پور (اب اٹک) اور جہلم میں ہندوؤں یا سکھوں کے دیہات پر حملوں میں ملوث رہے۔

1941 کی مردم شماری کے مطابق آبادی کی صورتحال		
راولپنڈی شہر (بشمول راولپنڈی میونسپلٹی، کینٹ اور چکلالہ)	**تعداد**	**فیصد تناسب**
تمام مذاہب	185,042	100
مسلمان	81,038	43.79
ہندو بشمول شیڈول کاسٹس	62,397	33.72
سکھ	32,054	17.32
عیسائی، ادھرمی اور دیگر مذاہب، یہودی، بودھ	9,957	5.38
ضلع راولپنڈی	**تعداد**	**فیصد تناسب**
تمام مذاہب	**785,231**	**100**
مسلمان	628,193	80
ہندو بشمول شیڈولڈ کاسٹس	82,453	10.5
سکھ	64,127	8.17
عیسائی، ادھرمی اور دیگر مذاہب، یہودی، بودھ	10,448	1.33

پنجاب کے دیگر حصوں کے برعکس راولپنڈی کو پہلے ہی پناہ گزینوں کی بڑی تعداد سے نمٹنا پڑا تھا کیونکہ دسمبر 1946 میں ہمسایہ صوبہ این ڈبلیو ایف پی کے ضلع ہزارہ سے ہندوؤں اور سکھوں کی بڑی تعداد راولپنڈی میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئی تھی۔ ماسٹر تارا سنگھ کی طرف سے مسلح ہونے کے اعلان کی خبریں 3 مارچ کو راولپنڈی پہنچیں جس سے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں

کے محلوں میں اشتعال انگیز سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ 4 مارچ کو مضافاتی علاقوں میں کچھ جھڑپیں ہوئیں تاہم شہر کے وسط میں پہلا تصادم 5 مارچ کو ہوا۔ 10 مارچ کی پاکستان ٹائمز کی اشاعت میں بتایا گیا کہ ہزارہ ضلع سے آنے والے ہجوم نے مری، جھیکا گلی، گھوڑا گلی اور لوئر ٹوپہ کے بازاروں پر دھاوا بول دیا۔ 12 مارچ کو کہوٹہ، گوجر خان اور مندرہ کے علاقوں میں جلاؤ گھیراؤ کے واقعات ہوئے پھر اس کا دائرہ فتح جنگ، حسن ابدال اور کیمبل پور تک پھیل گیا۔ دی ٹریبون کے 7 مارچ کے شمارے میں راولپنڈی میں ہونے والی جھڑپوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد 14 مارچ تک روزانہ اخبار میں تصادم کی خبریں موجود ہیں اور بتایا کہ ہجوم کی طرف سے راولپنڈی شہر کے بیرونی علاقوں اور مضافات کو بھی نشانہ بنایا جارہا ہے۔ مارچ 1947 میں راولپنڈی کی ضلعی انتظامیہ کا سربراہ انگریز ڈپٹی کمشنر سی ایل کوٹس تھا۔

احمد سلیم اور میں نے دسمبر 2004 میں راولپنڈی شہر اور ضلع میں کئی دن گزارے اور ایسے کئی افراد سے ملاقاتیں کیں جو مارچ 1947 کے واقعات کے عینی شاہد تھے۔ ان میں ممتاز ماہر تعلیم خواجہ مسعود احمد، ایک کوچوان، دو دکاندار اور دو سکھ (جن سے میں نے مارچ 2004 میں دہلی میں ملاقات کی تھی) شامل تھے۔ مارچ 1947 میں خاکسار تحریک کے ایک کارکن سے بھی میں ملا۔ ملاقات مئی 2002 کو لندن میں عالمی پنجابی کانفرنس کے دوران ہوئی۔

خواجہ مسعود احمد

"میں 1947 میں گورڈن کالج کا نوجوان لیکچرار تھا اور میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ 5 مارچ کو ہندوؤں، سکھوں کا مسلمانوں کے ہجوم کے ساتھ تصادم شہر کے وسط میں ہوا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سٹوارٹ (جو ایک امریکی تھی) شام کو ڈپٹی کمشنر مسٹر سی ایل کوٹس سے ملنے گئے لیکن انہوں نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر سٹوارٹ پریشانی کے عالم میں واپس آئے اور سٹاف کو بتایا کہ حکومت مسئلے سے نمٹنے میں سنجیدہ نہیں۔ اگلے روز راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے کارکن گلیوں میں یہ نعرے لگاتے رہے کہ اس بار (6 مارچ 1947 کو ہولی کا تہوار تھا) ہولی خونیں ہوگی، میں کالج سے باہر آیا تو دیکھا کہ مری روڈ کے ایک طرف مسلمان اور دوسری جانب ہند اور سکھ کھڑے تھے۔ دونوں فریقوں کے پاس چاقو اور چھریاں تھیں۔ وہ اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے لیکن چونکہ میں کالج کا استاد تھا اور یہ لوگ مجھے جانتے تھے اس لیے کسی نے مجھے ہراساں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا کمیونسٹ پارٹی کے دفتر چلا گیا۔ کامریڈ گر بخش سنگھ اور دیگر افراد نے ایسی بے احتیاطی پر مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ بعد ازاں گر بخش سنگھ مجھے خود گھر چھوڑنے آئے۔ اگلے کئی روز تک ہمارے پاس گھروں میں کھانے پینے کو کچھ نہ رہا کیونکہ دکانیں بند تھیں اور لوگ گھروں میں محصور رہے۔ کامریڈ دیشوا ناتھ سہگل جن کا تعلق راولپنڈی کے امیر ترین گھرانوں میں سے ایک سے تھا، وہ ہمارے لیے اپنے گھر سے کھانے پینے کی اشیا لاتے۔

"6،5 مارچ کو اچانک شہر بھر میں قرآنی اوراق زمین پر گرے پائے گئے۔ ایک خاکسار ورکر نے انہیں اٹھا کر کنویں میں پھینک دیا۔ یہ کنواں کالج کے بالکل باہر تھا۔ اس خاکسار کے ہندو اور سکھ دوست تھے چنانچہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کے محلے میں چلا گیا۔ اچانک ایک تیز چیخ سنائی دی۔ کسی نے اسے چھرا گھونپ دیا تھا۔ اس کی لاش اپنے خون میں ڈوبی پڑی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس سنگین جرم میں آر ایس ایس ملوث تھی۔ اس واقعے سے شہر میں

ہنگامے پھوٹ پڑے اور جلاؤ گھیراؤ اور چھرا گھونپنے کی کئی وارداتیں ہوئیں۔ صرف کینٹ کا علاقہ محفوظ رہا جہاں امیر لوگوں کی رہائشگاہیں تھیں۔

"اگرچہ سیاسی حوالے سے راولپنڈی ایک متحرک شہر تھا لیکن مختلف گروہوں کے درمیان تصادم شاذونادر ہوتا تھا۔ تمام مذاہب کے ممتاز افراد کے ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تعلقات تھے جس کے نتیجے میں عام افراد کے درمیان اچھے روابط قائم کرنے میں مدد ملی۔ گورڈن کالج ثقافتی اور علمی تنوع کا سرچشمہ تھا۔ دانشور، ماہرین تعلیم، صحافی اور سماجی معاملات سے باخبر افراد ہر روز کالج کی کنٹین میں جمع ہوتے اور گرما گرم مباحثوں میں حصہ لیتے۔ تمام بڑی جماعتوں کے حامی بھی وہاں موجود ہوتے لیکن چونکہ وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے اس لیے خیالات کے تبادلے میں کبھی بدمزگی پیدا نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ کالج کا ماحول بھی کثیر المذہب تھا۔ اساتذہ اور طلبا دونوں مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت کم ہندو، سکھ اور مسلمان طلبا کالج ہوسٹل میں مقیم تھے۔ میں کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا۔ 1946 میں مشہور بھارتی اداکار بلراج ساہنی جن کا تعلق راولپنڈی سے تھا لیکن فلمی شعبے سے متعلق کی بنا پر وہ بمبے میں رہ رہے تھے نے اپنے آبائی شہر کا دورہ کیا۔ وہ ہماری (کمیونسٹ پارٹی) سرگرمیوں سے کافی متاثر ہوئے۔ وہ خود بھی مارکسسٹ تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہندوستان جلد آزاد ہوگا اور ہم اپنے عوام کے ترقی پسند مستقبل کی منصوبہ بندی کریں گے۔ مارچ 1947 کے فسادات کے بعد بھی ہمیں یقین نہیں تھا کہ ہندوستان آخرکار تقسیم ہو جائے گا۔"

شیخ نوردین

"میں نے پوری زندگی تانگے کی کوچوانی کی۔ تشدد اس وقت شروع ہوا جب سکھوں نے ایک مظاہرے کے دوران پاکستان مخالف نعرے لگائے۔ راولپنڈی کی ممتاز شخصیت چودھری مولا کے بیٹے نے مظاہرین کو اشتعال انگیز زبان استعمال کرنے سے روکا تو ایک سکھ نے کرپان سے حملہ کر کے اس کی ٹانگ پر گہرا زخم لگا دیا۔ چودھری مولا کو واقعے کا علم ہوا تو وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں آیا۔ اس کے بعد کئی روز تک فسادات چلتے رہے۔ کئی افراد ہلاک یا زخمی ہوئے۔ املاک کا بھاری نقصان ہوا اور لوٹ مار کے ساتھ آگ لگانے کے واقعات بھی ہوئے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ زیادہ نقصان کس فریق کا ہوا لیکن سکھوں کے پاس بہرحال جدید اسلحہ تھا۔

"بعد میں تو غیر مسلموں کو یہاں سے بھاگنا پڑا لیکن شروع میں مقابلہ برابر ہی رہا۔ میں نے پوری زندگی راولپنڈی میں گزاری۔ 1947 کے ہنگاموں سے پہلے شہر میں ہندوؤں اور سکھوں کی بڑی آبادی تھی۔ مجموعی طور پر یہ بہت اچھے اور مہربان لوگ تھے۔ دت برہمنوں کا ایک خاندان ہمیشہ میرے تانگے پر سفر کرتا تھا اور ایک خاتون خانہ مجھے اپنا بھائی کہتی تھی۔ وہ لوگ مجھے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں پر تحائف بھی دیتے تھے۔"

شیخ محمد اسحاق

"ہمارے بزرگ کچھ نسلوں قبل اروڑہ ذات کی ذیلی ذات تھاپڑ سے مسلمان ہوئے تھے۔ شہر کے ایک کاروباری مرکز میں ہماری دکان تھی۔ ہمارے کاروباری رابطے پورے پنجاب میں پھیلے تھے اور میں اور میرے والد اپنی ریٹیل شاپ کے لیے مشرقی پنجاب

سے سامان لایا کرتے تھے۔ راولپنڈی میں 1946 کے انتخابات تک کوئی خاص سیاسی سرگرمی نہیں تھی۔ یونینسٹ پارٹی بڑی جماعت تھی جبکہ کانگریس انگریز مخالف عناصر کا مضبوط گڑھ تھی۔ خاکسار اور احرار بھی فعال تھے۔ کمیونسٹوں کی تعداد بہت کم تھی۔ آر ایس ایس کے کارکن بھی تھوڑا بہت تعداد میں موجود تھے۔ مسلم لیگ کو اس وقت اہمیت ملنا شروع ہوئی جب 1945-46 میں انتخابات ہوئے۔

"گڑبڑ کا آغاز 4 مارچ کی شام کو ہوا۔ اگرچہ یہ صرف نعرے بازی تک محدود تھی۔ پہلا تصادم 5 مارچ کو اس وقت ہوا جب سکھوں اور ہندوؤں کے جلوس کی مسلم لیگ کے حامیوں کے ساتھ جھڑپ ہوئی۔ 6 مارچ جمعرات کو ہندوؤں کا تہوار ہولی تھا لیکن جشن عام کی بجائے ایک روز قبل ہونے والے تصادم کا سلسلہ ہولی پر بھی جاری رہا۔ نہر و روڈ (اب اسے غزنوی روڈ کہتے ہیں) پر فائرنگ کے واقعات بھی ہوئے۔ دونوں اطراف سے ایک دوسرے پر فائرنگ کی گئی۔ دیگر مقامات پر جھڑپیں ہوئیں۔ کرتار پورہ میں سکھوں اور ہندووں نے کچھ مسلمانوں پر فائرنگ کی جس سے کچھ اموات بھی ہوئیں۔ دوسری طرف 'رٹہ' کے علاقوں میں کچھ سکھوں کو قتل کر دیا گیا اور ڈھوک میں سکھوں کو جبراً اسلام قبول کرا کے انکے سر اور داڑھی کے بال مونڈھ دیے گئے۔ سکھوں نے مزاحمت کی کوشش کی تو انہیں مسلمان ہجوم نے تشدد کر کے جان سے مار ڈالا۔ اسی طرح سکھوں کے مضبوط مرکز باغ سرداراں میں مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑے گئے۔ سکھوں نے بندوقیں اور کرپانیں استعمال کیں۔ البتہ زیادہ تر راولپنڈی کے ارد گرد کے دیہات میں غیر مسلمانوں کو انتہائی برے سلوک کا نشانہ بنایا گیا۔ ان میں سے کچھ بھاگ کر راولپنڈی آ گئے۔ ان لوگوں سے ہمیں اس سانحے کا علم ہوا۔"

حاجی شیر محمد

"5 مارچ کو ہمارے سکھ ہمسایوں نے ہمیں خبردار کیا کہ ہم آج دکان نہ کھولیں کیونکہ سکھ برادری کے لوگ مسلمانوں پر حملوں کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ 6 مارچ کو جھڑپیں بہت زیادہ شدید تھیں۔ مسلمانوں نے جامع مسجد کے اندر سے گولیاں چلائیں جبکہ سکھوں نے مخالف سمت میں سڑک کے پار سے فائرنگ کی۔ اس واقعے میں کچھ ہلاکتیں ہوئیں۔ یہ سچ ہے کہ سکھوں اور ہندوؤں کو ڈھوک جیسے علاقوں میں زبردستی تبدیلی مذہب پر مجبور کیا گیا۔ ان کی داڑھیاں اور کیس زبردستی مونڈھ دیے گئے۔ کچھ سکھوں نے اپنے مذہب کی علامت کی بے حرمتی پر شرم کے مارے خودکشی کر لی۔ تشدد تیزی سے پھیل گیا اور دیہات میں اس کی شدت کہیں زیادہ تھی۔ کئی ہندو اور سکھ بھاگ کر راولپنڈی شہر میں آ گئے۔ ان کی حالت زار بلاشبہ قابل رحم تھی۔ غیر مسلموں کے ساتھ ایسا سلوک اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں تھا۔"

راشد نثار

"راولپنڈی میں صورتحال دونوں طرف سے نعرے بازی کے ساتھ خراب ہونا شروع ہوئی۔ 6 مارچ کو محلہ لال کرتی میں ایک اجلاس میں تمام مذاہب کے عمائدین نے امن کمیٹی تشکیل دی۔ لیکن کمیٹی کا ایک مسلمان رکن شیخ برکت سازشی نکلا۔ 7 مارچ کو شیخ برکت کی بیٹھک میں ایک اجلاس ہوا۔ جب کمیٹی کے ہندو اور سکھ ارکان وہاں پہنچے تو ان پر دھوکہ دہی سے حملہ کر دیا۔ سندر

سنگھ حلوائی نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن چھریوں چاقوؤں سے لیس ہجوم نے اس کا تعاقب کیا۔ اس نے جان بچانے کے لیے ایک مسجد میں پناہ لی اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا لیکن حملہ آوروں نے یقین کرنے کی بجائے وضو والی جگہ پر لٹا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ انہوں نے اس کی زبان منہ سے باہر نکال دی، داڑھی صاف کر دی اور لاش کو گلیوں میں گھسیٹا۔ اس کا خون وضو والے تالاب کے ارد گرد پھیلا تھا۔ گلیوں میں لاش گھسیٹنے سے خون اور مٹی کی آمیزش سے ایک ملغوبہ بن گیا۔ یہ ایک کریہہ منظر تھا۔ مجھے آج تک یہ منظر یاد ہے۔ پولیس کو اجلاس کے انعقاد کا پتہ تھا اور ایسا لگتا ہے وہ اس منصوبے سے بھی پیشگی آگاہ تھی۔ لیکن مداخلت کرنے کی بجائے پولیس خاموش تماشائی بن کر دیکھتی رہی۔

"ہمارے ہمسائے میں مقیم سکھ خاندان نے ہمارے گھر میں پناہ لی۔ پتہ چلنے پر ایک ہجوم ہمارے گھر کے باہر جمع ہو گیا اور سکھوں کو ان کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا لیکن ہم نے انکار کر دیا۔ ہمارے خاندان کی وابستگی خاکسار تحریک سے تھی۔ ہمارے لیڈر اشرف خان نے ہم سے عہد لیا تھا کہ ہم مصیبت میں مبتلا ہونے والوں کی بلا تفریق مذہب امداد کریں گے۔ یہی وجہ تھی کہ خاکساروں نے ہمیشہ آگے آگے ہو کر کئی افراد کی جانیں بچائیں حالانکہ ہمارے ایک خاکسار بھائی کو 5 مارچ کو ہندو محلے میں قتل کر دیا گیا۔ غالب امکان ہے کہ آر ایس ایس اس قتل کے پیچھے ہو لیکن ہم نے اس کے باوجود انسانیت کی خدمت جاری رکھی۔ تقسیم کے بعد بھی کئی ہندو اور سکھ خاندان راولپنڈی میں تھے۔ ہم نے انہیں بحفاظت پناہ گزین کیمپوں تک پہنچایا۔ ہمارا دائرہ کار شہر تک محدود تھا۔ دیہات میں کیا ہوا ہمیں اس کا کچھ علم نہیں۔"

ہر کشن سنگھ مہتہ

"ہمارا تعلق تحصیل گوجر خان کے گاؤں کونتریلا سے تھا لیکن میں جب چھوٹا بچہ تھا تو ہم راولپنڈی منتقل ہو گئے۔ ہمارا گھر خالصہ ہائی سکول کے پاس واقع گلی 'مائی ویرو دی بنی' میں تھا۔ ہمارا گھر دراصل مارچ 1947 میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ مکمل طور ہندوؤں اور سکھوں کا علاقہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مارچ 1947 کے فسادات میں دونوں طرف (ہندوؤں- سکھوں اور مسلمانوں) سے بندوقوں کا استعمال ہوا تھا۔ زیادہ تر ہلاکتیں راولپنڈی کے مضافاتی دیہی علاقوں میں ہوئیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہزارہ سے (مسلمانوں کے حملوں سے بھاگ کر) آنے والے غیر مسلموں کو ہمارے علاقے میں پناہ دی گئی۔ میرے والد ریلوے میں ٹکٹ ایگزامینر تھے۔ جب مسلمانوں کے ایک گروہ نے میرے والد کو گھیر کر ان کے بال منڈھوانے کی کوشش کی تو ایک مسلمان قبائلی سردار گلو نے انہیں بچایا۔ گلو بعد ازاں میرے والد کو راولپنڈی لے آیا۔ وہ میانوالی کے ایک مسلح قبیلے کا سردار تھا۔ پھر ہم جون میں دہلی منتقل ہو گئے۔"

امر سنگھ

"پنجاب اسمبلی کے باہر ماسٹر تارا سنگھ کی تقریر کی خبر اسی روز راولپنڈی پہنچ گئی اور شام تک کشیدگی میں اضافہ شروع ہو گیا۔ 5 مارچ ہندو، سکھ مظاہرین اور مسلمانوں کے درمیان کھلے عام جھڑپوں کا پہلا روز تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی حکومت کے قیام کے خلاف نعرے لگانے والے مظاہرین کو چوہدری مولا کے بیٹے نے للکارا۔ پہلے تصادم میں ہندوؤں اور سکھوں کا بھاری نقصان

ہوا لیکن 6 مارچ کی شام تک ہم نے مسلمانوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ہم نے نہایت دلیری سے مقابلہ کیا۔ صرف ایک واقعے میں ایروز سینما کے مالکان نے 30 مسلمانوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ کئی اور مقامات پر بھی مسلمانوں کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔ شہر میں ہماری پوزیشن نہایت مضبوط تھی۔

''ایک ہندو پولیس اہلکار نے مجھے بتایا کہ اس نے ساتھی مسلمان پولیس اہلکاروں کو یہ کہتے سنا تھا کہ انگریزوں نے ہمیں کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ تین روز کے اندر غیر مسلموں کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہو کر لو لیکن ہمارے پاس بندوقیں تھیں اور مسلمانوں کو فساد برپا کرنے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ جب شہر میں ان کی ایک نہ چلی تو غضبناک ہو کر مسلمانوں نے دیہات کا رخ کر لیا۔ جہاں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان حملوں میں سکھوں اور ہندوؤں کا قتل عام کیا گیا۔ البتہ میں خاکساروں خصوصاً انکے لیڈر اشرف خان کو زبردست خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ جنہوں نے کئی سکھوں اور ہندوؤں کی جانیں بچائیں۔ البتہ یہ حسن سلوک صرف خاکساروں کی حد تک تھا۔ مسلم لیگ کے غنڈوں نے دیہات میں بے یارو مددگار غیر مسلموں کے لیے ذرا سی بھی رحمدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

''میں یہاں برملا اعتراف کرتا ہوں کہ مسلمانوں کو آخر کار ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف کیے گئے جرائم کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ وسط اگست 1947 کے بعد میں نے خود مشرقی پنجاب کے کئی علاقوں میں مسلمانوں پر حملوں میں حصہ لیا۔ براہ مہربانی آپ (مصنف) مجھ سے تفصیل مت پوچھیں لیکن مسلمانوں نے ہمارے ساتھ جو بدسلوکی کی، یہ سب اس کا انتقام تھا۔''

مدن لال سنگھ

''جی ہاں 6 مارچ ہی وہ دن تھا جب راولپنڈی خونیں فسادات کا مرکز بن گیا۔ مندر کلیان داس مندر کے قریب سکھوں اور مسلمان کے درمیان فائرنگ کے تبادلے میں دونوں فریقوں کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ شہر میں سکھ اپنے دفاع میں بہتر پوزیشن میں تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں سے بہتر جنگجو تھے۔ مسلمان شرپسندوں کا سرغنہ چودھری مولا اور اس کا بھائی چودھری حقا تھا۔ سکھوں نے ان دونوں کے سر کی قیمت 50 ہزار روپے مقرر کی تھی اور انہوں نے بھی کسی بھی سکھ لیڈر (یعنی تمام بڑے رہنماؤں) کے سر کی قیمت 50 ہزار روپے مقرر کی تھی۔ یہ سچ ہے کہ خاکسار تحریک کے ارکان نے غیر مسلموں کی زندگی بچانے کے لیے جو کچھ ہو اوہ کیا۔ البتہ مسلمان پولیس اہلکار خاموش تماشائی بنے رہے اور جب فوج تعینات ہوئی تو تب حالات کنٹرول میں آئے۔

''جب حالات بگڑے تو سکھوں نے ایک مسلمان مزار کے قریب خفیہ جگہ پر بموں کی تیاری شروع کر دی۔ ممتاز حریت پسند بھگت سنگھ کا ساتھی بابا گر بخش سنگھ بھی اس کارروائی میں ملوث تھا۔ ایک دن گر بخش سنگھ بم تیار کر رہا تھا کہ دھماکہ خیز مواد پھٹ گیا جس سے اس کا پیٹ پھٹ گیا اور انتڑیاں باہر نکل آئیں۔ وہ سخت تکلیف میں تھا لیکن پولیس کی گرفتاری سے ڈرا ہوا تھا۔ اس نے میرے والد رام سنگھ سے کہا کہ اسے جان سے مار دیں تاکہ تکلیف سے نجات مل سکے لیکن میرے والد کو حوصلہ نہ ہوا۔ آخر کار گر بخش سنگھ نے اپنی کرپان سینے میں گھونپ کر خودکشی کر لی۔''

ایس جی پی سی رپورٹ کا نیچے دیا گیا پیرا اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ راولپنڈی شہر کے پر تشدد واقعات میں شروع میں سکھوں کو بالادستی حاصل تھی:

> 5 مارچ 1947 کو لاہور میں ہندو اور سکھ طلبا پر فائرنگ کے واقعے کی خبر ملنے پر راولپنڈی میں ہندو اور سکھ طلبا نے مظاہرہ کیا اور پنجاب میں فرقہ وارانہ (مسلم لیگ کی) حکومت قائم کرنے کی کوششوں پر احتجاج کیا۔ اس جلوس پر مسلم لیگی کارکنوں نے دھاوا بول دیا۔ اس کھلی جنگ میں مسلمانوں کو بھاری ہزیمت اٹھانا پڑی۔ اس کے بعد نواحی علاقوں سے پیر آف گولڑہ شریف کی شہ پر مسلمانوں کا گروہ راولپنڈی شہر میں آیا لیکن ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے محلوں میں خندقیں کھود کر ان کا مقابلہ کیا چنانچہ مسلمانوں کو ایک بار پھر لڑائی میں شکست ہوئی (p.78)۔

دیہات پر حملے

راولپنڈی شہر سے باہر یعنی دیہی علاقوں میں صورتحال تقریباً یکسر مسلمانوں کے حق میں تھی۔ مثال کے طور پر اخبار دی ٹریبون نے 9 مارچ کو رپورٹ دی کہ مسلمان شرپسندوں نے 7 مارچ کو ٹیکسلا سٹیشن پر ٹرین روک کر 22 ہندوؤں اور سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس واقعے کا ایس جی پی سی رپورٹ (86 :1991) میں بھی ذکر ہے۔ پولیس کی ایک رپورٹ میں بھی ٹرین حملے کی تفصیل دی گئی ہے۔ (87 :1995)۔ یوں راولپنڈی میں ایک 'متوازن مقابلے' کے برعکس دیہات میں سکھوں اور ہندوؤں کے خلاف کیمبل پور، راولپنڈی اور جہلم میں کارروائیاں یکطرفہ تھیں۔ عمومی تاثر یہ ملتا ہے کہ سکھ دیہات پر حملوں کے باعث مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان چپقلش آنے والے ہفتوں اور مہینوں میں مصالحت کی کوششوں کے باوجود مستقل قائم رہی۔

راولپنڈی کے فسادات پر جسٹس منیر کے تاثرات

جسٹس محمد منیر جو پنجاب باؤنڈری کمیشن میں مسلم لیگ کے نمائندہ تھے اور بعد ازاں پاکستان کے چیف جسٹس بنے نے اپنی کتاب 'جناح سے ضیاء تک' میں راولپنڈی کے فسادات کے حوالے سے یہ لکھا ہے:

> مارچ 1947 میں راولپنڈی ضلع اور ملحقہ علاقوں میں ہنگامے پھوٹ پڑے اور مسلمان اس میں جارح تھے۔ میں نے اس معاملے پر قائداعظم سے بات کی اور کہا کہ مسلمانوں کا رویہ ٹھیک نہیں اور آپ کو خود یا مسلم لیگ کے کسی ذمہ دار عہدیدار کو راولپنڈی جانا چاہیے تاکہ اقلیتوں کو یقین دلایا جائے کہ پاکستان اگر بن گیا تو وہاں ان کے حقوق مسلمانوں کی طرح ایک آزاد شہری کی حیثیت سے محفوظ ہوں گے۔ انہوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔ البتہ یہ 5 جون 1947 کے آزادی پلان (میرے خیال میں جسٹس منیر نے یہاں غلطی کی ہے۔ یہ 3 جون کا پلان تھا۔ مصنف) سے پہلے کا معاملہ تھا۔ قائداعظم نے نہایت پر اعتماد اور دوٹوک لہجے میں فرمایا، "مجھے ایک بار اختیار سنبھالنے دو پھر تم ایسی کوئی فضول بکواس نہیں سنو گے۔" بہر حال

انہوں نے نواب ممدوٹ کو حکم دیا کہ وہ ذاتی طور پر راولپنڈی جائیں۔ راولپنڈی میں گڑبڑ کے بعد سکھوں نے ہندوؤں کے تعاون سے ایک منصوبے 'سکھ پلان' پر عملدرآمد شروع کر دیا تاکہ پنجاب سے مسلمانوں کو بے دخل کیا جا سکے (17 :1980)۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ محمد علی جناح سمیت مسلم لیگ کے کسی رہنما نے عوامی سطح پر راولپنڈی میں فسادات اور ظلم و جبر کی مذمت میں کوئی بیان جاری نہیں کیا۔ میں نے اس دور کے بڑے انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز اور ٹربیون کھنگال ڈالے لیکن مجھے ایسا کوئی بیان نظر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ مسلم لیگ کے پنجاب کی سطح کے کسی لیڈر نے بھی اس قتل عام کی کہیں مذمت نہیں کی۔ راولپنڈی میں مظالم کو سکھ طویل عرصے تک نہ بھولے اور بعد ازاں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان اعتماد کی بحالی کے لیے شروع کیے گئے اقدامات پر بھی یہ واقعات سایہ فگن رہے۔ میجر جنرل (ر) شاہد حامد نے کئی ماہ بعد اس کی کڑی مذمت کی۔ 13 ستمبر 1947 کو جب مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام بدترین سطح پر پہنچ چکا تھا تو انہوں نے کہا: "سکھوں نے عہد کیا ہے کہ راولپنڈی میں سکھوں کی ہلاکتوں کے انتقام میں ہندوستان میں موجود ہر مسلمان کو قتل کر دیں گے" (Hamid, 1986: 248)۔

کھوسلہ، ایس جی پی سی اور دیگر رپورٹیں

ضلع راولپنڈی اور متصل علاقوں میں سکھوں کے بھاری جانی نقصان کے بارے میں ایس جی پی سی اور کھوسلہ رپورٹوں میں مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ ایس جی پی سی رپورٹ میں مرنے والوں کی تعداد 7 ہزار بتائی گئی ہے جبکہ کھوسلہ رپورٹ میں حکومتی اعداد و شمار سے مماثل تعداد 2 ہزار دی گئی ہے۔ گیانندر پانڈے لکھتے ہیں کہ پہلے ہی اپریل کے آخر تک تقریباً 80 ہزار ہندوؤں اور سکھوں بالخصوص راولپنڈی کے مکینوں نے وسطی اور مشرقی پنجاب حتیٰ کہ دہلی میں پناہ لے لی تھی (24 :2001)۔ انہوں نے خود ہندو مہا سبھا دستاویزات میں مسلمانوں کے پر تشدد حملوں سے متعلق پولیس کی 3 ایف آئی آرز دیکھی ہیں۔ یہ رپورٹیں مغل، بیوال اور بسالی کے دیہات میں کیے گئے جبر و تشدد کا حوالہ دیتی ہیں۔ ان حملوں میں بوڑھوں، ناتواں افراد اور بچوں سمیت سینکڑوں لوگوں کو ہلاک کیا گیا۔ رپورٹ میں نہ صرف متاثرہ افراد بلکہ بعض ایسے مقامی افراد کے بھی نام دیے گئے ہیں جو حملوں میں ملوث رہے (Ibid: 74-9)۔ ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل کمیٹی نے 'راولپنڈی سے زیادتی' کے عنوان سے ایک تصویری کتابچہ بھی مرتب کیا ہے جس میں ظلم کو آشکار کیا گیا ہے۔ حکومت نے فوراً اس کتابچے کی اشاعت پر پابندی لگا دی کیونکہ اس سے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیزی کا خطرہ تھا۔

کھوسلہ اور ایس جی پی سی رپورٹ میں اس حقیقت کا کوئی ذکر نہیں کہ سکھوں نے اپنے ہاتھوں سے بڑی تعداد میں اپنے بچوں اور عورتوں کی گردنیں اڑا دیں، انہیں زندہ جلا دیا یا پھر گولی مار دی تھی۔ کیا ایسا امکان موجود تھا کہ یہ مرنے والی عورتیں اگر زندہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ جاتیں تو وہ انہیں زبردستی مذہب تبدیل کیے بغیر ان کی جان بخشی کر دیتے؟ یہ یقیناً ایک اہم نکتہ ہے۔ بہر صورت ان دونوں رپورٹوں میں اس بات کا سرے سے ذکر نہیں کہ راولپنڈی میں اشتعال انگیزی کا آغاز پہلے 5 مارچ 1947 کو ہندو اور سکھ مظاہرین نے کیا تھا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ارکان نے متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا اور یہ رپورٹ دی:

یہ فسادات نہیں بلکہ سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت شروع کی گئی عسکری مہم جوئی تھی۔ جھڑپوں سے بہت پہلے سابق ایم ایل اے سید اکبر خان (شاہ؟) کہوٹہ کے کیپٹن لال خان، تحصیلدار، سب انسپکٹر پولیس، مولوی عبدالرحمان اور کالا خان کی سربراہی میں مساجد میں اجلاس ہوئے اور اقلیتوں کے خلاف اعلان جہاد کرتے ہوئے دیہی علاقوں سے رضاکار منگوانے کے لیے ایلچی بھجوانے کا فیصلہ کیا گیا۔ گھڑ سوار ریٹائر فوجیوں کی قیادت میں کہوٹہ، تھوا خالصہ اور ناڑا وغیرہ پر حملہ کرنے والے مسلم گروہ نامی گنوں، پستولوں، رائفلوں، دستی بموں، ٹوکوں، پٹرول کے ڈبوں بلکہ فوجیوں کی مخصوص جنگی عینکوں (Feild Glasses) سے لیس تھے۔

یہ لوگ 4 گروپوں میں تقسیم کیے گئے۔ 1: آتشیں اسلحے سے لیس، 2: تالے توڑنے کے ماہر، 3: پٹرول اور مٹی کے تیل بردار، 4: گھوڑوں، اونٹوں کے انچارج، جو لوٹا گیا مال منتقل کرنے کے لیے استعمال کیے گئے۔۔۔ اس کے علاوہ مولوی اور حجام بھی ان کے ساتھ تھے تاکہ قتل یا جنسی زیادتی سے کسی نہ کسی طرح بچ جانے والوں کو مشرف بہ اسلام کیا جا سکے۔ حجاموں نے سکھوں کے سر اور داڑھی کے بال کاٹ ڈالے اور ان کے ختنے بھی کیے۔ مولویوں نے کلمے پڑھائے اور جبری شادیاں بھی کی گئیں۔ ان کے بعد لٹیرے تھے جن میں مرد اور خواتین دونوں شامل تھے (Talbot, 2008: 425)۔

حملوں کا آغاز 6 مارچ کی شام کو ہوا جب مسلمانوں نے راولپنڈی شہر میں انتہائی مسلح سکھوں سے پسپائی کے بعد نواحی دیہات کا رخ کیا۔ 11 سے 14 دسمبر 2004 کے درمیان میں (مصنف) نے اپنے دوست احمد سلیم کے ساتھ ضلع راولپنڈی کے ان دیہات کا دورہ کیا جہاں 1947 میں حملے کیے گئے۔ ہم نے گاؤں تھوا خالصہ جانے سے گریز کیا۔ جس کی ناقابل فراموش کہانی بھارتی مصنفہ اروشی بٹالیہ نے اپنی شاہکار کتاب 'دی ادر سائیڈ آف سائلنس' (The Other Side of Silence) میں کیا۔ تھوا خالصہ مشہور پاکستانی ایٹمی پلانٹ والے علاقے کہوٹہ کے قریب واقع ہے۔ کہوٹہ 2 ہزار ہندوؤں، سکھوں اور 1500 مسلمانوں پر مشتمل نسبتاً ایک بڑا گاؤں (موضع) تھا۔ اپنی تصنیف 'فریڈم ایٹ مڈنائٹ' (Freedom at Midnight) میں لیری کولنز اور ڈومینیق لیپائرے نے کہوٹہ کے سانحے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> مسلمانوں کے جتھے نے کہوٹہ پر بھیڑیوں کے غول کی شکل میں ہلہ بول دیا۔ بالٹیوں میں بھرا تیل چھڑک کر سکھوں اور ہندوؤں کے گھروں کو جلایا گیا۔ چند ہی لمحوں میں پورا علاقہ شعلوں میں گھر گیا اور آگ میں پھنسے افراد بے بسی کے عالم میں چیخنے چلانے لگے اور مدد کے لیے پکارتے رہے لیکن شعلوں نے ان کو نگل لیا۔ جنہوں نے آگ سے جان بچائی انہیں پکڑ کر باندھ دیا گیا اور پھر تیل چھڑک کر زندہ جلا دیا گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں کو لگائی آگ پھیلتے پھیلتے بے قابو ہو گئی اور مسلمانوں کے مکانوں تک بھی جا پہنچی چنانچہ پورا کہوٹہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ چند ہی ہندو اور سکھ عورتیں زندہ بچ سکیں۔ انہیں یا تو بستروں سے اٹھوا کر زیادتی کا نشانہ بنایا گیا یا پھر جبراً ان کا مذہب تبدیل کیا گیا۔ کچھ جنم جلی عورتیں بھاگ کر واپس آ گئیں اور آگ میں جلنے والے اپنے خاندانوں کے ساتھ زندہ جل مریں (1975: 139)۔

ان دنوں کہوٹہ کا علاقہ انتہائی حساس ہے اور یہاں غیر ملکیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔یہاں پولیس اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی موجودگی بھی بہت زیادہ ہے۔ اگرچہ میں پاکستانی ہوں لیکن سویڈن کی شہریت بھی رکھتا ہوں۔ اس تناظر میں میں نے ایسے حساس علاقے میں جا کر تحقیق کرنے سے گریز کیا۔ البتہ ہم دونوں ایک اور گاؤں دوبیراں گئے جو آزاد کشمیر کی سرحد پر واقع ہے اور جہاں سکھوں کا مکمل صفایا کر دیا گیا۔ وہاں بھی پتہ چلا کر پولیس اور خفیہ والوں کی کڑی نگرانی ہے اس لیے ہم نے بھی وہاں کوئی انٹرویو کرنا مناسب نہ سمجھا۔

تھمالی (دھمالی) میں قتل عام

بہر حال میں تحصیل کہوٹہ کے گاؤں تھمالی (دھمالی) جانے کا نہایت مشتاق تھا۔ میں نے کھوسلہ اور طالب کی رپورٹوں میں یہاں قتل عام کے بارے میں پڑھا تھا۔ مارچ 2004 میں میری ملاقات ریٹائر بھارتی سفارتکار مونی چڈا سے ہوئی۔ جنہوں نے اپنے دورہ راولپنڈی اور تھمالی کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی:

”1983 میں سارک تنظیم کے اجلاس میں شرکت کے لیے وفد میری سربراہی میں اسلام آباد گیا۔ یوں مجھے ان جگہوں پر واپس جانے کا موقع ملا جہاں سے میرے خاندان کو 1947 میں بھاگنا پڑا۔ میرے کئی رشتہ داروں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا لیکن میں ان جگہوں کو کبھی نہیں بھلا سکا جہاں ہم ایک دور میں رہتے تھے اور ہمارا مسلمانوں کے ساتھ بھائی چارہ تھا۔ خوش قسمتی سے مسٹر ریاض کھوکھر (بعد ازاں سیکرٹری خارجہ ریٹائر ہوئے) کو جو بھارت میں پاکستانی ہائی کمیشن میں ان دنوں قونصلر تھے نے مجھے آبائی علاقوں، کولار، تھمالی اور گوجر خان۔۔۔ کے دورے کی اجازت دلوانے میں میری مدد کی۔ میں 1947 میں چھوٹا لڑکا تھا لیکن اسی سرزمین پر واپس قدم رکھنے کے بعد کئی پرانی یادیں عود کر آئیں۔

”میں جہاں کہیں بھی گیا وہاں کے لوگ میری مدد کے لیے آگے آئے۔ ان کی گرمجوشی حقیقی اور فطری تھی۔ البتہ میں جہاں کہیں بھی گیا۔ آئی ایس آئی کی ایک کار نے میرا پیچھا ضرور کیا۔ جب ایک جگہ میں نے رک کر اس سائن بورڈ کی تصویر لینے کی کوشش کی جس پر 'تھمالی' لکھا تھا تو آئی ایس آئی والوں نے مجھے روکا اور استفسار کیا کہ کیا میرے پاس یہاں آنے کا اجازت نامہ ہے؟ میں نے انہیں اجازت نامہ دکھا دیا۔ وہ دیکھ کر انٹیلی جنس اہلکاروں نے مایوسی کا اظہار کیا لیکن اس کے بعد انہوں نے مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ کی، البتہ انہوں نے میرا تعاقب جاری رکھا۔ عام لوگوں کے رویے اور ریاستی اہلکاروں کے سلوک میں یہ بڑا واضح تضاد تھا۔

”کلر سیداں میں خوش قسمتی سے میری ملاقات ایک معمر شخص سے ہوئی (اس کی عمر 90 سال تھی) جو میرے خاندان کو جانتا تھا۔ اس کو میرے رشتہ داروں کے نام بھی یاد تھے اور اس نے مجھے ہمارے گھر بھی دکھائے۔ اس نے بتایا کہ خون آشام حملہ آور گاؤں سے باہر سے آتے تھے۔ جب میں وہاں سے رخصت ہونے لگا تو اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں اور اس نے گرمجوشی سے میرے ساتھ معانقہ کیا۔“

مونی چڈا نے بعد ازاں مجھے بتایا کہ ان کا ایک رشتہ دار رنجیت سنگھ بھسین تھمالی پر حملے میں بچ گیا تھا۔ انہوں نے مجھے اس سے ملوانے کی پیشکش کی۔ رنجیت سنگھ کپور تھلہ ریاست جو اب بھارتی پنجاب میں ہے اور جہاں سکھ اشرافیہ رہتی ہے میں

رہتا ہے۔ اگلے روز مجھے سٹاک ہوم کے لیے پرواز پکڑنا تھی لیکن میں نے آئندہ دورے میں اس سے ملنے کی شدید خواہش کا اظہار کیا۔ بعد ازاں دسمبر 2004 میں میں پاکستان میں تھا اور مجھے چند ہفتوں میں بھارت بھی جانا تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے تھمالی کا دورہ کر کے بعد میں کپور تھلہ میں رنجیت سنگھ بھسین سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

ہم 14 دسمبر 2004 کی سہ پہر کو تھمالی پہنچے۔ یہ ایک بڑا گاؤں تھا جہاں پختہ مگر تنگ گلیاں تھیں۔ گلیوں کی دونوں اطراف میں اینٹوں کے مکانات تھے جو لگتا تھا کہ کافی عرصہ پہلے تعمیر کیے گئے تھے۔ ہم گاؤں کے سکول میں گئے جس کے ہندوماسٹر کو علاقے کے سرکاری ڈاکٹر ذوالفقار نے ہماری آمد کی اطلاع دے رکھی تھی۔ ڈاکٹر ذوالفقار ہمارے راولپنڈی میں اہم ترین واقف کار علی صفدر کے رشتہ دار تھے۔ ہمیں پتہ چلا کہ تھمالی کے بیشتر باسی آزاد کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ انہیں سکھوں اور ہندوؤں کی متروکہ جائیدادیں الاٹ کی گئی تھیں۔ البتہ تقسیم سے پہلے کے بھی کچھ خاندان ابھی تک تھمالی سے مقیم تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ازراہ مہربانی ہمارے لیے تھمالی کے آزادی سے پہلے کے چند معمر افراد سے ملاقات کا اہتمام کیا۔

حاجی شیر خان

''میں تھمالی میں 1931 میں پیدا ہوا اور اسی سکول سے تعلیم حاصل کی۔ جنرل ٹکا خان بھی اسی سکول میں پڑھتے رہے۔ تھمالی میں کم مسلمان رہتے تھے۔ صرف تین یا چار خاندان مسلمانوں کے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی مسجد تھی۔ یہ ایک بڑا اور دو ہزار نفوس پر مشتمل خوشحال گاؤں تھا۔ ہندوؤں کی بھی تعداد کم تھی بیشتر لوگ سکھ تھے۔ گاؤں میں متعدد کثیر المنزلہ عمارتیں تھیں اور عین وسط میں ایک بڑا گوردوارہ بھی تھا۔ ہمارے سکھوں اور ہندوؤں کے دوستانہ تعلقات تھے۔ مسلمان غریب اور مقروض تھے جبکہ سکھ بہت امیر تھے۔ گاؤں کے بازار میں کئی دکانیں تھیں جن میں سناروں کی دکانیں بھی شامل تھیں۔ ارد گرد کے دیہات کے لوگ بھی خریداری کے لیے تھمالی آیا کرتے تھے۔

''باہر سے آنے والے حملہ آور کئی روز پہلے ہی گاؤں کے ارد گرد جمع ہونا شروع ہو گئے لیکن بڑا حملہ 12، 13 مارچ کو ہوا۔ اس وقت تک کئی ہزار مسلم افراد نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ ان کے پاس کئی قسم کے ہتھیار تھے لیکن اکثریت کے پاس لمبے ڈنڈے اور نیزے تھے۔ سکھوں کے پاس زیادہ ہتھیار نہیں تھے۔ انہوں نے حملہ آوروں سے امن کا سمجھوتہ (ڈیل) کرنے کی کوشش کی۔ امن معاہدے میں ثالثی کا کردار جنرل ٹکا خان کے والد راجہ محمد اقبال نے ادا کیا۔ معاہدے کو تحریری شکل دے کر دستخط کیے گئے۔ معاہدے کے تحت غیر مسلم اپنے ہتھیار سرنڈر کر دیں گے اور بدلے میں زمین گاؤں سے بحفاظت نکال دیا جاتا۔ کچھ ہندوؤں اور سکھوں نے پیسے دے کر گلو خلاصی کرائی۔ البتہ اکثر سکھوں نے اس امید پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کیا کہ شاید حکومت کی طرف سے کوئی امداد آن پہنچے۔

''معاہدے کے باوجود 12 مارچ کی شب کو ایک گروہ نے گاؤں پر دھاوا بول دیا۔ یہ معاہدے کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی۔ ہمارا گھر ایک علیحدہ قطار میں تھا۔ ہم نے گاؤں میں ہی قیام جاری رکھا کیونکہ ہمارے سکھوں سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ وہ سب میرے والد کی بہت عزت کرتے تھے۔ فائرنگ اور نعروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بچے اور عورتیں زور زور سے رو رہے تھے۔ کچھ دیر تک سکھوں نے اپنا دفاع کیا لیکن اتنے بڑے ہجوم کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہ سکے۔ ان میں سے

اکثر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دو سکھ لڑکے دوڑتے دوڑتے ہمارے گھر کی طرف آئے اور پناہ مانگی۔ میرے والد نے انہیں چھپالیا۔ اس دوران گاؤں کے ایک حصے اور گوردوارے میں آگ بھڑک اٹھی۔ ایسے دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں جیسے بم پھٹ پڑے ہوں۔ لڑائی پورا دن جاری رہی۔

"اگلے روز جب فوج پہنچی تو ہم نے سکھ لڑکوں کو ان کے حوالے کر دیا۔ زیادہ تر سپاہی گورکھا ہندو تھے۔ وہ ہمیں مارنا چاہتے تھے لیکن سکھ لڑکوں نے کہا کہ انہیں مت مارو انہوں نے ہماری جان بچائی ہے۔ فوج کے آنے تک سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ سکھوں نے اپنی اکثر عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں ایک سکھ تھا سورت سنگھ، اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ ہمارے علاقے کے ایک غنڈے محمد شریف نے اسے قابو کر کے کہا کہ وہ مسلمان ہو کر اس سے شادی کر لے۔ لیکن اس عورت نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس کی بجائے موت کو ترجیح دے گی۔ بہر حال شریف نے اسے قتل نہ کیا، شاید اس لیے کہ وہ حسین بہت تھی۔ جب فوج آئی تو وہ دیگر غیر مسلموں کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔ کچھ سکھوں اور ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا اور اسی گاؤں میں قیام جاری رکھا۔ البتہ بیشتر غیر مسلم بھارت چلے گئے۔ 1947 کے بعد تھمالی میں ایک بھی غیر مسلم نہیں رہا۔ میرا خیال ہے کہ سب سے ہولناک حملہ تھمالی پر کیا گیا۔ کلر سیداں جو تھمالی سے 2، 3 کلومیٹر دور واقع ہے میں شاید ایک یا دو سکھوں کو قتل کیا گیا۔ کئی سال بعد 1962 میں ان دونوں سکھوں لڑکوں نے جن کی جان میرے والد نے بچائی تھی ہمارے گاؤں کا چکر لگایا۔ وہ میرے والد وزیر خان سے ملنا چاہتے تھے لیکن ان کا انتقال کچھ برس پہلے ہو چکا تھا۔ میں بھی ان دنوں فوج میں تھا اور گھر سے دور تھا۔ انہوں نے ہمارے گھر میں مقیم افراد کو کچھ پیسے بھی دیے۔ یہ میرے والد کی رحمدلی کا واضح اعتراف تھا۔"

جان داد خان

"میں تھمالی میں 1933 میں پیدا ہوا۔ یہ ڈھائی، تین ہزار نفوس کی آبادی پر مشتمل ایک بڑا گاؤں تھا۔ غیر مسلم زیادہ تر سکھ اور کچھ ہندو اکثریت میں تھے۔ صرف چار گھر مسلمانوں کے تھے۔ میرے خاندان کی اپنی زمین تھی اور ہم پر کوئی قرض واجب الادا نہیں تھا۔ اس کے برعکس تھمالی کے اردگرد دیہات میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات دوستانہ تھے۔ غیر مسلموں کی نہ صرف دکانیں تھیں بلکہ کچھ دکاندار چھکڑوں اور سائیکلوں پر بھی اشیائے ضرورت فروخت کرنے اردگرد کے دیہات میں جاتے تھے۔ کچھ سکھ فوج میں افسر تھے جبکہ بعض دیگر پولیس میں ڈی ایس پی یا ایس پی رینک کے عہدے رکھتے تھے۔ ان کے گھر دو یا تین منزلہ تھے اور عمارتیں پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ ساہوکاری کا دھندہ عروج پر تھا۔ کئی افراد ان سے ادھار پر چیزیں لیتے تھے اس طرح کئی مسلمان ان کے مقروض تھے۔

"میں اسی سکول میں پڑھتا تھا جو ان دنوں صرف پرائمری سکول تھا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ ہم قریبی دوست تھے لیکن سکھ لڑکوں سے ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے۔ وہ امیر تھے جبکہ ہم غریب تھے۔ کلر سیداں میں وہ خالصہ ہائی سکول میں پڑھنے جاتے تھے جبکہ مسلمان گورنمنٹ ہائی سکول میں داخلہ لیتے تھے۔ سکول میں کچھ ہندو طلبا بھی تھے۔ میں مارچ میں آٹھویں جماعت میں تھا کہ حالات بگڑنا شروع ہو گئے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا ہو رہا تھا۔ ہمارے بیشتر اساتذہ ہندو تھے۔ وہ کلاس میں تحریک پاکستان سے متعلق کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ وہ اچھے لوگ تھے۔

"جب حملہ شروع ہوا تو ہم بھاگ کر کھیتوں میں چلے گئے۔ حملہ آوروں کا تعلق باہر کے علاقوں سے تھا۔ ہم حملہ آوروں اور گاؤں کے اکثریتی غیر مسلموں دونوں سے خوفزدہ تھے۔ ہمیں 'اللہ اکبر' کے نعروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سکھوں کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی املاک کو آگ لگادی اور اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا۔ ہمارا گاؤں اس علاقے میں آخری گاؤں تھا جس پر حملہ کیا گیا۔ میں حملے کی ٹھیک ٹھیک تاریخ بتانے سے قاصر ہوں۔"

رنجیت سنگھ بھسین

میں نے رنجیت سنگھ بھسین سے بھارتی ریاست کپور تھلہ میں ان کی رہائشگاہ پر 3 جنوری 2005 کی سہ پہر کو انٹرویو کیا۔ مسٹر بھسین کا موٹر سپیئر پارٹس کا کاروبار تھا اور لمبی داڑھی کے ساتھ ان کے پاس سکھوں کی دیگر نشانیاں بھی تھیں۔ انٹرویو سے پہلے میں کپور تھلہ سے 30 کلومیٹر دور گاؤں سلطان پور لودھی گیا کیونکہ میں نے اس گاؤں کے ایک سابق مکین مولانا مجاہد الحسینی کو گاؤں کی تازہ تصاویر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جب دو گھنٹے بعد واپسی ہوئی تو اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ رنجیت سنگھ نے اپنے پوٹھوہاری پنجابی لہجے میں اپنی روداد ان الفاظ میں سنائی۔

"تھمالی 500 گھرانوں پر مشتمل نسبتاً ایک بڑا گاؤں تھا۔ سکھوں کا زیادہ تر تعلق کھتریوں کی ذاتوں قندھاری، گاندھی، گجرال، بھسین، ساہنی اور دیگر سے تھا۔ کچھ خاندان ہندوؤں کے بھی تھے اور تین، چار گھروں میں مسلمان بھی رہتے تھے۔ گاؤں کے وسط میں گوردوارہ تھا اور یہی وہ مرکزی جگہ تھی جہاں ہمارا اجتماع ہوتا تھا۔ تھمالی پرائمری سکول گاؤں کے مشرقی نواحی علاقے میں تھا۔ میں نے چھٹی جماعت تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے میں نے تھمالی سے ایک اور کلومیٹر دور کلر (اب کلر سیداں) کے سکول میں داخلہ لیا۔ اس وقت تک ہمیں عدم تحفظ کا احساس نہیں ہوا تھا۔ میرا ایک مسلمان کلاس فیلو تھا جس کا نام نصیر الدین حیدر تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے کسی اور ساتھی کا نام یاد نہیں۔ ہمارے مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ اور امن پر مبنی تعلقات تھے۔ میرے دادا کو ورثے میں بہت بڑا رقبہ ملا۔ یہ مسلمانوں کی رہن شدہ زمین نہیں تھی۔ ہم ساہوکاری نہیں کرتے تھے۔ میرے خاندان کے لوگ فوج میں خدمات انجام دیتے تھے اور اس کے صلے میں انہیں حکومت نے زمینیں دیں۔ علاقے کے مسلمان مویشیوں کی خرید و فروخت کا کام کرتے تھے۔ ہمارا ایک باغ بھی تھا جس میں مسلمان مزارعے کام کرتے تھے۔

"حملہ آوروں کا پہلا جتھہ 6 مارچ کی شام کو آیا۔ ہمیں کوئی وارننگ نہیں جاری کی گئی تھی۔ البتہ ہم نے سن رکھا تھا کہ علاقے میں گڑبڑ شروع ہو چکی ہے۔ پہلا حملہ گاؤں کی پچھلی یعنی شمال کی طرف سے کیا گیا اور جنوب میں سڑک والا راستہ استعمال نہیں کیا گیا۔ ابتدا میں صرف سینکڑوں افراد نے کارروائی میں حصہ لیا اور بعد میں مزید افراد ان کے ساتھ آن ملے۔ ان کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ڈھول بجا کر 'اللہ اکبر' کے نعرے لگا رہے تھے۔ کچھ گھوڑوں پر سوار تھا لیکن بیشتر حملہ آور پیادہ تھے۔ ہمارے بڑوں نے چھتوں پر بندوقوں کے ساتھ پوزیشنیں سنبھال لیں اور یہ تاثر دیا کہ ہم اچھی طرح مسلح ہیں حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ہمارے پاس صرف تین ڈبل بیرل والی بندوقیں تھیں اور ایمونیشن نہ ہونے کے برابر تھا۔ شروع شروع میں اکا دکا جھڑپیں ہوئیں لیکن پھر 12 مارچ تک کئی ہزار حملہ آوروں نے تھمالی کا محاصرہ کر لیا۔ اس دوران جارحیت کا خطرہ

ٹالنے کے لیے کسی معاہدے کی بھی کوشش کی گئی۔12 مارچ کو آخر کار معاہدہ ہو گیا۔ میرے والد صوبیدار دیوان پال سنگھ ہنگاموں سے چھ ماہ قبل فوج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انہوں نے اور ریٹائر ایس پی پولیس بال مکند جو برہمن ہندو تھے نے گاؤں کی طرف سے مذاکرات کی نمائندگی کی۔ مسلمانوں کی طرف سے صوبیدار لال خان اور بعض دیگر عمائدین نے مذاکرات میں حصہ لیا۔ طے یہ پایا کہ ہم اگر ہتھیار پھینک دیں تو ہمیں بحفاظت گاؤں سے نکلنے کی اجازت ہو گی اور ہم 'پھر اواں' گاؤں جا سکیں گے۔ وہاں سے ہم کشمیر کے علاقے پونچھ میں جا سکتے تھے۔ بات چیت کے دوران حملہ آوروں نے بھانپ لیا کہ گاؤں والوں کے پاس زیادہ اسلحہ نہیں چنانچہ تمام مذہبی اور اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس شام کو بڑا حملہ کر دیا گیا۔ بال مکند اور دیگر برہمن خفیہ سمجھوتے کے تحت پہلے ہی لال خان کے گاؤں کی طرف نکل چکے تھے۔ ایک برہمن جگن ناتھ کو قتل کر دیا گیا کیونکہ اس کے پاس بندوق تھی اور مسلمانوں نے اسے اپنی طرف فائر کرتے دیکھا تھا۔ ہمارے گاؤں کے 10 سے 12 سکھ کلوہا گاؤں کی طرف گئے تھے اس لیے ان کی زندگی بچ گئی۔

"سکھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ہتھیار ہرگز نہیں پھینکیں گے۔ کچھ گھروں سے باہر کھیتوں میں گئے اور لڑائی کی لیکن یہ واضح ہو چکا تھا کہ ہم ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے تھے۔ خواتین کو گوردوارہ لے جایا گیا۔ ان کے ساتھ قیمتی اشیا بھی تھیں۔ اس کے بعد وہاں آگ کا الاؤ لگایا گیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنی عورتوں کو مسلمانوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میری دادی، والدہ اور میری ایک بہن اس آگ میں زندہ جل مریں۔ میرے بھائی کی بیوی، اس کا والد اور شیر خوار بچہ بھی زندہ جل گئے۔ میرے والد کے چچا، ان کے دو بیٹے، بیویاں اور ہمارے کنبے کے درجنوں افراد بھی موت کے منہ میں چلے گئے۔ پتہ نہیں کس وجہ سے میری بھابھی نے مجھے گوردوارے سے باہر بھیج دیا۔ میرے والد باہر کھیتوں میں لڑ رہے تھے۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے گاؤں کے مسلمانوں نے میرے والد کو پیشکش کی کہ وہ ہمارے خاندان کو بچا سکتے ہیں لیکن میرے والد نے پیشکش مسترد کرتے ہوئے کہا کہ بچانا ہے تو پورے گاؤں کو بچاؤ۔ کچھ لوگ اپنے گھروں میں رہے اور گوردوارے میں نہ گئے۔ حملہ آور ان میں سے اکثر کو پکڑ کر کھیتوں میں لے گئے۔ میں اور چند دیگر بچے بھی ان میں شامل تھے۔ یہ 13 مارچ کی صبح تھی۔ ہم 15 سے 20 افراد وہاں جمع تھے۔ زیادہ تر کم عمر سکھ تھے البتہ بعض معمر افراد بھی شامل تھے۔

"مسلمانوں نے ہمیں حکم دیا کہ زور زور سے 'اللہ، اللہ' کرو۔ ایک 70 سالہ ریٹائر پولیس اہلکار رام سنگھ بھی تھا۔ وہ بھی اللہ، اللہ کر رہا تھا لیکن ایک مسلمان نے اس کے گنجے سر پر کلہاڑے سے وار کیا۔ وہ بے چارہ زمین پر گر پڑا۔ پھر اس نے مجھے مارا، میرے کندھے پر گہرا زخم آیا۔ پھر میرے بازو کے نیچے دائیں طرف ایک اور وار کیا گیا۔ (اس موقع پر بھسین نے اپنی قمیض اٹھا کر مجھے گھاؤ دکھائے)۔ میں زمین پر گر گیا۔ خون بری طرح بہہ رہا تھا۔ میں سخت تکلیف میں تھا لیکن میں سانس تھامے خاموشی سے پڑا رہا۔ حملہ آوروں نے کیکر کی خشک ڈالیاں اکٹھی کر کے کھیتوں میں پڑے افراد کے اوپر ڈال دیں اور آگ لگانا شروع کر دی۔ کسی نے کہا، ان کو آگ کیوں لگا رہے ہو؟ یہ تو اللہ، اللہ کر رہے تھے۔ اس طرح اب یہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ ان کے درمیان تکرار جاری رہی۔ بہر حال آگ نہ لگائی گئی۔ یوں میں اور بعض دیگر افراد جو خود کو مردہ ظاہر کر رہے تھے بچ گئے۔

"فوج صبح ساڑھے 11 بجے آئی۔ فوجی کافی دیر سے علاقے میں تھی لیکن غیر فعال رہی۔ فوجیوں نے چلا چلا کر پوچھا کہ کیا کوئی زندہ ہے؟ ہم میں سے ایک زخمی نے کراہ کر کہا کہ کانٹے اٹھانے تک ہم کیسے اٹھ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کانٹے اٹھا

دیے۔ یوں ہم 12 سے 15 افراد بچ گئے۔ وہ فوجی ہندو تھے۔ مجھے ان میں ایک بھی سکھ نظر نہ آیا۔ کوئی انگریز فوجی بھی نہیں تھا۔ مجھے اور میری تین بہنوں کو زندہ بچا لیا گیا۔ ان میں سے ایک بہن صدمے سے پاگل ہو گئی۔ دوسری بہن آگ میں سے زندہ بچ گیا جبکہ تیسری بہن کو ایک مسلمان نے بچا لیا اور ایک روز بعد میری خالہ کے شوہر کے گھر پہنچا دیا۔ ایک سکھ خاندان بھی زندہ بچ گئی جو گوردوارے نہ گئی اور چھپ گئی۔ ایک نوجوان سکھ عورت جسے ایک مسلمان نے اغوا کرنے کی کوشش کی نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ (شاید یہ وہی خوبصورت خاتون ہو گی جیسے علاقے کے غنڈے شریف نے مسلمان بنا کر شادی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مصنف)۔ فوج آئی تو وہ بھی بحفاظت نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ بعد ازاں وہ لکھنو میں آباد ہو گئی۔ میں اس سے ملا ہوں۔ اب معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی ہے۔

"مجھے راولپنڈی کے کنٹونمنٹ ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں میرے زخم سی کر مرہم پٹی کی گئی۔ 40 روز بعد ہم واپس تھمالی گئے تاکہ مرنے والوں کی آخری رسومات میں حصہ لے سکیں۔ فوج ہمارے ساتھ تھی۔ ہم نے مرنے والوں کی ہڈیاں کھیتوں سے جمع کیں اور ارتھی جلادی۔ کسی مقامی فرد کو ہمارے قریب آنے کی اجازت نہ دی گئی۔ ہماری گاؤں میں داخل ہونے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔"

۔۔۔"ہمارے مویشیوں کے لیے تھمالی ایک اجنبی جگہ بن گئی"

رنجیت سنگھ بھسین نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "اس واقعے کے بعد تھمالی اچانک ہمارے لیے ایک بیگانی جگہ بن گئی۔ لگتا تھا کہ ہمارے مویشی ارد گرد ہی کہیں گھوم رہے تھے۔ کسی نے ان کا خیال رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ انہوں نے ہمیں پہچان لیا اور اس وقت بھی وہاں رہے جب فوجی ہمیں ٹرک پر سوار کر رہے تھے۔ جب گاڑیاں چلنے لگیں تو گائیں اور بھینسیں پیچھے پیچھے دوڑنے لگیں۔ تاہم ٹرکوں کی رفتار تیز ہونے پر وہ بے چاری بہت پیچھے رہ گئیں۔ یہ تھمالی کے حوالے سے میری آخری یاد ہے۔"

اس موقع پر رنجیت سنگھ بھسین بچوں کی طرح رونے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا کہ کیا آپ کو اب بھی تھمالی یاد آتا ہے تو انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا کہ: "میں نے کبھی وہاں واپس جانے کا نہیں سوچا، ہمارا تقریباً پورا خاندان ختم ہو گیا تھا اور جو زندہ بچ گئے وہ ان دنوں کے صدمے اور دکھ سے کبھی نہیں نکل سکے۔ البتہ میرے خوابوں میں تھمالی اب بھی زندہ ہے۔ لگتا ہے جب تک میں زندہ ہوں یہ تصور مجھے نہیں چھوڑے گا۔ ہر سال مارچ میں اپنے مرنے والے رشتہ داروں کی یاد میں پوجا پاٹھ کا اہتمام کرتا ہوں۔ میرے وہ چند رشتہ دار جو زندہ بچ گئے تھے وہ دہلی چلے گئے اور بھوگل کے علاقے میں آباد ہو گئے۔ میرا ان کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں۔ ایک اور بات، لوگ اکثر حیران ہوتے ہیں کہ تھمالی کے قریبی گاؤں کلر کے ہندو اور سکھ کیسے بچ گئے۔ مجھے کچھ بڑوں سے پتہ چلا کہ ان دنوں وہاں کے تھانے کا انچارج ڈیوٹی پر نہیں تھا اور اس کا اسسٹنٹ حوالدار اس سازش کا حصہ نہیں تھا۔ اس نے ہجوم کو دیکھ کر ہوائی فائرنگ کی تو وہ لوگ بھاگ نکلے۔ صرف ایک کولہو کو آگ لگائی گئی۔ میں نے بھارتی فوج میں 28 سال بارڈر سکیورٹی فورس میں خدمات انجام دیں۔ ریٹائرمنٹ پر میں کپورتھلہ میں آباد ہو گیا۔ میرے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹا 21 سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ آپ مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے کہ آخر سکھ دیہات پر حملوں کے پیچھے کیا نظریہ ہے؟ اور قتل عام کے ایک ہفتے بعد ہی فوج کیوں پہنچی؟ میرا پختہ یقین ہے کہ 1947

میں پیدا ہونے والی تمام گڑبڑ انگریزوں کی کارستانی تھی۔ آپ اس بات کی کیا وضاحت کریں گے کہ جنرل ملٹری ہیڈ کوارٹر سے محض ایک یا دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہونے کے باوجود فوج کو سکھوں کے دیہات میں آنے میں اتنی دیر کیوں لگی؟"

"اللہ، اللہ" یا مکمل کلمہ

انٹرویو کے بعد میں نے رنجیت سنگھ بھسین سے اس بات کی وضاحت کی درخواست کی کہ آپ اور دیگر سکھوں کو صرف 'اللہ، اللہ' کرنے یا مکمل کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنے پر مجبور کیا گیا؟ تو انہوں نے انتہائی وثوق سے کہا کہ حملہ آور صرف سکھوں سے 'اللہ' پڑھوانا چاہتے تھے۔ کئی محققین یہ سمجھتے ہیں کہ دیہی علاقوں میں مسلمانوں کو بسا اوقات اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے آگاہی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ حملہ آوروں کو مکمل یقین نہیں تھا کہ آیا لاشوں کو نذر آتش کیا جائے یا نہیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ایسی صورتحال میں مناسب اسلامی طریقہ کیسے اختیار کیا جائے۔

چوآ خالصہ کے فسادات

دوسرا گاؤں جس کا ہم نے دورہ کیا وہ چوآ خالصہ تھا۔ ہم نے وہاں ان مسلمانوں کے انٹرویو کیے جو 1947 میں زندہ تھے۔

سید نذیر حسین شاہ

"چوآ خالصہ 1947 میں تین ہزار نفوس پر مشتمل ایک خوشحال گاؤں تھا۔ راولپنڈی کے دیگر علاقوں کی طرح یہاں بھی مسلمان غریب جبکہ ہندو اور سکھ امیر تھے اور کاروبار پر ان کا کنٹرول تھا۔ یہاں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد تقریباً یکساں تھی۔ ان میں سے کچھ اہم سول اور فوجی عہدوں پر بھی فائز تھے۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے کے گھروں میں عموماً نہیں جاتے تھے لیکن کچھ غیر مسلم گھرانوں کے ساتھ ہمارے قریبی تعلقات تھے۔ غیر مسلم بالخصوص ہندو محرم کا بہت احترام کرتے تھے۔ ہندو اور سکھ اپنے مقدس ایام نہایت جوش و جذبے سے مناتے تھے۔ مجھے بالخصوص رام لیلا کا تہوار یاد ہے۔ جس میں ہم بھی شرکت کرتے تھے۔ چوآ خالصہ ایک پر امن گاؤں تھا۔

"میں مارچ 1947 میں انگریز فوج میں تھا۔ میں آپ کو جو تفصیل بتا رہا ہوں یہ میری بیوی اور بھائیوں نے مجھے بتائی۔ حملہ آور چوآ خالصہ کے ارد گرد کے دیہات کے رہنے والے تھے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر ٹھاکر داس پوری ایک صوفی منش انسان تھے۔ شاید ہی کوئی مسلمان ہو گا جو ہیڈ ماسٹر صاحب کی عزت نہ کرتا ہو۔ وہ تمام شاگردوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے۔ وہ کسی تعصب کے بغیر ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے۔ بد قسمتی سے حملہ آوروں نے ان کے ساتھ بھی ظالمانہ سلوک کیا تاہم انہیں ایک مسلمان استاد ماسٹر شیر زمان نے بچا لیا اور بعد ازاں ٹھاکر داس پوری بحفاظت ہندوستان جانے میں کامیاب ہو گئے۔ جب گڑبڑ شروع ہوئی تو ہندو اور سکھ دکانداروں نے اپنے کنبوں کو اونچی عمارتوں میں جمع کر لیا۔ بچوں اور عورتوں کو قتل کر دیا گیا یا آگ میں پھینک دیا گیا۔ جنہوں نے ایسا نہ کیا انہیں حملہ آوروں نے مار ڈالا۔ ایک یا دو ہندو یا سکھ

گھرانے مسلمان ہو گئے۔ وہ قریبی گاؤں خان اڈہ میں رہتے ہیں۔ حملہ کرنے والے مسلمان وحشی قسم کے لوگ تھے۔ وہ صرف غیر مسلموں کی دولت ہتھیانا چاہتے تھے۔ ان کا اسلام کی نیکو کاری اور رحمدلی کی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔"

راجہ محمد ریاست

"میں یونین کونسل چوا خالصہ کا ناظم ہوں۔ مارچ 1947 میں ہمارے گاؤں میں ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی مسلمانوں سے زیادہ تھی۔ البتہ ارد گرد کے دیہات میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ مسلمانوں اور سکھوں، ہندوؤں کے محلے الگ الگ تھے۔ اس کے باوجود ان کے درمیان کوئی عداوت یا رنجش نہ تھی۔ تینوں مذاہب کے بزرگوں کا سب لوگ احترام کرتے تھے اور ان کے مشوروں اور رہنمائی پر عمل کرتے تھے۔ قصبے میں تین یا چار مندر، گوردوارے تھے اور اتنی ہی مساجد تھیں۔ قصبے کی آبادی تین سے چار ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ خوشی یا غمی کے مواقع پر سب لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے۔ ہاں ہندو یا سکھ ہمارے سے بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ مسلمان غریب تھے۔ شادی یا دیگر تقریبات پر شاہانہ اخراجات کرنے کی وجہ سے مسلمان اکثر ہندوؤں یا سکھوں کے مقروض رہتے تھے۔ جو اس رقم پر کافی سود مرکب وصول کرتے تھے۔ اس طرح غیر مسلموں نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کی زمینیں ہتھیانا شروع کر دیں۔ یونینسٹ پارٹی کے وزیر سر چھوٹو رام نے زرعی اصلاحات نافذ کیں جس سے ساہو کاری کے نتیجے میں زمینوں پر قبضے کا سلسلہ رک گیا لیکن ہندوؤں اور سکھوں نے اس کے بعد مسلمانوں کو فرنٹ مین کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ تقسیم کے بعد ہمیں رہن شدہ ہماری زمینیں واپس نہیں کی گئیں بلکہ کشمیر اور مشرقی پنجاب سے آنے والے مہاجرین کو دے دی گئیں۔

"6 یا 7 مارچ کو مسلمانوں کے پہلے جتھے نے حملہ شروع کیا۔ کچھ ہندو اور سکھ مارے گئے تاہم حملہ آوروں کا اصل مقصد دکانیں لوٹنا تھا۔ اس صورتحال میں تمام بڑے مرکزی مسجد میں جمع ہوئے اور اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ گاؤں کے مکین ایک دوسرے پر حملہ نہیں کریں گے۔ البتہ 12 یا 13 مارچ کو مسلمانوں کا ایک اور جتھہ آیا۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ ہم پر غالب آ گئے۔ غیر مسلموں کو پیشکش کی گئی کہ وہ یا تو اسلام قبول کر لیں یا پھر موت کے لیے تیار رہیں۔ بالخصوص سکھوں نے مسلمان ہونے سے انکار کر دیا۔ دو سکھ بھائیوں جو اپنی کمیونٹی کے ممتاز افراد تھے نے اپنی عورتوں اور بچوں کو مار کر آگ میں پھینکنا شروع کر دیا۔ ایک بھائی کا نام غالباً بلونت سنگھ تھا۔ آخر میں دونوں بھائی بھی مارے گئے لیکن بلونت سنگھ کا ایک بیٹا بچ گیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ 150 سکھ حملے میں مارے گئے تھے۔ مجھے آج بھی سر کٹی لاشوں کا منظر یاد ہے۔ میں، میرے والد اور دادا اور کچھ دیگر لوگ گاؤں کے مرکز میں صورتحال کا مشاہدہ کرنے گئے۔ ایک گھر میں ہمیں سکھ ٹیچر کی کٹی پھٹی لاش نظر آئی۔ شاید اس کا نام رنجیت سنگھ تھا۔ کئی اور لاشیں بھی نظر آئیں۔ میرے دادا جو ذیلدار تھے وہ اور میرے چچا لڑائی والی جگہ پر گئے اور اسے روکنے کی کوشش کی لیکن گورکھا فوجیوں نے ان پر فائرنگ کر دی۔ گولی لگنے سے میرے دادا کا ہاتھ اڑ گیا جبکہ چچا ہلاک ہو گئے۔ ہندوؤں کا جانی نقصان نسبتاً کم ہوا۔ صرف 10 ہندو موت کا شکار ہوئے۔ 200 یا زائد ہندو قریبی گاؤں موہڑا ہیرا میں منتقل ہو گئے۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ البتہ جب فوج آئی تو وہ وہاں سے نکل گئے۔ کچھ دیگر کو مسلمانوں نے بچا لیا۔

''ان تمام غیر مسلموں سے بد سلوکی کے واقعے میں میرے لیے سب سے افسوسناک میرے پیارے استاد ماسٹر ٹھاکر داس پوری سے شرمناک سلوک کا واقعہ تھا۔ حملہ آوروں نے انہیں زمین پر لٹا کر ٹھڈے مارے، البتہ ماسٹر شیر زمان نے انہیں بچا لیا۔ ماسٹر ٹھاکر داس پوری بہت شفیق اور نیک انسان تھے۔ شاید ہی کوئی مسلمان طالبعلم ہو گا جس کی انہوں نے مدد نہیں کی ہو گی۔ میں اب بھی ان کے بارے میں سوچتا ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ بحفاظت ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔''

اس موقع پر راجہ محمد ریاست کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہنے لگی۔ وہ سسکیاں لیتے ہوتے بولا، ''بعد ازاں میں استاد بھرتی ہو گیا اور اسی سکول میں 25 سال تک پڑھاتا رہا۔ تھوڑے عرصے بعد کچھ ہندوؤں اور سکھوں نے چوا خالصہ کا دورہ کیا۔ کچھ میرے والد کو خط لکھتے رہتے تھے۔ ایک ہندو ڈاکٹر جو 1947 میں چھوٹا بچہ تھا کچھ سال پہلے میرے والد سے ملنے آیا۔ میں بھی اس سے ملا۔ وہ چوا خالصہ ریفیوجی ایسوسی ایشن دہلی کا صدر تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے بزرگ اکثر اپنے وطن کو یاد کرتے اور پرانے دور کے ناسٹلجیا میں رہتے تھے۔''

احمد سلیم اور میں نے چک بیلی خان جو مسلمان راجپوتوں کا گاؤں ہے کا 11 دسمبر 2004 کو دورہ کیا۔ دو روز بعد ہم ضلع اٹک کے گاؤں پڑیال بھی گئے۔

امیر خان

''چوا خالصہ میں مارچ 1947 میں مسلمان اور سکھ ایک ہی تعداد میں تھے۔ مسلمان کاشتکار تھے۔ چک بیلی خان کے کچھ ہندو سنار بھی تھے۔ چند سکھ بھی کاشتکار تھے لیکن اکثریت تاجر پیشہ یا ساہوکار تھی۔ زیادہ تر دکانیں سکھوں کی ملکیت تھیں۔ ان کی دکانیں بہت بڑی تھیں۔ مسلمانوں کی زمین سکھوں کے پاس رہن رکھی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ کاشتکاروں کے اخراجات ہمیشہ ان کی آمدن سے زیادہ ہوتے تھے جبکہ سکھ خرچ کے معاملے میں کافی سمجھدار تھے۔ جتنا بڑا مسلمان زمیندار تھا اتنا ہی وہ سکھ ساہوکاروں کا مقروض تھا۔ میرے والد کی 8 کنال زمین سکھوں کے پاس رہن تھی لیکن سر چھوٹو رام نے جو زرعی اصلاحات متعارف کرائی تھیں اس کے تحت گروی رکھی گئی زمین ایک مخصوص وقت کے بعد اصل مالک کو واپس کرنا ضروری تھی، ہمارے گاؤں کے ہندو غریب لوگ تھے۔ تمام سیٹھ سکھ ہی تھے۔ ہماری ان سے کوئی پرخاش نہیں تھی بلکہ ہمارے اور ان کے درمیان خیر سگالی اور دوستی کے جذبات پائے جاتے تھے۔ سکھوں کے قبضے میں مسلمانوں کی زمینیں رہن تھیں، وہ مسلمانوں کا کافی خیال کرتے تھے تاکہ ان کے دل میں نفرت انگیز خیالات پیدا نہ ہوں۔ مذہبی اختلافات کی بنا پر ہم اکٹھے بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے لیکن وہ مسلمانوں کو بغیر پکائی اشیا بھجوا دیتے تھے۔ ہندو اور سکھ ایک کنویں سے پانی بھرتے تھے جبکہ مسلمان دوسرے کنویں سے پانی لیتے تھے۔ گاؤں میں صرف دو کنویں تھے۔ ہم نے اس بات کو کوئی مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ زیادہ تر لوگ حتیٰ کہ چند سکھ اور ہندو بھی فوج میں ملازم تھے۔ میں فوج کے شعبہ وائرلیس میں ملازم تھا۔ ہماری یونٹ میں ہندو، سکھ اور مسلمان سب لوگ تھے۔

''گڑبڑ کا آغاز افواہوں سے ہوا۔ آج تک مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ آخر کس نے یہ افواہیں پھیلائی تھیں۔ افواہ یہ تھی کہ کسی جگہ پر سکھ جمع ہو رہے ہیں اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ جب یہ افواہیں ہم تک پہنچیں تو مسلمانوں نے سکھوں اور ہندوؤں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ کچھ مسلمانوں نے انہیں تحفظ بھی فراہم کیا۔ مرد چلے گئے جبکہ ان کی عورتیں قابل اعتماد خاندانوں کے پاس پیچھے چھوڑ دی گئیں جب پاکستان بن گیا تو وہ پاکستانی اور بھارتی فوجیوں کے ساتھ واپس آ گئے اور اپنی عورتیں ساتھ لے گئے۔ ان عورتوں سے کوئی زیادتی نہیں کی گئی نہ کسی کو قتل کیا گیا۔ میرے والد چودھری بیلی خان، ان کے بھائی چودھری محبوب خان اور علی صفدر (جس کے حوالے سے ہم اس گاؤں میں گئے تھے) کے والد نے کئی ہندوؤں اور سکھوں کو بچایا تھا۔ انہوں نے کسی غیر مسلم کے گھر کو بھی ہاتھ نہ لگانے دیا۔ چنانچہ حملہ کوئی نہیں ہوا البتہ رات کو سکھوں کی چند دکانیں ضرور لوٹ لی گئیں۔''

حاجی محمد حنیف

''میں ان دنوں چوتھی کلاس میں تھا۔ میں اپنے چچا کے ساتھ فتح جنگ ضلع اٹک سکالر شپ کے امتحان میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ امتحان کے بعد ہم ایک سہ پہر کو راولپنڈی پہنچے۔ یہ یقیناً مارچ کے اوائل کے ایام تھے۔ ان دنوں صرف ایک بس لیاقت باغ سے دوپہر کو ہمارے گاؤں جاتی تھی۔ گڑبڑ شروع ہوئی تو ہمارے گاؤں کے سکھ اور ہندو ایک بڑی عمارت میں جمع ہو گئے۔ لوگوں کے پاس نیزے، چھرے اور ڈنڈے تھے اور غیر مسلموں کی دکانیں لوٹی جا رہی تھیں لیکن چک بیلی خان میں کسی کی جان نہیں لی گئی۔ البتہ فوج کے آنے سے پہلے چند دکانوں کو لوٹ لیا گیا تھا۔ سکھوں اور ہندوؤں سے کہا گیا کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ایک قطار میں کھڑے تھے۔ انہیں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں مسجد لے جا کر کلمہ پڑھوایا گیا۔ ان کے بال اور داڑھیاں منڈھوا دی گئیں۔ جب فوج آئی تو یہ لوگ چلے گئے۔ تمام مسئلہ افواہوں کا نتیجہ تھا۔ علاقے میں مسلم لیگ بھی موجود تھی۔ شاید افواہیں اس کے کارکنوں نے اڑائی تھیں۔''

یہاں ایک ہی گاؤں کے دو بیانات میں مختلف تفصیل سامنے آئی ہے۔ البتہ دونوں نے یہ بات کہی کہ چک بیلی خان میں 1947 میں کوئی قتل نہیں ہوا تھا۔

پڑیال

حاجی محمد شریف

''پڑیال میں فسادات صرف اس وقت شروع ہوئے جب ہم نے سنا کہ مشرقی پنجاب میں ہزاروں مسلمانوں کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ (غالباً حاجی صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ شاید 1946 میں بہار میں ہونے والے فسادات کا ذکر کر رہے ہیں: مصنف)۔ بابو کرم سنگھ ہمارے استاد تھے۔ گاؤں میں صرف وہی واحد شخص تھے جو انگریزی پڑھ سکتے تھے۔ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ ایک دن رمضان میں ایک شخص بہادر خان نے ان سے پوچھا: 'کیا آپ پانی یا کچھ اور پینا پسند کریں

گے ؟' بابو کرم سنگھ بولے 'اوئے بہادر خان تم نے یہ کہہ کر میری بے عزتی کی ہے۔ میں نے تو رمضان میں کبھی اپنے گھر میں پانی نہیں پیا۔'

''گاؤں کے بڑوں نے بیٹھ کر متفقہ فیصلہ کیا کہ اگر گاؤں پر حملہ کیا گیا تو سب مل کر مقابلہ کریں گے۔ قریبی دیہات کے مسلمان تلواروں اور نیزوں سے مسلح ہو کر ڈھول بجاتے ہمارے گاؤں پر حملہ کرنے آئے۔ وہ سکھوں اور ہندوؤں کو نشانہ بنانا چاہتے تھے لیکن ہم نے انہیں واپس بھیج دیا۔ معاملات اس وقت قابو سے باہر ہوئے جب مشرقی پنجاب سے مسلمان مہاجرین آئے اور اپنے ساتھ سکھوں کے ظلم کی کہانیاں سنائیں۔ ہمارے گاؤں کے چند لوگ جو فوج میں تھے کچھ دنوں کے لیے گھر آئے۔ اس سے پہلے وہ پٹنہ اور بہار میں تعینات تھے۔ حملے کی منصوبہ بندی فضل بیگ، خان محمد اور لالہ شان محمد نے کی۔ ان کے پاس دستی بم اور دیگر اسلحہ تھا۔ سکھوں نے اپنا اسلحہ گوردواروں میں چھپایا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مسجد کی چھت پر چڑھ کر قریب واقع گوردوارے پر دستی بم پھینکیں گے۔ یہ تمام لوگ ہمارے ہی گاؤں کے تھے۔

''حکومت کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ سے پہلے میں نے کچھ عرصہ سندھ میں کام کیا جہاں میں نے مشاہدہ کیا کہ ایسے دیہات میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی وہاں نچلی ذاتوں سے برا سلوک کیا جاتا تھا۔ اگر ہم کسی بھیل (چھوٹی ذات والے شخص) کو چائے یا کچھ اور پیش کرتے تو وہ اپنے کم درجے کی وجہ سے ہچکچاہٹ محسوس کرتا۔ پاکستان بننے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں کا ذات برادری کا نظام انسانوں کی تذلیل کرتا تھا جبکہ اسلام مساوات کا درس دیتا ہے۔ مسلمان اور غیر مسلم دو الگ قومیں ہیں۔ مسلمانوں پر مظالم ڈھانے میں سکھوں نے ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرے آباؤاجداد ہندو راجپوت تھے اصل فرق تو عقیدے کا ہے۔''

فیض زمان

''میں 1929 میں پیدا ہوا۔ میں نے تمام عمر پاکستان آرمی میں گزاری اور ریٹائر ہونے کے بعد پڑیال واپس آ گیا۔ جس شخص نے گوردوارے میں دستی بم پھینکا وہ اکبر خان تھا۔ جو فوج سے بھگوڑا تھا۔ جب حملہ ہوا تو میں بابو کرم سنگھ کی کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ اکبر خان نے کہا کہ 'نعرہ تکبیر، اللہ اکبر'۔ اس کے بعد کئی دیگر افراد نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ اس کے بعد لوگوں نے غیر مسلموں کی جائیدادیں لوٹنا شروع کر دیں۔ بابو کرم سنگھ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ میرے ماموں اور بابو کرم سنگھ سگے بھائیوں جیسے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے گھر میں اکٹھے بیٹھ کر کھاتے پیتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں سے کہا کہ وہ مجھے میرے گھر تک چھوڑ کر آئیں۔ وہ لڑکیاں جوان تھیں۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں نے آگ لگانا شروع کر دی تھی۔ حملہ آور گاؤں کے ہی تھے۔ جلاؤ گھیراؤ کا سلسلہ دو روز تک جاری رہا۔ ہم نے ایک جگہ ایک لڑکی کو چھپے ہوئے دیکھا۔ ہم نے اسے کہا کہ باہر آؤ اور کلمہ پڑھ لو۔ اس نے انکار کر دیا اور خود کو آگ لگا لی۔ بابو کرم سنگھ کو بچا لیا گیا۔ ان کی بیوی اور بیٹیاں بھی بچ نکلیں۔ وہ میرے ماموں کے گھر مقیم رہے۔ کسی نے ان پر حملے کی کوشش نہ کی۔ چوتھے روز فوج آئی۔ رخصتی کے وقت بابو کرم سنگھ نے میرے ماموں سے کہا کہ 'میرے

پاس جو رقم ہے تم رکھ لو' لیکن ماموں بولے 'میں نے تمہیں اپنا بھائی کہا ہے تو پیسے کیسے رکھ لوں؟' پھر انہوں نے یہ کہا: 'کرم سنگھ تم مسلمان ہو جاؤ تو کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا' تاہم ماسٹر کرم سنگھ نہ مانے اور چلے گئے۔ ان کی بیوی اور تین بیٹیاں بھی بچالی گئیں۔

''ایک سکھ پیچھے رہ گیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا اور طویل عمر پائی۔ وہ با آواز بلند کلمہ پڑھتا تھا۔ گاؤں کے کچھ سکھ بہت امیر تھے۔ ان میں سیوا سنگھ بھی شامل تھا۔ جب اس کی بیٹی کی شادی ہوئی تو میرے والد نے 100 روپے کی سلامی دی۔ سکھ ہمیں تحفے میں کپڑے دیا کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں سے جانے والے سکھ بعد میں پنجہ صاحب اور حسن ابدال کی یاترا کے لیے جاتے ہوئے پڑیال آیا کرتے تھے۔

''1947 میں یہاں تقریباً 300 خاندانوں کا صفایا کر دیا گیا اور صرف چند افراد زندہ بچنے میں کامیاب ہوئے۔ مسلمان غریب تھے اور انہوں نے ہر چیز لوٹ لی۔ میرے خیال میں 1000 سے زائد افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ ہم نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ ہمارے گاؤں میں غیر مسلم اقلیت میں تھے حالانکہ ان کے 300 خاندان تھے۔ حملے سے پہلے پیر مقیم نے پڑیال کا دورہ کیا اور اہل گاؤں سے کہا کہ 'مشرقی پنجاب میں سکھ اور ہندو تو مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں لیکن تم لوگ خاموش بیٹھے ہو'۔ یقیناً اس نے گاؤں والوں کو اشتعال دلایا۔ اس کا بیٹا پیر کرم شاہ بعد ازاں پاکستان کی اسلامی نظریہ کونسل کا ممبر بنا۔''

یہ بات قابل ذکر ہے کہ پڑیال میں قتل و غارت کے وقت کے بارے میں ابہام پایا جاتا ہے ممکن ہے کہ یہ واقعات مارچ کی بجائے اگست 1947 میں پیش آئے ہوں۔ اس بات کا گمان مجھے انٹرویو کرتے ہوئے ہوا۔

جہلم پناہ گزین کیمپ میں مظالم پر ایک ہندو رضاکار کے تاثرات

ڈاکٹر جگدیش چندر سرن جہلم میں پناہ گزین کیمپ میں رضاکار تھا۔ میں نے اس سے پہلے 24 اکتوبر 1999 میں اس وقت انٹرویو کیا تھا جب میں پنجاب کی تقسیم سے متعلق زبانی تفصیلات جمع کر رہا تھا۔ جہلم کیمپ راولپنڈی ڈویژن کے متاثرین کی دیکھ بھال کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا: ''مارچ 1947 میں میرا قیام لاہور میں تھا۔ میں دو دیگر ڈاکٹروں کے ساتھ جہلم شہر سے باہر قائم کیمپ گیا جہاں فسادات سے متاثرہ افراد جمع تھے۔ یہ ایک قابل رحم جگہ تھی۔ میں نے کئی معذور اور لاچار افراد کو دیکھا۔ کئی افراد کا نہایت بربریت کے ساتھ مثلہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ میں ایک پیتھالوجسٹ ہوں پھر بھی میں ان کی حالت دیکھ کر لرز گیا۔ حملہ آوروں نے خواتین کی چھاتیاں کاٹ ڈالیں اور انہیں کئی بار زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ مردوں کے ساتھ بھی توہین آمیز سلوک کیا گیا۔ کچھ بچوں حتیٰ کہ شیر خوار بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے اور ان کی لاشیں نیزوں پر اچھالی گئیں۔ محض چند خوش قسمت ہی زندہ رہے۔ جب میں نے بچنے والے افراد سے بات چیت کی تو انہوں نے بتایا کہ حملہ آوروں کو یوپی اور بہار سے آنے والے متاثرین نے بھڑکایا۔ مسلمان فوجی جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران مختلف محاذوں پر کام کیا تھا نے بظاہر اس جلاؤ گھیراؤ کی منصوبہ بندی کی۔''

شمالی پنجاب میں حملوں سے متعلق سرکاری رپورٹیں

حوالہ نمبر 560

جنرل میسروی کا نوٹ

شمالی پنجاب میں گڑبڑ کے حوالے سے تاثرات

1-وجوہات

پہلی وجہ سیاسی مذہبی politico-religious ہے۔ مسلم لیگ جو اگرچہ سیاسی جماعت تھی لیکن وہ تمام پراپیگنڈہ مذہبی بنیادوں پر کر رہی تھی۔ اس حکمت عملی کا پنجاب کے مسلمانوں پر بہت زیادہ فرق پڑا۔ پاکستان کو اسلام سے ملا کر پیش کرنے کا نسبتاً کم تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں پر بڑا فرق پڑا۔ جب طویل تحریک کے نتیجے میں پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت ختم ہو گئی اور ماسٹر تارا سنگھ اور دیگر سکھ رہنماؤں کے پاکستان مخالف بیانات سامنے آئے تو اس نے مسلمانوں میں انتہا پسندی کے جذبات کو ابھارا۔ بس اب صرف مذہبی جنوں کو دیا سلائی دکھانے کی ضرورت تھی۔ یہ کمی لاہور، امرتسر، ملتان اور راولپنڈی میں پاکستان مخالف عوامی جلسوں اور جلوسوں سے پوری ہو گئی۔ ملتان میں تو مظاہرین نے غیر دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے 'قائداعظم مردہ باد' کے نعرے لگا دیے۔ ملتان اور راولپنڈی جیسے مسلم اکثریت والے شہروں میں لگی آگ تیزی سے دیہاتی علاقوں تک پھیل گئی۔

اس کے علاوہ دو چھوٹی وجوہات بھی تھیں۔ پہلا تو معاشی پہلو تھا۔ کپڑے اور چینی جیسی اشیائے خوردنی کی قلت سے ہندو سکھ بنیا کمیونٹی نے بلاشبہ بلیک مارکیٹ میں زبردست منافع خوری کی۔ حکومتی کنٹرول بھی زیادہ تر سکھ یا ہندو ایجنٹوں اور کلرکوں کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمان کاشتکار اور محنت کش بھی موقع سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں تھے۔ دوسرا عنصر تمام مذاہب میں غنڈہ کمیونٹی کا تھا جو لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ کی صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

2-طریقہ واردات

شہروں میں گڑبڑ اسی طریقے سے شروع ہوئی جو ہم کئی برسوں سے دیکھ رہے ہیں تاہم حملوں کی شدت پہلے سے کہیں زیادہ، اچانک اور تباہ کن رہی۔ دیہات میں کئی دیہات کے کاشتکاروں کے جتھے مل کر ہندوؤں اور سکھوں کی دکانوں اور مکانات پر حملے کر کے انہیں تباہ کرتے رہے اور لوٹ مار کی گئی۔ کچھ علاقوں میں انسانی جانیں تلف کرنے سے زیادہ جلاؤ گھیراؤ اور لوٹ مار بڑا ہدف رہا جبکہ بعض مقامات پر اگر مکانات نہیں جلائے گئے تو بربریت کی انتہا کرتے ہوئے عورتوں اور بچوں کو تشدد کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بڑی تعداد میں مردوں کی جبری تبدیلی مذہب اور عورتوں کے اغوا کے واقعات بھی ہوئے۔ پنجاب میں یا پنجابی فوجیوں کے ساتھ 34 سالہ فوجی ملازمت کے اپنے تجربے کو مدنظر رکھتے ہوئے بہانگ دہل یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ فطرتاً صلح جو اور بہادر پنجابی مسلمانوں کے جذبات کو اتنی آسانی سے برانگیختہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس بربریت کو مزید ہوا سوچی سمجھی افواہوں

سے دی گئی۔ ان میں سے عام افواہ بڑی سکھ فوج کی طرف سے حملے کی تیاری کے حوالے سے ہے۔ یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ کسی بھی گاؤں یا مقام پر دوبارہ کوئی بڑا حملہ نہیں کیا گیا۔ ہجوم کا جوش خود بخود ٹھنڈا پڑ گیا اور عموماً بچنے والوں سے جنسی زیادتی نہیں کی گئی۔ ایک بڑی خواہش اپنے علاقوں کو ہندوؤں اور سکھوں سے ہمیشہ کے لیے پاک کرنا ہے۔ کچھ گھروں پر ہل بھی چلائے گئے۔

3-راولپنڈی ڈویژن کے پناہ گزین

راولپنڈی ڈویژن میں پناہ گزینوں کی تعداد 40ہزار تک ہونے کا خدشہ ہے اور ان کی اکثریت معذور افراد کی ہے۔ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ہم 'واہ' اور جہلم کے علاقے 'کالا' میں پناہ گزین کیمپ قائم کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اگر تعداد کیمپوں کی گنجائش سے بڑھ گئی تو باقی ماندہ افراد کو یا تو واپس گھروں میں بھیجنے کی کوشش کی جائے گی یا پھر انہیں ہندو یا سکھ کمیونٹی کے پاس قیام کرایا جائے گا۔ 4ہزار ایسے افراد کو پہلے ہی راولپنڈی شہر میں بھیجا جا چکا ہے۔

4-پنجاب کے دیگر اضلاع میں فسادات کا سدباب

میں نے پنجاب میں دستیاب تمام فوجی دستے طلب کر لیے ہیں۔ جہاں کشیدگی عروج پر ہے وہاں فلیگ مارچ اور گشت کیا جا رہا ہے لیکن یہ بات قطعاً ذہن نشین رکھی جائے کہ ایسے احتیاطی اقدامات عارضی حل ہیں۔ مرض کی علامات سے نمٹ رہے ہیں لیکن فوجی کارروائی سے مرض کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ یہ مرض تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کا پیدا کردہ ہے۔ واحد علاج یہ ہے کہ تمام فریق کسی سمجھوتے پر متفق ہو جائیں۔ اب مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان کسی سمجھوتے سے ہی پنجاب میں فوری امن بحال کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جا سکا تو خون خرابے سے بچنے کی واحد امید تمام سیاسی رہنماؤں کو اپنے پیروکاروں کو متاثر کرنے کے لیے اشتعال انگیز بیانات دینے سے روکنا ہو گی۔

لیفٹیننٹ جنرل ایف ڈبلیو میسروی
جنرل آفیسر کمانڈر انچیف ناردرن کمانڈ

واضح رہے کہ جنرل میسروی نے بعد ازاں پاکستانی فوج کے پہلے کمانڈر انچیف کے طور پر خدمات انجام دیں۔

گورنر جینکنز کی رپورٹیں

پنجاب کے گورنر نے تقریباً ہر روز وائسرائے ویول کو بھیجے گئے تار میں دیہی علاقوں میں تصادم کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے پنجاب کے کسی اور علاقے کے مقابلے میں غیر معمولی قرار دیا ہے۔ چونکہ گورنر کی رپورٹ زیادہ تر راولپنڈی ڈویژن کے بارے میں ہے اور اس میں جنرل میسروی کی خصوصی رپورٹ کا ہی حوالہ دیا گیا ہے چنانچہ اسے دوبارہ بیان کرنا ضروری نہیں۔ شمالی کمان کے جی او سی لیفٹیننٹ جنرل میسروی کے علاوہ راولپنڈی کے ڈویژنل کمشنر انگریز افسر سی کنگ، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس جے اے سکاٹ اور ڈپٹی کمشنر راولپنڈی سی ایل کوٹس تھے۔ جب گورنر نے 9مارچ کو راولپنڈی میں ان افسروں سے ملاقات

کی تو ان کے ساتھ انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر بینٹ تھے (Carter, 2007a: 69-70)۔ نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام 16 اپریل 1947 کو ایک خصوصی رپورٹ میں گورنر جینکنز نے لکھا کہ صرف راولپنڈی کے ایک تھانے میں مارچ کے فسادات کے دوران قتل کے 500 مقدمات درج کیے گئے۔ اس رپورٹ میں انہوں نے مجموعی ہلاکتوں کی تعداد 3500 بتائی، اگرچہ وسط اپریل میں یہ تعداد 3 ہزار سے کم تھی۔ انہوں نے لکھا:

اگرچہ مذہبی تناسب کی بالکل ٹھیک تفصیل دستیاب نہیں تاہم میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہر ایک مسلمان کے بدلے چھ غیر مسلم مارے گئے۔ مسٹر لیاقت علی خان کو دیہی علاقوں میں کیے گئے قتل عام کی خوفناک صورتحال کا شاید ہی اندازہ ہو۔ میری پریشانی کا ایک سبب پنجاب میں مسلم لیگی رہنماؤں کا انتہا پسند رویہ ہے جو دراصل یہ کہتے ہیں کہ 'مرد، مرد ہی ہوتا ہے'۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ شہروں میں غیر مسلموں کا رویہ اشتعال انگیز تھا لیکن تحریک کے دوران مسلمانوں کا رویہ بھی انتہائی جارحانہ تھا بالخصوص انہوں نے امرتسر میں ایک سکھ کانسٹیبل کو بھی ہلاک کر دیا تھا (Ibid: 137)۔

جینکنز نے یہ بھی بتایا کہ راولپنڈی کے پولیس سربراہ مسٹر جے اے سکاٹ نے پریس کانفرنس میں فسادات کے واقعات پر سر عام اپنی کراہت کا اظہار کیا۔ گورنر کی 17 مارچ کی رپورٹ میں مارچ کے ہنگاموں کی مزید تفصیل دی گئی ہے لیکن زیادہ توجہ شمالی پنجاب (راولپنڈی) کے واقعات پر مرکوز کی گئی ہے (Ibid: 138)۔ نیچے چند اقتباسات دیے جا رہے ہیں:

لاہور کی طرح راولپنڈی میں فرقہ وارانہ فسادات کا وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو قبل ازیں اپنایا جاتا رہا ہے۔ میں اگرچہ راولپنڈی نہیں گیا لیکن موجودہ فضا سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں کئی عمارتیں نذر آتش کی گئی ہیں۔ جانی نقصان بہت زیادہ ہوا۔

دیہی علاقے کافی متاثر ہوئے۔ بربریت کا زبردست مظاہرہ کیا گیا۔ ٹیکسلا-مری-گوجر خان کی مثلث میں روزانہ کی بنیادوں پر غیر مسلموں بالخصوص سکھوں کا قتل عام کیا گیا۔ ظلم اور سازش عام رہی۔ جنرل میسروی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے ہسپتال میں ایک بچہ دیکھا جس کے ہاتھ کاٹے گئے تھے۔ کم از کم دو ثابت شدہ واقعات ایسے ہیں جن میں غیر مسلموں کو امن کمیٹیوں کے اجلاس میں بلانے کے بہانے قتل کر دیا گیا۔ ایک گاؤں سسالی میں سکھوں کے ایک گروپ جنہوں نے جان بخشی کے وعدے پر ہتھیار پھینکے کو جان سے مار ڈالا گیا۔ سب سے زیادہ خونریزی اسی مثلث میں دیکھنے میں آئی جس کا میں نے ذکر کیا ہے البتہ ان تین علاقوں کے علاوہ بھی ظلم و بربریت کا بازار گرم کیا گیا۔ ضلع میں ہر جگہ جلاؤ گھیراؤ اور لوٹ مار کے واقعات ہوئے۔

اٹک میں راولپنڈی سے متصل قصبہ چونترہ بھی بری طرح متاثر ہوا۔ ضلع کے باقی علاقوں میں راولپنڈی جیسی ہلاکت خیزی کے تو چند واقعات رونما ہوئے البتہ لوٹ مار اور آگ لگانے کے واقعات اتنے ہی زیادہ تھے جتنے راولپنڈی میں دیکھنے میں

آئے۔ حملہ کرنے کا ایک عام طریقہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے گاؤں میں گھروں پر سفید پرچم لہرا دیتے جو اس بات کی دعوت ہوتی ہے کہ قریبی دیہات کے مسلمان حملہ کر کے جھنڈے کے بغیر گھروں پر حملہ کر دیں (Ibid)۔

جہلم کے ہمسایہ علاقے چکوال کے بڑے گاؤں ڈھڈیال پر بھی حملہ کیا گیا لیکن پولیس اور فوج نے حملہ آوروں کو زبردست ہزیمت اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

ملتان میں بھی راولپنڈی ڈویژن کی طرح جلاؤ گھیراؤ کے واقعات کی شدت کافی زیادہ تھی لیکن صدر پولیس سٹیشن اور شجاع آباد تحصیل کا کچھ علاقہ کنٹرول کرنے میں آسانی رہی۔ فوجی دستوں نے حملہ آوروں کو کافی نقصان پہنچایا۔ املاک کا نقصان بہت زیادہ ہوا لیکن یہ بہر حال راولپنڈی سے کم تھا۔

راولپنڈی ڈویژن کے متاثرہ اضلاع انڈین فوج کے ساتویں ڈویژن (میجر جنرل لویٹ) کے کنٹرول میں ہیں۔ اس ڈویژن میں چھ بریگیڈ شامل ہیں جبکہ میرے خیال میں دو خود مختار فورسز بھی ہیں۔ یہ یونٹ شمال میں کیمبل پور اور راولپنڈی، جنوب میں جہلم، چکوال تلہ گنگ سے شاہ پور اور مغرب میں میانوالی تک آپریشنل کارروائیاں کر رہی ہے۔

دیہات میں غیر معمولی پر تشدد نقل و حرکت کی پوری طرح وضاحت کرنا بہت مشکل ہے۔ جنرل میسروی سمجھتے ہیں کہ ان حملوں میں سازش اور منظم منصوبہ بندی کا عنصر شامل ہے کیونکہ تمام حملے بیک وقت کیے گئے اور مری میں کیے گئے حملے جس کا ذکر میں نے 9 مارچ کو کیا تھا کے لیے نہایت احتیاط کے ساتھ پلاننگ کی گئی۔ متاثرہ علاقوں میں تمام مسلمان یا تو کارروائی میں ملوث ہیں یا حملہ آوروں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ فوج کی ساتویں ڈویژن کے کمانڈر نے مجھے بتایا کہ غیر مسلموں پر کیے گئے حملوں کی قیادت ریٹائر فوجی افسروں نے کی۔ ان میں سے کچھ اعزازی کمیشنڈ افسر بھی تھے۔ کیمبل پور کے عمائدین جن سے میں نے گزشتہ روز ملاقات کی انتہائی گومگو کی کیفیت میں تھے۔ ان میں سے بعض معززین شروع میں خوفزدہ رہے۔ اس بات میں بہت کم شبہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تحریک ناگزیر تھی اور وہ اس کی مخالفت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سب سے باوثوق خیال یہ ہے کہ 1943 سے نظریہ پاکستان سامنے آنے کے بعد 46-1945 کی انتخابی مہم کے دوران فرقہ وارانہ تصادم اور اس کے بعد پیدا ہونے والی کشیدگی، مخلوط حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ، مسلم لیگ کی تحریک سول نافرمانی اور 20 فروری کا برطانوی حکومت کا بیان اس جیسے عوامل دھماکہ خیز صورتحال پیدا کرنے کا موجب بنے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ انہیں یہ افواہیں ملیں کہ سکھوں کی بڑی فوج حملے کی تیاری کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں غیر مسلموں کی طرف سے اشیائے خوردنی کی بلیک مارکیٹ کے خلاف بھی غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ اس بات کا امکان ہے کہ مسلمان شاید یہ سمجھتے ہوں کہ غیر مسلموں کا صفایا کر کے وہ اپنے علاقوں کو دیگر مذاہب کے خلاف حملے کے لیے محفوظ اڈے کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ کوئی تعلیم یافتہ انسان شاید ہی سکھ فوج کی کہانی پر یقین کر سکتا ہے اور اگرچہ غیر مسلموں کی طرف سے پیسے بٹورنے اور معاشی معاملات پر کنٹرول کرنے کے ہتھکنڈوں کے خلاف عوامی ردعمل موجود تھا لیکن یہ مسئلے کی فوری وجہ نہیں قرار دی جا سکتی۔

غیر مسلموں میں سول افسروں بالخصوص پولیس کے خلاف تلخی پائی جاتی ہے۔ فوجی دستوں کے بارے میں بھی بعض شکایات پائی جاتی ہیں۔ ساتویں ڈویژن کے کمانڈر نے گورنر کو بتایا کہ یہ شکایات جائز ہیں۔ اب فسادات سے متاثرہ علاقوں سے مسلمان افسروں کو ہٹانے کے مطالبات کیے جائیں گے۔

امر تسر اور ملتان میں املاک کا نقصان غیر معمولی طور پر زیادہ رہا۔۔۔ قانونی طور پر میں یہ نہیں سمجھتا کہ شہری بد نظمی کے دوران املاک کو پہنچنے والے نقصان کی ذمہ دار ریاست ہے اور میں یہ نہیں سمجھتا کہ دفعہ 93 کے تحت میں اس سے زیادہ کچھ کر سکتا ہوں کہ نقصانات کا تخمینہ لگایا جائے اور آنے والی منتخب حکومت پر ازالے کا کام چھوڑ دیا جائے۔

جب میں گزشتہ روز راولپنڈی میں تھا تو پناہ گزینوں کی مجموعی تعداد 30 ہزار تھی اور ہمیں راولپنڈی سے مزید 35 ہزار یا زائد پناہ گزینوں کی آمد کے لیے تیار رہنا چاہیے (Ibid: 85-90)۔

گورنر نے 31 مارچ کی رپورٹ جو ماؤنٹ بیٹن کو بھیجی گئی میں لکھا:

زیر سطح کافی ہلچل پائی جاتی ہے اور کسی بھی وقت سنگین مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ مسلمان اپنی جگہ خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ وہ جارح نہیں ہیں بلکہ ماسٹر تارا سنگھ نے اپنے اشتعال انگیز بیانات سے آگ لگائی اور اب بھی سکھ اپنے عقیدے کے احترام کی آڑ میں کرپانوں کے ساتھ پریڈ کرتے پھر رہے ہیں۔ کچھ مساجد میں قابل اعتراض تقریریں کی گئیں اور انٹیلی جنس رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈر بالخصوص ایسی ہی کسی پر تشدد صورتحال سے کافی خوش ہوں گے۔

فی الوقت ہندو اور سکھ مل کر چل رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی 3 مارچ کی تقریریں بلا جواز تھیں لیکن ان کی آڑ میں راولپنڈی ڈویژن میں قتل عام کا بھی کوئی جواز نہیں تھا۔ یہ لوگ پنجاب کی تقسیم کے خواہاں ہیں اور مسلمانوں سے اب کوئی مصالحت نہیں چاہتے" (Ibid:102)۔

انٹرویوز

جگدیش چندر سرن، دہلی 24 اکتوبر 1999

راشد اسحاق، لندن 19، 18 مئی 2002

امر سنگھ، دہلی 14 مارچ 2004

مدن لال سنگھ، دہلی 14 مارچ 2004

ہر کشن سنگھ مہتہ، چندی گڑھ، 20 مارچ 2004

موتی چڈا، نئی دہلی 28 مارچ 2004

امیر خان، چک بیلی خان، ضلع راولپنڈی 11 دسمبر 2004

حاجی محمد حنیف، چک بیلی خان، ضلع راولپنڈی 11 دسمبر 2004

خواجہ مسعود احمد، راولپنڈی 12 دسمبر 2004

شیخ نور دین، راولپنڈی 12 دسمبر 2004

حاجی محمد شریف، پڑیال، اٹک 13 دسمبر 2004

فیض زمان، پڑیال، اٹک 14 دسمبر 2004

سید نذیر حسین شاہ، چو آ خالصہ 14 دسمبر 2004

حاجی شیر خان، تھمالی 14 دسمبر 2004

جان داد خان، تھمالی 14 دسمبر 2004

حاجی شیر احمد، راولپنڈی 15 دسمبر 2004

شیخ محمد اسحاق، راولپنڈی 15 دسمبر 2004

رنجیت سنگھ بھسین، کپور تھلہ 3 جنوری 2005

References

Chandra, Prabodh (compiler). *Rape of Rawalpindi*, Lahore: *'The Punjab Riots Sufferers'* Relief Committee. (1947).

Collins, Larry and Lapierre, Dominiqu, *Freedom at Midnight*, New York: Avon Books. (1975).

Hamid, Shahid (Maj. Gen retired), *Disastrous Twilight*, London: Lee Cooper, (1986).

Khosla, Gopal Das, *Stern Reckoning: A Survey of the Events Leading Up To and Following the Partition of India*, New Delhi: Oxford University Press (1989).

Munir, Muhammad, *From Jinnah to Zia*, Lahore: Vanguard Books Ltd. 1980.

Pandey, Gayendra, *Remembering Partition*, Cambridge: Cambridge University Press, (2001).

Talib, S. Gurbachan, *Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab 1947*, New Delhi: Voice of India, (1991).

Talbot, Ian, *'The 1947 Partition of India'* in Stone, Dan (ed), *The Historiography of Genocide*, Houndsmill, Basingstoke, Hampshire: Palgrave Macmillan, (2008).

Tan, Tai Yong, *The Garrison State, The Military, Government and Society in Colonial Punjab, 1849-1947*. New Delhi: Sage Publications Ltd, (2005).

Official Documents

Carter, Lionel, (ed), *Punjab Politics, 3 March – 31 May 1947, At the Abyss, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents*, New Delhi: Manohar, (2007a).

Census of India, 1941, Vol. VI, *Punjab*, Simla: Government of India Press, (1941).

Mansergh, Nicholas and Moon, Penderel (eds), *The Transfer of Power 1942-7*, Vol. XI, *The Mountbatten Viceroyalty, Announcement and Reception of the 3 June Plan, 31 May – 7 July 1947*, London: Her Majesty's Stationery Office (1982).

Newspapers

The Pakistan Times, Lahore, 1947.

The Tribune, Lahore, 1947.

دوسرا مرحلہ: انجام کی طرف بڑھتا کھیل، 24 مارچ - 14 اگست 1947

تعارف

پنجاب کی تقسیم کا دوسرا مرحلہ دہلی میں وائسرائے ہند کی تبدیلی سے شروع ہوا اور 15 اگست 1947 کو بھارتی اور پاکستانی حکومتوں کے قیام پر منتج ہوا۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے تو یہ طے ہو گیا تھا کہ پنجاب بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گا اور ہر صوبے کی الگ انتظامیہ ہو گی۔ اس عرصے کے دوران اچانک تشدد لاہور اور امرتسر سے دیگر قصبوں اور آخر میں دیہات میں پھیل گیا۔

وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی انتظامیہ بھارت بشمول بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے ریاستی منصوبے میں کافی مصروف رہی۔ نو آبادیاتی ریاست کی سطح پر واقعات کا تسلسل پنجاب کے گورنر سر ایوان جینکنز اور وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے درمیان رابطوں پر مشتمل تھا۔ آل انڈیا اور پنجاب کی سطح پر حکومتی فیصلوں پر عملدرآمد کے لیے سیاستدانوں اور سرکاری حکام کے کمیشن قائم کیے گئے۔ نچلی سطح پر از سر نو تشدد پھوٹنے اور پھیلنے کے عمل نے اپنا الگ کردار ادا کیا۔ اگرچہ ان دونوں متوازی عوامل نے ایک دوسرے پر اثر ڈالا اور دانستہ اور غیر دانستہ نتائج کو متاثر کیا۔

اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد وائسرائے اور گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کو اس بات پر قائل ہونا پڑا کہ ہندوستان بالآخر تقسیم ہو گا۔ ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ مشاورت اور بات چیت کے دوران انہوں نے اس بات کی یقین دہانی مانگی کہ آزادی کے بعد جنوبی ایشیا میں برطانوی مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچے یا بہت کم نقصان اٹھانا پڑے۔ ان ملاقاتوں کے دوران انہوں نے یہ انکشاف کر کے گویا دھماکہ کر دیا کہ برطانیہ قبل ازیں اعلان کردہ تاریخ جون 1948 کی بجائے اگست 1947 میں ہی ہندوستان والوں کو اقتدار منتقل کر دے گا۔ ان کا یہ فیصلہ نہایت ہی متنازع ہے لیکن یہ واحد متنازع امر نہیں ہے بلکہ ان کے اصرار پر پاکستان اور بھارت کی آزادی کے اعلان سے پہلے کی بجائے بعد میں سرحدی کمیشن کے فیصلوں کو منظر عام پر لایا گیا۔

یہ خیال کہ پنجاب کی تقسیم سے آبادی کی منتقلی نہیں ہو گی قطعی غیر حقیقی تھا۔ پنجاب کے گورنروں نے کئی بار انتباہ کیا کہ ایسی کوئی عمل پر تشدد ثابت ہو گا۔ اپریل کے بعد تشدد نے ایک بار پھر سے سر اٹھا لیا اور مئی تک حالات نے بد ترین شکل اختیار کر لی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ حالات مزید خراب ہونے لگے۔ خفیہ ایجنسیاں یہ معلومات گورنر کو بھیجتی تھیں جو گورنر ٹیلی گرام اور طویل رپورٹوں کے ذریعے وائسرائے کو ارسال کر دیتا تھا لیکن لگتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ پنجاب باؤنڈری فورس کے قیام سمیت دیگر انتظامی اقدامات ناکافی ثابت ہوئے۔ سکھ مسلسل خبردار کر رہے تھے کہ وہ تقسیم کا کوئی ایسا منصوبہ قبول نہیں کریں گے جس میں ان کے مطالبات پورے نہ کیے گئے ہوں۔ مسلمان لیڈروں کا رویہ بھی مجموعی طور پر غیر لچکدار رہا کیونکہ بیشتر تصادم میں ان کے نسل پرست ارکان اور جرائم پیشہ عناصر حاوی رہے۔ ہندو زیادہ تر دکاندار اور تاجر پیشہ تھے اور تشدد سے گھبراتے تھے۔ صرف آر

ایس ایس اور مشرقی پنجاب کے ہندی بولنے والے ہندوؤں کو استثنیٰ حاصل تھا جو کاشتکار برادری سے تعلق رکھتے تھے اور تشدد کرنا اور اس سے نمٹنا اچھی طرح جانتے تھے۔

جہاں تک پنجاب کا تعلق تھا اپریل سے اختتام جون تک زیادہ تر فسادات لاہور اور امرتسر میں ہوئے اور دہشت کی فضا برقرار رہی۔ مجموعی طور پر حالات انتہائی کشیدہ رہے۔ البتہ پنجاب کے بیشتر حصوں میں کسی حد تک صورتحال پر امن رہی۔ جب تک ایوان جینکنز گورنر پنجاب رہا حکومتی اتھارٹی کا ڈھانچہ فعال رہا۔ متعصب سرکاری عمال پر سختی کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے مسلح افراد کے خلاف کارروائی کی گئی جو ادھر اُدھر پھر کر اہداف کو نشانہ بناتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہلاکتوں کی تعداد کم رہی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہ تعداد ہزاروں میں تھی لیکن یہ تعداد اصل ہلاکتوں سے کم ظاہر کی گئی۔ شمالی پنجاب میں مسلم اکثریتی علاقوں سے ہندوؤں اور سکھوں کی مشرقی پنجاب کو منتقلی اپریل سے وسط اگست تک جاری رہی۔ لاکھوں افراد نے ہندو-سکھ علاقوں میں محفوظ علاقوں میں پناہ حاصل کرنے کے لیے سرحد پار کی۔ دوسری طرف مشرقی علاقوں سے مغربی پنجاب کی جانب مسلمانوں کی ہجرت کا سلسلہ اگست کے دوسرے ہفتے سے شروع ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس عرصے میں زیادہ تر حملے مسلم اکثریت والے علاقوں میں ہو رہے تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پنجاب کے دیہی علاقے زیادہ تر تشدد سے پاک رہے اور بیشتر جرائم شہروں اور قصبوں میں وقوع پذیر ہوئے۔ البتہ آبادی کا ایک بڑا حصہ نقل مکانی پر ضرور مجبور ہوا۔

یوں خوف اور غصہ بڑھتا گیا۔ جب تک ریاستی اتھارٹی کے مکمل طور پر جارحانہ اور متعصب ہونے کا یقین نہ ہوا اس وقت تک لوگ گھر چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔

10

پنجاب میں انگریزوں کی پالیسی، 24مارچ - 30جون 1947

24مارچ کو لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے نئے گورنر جنرل اور وائسرائے کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اس سے پہلے انہیں جون 1948 سے پہلے انگریز انتظامیہ سے اقتدار ہندوستان والوں کو متحدہ یا منقسم ملک میں منتقل کرنے پر واضح بریفنگ دی گئی۔ بلاشبہ سب سے مشکل اور نازک کام پنجاب کے مسئلے کا حل تلاش کرنا تھا جہاں سکھ آبادی کا صرف 13.2 فیصد حصہ ہونے کے باوجود ایک اہم اور طاقتور کمیونٹی تھے۔ ہندوستانی فوج میں ان کی بڑی تعداد موجود تھی جبکہ زرعی شعبے پر بھی سکھ حاوی تھے (بالخصوص مغربی پنجاب کی نہری کالونیوں میں)۔ اس کے علاوہ راولپنڈی شہر میں سکھ بطور ساہوکار برتر حیثیت کے حامل اور بڑی املاک کے مالک تھے۔

سکھوں کے حوالے سے گورنر جینکنز کی رائے

وائسرائے کے نام سکھوں کے بارے میں تاریخ کے بغیر ایک ٹاپ سیکرٹ رپورٹ (غالب امکان ہے کہ اوائل اپریل میں لکھی گئی) میں گورنر جینکنز نے بیسویں صدی کے شروع سے سکھ سیاست کا تاریخی خاکہ پیش کیا ہے۔ اس میں سکھ گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے قیام اور گوردواروں کو قدامت پسند سکھوں کے کنٹرول میں دینے کا پس منظر بھی بیان کیا گیا ہے۔ شرومنی اکالی دل جو ایک عسکری گروپ کے طور پر وجود میں آیا تھا وہ وقت گزرنے کے ساتھ مقبول سیاسی جماعت بن کر ابھرا۔ گورنر نے مسلمانوں سے ممکنہ تصادم کے لیے سکھوں کی تیاریوں پر بھی روشنی ڈالی۔ ان میں سکھ جتھوں کی تشکیل بھی شامل تھی اور اب تک سینکڑوں جتھے بن چکے ہیں۔ سکھ انگریزوں کی رخصتی کے بعد اپنی الگ ریاست بنانے کے خواہاں تھے۔ 3مارچ کو لاہور میں آگ لگانے والی تقریر کا ماسٹر تاراسنگھ پر الزام لگاتے ہوئے گورنر نے اپنے اس نکتے کا اعادہ کیا جو سکھوں اور مسلمانوں میں مصالحت کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ جینکنز نے لکھا کہ:

> بدقسمتی سے مسلمانوں نے — بالخصوص راولپنڈی میں — سکھوں کو مہلک زخم لگایا اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سکھ لیڈر اب انتقام لینے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ پتہ چلا ہے کہ ان کے خودمختار سکھ ریاستوں کے حکمرانوں سے رابطے ہیں۔ چند روز قبل گیانی کرتار سنگھ نے 300 جتھہ داروں کے ایک اجلاس سے خطاب کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ اپنی کمیونٹی کے دفاع کی تیاریاں کریں (Carter, 2007a: 111)۔

جینکنز کا خیال تھا کہ سکھوں میں دھڑے بندی حد سے زیادہ تھی۔ اگرچہ ماسٹر تاراسنگھ اور بلدیو سنگھ (مرکز میں عبوری حکومت کے وزیر دفاع) سکھوں کے سرفہرست رہنما تھے۔ تاہم سکھوں کے تین بڑے دھڑے یہ تھے۔ اکالی سکھوں کے مرکزی

دھارے کی قیادت ماسٹر تارا سنگھ (غیر کاشتکار) اور گیانی کرتار سنگھ (کاشتکار) کر رہے تھے۔ حالیہ فسادات سے پہلے تک کرتار سنگھ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان اتحاد کے حق میں تھے (Carter, 2007a: 111)۔ اس دھڑے کے علاوہ ادھم سنگھ ناگوک اور اشہر سنگھ مجھیل کی سربراہی میں اکالیوں کا چھوٹا گروپ بھی ہے۔ یہ دونوں امرتسر کی زرعی کمیونٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ تیسرا دھڑا سردار پرتاپ سنگھ کائروں (کاشتکار) اور سرجیت سنگھ مجیٹھ (زمیندار) کی قیادت میں کانگریس نواز سکھوں پر مشتمل تھا۔ چوتھا دھڑا کمیونسٹ سکھوں کا تھا جن سے اکالی لاتعلق تھے۔ گورنر کا کہنا تھا کہ برادری سسٹم بھی سکھ سیاست میں اہمیت کا حامل تھا۔ دہقان طبقے کے جاٹ سکھوں کی تعداد اکثریت میں تھی لیکن مجموعی قیادت بہرحال غیر کاشتکار رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی۔ دیگر سکھ رہنماؤں میں سردار سورن سنگھ اور سردار اجل سنگھ نمایاں تھے۔ سکھوں کی لیڈرشپ کے معیار پر جینکنز نے یہ تبصرہ کیا:

> سکھ کمیونٹی کے ساتھ میری ملاقاتوں میں اندازہ ہوا کہ زیادہ بااثر لیڈروں میں ماسٹر تارا سنگھ، گیانی کرتار سنگھ اور سردار بلدیو سنگھ شامل ہیں۔ موخر الذکر لیڈر کا نام اس لیے لیا ہے کہ وہ بہت دولت مند ہے اور گورنر جنرل کی کونسل کا رکن بھی ہے۔ سکھوں کے بارے میں واضح معلومات دینا یا کوئی فیصلہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ایک سطح پر سکھ لیڈر ذہین منتظم ہیں، تاہم بڑے ایشوز پر یہ لوگ کمزور ہیں اور ان کی بصیرت بھی کم ہے (Ibid: 112)۔

ایک الگ خفیہ خط میں گورنر نے ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ انہیں ایک بے نام پمفلٹ تقسیم کرنے پر کافی تشویش ہے۔ اس پمفلٹ میں راولپنڈی ڈویژن میں سکھوں پر مظالم کو بڑھا چڑھا کر سکھوں سے کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ معرکے کے لیے تیار رہیں۔ اس کے علاوہ سردار بلدیو سنگھ سمیت ممتاز سکھ لیڈروں اور 18 نمایاں ارکان اسمبلی کے دستخطوں سے ایک اپیل جاری کی گئی ہے جس میں سکھوں کو 'وار فنڈ' میں 50 لاکھ روپے کا عطیہ جمع کرانے کے لیے کہا گیا ہے (Ibid: 117)۔

گورنر کے یہ مشاہدات نہایت اہم ہیں کیونکہ وزیر دفاع نے اپنا نام اس اپیل میں شامل کیا ہے جس میں جنگ کرنے اور لڑنے کے لیے فنڈ جمع کرنے کی بات کی گئی ہے۔ یہ اس بات کا بھی اشارہ تھا کہ ایک قانونی حکومت کے معمول کے طریقہ ہائے کار اور امور پٹڑی سے اتر چکے تھے اور انگریزوں کی اقتدار پر گرفت ختم ہو رہی تھی۔ البتہ رسمی حکومت اب بھی قائم تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی دیگر رپورٹیں موجود تھیں کہ عبوری حکومت کے وزراء پنجاب آکر اپنے ہم مذہب افراد سے اظہار یکجہتی کرتے رہے۔ نوآبادیاتی ریاست کا انتظام وانصرام ختم ہونا شروع ہو چکا تھا۔

ایک غیر مشتہر رپورٹ میں وائسرائے کے سٹاف کے 12 اپریل کے اجلاس کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ماؤنٹ بیٹن نے انکشاف کیا کہ وہ انتقال اقتدار کے لیے دو بڑے خطوط پر غور کر رہے تھے۔ ایک 'یونین' پلان تھا جس میں کابینہ مشن کے منصوبے کی ترمیمی شکل میں ہندوستان کو متحد رکھا جانا تھا جبکہ دوسرا 'بلقان' Balkan منصوبہ تھا جس میں ہر صوبے کو اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جانا تھا۔ اس کے نتیجے میں ایک لولا لنگڑا پاکستان وجود میں آتا، البتہ دہلی میں مرکز کو جون 1948 تک دفاع اور مسلح افواج پر کنٹرول بدستور حاصل رہتا (Mansergh and Moon, 1981: 207-9)۔

14 اپریل کو ایک اور ملاقات میں جینکنز نے ماؤنٹ بیٹن اور دیگر اعلیٰ انگریز حکام کو بتایا کہ مسلمان پورے پنجاب پر کنٹرول چاہتے تھے جبکہ سکھ مسلمانوں کے منصوبے کو ناکام بنانے کے درپے ہیں اور اس کے لیے باقاعدہ لڑائی کا بھی آپشن موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ پنجاب میں تین متبادل راستے بھی موجود ہیں۔ (اے) یونینسٹ پارٹی کی طرز پر تمام مذاہب پر مشتمل حکومت کا قیام۔ (بی) پنجاب کی تقسیم یا پھر (سی) خانہ جنگی۔ اگر حکومت آپشن اے اور بی قبول نہیں کرتی تو اسے لاتعلق ہو کر سکھوں اور مسلمانوں کو لڑائی کرنے دینی چاہیے (Ibid: 231-2)۔

گاندھی اور جناح کی 15 اپریل کی اپیل

وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے زور دیا کہ وہ دونوں تشدد کے خلاف مشترکہ بیان جاری کریں تاکہ کشیدگی میں کچھ کمی آئے۔ وائسرائے نے کہا کہ جناح کو اس بات پر رضامند کرنے کے لیے دو روز تک دباؤ ڈالنا پڑا جبکہ گاندھی نے فوراً تجویز کی حمایت کر دی۔ ایک اور مسئلہ یہ اٹھ کھڑا ہوا کہ کانگریس کی قیادت چاہتی تھی کہ پارٹی کے صدر اچاریہ کرپلانی ان کی طرف سے بیان پر دستخط کریں لیکن یہ بات جناح کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس صورت میں دستخط کریں گے جب مشترکہ بیان پر گاندھی کے دستخط ہوں گے۔ اس کے بعد مزید تین روز تک تبادلہ خیال جاری رہا۔ بالآخر گاندھی اور جناح نے اپیل پر اپنے نام لکھے اور 15 اپریل 1947 کو یہ اپیل جاری کی گئی۔

> ہم حالیہ لاقانونیت اور تشدد کی بھرپور مذمت کرتے ہیں جس سے ہندوستان کی نیک نامی پر حرف آیا اور معصوم انسانوں کو سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ قطع نظر اس بات سے کہ کس نے جارحیت کی اور کون نشانہ بنا۔ ہم سیاسی مقاصد کے لیے طاقت کے استعمال کی مذمت کرتے ہیں اور ہندوستان کے تمام مذاہب کے افراد کے لیے بلا تفریق اپیل کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف تشدد اور بدامنی سے دور رہیں بلکہ تحریر و تقریر میں اشتعال انگیز الفاظ کے استعمال سے گریز کریں (Carter, 2003: 85-6)۔

یہ اپیل پورے ہندوستان سے متعلق تھی لیکن اس میں پنجاب کی صورتحال کی عکاسی نہیں ہوتی تھی جہاں مارچ کے فسادات نے انتظامیہ میں خطرے کی گھنٹیاں بجادی تھیں اور حکومت اب مزید صرف نظر نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ اس اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا اور پنجاب بالخصوص لاہور اور امرتسر میں تشدد کی لہر برقرار رہی۔

ماؤنٹ بیٹن کے نام لیاقت علی خان کا خط

15 اپریل کو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے نام خط میں عبوری حکومت کے وزیر خزانہ لیاقت علی خان نے شکایت کی کہ پنجاب کے گورنر سر ایوان جینکنز غیر مناسب طور پر صوبے میں مسلم لیگ کے حکومت قائم کرنے کے حق سے انکار کر رہے ہیں۔ مسلم لیگ پنجاب اسمبلی میں سب سے بڑی جماعت تھی اور 57 فیصد آبادی کی نمائندگی کرتی تھی۔ لیاقت علی خان نے خط میں لکھا کہ:

گورنر نے صوبے میں خراب صورتحال کی آڑ میں دفعہ 93نافذ کر دی حالانکہ مسلم لیگ نے گورنر سے حکومت سازی کی دعوت ملنے کی صورت میں اسمبلی کا سامنا کرنے کا اپنا آئینی دعویٰ کیا تھا۔ پنجاب میں دفعہ 93 (گورنر راج) کے نفاذ کے بعد رونما ہونے والے واقعات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ موجودہ صوبائی انتظامیہ نے مسلمانوں کو دبانے اور نقصان پہنچانے کو اپنی پالیسی بنالیا ہے اور گورنر نے ایوان میں اکثریت رکھنے والی پارٹی کو اقتدار سے ہر صورت میں دور رکھنے کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا رکھا ہے(Ibid: 256-7)۔

ماؤنٹ بیٹن نے اس خط کی کاپی گورنر جینکنز کو ارسال کی جنہوں نے جواب میں ایک طویل نوٹ لکھا اور ان الزامات کو مسترد کر دیا۔ انہوں نے پنجاب کی گڑبڑ کو مسلم لیگ کے 'راست اقدام' کا شاخسانہ قرار دیا جس کا مقصد صوبے میں اکثریت رکھنے والی (یونینسٹ) حکومت کو اقتدار سے محروم کرنا تھا۔ اس کے بعد امن وامان کی صورتحال پیدا ہوئی اور ہجوم نے تشدد کی کارروائیاں کیں اور پھر تشدد اور دہشت گردی ہر طرف پھیل گئی۔ راولپنڈی، اٹک اور پھر جہلم کے کچھ حصوں میں غیر مسلموں کا کھلے عام قتل عام کیا گیا۔ کئی دیہات میں 'سکھوں اور ہندوؤں' کو ٹولیوں کی شکل میں مکانات میں بند کر کے زندہ جلا دیا گیا۔ متعدد سکھوں کے سر اور داڑھی کے بال کاٹ دیے گئے اور زبردستی ختنے کیے گئے۔ کئی سکھ عورتیں جو موت سے بچ گئیں ان کو اغوا کر لیا گیا۔

گورنر نے کہا کہ مسلم لیگ نے صوبے میں امن قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور نواب ممدوٹ نے اپنی حکومت تشکیل دینے کی بھی کوئی سنجیدہ بھاگ دوڑ نہیں کی۔ اس وقت ایوان میں ان کے پاس اکثریت نہیں تھی اور ملاقات میں انہوں نے یہ تاثر دیا کہ وہ تشدد کے ہولناک پھیلاؤ کی ذمہ داری قبول کرنے کے خواہاں نہیں۔ ہلاک ہونے والوں کی مجموعی تعداد کا علم نہیں۔ تازہ ترین تعداد 3ہزار سے نیچے ہے اور مجھے یقین ہے کہ حتمی تعداد 3500 تک بڑھ جائے گی۔ فرقہ وارانہ تناسب کا پتہ نہیں لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہر مسلمان کے بدلے چھ غیر مسلموں کو تہہ تیغ کیا گیا(Carter, 2007a: 137)۔

گورنر جینکنز نے نشاندہی کی کہ پنجاب کے سرکاری ملازمین میں مختلف مذاہب کا تناسب ملا جلا ہے لہٰذا یہ بات یقینی بنانا ناممکن ہے کہ مسلمانوں کو اعلیٰ عہدوں پر مکمل حصہ ملے۔ میں اعلیٰ انگریز یا غیر مسلمان افسروں کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ پنجاب کے 29اضلاع میں 10 کے ڈپٹی کمشنر انگریز تھے۔ 9مسلمان تھے جبکہ 10 ہندو یا سکھ تھے۔ ایک مسلمان کمشنر بھی تھا لیکن وہ رخصت پر تھا۔ دوسری طرف چیف سیکرٹری بھی مسلمان تھا۔ جینکنز نے کہا کہ یہ الزام غلط ہے کہ برطانوی حکام کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ جارحانہ تھا۔ انہوں نے لکھا کہ: "ان (انگریز) افسروں کو دیہی علاقوں میں خون خرابے اور مسلم لیگ کے رویے سے سخت دھچکا لگا ہے۔ ڈی آئی جی راولپنڈی مسٹر سکاٹ جو ایک اچھے فائٹر ہیں لیکن سیاستدان نہیں نے غیر دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے کچھ صحافیوں کو انٹرویو دیا جس میں انہوں نے حالات پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا"(Ibid:138)۔

جینکنز نے اس بات کی بھی تردید کی کہ ارادتاً جانبداری کے ساتھ سنسرشپ نافذ کی گئی۔ ان کا موقف تھا:

یہ الزام کہ میرے سمیت انگریز افسر پنجاب میں بدامنی کو ہوا دیں گے کیوں لگایا گیا ہے، مجھے علم نہیں۔ انڈین سول سروس اور انڈین پولیس میں شامل میرے سمیت ہر انگریز افسر کل ہی واپس (وطن) جانے میں خوشی محسوس کرے گا۔ اقتدار

کے انتقال کے بعد دو یا تین افسروں کو چھوڑ کر کوئی بھی انگریز افسر پنجاب میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔ چھ ماہ پہلے صورتحال قطعاً مختلف تھی لیکن اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑ رہا ہے جو خود اپنے ہاتھوں سے تباہی کے درپے ہیں اور کسی معقول سیاسی سمجھوتے کی عدم موجودگی میں اوسط سرکاری ملازم کو اپنی زندگی خانہ جنگی کے درمیان گزرنا پڑے گی(Ibid:138)۔

16 اپریل کو وائسرائے کو ایک اور ٹاپ سیکرٹ خط میں جینکنز نے تجویز دی کہ اگر پنجاب کی تقسیم ناگزیر ہو جائے تو دیگر اقدامات کے ساتھ یہ اقدامات بھی کیے جائیں۔ اول یہ کہ اعلان کیا جائے کہ پنجاب دو حصوں میں تقسیم ہو گا۔ ایک حصہ مسلم اکثریت والے اضلاع اور دوسرا غیر مسلم علاقوں پر مشتمل ہو گا(Ibid:134)۔ یہ تقسیم تحصیل کی سطح پر آبادی کے تناسب سے عمل میں لائی جانی چاہیے۔ دوئم ایک سرحدی کمیشن تشکیل دیا جائے جو اس بات کا تعین کرے کہ غیر مسلموں کے کتنے تناسب پر مشتمل ایک 'جاٹ صوبہ' بنایا جائے [ہندو جاٹوں کی اکثریت والی ہندی سپیکنگ انبالہ ڈویژن](Ibid)۔

کانگریس کا بعض گورنروں کی غیر جانبداری پر شبہ

17 اپریل کو ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس کے رہنما کرشن مینن سے ملاقات کی جنہوں نے کہا کہ ان کی پارٹی صوبہ سرحد، پنجاب، بہار اور سندھ کے گورنروں کو نہایت شبے کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اگرچہ گورنر پنجاب ایوان جینکنز کو دانستہ طور پر کانگریس مخالف رویے کا مرتکب نہیں ٹھہرایا گیا لیکن مینن نے یہ ضرور کہا کہ گورنر ان حالات کا حصہ ضرور ہیں جن کے پیش نظر صوبے میں دفعہ 93 کا نفاذ کیا گیا(Mansergh and Moon,1981: 310)۔

30 اپریل کو سکھ رہنماؤں کرتار سنگھ، ہرنام سنگھ اور بلدیو سنگھ نے وائسرائے کے چیف آف سٹاف لارڈ اسمے Lord Ismay سے ملاقات کی جس کا مقصد پنجاب کی صورتحال پر تبادلہ خیال کرنا تھا۔ اسمے نے اس ملاقات کو ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے:

ان (سکھ رہنماؤں) کی بات چیت کا لب لباب لاہور ڈویژن بالخصوص لاہور شہر کی تقسیم تھا۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ مسلمان وہاں اکثریت میں ہیں لیکن یہ سکھوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اگر لاہور کا کنٹرول چاہے یہ عارضی ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کے سپرد کیا گیا تو یہ سب کے سب لڑتے ہوئے جان دے دیں گے(Ibid: 490)۔

یکم مئی کو جینکنز نے ماؤنٹ بیٹن کو ایک طویل خط لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ وہ پنجاب کی متوقع تقسیم کی صورت میں سکیورٹی کی صورتحال پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے فوج کے کمانڈر، لاہور کے ایریا کمانڈر اور آئی جی پولیس سے ملاقات کریں گے۔ انہوں نے وائسرائے کو تجویز دی کہ وہ ہندوستانی لیڈروں پر زور دیں کہ وہ کابینہ مشن پلان قبول کر لیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو وائسرائے اور شاہ

معظم کی حکومت کو عوام میں یہ بات مشتہر کرنا چاہیے کہ ہندوستان تقسیم ہوا تو بنگال اور پنجاب کو بھی مسلم اور غیر مسلم علاقوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ یہ اعلان 15 مئی سے پہلے نہ کیا جائے، البتہ اس تاریخ کے بعد کسی بھی وقت اعلان کیا جا سکتا ہے۔ مجھے (گورنر) اس اعلان کی تاریخ کا 48 گھنٹے سے پہلے علم نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد میں پنجاب کے لیڈروں سے مل کر انہیں مخلوط حکومت کے قیام پر رضامند ہونے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس دوران تقسیم کے معاملات طے کرنے کی بھی کوشش کی جائے گی۔ البتہ پنجاب کے گورنر کو یہ توقع نہیں تھی کہ پنجاب کی تقسیم پرامن ہو گی۔ انہوں نے خطے میں دیگر معاملات کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ:

اَ. پنجاب کی پرامن تقسیم تقریباً ناممکن ہے۔ مسلمان پورے کا پورا پنجاب چاہتے ہیں جبکہ سکھ دریائے جمنا سے راوی تک کے تمام اضلاع کے خواہاں ہیں۔ شاید چناب کے اضلاع بھی، ہندو اس معاملے میں سکھوں کی حمایت کریں گے۔

ب. ابتدائی تقسیم کے تحت غیر مسلموں کو انبالہ، جالندھر ڈویژن بمعہ ضلع امرتسر ملیں گے جبکہ مسلمانوں کو راولپنڈی اور ملتان ڈویژن اور لاہور ڈویژن بغیر امرتسر دیے جائیں گے۔

ج. حکومتی اعلان سے تمام مسلمانوں اور سکھوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ جائے گی اور ایسے مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں میں خوف و ہراس پھیل جائے گا جو سرحد کی دوسری طرف مقیم ہوں گے۔ ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ حکومتی اعلان کا منطقی جائزہ لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ تقسیم کا مشترکہ ردعمل بھی متوقع نہیں (Carter, 2007a:160)۔

بنگال اور پنجاب پر جناح کا موقف

یکم مئی 1947 کو روزنامہ ڈان میں شائع ہونے والے محمد علی جناح کے بیان میں پاکستان میں پورے پنجاب، بنگال، این ڈبلیو ایف پی، سندھ، بلوچستان اور آسام کی شمولیت کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ مطالبہ مشہور دو قومی نظریے کی بنیاد پر کیا گیا۔ جہاں تک بنگال اور پنجاب کا تعلق ہے تو انہوں نے رائے دی کہ ان صوبوں کی تقسیم کا مطالبہ کسی ٹھوس اصول کی بنیاد پر نہیں کیا گیا بلکہ یہاں مقیم ہندو اقلیتوں کو اپنے ہی صوبے کے عوام کو دو یا تین حصوں میں تقسیم کرنے کی راہ ہموار کی جا رہی ہے تاہم جناح نے تجویز دی کہ کسی مناسب وقت پر دونوں طرف سے آبادی کی منتقلی ہو سکتی ہے (Mansergh and Moon,1981: 543)۔ انہوں نے کہا کہ:

یہ بات واضح ہے کہ اگر پاکستان میں مقیم ہندو اقلیت اپنے وطن ہندوستان ہجرت کرنا چاہتی ہے تو اسے اس کی مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ اسی طرح ہندوستان میں رہنے والے مسلمان پاکستان آنے کی خواہش رکھتے ہوں تو ایسا ہونا چاہیے۔ جلد یا بدیر آبادی کا تبادلہ کرنا پڑے گا اور ہندوستان اور پاکستان کی آئین ساز اسمبلیاں اس معاملے پر بحث کر سکتی ہیں۔

کانگریس کا پراپیگنڈہ ایک قابل عمل حل کی راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ یہ بات بالکل اظہر من الشمس ہے کہ کانگریس والوں نے بنگال میں ہندو مہاسبھا اور پنجاب میں سکھوں کو سامنے لا کھڑا کیا ہے اور کانگریس سکھوں کو گمراہ کر کے انہیں شہہ دے رہی ہے۔ سکھوں کو پنجاب کی تقسیم سے کچھ نہیں ملے گا بلکہ وہ دو حصوں میں منقسم ہو جائیں گے۔ اگر ان کی خواہش کے مطابق پنجاب تقسیم ہوتا ہے تو سکھوں کی نصف سے زائد آبادی پاکستان میں ہی رہ جائے گی لیکن اگر وہ پاکستان کے ساتھ

رہیں جیسا کہ مسلم لیگ نے تجویز دی ہے تو وہ ایک بڑی اقلیت کے طور پر اہم کردار ادا کر سکیں گے۔ ہم سکھوں کو ہر مناسب طریقے سے قریب رکھنے کا جتن کریں گے(Ibid: 544)۔

محمد علی جناح کا یہ کہنا تھا کہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کے موقف کا موازنہ بنگال اور پنجاب کو تقسیم کرنے کے وہاں کی اقلیتوں کے مطالبے سے نہیں ہوتا لیکن اس موقف سے پنجاب کے غیر مسلم لیڈر قائل نہ ہوئے۔ یہ موقف پنجاب کے گورنر اور وائسرائے کو متاثر کرنے میں بھی ناکام رہا۔ ماؤنٹ بیٹن نے یکم مئی 1947 کو ایک پرسنل رپورٹ میں کہا کہ:

میں نے پنجاب کی تقسیم کے بارے میں جینکنز سے طویل مشاورت کی ہے۔ تنازع کا باعث دو دریاؤں راوی اور ستلج کے درمیان واقع علاقہ ہے اور ایسی حد بندی کرنا نہایت مشکل ہے جو دونوں فریقوں کے لیے قابل قبول ہو۔ سکھ اپنا ملک 'سکھستان' بنانے کی مہم میں وہ بڑا علاقہ چاہتے ہیں جہاں بیشتر رقبہ تو سکھوں کی ملکیت ہے لیکن جہاں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں ہے، میں اس مطالبے کا قطعاً مخالف ہوں (وائسرائے نے یہاں بات پر زور دیا ہے)۔ سکھ اپنے مقدس مقامات کو بھی اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتے ہیں۔ بشمول لاہور جسے پاکستان کا دارالحکومت قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ جب سکھ وفد نے میرے ساتھ ملاقات کی تو انہوں نے بالخصوص مجھے کہا کہ سکھوں سے یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ کیا وہ پاکستان کے ساتھ رہیں گے یا ہندوستان کے ساتھ کیونکہ انہوں نے ابھی ایسا کوئی ذہن نہیں بنایا کہ وہ کس طرف جائیں گے(Ibid: 537)۔

یہاں ماؤنٹ بیٹن کے ریمارکس کافی اہم ہیں کیونکہ عموماً انہیں مسلم لیگ کے خلاف کانگریس کا حامی ہونے کا مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ اوپر دیے گئے مشاہدے سے اشارہ ملتا ہے کہ سکھوں کے مفادات کے معاملے میں بھی ان کی پہلو تہی کچھ کم نہیں۔ انہوں نے پہلے سے ہی لاہور کو پاکستان کا نامزد دارالحکومت قرار دیا تھا۔ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ سکھ پاکستان یا ہندوستان میں سے کسی ایک ملک کے ساتھ شامل ہونے کے حوالے سے گومگو کیفیت کا شکار تھے۔ جیسا کہ بعد میں آنے والے واقعات سے ثابت ہو گا کہ ہندو اور سکھ بدستور یہ سمجھتے رہے کہ لاہور ہندوستان کے سپرد کیا جائے گا۔

سکھوں کی گورنر جینکنز سے ملاقات

سورن سنگھ، ہربنس سنگھ اور بھیم سین سچر پر مشتمل ایک وفد نے 2 مئی کو گورنر جینکنز سے ملاقات کی اور اس امر کا اعادہ کیا کہ پنجاب کی تقسیم میں دریائے چناب کو ہندوستانی اور پاکستانی پنجاب کے درمیان سرحد کے طور پر چنا جائے۔ انہوں نے پنجاب میں علاقے مختص کرنے کی بنیاد پر آبادی کے عوامل کے حوالے سے کئی اعتراضات اٹھائے۔ اس پر گورنر نے کہا کہ "تقسیم کا معاملہ مجھے قابو سے باہر ہوتا دکھائی دیتا ہے"(Carter, 2007a: 162)۔ تمام کمیونٹیوں کے متفق ہوئے بغیر تقسیم کا منصوبہ مشکل پیدا کر سکتا تھا۔ اگر حکومتی فیصلے کے تحت بزور طاقت تقسیم کی جاتی ہے تو بڑی تعداد میں فوج کی ضرورت ہو گی چونکہ مطلوبہ تعداد میں فوجی

دستے موجود نہیں تھے اس لیے یہ منصوبہ بھی قابل عمل نہیں تھا۔ اگر کسی نہ کسی طرح زبردستی حل نکال لیا جاتا تو بھی یہ ہر صورت میں ناخوشگوار اور مشکل کام ہوتا جس کا نتیجہ ایسی دو حکومتوں کی صورت میں نکلتا جن کے لیے قتل عام ناگزیز ہوتا۔ 2 مئی کو اپنے ایک الگ نوٹ میں جینکنز نے نوٹ کیا کہ سکھ لیڈر مردم شماری کے ریکارڈ کو ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ ان کے لیے اہم مسئلہ لاہور ڈویژن تھا۔ وہ زور دے کر یہ کہتے تھے کہ:

> گورداسپور ایک غیر مسلم ضلع تھا، یہ کہ امرتسر ہر حال میں غیر مسلموں کو ملنا چاہیے۔ لاہور شہر سے باہر ضلع لاہور میں سکھوں کی بڑی تعداد آباد تھی اور یہ کہ مسلمانوں نے لاہور کی ترقی میں بہت کم کردار ادا کیا تھا۔ یا یہ کہ سکھوں کو امید تھی کہ انہیں مسلمانوں کے غلبے اور جبر کے حوالے نہیں کیا جائے گا(Ibid:165)۔

تقسیم کے پلان کے نشری اعلان کے لیے تیار کیے گئے ایک مسودہ بیان جس میں تاریخ درج نہیں (اوائل مئی میں تیار کیا گیا) میں انگریزوں کے انخلا کی تاریخ جون 1948 تھی۔(Mansergh and Moon 1981: 545) گویا مئی کے آغاز تک انگریزوں نے وسط اگست تک ہندوستان کو آزادی دینے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ہمیں آگے جا کے پتہ چلے گا کہ 9 مئی کے لگ بھگ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے سٹاف کے ساتھ 1947 میں ہی انتقال اقتدار کے اپنے فیصلے کی باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔

پنجاب کے بارے میں ریفرنڈم

پنجاب کے یونینسٹ لیڈر اور سابق وزیر اعظم سر خضر حیات ٹوانہ نے 3 مئی کو وائسرائے سے ملاقات کی۔ وائسرائے نے خضر حیات ٹوانہ سے پنجاب کی بابت ریفرنڈم پر تبادلہ خیال کیا۔ اس کے لیے ٹوانہ نے تجویز دی کہ ریفرنڈم میں عوام سے یہ چار سوال پوچھنے چاہئیں۔

1. آزاد پنجاب: جس میں دفاع کے معاملے میں ہندوستان اور پاکستان میں اتفاق کا معاہدہ ہو۔
2. پنجاب پاکستان میں شامل ہو جائے۔
3. پنجاب کو ہندوستان میں شامل کیا جائے۔
4. پنجاب کو تقسیم کر دیا جائے۔

اس موقع پر خضر حیات ٹوانہ نے اپنی اس تجویز پر سختی سے زور دیا کہ پنجاب کی تقسیم کے کسی فیصلے کا مطلب خانہ جنگی ہوگا(Ibid:590)۔ چنانچہ وائسرائے نے جینکنز سے ریفرنڈم پر رائے طلب کی جس پر انہوں نے اسے بیکار مشق قرار دیا۔ گورنر کا موقف تھا کہ مجوزہ ریفرنڈم میں جہاں مسلمان پورا صوبہ پنجاب پاکستان میں شامل کرنے کے حق میں ووٹ دیں گے وہاں ہندو اور سکھ بیک جنبش قلم اس کو مسترد کر دیں گے اور اس کی مذہبی بنیاد پر تقسیم کے حق میں ووٹ دیں گے۔ لہذا ریفرنڈم کسی متفقہ حل کے لیے بے کار ثابت ہوگا(Ibid: 605-6)۔

4 مئی کو محمد علی جناح اور لیاقت علی خان سے ملاقات میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بتایا کہ سکھ بڑی مشتعل ذہنی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ وائسرائے کو اس امر کا احساس مہاراجہ پٹیالہ سے حالیہ ملاقات میں ہوا تھا۔ وائسرائے نے اس بات کی ستائش کی کہ جناح مہاراجہ پٹیالہ سے ملاقات کرنے والے ہیں(Ibid: 613)۔

پنجاب کی "منطقی تقسیم" پر سکھوں کے اندیشے

جب سکھوں کو پتہ چلا کہ حکومت مختلف اضلاع میں مذہبی اکثریت یا اقلیت کی بنا پر پنجاب کی تقسیم کا سوچ رہی ہے۔(مراد یہ کہ بشمول گورداسپور 17 اضلاع مغربی پنجاب میں شامل ہوں گے جبکہ باقی ماندہ 12 اضلاع مشرقی پنجاب میں شامل کیے جائیں گے) تو ان کو یہ تشویش لاحق ہوگئی کہ ایسی تقسیم بالآخر حتمی تقسیم پر منتج ہوگی۔ ماؤنٹ بیٹن نے 5 مئی کو ایک خط میں بلدیو سنگھ کو یقین دلایا کہ یہ 'منطقی تقسیم' ضروری تھی، انہوں نے لکھا کہ:

> صوبے کی تقسیم یا اس کے اتحاد کے وسیع تر سوال کا فیصلہ کرنے کے لیے دو اسمبلیوں کی تشکیل کرنا ہوگی۔ اس اقدام سے مجوزہ باؤنڈری کمیشن جس نے دونوں حصوں کی حد بندی کرنا ہے کے کام پر کوئی فرق نہیں پڑے گا(Ibid: 619-20)۔

ایک انٹرویو میں 6 مئی کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بلدیو سنگھ کو خبردار کیا کہ اگر سکھوں نے گڑبڑ کرنے یا فرقہ وارانہ جنگ کی کوشش کی تو میں اپنی کمان میں موجود، ساری طاقت کے ساتھ ان کو کچل دوں گا اور بلدیو سنگھ کو بطور وزیر دفاع حکم دوں گا کہ وہ فوج اور ائیر فورس کو بھی سکھوں کے خلاف استعمال کریں(Ibid: 632)۔ اس کے علاوہ بلدیو سنگھ نے مطالبہ کیا کہ گورداسپور، امرتسر اور لاہور کے اضلاع مشرقی پنجاب میں شامل ہونے چاہئیں۔ اس معاملے پر ماؤنٹ بیٹن نے جینکنز سے مشاورت کی تو انہوں نے 7 مئی کو جواب دیا کہ "دیگر سکھوں کی طرح بلدیو سنگھ یہ سمجھنے کو تیار نہیں کہ صرف سکھ ہی واحد قوم نہیں۔ ان کو کسی بھی ضلع میں واضح اکثریت حاصل نہیں اور جو نئی ریاست وہ بنانے کا سوچ رہے ہیں وہ سکھ ریاست ہرگز نہیں ہوگی بلکہ غیر مسلم ریاست ہوگی"(Ibid :643)۔

نوآبادیاتی حکومت کی الجھنیں

اوپر مسلم لیگ، سکھوں اور کانگریس کے نکتہ ہائے نظر کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز حکومت کی غیر جانبداری پر اب اعلیٰ ترین سطح پر بھی شکوک وشبہات کا اظہار کیا جارہا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستانی قیادت کے ساتھ انتہائی نجی سطح پر رابطوں سے ان شکوک وشبہات کو تقویت ملی کہ انگریز متصادم مفادات کے تصفیے کے لیے جانبدارانہ کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس معاملے پر تو مقامی قیادت نے ڈھکے چھپے الفاظ میں خیالات ظاہر کیے جبکہ یہی لیڈر صوبائی گورنروں کو کھل کر ہدف تنقید بناتے تھے۔

جہاں تک گورنر پنجاب جینکنز کا تعلق ہے تو انہوں نے مسلم لیگ کے الزامات کا واضح جواب دیا اور اس طرح کانگریس اور سکھ قیادت کے گمراہ کن الزامات کو مسترد کیا لیکن اہم بات یہ تھی کہ نوآبادیاتی انتظامیہ

کی اتھارٹی اب ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی اور انتقال اقتدار کی تاریخ قریب آنے پر اس کی گرفت مزید متاثر ہونے والی تھی۔

ہندوستان کو آزادی کے بعد دولت مشترکہ میں شامل رکھنا

ماؤنٹ بیٹن کو اس معاملے پر بھی بریف کیا گیا کہ متحدہ یا منقسم ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ میں کیسے رکھا جائے گا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کیں اور ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے بالخصوص اس مقصد کے حصول کو اہم سمجھا (یعنی ہندوستان کی آزادی سے اہم)۔ انگریزوں کو اس بات کا خدشہ نہیں تھا کہ جناح پاکستان کی دولت مشترکہ میں شمولیت کی مخالفت کریں گے۔ اس کے برعکس جناح نے کہا تھا کہ پاکستان دولت مشترکہ سے باہر کیسے رہ سکتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کے بقول جناح نے کہا کہ:

> تمام مسلمان شروع سے انگریزوں کے وفادار رہے ہیں۔ ہم نے دونوں عالمی جنگوں کے لیے فوجوں کا سب سے زیادہ حصہ فراہم کیا۔ ہمارا کوئی لیڈر کبھی غیر وفاداری کے الزام میں جیل نہیں گیا۔ جب آزاد خود مختار جمہوریہ کے قیام کی قرارداد آئین ساز اسمبلی میں منظور کی گئی تو مسلم لیگ کا کوئی رکن اس میں شامل نہیں تھا۔ (یہ قرارداد 22 جنوری 1947 کو پاس کی گئی)۔ ہم میں سے کسی نے ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ ہمیں دولت مشترکہ سے باہر رکھا جائے۔ کیا دیگر رکن ممالک ہماری مرضی کے بغیر پاکستان کو دولت مشترکہ سے نکال باہر کریں گے؟۔ کیا ویسٹ منسٹر کا ضابطہ کار آپ کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ آپ کسی ملک کو محض اس لیے دولت مشترکہ سے نکال دیں کہ اس کا ہمسایہ ملک ایسا چاہتا ہے؟۔ برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل نے مجھے یقین دلایا ہے کہ برطانوی عوام ہماری دولت مشترکہ سے بے دخلی کی کبھی حمایت نہیں کریں گے (Carter, 2003: 127)۔

ماؤنٹ بیٹن نے جناح کو جواب دیا کہ وہ اگرچہ جذباتی طور پر ان سے اتفاق کرتے ہیں لیکن اگر صرف ایک حصہ دولت مشترکہ میں اس بنیاد میں رہا کہ اس میں برطانوی افسر موجود ہیں اور اسے برطانوی امداد ملتی ہے تو اس سے عجیب صورتحال پیدا ہو جائے گی۔ یہ صورتحال اس صورت میں ناگزیر ہو جائے گی اگر برطانیہ اس حصے کے ساتھ جنگ آزما ہو جو دولت مشترکہ سے باہر ہو گا۔ انہوں نے جناح کو خبردار کیا کہ اگر آزاد بھارت دولت مشترکہ میں شامل نہیں ہوتا تو وہ بھی پاکستان کی رکنیت مسترد ہونے کے لیے تیار رہیں۔ اس جواب پر ماؤنٹ بیٹن کے مطابق محمد علی جناح نے کہا کہ وہ ایسی صورت میں شاہ معظم برطانیہ کی حکومت کے اپیل سننے کے اختیار پر انحصار کریں گے۔ جناح کو اعتماد تھا کہ انہیں برطانوی عوام کی حمایت حاصل ہو گی (Ibid)۔

دوسری طرف کانگریس دولت مشترکہ کے خیال کی بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے مکمل آزادی اور خود مختاری کے حق کا دعویٰ کر رہی تھی۔ تاہم کانگریس پر زبردست دباؤ کے نتیجے میں مئی 1947 میں کانگریس کا ایک ایک رہنما دولت مشترکہ میں شمولیت پر رضامند ہوتا چلا گیا۔ 7 مئی کو وائسرائے سٹاف کی 27 ویں میٹنگ میں یہ کہا گیا کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کو اس ضمن میں منا لیا گیا ہے جبکہ نہرو بھی متفق ہو جائیں گے (Mansergh and Moon, 1981: 659)۔

1947 میں انتقال اقتدار

تاریخ کے بغیر رپورٹ میں (غالب امکان ہے کہ اوائل مئی میں لکھی گئی) وائسرائے کی 29 ویں سٹاف میٹنگ کی تفصیل یوں بتائی گئی ہے۔ عالی مرتبت وائسرائے نے کہا کہ وہ سمجھتے ہیں اگر ہندوستان کو آزاد ملک کا درجہ جون 1948 سے پہلے دے دیا گیا تو یہ کام 1947 کے دوران وقوع پذیر ہو جانا چاہیے (Ibid: 702-3)۔ لگتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے جمع تفریق کر کے اخذ کیا تھا کہ اگر کانگریس پارٹی بھی ہندوستان کے دولت مشترکہ میں برقرار رہنے پر رضامند ہو گئی تو بات برطانیہ کے مفاد میں ہو گی کہ آزادی قبل از وقت یعنی 1947 میں دے دی جائے۔ اس لیے انہوں نے مزید تاخیر سے گریز کیا۔

وقت سے پہلے ہندوستان کو آزادی دینے کا ایک عملی فائدہ یہ بھی ہوتا کہ انگریز فوجی دستے جلد از جلد ملک سے نکلنے کے قابل ہوتے۔ البتہ کچھ تعداد میں فوجی عبوری دور کے لیے درکار ہوتے (Ibid: 703)۔ ان خطوط پر آگے چلتے ہوئے رپورٹ میں لکھا کہ:

> عزت مآب وائسرائے نے کہا کہ برطانیہ عظمیٰ کو ان کی رائے میں یہ ٹھوس فوائد حاصل ہو سکتے ہیں:
>
> (i) قبل از وقت انتقال اقتدار سے برطانیہ کی ساکھ میں زبردست اضافہ ہو گا۔
>
> (ii) انتقال اقتدار کی صورت میں موجودہ ذمہ داریوں سے کنارہ کشی کی جا سکے گی۔
>
> (iii) آزاد ہندوستان کی طرف سے دولت مشترکہ میں شامل رہنے کی درخواست سے دنیا کی نظر میں برطانیہ کی قدر و منزلت میں زبردست اضافہ ہو گا۔ صرف یہی ایک فیکٹر نہایت اہم ہے۔
>
> (iv) ایسی کوئی درخواست موجودہ برطانوی حکومت کی اپنے عوام کی نظر میں عزت میں اضافے کا بھی باعث بنے گی۔
>
> (v) برطانوی سلطنت کے دفاع کے نکتہ نظر سے دولت مشترکہ کے اندر ہندوستان پوری دنیا کی سٹریٹجی کے فریم ورک کو مکمل کرے گا جبکہ غیر جانبدار ہندوستان ایک ایسا خلا پیدا کر دے گا جو مسئلے کو انتہائی پیچیدہ بنا دے گا۔ ایک جارح ہندوستان کا مطلب یہ ہو گا کہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ مکمل طور پر کٹ جائیں (Ibid: 703-4)۔

اس وقت تک برطانوی حکومت نے یہ پختہ رائے قائم کر لی تھی کہ ہندوستان کی تقسیم ناگزیر ہو گی۔ اسی رپورٹ میں کہا گیا کہ:

> محترم المقام وائسرائے نے اجلاس میں کہا کہ انہیں 1947 میں نئی ریاست کو انتقال اقتدار کے مرحلے میں لاحق مشکلات کا پوری طرح احساس ہے۔ ان کو اس بات پر کوئی شک نہیں کہ ان مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ جنگ عظیم کے دوران درپیش مسائل حل کیے گئے تھے۔ انہی مشکلات میں سے ایک بڑا مسئلہ پاکستان کو چلانے کے لیے انتظامی مشینری کی تشکیل اور ایسی آئینی مشینری قائم کرنا ہے جو اقتدار اپنے کندھوں پر سنبھال سکے۔ البتہ ان مسائل کے حل کے لیے بلاشبہ کئی راستے موجود ہیں (Ibid: 704)۔

قبل از وقت انتقال اقتدار کی نہرو کو بتائی گئی تفصیل

وائسرائے کی شملہ میں 10 مئی کو ملاقات جس میں پنڈت نہرو بھی موجود تھے سے متعلق انتہائی خفیہ دستاویز سے انکشاف ہوتا ہے کہ ریفارمز کمشنر وی پی مینن وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی ہندوستان آمد سے بہت پہلے قبل از وقت انتقال اقتدار کے منصوبے پر کام کر رہے تھے۔ لگتا ہے کہ وی پی مینن نے اس منصوبے کا ایک روز قبل نہرو سے جبکہ چار ماہ پہلے ولبھ بھائی پٹیل سے ذکر کیا تھا (Ibid: 731)۔ اس ملاقات کے بعد کوئی فالو اپ موجود نہیں اس لیے ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں کہ وی پی مینن کس کے کہنے پر اس منصوبے پر کام کر رہے تھے۔ اسی رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ نہرو اب آزاد بھارت کی دولت مشترکہ میں موجودگی کے کھلے عام حامی تھے۔

برطانوی فوج پاکستان پر یادداشت تیار کرتی ہے

12 مئی 1947 کو لندن میں رائل ایئر فورس مارشل لارڈ ٹیڈر Lord Tedder کی صدارت اور فیلڈ مارشل منٹگمری اور لارڈ اسمے کی موجودگی میں برطانوی مسلح افواج کے کئی شعبوں کے سربراہوں کا خصوصی اجلاس ہوا جس میں تقسیم ہند کی حتمی تجاویز پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ اب تقسیم کو سیاسی تصفیے کی بنیاد کے طور پر لیا جا رہا تھا۔ یہ متوقع تھا کہ پاکستان سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبے، مغربی پنجاب، آسام بشمول بنگال کے چند حصوں پر مشتمل ہو گا۔ یہ بھی توقع تھی جناح کو تجویز دی جائے گی کہ:

> مسلمانوں پر مشتمل حصہ دولت مشترکہ میں رہے۔ دیگر خود مختار ریاستیں بھی ایسا کریں۔ دوسری طرف امکان ہے کہ کانگریسی لیڈروں کے واضح عزائم کے تحت ہندوستان آزاد اور خود مختار ریاست بنے۔ اگرچہ اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ کچھ کانگریسی رہنماؤں کو برطانوی مشیروں اور انتظامی افسروں کی مدد کے بغیر ہندوستان کے معاملات چلانے کی اہلیت پر شبہ ہے (Ibid: 788)۔

اس دستاویز سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ فوجی سربراہوں کو یہ معلومات پوری طرح نہیں دی گئی تھیں کہ کانگریس کو پہلے ہی دولت مشترکہ کے رکن کے طور پر برقرار رکھنے پر رضامند کر لیا گیا تھا۔ اجلاس میں منٹگمری نے اس رائے کا اظہار کیا کہ "پاکستان بالخصوص شمال مغربی پاکستان کا دولت مشترکہ میں موجود رہنا ایک عظیم اثاثہ ہو گا" (Ibid: 791)۔ فوجی سربراہوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ان کی آراء وزیر اعظم کو پیش کرنی چاہئیں۔ انہوں نے اتفاق کیا کہ:

> سٹریٹجک نکتہ نظر سے مغربی پاکستان کے دولت مشترکہ میں رہنے کے حق میں ٹھوس دلائل موجود ہیں۔ جیسا کہ ہمیں کراچی بندرگاہ جیسی اہم سٹریٹجک سہولیات اور مسلمانوں کی مستقبل میں افرادی قوت کی فراہمی۔ چنانچہ مغربی پاکستان کی دولت مشترکہ میں بہر صورت شمولیت یقینی بنانا ہو گی۔ اس ضمن میں انکار کا مطلب یہ ہو گا کہ وفادار لوگ دولت مشترکہ سے نکال دیے جائیں اور ہمیں ہندوستان میں کسی بھی جگہ سے سٹریٹجک سہولیات میسر

نہ ہوں۔ اس کے علاوہ پوری اسلامی دنیا میں ہماری ساکھ بھی متاثر ہو گی۔ عسکری نکتہ نظر سے اس کے نتائج تباہ کن ہوں گے (Ibid: 791-2)۔

اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ خود مختار ریاستوں اور بنگال کی بھی دولت مشترکہ میں شمولیت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس لیے ایسے تمام علاقے جو دولت مشترکہ میں شامل ہونا چاہتے ہوں کو بھی رکنیت کی درخواست دینے کے لیے کہا جائے۔

پنجاب کو ووٹنگ کے مقصد کے لیے "منطقی بنیاد" پر تقسیم کیا جائے گا

11 مئی کو ایک اجلاس جس کی صدارت ماؤنٹ بیٹن نے کی اور گورنر پنجاب اور نہرو بھی موجود تھے میں وائسرائے نے کہا کہ "برطانوی انتظامیہ معاملات چلانے کے لیے پنجاب کی مسلم اور غیر مسلم اضلاع کی بنیاد پر منطقی تقسیم چاہتی ہے لیکن اس سے مجوزہ باؤنڈری کمیشن کا کام متاثر نہیں ہونا چاہیے" (Ibid: 759)۔ نہرو نے اس بات سے اتفاق کیا کہ جائیداد کی ملکیت کا اصول جس کا سکھ مطالبہ کر رہے ہیں وہ علاقوں کی تقسیم کی معقول بنیاد نہیں بن سکا بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں سکھوں کے مقدس مقامات موجود ہیں یہ نکتہ ذہن نشین رکھنا چاہیے (Ibid)۔

البتہ جینکنز کا نکتہ نظر یہ تھا کہ مغربی پنجاب میں اگرچہ سکھوں کے مقدس مقامات کی بڑی تعداد موجود ہے تاہم اصل مقدس مقام امرتسر میں ہے جسے بہر صورت سکھوں کے حوالے کیے جانا چاہیے (Ibid)۔ انہوں نے یہ پیشگوئی بھی کی کہ باؤنڈری کمیشن لاہور اور گورداسپور کے اضلاع کو تقسیم کر سکتا ہے۔ اس اجلاس میں نہرو نے اس افواہ کا بھی ذکر کیا کہ پنجاب میں دیگر علاقوں سے اسلحہ منتقل کیا جا رہا تھا۔ گورنر نے اس دعوے کی تردید کی تاہم اتنا ضرور کہا کہ کچھ اسلحہ صوبہ سرحد سے آیا تھا اور حکومت اس معاملے کو دیکھ رہی تھی (Ibid)۔

اسی دوران پنجاب کی تقسیم کے میکانزم پر بحث شروع ہو گئی۔ 'منطقی تقسیم' کا خیال یہ تھا کہ ایسا فریم ورک تیار کیا جائے جس کے تحت پنجابیوں کے نمائندوں کا انتخاب ہو سکے۔ مثلاً پنجاب اسمبلی کے ارکان کا انتخاب جو اگرچہ تمام عوام کی نمائندگی نہ کرتے ہوں لیکن تقسیم کے منصوبے کے معاملات پر غور کریں۔ ضلع کو ایک اکائی کا درجہ دیا گیا اور مسلم اور غیر مسلم 29 اضلاع کی منطقی گروپ بندی کی گئی۔ ایسے تصور کو 13 مئی کی تقریر کے مسودے کی صورت میں مزید آگے بڑھایا گیا جس کے تحت ہندوستان کے عوام سے تقسیم کی بابت رائے مانگی جانا تھی۔ اس مسودے پر اپنے تبصرے میں جناح نے اعلان کیا کہ مسلم لیگ کسی بھی صورت میں کابینہ مشن کے منصوبے کو کسی بھی شکل میں قبول نہیں کرے گی۔ انہوں نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم قبول نہ کرنے کا بھی اعادہ کیا (Ibid: 852)۔ البتہ ماؤنٹ بیٹن نے محمد علی جناح سے کئی ملاقاتوں میں زور دیا کہ صوبوں کی تقسیم کے لیے وہی فارمولا بنایا جائیگا جو ہندوستان کی تقسیم کے لیے تیار کیا جائے گا۔ 17 مئی ایک نظر ثانی شدہ بیان میں ایک جدول کا اضافہ کیا گیا جس میں پنجاب کو 'منطقی' طور پر 17 مسلمان اور 12 ہندو سکھ اضلاع میں تقسیم کیا گیا اور آبادی کی تعداد کے تعین کے لیے 1941 کی مردم شماری کو استعمال کیا گیا (Ibid:887)۔

جناح اور مہاراجہ پٹیالہ کی ملاقات

ماؤنٹ بیٹن نے جناح کو ترغیب دی کہ وہ پٹیالہ کے مہاراجہ سے ملاقات کر کے اس بات کا امکان تلاش کریں کہ کیا سکھ اور مسلمان پنجاب کو متحد رکھنے پر متفق ہو سکتے ہیں۔ یہ ملاقاتیں دہلی میں 15 اور 16 مئی کو ہوئیں۔ پاکستان ٹائمز اور دی ٹربیون دونوں اخبارات نے خبر شائع کی کہ مہاراجہ نے بتایا کہ جناح نے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ پاکستان میں اقلیتوں کا تحفظ کیا جائے گا تاہم انہوں نے کوئی دوٹوک تجویز یا فارمولا نہیں دیا۔ بھارت کی بین الاقوامی سرحد کے بارے میں مہاراجہ نے سکھوں کی اس تجویز کو دہرایا کہ اس کی حد دریائے چناب ہونی چاہیے جبکہ جناح دریائے ستلج کو آخری حد بنانے کے خواہاں تھے۔ البتہ بطور مفاہمت امکان تھا کہ فریقین دریائے راوی کو بطور سرحد قبول کرنے پر اتفاق کر لیں گے (Ibid: 915)۔

وائسرائے کے پرنسپل سیکرٹری سر ایرک مائی ولی Sir Eric Mieville نے 20 مئی کو ماؤنٹ بیٹن کو ایک ٹیلی گرام میں بتایا کہ مہاراجہ پٹیالہ اور جناح کے درمیان ملاقات ہوئی جس میں مہاراجہ نے طویل گفتگو میں انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہندوستان کی تقسیم کے تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے لیکن جناح کسی بھی صورت میں سمجھوتہ کرنے یا قائل ہونے پر آمادہ نظر نہیں آئے۔ اسی ٹیلی گرام میں مائی ولی نے لکھا کہ:

> سکھ پنجاب کی تقسیم کو ناگزیر سمجھتے ہیں اور ایسی کوئی تقسیم جس میں ان کی زمینی جائیدادوں، اثاثوں، مقدس مقامات کے لحاظ سے ان کے حقوق اور سکھوں کی اکثریت پر مشتمل ان کے الگ وطن کی یقین دہانی نہ کرائی گئی ہو اسے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے... سکھوں اور ہندوؤں دونوں قوموں کے نزدیک یہ امر انتہائی غیر مناسب ہوگا کہ پنجاب کو دیگر عوامل پیش نظر رکھے بغیر محض آبادی کی بنیاد پر تقسیم کر دیا جائے۔ ان عوامل میں قومی اثاثوں میں دیگر گروہوں کے ساتھ ان کا تناسبی حصہ، صوبے کی خوشحالی میں ان کا کردار اور تقسیم شدہ حصوں کی خودمختاری کی خواہش شامل ہیں (Ibid)۔

اس کے علاوہ مہاراجہ نے محسوس کیا کہ انگریز حکام کی پالیسی بالخصوص پولیس فورس کے حوالے سے مسلمان نواز تھی، انہوں نے استدعا کی کہ اگر اقتدار منقسم ہندوستان کو منتقل کیا جاتا ہے تو شاہ برطانیہ کی حکومت اور وائسرائے کو پنجاب کی ایسی تقسیم یقینی بنانا ہوگی جس میں سکھوں سے انصاف کیا جا سکے (Ibid)۔

جناح کی سکھوں کو پیشکش

مندرجہ بالا تفصیل سے جناح اور مہاراجہ کی ملاقات کا مکمل ریکارڈ سامنے نہیں آتا۔ متعدد باخبر پاکستانیوں سے کئی انٹرویوز کے دوران انہوں نے کہا کہ محمد علی جناح نے سکھوں کو اس شرط پر نہایت فراخدلانہ پیشکشیں کیں کہ وہ ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ نہ کریں۔ اس دعوے کو آنجہانی مہاراجہ پٹیالہ کے 19 جولائی 1959 کو 'دی ٹربیون' میں شائع ہونے والے آرٹیکل 'میں جناح کی طرف سے سکھ ریاست کی پیشکش یاد کرتا ہوں' سے تقویت ملتی ہے۔ بادی النظر میں ملاقات میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، لیاقت علی خان اور ان کی اہلیہ بیگم رعنا لیاقت علی بھی موجود تھے۔ آرٹیکل کے چند اقتباسات نیچے دیے جا رہے ہیں:

ہم نے ڈرنک کی اور پھر کھانا کھانے چلے گئے۔ گفتگو شروع ہوگئی اور مسٹر جناح نے میری رضامندی کی صورت میں ہر مطالبہ منظور کرنے کی پیشکش کی۔ وہاں دو پہلو تھے۔ ایک تجویز راجستھان اور دوسری آزاد سکھ ریاست کی بنیاد پر مبنی تھی۔ مجوزہ سکھ ریاست میں جنوب کے ایک یا دو اضلاع شامل نہیں ہونا تھے۔ میں نے ماسٹر تارا سنگھ، گیانی کرتار سنگھ اور دیگر لیڈروں سے طویل ملاقاتیں کیں۔ سکھوں کی طرف سے تمام تر بات چیت میرے علم میں تھی۔ دراصل میں بعض تناظر میں ان کے ساتھ ایک ڈیل کرنے کا خواہاں تھا۔ میں نے جناح سے کہا کہ میں ان کی دونوں تجاویز قبول نہیں کر سکا اور انہیں اپنی سوچ سے آگاہ کیا۔ لیاقت علی اور بیگم لیاقت علی نے مسلم لیگ کی طرف سے مجھے کئی گمراہ کن پیشکشیں کیں۔ یہ کہ میں نئی سکھ ریاست کا پٹیالہ کی طرح سربراہ ہوتا۔ سکھوں کی اپنی فوج وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب باتیں بڑی پرکشش لگ رہی تھیں لیکن میں عملی طور پر انہیں قبول کر سکتا تھا نہ میں اپنا ارادہ تبدیل کرنے کے موڈ میں تھا۔ بات چیت نصف شب تک جاری رہی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک اچھے سامع تھے۔ وہ کبھی کبھی خود بات کرتے تھے۔ آخر کار انہوں نے کہا کہ شاید میری (مہاراجہ) اور جناح کی کبھی مناسب وقت پر دوبارہ ملاقات ہو سکے (Quoted in Singh1991: 86)۔

اسی آرٹیکل میں آگے چل کر مہاراجہ نے محمد علی جناح کی طرف سے اورنگزیب آباد روڈ دہلی میں ان کی رہائشگاہ پر چائے پر مدعو کرنے کا ذکر کیا ہے۔ وہاں مہاراجہ کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ ملاقات میں مس فاطمہ جناح بھی موجود تھیں اور بعد ازاں لیاقت علی خان بھی شامل ہوگئے۔ اس موقع پر وہی باتیں ہوئیں جو دو روز قبل ہوئی تھیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا (Ibid:87)۔

سکھ لیڈروں اور مسلم لیگی قیادت کے درمیان ملاقاتوں میں پٹیالہ کے سابق وزیراعظم ہردت سنگھ ملک بھی شریک رہے۔ نیچے میں نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ ایسی ہی کسی ملاقات کی تفصیل ہے جس میں دیگر سکھ لیڈروں کے علاوہ مہاراجہ بھی موجود تھے۔ پنجاب کی تقسیم کے ممتاز سکھ مؤرخ کرپال سنگھ نے سکھوں سے ملاقات کے حوالے سے ہردت سنگھ کا انٹرویو کیا جس میں انہوں نے یہ سوال کیا:

سوال: "سکھ لیڈروں کی مسٹر جناح اور لیاقت علی خان سے ملاقاتوں میں آپ بھی موجود تھے۔ کیا آپ اس پر کوئی روشنی ڈالیں گے[؟] یہ مذاکرات ناکام کیوں ہوئے؟"

جواب: "آپ جانتے ہیں کہ اس وقت تک پاکستان کا قیام یقینی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جناح سکھوں کو قائل کرنے کے کافی شائق تھے چنانچہ انہوں نے مہاراجہ پٹیالہ کو ملاقات کا پیغام بھجوایا جس پر مہاراجہ نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے کہا کہ 'ملاقات ہر صورت کریں لیکن جناح کو اپنی طرح بلائیں۔ ہم ان سے ملنے کیوں جائیں۔ بات انہوں نے کرنی ہے تو انہیں خود آپ کی طرف چل کر آنا چاہیے۔'

"لہٰذا ہم نے انہیں پیغام بھجوادیا جس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ یہاں نہیں آسکتے اس لیے کسی تیسری جگہ پر ملاقات رکھ لیں۔ ہم نے یہ بات مان لی چنانچہ نئی دہلی میں 4 بھگوان داس روڈ پر میرے بھائی کے گھر پر ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ ملاقات میں جناح، مہاراجہ پٹیالہ میں خود، ماسٹر تاراسنگھ اور گیانی کرتار سنگھ موجود تھے۔ میں سکھوں کی طرف سے ترجمان تھا۔

"مسٹر جناح نے ان الفاظ کے ساتھ گفتگو شروع کی کہ وہ دلی طور پر خواہاں ہیں کہ سکھ پاکستان کو تسلیم کرلیں جس کے بدلے میں سکھوں کو جو مانگیں گے دیا جائے گا۔ میں نے انہیں مخاطب کر کے کہا کہ مسٹر جناح آپ نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن ہم جاننا چاہتے کہ آپ کا حقیقی موقف کیا ہوگا۔ آپ کی حکومت ہوگی، آپ کی پارلیمنٹ ہوگی اور مسلم افواج بھی ہوں گی۔ یہ بتائیے کہ ان سب میں سکھوں کا کیا حصہ ہوگا۔ ان کا جواب تھا مسٹر ملک کیا آپ کو پتہ ہے کہ مصر میں کیا ہوا تھا؟ میں سکھوں سے ویسی ہی ڈیل کروں گا جیسی ذغلول پاشا نے مصر کو آزادی ملنے کے وقت قبطی عیسائی اقلیت سے کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے پوری کہانی سنائی کہ قبطی(Copts)عیسائیوں کا وفد پہلی بار ذغلول پاشا سے ملا اور اپنے مطالبات پیش کیے۔ مطالبات سننے کے بعد ذغلول پاشا نے ان سے کہا کہ آپ لوگ واپس جائیں، ایک بار پھر غور کریں اور اگلی ملاقات میں مطالبات تحریری شکل میں لے کر آئیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ ذغلول پاشا نے کاغذ پکڑا اور پڑھے بغیر لکھ دیا۔ 'منظور ہے' جناح نے اس موقع پر کہا، 'یہی کچھ میں سکھوں کے ساتھ کروں گا۔'

"اس بات نے سکھوں کو عجیب وغریب صورتحال میں مبتلا کردیا کیونکہ ہم کسی بھی صورت میں پاکستان کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے جبکہ دوسری طرف یہاں مسلمان لیڈر ہمیں سب کچھ دینے کو تیار تھا، ہم کیا کریں؟

"تب میں نے کچھ سوچ کر کہا، 'مسٹر جناح آپ نہایت مہربان ہے لیکن فرض کریں کہ خدانخواستہ کل کو آپ زندہ نہ رہیں تو ان وعدوں کو کون پورا کرے گا؟'

"ان کا جواب نہایت پر اعتماد تھا۔۔۔ انہوں نے کہا، 'میرے دوست پاکستان میں میری کہی بات کو خدا کی بات کے برابر درجہ حاصل ہوگا۔ کوئی اس سے روگردانی نہیں کرے گا۔'

"اس کے بعد کہنے کو کوئی بات نہیں تھی اور یوں ملاقات ختم ہوگی۔"

جناح کا پاکستان کے لیے راہداری کا مطالبہ

22 مئی کو خبر رساں ادارے 'رائٹر' نے محمد علی جناح کا یہ بیان جاری کیا:

سب سے پہلے مسلم لیگ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان زمینی رابطے کے لیے راہداری کا مطالبہ کرے گی۔ دوئم یہ کہ مسلم لیگ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی صورت میں ہر انچ کے لیے لڑائی لڑے گی۔ سوئم پاکستان اور برطانیہ کے درمیان حقیقی معنوں میں مفید تعلقات استوار کیے جائیں گے۔ چہارم یہ کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دوستانہ اور تعاون پر

مبنی تعلقات ہونے چاہئیں۔ تمام مسلح افواج کو مکمل طور پر تقسیم کیا جانا چاہیے۔ میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک ایسے اتحاد یا معاہدے کا خواہاں ہوں جو کسی بیرونی جارحیت کا مل کر مقابلہ کرنے پر مبنی ہو (Ibid: 929-30)۔

برطانوی حکومت کو یقین ہو گیا کہ کابینہ مشین پلان غیر موثر ہو گا۔

22 مئی کو برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی نے ہندوستان سے متعلق پالیسی پر ایک میمورنڈم جاری کیا جس میں اس افسوس کا اظہار کیا گیا کہ اگرچہ ماؤنٹ بیٹن کو کابینہ مشن پلان کے تحت انتقال اقتدار پر مذاکرات کے لیے بریفنگ دے دی گئی تھی تاہم وائسرائے اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ یہ پلان موثر نہیں ہو گا۔ اس وقت تک بھی لندن میں برطانوی حکومت جون 1948 کو ہی انتقال اقتدار کی تاریخ قرار دے رہی تھی (Ibid: 949)۔

جہاں تک ہندوستان میں مسلح افواج کا تعلق تھا۔ انگریز فوج کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر کلاؤڈ آکن لیک جو ہندوستان بالخصوص فوج کی تقسیم کے سخت خلاف تھے نے 27 مئی کو اپنے ایک نوٹ میں مسلح افواج کی تقسیم کے عمل میں درپیش بے پناہ مشکلات کا ذکر کیا (Ibid: 1004-8)۔ اسی روز مہاتما گاندھی نے خبردار کیا کہ کانگریس ہندوستان کی تقسیم کی مخالف ہے۔ انہوں نے بیان میں کہا کہ:

> ملک کی تقسیم کی پہلی ذمہ داری مسلم لیگ اور پھر انگریز حکومت پر عائد ہو گی اور اگر تقسیم ناگزیر ہوتی ہے تو اسے منصفانہ ہونا چاہیے۔ کانگریس کسی بھی صورت میں غیر مسلم علاقوں کو پاکستان میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دے گی (Ibid: 1038)۔

3 جون 1947 کا تقسیم کا منصوبہ

19 مئی کے بعد ماؤنٹ بیٹن برطانیہ میں تھے اور برطانوی کابینہ اور انڈیا آفس کے ساتھ مشاورت کرتے رہے اور 30 مئی تک واپس نہ آئے۔ 31 مئی کو تمام صوبائی گورنروں کے نام ایک تار میں انہوں نے برطانوی کابینہ سے مشاورت کے بارے میں بتایا کہ:

> مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہم نے ہندوستان اور پاکستان کے دساتیر کی تیاری اور تقسیم کے معاملات کا تصفیہ ہونے کا انتظار کیا تو مسائل حل ہونے کی بجائے بڑھتے چلے جائیں گے۔ خدشہ ہے کہ جون 1948 میں کوئی شورش برپا ہو جائے۔ چنانچہ میں زور دے کر کہتا ہوں کہ شاہ انگلستان کی حکومت کو دو آزاد حکومتوں کے قیام کے لیے فوراً قانون سازی کرنی چاہیے۔ اگر عوام نے تقسیم کے حق میں ووٹ دیا تو ہر حکومت کے پاس 1935 ایکٹ کے مطابق آئین ہونا چاہیے تاہم انہیں کسی بھی وقت نیا آئین تشکیل دینے کا حق بھی ہونا چاہیے (Mansergh and Moon,1982: 29)۔

اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے 2 جون کو ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات کی۔ انہیں تازہ ترین بیان کی نقول اگلے روز صبح 10 بجے دے کر کہا گیا کہ وہ اپنے جوابات اور آرا نصف شب تک جمع کرا دیں لیکن یہ بیان حتمی تھا۔ کئی نظر ثانی شدہ

فارموں میں اس فارم کے بیشتر ٹیکسٹ کا ذکر ملتا ہے لیکن اس میں قبل از وقت انتقال اقتدار کی تاریخ نظر نہیں آتی۔ البتہ ماؤنٹ بیٹن نے ایک سر کلر جاری کیا جس کا عنوان تھا' تقسیم کے انتظامی مسائل' جس میں پہلی بار انہوں ہندوستان کی تقسیم پر اتفاق کی صورت میں بہت جلد ہندوستان سے انخلا کا انکشاف کیا۔ انہوں نے اس دستاویز میں لکھا کہ یہ میرا ارادہ ہے کہ ایکٹ کو بننے کے فوری بعد موثر ہو جانا چاہیے اور یہ کام کسی بھی صورت میں 15 اگست سے پہلے ہو جانا چاہیے (Ibid: 53)۔ بھارت اور پاکستان کو دو آزاد ریاستوں کا درجہ دیا جانا تھا۔ اس دستاویز میں تقسیم کے لیے جامع پلان تیار کیا گیا تھا۔

اس پلان کے نکات کے پہلو یہ تھے: سرحدوں کی حتمی حد بندی، ہندوستان کی مسلح افواج کی فارمیشنوں، یونٹوں اور فوجیوں کی تقسیم، حکومت ہند کے سول محکموں کے ریکارڈ، تنظیموں، سٹاف، اثاثہ جات اور ذمہ داریوں کی تقسیم (Ibid: 53-4)۔ 15 اگست کی تازہ ترین تاریخ کے حوالے سے وائسرائے نے تبصرہ کیا کہ: "یہ تاریخ سننے پر وہاں موجود ہر شخص کو اگر صدمہ نہیں پہنچا تو دھچکا ضرور لگا ہو گا" (Ibid:163)۔

یہ تبصرہ اپنے اندر انکشافات کا حامل ہے کیونکہ اس فیصلے سے ہندوستانی رہنماؤں کا ردعمل جاننا مقصود تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ نہرو اور پٹیل کو پہلے ہی اعتماد میں لے لیا گیا تھا کہ انگریز برصغیر سے پہلے سے طے شدہ پروگرام سے قبل ہی واپس چلے جائیں گے اور یہ دونوں رہنما بھی اس فیصلے کے حق میں تھے لیکن واپسی کی تاریخ اس انداز میں سامنے لائی جائے گی، اس کا انہیں بھی نہیں پتہ تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مسلم لیگ، سکھوں اور ممکن ہے کہ دیگر کانگریسی لیڈروں کو 2 جون کو ہی اس فیصلے کا پتہ چلا اور یقینا انہیں اس سے شدید دھچکا لگا ہو گا۔ ہندوستان کی تقسیم کوئی آسان کام تو پہلے بھی نہیں تھا لیکن اس اہم ٹاسک کو محض 11 ہفتے کے اندر انجام دینا تو مشکل تر تھا کیونکہ انتظامی مشینری اس کے لیے تیار نہیں کی گئی تھی۔

تقسیم کا اعلان

لندن میں برطانوی حکومت، حکومت ہند اور ہندوستان میں کانگریس، مسلم لیگ اور سکھ نمائندوں سے کئی ماہ تک اعصاب شکن مشاورت کرنے کے بعد بالآخر وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 3 جون کو آل انڈیا ریڈیو پر تقسیم ہند کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ لندن میں وزیراعظم ایٹلی نے دارالعوام میں سہ پہر ساڑھے 3 بجے بیان دیا جو ہندوستان میں وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے ریڈیو پر پڑھا۔ انہوں نے کہا کہ:

> ایک سو سال تک (یعنی برطانوی قبضے کے بعد) 400 ملین اہل ہند اکٹھے رہے اور یہ ملک بطور ایک یونٹ چلایا گیا۔ مواصلات، دفاع، ڈاک اور کرنسی کا ایک ہی نظام رائج رہا۔ ٹیرف کی کوئی پابندی تھی نہ کسٹمز کی رکاوٹیں تھیں اور اس نظام سے مربوط سیاسی معیشت کی بنیادیں قائم ہوئیں۔ میری شدید خواہش یہ تھی کہ مذہبی اختلافات سے اس کو تباہ نہیں ہونا چاہیے۔
>
> مشاورتی مراحل کے دوران میری اولین کوشش رہی کہ سیاسی رہنما کسی تحفظات کے بغیر کابینہ مشن کے پلان 16 مئی 1946 کو قبول کر لیں۔ میری رائے میں اس منصوبے میں ہندوستان کے تمام طبقات کے مفادات کا خیال رکھا گیا تھا۔ مجھے

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑرہا ہے کہ کابینہ مشن پلان سمیت ہندوستان کو متحد رکھنے کے کسی منصوبے پر اتفاق رائے حاصل نہیں کیا جاسکا لیکن اس بات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کسی بڑی اکثریت کو اس کی خواہش کے برخلاف ایسی حکومت کے تحت رکھا جائے جس پر بڑی اکثریت فائز ہو چنانچہ متبادل حل تقسیم ہی ہے۔

لیکن جب مسلم لیگ ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کرتی ہے تو کانگریس اپنی دلائل کی بناپر مخصوص صوبوں کی تقسیم کی بات کرنے لگتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دلیل ناقابل تردید اور ٹھوس ہے۔ درحقیقت کوئی بھی فریق ایسا علاقہ دوسرے ملک میں نہیں چھوڑنا چاہتا جس میں ایک بڑی تعداد میں اس کی کمیونٹی کے لوگ رہتے ہوں۔ یقیناً میں نے خود بھی صوبوں کی تقسیم کی مخالفت کی جیسا کہ میں نے اس بنیاد پر تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی۔

لیکن اب میں نے محسوس کیا ہے کہ یہاں ایک ہندوستانی سوچ پائی جاتی ہے جس کو فرقہ وارانہ اختلافات سے پاک ہونا چاہیے۔ اسی طرح میں محسوس کرتا ہوں کہ یہاں پنجابی اور بنگالی سوچ بھی موجود ہے جس نے اپنے صوبے سے وفاداری کو ابھارا ہے۔ لہٰذا میں نے محسوس کیا کہ یہ بات ازبس ضروری ہے کہ ہندوستان کے عوام کو تقسیم کے معاملے میں خود فیصلہ کرنا چاہیے۔ ان حالات میں یہ بات ضروری تھی کہ پنجاب، بنگال اور آسام کے ایک حصے کے لوگوں کی مسلم اکثریت اور باقیماندہ علاقوں کے درمیان حد بندی کی خواہش معلوم کی جائے لیکن میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حتمی سرحدوں کا تعین باؤنڈری کمیشن ہی کرے گا اور فیصلہ اس عارضی فیصلے سے مختلف ہو سکتا ہے۔

ہم نے سکھوں کی پوزیشن پر بڑی احتیاط سے غور وفکر کیا ہے۔ یہ بہادر کمیونٹی پنجاب کی آبادی کا 8 فیصد ہے لیکن وہ اس بات سے نہایت پریشان ہیں کہ پنجاب کی تقسیم سے ان کی تقسیم بھی ناگزیر ہوگی۔ ہم میں سے وہ تمام افراد جو سکھوں کو اپنے قریب سمجھتے ہیں ان کو نہایت افسوس ہے کہ پنجاب کی تقسیم جس کے وہ خود بھی خواہاں ہیں سے کم یا زیادہ ان کی اپنی بھی تقسیم ہوگی۔ حتمی تقسیم بہرحال حد بندی کمیشن کرے گا اور یقیناً اس پر انہیں بھی اعتماد میں لیا جائے گا" (Ibid: 86-7)۔

برطانوی حکومت نے 3جون کے بیان کو ان نکات کے اضافے کے ساتھ شائع کیا:

5. بنگال اور پنجاب کی اسمبلیوں کے مسلمان اضلاع اور غیر مسلم علاقوں کے ارکان (یورپی ارکان چھوڑ کر) کے الگ الگ اجلاس بلائے جائیں گے۔ آبادی کی تعداد کا تعین کرنے کے لیے 1941 کی مردم شماری کے اعداد و شمار کو حتمی سمجھا جائے گا۔ مسلم اکثریت والے اضلاع کی تفصیل کا جدول اسی اعلان میں دیا جارہا ہے۔

6. ہر قانون ساز اسمبلی کے دونوں حصوں کے اجلاس میں انہیں نے اس بات کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے گا کہ آیا ان کے صوبے کو تقسیم کیا جائے یا نہیں۔ اگر سادہ اکثریت تقسیم کے حق میں فیصلہ کرتی ہے تو تقسیم کی جائے گی اور اس کے مطابق انتظامات کیے جائیں گے۔

9. تقسیم کا مطلوبہ فیصلہ کرنے کے مقصد کے لیے بنگال اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلیوں کے مسلم ارکان اور غیر مسلم نمائندے الگ الگ اجلاس میں بیٹھیں گے۔ یہ محض عارضی اقدام ہے کیونکہ حتمی حد بندی کا فیصلہ کرنے کے لیے

سرحدوں کا تعین تفصیلی جانچ پڑتال میں کیا جائے گا۔ اس ضمن میں گورنر جنرل ہند ایک باؤنڈری کمیشن تشکیل دیں گے جس کے ارکان کی نامزدگی مشاورت کے ساتھ کی جائے گی۔ اس کمیشن کو ہدایت کی جائے گی کہ وہ ان دونوں صوبوں میں مسلم اکثریت اور غیر مسلم آبادی والے علاقوں کا تعین کریں۔ کمیشن کو دیگر عوامل مدنظر رکھنے کی بھی ہدایت کی جائے گی۔ باؤنڈری کمیشن کی رپورٹ تیار ہونے تک صوبائی سرحد بندی کے لیے نیچے دیے گئے اپنڈکس کو استعمال کیا جائے گا (Ibid:90-1)۔

یہ اپنڈکس 1941 کی مردم شماری کے تحت اضلاع کے حساب سے اکثریتوں پر مشتمل تھا جس کے مطابق پنجاب کی پانچ میں سے تین ڈویژنوں میں مسلمان اکثریت میں تھے۔

1. راولپنڈی ڈویژن: اٹک، گجرات، جہلم، میانوالی، راولپنڈی اور شاہ پور کے اضلاع۔
2. لاہور ڈویژن: گوجرانوالہ، گورداسپور، لاہور، شیخوپورہ اور ضلع سیالکوٹ۔
3. ملتان ڈویژن: ڈیرہ غازی خان، جھنگ، لائل پور، منٹگمری، ملتان، مظفر گڑھ کے اضلاع۔

امر تسر جو لاہور ڈویژن میں شامل تھا میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی۔ اس لیے اسے جدول میں مسلم اکثریت والے علاقوں میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ امر تسر کے علاوہ سکھ اور ہندو درج ذیل اضلاع اور ڈویژنوں میں اکثریت میں تھے۔

4. جالندھر ڈویژن: لدھیانہ، فیروزپور، جالندھر، ہوشیارپور، کانگڑہ۔
5. انبالہ ڈویژن: گڑگاؤں، روہتک، حصار، کرنال، انبالہ اور شملہ۔

ماؤنٹ بیٹن کے خطاب کے بعد نہرو، جناح اور بلدیو سنگھ نے تقریریں کیں اور 3 جون کے بیان کو ہندوستان کے سیاسی تصفیے کے لیے بطور بنیاد تسلیم کر لیا۔

4 جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دہلی میں پریس کانفرنس کی جس میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ نکات بھی شامل تھے:

اس پلان کے دو بڑے فریق مسلم لیگ اور کانگریس ہیں لیکن ایک تیسرا فریق بھی ہے جو عددی لحاظ سے بہت چھوٹا لیکن نہایت اہمیت کا حامل ہے وہ ہے سکھ کمیونٹی۔ جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سکھوں کے مطالبے پر ہی کانگریس نے پنجاب کی تقسیم کی قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد کے مطابق پنجاب کو مسلمان اور غیر مسلم علاقوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی قرارداد کے تحت تقسیم کا منصوبہ بنایا گیا۔ جب یہ تجویز مجھے بتائی گئی تو مجھے پوری تفصیل کا علم نہیں تھا لیکن جب میں نے نقشہ ملاحظہ کیا تھا مجھے شدید حیرت ہوئی کہ جو منصوبہ انہوں نے پیش کیا اس سے سکھ کمیونٹی

دوبرابر حصوں میں تقسیم ہو جاتی۔ میں نے اس ضمن میں انگلینڈ اور ہندوستان دونوں جگہوں پر طویل مشاورت کی تا کہ ایسا حل تلاش کر سکوں جس میں سکھوں کو وسیع تر اور قابل فہم بنیادی اصول کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اکٹھا کیا جا سکے۔ وہ اصول جس کا مطالبہ ایک فریق نے کیا لیکن جو دوسرے فریق کے لیے بھی قابل قبول ہو۔ میں کوئی معجزہ دکھانے والا نہیں ہوں اور مجھے ایسا کوئی حل نہیں ملا (Ibid: 112)۔

اگلا اہم اقدام 12 جون کو پارٹیشن کمیٹی کا قیام تھا۔ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی سربراہی میں تشکیل پانے والی کمیٹی میں کانگریس کی طرف سے سردار پٹیل اور ڈاکٹر رجندر پرشاد جبکہ مسلم لیگ کی طرف سے نوابزادہ لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر شامل تھے (Ibid: 284)۔

تقسیم کے منصوبے پر گورنر جینکنز کی رائے

پنجاب کے گورنر ایون جینکنز نے 15 جون کو اپنی پندرہ روزہ خفیہ رپورٹ میں لکھا کہ تقسیم کے منصوبے کو پنجابیوں میں بالعموم زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جبکہ سیاستدان اس حوالے سے اپنی الگ آراء رکھتے ہیں۔ تقسیم کے منصوبے سے مکمل لاتعلقی کی فضا پائی جاتی ہے۔ کوئی آدمی خوش نظر نہیں آتا اور اس کام میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔ اس منصوبے سے بین المذاہب تعلقات پر زیادہ اثر نہیں پڑا، یہ لوگ ویسے ہی ہیں جیسے پہلے تھے۔ اس کے علاوہ آزادی کے معاملے میں خصوصی جوش و خروش یا جارحیت نظر نہیں آئی۔

گورنر نے لکھا کہ سیاسی جماعتوں نے بھی تقسیم کو مختلف وجوہات کی بنا پر قبول کیا ہے۔ مسلم لیگ والے سمجھتے ہیں کہ جناح کی طرف سے تقسیم قبول کرنا بڑی کامیابی ہے چونکہ پاکستان اب معرض وجود میں آنے والا ہے جبکہ کانگریس کے رہنما یہ سوچتے ہیں کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم سے پاکستان کو اصل مقصد سے ہٹا دیا ہے۔ میاں ابراہیم برق (سابق خضر کابینہ کے وزیر) نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے کانگریس کے مرد آہن سردار ولبھ بھائی پٹیل کو یہ کہتے سنا کہ اگر پاکستان نے بھارت کے لیے کوئی مشکل پیدا کی تو بھارت بڑی آسانی سے وہاں مقیم مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دے گا۔ جینکنز نے لکھا کہ ''یہ دعویٰ شاید بالکل باطل ہو لیکن ہندوؤں کی امید اور مسلمانوں کے خوف کے معاملے پر ضرور غور کیا جائیگا۔'' جہاں تک سکھوں کا تعلق ہے تو وہ اپنی امید باؤنڈری کمیشن سے لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ ان اضلاع میں کافی منظم ہیں جو ان کے خیال میں متنازع ہیں اور اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ وہ سرحد بندی کا پوری طرح اندازہ کیے بغیر تقسیم کو مسترد کر دیں گے۔ وہ اپنی املاک اور آبادی دونوں کے انتقال کا مطالبہ کر رہے ہیں (Carter, 2008b:74)۔

گورنر نے یہ بھی لکھا کہ برٹش سول سروس پنجاب میں خدمات انجام دینے میں چنداں دلچسپی نہیں رکھتی، چاہے یہ الگ ملک ہی کیوں نہ بن جائے۔ دوسری طرف مسلمان سول سرونٹس پاکستان میں پرکشش اسامیوں کو آپس میں تقسیم کر رہے ہیں جبکہ غیر مسلم افسریہ نہیں سمجھتے کہ وہ مغربی پنجاب میں محفوظ رہیں گے اور امید کر رہے ہیں کہ انہیں ہندوستان میں کھپایا جائے گا (Ibid)۔

پنجاب کی تقسیم کے سوال پر ووٹ ڈالنے والے ارکان صوبائی اسمبلی

پارٹیشن پلان میں یہ طے کیا گیا تھا کہ پنجاب قانون ساز اسمبلی کے ارکان کو مغربی اور مشرقی بلاک میں تقسیم کیا جائے جو پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ اسمبلی کے مغربی بلاک کے ارکان نے سپیکر دیوان بہادر ایس پی سنگھا کی زیر صدارت جبکہ مشرقی بلاک کے ارکان نے ڈپٹی سپیکر سردار کپور سنگھ کی زیر صدارت اجلاس میں 23جون 1947 کو ووٹ ڈالا۔ مشرقی پنجاب سے تعلق رکھنے والے 72ارکان نے الگ اجلاس میں مسلم لیگ کے مشرقی پنجاب کے رہنما نواب ممدوٹ کی اس تجویز کو 22 کے مقابلے میں 50ووٹوں سے مسترد کر دیا کہ پنجاب کو متحد رکھا جائے۔ مذہبی تعلق کے حوالے سے یوں سمجھ لیں کہ 88 مسلمانوں بشمول خضر حیات ٹوانہ سمیت یونینسٹ پارٹی کے 7 دیگر ارکان، 2ہندوستانی عیسائیوں اور ایک اینگلو انڈین نے متحدہ پنجاب کے حق میں ووٹ ڈالا۔ دو، سکھ اور شیڈول کاسٹس کی کمیونٹی کے 77ارکان نے پنجاب کی تقسیم کی بات کی (Ibid: 567)۔ یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ بعض رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب اسمبلی کی اندرونی فضا لاہور اور گرد و نواح میں ہونے والے المناک قتل عام اور دیگر شہروں میں فسادات سے پیدا ہونے والی فرقہ واریت سے بالکل اُلٹ تھی۔

پنجاب باؤنڈری کمیشن

ماؤنٹ بیٹن نے پنجاب باؤنڈری کمیشن کے حوالے سے ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ مشاورت شروع کر دی تھی اور اس بات پر اتفاق کیا گیا تھا کہ کمیشن آزاد چیئرمین اور 4ارکان پر مشتمل ہو گا۔ 2ارکان کانگریس نامزد کرے گی (جن میں سے ایک سکھ ہو گا) جبکہ 2ارکان کے نام مسلم لیگ دے گی۔ اگر ممکن ہو سکے تو چاروں ارکان اعلیٰ عدالتی پس منظر کے حامل ہوں چنانچہ کانگریس نے جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیج سنگھ جبکہ مسلم لیگ نے جسٹس محمد منیر اور جسٹس دین محمد کو رکن نامزد کر دیا۔ ان میں سے جو رکن سینئر ہو گا وہ کمیشن کے اجلاسوں کی صدارت کرے گا۔ 27جون کو اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ برطانوی بار ایسوسی ایشن کے سینئر رکن سر سیرل ریڈکلف کمیشن کے سربراہ ہوں گے جو دہلی میں رہیں گے اور پنجاب باؤنڈری کمیشن کے اجلاسوں میں براہ راست شرکت نہیں کریں گے۔ اجلاسوں کی کارروائی کی تفصیل انہیں بذریعہ ٹیلی فون دی جائے گی۔

References

Singh, Kirpal (ed.), *Select Documents on Partition of Punjab – 1947: Indian and Pakistan, Punjab, Haryana and Himachal, India and Punjab - Pakistan,* Delhi: National Book Shop, (1991).

Official Documents

Carter, Lionel (ed), *Mountbatten's Report on the Last Viceroyalty (23 March – 15 August 1947)*, Manohar, Delhi, (2003).

Carter, Lionel, (ed), *Punjab Politics, 1 June – 14 August 1947, Tragedy, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents,* New Delhi: Manohar, (2007a).

Carter, Lionel, (ed), *Punjab Politics, 3 March – 31 May 1947, At the Abyss, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents,* New Delhi: Manohar, (2007b).

Mansergh, Nicholas and Moon, Penderel (eds), *The Transfer of Power 1942-47,* Vol. X, *The Mounbatten Viceroyalty, Formulation of a Plan, 22 March – 30 May 1947,* London: Her Majesty's Stationery Office, (1981).

Mansergh, Nicholas and Moon, Penderel (eds), *The Transfer of Power 1942-7,* Vol. XI, *The Mountbatten Viceroyalty, Announcement and Reception of the 3 June Plan, 31 May – 7 July 1947,* London: Her Majesty's Stationery Office (1982).

The Partition of the Punjab 1947, four volumes, (official documents compiled originally by Mian Muhammad Sadullah for the National Documentation Centre, Lahore), Lahore: Sang-e-Meel Publications.

11

لاہور اور امرتسر کے حصول کی جنگ،

یکم اپریل-30جون 1947

جہاں دہلی میں اعلیٰ سطحی سیاسی حلقوں میں تقسیم کا منظر نامہ آہستہ آہستہ واضح ہو رہا تھا وہاں پنجاب میں زمینی صورتحال بد تر رہی۔ اگرچہ مارچ 1947 میں ہونے والے ظلم وزیادتی کے واقعات کا سلسلہ اسی ماہ کے وسط تک تھم گیا تھا لیکن حالات اس کے بعد کبھی معمول پر نہ آسکے۔ اپریل کے پہلے ہفتے میں پاکستان ٹائمز اور دی ٹربیون کی خبروں میں صوبے کے کئی علاقوں میں گاہے بگاہے انفرادی حملوں کی خبریں شائع ہوئیں۔ فرقہ وارانہ کشیدگی کا ایک اور واقعہ 11 اپریل کو اس وقت رونما ہوا جب امرتسر میں مسلمان چوک پراگ داس کی مسجد میں نماز جمعہ کے لیے جمع ہوئے۔ اسی چوک پر قبل ازیں مارچ میں خون خرابہ ہوا تھا۔ نماز جمعہ میں نمازیوں کا رش مسجد سے باہر سڑک تک پھیلا ہوا تھا۔

نماز کے بعد مسلمانوں کا گروپ غیر مسلم اکثریت والے علاقے سے ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف نعرے لگاتے گزرا جس کے جواب میں ہندوؤں اور سکھوں نے مکانات کی چھتوں سے ان پر اینٹیں اور پتھر پھینکے۔ جواب میں مسلمانوں نے بھی کارروائی کی۔ گورنر کی 30 اپریل کی رپورٹ کے مطابق اس تصادم میں 32 افراد مارے گئے۔ 7 مسلمان، 6 ہندو اور 19 سکھ جبکہ 103 زخمی ہوئے۔

جینکنز نے بتایا کہ پورے پنجاب میں 'خانہ جنگی' جیسی فضا پائی جاتی تھی۔ کئی علاقوں بالخصوص لاہور سے چھرا گھونپنے کی پے در پے وارداتوں کی اطلاعات ملی ہیں۔ دیسی ساختہ بم جو عموماً سوڈاواٹر کی بوتلوں میں بارود رکھ کر تیار کیے جاتے تھے ہر جگہ آزادانہ بنائے جا رہے تھے۔ فرقہ وارانہ تصادم کے نتیجے میں کئی مقامات پر آگ بھی لگائی گئی۔ شہروں میں لوگ اپنی گلیوں کو محفوظ بنانے کے لیے رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے۔ امرتسر کے کئی مقامات قلعہ بند تھے۔ اسلحے کی کھلے عام نمائش کی جا رہی تھی اور سکھ جگہ جگہ کرپانوں کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ مسلمان سکھوں کے روایتی ہتھیار کرپان کو پابندی سے استثنیٰ دینے پر سیخ پا تھے۔ مارچ میں راولپنڈی کے فسادات کے حوالے سے گورنر نے لکھا کہ:

> دولتانہ نے حال ہی میں ضلع اٹک کا دورہ کیا ہے اور اس بات کے کئی شواہد موجود ہیں کہ انہوں نے کم از کم ایک گاؤں کے افراد سے کہا کہ اگر وہ پندرہ روز یا تین ہفتے تک شورش قائم رکھیں تو ان کے خلاف تمام قانونی کارروائی ختم کر دی جائے گی اور ایسے افسران جنہوں نے گڑبڑ کچلنے کی کوشش کی انہیں سبق سکھا دیا جائے گا(Carter, 2007a: 153)۔

امرتسر اور لاہور میں فسادات میں شدت

اپریل کے دوسرے ہفتے اور اوائل مئی میں تشدد نے ایک بار پھر سر اٹھالیا تھا لیکن 9مئی کو اس میں شدت آگئی۔ پاکستان ٹائمز اور دی ٹربیون نے 10مئی کو اپنی اشاعت میں چھرا گھونپنے سے 5افراد ہلاک اور 12زخمی ہونے کی اطلاع دی۔ آگ لگانے اور بم حملوں کے بھی واقعات ہوئے لیکن کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ اگلے روز صورتحال اس وقت مزید خراب ہو گئی جب دائم گنج کے ہندو شمشان گھاٹ میں ایک بچے کی میت لے کر آنے والے سکھوں اور ہندوؤں پر مسلمانوں کے ایک گروپ نے میاں معراج دین کی شہ پر حملہ کر دیا جس سے 5زخمی ہوگئے۔ اس حوالے سے خواجہ افتخار نے اختلافی بات کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ آخری رسومات میں شریک افراد مسلم اکثریت والے علاقے میں شرافت سے نہیں گزرے اور انہوں نے جارحانہ رویے کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ اس وجہ سے مسلمان جو چوک پراگ داس کے واقعہ کو نہیں بھولے تھے وہ مشتعل ہوگئے۔ مرنے والے غیر مسلموں کی لاشوں کو تیل ڈال کر آگ لگادی گئی جبکہ زخمیوں کو انتہائی بری حالت میں ہسپتال پہنچایا گیاالبتہ ایسی صورتحال میں بھی ایک خاتون 'لبھی' کی جان بخشی کر دی گئی۔ جب پولیس پہنچی اور مشتبہ افراد کی شناخت پریڈ کرائی گئی تو معراج دین نے اپنی داڑھی بھی منڈھوالی جس کی وجہ سے لبھی اسے پہچان نہ پائی اور ایک دوسرے شخص کی طرف اشارہ کر دیا۔ یوں زیر حراست افراد کے خلاف کیس ختم ہوگیا(1991:143-6)۔

خواجہ افتخار نے اپنی کتاب میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ امرتسر کے فسادات میں مسلمانوں کو برتری حاصل تھی۔ انہوں نے کئی دیگر واقعات کا تفصیل ذکر کیا ہے اور یہاں تک کہا کہ مسلمان ڈاکٹر اور طبی عملہ ہر روز غیر مسلموں کے نقصان کا ''سکور'' بتاتے تھے۔ انہوں نے غیر مسلم انتظامی افسروں پر مسلم کش ہونے کا الزام لگاتے ہوئے ان ہندو پولیس افسروں کے نام بھی دیے۔ مثال کے طور پر تھانیدار کندن لال مہتہ۔ انہوں نے کتاب میں جگہ جگہ دہرایا کہ مسلمانوں کو لڑائی میں برتری حاصل رہی کیونکہ کافر بہادری میں سچے مسلمانوں کا کوئی مقابلہ نہیں کرتے (Ibid:146-9)۔

ارتھی پر بہیمانہ حملے کی خبر مسلم لیگ نواز اخبار پاکستان ٹائمز اور دی ٹربیون نے دی اور صفحہ اول پر لال رنگ کی سرخی جمائی۔ پنجاب کے چیف سیکرٹری اختر حسین نے مئی میں اپنی پندرہ روزہ رپورٹ میں لکھا کہ ''حملوں کی کچھ کارروائیاں توبربریت کے لحاظ سے المناک تھیں۔ جیسا کہ کمسن بچے کی ارتھی کے شرکا پر حملے کا واقعہ ہے جس میں چھ سکھ اور ایک ہندو مارا گیااور یہ مسلمانوں کے ظلم و جبر کی طویل فہرست میں ایک اور اضافہ تھا۔'' اسی رپورٹ میں بتایا گیا کہ ہندو اور سکھ خام بم تیار کر رہے تھے جن میں سے اکثر تیاری کے دوران ہی پھٹ گئے۔ یوں جن افراد کو نشانہ بنایا جانا تھا سے زیادہ بم تیار کرنے والے خود نشانہ بنے۔''

پاکستان ٹائمز اور دی ٹربیون نے 11مئی کو امرتسر میں آگ لگانے کے واقعات کی تعداد دس بتائی۔ 12مئی کو دی ٹربیون نے صفحہ اول پر 'امرتسر میں حریف فریقوں کی مسلسل لڑائیاں' کے عنوان سے شہ سرخی لگائی۔ خبر میں بتایا گیا کہ گھریلو ساختہ بموں کا آزادانہ استعمال کیا جارہا تھا۔ پاکستان ٹائمز نے بھی شہر میں مسلسل خراب ہوتی صورتحال کے بارے میں بتایا۔ 11مئی اتوار سے 13مئی منگل کے درمیان گولی مارنے اور چھرا گھونپنے کے پانچ واقعات ہوئے۔

لاہور

ٹریبون نے 15 مئی کو چھرا گھونپنے کے 17 واقعات کی رپورٹ دی جن میں 12 اموات ہوئیں۔ خبر میں لکھا تھا:

> چھرا گھونپنے کی وارداتوں کے بعد سکول اور کالج بند ہو گئے اور بچوں کو گھروں میں واپس جانا پڑا۔ کئی لوگ دفاتر نہ پہنچ سکے جبکہ کئی دفاتر قبل از وقت بند کرنا پڑے۔ انار کلی سمیت بیشتر بازار اور کاروباری مراکز بند کر دیے گئے۔

میرے (مصنف کے) بڑے بھائی مشتاق احمد اور پنجابی مصنف مستنصر حسین تارڑ دونوں ان دنوں سکول کے طالبعلم تھے۔ انہوں نے سکولوں کی بندش کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

مشتاق احمد

''میرا اسکول پنجاب یونیورسٹی کے چوبرجی گراؤنڈ (لیک روڈ) کے قریب واقع تھا۔ یہ ایک انگلش میڈیم سکول تھا۔ یہ غالباً اپریل کا مہینہ تھا۔ کلاس شروع ہوئی ہی تھیں کہ بعض شرپسندوں نے سکول کو آگ لگادی۔ ہندو سٹاف جن کی اکثریت خواتین کی تھی سراسیمگی میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ جو لڑکے بڑے تھے وہ خود گھر چلے گئے جبکہ چھوٹے بچوں کو ان کے گھر والے لینے آ گئے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھا کہ کرنا کیا ہے۔ لہٰذا میں گیٹ کے باہر اکیلا بیٹھ گیا۔ اس وقت میری عمر صرف 6 سال تھی اور اکیلا گھر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ سکول ٹیمپل روڈ (لاہور) سے کئی میل دور تھا۔ اتفاق سے اباجی اسی سکول کے قریب ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ وہ آئے اور مجھے گھر پہنچایا۔ یہ سکول دوبارہ نہ کھل سکا اور پاکستان بننے کے بعد اس میں دوبارہ کلاسیں شروع ہوئیں۔''

مستنصر حسین تارڑ

''1947 میں میری عمر آٹھ سال تھی۔ میں ان دنوں رنگ محل مشن سکول میں پڑھتا تھا۔ مجھے تاریخ یاد نہیں لیکن یہ اپریل کا کوئی دن تھا۔ ہماری ٹیچر نے ہمیں کہا کہ ہم گھروں کو چلے جائیں کیونکہ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ میں گوالمنڈی سے رنگ محل پڑھنے آیا کرتا تھا۔ تمام اساتذہ چلے گئے۔ مجھے کوئی گھر سے لینے نہ آیا کو پتہ نہیں ہو گا چنانچہ میں پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑا۔ بیرون موچی گیٹ سرکلر روڈ سنسان پڑا تھا۔ فطری بات تھی کہ میں دہشت زدہ ہو گیا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ پھر میں نے ایک شخص کو سڑک کے درمیان پڑے دیکھا۔ میں اس کے نزدیک آیا تو اس کے ارد گرد خون کا تالاب بنا ہوا تھا۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ہندو تھا یا مسلمان۔ میں نے زندگی میں پہلی بار انسانی خون دیکھا تھا جس کو دیکھ کر میں رونا شروع ہو گیا۔ خوبیِ قسمت میرے ماموں احمد علی وہاں سے گزر رہے تھے۔ میں ان کے گھر چلا گیا۔ ہم چیمبر لین روڈ پر رہتے تھے جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ رات کے وقت ہندو مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر مسلمانوں کی آبادی کی طرف گولیاں چلاتے تھے جس پر دو مسلمان پولیس کانسٹیبل بھی چھت پر چڑھ کر جواب فائرنگ کر کے انہیں دور رکھتے۔ ہر رات کو 'اللہ اکبر' اور 'ہر ہر مہادیو' کے نعرے سنائی دیتے تھے۔''

چوڑیوں اور مہندی کا قصہ

بچپن سے میں یہ سنتا آرہا تھا کہ امرتسر کے مسلمان بدمعاشوں نے لاہور کے ہم مذہب بدمعاشوں کو بزدلی کا طعنہ مارتے ہوئے چوڑیوں (نسوانیت کی علامت) اور مہندی (بزدلی کا استعارہ) کا لفافہ بھیجا۔ جس کے مطلب تھا کہ لاہور میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کے باوجود تم لوگ ہندوؤں اور سکھوں پر حملے کیوں نہیں کرتے؟۔ اس طعنے کا فوری اثر ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں لاہوری بدمعاشوں نے چھرا گھونپنا اور غیر مسلموں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ دی ٹریبون نے 16 مئی کو خبر دی کہ:

> لاہور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ایوسٹاس Mr.Eustace کے الفاظ میں قبل ازیں لاہور طویل عرصے سے دانشمندی اور سمجھداری کا مظاہرہ کرتا رہا ہے لیکن جو اطلاعات ملی ہیں ان کے مطابق صورتحال اس بنا پر بگڑنا شروع ہو گئی ہے کیونکہ امرتسر کے بدمعاشوں نے لاہور کے اپنے پیٹی بھائیوں کو چوڑیاں بھجوائیں جو اس بات کا پیغام تھا کہ وہ بھی لاہور میں غنڈہ گردی شروع کر دیں۔ یہ طعنہ ملنے پر لاہور کے بدمعاش بھڑ گئے اور گڑبڑ شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے باوجود مسٹر ایوسٹاس سمجھتے ہیں کہ لاہور میں دوبارہ گڑبڑ نہیں ہو گی۔

ایوسٹاس جو لاہور کے ڈپٹی کمشنر بھی تھے نے اپنی پریس کانفرنس میں مہندی کا ذکر نہیں کیا لیکن یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ دی ٹریبون نے 17 مئی کو اپنی فالو اپ سٹوری میں گورنر ڈپٹی کمشنر اور آئی جی پولیس پر زور دیا کہ وہ 'چوڑیوں کے معاملے' کی تحقیقات کرائیں۔ پاکستان ٹائمز نے 16 مئی 1947 کے اس واقعے کو براہ راست بیان کرنے سے گریز کیا لیکن یہ بتایا کہ تشدد میں اضافے کے بعد 14 مئی کو 22 افراد ہلاک ہو گئے۔ کلب علی شیخ نے لاہور کے باسیوں کو چوڑیاں پیش کرنے کا واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ "امرتسر سے کچھ لوگ روزانہ کام کرنے لاہور آیا کرتے تھے۔ وہ ٹرین پاس کے ذریعے آتے جاتے تھے۔ جب گڑبڑ شروع ہوئی تو امرتسر کے غنڈے مسلسل لاہور آنے لگے۔ اہل لاہور امرتسریوں کی طرح قتل و غارت میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے، مئی کے ایک دن ہال روڈ پر مسلم لیگ کا ایک جلوس نکلنے والا تھا۔ وہیں امرتسری لوگ پہنچے اور چوڑیوں کا لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ 'یہ ہماری طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔' اس واقعے کے بعد مسلمانوں کے جارحانہ رویے میں شدت کی واضح تبدیلی نظر آنے لگی۔ یہ بات سب جانتے کہ بعض مسلم لیگی رہنماؤں جیسا کہ سردار شوکت حیات کے امرتسر اور لاہور کے غنڈوں کے ساتھ قریبی روابط تھے۔ اس گٹھ جوڑ کے نتیجے ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف پر تشدد کارروائیوں میں تیزی آگئی۔" خواجہ افتخار نے بھی اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> متحدہ پنجاب کے شہروں اور قصبوں میں فرقہ وارانہ تشدد پھیل گیا۔ لیکن یہ امر حیران کن تھا کہ زندہ دل لاہور جو کئی تحریکوں کا مرکز رہا تھا اور یہیں سے تحریکوں کو مقبولیت ملتی ہے اس بار مکمل خاموش تھا۔ لاہور سے آنے والی بابو ٹرین کے ذریعے امرتسر کے شریر مسلمانوں نے ایک پیغام بھیجا۔ انہوں نے لاہوری مسلمانوں کے ایک ڈبے میں چوڑیوں اور مہندی کا لفافہ رکھ دیا۔ اس کا مقصد لاہور کے مسلمانوں کو اپنے ہم مذہب افراد کے خلاف ظلم و جبر کا انتقام لینے پر آمادہ کرنا تھا۔

امر تسری مسلمانوں کی طرف سے چوڑیاں اور مہندی بھجوانے کی خبر کو لاہور کے اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کیا جس سے لاہور مسلمانوں کی قومی غیرت جاگ اٹھی۔ مر تسری مسلمانوں کی مدد سے انہوں نے لاہور کی شاہ عالم مارکیٹ (ہندو اکثریت کا مسکن) کو آگ لگادی۔ اس مارکیٹ کو شاہ عالم کا نام پاکستان کے قیام کے بعد دیا گیا (192:1991)۔

شاہ عالم مارکیٹ پر حملہ بہت بعد میں جاکر ہوا۔ خواجہ افتخار کو شاید تاریخوں کا مغالطہ ہوا ہے۔ 16 مئی کی نصف شب سے 17 مئی کی صبح تک 14 مئی سے مجموعی طور پر 55 افراد کی ہلاکت ہوئی جبکہ 128 زخمی ہوئے۔ (Pakistan Times, 18 May)۔ اس کے بعد صورتحال کچھ معمول پر آگئی کیونکہ گورکھا فوجیوں کی بٹالین کو متاثرہ علاقوں میں گشت کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ لاہور کے کانگریسی لیڈر بھیم سین سچر اور ہندو مہا سبھا کے رہنما سر گوکل چند نارنگ نے گورنر پنجاب کو ٹیلی گرام ارسال کیا جس میں انہوں نے کہا کہ "لاہور کی صورتحال انتہائی تشویشناک ہے۔ اس لیے 24 گھنٹے کا کرفیو نافذ کر کے زیادہ فوجی نفری تعینات کی جائے۔ فوری کارروائی سے ہی مزید خرابی سے بچا جا سکتا ہے" (The Tribune, 17 May)۔

البتہ آر ایس ایس خود بھی مسلمانوں کے خلاف پر تشدد کارروائیوں میں ملوث تھی۔ مجھے ڈاکٹر حفیظ احمد مغل نے بتایا کہ ان کے خالو چنن دین جو 1939 میں کلکتہ سے اندرون شہر رنگ محل کی 'بلا کبوتر باز گلی' میں منتقل ہوگئے تھے کو 16 مئی 1947 کو کیسرا بازار میں چھرا گھونپ کر ہلاک کر دیا گیا۔ قاتلوں کا کبھی سراغ نہیں مل سکا۔ ڈاکٹر مغل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اینٹیں پھینکنا اور راہگیروں پر حملے کرنا وہاں معمول بن چکا تھا چنانچہ قدیم شہر کے متاثرہ علاقوں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

اندرون شہر میں جلاؤ گھیراؤ

پاکستان ٹائمز نے 18 مئی 1947 کو رپورٹ دی کہ جمعہ 16 مئی کی رات سے اندرون شہر میں کئی جگہ پر آگ لگادی گئی۔ کرفیو میں نرمی کرنے پر 8 بجے صبح کے بعد صورتحال ایک دم اور بگڑنا شروع ہوگئی۔ دوپہر کے بعد کی گیٹ سے ٹیکسالی گیٹ کے درمیانی علاقوں میں دست بدست لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ ایک علاقے میں لگائی گئی آگ تیزی سے دوسرے علاقوں کی طرف پھیل گئی۔ ان میں چوک وزیر خان، اکبری منڈی اور کوچہ واں وثاں کے علاقے شامل تھے۔ گورکھا فوج کے دستوں کو سرکلر روڈ پر گشت کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ ہفتے کی صبح تک 55 افراد ہلاک اور 128 زخمی ہو چکے تھے۔

راج گڑھ کے مسلم اکثریتی علاقے پر حملہ

لاہور کے علاقے راج گڑھ کو 18 مئی کو ہندوؤں اور سکھوں کے ایک منظم حملے کا نشانہ بننا پڑا۔ راج گڑھ ہندو اکثریت والے کئی علاقوں جیسا کہ شام نگر، پریم نگر اور ہندوؤں کے مضبوط گڑھ کرشن نگر کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ چیف سیکرٹری اختر حسین نے مئی کے دوسرے پندرھواڑے کی رپورٹ میں لکھا کہ 11 اپریل کے بعد سے امر تسر میں 460 افراد ہلاک یا زخمی ہو چکے ہیں جبکہ لاہور میں 9 مئی کو تشدد کی نئی لہر شروع ہونے کے بعد 325 افراد ہلاک یا زخمی ہوئے۔ انہوں نے رپورٹ میں لکھا کہ:

ان دونوں شہروں میں رونما ہونے والے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ امرتسر اور لاہور کے اندر اور باہر حملے زیادہ منظم ہو گئے ہیں۔اس کی بہترین مثال لاہور کے (اُن دنوں)نواحی علاقوں راج گڑھ اور سنگھ پورہ میں 18 اور 19 مئی جبکہ امرتسر کے علاقے رسولپورہ میں 24 مئی کو ہونے والے حملے ہیں۔راج گڑھ اور رسول پورہ میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہجوم نے منظم طریقے سے جدید ہتھیاروں اور دستی بموں کے ساتھ حملہ کیا۔سنگھ پورہ کا معاملہ ذرا مختلف تھا جہاں بلا اشتعال جارحیت کا کوئی ثبوت نہیں ملا البتہ سکھوں کی طرف سے منظم تیاری اور کسی حملے کی صورت میں جواب دینے کے شواہد ضرور ملے ہیں۔ان تینوں کیسوں میں جن میں مسلمانوں کا بھاری جانی نقصان ہوا کے حوالے سے تحقیقات جاری ہے اور دلچسپ انکشافات ہونے کی توقع ہے۔اس بات کے پہلے ہی آثار ملے ہیں کہ راج گڑھ پر حملے میں ہندو تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ کے ارکان شامل تھے۔یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے ارکان کا تعلق شہر کے اندر کی ایک تنظیم سے ہے جو پنجاب ریلیف کمیٹی کے ماتحت ڈیفنس کمیٹی کے کنٹرول میں کام کرتی ہے"(June1947,POL.8501/4720)۔

رپورٹوں میں مزید کہا گیا کہ لاہور اور امرتسر کے بعد مذہبی تصادم کی بدترین صورتحال ضلع گڑگاؤں میں ہے۔یہ بدامنی 25 مئی کو اس وقت شروع ہوئی جب آہیر قبیلے کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے گاؤں پر حملہ کر دیا جس سے کئی افراد مارے گئے اور املاک کو نقصان پہنچا۔اگلے روز ایک اور مسلمان گاؤں پر حملہ کیا گیا لیکن مسلمانوں نے جوابی کارروائی کی۔اس ضلع میں عملاً فرقہ وارانہ جنگ جاری ہے جس پر انتظامیہ قابو پانے میں ناکام تھی۔50 دیہات تباہ ہو گئے اور بڑی تعداد میں لوگ ہلاک یا زخمی ہوئے۔آہیر ہندوؤں کا سب سے زیادہ مقابلہ مسلمان میو برادری کر رہی تھی۔پولیس اور فوج کو امن قائم کرنے کے لیے کم از کم ایک ہزار گولیوں کے راؤنڈ چلانا پڑے۔دونوں فریقوں سے جو اسلحہ برآمد ہوا اس میں دیگر مقامی ساختہ ہتھیاروں کے ساتھ مارٹر گولے بھی شامل تھے(Ibid)۔

گورنر پنجاب نے الگ رپورٹ میں 31 مئی کو کہا کہ سکھ ریاستوں فرید کوٹ اور نابھہ سے مسلح پارٹیاں لاہور میں نظر آئی ہیں جس سے خوف وہراس پایا جاتا ہے۔جس پر ان حکومتوں کو خبردار کیا گیا کہ وہ برطانیہ کے زیر انتظام پنجاب میں مسلح افراد اور فوجی گاڑیاں بھیجنے سے گریز کریں(Carter, 2007a: 222)۔

ڈاکٹر مغل

ڈاکٹر مغل کو وہ ہولناک رات اچھی طرح یاد ہے۔انہوں نے مجھے لکھا:"جب پاکستان بنا تو میری عمر ساڑھے چودہ سال تھی (تاریخ پیدائش 2 جنوری 1933)اور میں سینٹرل ماڈل سکول میں نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا اور ہماری رہائش مزنگ میں تھی۔فوج کی ایک بٹالین نفری نے راج گڑھ میں مسلمانوں پر حملہ کر کے بچوں اور عورتوں سمیت بڑی تعداد میں لوگوں کو ہلاک کر دیا۔فوجی ہماری آنکھوں کے سامنے بیگم روڈ سے گزرے،یہ رات کا وقت تھا۔ہم حملے کا نشانہ بننے والوں کی چیخ و پکار بخوبی سن سکتے تھے۔جلنے والی جھونپڑیوں میں شعلوں اور دھویں کو بھی دیکھا جا سکتا تھا۔

13 جنوری 2005 کو راج گڑھ کا دورہ

تقسیم سے پہلے راجگڑھ لاہور کی نواحی بستی تھی جس کے ارد گرد ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت والے علاقے تھے۔ مسلمانوں کا مضبوط گڑھ مزنگ کچھ فاصلے پر تھا۔

احمد سلیم اور میں راج گڑھ میں اس وقت پہنچے جب سردیوں کی شام میں سورج افق پر تیزی سے چھپ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم ان افراد سے ملے جنہوں نے ہمیں ایسے لوگوں کا اتہ پتہ دیا جو 18 مئی 1947 کے واقعات کو یاد کر سکتے تھے۔

غلام حیدر

"مسلح شر پسند ہندو اکثریت والے علاقے شام نگر اور کرشن نگر سے آئے۔ ان کے پاس جدید آتشیں اسلحہ اور بارودی ہتھیار تھے۔ انہوں نے دستی بم پھینک کر خانہ بدوشوں کی جھگیوں کو آگ لگائی اور گوجروں کے ڈیری فارم پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے میرے چچا اور ان کی خواہر نسبتی کو قتل کر دیا۔ ان افسوسناک واقعات کے بعد ہم اچھرہ منتقل ہو گئے اور پاکستان بننے کے بعد ہی اپنے گھر کو واپس لوٹے۔ لاہور کا ڈی ایس پی ٹیک سنگھ راج گڑھ پر حملے کی سازش میں شریک تھا۔"

محمد منیر

"اس وقت میں دس یا بارہ سال کا تھا۔ حملہ آور رات کو آئے۔ بم دھماکوں سے کئی مسلمان ہلاک یا زخمی ہو گئے۔ حملہ آوروں نے ایک شخص گامانائی کی دونوں ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ ہم مزنگ میں اپنے رشتہ داروں کے گھر پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ بیگم شاہنواز سمیت کئی مسلمان رہنماؤں نے راج گڑھ کے متاثرہ علاقے کا دورہ کیا۔ اس کے بعد پولیس اور فوج آئی اور بعض مشتبہ ہندوؤں اور سکھوں کو پکڑ کر مزنگ تھانے میں بند کر دیا گیا۔ حملہ کرشن نگر کے رہنے والے ہندوؤں نے کیا۔ 5 سے 7 مسلمان مارے گئے۔ میرے چچا جلال دین، ان کی بیوی غلام فاطمہ اور بیٹے محمد یوسف کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی کچھ بھینسوں کو بھی مار ڈالا گیا۔ میاں احمد دین کو بھی گولی ماری گئی لیکن وہ بچ گیا۔"

لمبر دار میاں حنیف

"میرا تعلق گاؤں کے لمبر دار (اردو میں نمبر دار) گھرانے سے تھا۔ میں 1947 میں 16 سال کا تھا۔ ہمارا تعلق آرائیں برادری سے تھا اور ہمارے گھرانے کو راج گڑھ میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ ہمارے بڑوں کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جاگیر عطا کی تھی۔ راج گڑھ کا مین روڈ میرے دادا پیر بخش سے موسوم تھا۔ راج گڑھ کو حملے کے لیے اس لیے چنا گیا کیونکہ یہ واحد مسلمان بستی تھی جو ہندوؤں اور سکھوں کی آبادیوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ صرف ایک جانب سے راج گڑھ کا رابطہ مسلم اکثریتی علاقے ساندیاں (ساندہ؟) سے تھا۔

"حملہ بلاشبہ بہت منظم انداز میں کیا گیا۔ ایسی اطلاعات بھی ملیں کہ بعض خود مختار غیر مسلم ریاستوں کے مسلح افراد اور کرشن نگر کے ہندوؤں نے مل کر حملہ کیا۔ یہ لوگ رات کی تاریکی میں حملہ آور ہوئے اور شروع میں دستی بموں سے پے در پے دھماکے کیے گئے۔ بستی کے صرف دو مسلمانوں مہر فیروز اور باؤ امین کے پاس بندوقیں تھیں لیکن انہوں نے حملہ آوروں کی

بالادستی قبول کرتے ہوئے جوابی فائرنگ سے گریز کیا۔ ڈر کے مارے لوگ گھروں کے اندر مقید ہو گئے۔ اس وقت شہر میں کرفیو بھی نافذ تھا۔ حملے میں کئی خانہ بدوش اور گوجر مارے گئے اور ان کی جھونپڑیاں جلادی گئیں۔

"اس وقت اندرون قدیم شہر میں بھی آگ لگنا شروع ہو گئی تھی۔ کرشن نگر میں ایک ہی مسلمان کی عمارت چراغ بلڈنگ موجود تھی۔ ہندوؤں نے اسے آگ لگانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ راج گڑھ کے کچھ ہندوؤں نے بھی اپنے ہم مذہب افراد کے ساتھ حملوں میں حصہ لیا۔ تقسیم ہند کے بعد اکثر ہندو اور سکھ بھارت چلے گئے۔ البتہ کچھ غیر مسلم خاندان 1948 تک یہیں رہے۔"

لاہور کے حصول کے لیے جنگ میں شدت

پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت 18 مئی کو حکومت نے فرقہ وارانہ تصادم کے واقعات کی خبروں کی اشاعت پر پابندی لگادی اور صرف حکومت کی جاری کردہ خبریں شائع کی جاسکتی تھیں۔ راج گڑھ کے واقعے سے مسلمانوں میں پھیلنے والے خوف و ہراس کے برعکس مئی کے وسط میں لاہور میں طاقت کا مجموعی توازن ان کے حق میں چلا گیا۔ گورنر جینکنز نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ دو تہائی ہلاکتوں اور جلاؤ گھیراؤ کے ذمہ دار مسلمان ہیں۔ 21 مئی کو وائسرائے ہند کے نام ایک تار میں انہوں نے لکھا کہ: "مسلمان بظاہر ہندوؤں اور سکھوں کو لاہور اور ارد گرد کے علاقوں سے نکال باہر کرنے کے درپے ہیں اور زیادہ توجہ آگ لگانے پر مرکوز رکھے ہوئے ہیں۔ ہندو اور سکھ بھی اسی طرح جواب دے رہے ہیں لیکن ان کی زیادہ توجہ اسلحے کے حصول اور ذاتی انتقام لینے پر ہے" (Carter, 2007a: 207)۔ گورنر نے دعویٰ کیا کہ حکومت نے پولیس کی دستیاب زیادہ سے زیادہ نفری تعینات کی ہے لیکن یہ خراب ہوتی صورتحال کے لیے کافی نہیں۔ انہوں نے مرکزی حکومت سے مزید دستوں کی درخواست کی۔ لاہور میں انڈین آرمی کے چوتھے ڈویژن کے ساتھ صرف لاہور کے علاقے کے لیے ایک بریگیڈ مزید فوج ضروری تھی (Ibid)۔

اخبار دی ٹریبون نے 'گورنر پنجاب کے لیے چند تجاویز' کے عنوان سے ایک مضمون میں لکھا کہ لاہور میں مزید فوجی دستوں کی ضرورت تھی اور شہر میں مختلف مذاہب کے پولیس اہلکار تعینات کیے جائیں (زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی) اور یہ کہ فائر بریگیڈ کے ساتھ فوجی اہلکار بھی بھیجے جائیں بصورت دیگر غنڈہ گرد اور دیگر سماج دشمن عناصر آگ بجھانے کے کام میں پتھراؤ کر کے مداخلت کریں گے۔

مئی کا اختتام

مئی کا مہینہ ہندوستان کی تقسیم کے مجموعی سوال کے ساتھ ختم ہوا اور پنجاب ایک نازک مرحلے میں داخل ہو گیا۔ وائسرائے کی طرف سے متوقع اعلان قریب آرہا تھا اور اس اعلان کا بڑے شہروں، قصبوں اور تعلیم یافتہ طبقے میں بے چینی سے انتظار کیا جارہا تھا۔ جہاں تک امن وامان کی صورتحال کا تعلق تھا تو پنجاب بدستور بدامنی کا شکار تھا، تشدد کے واقعات نہ صرف لاہور اور امرتسر میں ہو رہے تھے بلکہ صوبے کے دیگر حصوں میں بھی حملے ہو رہے تھے۔

یوراج کرشن

پرانی انار کلی کے ہندو علاقے میں رہنے والے یوراج کرشن نے مئی کے اواخر میں ہونے والے آتشزدگی کے واقعات کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے۔

"لاہور میں گڑبڑ ماسٹر تارا سنگھ کی 3 مارچ کو پرانی انار کلی کے قریب کڑی (لڑکی) باغ میں اشتعال انگیز تقریر سے شروع ہوئی۔ یہ باغ ہمارے گھر کے پاس ہی تھا۔ اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات اور پولیس کی فائرنگ کا سلسلہ چل نکلا جس میں زیادہ تر نقصان ہندوؤں کا ہوا۔ اس کے بعد کوئی ایسا دن نہ گزرا جب لوٹ مار اور چھرا گھونپنے کی کوئی واردات نہ ہوئی ہو۔ شام کو صورتحال مزید بگڑ جاتی تھی۔ فرقہ وارانہ مخالفت کا اظہار نعرے بازی اور چھتوں کے اوپر سے جنگی شور غوغا سے کیا جاتا تھا۔ مسلمان کہتے 'نعرہ تکبیر اللہ اکبر'۔ جس کے بعد ہندو زور سے کہتے 'ہر ہر مہادیو' جبکہ سکھوں کا نعرہ تھا، 'جو بولے سو نہال، ست سری اکال'۔ یہ نعرے اس وقت تک جاری رہتے جب تک مخالف فریق نعرے لگاتے رہتے۔ اس صورتحال سے گہرا خوف اور احساس عدم تحفظ پیدا ہو گیا۔ مئی میں حملے زیادہ منظم انداز میں ہونے لگے۔ ہندوؤں اور سکھوں کو ان علاقوں میں نشانہ بنایا گیا جہاں وہ کم تعداد میں تھے جبکہ مسلمانوں پر ان علاقوں میں حملے کیے گئے جہاں وہ اقلیت میں تھے۔

"جب گڑبڑ شروع ہوئی تو میرے والد اپنے آبائی علاقے کو لوچلے گئے۔ میں، میرا بڑا بھائی اور ایک کزن دھوبی منڈی والے گھر میں رہتے تھے۔ 27 مئی کی رات کو مسلمانوں نے اندرون شہر میں ہندوؤں کی آبادی والے علاقے پاپڑ منڈی کو آگ لگا دی۔ جب ہندوؤں نے جان بچانے کے لیے بھاگنے کی کوشش کی تو پولیس نے انہیں واپس گھروں کو جانے کا حکم دیا کیونکہ شہر میں کرفیو لگا تھا۔ رات کے 2 بجے ہم اپنے گھر کی چھت سے قدیم شہر میں لگی آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے دیکھ رہے تھے، یہ منظر دیکھ کر ہم سخت مایوس اور خوفزدہ ہوئے۔ لاہور پولیس میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت تھی اور انہوں نے اس دوران بڑا جانبدارانہ کردار ادا کیا۔ ہمارا ریاستی مشینری پر اعتماد ختم ہو کر رہ گیا۔ اگر کوئی ہندو یا سکھ دادرسی کے لیے پولیس سٹیشن جاتا تو اسے امداد فراہم کرنے سے اگر انکار نہ کیا جاتا تو ٹال ضرور دیا جاتا تھا۔"

مسز ومل ایسار

نئی دہلی کے انٹرنیشنل سینٹر کے ریستوران میں مجھے ایسے افراد کا گروپ ملا جو ایک ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھانا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک ومل ایسار بھی تھیں جو بھارتی سرکاری ٹی وی دوردرشن کے ایک اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوئی تھیں۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ وہ لاہور کی رہنے والی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے کئی دلچسپ انٹرویو کرنے میں مدد دی۔ جب میں نے ان سے 13 مارچ 2004 کو انٹرویو کیا تو انہوں نے ان الفاظ میں اپنی یادیں دہرائیں:

"میں اندرون شہر کے علاقے کوچہ میلارام میں پیدا ہوئی۔ میرے والد ہربنس سنگھ سوری کا کھیلوں کے سامان کا کاروبار تھا۔ ہم پنجاب بھر کے سپورٹس کلبوں کو کھیلوں کا سامان سپلائی کرتے تھے۔ میرے والد روشن خیالی سوچ کے مالک تھے اور ذات برادری پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ مسلمان بھی ہمارے گھر میں آزادانہ طور پر کھاتے رہتے تھے۔ ہمیں کبھی کوئی الجھن محسوس نہیں ہوئی تھی، کھانے پینے کے معاملے میں مردوں کے مقابلے میں خواتین زیادہ

تعصب کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ ہمارے گھر سے ایک باریک گلی ریڈ لائٹ ایریا ہیرا منڈی کو جاتی تھی۔ ہمارے ملازمین میں کافی تعداد میں مسلمان بھی تھے۔ ایک مسلمان دھوبی میری ماں کو بھابھی کہتا تھا۔ ہمارے گھر کا فرنیچر ایک مسلمان کاریگر گل محمد نے تیار کیا تھا۔

"مارچ کے بعد لاہور میں مسلسل حالات خراب رہے لیکن ہم پر ہمارے ہمسایہ مسلمانوں نے کبھی حملہ نہیں کیا۔ ہم نے سنا تھا کہ راولپنڈی میں ہندوؤں اور سکھوں کو زبردستی تبدیلی مذہب پر مجبور کیا جارہا ہے لیکن اس وقت تک ہم خوفزدہ نہیں ہوئے۔ میں یونیورسٹی گراؤنڈ (لیک روڈ نزد چوبرجی چوک) کے قریب ایک گرلز سکول میں پڑھنے جایا کرتی تھی۔ میری ایک مسلمان کلاس فیلو سلمیٰ بھی تھی۔ میرا بڑا بھائی ہیلے کالج میں جبکہ چھوٹا بھائی گورنمنٹ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ طلبا کی احتجاجی تحریک اس وقت شروع ہوئی جب مارچ میں گول باغ میں پولیس نے ہندو طلبا کے مظاہرے پر فائرنگ کر دی۔ میرا بھائی تیج کمار بھی وہاں تھا تاہم خوش قسمتی سے وہ محفوظ رہا۔ گڑبڑ کے باوجود ہم نے اسی علاقے میں رہنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ہمارے تمام ہمسائے بہت اچھے لوگ تھے۔

"مئی کے مہینے میں اندرون شہر سمیت لاہور کے کئی حصوں میں آگ لگانے کے واقعات ہوئے۔ ہمارے دھوبی نے ہمیں خبردار کیا کہ ہم گھر چھوڑ دیں کیونکہ ہمارے مکان پر بھی حملے کی منصوبہ بندی کی جارہی تھی۔ ہمارے والد نے فیصلہ کیا کہ ہم مین روڈ کی دوسری طرف موہنی روڈ کے علاقے میں منتقل ہو جائیں۔ وہ ہندوؤں کا علاقہ تھا۔ موہنی روڈ پر جا کر ہمیں لاہور کے کئی حصوں سے تکلیف دہ خبریں آنے لگیں۔ پھر ایک دن ہجوم 'یا علی، یا علی' کے نعرے لگاتا موہنی روڈ پر آیا۔ اس سے میرے والدین خوفزدہ ہو گئے۔ ہم اپنے گھر کی چھت سے جگہ جگہ لگی آگ بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ آگ مسلسل پھیل رہی تھی۔ سیالکوٹ میں ہمارے رشتہ دار پہلے ہی بھارتی صوبہ اترپردیش جا چکے تھے۔ میرے والد نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو اترپردیش کے قصبے متھرا بھیج دیا جہاں ہمارے عزیز مقیم تھے۔ میری والدہ اور چھوٹا بھائی جولائی میں ہمارے ساتھ آن ملے اور بتایا کہ ہمارے گھر مکمل طور پر جل کر راکھ بن چکا تھا۔ میرے والد نے وسط اگست (آزادی) سے کچھ ہی روز قبل لاہور کو خیر باد کہا۔ ہمارا کوئی قریبی عزیز زخمی یا ہلاک نہیں ہوا۔"

امرتسر

امرتسر میں جلاؤ گھیراؤ، چھرا گھونپنے اور تشدد کرنے کے واقعات سے پورے شہر میں لوگوں کی زندگیوں کو خطرہ تھا۔ صورتحال روز بروز قابو سے باہر ہوتی جارہی تھی کیونکہ لوگ حملہ آوروں جن کی اکثریت جرائم پیشہ عناصر کی تھی کے نرغے میں آرہے تھے۔ یہ گینگ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ اس وقت تک اکثر لوگ کثیر المذہب علاقوں سے منتقل ہو کر ایسے مقامات پر جا چکے تھے جہاں ان کے ہم مذہب افراد کی اکثریت تھی۔ 5مارچ سے 16 مئی کے درمیان سرکاری حکام نے 209 افراد ہلاک اور 422 کے زخمی ہونے کی تصدیق کی۔ پولیس کے پاس جلاؤ گھیراؤ، قتل، لوٹ مار اور تشدد کرنے کے 2062 کیس درج کرائے گئے اور نقصان کا تخمینہ 42 لاکھ روپے لگایا گیا۔ 319 اشتہاری ملزم سرکاری حکام کو مطلوب تھے۔ ان میں سے کئی زیر زمین جا چکے تھے (The Tribune, 27 May)۔

پنجاب کا ایک اور علاقہ جو گڑبڑ کا شکار ہوا وہ انبالہ ڈویژن کا ضلع گڑگاؤں تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت والے 36 دیہات کو آگ لگا کر نیست ونابود کر دیا گیا۔(The Tribune, 31 May)۔ پاکستان ٹائمز نے بھی گڑگاؤں میں قتل عام کی اطلاعات پر افسوس کا اظہار کیا۔

جون

جون کے پہلے ہفتے میں بھی تشدد کے واقعات مسلسل جاری رہے۔ دی ٹربیون نے 2 جون کی اشاعت میں یکم جون کو امر تسر میں ہجوم کے تصادم کی خبر شائع کی۔ شہر کے مختلف حصوں سے آگ لگانے، چھرا گھونپنے اور دیگر ظالمانہ حملوں کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ 8 جون کے بعد جارحانہ حملوں میں شدت آ گئی۔ گورنر جینکنز نے وائسرائے کے نام ایک تار میں لاہور، امر تسر اور گڑگاؤں میں کئی ہلاکتوں کا ذکر کیا(Carter, 2007b: 61-2)۔ جون کے دوسرے ہفتوں میں صوبے کے کئی حصوں میں ایک بار پھر آگ لگانے، چھرا گھونپنے اور بم حملوں کے واقعات نے سر اٹھالیا جس سے متعدد افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ گوجرانوالہ جون کے شروع سے ہی متاثرہ ضلع تھا۔ گجرات، گورداس پور، جالندھر، لدھیانہ اور جالندھر میں بھی تشدد کے واقعات ہوئے۔ منٹگمری میں سکھوں نے 6 مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔[بمطابق گورنر کا ٹیلی گرام](Carter, 2007b: 67-8)۔

پاکستان ٹائمز جس کی اشاعت 19 مئی سے 11 جون کے درمیان معطل رہی۔ ایک بار پھر 12 جون کو شائع ہوا۔ اس نے خبر دی کہ اندرون لاہور کے علاقے موچی گیٹ میں چھرا گھونپنے، آگ لگانے اور بم حملوں کے واقعات کے بعد 62 گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ اس دوران امر تسر کی صورتحال قدرے بہتر رہی لیکن 17 جون کو ایک بار پھر تشدد عود کر آیا۔ متحارب گروہ ایک دوسرے پر دستی بموں اور دیسی بموں سے حملے کر رہے تھے۔ قانون ساز اسمبلی کے رکن اور مسلم لیگ امر تسر کے صدر شیخ صادق حسن نے گورنر کے نام ایک ٹیلی گرام میں مطلع کیا کہ 14 ہزار بے روزگار مسلمان جن کے گھر جلا دیئے گئے ہیں بے یارومددگار پڑے ہیں اور حکومتی امداد کے منتظر ہیں۔

کچھمن داس ہسپتال، شاہ عالمی لاہور پر 16 جون کو بم حملہ

گورنر پنجاب جینکنز نے وائسرائے کے نام ایک ٹیلی گرام میں بتایا کہ:

> بدترین بم دھماکہ اس وقت ہوا جب پولیس کی ٹیم قبل ازیں کیے گئے شاہ عالمی ہسپتال میں دھماکے کی تحقیقات کے لیے گئی۔ ایک شخص ہلاک، 44 زخمی ہوئے جبکہ 3 پولیس اہلکاروں سمیت متعدد افراد شدید زخمی ہوئے(Carter, 2007b: 88)۔

حاجی عبدالرحمان گل جن کا مارچ میں شاہ عالمی گیٹ کے تشدد کے حوالے سے قبل ازیں ذکر کیا گیا تھا۔ انہوں نے 16 جون کے واقعے کو ان الفاظ میں یاد کیا:

''کانگریس لاہور کے رہنما بھیم سین سچر نے شاہ عالمی دروازے کے بالکل باہر واقع لالہ چھمن داس ہسپتال کے احاطے میں ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ میں اس وقت اپنے ڈیرے کی ملک شاپ پر بیٹھا تھا۔ تین مسلمان نوجوان موچی دروازے والی جانب سے آئے۔ انہوں نے جلسے میں شریک افراد پر بم پھینکنے کے منصوبے پر کھلے عام باتیں کیں۔ ان میں سے ایک بازار کی طرف سے سامنے والی جانب گیا۔ دوسرا پارک کی طرف چلا گیا جبکہ تیسرے نوجوان نے ہسپتال کی طرف سے آکر بم پھینکنا تھا۔ میں نے ان میں سے ایک کو دھماکہ خیز مواد جو کہ دستی بم ہی ہو گا چلاتے دیکھا۔ چار دیواری صرف 8 فٹ اونچی تھی۔ بم پھٹا اور کئی افراد ہلاک یا زخمی ہو گئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ محمد غنی چیمہ (جو دراصل سٹی مجسٹریٹ تھا) جو قریبی علاقے میں موجود تھا نے الٹا ہندوؤں کو دھماکہ خیز مواد رکھنے کا مواد الزام ٹھہرادیا جبکہ خود پر بم پھینکنے کا بھی الزام دھر کر ہندوؤں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔

پنجاب میں صورتحال تیزی سے قابو سے باہر ہوتی جارہی تھی۔ پولیس رپورٹوں میں بتایا گیا کہ مغربی اضلاع سے ہندو اور سکھ مسلسل مشرقی پنجاب کی طرف جارہے تھے جبکہ گڑگاؤں، امرتسر اور لدھیانہ سے مسلمان مغربی پنجاب کی جانب منتقل ہورہے تھے۔(Disturbances in the Punjab 1947: 234) اسی دوران تمام وسطی اور مشرقی اضلاع بشمول خود مختار ریاستوں میں سکھوں کی نقل و حرکت بھی دیکھی جارہی تھی۔

لاہور، امرتسر، گوجرانوالہ، گجرات، جالندھر اور انبالہ بدستور متاثرہ ترین علاقوں میں شمار ہوتے رہے جہاں تشدد پہلے سے بھی بڑھ گیا تھا۔ دی ٹربیون نے 21جون کو امرتسر میں متحارب گروہوں کے ایک دوسرے پر 100 بم پھینکنے کی خبر دی۔ لاہور کے علاقے مزنگ میں مسلمان شرپسندوں کے قبضے سے 20 بم برآمد ہوئے۔ لیکن سب سے ڈرامائی حالات لاہور میں پیدا ہوئے جس سے ہندوؤں اور سکھوں کے شہر پر قبضے کے عزائم کمزور پڑ گئے۔ شاہ عالمی گیٹ میں ہندو اکثریت والے علاقے میں بدنام زمانہ آگ لگی تھی۔ اس وقت تک جہاں سکھوں نے مسلمانوں کی طرف سے (راولپنڈی ڈویژن میں مارچ میں) زیادتیوں کو برداشت کیا وہاں لاہور کے ہندو پراعتماد تھے کہ حالات کچھ بھی ہوں وہ شہر میں ہی رہیں گے۔

سبزی منڈی میں بم حملہ

پاکستان ٹائمز اور دی ٹربیون نے 22جون کو سبزی منڈی میں 2 بم دھماکوں کی خبر شائع کی۔ حملے میں 18 افراد ہلاک اور 55 زخمی ہوئے۔ چونکہ سبزی منڈی میں زیادہ تر کاروبار مسلمانوں کا تھا چنانچہ غالب امکان ہے کہ جانی نقصان بھی زیادہ انہی کا ہوا ہو گا۔ ان بم دھماکوں کے ایک مسلمان عینی شاہد میاں محمد شریف نے واقعہ یوں بیان کیا ہے: ''میں اپنے چچا خدا بخش کا کام میں ہاتھ بٹار ہا تھا کہ اچانک سبزی منڈی میں زوردار دھماکہ ہوا۔ مجھے لگا کہ ایک سے زیادہ دھماکے ہوئے۔ یہ صبح کا وقت تھا اور منڈی میں کافی رش تھا۔ مجھے جلی ہوئی ناقابل شناخت لاشیں ابھی یاد ہیں۔ انسانی اعضا بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ لوگ خوفزدہ ہو کر بھاگ رہے تھے۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے۔ ایک درجن سے زائد افراد ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔ یہ ہولناک منظر تھا۔ یہ دھماکے یقیناً ہندوؤں نے کرائے تھے۔ منڈی کے ارد گرد کے علاقوں میں ان کی بڑی تعداد رہتی تھی اور لگتا ہے کہ یہ کام قریبی آبادی گوالمنڈی اور نسبت روڈ کے رہنے والے ہندوؤں کا تھا۔''

دیناناتھ ملہوترا

تقسیم ہند سے قبل ہندو مسلم تعلقات کے حوالے سے قبل ازیں دیناناتھ ملہوترا کے تاثرات بیان کیے جاچکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دھماکہ میوہ منڈی (فروٹ منڈی) میں ہوا لیکن اخبارات اور حکومتی ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے کہ بم سبزی منڈی میں پھٹے تھے۔ میوہ منڈی میں دھماکے کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ انہوں نے مجھے یہ تفصیل بتائی:

"مئی کے بعد لاہور کے بعض علاقوں میں مسلسل آگ لگانے کے واقعات رونما ہورہے تھے۔ ہمارا گھر ہندوؤں کے مضبوط گڑھ نسبت روڈ (متصل لکشمی چوک) پر تھا۔ ہم وہاں سے بھی قدیم شہر میں گھروں میں لگی آگ کا دھواں دیکھ سکتے تھے۔ معاملہ ہندوؤں کے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ میں ہندو لیڈر سر گوکل چند نارنگ کی سربراہی میں قائم 'متاثرین کی امدادی کمیٹی' کا رکن تھا۔ اتوار کی ایک صبح کو ہمیں معلوم ہوا کہ اندرون شاہ عالمی گیٹ کے علاقے وچھو والی میں حویلی نکائن میں گولیاں لگنے سے 5 ہندو نوجوان شدید زخمی ہوگئے تھے انہیں فوری طور پر ہسپتال منتقل کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ جون کا کوئی دن تھا۔ میں بڑی ایمبولینس چلا کر وہاں لے گیا۔ یہ ایمبولینس ہم نے خود خریدی تھی۔ میرے ساتھ میرا دوست ودیارتن تھا۔ کرفیو کی وجہ سے سڑکیں سنسان تھیں۔ (ہمیں فلاحی کام کی وجہ سے باہر گھومنے کی اجازت تھی)۔ ہر طرف آگ لگی تھی۔ پولیس جس میں زیادہ مسلمان تھے کھلے عام مسلمان شرپسندوں کی حمایت کررہی تھی اور عدم تحفظ کا احساس بہت زیادہ تھا۔ زخمیوں تک پہنچنا بہت مشکل کام لگ رہا تھا۔ ہمارے پہنچنے تک ایک نوجوان زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مرچکا تھا۔ ہم دیگر 4 زخمیوں کو ایمبولینس پر ڈال کر لے گئے۔ ایک نوجوان کی ماں ہیجانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھ گئی۔ ہم بڑی مشکل سے شاہ عالمی دروازے سے باہر نکلے۔ پھر ماں کی دل فگار چیخیں سن کر ہم نے گاڑی روک لی۔ خاتون کا بیٹا دم توڑ چکا تھا۔ ہم نے بدقسمت خاتون کو دلاسا دینے کی بھرپور کوشش کی۔ پھر ممتاز دیوان خاندان کا فرد لیفٹیننٹ روپ چند اپنی گاڑی پر وہاں آیا اور باقی 3 زخمی ہندوؤں کو لے کر گنگارام ہسپتال لے گیا۔

"دو روز بعد ہماری ریلیف کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ہم نے آتشیں اسلحہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر این ڈی کپور آپریشن کے انچارج تھے۔ انہوں نے ہمارے لیے راولپنڈی آرڈننس ڈپو سے چند بندوقوں کا بندوبست کردیا۔ چنانچہ میں اور میرا دوست مہندر راولپنڈی گئے اور 12 ریوالور لے کر آگئے۔ یہ اسلحہ ہم نے بس کی اگلی نشستوں میں چھپا کر کور کو سی دیا تھا۔ اسی بنا پر ہم کامیابی کے ساتھ ریوالور مسٹر کپور تک پہنچا سکے۔ ایک روز میں گوالمنڈی تھانے گیا تا کہ اپنی اس دکان کا قبضہ حاصل کرسکوں جس کا کرایہ دار ایک مسلمان درزی تھا اور وہ کئی ماہ سے دکان نہیں کھول رہا تھا۔ تھانے کا محرر چند فائلوں میں سر کھپا رہا تھا چنانچہ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر باری کا انتظار کرنے لگا۔ پولیس نے میوہ منڈی میں دھماکوں کے بعد چند ہندو نوجوان کو حراست میں لیا تھا۔ دھماکے میں 8 افراد ہلاک اور 20 زخمی ہوئے تھے۔ ایسے موقع پر پولیس ملزموں سے اقبال جرم کرانے کے لیے تشدد کی انتہا کردیتی ہے۔ ایک مشتبہ نوجوان سے تفتیش کے دوران ایس ایچ او نے چیخ کر کہا 'پرکاش'۔۔۔ میں جانتا تھا کہ پرکاش کو دھماکے والی جگہ سے پکڑا گیا تھا۔ پرکاش کی آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔ اس نے بم دھماکے کی منصوبہ بندی کرنے والوں میں میرا نام بھی دے دیا۔

"اپنا نام سن کر خوف سے میرے جسم سے گویا جان نکل گئی۔ محرر بدستور فائلوں میں مصروف تھا لہٰذا میں چپکے سے اٹھا اور وہاں سے کھسک آیا اور اپنے گھر والی گلی میں آکر میں پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا۔ گھر میں آیا تو میری والدہ

اور بھائی نے فیصلہ کیا کہ میرا گھر میں مزید رہنا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ میرا بھائی مجھے گاڑی پر آریہ پریس لے گیا اور پھر شام کو مجھے لاہور سٹیشن کی بجائے مغلپورہ ریلوے سٹیشن پر پہنچا دیا۔ جہاں سے میں پنجاب میل پر بیٹھ کر لاہور سے نکل گیا۔ یہ غالباً جون کے آخر کا کوئی دن تھا لیکن مجھے صحیح تاریخ یاد نہیں۔"

ڈاکٹر جگدیش چندر سرن

ڈاکٹر جگدیش چندر سرن کا اس کتاب میں پہلے شمالی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں پر حملوں کے حوالے سے ذکر ہو چکا ہے۔ انہوں نے اندرون لاہور میں لگنے والی آگ کی ان الفاظ میں تفصیل بتائی ہے: "21 جون کو لاہور کے ہندو علاقے پاپڑ منڈی کو آگ لگا دی گئی۔ اس کے بعد مچھی ہٹہ اور پھر شاہ عالمی کو شعلوں کی نذر کر دیا گیا۔ ان دنوں وہاں ایک مجسٹریٹ چیمہ تھا۔ جس نے اپنی نگرانی میں غیر مسلموں پر حملے کرائے۔ وہ ہندو علاقوں میں آگ لگنے کی صورت میں فائر بریگیڈ کو اس طرف نہ جانے دیتا اور جو غیر مسلم آگ سے بچنے کے لیے بھاگتے انہیں (کرفیو کی آڑ میں) واپس گھروں کو بھجوا دیتا۔ ان دنوں میں منٹگمری پارک سے پلازہ سینما اور پھر کوئنز روڈ پر بالک رام میڈیکل کالج جایا کرتا تھا۔ ہم ہر روز سنتے کہ کسی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ کوئی زخمی ہو گیا ہے۔ اگر ایک روز 7 ہندو مرتے تو اگلے روز 7، 8 مسلمانوں کے مارے جانے کی خبر آ جاتی۔ جہاں تک میری یاداشت کا تعلق ہے تو ہمارے اپنے علاقے میں کسی مقامی مسلمان نے ہم (غیر مسلموں) پر حملہ نہیں کیا۔ ایک روز بری طرح جھلسے 2 افراد ہسپتال لائے گئے۔ وہ غالباً آر ایس ایس کے کارکن تھے اور بم کی تیاری کے دوران دھماکہ ہونے سے جھلس گئے تھے۔

"ایک دوست میرے پاس آیا اور بتایا کہ گزشتہ شب اندرون لاہور کے ہندو علاقے محلہ سرین میں حملہ کر کے 17 نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ مرنے والوں کے پاس اپنے دفاع کے لیے کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ زخمیوں کو طبی امداد فراہم کرنے کے لیے ایک ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔ میں نے زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ میں ہندو مہا سبھا کے ممتاز رہنما اور سرسوتی انشورنس کمپنی کے مالک سر گوکل چند نارنگ کے دفتر چلا گیا۔ یہ لاہور ریلیف سوسائٹی کا بھی ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہ دراصل ہندو عسکریت پسندوں کا خفیہ مرکز تھا۔ وہاں سے ہم نے نہ صرف ابتدائی طبی امداد کے آلات حاصل کیے بلکہ ایک تھری ناٹ تھری (303) رائفل اور کچھ راؤنڈ بھی لیے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسلحہ استعمال نہیں کیا تھا چنانچہ اسلحہ اٹھا کر چلنے سے میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ مہاراشٹر کے رہنے والے ایک شخص جس نے 1940 کے عشرے میں سوشلزم تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اس نے مجھے امونیا کی بوتلیں اور برومین کے کیپسول دیے، اس نے مجھے بتایا کہ اگر کوئی گروہ تم پر حملہ آور ہو تو ان بوتلوں کو زمین پر گرا دینا۔ جس سے دھویں کے بادل اٹھیں گے اور ہجوم بھاگ جائے گا۔ ہم نے رائفل ایک سٹریچر میں چھپائی جبکہ دیگر اسلحے کا ساز و سامان کاٹن کے بنڈل میں چھپا لیا گیا۔ اس کے بعد ہم سر گوکل کی بڑی بیوک کار میں بیٹھ کر محلہ سرین چلے گئے۔

"ہم شاہ عالمی گیٹ میں داخل ہو گئے۔ وہاں کئی لوگ جمع تھے اور نعرے لگا رہے تھے 'آگے مت جاؤ آگ جل رہی ہے۔' لیکن ہم چلتے رہے اور کشمیری بازار میں پہنچ گئے۔ ہم نے محلہ سرین کے سامنے کار پارک کی، ہم اندر گئے اور کچھ دیر وہاں رہے اور انہیں چیزیں دینے کے بعد شاہی محلے کے رستے واپس روانہ ہو گئے۔ ہم نے سنا کہ مسلمان لڑکوں کا ایک گروپ ایک تنگ

دروازے سے محلے میں داخل ہو کر اسے آگ لگانے کے در پے تھا جبکہ دروازے کے دوسری طرف ہندو لڑکے پتھروں اور ڈنڈوں کی مدد سے انہیں روکنا چاہتے تھے۔ دونوں فریقوں کے پاس بادی النظر میں کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ اگلے روز لاہور ریلیف سوسائٹی کے 7 ارکان جو دراصل آر ایس ایس کے ورکر تھے وہاں گولیاں دینے گئے لیکن انہیں پولیس نے دھر لیا اور بعد ازاں تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد اندرون شہر میں بڑے پیمانے پر آگ لگائی گئی اور ہندوؤں کی آبادی والے تمام علاقوں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ صورتحال مسلسل خراب ہی رہی لیکن اب بھی کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ لاہور پاکستان میں شامل ہو گا۔ ایک روز میں نے کانگریسی لیڈر ڈاکٹر گوپی چند بھر گاوہ سے کہا، 'ڈاکٹر صاحب آپ کو لاہور سے چلے جانا چاہیے۔' انہوں نے کہا کہ نہیں میں گاندھی کا پیروکار ہوں۔ اگر کوئی مجھے مارنے آئے گا تو میں (لڑنے کی بجائے) خاموشی سے مرنا پسند کروں گا۔ ایک اور شخص موہن لال نے مذاق کرتے ہوئے ان سے کہا: 'ڈاکٹر صاحب ہر کوئی اپنی جائیداد ارینج رہا ہے تو آپ کیوں نہیں فروخت کر رہے؟ میں خریدنے کے لیے تیار ہوں۔' اصل میں لاہور کے کانگریسی لیڈروں کو بھرپور یقین تھا کہ لاہور بھارت کا حصہ رہے گا۔ ڈاکٹر گوپی چند بھر گاوہ بھی سمجھتے تھے کہ لاہور کبھی پاکستان میں شامل نہیں ہو گا۔"

اس سے پہلے 3 جنوری 1997 کو ممبئی کے دورے میں میری معروف بھارتی فلمساز بی آر چوپڑہ سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے ان کے لاہور میں قیام کے دنوں کے حوالے سے تفصیلی بات چیت کی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کا خاندان گوالمنڈی کے چیمبر لین روڈ پر رہتا تھا۔ جو شاہ عالمی سے زیادہ دور نہیں۔ یہ ہندوؤں کی اکثریت کا علاقہ تھا۔ بعد میں انہوں نے پنجاب اسمبلی کے عقبی علاقے میں گھر لے لیا۔ بات چیت کے دوران میں یہ جاننے کا شائق تھا کہ کیا انہوں نے کبھی واپس لاہور جانے کا سوچا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اکثر گورنمنٹ کالج لاہور میں گزرے ایام یاد کرتے ہیں، یہ میری زندگی کا ناقابل فراموش حصہ ہیں اور انہوں نے بعد میں بھی لاہور میں اپنے پرانے دوستوں سے رابطے برقرار رکھے تھے۔ ان کے دیرینہ دوست شیخ عبدالرشید کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے بچے ان کو گاہے بگاہے خط لکھتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ لاہور جانے کی شدید خواہش رکھتے تھے لیکن ان کی بیوی ان کو شاہ عالمی میں لگنے والی بدترین آتشزدگی کے تناظر میں لاہور جانے نہیں دیتی۔ اس آگ سے وہاں کے ہندوؤں میں شدید خوف و ہراس پھیلا تھا۔ وہ بے چاری بھی اس واقعے کے صدمے سے نہیں نکلی۔ اگرچہ وہ کسی نقصان کے بغیر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن اس کے کئی رشتہ دار ضرور اس آگ میں جل مرے تھے۔

شاہ عالمی کی آگ

بزرگ مسلمان بھی 1947 کے سال اور تقسیم کے موضوع پر بات کرتے ہوئے ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ شاہ عالمی کے علاقے میں لگنے والی آگ ہی وہ فیصلہ کن لمحہ تھا جب ہندو اور سکھ لاہور میں رہنے کی جنگ لڑنے کا حوصلہ چھوڑ بیٹھے۔ لاہور سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں سے میری حالیہ برسوں کے دوران ہونے والی گفتگو میں دو باتوں کا بار بار ذکر کیا گیا۔ شاہ عالمی کی آگ اور اس آگ کے پھیلنے میں سٹی مجسٹریٹ محمد غنی چیمہ کا اہم کردار۔ چنانچہ میں بالخصوص یہ جاننا چاہتا تھا کہ حقیقی صورتحال کیا تھا۔

حاجی عبدالرحمان گل شاہ عالمی کی آگ پر مستند معلومات دے سکتے تھے کیونکہ وہ خود بھی اس منصوبے میں شامل ہے۔ انہوں نے مجھے جو معلومات فراہم کیں وہ 24جون 1947 کو پاکستان ٹائمز میں شائع ہونے والی تفصیلات کے کافی قریب تھیں۔ میں نے ان سے 30دسمبر 2004 کو جو انٹرویو کیا۔ اس میں میں نے بالخصوص آگ لگنے کی درست تاریخ دریافت کرنے میں دلچسپی لی لیکن وہ تاریخ انہیں یاد نہ آسکی۔ وہ صرف اتنا کہہ سکے کہ یہ ایک انتہائی گرم موسم والی رات تھی۔ میں یہاں پاکستان ٹائمز کی 24جون 1947 کی اشاعت میں شائع ہونے والی خبر ہو بہو پیش کر رہا ہوں:

"اتوار کی صبح (22جون) کو اندرون شاہ عالمی گیٹ، پاپڑ منڈی اور کوچہ ہوا گراں کے علاقے میں لگنے والی آگ سے 100 مکانات اور 100 دکانیں جل کر راکھ ہوئیں۔ بازار کے دونوں طرف عمارتوں کی قطار خاکستر ہو کر گر گئی ہے۔ جس کے ملبے سے بازار کا راستہ بند ہو گیا ہے۔ نقصان کا تخمینہ لاکھوں میں لگایا گیا ہے۔ شہر کی سونا مارکیٹ، کریانہ مارکیٹ اور گودام بھی انہی علاقوں میں ہیں۔ آگ اتوار کی علی الصبح اندرون شاہ عالمی گیٹ میں لگی اور پھر پاپڑ منڈی، جوڑ موری اور بالمتہ سٹریٹ تک پھیل گئی۔

"میونسپل کارپوریشن کا ایک اور فوج کے دو فائر انجن موقع پر پہنچے لیکن پانی کی سپلائی میں تعطل آنے سے اپنا کام کافی دیر تک شروع نہ کر سکے۔ اتوار کی صبح بندوق کی گولیوں کی آواز مسلسل آتی رہی اور پولیس اور فوج نے کرفیو توڑنے والے افراد پر 100 گولیاں چلائیں۔ یہ لوگ تیزی سے پھیلتی آگ سے پیدا ہونے والی افراتفری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی دوران شاہ عالمی گیٹ میں اس وقت 3 بم دھماکے ہوئے جب پولیس افسر اور ایک مجسٹریٹ متاثرہ علاقے کا دورہ کر رہے تھے۔ ان دھماکوں میں ایک فوجی اور دو پولیس افسروں کے زخمی ہونے کی اطلاعات ہیں۔ پولیس اور فوج نے علاقے کو سیل کر کے ایک خاتون سمیت 150 مشتبہ افراد کو گرفتار کر لیا۔"

اخبار کے اسی صفحے کے نیچے یہ بتایا گیا ہے کہ 'شام کو سر ایون جینکنز نے آئی جی پولیس سر جے ایم ٹی بینٹ کے ساتھ شاہ عالمی، پاپڑ منڈی، کوچہ ہوا گراں اور مزنگ کے علاقوں کا دورہ کیا۔'

حاجی عبدالرحمان گل

"مجسٹریٹ چیمہ ہمارے ڈیرے پر میرے والد سے ملنے آتا رہتا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح جاٹ برادری کا تھا اور میرے والد کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ میں ہمیشہ اپنے والد کے ساتھ ہوتا تھا کیونکہ انہیں گاہے بگاہے مرگی کے دورے پڑتے تھے اور انہیں فوری توجہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لیے میں ان دنوں رونما ہونے والے تمام واقعات سے آگاہ ہوں۔ میرے والد اور مجسٹریٹ چیمہ برتنوں کی دکان کے باہر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دن کچھ ہندوؤں نے اندرون شاہ عالمی گیٹ کی لال مسجد کے مینار گرانے کی کوشش کی۔ میرے والد وہاں جا کر شرپسندوں کی گوشمالی کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت ایک انگریز سارجنٹ کی قیادت میں فوج کی ایک گاڑی وہاں گشت پر تھی۔ مجسٹریٹ چیمہ نے گاڑی روک کر انہیں اپنے شناختی کاغذات دکھائے جس پر انگریز سارجنٹ نے اسے سلیوٹ کیا۔ مجسٹریٹ کی ہدایات پر سارجنٹ نے گاڑی میں سوار فوجیوں کو نیچے اتر کر شرپسندوں پر گولی چلانے کا حکم دیا۔ اس صورتحال میں خوف وہراس پھیل گیا اور لوگ جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ کچھ ہندوؤں نے خود کو چوڑے سیوریج نالے کے پیچھے چھپا لیا جبکہ باقی وہاں سے فرار ہو گئے۔

"ہمارے گھر کے بالکل عقب میں ہندوؤں کا محلہ کوچہ بالمتہ تھا۔ وہاں کے ہندوؤں نے میرے دادا کے مکان کی بالائی منزل کو آگ لگادی لیکن آگے نیچے والے حصے کی طرف آنے کی بجائے ہندوؤں کے گھروں کی جانب پھیلنے لگی۔ بہرحال ہندوؤں کی طرف سے اس اشتعال انگیزی نے میرے والد کو مزید غضبناک کر دیا۔ 3 مارچ کے واقعات کے بعد سے میانوالی سے تعلق رکھنے والے مسلمان پولیس اہلکار شاہ عالمی گیٹ میں تعینات کیے گئے تھے۔ ان کا انچارج اسسٹنٹ سب انسپکٹر کرم دین تھا۔ میانوالی کے لوگ دراز قد ہوتے ہیں اور لمبی مونچھیں رکھتے ہیں۔ یہ پولیس والے بھی کافی دبنگ تھے۔ ان اہلکاروں نے شاہ عالمی میں پہلے سوچے سمجھے حملے میں کردار ادا کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ مجسٹریٹ چیمہ نے محسوس کر لیا تھا کہ مکان کو آگ لگانے کے بعد میرے والد ہندوؤں کے لیے سخت غصہ رکھتے تھے اس لیے وہ انہیں ہندوؤں پر حملے کے لیے باآسانی شہہ دے سکتا تھا۔ چنانچہ ایک انتہائی گرم شام کو جب ہم سب ڈیرے پر بیٹھے تھے تو چیمہ نے میرے والد سے کہا کہ 'بلی (مراد بلا) مجھے کچھ آدمی دو، میں شاہ عالمی کو جلا کر راکھ کرنا چاہتا ہوں۔' یہی شاہ عالمی میں لگنے والی آگ کی بنیاد تھی۔

"میرے والد ہچکچاہٹ کا شکار تھے کیونکہ ہمارا گھرانہ کافی بڑا تھا اور سوائے میرے سب چھوٹے بچے تھے۔ انہوں نے چیمہ سے کہا کہ 'میں ایسے کسی کام میں حصہ نہیں لے سکتا کیونکہ مجھ پر کئی ذمہ داریاں ہیں۔ 1927، 1935 اور 1937 کا دور مختلف تھا۔ اب مجھے اپنے بچوں کی بہتری کا سوچنا پڑتا ہے۔' مجسٹریٹ نے کہا کہ وہ سب سمجھتا ہے لیکن وہ ہر صورت میں شاہ عالمی کو آگ لگانا چاہتا ہے۔ میرے والد کی پوزیشن مزید محفوظ بنانے کے لیے اس نے اے ایس آئی کرم دین کو حکم دیا کہ بلے (میرے والد) کو ساتھ لے جاؤ اور پولیس ریکارڈ میں لکھ دو کہ اسے دفعہ 107 اور 151 کے تحت نظر بند کر دیا گیا ہے۔ پھر اس نے میرے والد سے کہا کہ 'اب مجھے چند آدمی دے دو۔' یہ سن کر والد بولے 'اچھا چودھری' (چونکہ چیمہ بھی جاٹ برادری سے تعلق رکھتا تھا اور پنجاب میں جاٹوں کو چودھری بھی کہا جاتا ہے)۔

"میرے والد نے چیمہ سے کہا: 'مجھے ایک پولیس کانسٹیبل دو تو میں تمہاری مدد کروں گا۔' چنانچہ میں، میرے والد اور کانسٹیبل موچی گیٹ کے سریانوالا بازار گئے جہاں میرا کزن محمد شفیع جو شفیع اٹی یا شفیع نیناں والا کے نام سے مشہور تھا بھی رہتا تھا۔ سریانوالا بازار وہی علاقہ ہے جہاں غازی علم دین شہید رہتے تھے۔ میرے والد نے ان سے بات کی اور کہا کہ انہیں شاہ عالمی کو آگ لگانے کے لیے مواد کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا 'ٹھیک ہے بھاہ جی، آپ دو گھنٹے بعد دوبارہ آئیں۔' ہم دو گھنٹے بعد واپس آئے۔ اس نے تیل اور کیمیکل والے محلول کے دو پیپے (ڈرم) ہمیں دیے۔ یہ محلول جوتے بنانے سمیت دیگر کئی مقاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ مائع کسی چیز کو لگایا جاتا ہے تو اسے آسانی سے آگ نہیں لگتی لیکن اگر شعلہ بھڑک اٹھے تو پھر اتنی آسانی سے آگ نہیں بجھتی۔

"اس کے دو قریبی دوست عبداللطیف یا طیفا ترکھان اور لا وا کن کٹا کشمیری اس کے ساتھ تھے۔ یہ رات کے 10 بجے کا وقت تھا۔ کرفیو کی وجہ سے گلیاں سنسان تھیں۔ جلد ہی ہم اس جگہ پر پہنچ گئے جہاں مجسٹریٹ چیمہ اور میرے والد ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ پولیس فورس میں شامل ایک سکھ جسے ہندو ہمیشہ اپنے علاقے میں تعینات دیکھنا پسند کرتے تھے۔ اس رات شاہ عالمی میں ڈیوٹی پر تھا۔ وہ شاہ عالمی گیٹ کے قریب چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس رات چیمہ نے کرم دین سے کہا کہ تھا کہ وہ سکھ اہلکار کی ڈیوٹی نہ لگائے۔ چیمہ نے ایک لوڈڈ بندوق والا پولیس اہلکار اس کے پاس کھڑا کر دیا اور کہا کہ اگر یہ جاگ کر شور مچانے کی کوشش کرے تو اسے گولی مار دی جائے۔ کچھ دیر بعد چیمہ نے ہم سے کہا کہ ہم اپنا کام شروع کر دیں۔ میرا والد اور چیمہ باہر ہی رہے۔ ہم نے

دو، دو افراد کے دو گروپ بنا دیے۔ دونوں گروپ مخالف سمت میں شاہ عالمی کے اختتام تک گئے اور دکانوں کے دروازوں اور ان کے سامنے تھڑوں جو ان دنوں لکڑی کے ہوتے تھے پر محلول پھینکنا شروع کر دیا۔ حویلی لالہ لچھمن رام کے ایک کونے پر ہندوؤں نے پانی کا چھوٹا سا چوبچہ بنا رکھا تھا۔ اس کے ساتھ پانی سے بھرے ڈرم بھی رکھے تھے۔ یہ احتیاطی اقدام کے طور پر آگ سے نمٹنے کی تیاری تھی۔ یہ حویلی قلعہ نما تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ ہندوؤں نے یہاں بڑی تعداد میں اسلحہ اور ایمونیشن چھپا رکھا تھا۔

''دوسری پارٹی محلہ پاڑی مل کی طرف گئی۔ دونوں گروپوں نے دروازوں اور تھڑوں پر محلول ڈال دیا اور پانی کے چوبچے میں بھی کیمیکل پھینکا۔ جب گورنمنٹ کالج کے مینار پر لگے بڑے گھڑیال نے ایک بجایا تو چیمہ نے حکم دیا کہ آگ لگا دی جائے۔ ہم آخری طرف سے آگ لگاتے شاہ عالمی گیٹ کی طرف بڑھتے گئے۔ چند ہی منٹوں میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اس واقعے کے ستاون سال بعد آگ سے متعلق باتیں کرنا اور اس وقت موقع واردات کو آنکھوں سے دیکھنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ اس وقت جو چیخیں اور رونے کی آوازیں سنائی دیں وہ کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ آگ میں جلنے سے زیادہ تکلیف دہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جہاں پورا شہر تاریکی میں ڈوبا تھا وہاں شاہ عالمی شعلوں کی آگ میں روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ پورا ماحول غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ موتی مندر جو جواہر لال نہرو کے والد نے بنوایا تھا اب ملیامیٹ ہو چکا تھا۔ یہ مندر اس پانی کے کھالے کے پاس تھا جو پورے شہر کے گرد گھومتا تھا۔ یہ نالہ انگریزوں نے اولڈ سٹی کے گرد لگائے گئے باغات کو پانی دینے کے لیے بنوایا تھا۔

فوری طور پر فائر بریگیڈ آ گیا اور موتی مندر کے عمارات کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ نہر سے پانی کھینچنے کے لیے انجن چلائے گئے تاکہ جلی عمارتوں پر پانی پھینکا جا سکے لیکن چیمہ نے فائر فائٹروں کو حکم دیا کہ وہ پانی کے پائپ دوبارہ اس پانی کے نالے میں پھینک دے۔ اس طرح انجن کے شور سے لگتا تھا کہ فائر بریگیڈ پوری شدت سے کام کر رہا تھا لیکن درحقیقت پانی دوبارہ واپس اس نالے میں جا رہا تھا۔ فائر فائٹرز ویسے بھی مسلمان تھے لیکن وہ اگر مسلمان نہ بھی ہوتے تو بھی سٹی مجسٹریٹ کے حکم کی سرتابی نہیں کر سکتے تھے۔ جب آگ تیز تر ہو گئی تو چیمہ نے میرے والد سے کہا 'بلے، اب میرا دل گڑ والے چاول اور مسر چاول کھانے کو کر رہا ہے۔' یہ دونوں کھانے فوراً تیار کیے گئے اور ہم نے کوچہ ڈوگراں کے ایک مکان میں بیٹھ کر چاول کھائے۔

''مجھے یاد ہے کہ آگ پھیل رہی تھی اور گرم مصالحے والی دکانیں شعلوں میں جل رہی تھیں۔ مصالحے جلنے سے مخصوص خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ مصالحوں سے تو بھلی خوشبو آ رہی تھی لیکن جب سرخ مرچیں جلنے لگیں تو لوگ چھینکیں مارنے لگے۔ میں نے اس رات کو معجزہ ہوتے دیکھا۔ جب آگ جلتے جلتے کسی مسلمان کے گھر کے پاس پہنچتی تو اسے لپیٹ میں لینے کی بجائے دوسری سمت (یعنی کسی غیر مسلم کے گھر کی طرف) کو چل دیتی۔ لال مسجد کے قریب ایک مسلمان طوائف کا گھر تھا لیکن آگ نے اس کے گھر کو چھوا تک نہیں۔ جب یہ آگ پاپڑ منڈی پہنچی تو مسلمان شیخوں کے گھروں کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر گھروں کو پانی میں بھگو رکھا تھا۔ اس دوران ہندو تھانیدار پنڈت دیوی داس اور اس کے دو مسلمان کانسٹیبل جنہیں ہم سجا اور کھبا کہتے تھے مسلمانوں کے علاقے کوچہ ڈوگراں کی طرف آیا۔ یہ دونوں مسلمان کانسٹیبل بہت کھردرے مزاج کے تھے اور دیوی داس کے جاسوس تھے۔ اس نے کوچہ ڈوگراں کے مسلمانوں سے کہا کہ میرے علاقے میں کوئی کرفیو نہیں، لہٰذا تم لوگ جاؤ اور آگ بجھاؤ۔ ان کی بات ماننے کی بجائے اہل محلہ نے ان تینوں کو جان سے مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں بہلا پھسلا کر شیخوں کے گھر کی طرف لے جایا گیا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر دیکھیں کہ آگ کی کیا صورتحال تھی۔

منصوبہ یہ تھا کہ جب وہ تینوں چھت کے اوپر پہنچیں گے تو انہیں نیچے گرا دیا جائے گا۔ دیوی داس چند سیڑھیاں اوپر گیا تو اس نے کوئی خطرہ بھانپ لیا چنانچہ وہ تینوں مکان سے بھاگ نکلے اور پھر پولیس سٹیشن میں بھی واپس نہ آئے۔

''آگ پورے بارہ گھنٹے تک لگی رہی۔ یہ رات ایک بجے لگی اور اگلے دن دوپہر ایک بجے اس پر قابو پایا گیا۔ مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں کہ کتنے لوگ آگ میں ہلاک ہوئے تاہم ان کی تعداد 100 سے کم ہی تھی کیونکہ بیشتر افراد وہاں سے جان بچا کر بھاگ نکلے۔ وہ لوہاری منڈی کے راستے موتی بازار سے نکلے اور پھر لاہوری باغ پہنچے تو وہاں گویا میلہ لگا ہوا تھا۔ لیکن یہ خوشی اور شادمانی منانے والے افراد نہیں بلکہ مصیبت زدہ افراد کا ہجوم تھا۔ تانگے والے منہ مانگے دام وصول کر رہے تھے۔ سٹیشن جانے کے لیے فی کس 100 روپے کرایہ مانگا گیا۔ یہ انتہائی زیادہ کرایہ تھا۔ ان دنوں معمول میں یہ کرایہ ایک روپے سے بھی کم تھا۔ آگ میں شاہ عالمی کا پورا علاقہ نذر آتش نہیں ہوا تھا کچھ عمارتیں محفوظ رہ گئیں۔ اس لیے ان بچی کھچی عمارتوں میں بے گھر سکھ اور ہندو مقیم ہو گئے۔ ان عمارتوں کو جولائی میں جلا دیا گیا۔ اس کام میں دیگر افراد کا ہاتھ تھا۔

''پولیس کو جو ایف آئی آر درج کرائی گئی اس میں صرف میرے والد کو ملزم نامزد کیا گیا۔ سینئر پولیس افسر اب بھی انگریز تھے۔ انہوں نے میرے والد کی تلاش شروع کر دی۔ پہلے انہوں نے روپوش ہو کر توپخانہ بازار میں ایک عزیز کے گھر پناہ لی جس نے انہیں ایک دکان میں چھپا دیا۔ پھر وہ لاہور سے بہت دور علاقے چوہنگ گاؤں چلے گئے۔ برسوں پہلے یہ علاقہ قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے پناہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ چوہنگ میں ہمارا ایک رشتہ دار رہتا تھا جو کافی بااثر تھا۔ اس نے میرے والد کو پناہ دی۔

''مجھے اور میرے چچا کو تفتیش کے لیے لوہاری گیٹ پولیس سٹیشن لے جایا گیا تاہم مسلم لیگ کے لیڈر اور پنجاب اسمبلی کے رکن خلیفہ شجاع الدین جن کی میرے والد انتخابات میں حمایت کرتے تھے کے دباؤ پر پولیس نے ہم دونوں کو رہا کر دیا۔ اس دوران میرا ایک بھائی شدید علیل ہو گیا۔ اس سے میرے والد بہت محبت کرتے تھے اور وہ اسے ملے بغیر نہ رہ سکے۔ کسی نے ان کی آمد کی پولیس کو اطلاع کر دی جس پر پولیس فوراً انہیں گرفتار کرنے پہنچ گئی لیکن میرے والد نواں بازار کے باہر تانگہ سٹینڈ میں بنی گھوڑوں کی کھرلی میں چھپ گئے اور پولیس کے ہاتھ نہ آئے۔ یوں جب گھوڑے اس کھرلی میں چارہ کھا رہے تھے تو چارے کی تہہ میں میرے والد چھپے رہے۔ پولیس ناکام واپس چلی گئی۔ جولائی میں میرے والد دوبارہ ہم سے ملنے آئے لیکن پولیس کو دوبارہ کسی نے مخبری کر دی لیکن میرے والد دوبارہ ایک گوجر کے گھر میں اپلوں کے ڈھیر میں چھپ کر بچ گئے۔ پولیس میرے والد کے شبے میں ہمارے رشتہ دار دلاجٹ (جس کی آنکھیں میرے والد کی طرح نیلی تھیں) کو پکڑ کر لے گئی۔ میرے والد کی بلی آنکھیں بطور شناخت پولیس کے پاس ریکارڈ میں 1927 سے درج تھیں۔ پولیس بلی آنکھوں کی وجہ سے ایک اور آدمی بلا کاریگر کو بھی لے گئی۔ اسے تو رہا کر دیا گیا لیکن دلاجٹ کو نہ چھوڑا۔ دلاجٹ کم بولنے میں مشہور تھا اور گھنٹوں خاموش رہ سکتا تھا۔ پولیس نے اسے پاگل خانے بھجوا دیا۔ ہمیں دلاجٹ کی گرفتاری پر کافی تشویش ہوئی کیونکہ ایک تو وہ بے گناہ تھا اور دوسرا جاٹ بھی تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنی برادری کے مشہور مسلم لیگی چودھری کلیم الدین احمد سے رابطہ کیا۔ ان کی سفارش پر مسلم لیگی لیڈروں نواب ممدوٹ، دولتانہ، شوکت حیات، عبدالحمید دستی اور خود چودھری کلیم الدین احمد نے دلاجٹ کی تلاش کے لیے لاہور کے تمام تھانوں اور جیلوں کا دورہ کیا لیکن وہ انہیں کہیں نہ ملا۔ پھر ایک مسلمان پولیس اہلکار نے

ہمیں بتایا کہ دلاجٹ کو مینٹل ہسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ وہ سب وہاں گئے تو اسے ایک کھڑی چارپائی کے ساتھ زنجیریں باندھ کر کھڑا کیا گیا تھا۔ اس سے بطور مشقت زمین میں ایک بڑا گڑھا کھدوایا گیا۔ بہر حال اسے وہاں سے نکال لیا گیا۔

''ہندوؤں کے دیگر محلوں جیسا کہ محلہ سرین، محلہ واں وٹاں اور شاہ عالمی کے کچھ حصوں میں جو آگ لگائی گئی وہ دیگر (ہمارے علاوہ) مسلمان نوجوانوں کا کام تھا۔ ان میں بھاٹی، لوہاری، موچی دروازوں کے علاوہ مشرقی پنجاب سے آئے مہاجرین شامل تھے۔ انہوں نے گھروں اور دکانوں کے تالے توڑا کر انہیں لوٹ لیا لیکن ہم نے جو آگ لگائی تھی اس نے لاہور کا پانسہ پلٹ دیا۔ اس کا منصوبہ ساز مجسٹریٹ چیمہ تھا جبکہ میرے والد نے اسے ضروری سامان اور افرادی قوت فراہم کی۔

''میرے والد چوہنگ میں پاکستان بننے تک روپوش رہے۔ اس کے بعد پولیس پر انگریزوں کا کنٹرول ختم ہو گیا اور پاکستانی افسروں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس کے باوجود والد صاحب غیر یقینی کیفیت کا شکار رہے کہ حکام ان سے کیسا سلوک کریں گے۔ وہ شاہ عالمی میں اپنے گھر واپس آنے سے پہلے باقاعدہ اجازت اور کلیرنس چاہتے تھے۔ یہ گھر 5 مارچ سے خالی تھا اور ہم نواں بازار میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں رہ رہے تھے۔ چنانچہ 22 اگست 1947 کو ہم نے عدالت میں ایک درخواست دائر کی۔ جس میں کہا گیا کہ:

بخدمت جناب ڈپوٹی مجسٹریٹ

لاہور

جناب عالی

مؤدبانہ گزارش ہے کہ ہم زیر دستخطی شاہ عالمی کے علاقے سسیاں میں رہتے تھے لیکن فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ہمارے علاقے کے ہندوؤں نے ہمیں زبردستی گھروں سے نکال دیا۔ وہ ہمیں دھمکیاں دیا کرتے تھے۔ اب ہم اپنے گھروں کو واپس آنے کے خواہاں ہیں لیکن جہاں ہندوؤں کے گھر اب بھی قائم دائم ہیں اور انہیں تالا لگا ہوا ہے وہاں ہمارے مکانات تباہ ہو گئے ہیں اور لوٹ لیے گئے۔ ہم نے پہلے بھی کئی درخواستیں گزاریں کہ ہماری املاک کے نقصان کا ازالہ کیا جائے۔ ہم جناب کو اطلاع دیتے ہیں کہ ہم آج 22 اگست کو واپس اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔

آپ کے تابعدار

دستخط: پیر بخش ولد فضل دین (قوم جاٹ) ساکن کٹرا سسیاں لاہور، باغ دین ولد عمر دین (قوم جاٹ)، غلام حسین ولد فضل دین (قوم جاٹ)، رحیم بخش ولد سوداگر (قوم جاٹ)، دین محمد ولد غلام محمد (جاٹ) محلہ کٹرا سسیاں لاہور۔

احمد سلیم نے لاہور کے سینئر وکیل حکم قریشی سے انٹرویو کیا تاکہ ان سے 1947 میں لاہور کی صورتحال جان سکیں۔ انہوں نے تصدیق کی کہ درمیان میں عارضی وقفہ چھوڑ کر مارچ کے بعد سے لاہور میں حالات خراب ہی رہے۔ مجسٹریٹ ایم جی چیمہ کے کردار کے بارے میں انہوں نے یہ بتایا:

حکم قریشی

"مجسٹریٹ ایم جی چیمہ سر پر ہیلمٹ پہن کر گشت کرتا تھا۔ اس نے لاہور سے تمام ہندوؤں کو نکال باہر کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ آگ لگنے سے پہلے مسلمان سوڈا واٹر گیس سے بھری بوتلیں شاہ عالمی میں پھینکتے تھے۔ اس کے دھماکے سے موت واقع ہو سکتی تھی یا آدمی زخمی ہو سکتا تھا۔ اس کے جواب میں ہندو اپنے گھروں کی چھتوں سے فائرنگ کرتے تھے۔ ہندوؤں میں کوئی بدمعاش نہیں تھا۔ سب کے سب غنڈے مسلمان تھے۔ شاہ عالمی کی آگ سے چند روز پہلے چوک رنگ محل سے شاہ عالمی تک سیوریج پائپ بلاک ہو گئے۔ اس میں گندے پانی کی بجائے مٹی کا تیل اور پٹرول ملا کر بہا دیا گیا۔ ہندو شاہ عالمی میں اپنے مضبوط گڑھ میں قلعہ بند تھے لیکن گھروں اور دکانوں کو آگ لگنے پر وہ پھنس گئے۔ یہ سب کارستانی مجسٹریٹ چیمہ کی تھی۔"

سلیمان چیمہ

"حاجی عبدالرحمان سے انٹرویو کے بعد ہم نے مجسٹریٹ چیمہ سے متعلق مواد کی تلاش شروع کر دی۔ مجسٹریٹ عرصہ پہلے انتقال کر چکا تھا لیکن ہم نے سنا کہ اس کا بیٹا سلیمان چیمہ لاہور میں رہتا ہے لیکن ان دنوں وہ امریکہ میں مقیم تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے بھارت سمیت مختلف مقامات پر 20 سے زائد انٹرویوز میں ہر شخص نے مجسٹریٹ ایم جی چیمہ کا نام ضرور لیا۔ کئی ماہ بعد 13 اکتوبر 2005 کو بالآخر میں سلیمان چیمہ سے فون پر رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ تقسیم کے بعد پیدا ہوا تھا لہٰذا اسے ان دنوں کا ذاتی طور پر کچھ پتہ نہیں۔ البتہ اس نے اس بات کی تصدیق ضرور کی کہ ہندوؤں اور سکھوں نے اس کے والد کے سر کی قیمت سوا لاکھ روپے مقرر کی تھی۔ اس کے والد نے انہیں کبھی نہیں بتایا کہ وہ شاہ عالمی کو جلا کر راکھ کرنے کے واقعے میں ملوث تھا۔ اس کی بجائے سلیمان چیمہ نے بتایا کہ بہت عرصہ پہلے کوئی بھارت سے اسے ملنے آیا اور اس بات پر شکریہ ادا کیا کہ مجسٹریٹ چیمہ نے ان کے خاندان کو بحفاظت بھارت منتقل ہونے میں مدد کی۔"

ایک سکھ چیمہ آج بھی اپنے والد کا منتظر ہے

2006 میں مجھے ایک سکھ کی ای میل موصول ہوئی جس نے لاہور کے اخبار ڈیلی ٹائمز میں میرے فلمساز راما نند ساگر سے متعلق آرٹیکل پڑھ کر مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ ای میل میں اس نے انکشاف کیا کہ وہ اور راما نند دونوں لاہور کے علاقے مزنگ میں رہتے تھے۔ (بدقسمتی سے ای میل میرے پاس اب نہیں لیکن اس کے پیغام نے مجھے بہت متاثر کیا)۔ مجھے اس میل کے جو مندرجات یاد ہیں وہ میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔ اس سکھ نے مجھے لکھا: "کیا آپ مجھے میرے والد کی تلاش میں مدد دے سکتے ہیں؟ آپ کو بتاؤں کہ ہم نے تقسیم کے بعد لاہور ہی میں رہنے کی کوشش کی تھی جہاں ہمارا ادویات بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ ہم نے واہگہ کے راستے بھارت جانے کی کوشش کی لیکن وہ بہت خطرناک ہوتا لہٰذا ہم واپس آ گئے۔ میرے والد مزنگ گئے تاکہ ایک مسلمان مجسٹریٹ جو ہماری طرح چیمہ جاٹ تھا کی مدد حاصل کر سکیں لیکن وہ کبھی واپس نہ آئے۔ میں ان دنوں گیارہ سال کا تھا اور اب میری عمر ستر سال ہے۔ میں آج بھی اپنے والد کی واپسی کا منتظر ہوں۔ میں صرف یہ جاننا

چاہتا ہوں کہ والد صاحب کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا۔ کیا آپ میری کوئی مدد کر سکتے ہیں۔" میں نے اسے جواب میں لکھا کہ آپ کو یہ حقیقت مان لینی چاہیے کہ اگر اتنے برسوں تک آپ کے والد واپس نہیں آئے تو یقیناً مجسٹریٹ چیمہ سے ملنے کی کوشش میں انہیں ہلاک کر دیا گیا ہو گا۔ مجھے یہ سوچ کر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ جس چیمہ مجسٹریٹ کا یہ سکھ ذکر کر رہا تھا کیا وہ وہی ایم.جی چیمہ تھا؟

سکندر لال بگا

3 دسمبر 2005 کو میں نے ایک معمر شخص سکندر لال بگا کا دہلی میں انٹرویو کیا۔ اس نے مجھے اس بات کی وجہ بتائی کہ مجسٹریٹ چیمہ آخر ہندوؤں کے خلاف کیوں ہو گیا تھا۔ ایم.جی چیمہ لاہور میں سٹی مجسٹریٹ تھا۔ 1947 میں کرشن نگر کے ہندوؤں نے اسے اپنے علاقے میں تحقیقات کرنے سے روک دیا بلکہ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر وہ دوبارہ وہاں گیا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس پر ایک قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا تاہم وہ محفوظ رہا۔ بعد میں 3 جون 1947 کے اعلان آزادی کے بعد جب فسادات اور پر تشدد واقعات میں تیزی آ گئی اور ہندوؤں کی مزاحمت دم توڑ گئی تو مجسٹریٹ چیمہ اپنا انتقام لینے سامنے آ گیا۔

بہر حال وقوعہ کچھ بھی ہوا ہو لیکن عبدالرحمان گل کے انٹرویو سے شاہ عالمی کو آگ لگانے کی سازش میں مقامی بااثر افراد، پولیس، دیگر سرکاری عہدیداروں اور سیاستدانوں کا گٹھ جوڑ ضرور بے نقاب ہوتا ہے۔ معروف اردو ادیب احمد بشیر جو خود لاہور کے فسادات کے عینی شاہد تھے سے اپریل 2003 میں انٹرویو کیا گیا، انہوں نے ایسے کئی واقعات بیان کیے جن کا ذکر انہوں نے اپنے ناول 'دل بھٹکے گا' میں بھی کیا کہ کس طرح لاہور کے بدمعاشوں نے پولیس اور مسلم لیگی عہدیداروں کی پشت پناہی سے شہر میں لوٹ مار کی (2003: 313)۔ حقیقت میں ایسے گٹھ جوڑ کے بغیر نسلی قتل عام ممکن نہیں تھا۔

ایک طرف پنجاب جل رہا تھا اور لوگ سنگین خطرات اور اچانک حملوں میں اپنی زندگی بچانے میں لگے ہوئے تھے تو دوسری جانب پنجاب اسمبلی مشرقی اور مغربی بلاک کے ارکان کا 23 جون کو اجلاس ہوا تا کہ تقسیم کے معاملے پر کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ کتاب 'ٹرانسفر آف پاور' جلد XI میں خبر رساں ادارے رائٹر کی رپورٹ کے حوالے سے اس صورتحال کا احاطہ کیا گیا ہے:

> جس وقت پورے پنجاب کے سینکڑوں دیہات اور لاہور کے بڑے حصے میں آگ تباہی مچا رہی تھی، اس وقت پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے 168 ارکان ایوان میں قہقہے لگا رہے تھے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر لطیفے سنا رہے تھے۔ یہ لوگ اس بات کا فیصلہ کرنے والے تھے کہ پنجاب کو تقسیم ہونا چاہیے یا نہیں۔ اسمبلی کی طرف جانے والے راستوں کو خاردار تار لگا کر بند کر دیا گیا تھا اور ارد گرد پولیس کی بھاری نفری تعینات تھی۔ عوام کو اجلاس کے موقع پر داخلے کی اجازت نہیں تھی البتہ مقامی اور غیر ملکی صحافی پریس گیلری میں براجمان تھے (Mansergh and Moon,1981:466-7)۔

ٹربیون نے 25 جون کو خبر دی کہ 4 مارچ 1947 سے پنجاب میں فسادات کے دوران 3 ہزار 749 افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لوہاری گیٹ کے باہر ستلا مندر کے قریب مجسٹریٹ کی قیادت میں پولیس پارٹی پر دستی بم

پھینکا گیا لیکن کوئی ہلاک یا زخمی نہیں ہوا۔ 2004 میں مجھے دہلی میں لاہور کے سابق ڈپٹی مجسٹریٹ مسٹر ہری دیو شوری سے بات چیت کا موقع ملا۔ لاہور میں ہونے والے حملے کے حوالے سے انہوں نے مجھے بتایا کہ "میں اور پولیس کے دیگر اہلکار گشت کے دوران اندرون لوہاری گیٹ سے گزر رہے کہ اس دوران کسی نے ستلا مندر کے قریب ہم پر بم پھینکا۔ خوش قسمتی سے وہ کچھ فاصلے پر گر کر پھٹ گیا اور کوئی زخمی نہ ہوا۔ جب ہم بیرون لوہاری گیٹ میں واقع پارک کے قریب پہنچے تو انسانوں کا ایک خوفزدہ سمندر حملوں سے بچنے کے لیے محفوظ پناہ کی تلاش کر رہا تھا۔ یہ سب ہندو اور سکھ تھے۔ یہ لوگ لاہور ریلوے سٹیشن جانے کے لیے ٹرانسپورٹ تلاش کر رہے تھے۔ تانگے والے منہ مانگا کرایہ وصول کر رہے تھے۔ میں نے وہاں صورتحال کنٹرول کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران مجسٹریٹ محمد غنی چیمہ اپنی پولیس فورس کے ساتھ وہاں آیا اور مجھے (چونکہ وہ علاقہ مجسٹریٹ تھا) وہاں سے جانے کو کہا۔ یہ روح فرسا صورتحال تھی۔ خوفزدہ مرد، خواتین اور بچے امداد مانگ رہے تھے لیکن کوئی ان کی سننے کے لیے وہاں موجود نہیں تھا۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ بعض ڈوگرہ فوجی وہاں آئے جنہوں نے صورتحال کو قابو میں کیا۔ کئی ہندو اور سکھ جون کے آخر تک لاہور چھوڑ کر جا چکے تھے تاہم جہاں ان کی اکثریت تھی وہاں وہ کچھ غیر مسلم بعد تک مقیم رہے۔ اونچی کلاس کے علاقوں جیسا کہ ماڈل ٹاؤن، میں صورتحال وسط اگست 1947 تک بھی پر سکون رہی۔ اس کے بعد وہاں بھی حملے پھیل گئے چنانچہ ہم سب نے لاہور کو خیرباد کہہ دیا۔"

مسلم لیگ، کانگریس اور اکالی پارٹی پنجاب کے رہنماؤں کا اجلاس 23 جون کو لاہور میں ہوا تاکہ تیزی سے پھیلے فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پانے کی حکمت عملی تیار کی جا سکے۔ (Pakistan Times, 25 June)۔ پھر 26 جون کو ان کا ٹاؤن ہال میں دوبارہ اجلاس ہوا جس میں امن کی بحالی پر غور وخوض کیا گیا۔ (Pakistan Times, 27 June)۔ ٹریبون نے 27 جون کو رپورٹ دی کہ گڑگاؤں، مغربی پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ سے 75 ہزار پناہ گزین دہلی آئے۔ اگلے روز کے شمارے میں اخبار نے بتایا کہ لاہور میں 26 غنڈہ گرد عناصر گرفتار ہوئے ہیں اور مختلف مذاہب کے رہنماؤں کی امن کی اپیل کے مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یوں لاہور کی سڑکیں اور گلیاں پر سکون تھیں لیکن شاہ عالمی کی آگ نے لاہور سے نقل مکانی کے رجحان کو تقویت دی تھی۔ قائم مقام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ولیمز نے بتایا کہ "شہر کی صورتحال پر سکون ہے" (Tribune, 28 June)۔ 30 جون کو دی ٹریبون نے بتایا کہ یوپی کے وزیر اعلیٰ پنڈت گوند بلابھ پنت نے انکشاف کیا ہے کہ ایک لاکھ مہاجرین (سکھ اور ہندو) ان کے ضلع میں مقیم ہیں۔ 30 جون کو جالندھر کے قریبی گاؤں منڈالی میں پے در پے کئی دھماکے ہوئے جس میں کوئی ہلاک تو نہیں ہوا البتہ 100 افراد زخمی ہوئے۔ یہ دھماکہ ایک مزار پر عرس کے دوران ہوا۔

25 جون کو وائسرائے کو ارسال کی گئی ایک خصوصی رپورٹ میں گورنر جینکنز نے پنجاب میں بدامنی کی خراب صورتحال کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ دیگر پہلی رپورٹوں کی طرح اس میں بھی زیادہ توجہ لاہور اور امرتسر پر مرکوز کی گئی ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ جلاؤ گھیراؤ کے بیشتر واقعات کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ تھا۔ جون کے اواخر تک ہندو اور سکھ بم پھینکنے کے واقعات میں زیادہ متحرک نہیں تھے لیکن صورتحال بدلنے ضرور لگی تھی۔ گورنر نے سبزی منڈی کے مسلم اکثریتی علاقے میں 21 جون کو بم پھینکنے اور 22 جون کی رات شاہ عالمی میں آگ لگانے کے واقعے میں دلچسپ تعلق ظاہر کیا ہے، انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ شاہ عالمی میں آگ انتقام کے طور پر لگائی گئی (Carter, 2007b: 100)۔

اس کے علاوہ جینکنز نے یہ بھی اعتراف کیا کہ امن وامان برقرار رکھنے کے ذمہ دار افسر غیر جانبدار نہیں رہے۔ جنہوں نے غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی ان پر جارحیت پسند گروپوں اور ان کے لیڈروں نے جانبداری کا الزام لگادیا۔ انہوں نے کہا کہ سیاسی تنظیمیں بھی اشتعال انگیزی میں ملوث تھیں۔ مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے کرائے کے حملہ آوروں کو استعمال کیا گیا۔ ایک ہندوستانی عیسائی اور شمالی ہندوستان کے بعض مزدور ہندوؤں کو ہندو املاک نذر آتش کرنے کے لیے رقم دی گئی۔ اس طرح بم پھینکنے کے واقعات میں آر ایس ایس کا ہاتھ تھا۔ کئی معزز ہندو اس کی تنظیموں کے سربراہ تھے۔ البتہ گورنر کی ایڈوائس پر پنجاب کے سرکردہ لیڈروں نے امن کی اپیل کی جس کا فوری اثر ہوا اور لاہور میں جون کے اختتام پر صورتحال کافی بہتر ہو گئی (Ibid: 98-101) تاہم امرتسر کے مسلمانوں میں یہ تاثر جڑ پکڑ رہا تھا کہ 'انہیں ہجرت سے پہلے جتنا ممکن ہے نقصان پہنچانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے' (Ibid: 100)۔

30جون کو اپنی رپورٹ میں گورنر نے بتایا کہ صورتحال میں نمایاں بہتری آئی ہے لیکن صورتحال اب بھی کافی بدتر تھی۔ امرتسر اور لاہور کے علاوہ زیادہ خراب حالات گڑگاؤں میں دیکھے گئے۔ جالندھر اور ہوشیارپور کے علاقوں میں بھی فرقہ وارانہ تصادم کے واقعات رونما ہوئے (Ibid: 110-11)۔

انٹرویوز

بی آر چوپڑا، ممبئی 4 جنوری 1999

یوراج کرشن، دہلی 21 اکتوبر 1999

ڈاکٹر جگدیش سرن، دہلی 24 اکتوبر 1999

مشتاق احمد، سٹاک ہوم 12 اپریل 2002

دینا ناتھ ملہوترا، نئی دہلی 15 مارچ 2004

وِمل ایسار، نئی دہلی 13 مارچ 2004

ہری دیو شورائی، نئی دہلی 16 مارچ 2004

مستنصر حسین تارڑ، لاہور 17 دسمبر 2004

کلب علی شیخ، لاہور 25 دسمبر 2004

حاجی عبدالرحمان گل، لاہور 30 دسمبر 2004، 29 ستمبر، 15 اکتوبر 2005

غلام حیدر، لاہور 13 جنوری 2005

محمد منیر، لاہور 13 جنوری 2005

نمبردار میاں محمد حنیف، لاہور 13 جنوری 2005

میاں محمد شریف، لاہور 14 جنوری 2005

سلیمان چیمہ، لاہور (سٹاک ہوم سے سویڈش وقت کے مطابق 15.35 بجے فون پر) 13 اکتوبر 2005

حکم قریشی لاہور، سکندر لال بگا، دہلی

ڈاکٹر حفیظ احمد (بذریعہ ای میل انٹرویو 16 جنوری 2006)

نوٹ: 1927 میں راج پال کو واجبی سی سزا ملنے پر ہنگامے ہوئے۔ 1935 میں مسجد شہید گنج کے تنازعے پر فسادات ہوئے جبکہ 1937 میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے تحت انتخابات منعقد ہوئے۔

References

Bashir, Ahmad, *Dil Bhatkay Ga* (*The Heart will Wander*), Lahore: Ferozsons, (2003).

Iftikhar, K, *Jabb Amritsar Jall Raha Tha* (*When Amritsar was Burning*), Lahore: Khawaja Publishers, (1991).

Kholsa, G. D., *Stern Reckoning,* Delhi: Oxford University Press, (1989).

Talib, S. G. S., *Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab 1947,* New Delhi: Voice of India, (1991).

Official Documents

Carter, Lionel, (ed), *Punjab Politics, 1 June – 14 August 1947, Tragedy, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents,* New Delhi: Manohar, (2007a).

Carter, Lionel, (ed), *Punjab Politics, 3 March – 31 May 1947, At the Abyss, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents,* New Delhi: Manohar, (2007b).

Fortnightly Reports (*on microfilm*) *of Punjab Chief Secretary*: IOR L/P & J/5/250.

Newspapers

The Pakistan Times, Lahore, 1947.

The Tribune, Lahore, 1947.

12

تقسیم کے عمل کا طریقہ کار، یکم جولائی - 14 اگست 1947

پنجاب پارٹیشن کمیٹی کا اجلاس یکم جولائی کو ہوا۔ صدارت گورنر نے کی جبکہ 4 ارکان میں مغربی پنجاب کے دو نمائندے ممتاز دولتانہ اور زاہد حسین جبکہ مشرقی پنجاب کے نمائندے ڈاکٹر گوپی چند بھرگاوہ اور سردار سورن سنگھ شامل تھے۔ کمیٹی کے اجلاس کا بڑا ایجنڈا تقسیم کے منصوبے پر عملدرآمد یقین بنانے کے لیے مشینری کا تعین کرنا تھا۔ کمیٹی اور کئی حکومتی محکموں کے درمیان رابطے کے لیے ایک سٹیئرنگ کمیٹی بنائی گئی جس کے ارکان میں ایک مسلمان سید یعقوب شاہ اور دوسرا ہندو ایم آر سچدیو شامل تھے۔ اسی طرح ہر محکمے میں ایک سینئر مسلمان اور ایک غیر مسلم افسر کا انتخاب کیا گیا جنھوں نے محکمانہ کمیٹیاں تشکیل دینا تھیں۔ اوائل جولائی میں غالباً بعض برطانوی سول سرونٹس نے پنجاب کو متحد رکھنے کی آخری کوشش کی لیکن وہ بھی ناکام رہے۔ یہ بیڑا ریاست بہاولپور میں بطور وزیر کام کرنے والے انگریز افسر سر پینڈرل مون اور سکھوں سے ہمدردی رکھنے والے انگریز میجر شارٹ نے اپنے سر اٹھایا۔ میجر شارٹ ان دنوں اگرچہ برطانیہ میں تھا لیکن وہ سکھوں سے متعلق معاملات پر سکھ لیڈروں اور پینڈرل مون کے ساتھ بذریعہ خط وکتابت مستقل رابطے میں تھا۔ ان دونوں انگریز افسروں نے مسلم لیگ اور سکھوں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ صوبے کو متحد رکھنے پر متفق ہو جائیں لیکن سکھوں کو وسطی پنجاب کے کچھ اضلاع میں خود مختاری دینے اور پاکستان کے دیگر صوبوں میں بھی ایسی ہی حیثیت دینے کے پیشکش کے باوجود جہاں سکھ مسلم لیگی قیادت سے بدگمان تھے وہاں مسلم لیگی رہنما بھی سکھوں کے خدشات میں کمی نہ لا سکے۔ سر پینڈرل مون کو ایک ممتاز سکھ لیڈر جس کا نام انہوں نے صیغہ راز میں رکھا سے کورا جواب ملا جبکہ جناح کا رویہ بھی اس کے بقول کچھ مختلف نہیں تھا (Mansergh and Moon,1982: 454-55)۔

جناح کا گورنر جنرل پاکستان بننے کا اعلان

ہندوستان کی تقسیم کے آخری مراحل میں جو واقعات پیش آئے ان میں جناح کی طرف سے ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا گورنر جنرل تسلیم کرنے سے انکار سب سے نمایاں سیاسی پیشرفت تھی۔ وائسرائے کی پرسنل رپورٹ نمبر 11 مورخہ 4 جولائی 1947 میں اس حوالے سے تفصیل دی گئی ہے۔ عام تاثر یہ پایا جاتا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن پاکستان اور بھارت دونوں کے مشترکہ گورنر جنرل ہوں گے لیکن جناح نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ جواب دے کر ششدر کر دیا کہ جہاں سندھ کے سوا تمام صوبوں میں انگریز گورنر اور مسلح افواج کے سربراہ بھی انگریز برقرار رہیں گے وہاں وہ خود پاکستان کے گورنر جنرل بنیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے بہت کوشش کی کہ جناح کو اس بات پر قائل کر سکیں کہ دولت مشترکہ میں پاکستان اور بھارت کے ایک گورنر جنرل ہونے کے کتنے فوائد ہوں گے۔ ان فوائد میں تقسیم کا عمل منصفانہ ہونا بھی شامل تھا تاہم محمد علی جناح ڈٹے رہے (Ibid: 839-

42)۔اس مؤقف پر تلملا کر ماؤنٹ بیٹن نے انہیں خبر دار کیا کہ "کیا آپ کو اندازہ ہے کہ اس کی آپ کو کتنی قیمت ادا کرنا پڑے گی؟" محمد علی جناح نے جواب دیا "شاید اثاثہ جات کی تقسیم میں کئی کروڑ روپے کا نقصان ہو گا۔"ماؤنٹ بیٹن نے آگے سے کہا کہ "نہیں اس فیصلے کی قیمت تمام اثاثوں (یعنی پاکستان کے حصے) سے ہاتھ دھونا اور پاکستان کا مستقبل داؤ پر لگانا بھی ہو سکتی ہے"(Ibid: 899-900)۔

محمد علی جناح کی طرف سے ماؤنٹ بیٹن کو بطور گورنر جنرل مسترد کرنے کا فیصلہ کافی متنازع حیثیت کا حامل ہے۔ایسا ممکن ہے کہ انہیں ماؤنٹ بیٹن پر اعتبار نہ ہو چنانچہ انہوں نے گورنر جنرل کا طاقتور عہدہ انہیں دینے سے گریز کیا۔ماؤنٹ بیٹن نے اس کی ایک اور توجیہہ پیش کی:

میں نے انہیں (جناح کو) بتایا کہ اگر وہ آئینی گورنر جنرل بننا چاہتے ہیں تو ان کے اختیارات محدود ہوں گے لیکن بطور وزیر اعظم وہ پاکستان کے تمام امور چلا سکیں گے۔اس پر انہوں نے واضح کیا کہ ان کا وزیر اعظم وہی کرے گا جو میں (بطور گورنر جنرل) کہوں گا۔میرے مشورے پر ہر کسی کو عمل کرنا پڑے گا(Ibid: 898-99)۔

ممتاز پاکستانی صحافی حمید اختر (مرحوم) کی رائے یہ تھی کہ "جناح کا فیصلہ غلط تھا"۔ تقسیم کے عمل کے دوران ہونے والے زیادہ تر فسادات دونوں ملکوں کی مشترکہ قیادت نہ ہونے کا نتیجہ تھے۔یہی صورتحال پنجاب کی تقسیم کے عمل میں سامنے آئی۔میں (مصنف) نے خود بھی پاکستان میں کئی افراد کو نجی طور پر یہی رائے دہراتے پایا ہے، اگرچہ کوئی کھلم کھلا قائد اعظم کے فیصلے سے اختلاف نہیں کر سکتا۔پاکستان میں عام رائے یہ پائی جاتی ہے کہ ماؤنٹ بیٹن بھارت نواز تھا، اس لیے اسے 1935 کے ایکٹ کے تحت حاصل طاقتور اختیارات سمیت قبول کرنے سے انکار کر کے دراصل قائد اعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن کا راستہ روکا۔البتہ حقیقت یہ ہے کہ جب یکم اگست 1947 کو ماؤنٹ بیٹن، کانگریس اور مسلم لیگ کی قیادت کا ایک اجلاس ہوا جس میں تقسیم سے متعلق معاملات بالخصوص فوج، اسلحے اور فوجی خدمات کی تقسیم پر بات چیت کی گئی تو وائسرائے نے فوج اور اسلحے کی تقسیم کا فارمولا پیش کیا۔کانگریس نے فارمولے کو اس لیے پسند نہ کیا کیونکہ اس میں بھارت کو 70 فیصد اور پاکستان کو 30 فیصد کے تناسب سے حصہ دیا گیا تھا(Mansergh and Moon,1983: 446-7)۔

دریں اثنا باؤنڈری کمیشن کے چیئر مین سر سیرل ریڈکلف 8 جولائی کو پاکستان آئے۔وہ اس سے پہلے ہندوستان کبھی نہیں آئے تھے۔وہ دہلی سے کلکتہ اور لاہور کے دورے کے لیے 10 جولائی کو روانہ ہوئے۔11 جولائی کو سکھ لیڈروں جتھہ دار موہن سنگھ اور سردار ہرنام سنگھ (انہوں نے بعد ازاں باؤنڈری کمیشن کے روبرو سکھوں کا مقدمہ بھی لڑا) سے انٹرویو میں گورنر جینکنز نے محسوس کیا کہ سکھ اپنی آبادی کا پاکستان سے انتقال چاہتے تھے۔انہوں نے بتایا کہ:

واحد حل آبادی کا بڑے پیمانے پر انتقال تھا۔اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو پھر سکھ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو بے دخل کرنے کے لیے ان کا قتل عام کرنے کی کوشش کریں گے۔ مسلمان پہلے ہی راولپنڈی ڈویژن میں سکھوں سے چھٹکارا پا چکے ہیں اور

وہاں خالی ہونے والی جائیدادیں مشرقی پنجاب سے آنے والے مسلمانوں کے کام آسکتی ہیں۔یہی حکمت عملی سکھ مشرقی پنجاب میں اپناسکتے ہیں اور وہاں مسلمانوں کی خالی املاک مغربی پنجاب سے آنے والے سکھوں کو دے سکتے ہیں(Ibid:103)۔

ایک اور بات دلچسپی کی حامل ہے کہ گورنر کے اسی انٹرویو میں یہ تاثر بھی سامنا آیا کہ سکھ کانگریس اور ہندوؤں کے لیے بھی زبردست شکوک وشبہات رکھنے لگے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ ہندو پنجاب میں سکھوں کا اثرورسوخ ختم کرنے کی کوشش کریں گے چنانچہ وہ یہ منصوبہ بنارہے تھے کہ مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے بے دخل کرکے خالی جائیدادوں پر سکھوں کو ہی آباد کریں تاکہ کانگریس اور ہندوؤں کے عزائم ناکام بنائے جاسکیں۔ 16 جولائی کو سرایوان جینکنز نے باؤنڈری کمیشن کے اجزائے ترکیبی اور تاریخ کے حوالے سے پیشگی معلومات فراہم کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے خط میں لکھا کہ ”احتیاطی اقدامات کرنانہایت ضروری ہیں۔بالخصوص ان علاقوں میں جن کے متاثر ہونے کا امکان ہے۔ خصوصاً مغربی پنجاب میں۔“ انتقال اقتدار کی حتمی آئینی ضرورت پاکستان اور بھارت کی برطانوی دولت مشترکہ کے اندر آزادی کے اعلان کا بل تھا۔

آزادی ہند ایکٹ، 18 جولائی 1947

ماؤنٹ بیٹن آزادی بل پر قومی اور صوبائی سطح کے ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ کافی عرصے سے مشاورت کررہے تھے اور انہیں اس حوالے سے خطوط اور مشاورتی بیانات بھی موصول ہورہے تھے۔ اس بل کے کئی مسودے برطانوی پارلیمنٹ میں بھی زیر بحث آئے۔ ونسٹن چرچل جو ان دنوں اپوزیشن لیڈر تھے نے یکم جولائی کو پارلیمنٹ میں دعویٰ کیا کہ انہوں نے ہندوستان میں انتقال اقتدار مقامی قیادت کو سپرد کرنے کی منظوری دوآزادریاستوں نہیں بلکہ دوریاستوں کے قیام کی شرط پر دی تھی چنانچہ ان کے نزدیک مجوزہ بل کا مناسب نام 'دی انڈین ڈومینین بل 1947' یا پھر 'دی انڈیا سیلف گورنمنٹ بل' ہوگا(Mansergh and Moon,1982: 812-3)۔ البتہ لیبر پارٹی کی حکومت نے بل کا نام ”انڈیا انڈی پینڈنس ایکٹ، 1947' رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اسی نام سے 18 جولائی کو برطانوی پارلیمنٹ میں اس کی منظوری دے دی گئی۔ بل میں کہا گیا کہ ”15 اگست 1947 سے ہندوستان میں دو آزاد ریاستیں وجود میں آجائیں گی جن کے نام بالترتیب انڈیا اور پاکستان ہوں گے“(Mansergh and Moon,1983: 234)۔

پنجاب کے حوالے سے بل میں قرار دیا گیا کہ:

1. متعینہ دن سے:
   (ا) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے تحت صوبہ پنجاب معرض وجود میں آجائے گا۔
   (ب) پنجاب کے دو حصے کیے جائیں گے، ایک مغربی پنجاب اور دوسرا مشرقی پنجاب ہوگا۔
2. دونوں صوبوں کی حدبندی کا تعین باؤنڈری کمیشن کرے گا جو گورنر جنرل تشکیل دے گا لیکن حدبندی ہونے تک:

(أ) اس ایکٹ کے جدول نمبر 2 میں درج کیے گئے اضلاع صوبہ مغربی پنجاب کا حصہ ہوں گے۔

(ب) باقیماندہ علاقے مشرقی پنجاب میں شامل کیے جائیں گے۔

3. اس سیکشن میں لفظ "ایوارڈ" کا مطلب باؤنڈری کمیشن ہوگا۔ اس کمیشن کے چیئرمین کے فیصلے رپورٹ کی شکل میں گورنر جنرل کو پیش کیے جائیں گے(Ibid: 236)۔

آزادی ہندوستان ایکٹ 1947 کے جدول نمبر 2 میں دیئے گئے اضلاع دراصل وہی علاقے ہیں جن کا تعین 3 جون کے تقسیم ہند پلان میں کیا گیا تھا۔ ان میں راولپنڈی اور ملتان ڈویژن کے تمام اضلاع، لاہور ڈویژن کے تمام اضلاع بشمول گورداسپور لیکن امرتسر نہیں شامل تھے۔ لیکن اس سے بھی اہم حقیقت یہ تھی کہ باؤنڈری کمیشن کے چیئرمین کو حد بندی کے ایوارڈ کا اعلان کرنے کا کلی اختیار دیا گیا تھا۔

پنجاب باؤنڈری فورس (پی بی ایف)

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے کہ پنجاب حکومت نے وفاق سے متعدد بار بدامنی کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے مزید فوجی دستے بھجوانے کی درخواست کی تھی لیکن دہلی حکومت نے صاف صاف جواب دیا کہ مزید دستے دستیاب نہیں لیکن اب جبکہ پنجاب کو تقسیم کیا گیا تھا تو ماؤنٹ بیٹن نے محسوس کیا کہ ممکنہ آتش فشانی صورتحال سے نمٹنے کے لیے مسلح دستوں کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ بنگال کو خصوصی مسلح دستوں کی ضرورت نہیں، البتہ پنجاب کو ضرورت ہے۔ 17 جولائی کو پارٹیشن کونسل نے پنجاب باؤنڈری فورس (پی بی ایف) کے قیام کی منظوری دے دی۔ برطانوی فوج کی چوتھی ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل ریس (Rees) اس فورس کے انچارج مقرر کیے گئے جو 7 یا 8 اگست سے پنجاب کے متاثرہ علاقوں میں ذمہ داریاں سنبھالنے والی تھی۔ اس مقصد کے لیے کسی قانون میں تبدیلی کی ضرورت اہم نہ سمجھی گئی(Ibid: 206-7)۔

شروع میں سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور، منٹگمری، لاہور، امرتسر، گورداسپور، ہوشیارپور، جالندھر اور فیروزپور کے اضلاع کو گڑبڑ والے علاقے قرار دیا گیا۔ جنرل ریس کے زیر کمان 5 انفنٹری بریگیڈ اور ایک آرمرڈ بریگیڈ تھا۔ آرمرڈ بریگیڈ کے ٹینکوں کو تمام متاثرہ علاقوں میں پھیلا دیا گیا(Ibid: 272)۔ بعد ازاں پارٹیشن کونسل کے اجلاس میں غور و خوض کے بعد لدھیانہ کو بھی متاثرہ علاقوں میں شامل کر لیا گیا۔ جنرل ریس کی مشاورت کے لیے بھارت سے بریگیڈیئر ڈگمبر سنگھ برار اور پاکستان سے کرنل ایوب خان کی تعیناتی عمل میں لائی گئی(Ibid: 326-7)۔ یوں مجموعی طور پر لاہور اور جالندھر ڈویژن کے 12 اضلاع کی نگرانی پی بی ایف کے سپرد کی گئی۔ پی بی ایف کو پہلے سے طے شدہ تاریخ تعیناتی میں تبدیل کرتے ہوئے 7 سے 8 اگست کی بجائے یکم اگست کو پوزیشن سنبھالنے کی ہدایت کی گئی۔ 14 اگست کے بعد باقاعدہ فوج کو آپریشنل سرگرمیوں کی اجازت نہیں تھی۔ پی بی ایف کی ہر یونٹ میں انگریز افسروں کو موجود رہنے کا حکم دیا گیا(Ibid: 404)۔

جن علاقوں میں گڑبڑ جاری تھی ان کا رقبہ سکاٹ لینڈ اور ویلز کے مجموعی رقبے سے بھی زیادہ تھا۔ ان میں 37 ہزار 500 مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلے 26 شہر اور 17 ہزار دیہات شامل تھے۔ جینکنز نے 8 اگست کو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ پی بی ایف کے پاس صرف 5 بریگیڈ نفری ہے۔ جن کے پاس اوسطاً 1500 کارآمد رائفلیں موجود ہیں۔ اس طرح پولیس کے علاوہ مجموعی

نفری کی تعداد 7500 بنتی ہے۔ 1500 دیگر افراد کو معمولی تربیت کے ساتھ تیار کیا جا سکتا ہے۔ یوں 12 اضلاع کی ایک کروڑ 20 لاکھ کی آبادی پر کنٹرول کے لیے صرف 9 ہزار سکیورٹی اہلکار دستیاب ہوں گے۔ گورنر نے جنرل ریس کی طرف سے مزید دستے فراہم کرنے کی درخواست کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ ممکن ہو تو فضائی نگرانی کے لیے ایک سکواڈرن یا محض چند طیارے ہی فراہم کر دیے جائیں (Carter, 2007b: 219)۔

9 اگست کو وائسرائے کی 69ویں سٹاف میٹنگ میں مزید فوجی دستوں اور طیاروں کی فراہمی کی درخواست پر غور کیا گیا اور کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل آکن لیک کی رائے لی گئی۔ چونکہ پی بی ایف کے تمام یونٹوں میں ہر مذہب کے اہلکار شامل تھے اس لیے سکھ اہلکاروں کی وفاداری پر شک و شبے کا اظہار کیا گیا۔ (Mansergh and Moon, 1983: 611-2)

اپنے 12 اگست کے ٹیلی گرام میں جینکنز نے بتایا کہ "پنجاب باؤنڈری فورس کی تعداد موجودہ اور مستقبل کی ذمہ داریاں انجام دینے کے لیے کافی نہیں اور میں پہلے بھی اس حوالے سے گوش گزار کر چکا ہوں" (Carter, 2007b: 226)۔ اگلے روز گورنر نے پی بی ایف کے سپرد کی گئی ناممکن ذمہ داری کی مزید تفصیل بیان کی ہے۔ انہوں نے قبل ازیں لگائے گئے تخمینے کی تصحیح کرتے ہوئے کہا کہ 12 متاثرہ اضلاع کی آبادی دراصل 14.5 ملین ہے اور 17 ہزار 932 قصبوں اور دیہات کی نگرانی کے لیے صرف 9 ہزار سکیورٹی اہلکار دستیاب ہیں (Ibid: 230-1)۔ 14 اگست کو چیف آف جنرل سٹاف سر آرتھر سمتھ نے وائسرائے کے پرسنل سیکرٹری سر جارج ایبل کو لکھا کہ بھارت اور پاکستان دونوں ملک ایک ہفتے کے اندر 3، 3 بٹالین فورس فراہم کریں گے (Mansergh and Moon, 2007b: 721)۔ آکن لیک نے 15 اگست کو لکھا: "مزید 2 بریگیڈ نفری (پاکستان اور بھارت دونوں سے ایک ایک بریگیڈ فوج ملی) پنجاب باؤنڈری فورس کے لیے بھیجی جا رہی ہے تاہم فورس کی کوئی بھی تعداد سرحد کے دونوں طرف جاری بلاامتیاز قتل عام روکنے کے لیے کافی نہیں" (Ibid: 736)۔

اگرچہ پی بی ایف کے انچارج جنرل ریس کو عموماً غیر جانبدار قرار دیا جاتا ہے لیکن ان کی زیر کمان فورس میں شامل اہلکار فرقہ واریت میں ملوث پائے گئے۔ کرپال سنگھ دعویٰ کرتے ہیں کہ مکمل طور پر مسلمانوں پر مشتمل بلوچ رجمنٹ نے شیخوپورہ میں ہندوؤں اور سکھوں کے قتل عام میں حصہ لیا (Ibid)۔ رابن جیفری نے اس موضوع پر جو تحقیق کی ہے اس سے اس الزام کی تائید ہوتی ہے۔ شیخوپورہ اور مشرقی پنجاب میں اس حوالے سے ذاتی تاثرات آگے جا کر بیان کیے جائیں گے۔ فی الحال اتنا کہنا کافی ہے کہ پی بی ایف کو 31 اگست 1947 کی رات کو توڑ دیا گیا۔ یہ فیصلہ دہلی میں پاکستان اور بھارت دونوں حکومتوں کی جوائنٹ ڈیفنس کونسل کے اجلاس میں کیا گیا۔ اس کے بعد سے بھارت اور پاکستان نے سرحد کے دونوں طرف نگرانی کے لیے مشترکہ یونٹ تشکیل دیے۔ جن کا کام مہاجرین کے قافلوں کو سکیورٹی فراہم کرنا اور لوگوں کی زندگی بچانا تھا۔

پنجاب باؤنڈری کمیشن کی کارروائی

پنجاب کی تقسیم کے لیے قائم کی گئی کوئی بھی کمیٹی یا کونسل اتنی اہمیت کی حامل نہیں جتنا کہ پنجاب باؤنڈری کمیشن اہم تھا۔ جیسے ہی کمیشن کے قیام کا اعلان ہوا تو تمام فریق اپنے اپنے دعوؤں کے حق میں دلائل دینے کی تیاری میں جت

گئے۔ دونوں فریقوں (پاکستان اور بھارت) نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ کمیشن کا ہر فیصلہ قبول کریں گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کیا کہ وہ بحیثیت وائسرائے یا گورنر جنرل کمیشن کی کارروائیوں یا ایوارڈ کے نتائج میں مداخلت نہیں کریں گے۔ باؤنڈری کمیشن کی کارروائیوں سے متعلق سرکاری دستاویزات اور مسودے معلومات کا مسحور کن ذریعہ ہیں۔ چار جلدوں پر مشتمل 'دی پارٹیشن آف پنجاب 1947' (مطبوعہ 1993) میں خطوط، ٹیلی گرام، درخواستیں، سیاسی جماعتوں، انکے مقامی لیڈروں اور ترجمانوں کے بیانات، سرکاری افسروں، آزاد ریاستوں کے حکمرانوں، وزراء کی آراء، تحریری یادداشتوں اور کسی فریق کے وکیل کی پریذنٹیشن کی تفصیل دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں کمیشن کے ارکان کے ریمارکس بھی شامل ہیں۔

اوپر بیان کی گئی تصنیف کی 4 جلدوں کی روشنی میں تیار کی گئی ایک اور تدوین The 1947 Partition of the Punjab: Arguments put forth before the Punjab Boundary Commision by the Parties Involved کے تھکا دینے والے مطالعے کے بعد میں نے نیچے اس کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ پنجاب باؤنڈری کمیشن کے چیئر مین انگریز قانون دان سر سیرل ریڈ کلف تھے جبکہ ارکان میں سے 2 ججوں جسٹس دین محمد اور جسٹس محمد منیر کو مسلم لیگ نے اسی طرح جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیج سنگھ کو کانگریس نے نامزد کیا۔ کمیشن کا اجلاس 21 جولائی سے 31 جولائی کے درمیان مسلسل 10 روز لاہور میں ہوا۔ (27 جولائی کو اتوار کی چھٹی کی وجہ سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی)۔ اگرچہ چیئر مین نے کسی اجلاس میں شرکت نہیں کی تاہم اس بات کا انتظام کیا گیا کہ کارروائی کا ریکارڈ دہلی میں انہیں بھجوایا جائے۔

"دیگر عوامل" پر تنازع

اگرچہ سرحدوں کی حد بندی کے عمل میں مرکزی نکتہ مسلمان اور غیر مسلم علاقوں کی تقسیم تھا لیکن کمیشن کی تشکیل کی شرائط میں "دیگر عوامل" کی شمولیت نے بحث کے دائرہ کار میں نمایاں حد تک توسیع کر دی۔ بحث مباحثے میں ناگزیر طور پر تاریخی، مذہبی، جغرافیائی، سماجی اور معاشی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ مسلم اکثریت والی راولپنڈی ڈویژن پاکستان کو دینے اور غیر مسلموں کی زیادہ آبادی والی انبالہ ڈویژن بھارت میں شامل کرنے پر کسی فریق کو اعتراض نہیں تھا۔ اصل تنازع لاہور، ملتان اور جالندھر ڈویژن کے بعض علاقوں کی تقسیم پر تھا (Ahmed,1999: 23)۔ فریقین کے وکلا نے کمیشن کے روبرو تحریری یادداشتیں جمع کرائیں اور زبانی دلائل بھی دیے۔

کانگریس کا مقدمہ

ایم سی سیٹلواڈ M.C. Setalvad نے ان دلائل کے ساتھ بریفنگ کا آغاز کیا کہ پنجاب باؤنڈری کمیشن کا ضابطہ کار یہ ہے کہ وہ کئی فریقوں کے دعوؤں کا دو پہلوؤں سے جائزہ لے۔: اول یہ کہ آبادی کی اکثریت کے لحاظ سے سرحدوں کا تعین کیا جائے اور دوم 'دیگر عوامل' other factors کو بھی مد نظر رکھا جائے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ "باہم متصل دو الگ

علاقوں کی اصطلاح کی تشریح 'بڑی اکائی' کے طور پر کی جانی چاہیے۔ اس کا مطلب چھوٹے یونٹ کے طور پر نہیں لینا چاہیے۔ یہ مختلف علاقوں کے حساب سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ 'دیگر عوامل' کی کم اہمیت ہے اور نہ ہی یہ قرار دینا چاہیے کہ یہ مقامی نوعیت کے نتائج کی شکل میں سامنے آئے ہیں" (Ibid:124)۔ انہوں نے کہا کہ:

> یہ بات انتہائی ناقابل فہم ہے کہ اگر یہ معاملہ صرف متصل اکثریتی علاقوں سے متعلق ہے تو کمیشن کو درکار ذمہ داری اتنی اہمیت اور وزن کے ساتھ نہیں سونپی گئی۔ ایسی صورت میں مردم شماری کے اعداد و شمار کے ساتھ ایک نقشہ کھینچا جا سکتا ہے اور کوئی ڈپٹی کمشنر متصل اکثریتی علاقوں کی بنیاد پر حد بندی کر سکے گا (Ibid)۔

جہاں تک 1941 کی مردم شماری کے اعداد و شمار پر انحصار کا تعلق ہے تو ایم سی سیٹلواڈ نے دعویٰ کیا کہ جب 1911 میں جداگانہ طرز انتخاب متعارف کرایا گیا تھا تو ہر مذہب کے افراد نے زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے کے لیے مختلف علاقوں میں جمع ہونا شروع کر دیا۔ 1941 تک یہ رجحان مضحکہ خیز شکل اختیار کر چکا تھا۔ 'دیگر عوامل' پر زبردست زور دیتے ہوئے انہوں نے دعویٰ کیا کہ مغربی پنجاب کے سابق صحرائی علاقوں، لائل پور اور منٹگمری کے نہری علاقوں کو زیادہ تر مشرقی پنجاب اور وسطی پنجاب سے تعلق رکھنے والے افراد نے آباد کیا جنہیں ان علاقوں میں زمینیں الاٹ کی گئی تھیں۔ ان کالونیوں میں زیادہ تر سکھ جاٹوں کو ترجیح دی گئی۔ ان جاٹوں نے بڑے پیمانے پر زمینوں کی ملکیت حاصل کرنے کے علاوہ کاروبار اور تجارت بھی شروع کی۔ لہٰذا اگر لائل پور، سرگودھا اور منٹگمری کے اضلاع مغربی پنجاب میں شامل کیے گئے تو کئی سکھ اور ہندو بھارت کو ہجرت کر جائیں گے کیونکہ صوبہ سرحد اور شمالی پنجاب میں ہندو اور سکھ کش فسادات سے پہلے ہی ان میں عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے (Ibid)۔

لاہور

کانگریس کے وکیل نے بھرپور زور دے کر کہا کہ غیر مسلموں کی لاہور میں گہری ثقافتی جڑیں ہیں۔ انہوں نے وہاں کالج اور لائبریریاں تعمیر کروائیں جبکہ ضلع میں ان کے غیر معمولی معاشی مفادات بھی ہیں۔ اگرچہ 1941 کی مردم شماری کے اعداد و شمار (جو کانگریس کے نزدیک متنازعہ تھے) کے مطابق لاہور میں مسلمانوں کی آبادی 60.62 جبکہ غیر مسلموں کی تعداد 39.38 فیصد تھی لیکن مسلمان صرف 5لاکھ 81ہزار 235روپے اور غیر مسلم 12لاکھ 63ہزار 830روپے ٹیکس دیتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی ملکیت میں اراضی صرف 5لاکھ 11ہزار 867ایکڑ تھی جبکہ غیر مسلم 11لاکھ 50ہزار 450ایکڑز مین کے مالک تھے (Ibid:127)۔ یوں پنجاب کی تقسیم کے معاشی پہلوؤں کو بھی زیر غور لایا گیا۔ لاہور شہر کے بارے میں انہوں نے دلائل دیے کہ:

> آپ کو لاہور شہر کے بارے میں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ یہاں 1941 کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب بالترتیب 61 اور 39 فیصد اور ضلع لاہور میں 64 اور 36 فیصد ہے۔ لیکن آپ کو پتہ چلے گا کہ زیادہ تر زمین

غیر مسلموں کی ملکیت میں تھی۔ ایک اور فیکٹر متصل فیکٹر ہے جو شہری علاقوں اور بعض مقامات پر دیہات میں نظر آتا ہے۔یہاں پھر ایک بار آپ کو پتہ چلے گا کہ مسلم اکثریتی علاقوں میں بھی صورتحال یہ ہے کہ تجارت، صنعت اور فیکٹریاں سمیت تمام کاروبار تقریباً سب کا سب غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے(Ibid)۔

اپنے دلائل میں انہوں نے یہ بھی قرار دیا کہ ایک اور قابل غور چیز ٹرانسپورٹ اور روڈ سسٹم ہے۔ ایسی کوئی تقسیم قابل قبول نہیں ہوگی جس سے ریلوے اور روڈ کا نیٹ ورک غیر فعال ہو جائے۔ اسی طرح مشرقی پنجاب کے ریلوے نظام کی مرمت کے لیے ضروری ہے کہ لاہور کے نواح میں مغلپورہ ورکشاپس مشرقی پنجاب کے لیے دستیاب ہوں(Ibid)۔لاہور ڈویژن کے بعض دیگر اضلاع کا بھی زمین اور جائیداد کی ملکیت کی بنیاد پر دعویٰ کیا گیا۔

سکھ کمیونٹی اور ننکانہ صاحب کے خصوصی حقوق

سیٹلواڈ نے کمیشن کے روبرو دلائل دیتے ہوئے سکھ کمیونٹی پر اظہار خیال کرتے ہوئے زور دیا کہ سکھوں کی پنجاب کے لیے تاریخی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے صوبے میں حقوق کا خصوصی جائزہ لیا جائے۔ یہ جنگجو قوم ہے اور انگریزوں کی حکومت سے پہلے پنجاب میں سکھ ہی حکمران تھے۔ اس کے بعد انگریزوں کی حکومت میں سکھ نہ صرف بڑی تعداد میں انگریز فوج میں شامل ہوئے بلکہ صوبے کی ترقی کے لیے بھی غیر معمولی کردار ادا کیا۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ 'منطقی اصول' کی بنیاد پر ننکانہ صاحب جو سکھ مذہب کے بانی کی جائے پیدائش ہے وہ مغربی پنجاب میں آتا ہے۔ یہ سکھوں کے لیے ناقابل قبول تھا۔ چنانچہ ایسے ضروری اقدامات کیے جائیں تاکہ سرحدوں کی حد بندی کرتے ہوئے سکھوں کی تاریخ اور ثقافت منقسم نہ ہو(Ibid: 127-8)۔

ضلع گورداسپور

اہم ضلع گورداسپور جو 4 تحصیلوں (گورداسپور، شکر گڑھ، بٹالہ اور پٹھان کوٹ) پر مشتمل تھا کا ذکر کرتے ہوئے سٹیلواڈ نے بتایا کہ 1921 تک گورداس پور میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی۔ البتہ 1931 میں مسلمان 15 ہزار 534 کی تعداد سے اکثریت میں آ گئے جبکہ 1941 میں یہ تعداد 26 ہزار 435 کی اکثریت تک پہنچ گئی۔ یوں 1941 کی مردم شماری کے مطابق گورداسپور میں مسلمانوں کی تعداد 5 لاکھ 84 ہزار 923 تھی جبکہ غیر مسلم 5 لاکھ 63 ہزار 588 تھے۔ اس طرح یہ تناسب 50.6 فیصد مسلمان اور 49.4 فیصد غیر مسلم کا بنتا تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت گویا بہت کم تھی۔ چاروں تحصیلوں میں مذہبی تناسب اس طرح سے تھا۔ تحصیل گورداسپور 50.5 فیصد مسلمان، شکر گڑھ 51.3 فیصد مسلمان، بٹالہ 53 فیصد مسلمان اور پٹھان کوٹ میں 65 فیصد غیر مسلم تھے۔ ہر لحاظ سے 'منطقی تقسیم' کی بنیاد پر گورداسپور ضلع کو مشرقی پنجاب میں شامل ہونا چاہیے۔

سٹیلواڈ نے مؤقف اختیار کیا کہ تجارت اور مواصلات کی بنیاد پر گورداسپور کا ضلع امرتسر سے گہرا تعلق تھا۔ امرتسر گورداسپور کی درآمدات کے لیے کلیئرنگ ہاؤس کا کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ریل اور روڈ کے رابطے ایسے تھے کہ لاہور سے پہلے

سڑک امر تسر آتی تھی اور پھر گورداسپور جاتی تھی۔ وادی کانگڑہ بھی امر تسر اور لاہور سے براستہ گورداسپور منسلک تھی۔ لہذا امر تسر اور گورداسپور کو (قطع نظر آبادی کے تناسب کے) ایک یونٹ سمجھنا چاہیے۔ اس طرح مل کر یہ غیر مسلم اکثریت والا علاقہ بن جاتا تھا اور اسے مشرقی پنجاب میں شامل کر دینا چاہیے۔ گورداسپور کو مشرقی پنجاب میں شامل کرنے پر غور کی ایک اور بڑی وجہ اس کا سکھ تاریخ سے تعلق بتائی گئی۔ کئی مشہور سکھ مزارات گورداسپور میں واقع تھے (Ibid: 129)۔

مشرقی پنجاب کے لیے تجویز کردہ علاقے

کانگریس کی یادداشت میں پنجاب کی تقسیم سے متوقع بڑے پیمانے پر آبادی کی نقل مکانی کی بنیاد پر درج ذیل علاقے مشرقی حصے میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا گیا:

1. پوری انبالہ ڈویژن
2. پوری جالندھر ڈویژن
3. پوری لاہور ڈویژن
4. ضلع لائل پور
5. ضلع منٹگمری
6. ایسے دیگر علاقے جو نہری کالونیوں سے متصل تھے۔

سیٹلواڈ کا موقف تھا کہ ایسی تقسیم سے 37 لاکھ 57 ہزار 401 کی آبادی پر مشتمل مشرقی پنجاب میں 34 لاکھ سکھ ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔

سکھوں کا مقدمہ

سکھوں کے وکیل سردار ہرنام سنگھ نے سٹیلواڈ کے دلائل سے اتفاق کیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ 'دیگر عوامل' کی اہمیت کو مسلم لیگ بھی تسلیم کرتی ہے۔ اگرچہ اس کی بنیادی توجہ باہم متصل مسلم آبادی پر مرکوز تھی۔ اس لیے مسلم لیگ نے غیر مسلم اکثریت والی تحصیل پٹھان کوٹ پر دعویٰ کیا کیونکہ وہاں دریائے راوی پر مادھوپور بیراج واقع تھا جہاں سے اپر باری دوآب کینال نکلتی تھی (Ibid: 131)۔

ہرنام سنگھ نے دلائل دیے کہ سکھ زیادہ تر کاشتکار زمیندار تھے اور مذہبی اور اقتصادی دونوں حوالوں سے پنجاب کی مٹی میں ان کی جڑیں ہیں۔ ایسے افراد کو کسی اور جگہ منتقل کرنا ممکن نہیں۔ دوسری طرف 1931 کی مردم شماری کے مطابق انگریزوں کے زیر انتظام پنجاب میں مسلمانوں کی ایک کروڑ 49 لاکھ 29 ہزار 896 کی آبادی میں سے 46 لاکھ 95 ہزار 957 فقیر، بھکاری، جولاہے، چرواہے، موچی، کمار، مسلی، بڑھئی، تیلی، نائی، میراثی، لوہار، دھوبی اور قصائی تھے۔ یہی وہ افراد ہیں جنہیں آباد کاری

رپورٹوں میں بے زمین اور محروم طبقہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ گھومنے پھرنے والے لوگ ہیں انہیں با آسانی کسی اور جگہ پر منتقل کیا جا سکتا ہے(Ibid:132)۔

پنجاب پر سکھ کمیونٹی کا خصوصی مذہبی ثقافتی دعویٰ

پنجاب میں سکھوں کی خصوصی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے ہرنام سنگھ نے دعویٰ کیا کہ خود مسلم لیگ تک نے اپنی یاداشت میں تسلیم کیا ہے کہ سکھ خصوصی طور پر زیر غور آنے کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا: "میں سمجھتا ہوں کہ از منہ قدیم سے پنجاب کی وسطی ڈویژنیں سکھوں کا وطن رہی ہیں۔ چنانچہ یہ سوال بالکل غیر متعلقہ اور غیر اہم ہے کہ سکھوں کی تعداد کم ہے یا زیادہ۔ اصل میں یہ نکتہ سامنے رکھنا چاہیے کہ ایک مخصوص خطہ یا علاقہ ان کا مسکن ہے"(Ibid:133)۔

اب اگر بھارت ہندوؤں کا وطن ہے اور پاکستان مسلمانوں کا وطن ہے تو پھر دریائے چناب اور بیاس کے درمیان کا علاقہ سکھوں کا وطن ہے۔ (اس موقع پر ہرنام سنگھ نے کئی کتابوں اور سرکاری دستاویزات کا حوالہ دیا جن میں پنجاب کے ماجھے کے خطے جس کا مرکز امرتسر تھا کو سکھوں کا ملک قرار دیا گیا تھا)۔ اس لیے جب ایک علاقے کو کسی کمیونٹی کا وطن قرار دیا گیا ہو تو اس پر اسی کمیونٹی کے حق کو محض اس لیے مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی اور کمیونٹی وہاں اکثریت میں ہے۔ مثال کے طور پر اعلان بالفور Balfour Declaration کے تحت فلسطین کو یہودیوں کا وطن تسلیم کیا گیا تھا حالانکہ وہ 1917 میں وہاں اقلیت میں تھے(Ibid:133)۔ ہرنام سنگھ نے اپنے دلائل میں کہا کہ:

> چنانچہ میں درخواست کرتا ہوں کہ جب آپ اس نکتے پر غور کر رہے ہیں تو سکھوں کی خصوصی حیثیت کو مدنظر رکھا جائے۔ میں ہر مذہب کے متعلقین اور جذبات کا دل کی گہرائی سے احترام کرتا ہوں لیکن میں گزشتہ 2 عشروں سے مسلمان لڑکوں کو یہ پڑھتے سن رہا ہوں "یارب مکہ مدینہ لے چل مجھے"۔ یہ لوگ (مسلمان) مغرب (قبلے) کی طرف دیکھتے رہے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم اجنبی ملک میں رہ رہے ہیں۔ ہمارا کوئی وطن نہیں۔ ہمارا اصل وطن خطہ عرب ہے۔ میں یہ کہہ کر اپنے ہندو بھائیوں کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچا رہا کہ وہ ہردوار اور بنارس کی زیارت کرتے ہیں اور مسلمان مکہ مدینہ کا حج کرتے ہیں لیکن سکھوں کے امرتسر، ننکانہ صاحب، کرتارپور (ضلع گورداسپور، تحصیل شکر گڑھ) شہر ان کے لیے مکہ، مدینہ اور ہردوار اور بنارس ہیں(Ibid)۔

ہرنام سنگھ نے خدشہ ظاہر کیا کہ مسلمان تاریخی پس منظر میں ایک بار پھر مسلمانوں کی کارروائی کا نشانہ بن رہے ہیں۔ انہوں نے کئی کتابوں بشمول تزک جہانگیری کا ذکر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سکھوں کے گوروار جن کے خلاف ریاستی کارروائی کی منظوری دی گئی تھی۔ ان کے دلائل کا لب لباب یہ تھا کہ مسلمان حکمرانوں نے سکھوں کے ساتھ بالعموم جارحانہ رویہ اختیار کیے رکھا(Ibid: 134)۔ دلائل آگے بڑھاتے ہوئے ہرنام سنگھ نے زور دیا کہ سکھ واضح طور پر اس خواہش کا اظہار کر چکے ہیں کہ وہ پاکستان میں نہیں رہیں گے۔ یہ حقائق سکھوں کی یاداشت میں لکھے ہیں جن پر پنجاب اسمبلی کے 33 میں سے 32 ارکان نے دستخط کیے۔ پھر 33 ویں رکن نے بھی بعد میں دستخط کر دیے(Ibid)۔

زبان کا مسئلہ

سکھ وکیل نے دعویٰ کیا کہ پورا پنجاب پنجابی زبان نہیں بولتا۔ کرنال، روہتک، حصار، ڈیرہ غازی خان، عیسیٰ خیل اور میانوالی میں پنجابی نہیں بولی جاتی۔ حتیٰ کہ ملتان میں بھی پنجابی نہیں بلکہ ملتانی زبان بولی جاتی ہے۔ (اب ملتانی کو سرائیکی زبان کہتے ہیں)۔ اسی طرح کانگڑہ میں مختلف زبان بولی جاتی ہے۔ پنجابی صرف پنجاب کے وسطی حصے لاہور، جالندھر ڈویژن اور نہری کالونیوں والے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔

جھنگ، ملتان کے اضلاع اور جہلم کے نواحی علاقے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فتح کر کے پنجاب میں شامل کیے اور انگریز حکومت نے بھی انہیں انتظامی بنیادوں پر برقرار رکھا۔ یوں دہلی کی سرحد سے دریائے جہلم کے کنارے، جھنگ اور ملتان کے اضلاع نکال کر آبادی کا تناسب اس طرح سے تھا۔

مسلمان	ایک کروڑ 7 لاکھ 61 ہزار 560
سکھ اور دیگر (Ibid:134-5)	ایک کروڑ 11 لاکھ 84 ہزار 886

دہلی کی سرحد سے دریائے چناب کے کنارے تک، ملتان اور جھنگ کے اضلاع چھوڑ کر آبادی کی تفصیل اس طرح سے تھی۔

مسلمان	91 لاکھ 91 ہزار 618
سکھ اور دیگر اقوام	ایک کروڑ 18 لاکھ 85 ہزار 834

مشرقی پنجاب میں پنجابی کا تحفظ

ہرنام سنگھ نے دلائل میں نشاندہی کی کہ مسلمان اردو کو اپنی مادری زبان قرار دیتے رہے ہیں جبکہ ہندو ہندی زبان کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں لیکن سکھ پنجابی پر اپنا غیر متزلزل دعویٰ کرتے ہیں:

> مشرقی پنجاب میں ہندو اکثریت والے علاقے ہندوستانی بولنے والے علاقوں سے منسلک کیے جا سکتے ہیں۔ تقسیم در تقسیم میرا موقف ہے۔ چنانچہ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ زبان اور ثقافت کا تحفظ چاہتے ہیں تو آپ یہ کام ان لوگوں کو پاکستان جہاں لوگ اس ثقافت کو تباہ کرنا چاہتے ہیں میں شامل کر کے نہیں کر سکتے۔ یہ صرف مارچ 1947 میں ہونے والے واقعات کا معاملہ نہیں۔ یہ پچھلے 2 دہائیوں سے ہو رہا ہے۔ یہاں ایک بار پھر وہ صورتحال پیدا ہوئی ہے جو سکھوں کی خصوصی حیثیت کی متقاضی ہے (Ibid:135)۔

لاہور اور ننکانہ صاحب

ہرنام سنگھ نے لاہور کو سکھوں کی عملداری میں دینے کی خصوصی کوشش کی۔ انہوں نے نشاندہی کی کہ نہ صرف امرتسر اور گورداسپور میں سکھوں کے کئی مقدس مقامات ہیں بلکہ سکھوں کی مذہبی اور ثقافتی تاریخی کے حوالے سے لاہور ضلع بھی مقدس

ہے۔ سکھوں کے چوتھے گورو رام داس جو اس کے بعد آنے والے تمام گوروؤں کے جد امجد تھے وہ لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی پرورش ہوئی(Ibid:136)۔ پانچویں گورو ارجن کی یادگار جہاں انہیں شہید کیا گیا وہ بھی لاہور میں ہے۔ یہ شہر گوروؤں کے 'تخت' کے طور پر بھی مشہور ہے۔ ضلع شیخوپورہ میں ننکانہ صاحب کے بارے میں سکھ وکیل نے زور دیا کہ اسے مشرقی پنجاب کا حصہ بننا چاہیے کیونکہ یہاں سکھ مذہب کے بانی بابا گورونانک پیدا ہوئے اور یہ سکھوں کے لیے مقدس ترین جگہ ہے۔ اس تناظر میں سکھوں کے اتحاد اور ثقافتی تسلسل کے لیے واحد حل مشرقی پنجاب میں سکھوں کا ایک جگہ جمع ہونا تھا(Ibid)۔

ذیل (مختلف دیہات کا ریونیو یونٹ) پر اپنے اعداد و شمار کا انحصار کرتے ہوئے ہرنام سنگھ نے دعویٰ کیا کہ متصل غیر مسلم اکثریتی علاقہ شہیدی بار تک پھیلا ہے جو لائل پور کے نہری علاقوں سے شروع ہوتا ہے اور شیخوپورہ اور گوجرانوالہ کے اضلاع کے کچھ حصے کو چھوتا ہوا لاہور کی تحصیل چونیاں سے مشرقی اضلاع تک جاتا ہے(Ibid:137)۔ اس کے علاوہ ضلع منٹگمری اور ضلع ملتان کی تحصیلوں خانیوال اور میلسی میں تجارت اور کاروبار سب کا سب سکھوں کے ہاتھ میں ہے(Ibid)۔ انہوں نے ضلع سیالکوٹ پر بھی دعویٰ کیا جو ان کے نزدیک سکھوں کا متبرک شہر ہے۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ مشرقی پنجاب کی سرحد دریائے چناب تک وسیع ہونی چاہیے (Ibid)۔

مشرقی پنجاب کے لیے اضافی علاقوں کا سکھوں کا مطالبہ

سکھوں کی یادداشت میں آبادی کی نقل مکانی کو ناگزیر قرار دیتے ہوئے مشرقی پنجاب میں سکھ کمیونٹی کے ارتکاز کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اس میں درج ذیل علاقوں کا دعویٰ کیا گیا۔

1. انبالہ ڈویژن
2. جالندھر ڈویژن
3. لاہور ڈویژن
4. ملتان ڈویژن کا ضلع لائل پور
5. ضلع منٹگمری، ملتان ڈویژن کی تحصیل میلسی، خانیوال اور وہاڑی

ایسی تقسیم کا مطلب یہ ہوتا کہ 37 لاکھ 57 ہزار 401 سکھوں میں سے 34 لاکھ سکھ مشرقی پنجاب میں ایک علاقے میں جمع ہو جاتے(Ibid:137-8)۔

مسلم لیگ کا مقدمہ

سر محمد ظفر اللہ خان نے کانگریس اور سکھوں کے مسلم اور غیر مسلم متصل علاقوں کے اصول کی بنیاد پر 'دیگر عوامل' پر موقف کے مقابلے میں مسلم لیگ کا موقف پیش کیا۔ انہوں نے دلائل دیئے کہ اگر مذہبی جذبات، ذاتی، مفادات، ایکڑوں زمین

کی ملکیت، بنکوں اور انشورنس کمپنیوں اور فیکٹریوں کی ملکیت جیسے عوامل ہندوستان کی تقسیم کی وجہ ہوتے تو یہ تقسیم کبھی نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے مزارات پھیلے ہیں لیکن یہ ماپنا ناممکن ہے کہ ان مزارات کے ساتھ مسلمانوں کے جذبات کتنے وابستہ ہیں۔ اس طرح غیر مسلموں کے ان کے مقدس مقامات سے ناتے کے جذبات کی پیمائش کرنا ممکن نہیں۔ مسلم لیگ نے برصغیر کے بعض علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت کی واحد وجہ کی بنا پر ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا ہے۔

ظفر اللہ خان نے دعویٰ کیا کہ برطانوی حکومت نے باؤنڈری کمیشن کے افعال کار سے متعلق جو ضابطہ تیار کیا تھا اس میں صرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے اکثریت متصل علاقوں کے حوالے سے ضابطہ کار کی بات کی گئی ہے اور جہاں 'دیگر عوامل' کی بات کی گئی اس سے مراد مقامی عوامل ہیں۔ بعض غیر معمولی صورتوں میں اکثریت کے اصول سے محض اس لیے صرف نظر انداز کیا جاسکتا ہے تاکہ مقامی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے (Ibid:139)۔

تقسیم پنجاب کے لیے سکھوں کا مطالبہ

سکھوں کی طرف سے خصوصی سلوک کے مطالبے کا جواب دیتے ہوئے مسلم لیگی وکیل نے کہا کہ سکھوں نے اس ضمن میں دو بڑی وجوہات جمع کرائی ہیں۔ ایک یہ الزام کہ مغلوں کے دور میں سکھوں اور ان کے رہنماؤں کے خلاف تشدد کیا گیا اور سرکاری سطح پر کارروائی کی گئی اور یہ کہ انہیں خدشہ ہے اگر وہ ایک بار پھر کسی مسلم ریاست میں رہے تو تاریخ خود کو دہرا سکتی ہے۔ دوم یہ کہ سکھوں نے راولپنڈی اور ملتان کے اضلاع میں حال ہی میں مسلمانوں کے ہاتھوں اپنے ہم مذہب افراد کی ہلاکتوں کا ذکر کیا ہے (Ibid:140)۔

سر ظفر اللہ خان نے دونوں الزامات مسترد کر دیئے۔ انہوں نے کئی مستند سکھ اور دیگر تصانیف کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مغل حکمران دراصل سکھ گوروؤں کے مربی تھے۔ مسلم حکمرانوں نے انہیں جاگیریں عطا کیں اور سکھ مذہب کا احترام اور تحفظ کیا۔ دربار صاحب اور ننکانہ صاحب سمیت سکھوں کے کئی مزارات مسلمانوں کے چندے کی شراکت سے بنائے گئے (Ibid)۔ شہنشاہ جہانگیر نے گورو ارجن کو سزا اس لیے دی تھی کہ انہوں نے بادشاہ کے بیٹے اور باغی شہزادے خسرو کا ساتھ دیا تھا۔ بعض مواقع پر اگر مغلوں نے سکھوں کو ریاستی جبر کا نشانہ بنایا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں نے مسلم حکمرانوں کو اشتعال دلایا تھا کہ وہ سکھوں کو دبا کر رکھیں۔ اس کے برعکس گورو گوبند کے دور میں سکھوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت کی ترویج کی اور بغاوتوں کے علم بلند کیے (Ibid:140-41)۔

حالیہ ہلاکتوں کے بارے میں مسلم لیگ کے وکیل نے زور دیا کہ ان کا الزام مسلمانوں پر نہیں لگانا چاہیے۔ مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی تحریک جو اواخر جنوری 1947 میں شروع ہوئی اور 5 ہفتے تک جاری رہی۔ مجموعی طور پر پرامن احتجاج تھا اور اس کا اختتام 28 فروری کو ہوا۔ خضر حکومت نے 2مارچ کو استعفیٰ دے دیا تاہم اس کی خبر اگلے روز منظر عام پر آئی۔ ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کی عمارت سے باہر کرپان لہرا کر اور 'پاکستان مردہ باد، ست سری اکال' کا نعرہ لگا کے سکھوں کو اکسایا۔ تارا سنگھ اور ہندو لیڈروں نے اسی روز مزید اشتعال انگیز

تقریریں کیں۔ فرقہ وارانہ کشیدگی کے ایسے ماحول میں فسادات کا آغاز ہوا اور لاہور سمیت پنجاب بھر میں ہنگامے شروع ہو گئے (Ibid: 142)۔

اپنے اس موقف کو تقویت دینے کے لیے کہ سکھوں نے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے اپنی سوچ بہت بعد میں تبدیل کی، ظفر علی خان نے ماسٹر تارا سنگھ کے کئی بیانات کا حوالہ دیا۔ گورمکھی میگزین 'سنت سپاہی' میں اگست 1946 میں سکھ لیڈر نے لکھا کہ:

> مذہبی اصولوں کے تناظر میں سکھ عقیدے کے لحاظ سے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے زیادہ قریب ہیں تاہم سکھوں کے ہندوؤں کے ساتھ سماجی روابط زیادہ مضبوط ہیں۔ ہندوؤں میں ایک طبقہ ایسا ہے جو ہماری الگ شناخت مٹانے کے درپے ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے ساتھ ہمارے روابطے زیادہ مضبوط نہیں تاہم ہندوؤں کی اس سوچ کی وجہ سے ہمیں ان سے نسبتاً کم خوف ہے۔ میں مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کے حق میں ہوں اور چاہتا ہوں کہ ان کے ساتھ بہتر تعلقات کو فروغ دیا جائے۔ ایسے ہندو بھی ہیں جو سازشوں اور سیاست کے ذریعے سکھوں کو نگلنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہماری ہندوؤں کے بارے میں پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ ہمیں ہندوؤں کے اتنا قریب نہیں ہونا چاہیے کہ ہم مستقل ان کے ساتھ دست و گریبان رہیں اور نہ اتنا دور ہونا چاہیے کہ اپنی شناخت کھو دیں۔ ہندوؤں کو بھی ہماری یہ بات سمجھنا ہو گی۔ اگر وہ اپنی یہ کوشش ترک کر کے ہمیں اپنے ساتھ ملانے پر تیار ہیں تو ہمیں ان کے ساتھ تعلقات مضبوط کرنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ماضی کی تاریخ مدنظر رکھیں تو ہمیں ان پر کوئی اعتبار نہیں۔ ہمیں چوکس رہنا ہو گا۔
>
> کانگریس ہماری ہمدردی اور معاونت حاصل کرنے پر مجبور ہے لیکن وہ ماضی میں ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی بھی کوشش کرتی رہی اور مستقبل میں پھر ایسا کرے گی۔ اس نے ہمارے الگ سیاسی وجود کو تسلیم نہیں کیا کیونکہ ہم نے اس کی اصولی مخالفت کی۔ لہٰذا یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ کانگریس اور ہندو ہماری الگ سیاسی شناخت تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ گزشتہ انتخابات کے دوران بھی اس کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا لیکن ہم نے خود کو بچا لیا۔ اگر پنجاب اسمبلی کا رکن بننے والے سکھ کانگریس کی ٹکٹ پر منتخب ہوتے تو ہم بطور الگ قوم مر چکے ہوتے (Ibid:141-2)۔

تقسیم کی معاشی بنیادیں

سر ظفر اللہ نے مسلم لیگ کا نکتہ نظر پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اور پنجاب کی تقسیم اصل وجہ معاشی عدم توازن اور ناہمواری تھی۔ ایک طرف امیر ہندو اور سکھ تھے اور دوسری طرف محروم مسلمان۔ انگریزوں کے دور میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے بڑے پیمانے پر استحصال سے ان میں انتہائی غربت نے گھر کر لیا ہے۔ اگرچہ پنجاب لینڈ ایلی نیشن ایکٹ (1900) سے ان کی زمینوں پر ہندو اور سکھ ساہوکاروں کے قبضے کی رفتار کم ہو گئی ہے لیکن اب بھی کئی ایسے چور دروازے موجود ہیں جن کے ذریعے یہ غیر مسلم مسلمانوں کی زمینوں کو ہتھیانے میں لگے ہوئے ہیں (Ibid:143)۔

جہاں تک زمینوں کی ملکیت اور اپنی مٹی سے وابستگی کا سوال ہے تو ظفر اللہ خان نے دلائل دیئے کہ مسلمان کاشتکار اور زمیندار غیر مسلموں کی بہ نسبت بہت زیادہ رقبے کے مالک ہیں تاہم سکھ جنہوں نے بلاشبہ پنجاب کی ترقی میں غیر معمولی کردار ادا کیا وہ اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ رقبے کے مالک ہیں۔ سکھوں کے مقابلے میں اگرچہ مسلمان زیادہ تر چھوٹے رقبوں کے مالک ہیں لیکن مجموعی تعداد ان کی ہی زیادہ ہے (Ibid:143-4)۔

نہری کالونیاں

نہری کالونیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مسلم لیگ کے وکیل نے کہا کہ ان علاقوں کی زمینیں دراصل مسلمان خانہ بدوشوں اور قدیم باشندوں کا وطن ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ تاج برطانیہ نے نہری کالونیوں میں زمینوں کی الاٹمنٹ جو حکمنامہ جاری کیا۔ اس میں بھی وہاں مسلمانوں کو اکثریت میں دکھایا گیا ہے۔ یوں لائل پور، منٹگمری، ملتان، شیخوپورہ، جھنگ، شاہ پور اور گجرات کی نہری کالونیوں کا مجموعی رقبہ 42لاکھ 99ہزار 663 ایکڑ بنتا ہے۔ اس رقبے میں سے مسلمانوں کے زیر کاشت رقبہ 27لاکھ 40ہزار 814ایکڑ، ہندوؤں کے زیر کاشت رقبہ 3لاکھ 79ہزار ایک ایکڑ، سکھوں کے زیر کاشت رقبہ 11لاکھ 46ہزار 432ایکڑ، عیسائیوں کے پاس رقبہ 22ہزار 786ایکڑ اور دیگر مذاہب کے زیر کاشت رقبہ 10ہزار 635ایکڑ ہے (Ibid 144)۔

اہم ضلع لائل پور جس کی ترقی میں سکھوں کے کردار پر مخالف فریق نے لمبے چوڑے دعوے کیے تھے کے بارے میں ظفر اللہ خان نے بتایا کہ لائل پور میں مسلمانوں کی آبادی 62.8 فیصد تھی اور 62فیصد رقبہ بھی انہی کی ملکیت تھی اور مسلمان 57فیصد ریونیو ادا کرتے ہیں اور 69فیصد زمین کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ صرف سکھ جاٹوں نے ہی نہیں بلکہ مسلمان آرائیں (کاشتکار) برادری نے بھی زرعی پیداوار اگانے میں میں قابل ذکر کردار ادا کیا ہے (Ibid)۔

دعوے متصل تحصیلوں کی بنیاد پر ہونے چاہئیں

ظفر اللہ خان نے باؤنڈری کمیشن سے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے علاقوں کا تعین کرنے کے لیے تحصیل کو بطور یونٹ استعمال کیا جائے کیونکہ پنجاب کی تاریخ میں تحصیل کو ہی انتظامی اور ریونیو یونٹ کا درجہ حاصل رہا ہے۔ دوسری طرف نئے اضلاع بنائے گئے اور پرانے ختم کر دیے گئے۔ تحصیل سے کم سطح کا کوئی بھی یونٹ—جیسا کہ ذیل یا تھانہ—مفید ثابت نہیں ہوگا کیونکہ یہ تصفیے کے لیے کارآمد نہیں اور غلطی کا امکان بھی ہو سکتا ہے (Ibid:139)۔ چنانچہ اگر تحصیل کو فیصلے کے لیے بطور یونٹ تسلیم کیا جاتا ہے تو پتہ چلے گا کہ گورداس پور ضلع میں صرف تحصیل پٹھان کوٹ ہی ایسی ہے جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے جبکہ تحصیل گورداسپور، تحصیل شکر گڑھ اور تحصیل بٹالہ میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اسی طرح امرتسر کی تحصیل اجنالہ میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ ضلع جالندھر کی تحصیل جالندھر اور نکودر میں بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ضلع فیروزپور میں فیروزپور اور زیرہ تحصیل میں مسلمانوں کی آبادی غیر مسلموں سے زیادہ ہے۔ یہ تمام تحصیلیں مغربی پنجاب کے ساتھ متصل علاقہ قائم کرتی ہیں (Ibid)۔

ظفر اللہ خان نے یہ نکتہ اٹھایا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان دریائے چناب کو سرحد قرار دینے کی کانگریس اور سکھوں کی تجویز پر عملدرآمد کیا گیا تو پاکستان بھارت کی ممکنہ جارحیت کا آسانی سے شکار ہو سکتا ہے۔ پاکستان کا دفاع اس بات کا متقاضی ہے کہ مغربی پنجاب میں اس کی مواصلاتی لائنیں اور شہر محفوظ ہوں چنانچہ اس کے لیے ستلج کو سرحد بنایا جائے (Ibid:140)۔

امرتسر کو پاکستان میں رہنا چاہیے

اگرچہ لاہور اور گورداسپور مسلم اکثریتی اضلاع تھے اور 'منطقی' طور پر انہیں مغربی پنجاب میں ہی شامل کیا گیا تھا البتہ لاہور ڈویژن کا غیر مسلم اکثریت والا ضلع امرتسر شامل نہیں کیا گیا۔ ظفر اللہ خان نے امرتسر کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے یہ دلائل دیے:

اول یہ کہ امرتسر اور گورداسپور متصل اضلاع ہیں اور دونوں کی کل آبادی 42لاکھ 62ہزار 762 تھی اور ان میں مسلمانوں کی تعداد 22لاکھ 75ہزار 390 تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعداد 2لاکھ 88ہزار 18 نفوس زیادہ تھی۔ چنانچہ اس تناظر میں یہ پاکستان میں شامل ہونے چاہئیں (Ibid:145)۔

دوم یہ کہ امرتسر اور ترن تارن تحصیلیں غیر مسلم اکثریت کی حامل تھیں لیکن یہ دونوں بھی مسلم اکثریتی تحصیلوں میں گھری ہوئی تھیں۔ (مغرب میں ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ، جنوب میں ضلع فیروزپور کی تحصیل اور زیرہ، مشرق میں مسلم اکثریت کی حامل خود مختار ریاست کپورتھلہ جبکہ شمال میں گورداس پور ضلع کی تحصیل گورداس پور اور بٹالہ واقع تھیں)۔ یوں یہ مشرقی پنجاب سے ملحق نہیں تھیں۔ اسی طرح فیروزپور، جھرکہ اور نوح تحصیلیں غیر مسلم اکثریتی ضلع گڑگاؤں میں مسلم اکثریت والی تھیں لیکن انہیں اس لیے مغربی پنجاب میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ وہ مسلم اکثریتی علاقوں سے ملحق نہیں تھیں۔ چنانچہ فیروزپور، جھرکہ اور نوح تحصیل کو مشرقی پنجاب جبکہ امرتسر اور ترن تارن تحصیل کو لازماً مغربی پنجاب میں شامل کرنا چاہیے (Ibid)۔

تحصیل پٹھان کوٹ کے کچھ علاقوں پر دیگر عوامل کی بنیاد پر دعویٰ

تحصیل کی بنیاد پر علاقوں کی تقسیم کے مسلم لیگی مؤقف سے ہٹ کر سر ظفر اللہ خان نے 'دیگر عوامل' کی بنیاد پر پٹھان کوٹ تحصیل کے مسلم اکثریت والے علاقے مغربی پنجاب میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے یہ دلائل دیے کہ:

> اپر باری دوآب سسٹم کے نہری ہیڈورکس ضلع گورداس پور کی (غیر مسلم اکثریت والی) تحصیل پٹھان کوٹ کے علاقے مادھوپور میں واقع ہیں — اس ہیڈورکس سے سیراب ہونے والے تمام علاقے مغربی پنجاب میں واقع ہیں جبکہ ہیڈورکس اور نہر کا چند میل والے علاقہ مشرقی پنجاب میں ہے چنانچہ گزارش ہے کہ مادھوپور سے اوپر 2 میل کا علاقہ اور اپر باری دوآب نہر کا مشرق کی طرف بہنے والا علاقہ مغربی پنجاب میں شامل کیا جانا چاہیے (Ibid)۔

مسلم لیگ نے مغربی پنجاب کے لیے جن علاقوں کا دعویٰ کیا

کانگریس اور سکھوں کے دعوؤں جن میں انہوں نے یادداشتوں اور فہرست کے ذریعے علاقوں کا تعین کیا کے برعکس مسلم لیگ نے یادداشت پیش کی نہ پریذنٹیشن دی بلکہ اس نے اس کے لیے کئی پیراگراف تیار کرائے۔ ظفر اللہ نے مؤقف اختیار کیا کہ مغربی پنجاب کے وہ 17 اضلاع جو منطقی تقسیم، کی بنا پر صوبے کو 2 حصوں میں تقسیم کرتے ہیں میں تحصیل پٹھان کوٹ کے سوا تمام میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس لیے یہ سب مغربی پنجاب میں شامل ہونے چاہئیں۔ انہوں نے 'دیگر عوامل' کی بنیاد پر تحصیل پٹھان کوٹ کا بھی دعویٰ کیا کیونکہ یہ علاقہ مغربی پنجاب کو آبپاشی کے پانی کی فراہمی کے لیے ضروری تھا۔ اس کے علاوہ مسلم اکثریت والے علاقے فاضلکا، سمرالہ، روپڑ، یونا، موگا، گڑھ شنکر، نواں شہر اور پھلاور جو غیر مسلم اکثریت والے اضلاع کا حصہ تھے محض اس لیے مغربی پنجاب میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا گیا کیونکہ یہ سب مسلم اکثریت والے اضلاع لاہور، گورداس پور اور منٹگمری سے ملحق تھے۔ دسویہ تحصیل (ضلع ہوشیار پور) پر اس بنیاد پر دعویٰ کیا گیا کیونکہ وہاں مسلم - عیسائی اکثریت تھی۔ ظفر اللہ کا مؤقف یہ تھا کہ عیسائی اہل کتاب ہیں اور وہ بھارت کی بجائے مسلمان ملک پاکستان میں رہنا پسند کریں گے۔ ان دلائل کی روشنی میں مسلم لیگ نے دریائے ستلج کی وادی پر اپنا دعویٰ کیا (Ibid: 147)۔

ظفر اللہ خان نے کانگریس اور سکھوں کا یہ نظریہ مسترد کر دیا کہ تقسیم کی وجہ سے آبادی کی بڑی تعداد کو نقل مکانی کرنا پڑے گی۔ اگر ایسا ہوا بھی تو مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کی بڑی تعداد مغربی پنجاب کو ہجرت کرے گی۔ مغربی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کو کم تعداد میں مشرقی پنجاب کو نقل مکانی کرنا پڑے گی۔ میمورنڈم میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ مسلم لیگ کی تجاویز کی روشنی میں پنجاب کی تقسیم کا مطلب ہوگا کہ مغربی پنجاب کی کل آبادی 2 کروڑ 4 لاکھ 27 ہزار 946 میں سے 69.86 فیصد مسلمان، 12.75 فیصد سکھ، 12.24 فیصد ہندو، 2.68 فیصد شیڈول کاسٹس اور ادھرمی جبکہ 2.68 فیصد عیسائی ہوں گے۔ اس تناظر میں مسلم لیگ کا یہ دعویٰ قطعی جائز ہوگا کہ ستلج کو دونوں حصوں کے درمیان سرحد ہونا چاہیے۔

چھوٹی اقلیتوں کے دلائل

نیشنل کرسچین ایسوسی ایشن کی وکالت کرتے ہوئے مسٹر بینرجی نے دلائل دیے کہ 'منطقی تقسیم' کی بنیاد پر مسیحی برادری کی بیشتر تعداد مغربی پنجاب میں آئے گی لیکن چونکہ عیسائی آل انڈیا سطح پر منظم تھے تو وہ چاہیں گے کہ ان کے علاقے بھارت میں شامل کیے جائیں۔ ان دستاویزات کو پنجاب کرسچین لیگ کے لیڈر ایس جی دت نے چیلنج کیا۔ شیڈول ذاتوں کی نمائندگی کرتے ہوئے بدری داس نے دعویٰ کیا کہ انہیں پنجاب اسمبلی کے 8 اور آئین ساز اسمبلی کے 2 شیڈول کاسٹس کے ارکان کی نمائندگی حاصل تھی۔ انہوں نے مؤقف اختیار کیا کہ شیڈول کاسٹس خود کو ہندو معاشرے کا فرد سمجھتے تھے اور یونین آف انڈیا سے الحاق کو ترجیح دیں گے۔ دربار سنگھ نے دلائل دیے کہ سکھوں کی اچھوت ذاتوں یعنی

مذہبی اور رام داسیہ سے تعلق رکھنے والے سکھ دراصل سکھ معاشرے کا اٹوٹ حصہ ہیں لہٰذا انہیں مشرقی پنجاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔

پنجاب کے ممتاز عیسائی لیڈر ایس پی سنگھا (پنجاب اسمبلی کے سپیکر جو جوائنٹ کرسچین بورڈ کی نمائندگی کر رہے تھے) نے کہا کہ نیشنل کرسچین ایسوسی ایشن کا کوئی وجود نہیں چنانچہ مسٹر بیز جی کو عیسائی برادری کی نمائندگی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ممتاز عیسائی عمائدین کے ناموں کی فہرست پیش اور مسیحیوں کا حقیقی نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے ایس پی سنگھا نے کہا کہ عیسائی کابینہ مشن پلان کے تحت اپنا الگ ملک چاہیں گے لیکن اگر پنجاب کو تقسیم کیا جاتا ہے تو وہ ہندو اکثریت والے اور ذات برادری میں بٹے بھارت کی بجائے پاکستان میں بہتر سلوک کی توقع کریں گے (Ibid)۔ اینگلو انڈین باشندوں کی نمائندگی کرتے ہوئے مسٹر گبن نے باؤنڈری کمیشن کو مطلع کیا کہ اینگلو انڈین افراد پاکستان میں خوش رہیں گے، وہ لاہور اور مغربی پنجاب کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔

احمدیوں کے نمائندے بشیر احمد نے مطالبہ کیا کہ ضلع گورداس پور کی بٹالہ تحصیل کے قصبے قادیان (مرزا غلام احمد کی جائے پیدائش) کو پاکستان میں شامل کیا جائے کیونکہ یہ قصبہ مسلم اکثریتی تحصیلوں اجنالہ اور نارووال سے ملحق تھا۔ انہوں نے کہا کہ سکھوں نے باؤنڈری کمیشن کے روبرو امرتسر اور ننکانہ صاحب میں اپنے مقدس مقامات کا زبردست کیس پیش کیا ہے۔ اسی منطق پر ہم یہ کہتے ہیں کہ احمدیہ مسلمانوں کے بانی مرزا غلام احمد تحصیل بٹالہ کے قصبے قادیان میں مدفون ہیں۔ اس لیے یہ مزار پاکستان میں شامل ہونا چاہیے (Ibid:147-8)۔ اس کے علاوہ صرف سکھوں نے ہی سلطنت برطانیہ کے لیے گرانقدر خدمات انجام نہیں دیں بلکہ احمدیوں نے بھی انگریز حکومت کی دوسری جنگ عظیم میں بھرپور خدمت کی۔ احمدیوں نے انگریز فوج میں شمولیت اختیار کی۔ حتیٰ کہ جنگ کے دوران 199 احمدیوں کو شاہ برطانیہ کا کمیشن حاصل ہوا اور انہیں ممتاز مقام سے سرفراز کیا گیا (Ibid:148)۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ ضلع گورداس پور کی کل آبادی 11 لاکھ 53 ہزار 511 تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد ملا کر 5 لاکھ 4 ہزار 453 بنتی تھی جبکہ مسلمانوں کی آبادی 5 لاکھ 89 ہزار 923 تھی۔ باقی تعداد ادھرمیوں، عیسائیوں، جین مت کے پیروکاروں اور ننھی منی اقلیتوں پر مشتمل تھی۔ اس کے مطلب تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت محض 85 ہزار 470 یا صرف ایک فیصد تھی۔ یہ اکثریت بھی غالباً احمدیہ فرقے کے ماننے والوں کو مسلمانوں میں شمار کرنے سے حاصل ہوئی تھی۔ احمدی اس ضلع بالخصوص قادیان میں نمایاں تعداد میں موجود تھے۔ 1974 میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا۔

مذہبی سکھوں اور شیڈول کاسٹس کی نمائندگی کرنے والے سلیگ رام (جو شیڈولڈ کاسٹس فیڈریشن کے پلیٹ فارم سے دلائل دے رہے تھے تاہم بعض دیگر سٹیک ہولڈروں نے ان کی نمائندگی کو اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ وہ خود شیڈول کاسٹس سے تعلق نہیں رکھتے) نے کمیشن کے روبرو مؤقف اختیار کیا کہ بھارت میں شمولیت کے حق میں فیصلہ کرنے والے آٹھوں ارکان اسمبلی شیڈول کاسٹس کے محروم طبقے کی نمائندگی نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ چونکہ اسلام میں اچھوت کا کوئی تصور نہیں اس لیے نچلی ذاتوں کو مسلمانوں کے دیہات میں بہتر سلوک

کا سامنا رہا ہے۔ لہذا ان کے مفادات کا تحفظ مسلمانوں سے اتحاد میں ہے (Ibid)۔ جہاں تک مذہبی سکھ اچھوتوں کا تعلق ہے تو ان کے اپنے گوردوارے ہیں۔ اگر ہیں تو ان کا امرت دھارا بھی مختلف قسم کا ہوتا ہے اور ان کی عام سکھوں سے کوئی بھی قدر مشترک نہیں (Ibid)۔ بیکانیر سٹیٹ کی نمائندگی کرنے والے آر سی سونی اور ظفر اللہ خان جو ریاست بہاولپور کے بھی وکیل تھے انہوں نے ان ریاستوں سے گزرنے والے دریاؤں اور نہروں کے پانی میں حصے کا تنازعہ اٹھایا۔

باؤنڈری کمیشن کے ارکان کی رپورٹیں

پنجاب باؤنڈری کمیشن کے چاروں ارکان کسی متفقہ فیصلے پر نہ پہنچ سکے۔ لہذا انہوں نے الگ الگ رپورٹیں لکھیں۔

جسٹس دین محمد

جسٹس دین محمد نے سکھوں کی طرف سے خصوصی حقوق کے مطالبے کو انتہائی مضحکہ خیز، انتہائی غیر منصفانہ اور انتہائی غیر منطقی قرار دیا (Ibid: 149)۔ انہوں نے کہا کہ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف پیش کیے گئے نقشے گمراہ کن ہیں۔ انہوں نے تقسیم کے لیے عددی اکثریت اور علاقائی الحاق کو مرکزی اصول کے طور پر قبول کیا اور املاک کی ملکیت کو بطور حق دعویٰ مسترد کر دیا۔ دوسری طرف ان کے نزدیک سکیورٹی، معاشی استحکام، نہری ہیڈ ورکس کی ایلوکیشن اہم "دیگر عوامل" تھے (Ibid)۔ البتہ ہندوؤں اور سکھوں کے مطالبات کے مقابلے میں جسٹس دین محمد نے مسلمانوں کے مؤقف کو معقول، اعتدال پسندانہ اور سودے بازی سے پاک قرار دیا کیونکہ اس میں صرف آبادی کے فیکٹر کو اہمیت دی گئی تھی (Ibid)۔

جسٹس محمد منیر

جسٹس منیر نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ سکھوں کا اپنے مقدس مقامات کے حوالے سے خصوصی حقوق کا مطالبہ غیر متعلقہ ہے۔ مسلمانوں کے بھی پورے پنجاب میں مزارات ہیں۔ اسی طرح زبان کے بارے میں ان کا مؤقف بھی منصفانہ نہیں کیونکہ 'لہندہ' محض پنجابی کا ایک لہجہ ہے۔ انہوں نے سکھوں کا یہ الزام تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ مسلم حکمرانوں نے سکھوں کو ریاستی جبر کا نشانہ بنایا۔ اس کے برعکس انہوں نے کئی سکھ ذرائع کا حوالہ دیا جن میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ سکھوں کی طرف سے نہری علاقوں کی ترقی کے لیے محنت اور خصوصی کاوشوں کا مؤقف بھی مسترد کر دیا گیا۔ لائل پور میں صرف سکھ جاٹوں نے ہی نہیں بلکہ مسلمان آرائیوں نے بھی زرعی شعبے کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا (Ibid)۔ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے مسلمانوں کا معاشی استحصال ہی مسلمانوں کی الگ ریاست بنانے کی اصل وجہ تھی۔ چنانچہ پنجاب میں بڑے رقبے پر جائیدادوں کی ملکیت کی بنا پر علاقوں پر دعویٰ قابل قبول نہیں تھا (Ibid: 149-50)۔

سکیورٹی کے معاملے کا جائزہ لیتے ہوئے جسٹس منیر نے رائے دی کہ مسلم لیگ کی تجویز درست تھی۔ علاقوں کے باہمی تعلق کے حقیقی پیمانے کے طور پر تحصیل ہی مناسب ترین یونٹ ہے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ دیا کہ دونوں ریاستوں کے درمیان سرحد وہی ہونی چاہیے جو مسلم لیگ نے تجویز کی ہے۔ انہوں نے غیر مسلموں کو یقین دلایا کہ وہ پاکستان میں کوئی خوف محسوس نہ کریں کیونکہ اسلام تمام شہریوں سے بلاامتیاز یکساں سلوک کرنے کا سبق دیتا ہے(Ibid)۔

جسٹس تیج سنگھ

جسٹس تیج سنگھ نے ایک مسلمان حکومت کے زیر سایہ رہنے کے حوالے سے سکھوں کے خوف کے نکتے پر بھرپور زور دیا۔ سکھ وکیل کے دلائل کا اعادہ کرتے ہوئے مغلیہ دور میں مسلم سکھ عداوت پر انہوں نے مفصل ریمارکس دیے۔ یونینسٹ پارٹی کی حکومت کے خلاف مسلم لیگ کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے جسٹس تیج سنگھ نے کہا کہ یہ تحریک نہ صرف پر تشدد تھی بلکہ اس میں مسلمانوں نے غیر مسلموں کے خلاف جارحانہ نعرے بازی بھی کی گئی۔

ایسے لیں گے پاکستان
جیسے لیا تھا ہندوستان(Ibid:150)

جسٹس تیج سنگھ کے مطابق جب مسلمانوں کی تحریک زوروشور سے جاری تھی تو انتظامیہ نے ایک انگلی بھی نہ ہلائی لیکن جب 4مارچ 1947 کو سکھ اور ہندو طلبا نے مظاہرہ کیا تو ان پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ جس پر ہنگامے لاہور سے پنجاب کے دیگر علاقوں تک پھیل گئے۔ کیمبل پور، راولپنڈی، جہلم، امرتسر، ملتان اور بعد ازاں گڑ گاؤں کے اضلاع میں بدترین فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ راولپنڈی اور جہلم کے دیہی علاقوں میں مسلمان ہجوم ہائے نے سکھوں کی بے حرمتی کی(Ibid)۔ کچھ علاقوں میں 5سے 10ہزار کی تعداد میں فسادیوں نے پوری کی پوری سکھ آبادی کو قتل کر دیا یا زندہ جلاڈالا۔ بڑی تعداد میں غیر مسلموں کو تبدیلی مذہب پر مجبور کیا گیا۔ بچوں کو اغوا کیا گیا اور نوجوان عورتوں کو یرغمال بنا کر سرعام زیادتی کی گئی(Ibid:150-51)۔

تیج سنگھ نے نشاندہی کی کہ احمدیہ کمیونٹی جس نے مسلم لیگ کے مؤقف کی حمایت کی ہے اور مسلم لیگ کے وکیل ظفر اللہ خان بھی احمدی ہیں نے بھی اپنی کمیونٹی کی یکجہتی کے تحفظ کی ضرورت پر زور دیا ہے(Ibid:151)۔ اس کے علاوہ سکھوں کے کئی مزارات لاہور، امرتسر، گورداس پور، گوجرانوالہ اور شیخوپورہ کے اضلاع میں ہیں چنانچہ یہ علاقے مشرقی پنجاب میں شامل ہونے چاہئیں۔ انہوں نے اپنے خلاصے میں کہا کہ پنجاب کی تقسیم اگر مکمل طور پر سکھوں کے نکتہ نظر سے نہیں تو بڑی حد تک ان کی تجویز کے مطابق ہونی چاہیے۔ میرا اندازہ ہے کہ مشرقی پنجاب میں سکھوں کی تعداد 31لاکھ ہے(کانگریس اور سکھوں نے یہ تعداد 34لاکھ بتائی تھی)۔ جبکہ پورے پنجاب میں سکھوں کی کل آبادی 37لاکھ تھی(Ibid:152)۔

جسٹس مہر چند مہاجن

ملحقہ مسلم اور غیر مسلم علاقے بالترتیب پاکستان اور بھارت میں شامل ہونے کے مؤقف کو تسلیم کرتے ہوئے جسٹس مہاجن نے کہا کہ 'دیگر عوامل' کو کمیشن کی صوابدید پر رہنے دیا جائے۔ انہوں نے یہ دلچسپ آبزرویشن دی:

> میں اس بات کا قائل ہوں کہ ایک ذہین مسلمان ایک خاص مقام پر لکیر کھینچ کر پنجاب میں الگ اکثریتی علاقہ قائم کرے۔ اسی طرح کوئی سمجھدار غیر مسلم دریائے جہلم تک اپنا الگ اکثریتی صوبہ بنانے کی حد بندی کرے۔ بلکہ وہ آگے راولپنڈی تک بھی جا سکتا ہے (Ibid)۔

نسبتاً غیر جانبدارانہ اور آزادانہ انداز میں کام کرتے ہوئے جسٹس مہاجن نے کانگریس اور سکھوں کی یہ تجویز مسترد کر دی کہ دریائے چناب کو پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحد ہونا چاہیے۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ:

> اس تجویز سے مسلم لیگ کے آبادی کی بنیاد پر سرحد بندی کے مطالبے پر کاری ضرب لگے گی اور یہ تقسیم کے مرکزی اصول سے بھی متصادم ہو گا کیونکہ اس سے مشرقی پنجاب میں ایسے کئی علاقے آجائیں گے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس علاقے میں آبادی کے فیکٹر پر حاوی ہونے والا اور کوئی فیکٹر نہیں ہو سکتا (Ibid)۔

دریائے ستلج کو سرحد کے طور پر مخصوص کرنے کے مسلم لیگ کے موقف پر مہاجن نے رائے دی کہ مسلم لیگ نے تحصیل کو حد بندی کے لیے بطور یونٹ لینے پر کام کیا تھا۔ اس اقدام کو با آسانی الٹ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی کسی تحصیل کے غیر مسلم حصے اکٹھے کر کے نئے غیر مسلم ملحقہ علاقے قائم کیے جا سکتے ہیں اور پھر انہیں مغربی پنجاب تک توسیع دی جا سکتی تھی (Ibid: 153)۔ دوسری طرف لائل پور اور منٹگمری کی دو بڑی نہری کالونیوں کی تقسیم کے معاملے میں دونوں طرف کے فریقوں کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں لائل پور کے بیشتر حصے میں شہیدی بار کے کافی علاقے مغربی پنجاب کو دیے جائیں وہاں منٹگمری مشرقی پنجاب کو ملنا چاہیے (Ibid)۔ لاہور کے بارے میں جسٹس مہاجن نے تمام مذاہب کے دعوؤں کو تسلیم کرتے ہوئے ایسے انتظامات کو ترجیح دی جن کے تحت لاہور کو مشترکہ 'آزاد شہر' قرار دیا جا سکے اور پاکستان اور بھارت مل کر اس کے امور چلائیں۔ البتہ ننکانہ صاحب بھارت کو ملنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے خلاصے میں لکھا کہ:

> میرے خیال میں پاکستان اور بھارت کی سرحد راوی کے مغرب میں واقع علاقوں میں ہونی چاہیے کیونکہ سٹرٹیجک حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ صرف یہی قابل عمل سرحد ہو سکتی ہے جو مذہب کی بنیاد پر تقسیم ہونے والے دونوں ملکوں کے درمیان کھینچی جا سکتی ہے (Ibid)۔

باؤنڈری کمیشن کے چاروں ارکان کی اختلافی آراء کے بعد اب معاملہ خالصتاً چیئر مین کے پاس چلا گیا تھا اور ایوارڈ کا ایشو اب پہلے سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ پنجاب کے لیڈروں کو ریڈ کلف ایوارڈ کے بارے میں 16 اگست کو مطلع کیا گیا۔ اگرچہ پاکستان اور بھارت 14 اور 15 اگست کو آزادی حاصل کر چکے تھے۔ یہ ایوارڈ 17 اگست 1947 کو شائع کیا گیا۔

باؤنڈری کمیشن کی کارروائی یاد کرتے ہوئے

میں باؤنڈری کمیشن کے چشم دید گواہوں کی بڑی شدت سے تلاش کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ ہمیں مل گئے اور ہم نے ان کے انٹرویو کیے۔

سید افضل حیدر

"مسلم لیگ نے باؤنڈری کمیشن کے روبرو اپنا مقدمہ لڑنے کی نہ ہونے کے برابر تیاری کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ پاکستان معرض وجود میں آ جائے گا۔ چنانچہ جب حکومت نے اعلان کیا کہ کمیشن حد بندی سے متعلق دلائل کی سماعت کرے گا تو صرف ایک ہی قانونی ماہر اور صاحب علم شخص سر ظفر اللہ خان تھا جو پاکستان کا مقدمہ لڑ سکتا تھا۔ ان کی معاونت میرے والد سید محمد شاہ، صاحبزادہ نوازش علی، شیخ نثار احمد، میاں عبد الباری، شیخ کرامت علی اور احمد سعید کرمانی نے کی۔ حکومت نے کارروائی کے دوران مسلم لیگ کی معاونت کے لیے سینئر بیوروکریٹ خواجہ عبد الرحیم کو ذمہ داری سونپی چنانچہ وہ آبادی، جائیدادوں اور دیگر عوامل پر مشتمل اعداد و شمار کی بوری بھر کر لائے اور سر ظفر اللہ کے حوالے کر دی۔ ان کی کاوش کافی مفید ثابت ہوئی۔ اسی طرح ایک ہندو افسر کانگریس کی معاونت کے لیے تعینات کیا گیا۔

"سید مراتب علی نے نہ صرف ایک سٹینو گرافر اور لکھنے کے لیے سامان کا بندوبست کیا بلکہ وہ ہمیں دوپہر کا کھانا بھی دیتے تھے۔ سر ظفر اللہ خان نے بتایا کہ جناح نے ان سے کہا تھا کہ تمام معاملات طے ہیں، آپ نے صرف ایک کام کرنا ہے کہ کمیشن کے روبرو اپنا مقدمہ پیش کرنا ہے۔ البتہ میرے والد اور خواجہ رحیم کی طرف سے ضروری دستاویزات کی فراہمی اور سید مراتب علی کی طرف سے کھانا اور دیگر سہولتوں کے سوا مسلم لیگ یا اس کے وکلاء کی کیس کے متعلق کوئی تیاری نہیں تھی۔

"کبھی کبھار پاکستان نواز لیڈر اور اخبار نوائے وقت کے مدیر حمید نظامی بھی آتے تھے۔ ان کے علاوہ مسلم لیگ کے کسی رہنما نے باؤنڈری کمیشن کی کارروائی میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ میں کتابیں اور کاغذات اٹھاتا تھا جبکہ میرے والد اور سر ظفر اللہ خان میرے آگے آگے چلتے تھے۔ یوں ہم لاہور ہائی کورٹ کی حدود میں پہنچتے تھے جہاں باؤنڈری کمیشن بیٹھتا تھا۔ اگر میں بھول نہیں رہا تو ممتاز دولتانہ ایک یا دو بار آئے تھے۔ میاں افتخار الدین ایک بار جبکہ شوکت حیات کبھی نہیں آئے تھے۔ راجہ غضنفر علی بھی ایک بار آئے تھے۔ یہ سب ظفر اللہ خان سے کہتے کہ آپ ہم سے زیادہ قابل ہیں، ہم نے آپ کی کیا مدد کرنی ہے۔

"ظفر اللہ خان کہا کرتے تھے، 'براہ کرم کیس کی تیاری میں میری جتنی اچھی طرح مدد کر سکتے ہیں، وہ کریں کیونکہ میں کل کو یہ نہیں سننا چاہتا کہ ایک قادیانی نے مسلم لیگ کا کیس لڑا اور اچھی کارکردگی نہیں دکھائی۔' کیس کے دلائل میرے والد اور ٹیم کے دیگر ارکان نے تیار کیے تھے تاہم کیس کمیشن کے روبرو سر ظفر اللہ خان نے ہی پیش کیا تھا اور مسلم لیگ کا موقف لڑنے

میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جب بریف تیار کیے جا رہے تھے تو کانگریس کے انگریز وکیل سٹیلواڈ نے ظفر اللہ خان سے پوچھا، 'سر محمد (ظفر اللہ)، میں برملا کہوں گا کہ آپ جیت گئے ہیں۔ آپ نے کتنی فیس لی؟' سر ظفر اللہ خان بولے 'میں نے ایک پیسہ فیس نہیں لی۔' سٹیلواڈ نے کہا کہ 'اچھا تو مجھے بھی کانگریس کی 7 لاکھ روپے کی فیس واپس کر دینی چاہیے'۔"

سید احمد سعید کرمانی

"میں مسلم لیگ کا مقدمہ تیار کرنے والی ٹیم کا سب سے کم عمر رکن تھا۔ کمیشن کی سماعت میں شرکت خصوصی پاس سے ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت زیادہ لوگوں نے کارروائی میں شرکت نہیں کی۔ ان دنوں لاہور میں کرفیو نافذ تھا۔ مجھے پنجاب لائبریری میں متعلقہ کتابوں کے مطالعے کے لیے کرفیو کا پاس بنوانا پڑتا تھا۔ اگر خواجہ عبدالرحیم اور صاحبزادہ نوازش علی نہ ہوتے تو ہمیں سرکاری دستاویز تلاش کرنے میں نہایت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ کمیشن کی کارروائیاں جوش و جذبے کی حامل تھیں۔ قادیانی لیڈر مرزا بشیر الدین محمود بھی سماعت سننے آیا کرتے تھے۔ وہ سر ظفر اللہ خان سے باتیں کرتے تھے جو ان کے پیرو کار تھے۔ ایک موقع پر جسٹس دین محمد نے ظفر اللہ خان کی سرزنش کی لیکن ظفر اللہ خان نے کیس لڑنے سے دستبردار ہونے کی دھمکی دے ڈالی اور کہا کہ یہ ان کا حق ہے کہ وہ کسی سے بھی مشاورت کریں۔ عیسائی لیڈر ایس پی سنگھا اور مسٹر گبن نے بھی پاکستان کے حق میں نہایت ذوق و شوق سے دلائل دیے۔ حمید نظامی بھی آیا کرتے تھے۔ البتہ مجھے کسی مسلم لیگی لیڈر کی وہاں آمد یاد نہیں۔ سٹیلواڈ اور ٹیک چند قانونی دلائل دینے میں ظفر اللہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے پنجاب کے معاملے میں پاکستان کا مقدمہ نہایت مہارت سے لڑا۔ میں یہ بات نہایت ایمانداری سے کہہ رہا ہوں، اگرچہ میں قادیانی نہیں ہوں۔"

گورنر جینکنز نے کوئی رائے نہیں دی

یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ گورنر ایوان جینکنز نے پنجاب باؤنڈری کمیشن میں کوئی مؤقف داخل نہیں کرایا۔ اپنی آخری پندرہ روزہ خفیہ رپورٹ میں 13 اگست 1947 کو انہوں نے 11 اگست کو ہونے والی پنجاب پارٹیشن کمیٹی کے اجلاس کے بارے میں بات کی ہے لیکن باؤنڈری کمیشن کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اخبارات نے بھی سنجیدہ تبصرے کرنے سے گریز کیا۔

ریڈکلف ـــــ ایوارڈ

علاقائی حد بندی کے بارے میں اپنی رپورٹ میں ریڈکلف نے لکھا کہ میرے ساتھی کمیشن کے ارکان کی آراء میں اتنا فرق ہے کہ کوئی متفقہ حل تلاش کرنا ممکن نہیں۔ انہوں نے رپورٹ میں لکھا کہ [صرف مطلوبہ نکات دیے جا رہے ہیں] (Manserghand Moon,1983: 745)۔

> 9. پنجاب میں سرحدوں کی حد بندی کرنا ایک مشکل کام ہے۔ متعلقہ فریقوں کے دعوے وسیع تر نکتہ ہائے نظر کے حامل ہیں لیکن میں جو فیصلہ دیا ہے اس میں حقیقی توجہ دریائے بیاس اور ستلج ایک طرف اور دریائے راوی دوسری طرف پر مرکوز کی گئی ہے۔ آبپاشی کے نہری نظام کی موجودگی میں ان علاقوں کی حد بندی مزید پیچیدہ

ہو گئی ہے۔ یہ نہری نظام علاقے کی ترقی اور خوشحالی کے لیے از بس اہم ہے۔ اسی طرح سڑکوں اور ریل کا نظام ہے۔ یہ سب نظام ایک ہی انتظامیہ کے تحت چلانے کے لیے بنائے گئے تھے۔

10. میں ان علاقوں کی بابت کافی ہچکچاہٹ کا شکار تھا جن میں دریائے ستلج کا وہ مشرقی علاقہ واقع ہے جو بیاس اور ستلج کے زاویے میں ہیں اور وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ بہر حال مجموعی طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ بات دونوں ملکوں کے مفاد میں ہو گی کہ وہ مغربی پنجاب کی سرحد کو ستلج کے دور افتادہ کنارے تک توسیع دیں اور یہ کہ ایسے عوامل بھی موجود ہیں جیسا کہ ریلوے مواصلات اور آبپاشی کا نظام ہے جو اس تقسیم سے متاثر ہوں گے۔

11. مجھے یہ ممکن نہیں لگا کہ میں اپر باری دوآب نہر کے غیر منقسم آبپاشی نظام کو محفوظ بنا سکوں جو مادھو پور تحصیل پٹھان کوٹ سے ضلع لاہور کی مغربی سرحد تک پھیلا ہوا ہے اگرچہ میں نے لاہور اور امرتسر کی کسی حد تک ایڈجسٹمنٹ کی ہے تاکہ کچھ نتائج و عواقب کی شدت کم کی جا سکے (Ibid: 746-47)۔

ریڈ کلف ایوارڈ 13 اگست کو تیار ہو گیا (اعلان 16 اور 17 اگست کو کیا گیا)

اگرچہ پنجاب کی حد بندی پر قائم ریڈ کلف ایوارڈ 13 اگست کو تیار ہو گیا تھا لیکن سیاسی قیادت کو اس کی اطلاع 16 اگست کو دی گئی اور 17 اگست کو اسے منظر عام پر لایا گیا۔ اس وقت پاکستان اور بھارت کو آزادی حاصل کیے دو روز گزر چکے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کو 17 اگست کو ہی معلومات حاصل ہوئیں۔ اس ایوارڈ کا متنازعہ ترین پہلو یہ تھا کہ اوجھ دریا (جو آگے راوی سے مل جاتا ہے) کے مشرقی کنارے پر ضلع گورداس پور کی چار میں سے تین تحصیلیں گورداسپور، بٹالہ اور پٹھان کوٹ بھارت میں شامل کر دی گئیں جبکہ صرف شکر گڑھ تحصیل پاکستان کو دی گئی۔ البتہ انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کرنے پر دریائے اوجھ اور راوی کو سرحدوں کا نکتہ اختتام تسلیم کرتے ہوئے کہا گیا کہ "دریائے اوجھ کی گزرگاہ نہیں بلکہ تحصیل کی حد مشرقی اور مغربی پنجاب کے درمیان سرحد ہو گی" (Ibid: 747)۔ اس فیصلے سے پاکستان اور بھارت دونوں کو مخالف طرف کچھ گنجائش ملی اور یوں سرحد میں کافی کھینچاؤ سا آ گیا تھا۔

اس کے بعد سرحد میں وہ حد بندی شامل کی گئی جو پہلے ہی ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ اور امرتسر اور لاہور کی تحصیل ترن تارن کے طور پر موجود تھی۔ یہ آگے چلتی ہوئی ضلع لاہور کی تحصیل قصور تک گئی۔ یوں تحصیل لاہور اور تحصیل ترن تارن آپس میں جا ملیں۔ اس کے علاوہ قصور کے کچھ حصے لے کر بھارت میں شامل کر دیے گئے اور آگے جاتے ہوئے یہ سرحد ستلج سے ریاست بہاولپور تک جا پہنچی (Ibid: 748-9)۔

ریڈ کلف ایوارڈ: ایک تجزیہ

ریڈ کلف ایوارڈ انتہائی متنازعہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس ایوارڈ کا پاکستان اور بھارت کے قیام کے بعد اعلان کرنے کی بڑی وجہ اکثر یہ بتائی جاتی ہے کہ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کو خدشہ تھا کہ سرحدوں کی حد بندی کے معاملے پر تینوں فریقوں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی طرف سے شدید ردعمل سامنے آ سکتا ہے۔ چونکہ وہ دونوں ملکوں کی آزادی کی تقریب میں بطور مہمان خصوصی مدعو تھے۔ اس لیے

انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ ریڈ کلف ایوارڈ کو ان تقریبات کے بعد منظر عام پر لایا جائے (Tanand Kudaisya,2000:96)۔
اس بارے میں کافی زیادہ لٹریچر موجود ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے اصل مسودے میں تبدیلی کی تاکہ گورداس پور جہاں مسلمانوں کی معمولی سی اکثریت تھی وہ پاکستان میں شامل نہ ہو سکے۔ چنانچہ ضلع گورداس پور کی چار میں سے تین تحصیلیں مشرقی پنجاب میں شامل کر دی گئیں اور صرف ایک تحصیل شکر گڑھ پاکستان کو دی گئی۔ اس کی وجہ مبینہ طور پر یہ بتائی جاتی ہے کہ بھارت کو کشمیر تک براستہ پٹھان کوٹ زمینی راستہ دینا مقصود تھا۔ دوسری طرف یہ جوابی دلیل دی جاتی ہے کہ پٹھان کوٹ ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت والی تحصیل تھی اور بہر صورت بھارت میں شامل ہونی تھی کیونکہ مسلم اور غیر مسلم ملحق علاقوں کے فارمولے پر بھی یہ تحصیل بھارت میں شامل ہونی تھی اس لیے پاکستان کی کشمیر تک رسائی تو ویسے ہی ہونی تھی (Ahmed,1999:156)۔

پاکستانی ذرائع کے مطابق ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ اور تحصیل فیروز پور اصل میں پاکستان کو دی گئی تھیں۔ البتہ حتمی ایوارڈ میں یہ بھارتی پنجاب میں شامل کر دی گئیں۔ کمیشن کے ممبر جسٹس منیر احمد نے دعویٰ کیا ہے کہ سر ریڈ کلف نے تحصیل زیرہ، فیروز پور اور تحصیل فاضلکا کا ایک حصہ مغربی پنجاب کو دینے پر اتفاق کیا تھا۔ اسی طرح وہاں کا ہیڈ ورکس بھی پاکستان کو ملنا تھا (Munir,1973:55)۔ انہوں نے یہ دعویٰ کی بھی کیا ہے کہ انہیں رشوت دے کر منٹگمری کو بھی بھارت میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ ریڈ کلف لاہور بھی بھارت کو دینے کے درپے تھے تاہم میرے بھرپور احتجاج پر انہوں نے اپنا ذہن تبدیل کر لیا (Ibid: 50-55)۔ اسی طرح چودھری محمد علی جو بعد ازاں پاکستان کے وزیر اعظم بنے اور وائسرائے کی سربراہی میں پارٹیشن کونسل کی سٹیئرنگ کمیٹی کے رکن تھے نے یہ دعویٰ کیا کہ انگریز واضح طور پر سکھوں کے حق میں متعصب تھے۔ اسی لیے مسلم اکثریت والی گورداس پور کی تحصیلیں اور فیروز پور، امرتسر اور جالندھر کے مسلمانوں کے اکثریت والے علاقے بھارت میں شامل کر دیے گئے (Ali,1998: 210-21)۔

کرپال سنگھ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن کے سیکرٹری سر جارج ایبل نے جو نقشہ تیار کیا تھا اس میں تحصیل فیرور پو راور زیرہ شامل تھیں اور یہ نقشہ گورنر جینکنز کو ارسال کیا گیا تاہم کرپال سنگھ نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ یہ غیر رسمی نقشہ تھا جو جاری مذاکرات کی صورتحال ظاہر کرتا تھا اور حتمی نہیں تھا (Singh,1972: 99-103)۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ پنجاب باؤنڈری کمیشن کے مسلمان ارکان جسٹس دین محمد اور جسٹس منیر احمد کو اس بات کا پتہ تھا کہ گورداسپور بھارت میں شامل ہو گا۔ انہوں نے اس ضمن میں دی ٹربیون کی 26 اپریل 1960 (جو ان دنوں انبالہ کینٹ سے شائع ہوتا ہے) کی اشاعت میں جسٹس منیر احمد کا شائع ہونے والے ایک بیان کا بھی حوالہ دیا:

> آج مجھے یہ انکشاف کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی... مجھے اور مسٹر دین محمد کو بحث کے بہت شروع میں اس بات کا واضح پتہ تھا کہ گورداسپور بھارت میں شامل ہو گا اور ہمارے وا سے بڑی شروع میں مسلم لیگ کے ہماری مدد کے لیے تعینات عناصر تک پہنچا دیے گئے تھے (Ibid: 99)۔

البتہ الاسٹیئر لیمب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جس نقشے کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ باقاعدہ شائع ہوا تھا اور 8 اگست تک اس کی حیثیت سرکاری ہی تھی۔ تب ماؤنٹ بیٹن کی ہدایت پر بعض انگریز افسروں نے اس میں جعلسازی سے تبدیلی کی اور اسے ویول پلان کے تحت روپ دے دیا۔ یہ پلان کانگریس نواز لیڈر وی پی مینن نے تیار کیا تھا۔ یہ تبدیلیاں سکھوں کا غم و غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے عمل میں لائی گئیں جنہوں نے 8 اگست کو نقشہ دیکھ لیا تھا (72-61 :1997)۔

پنجاب باؤنڈری کمیشن میں ہونے والی بحث کے محتاط تجزیے سے ایک اور نکتہ سامنے آتا ہے کہ: ریڈ کلف ایوارڈ میں بنیادی طور پر مسلم اور غیر مسلم اکثریتی اور ملحقہ علاقوں کے اصول کی بنیاد پر تقسیم پر غور کیا گیا اور اس میں جائیداد کے دعوؤں کی بنیاد پر تقسیم کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ بالخصوص کانگریس اور سکھوں کے لائل پور اور منٹگمری کے نہری اراضی والے دعوے کو آبادی کے فیکٹر پر ترجیح نہیں دی گئی۔ چنانچہ ان علاقوں میں جہاں سکھوں اور ہندوؤں کی اراضی اور شہری املاک تھیں وہ پاکستان میں چلی گئیں۔ اگر اس تناظر سے دیکھا جائے تو ریڈ کلف ایوارڈ میں کانگریس اور سکھوں کے مقابلے میں مسلم لیگ کے دعوؤں سے زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔

دوسری طرف یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ ریڈ کلف کی طرف سے مسلم اکثریت والی سات تحصیلیں مشرقی پنجاب میں شامل کرنے کا مقصد سکھوں کے مطالبات کو کس حد تک مناسب طریقے سے پورا کرنا تھا۔ یہ طرز عمل انگریز حکومت کے کئی اعلیٰ حکام کی طرف سے ماضی میں سامنے آتا رہا تھا جس میں سکھوں کو خصوصی حیثیت دینے کی بات کی گئی تھی۔ اگر ریڈ کلف کھلے عام اس بات کا اعتراف کر لیتے تو شاید باؤنڈری کمیشن کے ایوارڈ پر اتنا تنازعہ پیدا ہوتا نہ سازشی نظریات جنم لیتے۔

ریڈ کلف ایوارڈ تقریباً ویول کے سرحدوں کی حد بندی کے پلان سے مماثل تھا

ریڈ کلف ایوارڈ کا ایک قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ اس میں سرحدوں کی حد بندی تقریباً اسی طرح کی گئی تھی جس طرح 7 فروری 1946 کے باؤنڈری ڈی مارکیشن پلان میں کی گئی تھی۔ یہ پلان وائسرائے ویول کے 27 دسمبر 1945 کے ٹاپ سیکرٹ بریک ڈاؤن پلان کا حصہ تھا۔ ویول نے کہا کہ تھا کہ امر تسر بہر صورت بھارت میں جانا چاہیے جو کہ سکھوں کا مقدس ترین مقام تھا۔ اسی تناظر میں گورداس پور بھی بھارت کو ملنا چاہیے جو امر تسر کی سکیورٹی کے حوالے سے اہم ہے کیونکہ گورداس پور پاکستان کو دینے سے امر تسر شمال اور مغرب کی طرف سے پاکستان کے گھیرے میں آ جائے گا۔ جنوب میں فیروز پور ضلع میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے، اگرچہ اس کی دو تحصیلیں زیرہ اور فیروز پور مسلم اکثریت کی حامل تھیں۔ ویول اس وقت یقیناً سرحدوں کی حد بندی کے لیے تحصیلوں کی بجائے ملحقہ اضلاع کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ ریڈ کلف نے تحصیل قصور میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود اس کے کچھ حصے بھارت کو دے دیے۔ تحصیل قصور میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد 2 لاکھ 37 ہزار 36 تھی، ہندوؤں کی تعداد بشمول شیڈول کاسٹس 34 ہزار 591 جبکہ سکھوں کی آبادی ایک لاکھ 23 ہزار 446 تھی (Census Punjab, 1941: 61)۔

ریڈکلف ایوارڈ میں بادی النظر میں ویول کی عقلی دلیل کو تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈ کلف کے قبل ازیں تیار کیے گئے مسودے میں تبدیلی کرنے کے لیے دباؤ ڈالا ہو۔ یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ فیروز پور مجموعی طور پر غیر مسلم اکثریت کی حامل تھی۔ البتہ کسی مرحلے میں تحصیل زیرہ اور تحصیل فیروز پور پاکستان میں شامل ہو جاتیں۔ تقسیم کے اس فیصلے کو ضلع گورداس پور کی مسلم اکثریت والی تحصیلیں بٹالہ اور گورداسپور بھارت کو دے کر متوازن بنایا جا سکتا تھا۔ البتہ فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلیں پاکستان کو نہ دی گئیں، ریڈکلف نے کبھی کھل کر اس بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کا بڑا مقصد امر تسر کو تین اطراف شمال، مغرب اور جنوب کی طرف سے پاکستان کے گھیرے میں جانے سے بچانا ہو۔ تحصیل قصور کے کچھ حصے بھارت کو اس لیے دیے گئے ہوں گے تاکہ امر تسر اور لاہور کے درمیان بارڈر کو ہم فاصلہ بنایا جا سکے۔ یوں یہ سرحد ایک طرف واہگہ (پاکستان) جبکہ دوسری طرف اٹاری (بھارت) کے درمیان کھینچی گئی۔

انٹرویوز

حمید اختر، لندن 19 مئی 2002

سید افضال حیدر، لاہور 13 اپریل 2003

سید احمد سعید کرمانی، لاہور 31 اکتوبر 2005

References

Ahmed, Ishtiaq, *'The 1947 Partition of the Punjab: Arguments put forth before the Punjab Boundary Commission by the Parties Involved'* in Ian Talbot and Gurharpal Singh (eds), *Region and Partition: Bengal, Punjab and the Partition of the Subcontinent,* Karachi: Oxford University Press, (1999).

Ali, Chaudhri Muhammad , *The Emergence of Pakistan,* Lahore: Research Society of Pakistan, (1998).

Jeffrey, Robin, *'The Punjab Boundary Force and the Problem of Order, August 1947', Modern Asian Studies*, Vol. VIII, No. 4, Cambridge: Cambridge University Press, (1974).

Lamb, Alastair, *Incomplete Partition: The Genesis of the Kashmir Dispute 1947-1948,* Hertingfordburg, Hertfordshire: Roxford Books, (1997).

Munir, Muhammad, *Chief Justice Munir: His Life, Writings and Judgments,* Lahore: Research Society of Pakistan, (1973).

Singh, Kirpal, *The Partition of the Punjab,* Patiala: Punjab University Patiala, (1972).

Singh, K., *Select Documentation on Partition of Punjab – 1947,* Delhi: National Book Shop, (1991).

Tan, T. Y., and Kudaisya, G., *The Aftermath of Partition in South Asia,* London: Routledge, (2000).

Official documents

Carter, Lionel, (ed), *Punjab Politics, 3 March – 31 May 1947, At the Abyss, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents,* New Delhi: Manohar, (2007b).

Census of India, 1941, Vol. VI, *Punjab*, Simla: Government of India Press, (1941).

Mansergh, Nicholas and Moon, Penderel (eds.),*The Transfer of Power 1942-47*, Vol. XI, *The Mountbatten Viceroyalty, Announcement and Reception of the 3 June Plan, May 31 to July 7, 1947*, London: Her Majesty's Stationery Office, (1982).

Mansergh, Nicholas and Moon, Penderel (eds.), *The Transfer of Power 1942-47.* Vol. XII, *The Mountbatten Viceroyalty, Princes, Partition and Independence, July 8 to August* XV, *1947*, London: Her Majesty's Stationery Office,(1982.

The Partition of the Punjab 1947, Volumes I, II and III, (official documents compiled originally by Mian Muhammad Sadullah for the National Documentation Centre, Lahore) Lahore: Sang-e-Meel Publications, (1993).

Newspapers

The Pakistan Times, Lahore, 1947.

The Tribune, Lahore, 1947

13

پنجاب کا بٹوارہ، یکم جولائی - 14 اگست 1947

جولائی 1947 کا آغاز عارضی امن کے قیام سے ہوا کیونکہ جون کے آخری ہفتے میں شروع کیے گئے امن اقدامات کی بازگشت ہر جگہ سنائی دی گئی اور امن کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ یکم جولائی کو امرتسر میں مرکزی امن کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کے اجلاس میں کالا کیشورام سیکھری، محمد اسماعیل عیسیٰ اور میاں غلام محمد نے تقریریں کیں اور بین المذاہب امن اور ہم آہنگی کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقع پر یہ فیصلہ کیا گیا محلے کی سطح پر بھی امن کمیٹیاں قائم کی جائیں گی۔(Pakistan Times, 3 July)۔ 4 جولائی کو راولپنڈی بار کے دو وکیلوں ٹی آر بھسین اور اے آر چنگیز نے ایک اخباری بیان میں کہا: ''برطانوی حکومت کی طرف سے 3 جون کے اعلان آزادی کے بعد قتل عام جاری رکھنا نامعقول ہے۔ اس بات کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ نہ کیا جائے۔ اقلیتیں پاکستان اور بھارت دونوں میں محفوظ ہوں گی'' (Pakistan Times, 5 July)۔

گزشتہ ماہ سے لاہور، امرتسر، راولپنڈی اور گوجرانوالہ میں لگایا گیا کرفیو بدستور جاری رہا بلکہ اسے بعض نئے علاقوں تک توسیع دی گئی۔ انٹیلی جنس رپورٹوں میں خبردار کیا گیا کہ سکھ مشرقی اضلاع میں منظم ہو رہے تھے اور سرحد کی حد بندی اپنی توقعات کے مطابق نہ ہونے کی صورت میں خانہ جنگی کے لیے بھی تیار تھے۔ جولائی کے دوسرے ہفتے سے آگے تک امرتسر، گورداسپور اور ہوشیارپور کے اضلاع میں سکھوں کے جتھے دیہی علاقوں میں گشت کرتے رہے اور انہوں نے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا۔ ضلع ہوشیارپور کے شہر اور بعض دیہات میں پہلے بھی جھڑپوں کی اطلاعات آتی رہی تھیں لیکن صورتحال اچانک اس وقت بگڑ گئی جب رائفلوں، دستی بموں اور کرپانوں سے لیس سکھوں نے پٹھان مزدوروں پر حملہ کر کے انہیں ہلاک کر دیا۔ ایسے واقعات ضلع کے کئی علاقوں میں ہوئے۔ دوسری طرف مسلمانوں پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے گوجرانوالہ میں فائرنگ کر کے کئی سکھوں اور ہندوؤں کو مار ڈالا۔

سکھوں کی گڑبڑ کرنے کی تیاریاں

برطانوی خبر رساں ادارے رائٹر نے 8 جولائی کو رپورٹ دی کہ پورے پنجاب اور دہلی میں سکھوں نے تقسیم کے فیصلے کے خلاف احتجاجاً بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھ لی ہیں۔ گوردواروں کے ایک اجتماع میں منظور کی جانے والی قرارداد میں کہا گیا: ''ایسی کوئی بھی تقسیم جس سے سکھوں کی یکجہتی اور یگانگت کا تحفظ نہ ہوتا ہو وہ قبول نہیں کی جائے گی اور اس سے مشکلات پیدا ہوں گی۔'' رائٹر نے بتایا کہ ہندوستان کی عبوری حکومت کے وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ نے کہا کہ اگر باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ سکھوں کے خلاف جاتا ہے تو سکھ ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں(Mansergh and Moon,1983: 17-18)۔

7جولائی کو اپنی پندرہ روزہ رپورٹ میں چیف سیکرٹری نے لکھا کہ 'دی ٹربیون' سمیت ہندو پریس سکھوں کو تشدد کے لیے اکسا رہا تھا تا کہ باؤنڈری کمیشن سے مطالبات منوائے جا سکیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کے اخبارات پنجاب کی تقسیم کی مخالفت بدستور جاری رکھے ہوئے تھے اور بالخصوص وہ امرتسر کی بھارت میں شمولیت کے خلاف تھے۔ اس کے علاوہ ممدوٹ اور فیروز خان نون سکھوں کے اس مطالبے کا مذاق اڑا رہے تھے کہ گورداس پور بھارت میں شامل ہونا چاہیے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ سکھ مسلمانوں کے ساتھ تصفیہ کریں اور پنجاب کو متحد رہنے دیں(IORL/P&J/5/250)۔

لاہور میں ریلوے ملازمین کا تصادم

اب تک لاہور میں ریلوے ملازمین کو فرقہ وارانہ تشدد نے متاثر نہیں کیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ٹریڈ یونین کی قیادت کمیونسٹوں کے ہاتھ میں لیکن بالآخر 10 جولائی کو پرولتاری یکجہتی کا یہ مرکز بھی فرقہ وارانہ پاگل پن کی تاب نہ لا سکا (Pakistan Times,11 July)۔ جینکنز کی 14 جولائی کی رپورٹ میں اس واقعے کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا کہ ریلوے ورکشاپ کی کنٹین جس کا ٹھیکہ ایک سکھ کے پاس تھا کے باہر کریکر دھاکہ ہوا۔ اس میں اگرچہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا لیکن ردعمل کے طور پر سکھوں اور مسلمانوں میں دست بدست لڑائی شروع ہوگئی اور کرپانیں اور چاقو باہر نکل آئے۔ چنانچہ آٹھ افراد تمام کے تمام سکھ مارے گئے۔ پینتیس افراد زخمی ہوئے جن میں بتیس سکھ، دو ہندو تھے جبکہ ایک مسلمان تھا۔ رپورٹ میں الزام لگایا گیا کہ امکان ہے کہ مسلمانوں کو حملے کے لیے اکسایا گیا ہو کیونکہ انہوں نے سکھوں کو ان کی کرپانوں سے ہی نشانہ بنایا۔ اسی رپورٹ میں گورنر نے ضلع امرتسر میں کئی افراد کے قتل اور ایک، دو گاؤں پر حملوں کی بھی اطلاع دی۔ بیشتر کیسوں میں جارحیت سکھوں کی تھی(Ibid)۔ پاکستان ٹائمز نے 16 جولائی کو خبر شائع کی کہ سکھوں نے باؤنڈری کمیشن سے 'دیگر عوامل' کے حوالے سے امیدیں باندھ لی ہیں اور سردار سورن سنگھ دریائے چناب کو بطور سرحد تسلیم کرنے کے خواہاں ہیں۔۔۔ سکھوں کا یہ موقف اس وقت سے سامنے آ رہا تھا جب سے پنجاب کی تقسیم کی بحث (1940 کی دہائی) شروع ہوئی تھی۔ اسی دوران حکومت نے متوقع طوائف الملوکی اور ناگزیر شورش سے نمٹنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

اس عرصے کے دوران 'پاکستان ٹائمز' اور 'دی ٹربیون' تقریباً ہر روز امرتسر اور لاہور میں چھرا گھونپنے اور آگ لگانے کے واقعات کی خبریں شائع کر رہے تھے۔ اگرچہ جولائی کے پہلے تین ہفتے نسبتاً کم تشدد کے حامل تھے۔ روزوں کا مہینہ رمضان المبارک جولائی کے تیسرے ہفتے سے شروع ہوا اور روزے داروں کی سہولت کے لیے حکومت نے پوری رات کا کرفیو ختم کر کے صرف رات 11 بجے سے صبح 3 بجے تک کا مخصوص کر دیا۔(Pakistan Times,19 July)۔ انتظامیہ کی رائے میں پنجاب کی مجموعی صورتحال 'مستحکم' تھی۔ صوبائی ہوم سیکرٹری اے، اے میکڈونلڈ کا کہنا تھا کہ راولپنڈی، جہلم، گجرات، ملتان، جالندھر حتیٰ کہ امرتسر میں صورتحال معمول کی طرف لوٹ رہی تھی۔ صرف میانوالی میں گڑبڑ کا خدشہ تھا جہاں 8 ہزار مسلح پٹھان جمع ہو چکے تھے(Ibid)۔

انتظامیہ کی طرف سے ایسی خوش فہمی محض تصوراتی تھی۔ لاہور میں آر ایس ایس بم حملوں کی مہم چلا رہی تھی اور پولیس انٹیلی جنس کی رپورٹ تھی کہ یہ بم اکالی سکھوں کی اعلیٰ قیادت آر ایس ایس کو فراہم کر رہی

تھی۔(RSS in the Punjab, 1948: 18-19)۔ 18 جولائی کو آر ایس ایس کے انتہا پسند ورکروں نے سانده روڈ کی ایک فیکٹری سے نکلنے والے مسلم ورکروں پر بم حملہ کیا، یہ علاقہ ہندوؤں کے مضبوط گڑھ کرشن نگر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ حملے میں بارہ مزدور زخمی ہوئے۔(Pakistan Times, 19 July)۔ اس کے بعد 20 جولائی کو مسلم اکثریت والے علاقے بھاٹی گیٹ کے ایک سینما گھر میں بم دھماکہ ہوا جس میں تین افراد ہلاک اور چوبیس زخمی ہو گئے۔ اگلے ہی روز مغلپورہ ریلوے سٹیشن پر ایک ٹرین کی بوگی میں بم پھینکا گیا۔ اسی طرح لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر 9 پر بھی بم پھٹا (Pakistan Times, 22 and 23 July)۔ امرتسر میں بھی بم دھماکوں کے پے در پے واقعات ہو رہے تھے۔ حملہ آور شر پسند زیادہ تر ہندو اور سکھ تھے۔ 21 جولائی کی پندرہ روزہ خفیہ رپورٹ میں چیف سیکرٹری نے اس رائے کا اظہار کیا کہ سکھوں کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ پنجاب کی تقسیم پر اصرار کر کے انہوں نے سکھ پنتھ کے اتحاد اور یکجہتی کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ انہوں حکومت کو خبردار کیا کہ اگر نہری کالونیاں مشرقی پنجاب میں شامل نہ کرنے کی کوشش کی گئی تو خطرناک صورتحال جنم لے سکتی تھی(IORL/P&J/5/250)۔

پنجاب کی تقسیم پر تشویش اور مایوسی کا اظہار کرنے والی آوازیں

شورش اور بدامنی کے ایسے حالات میں پنجاب کی تقسیم کے مضمرات پر مایوسی اور تشویش کی آوازیں بھی اٹھنا شروع ہو گئی تھیں۔ پنجاب کی تقسیم کا سب سے پہلے مطالبہ سکھوں نے ہی کیا تھا لیکن جب 'منطقی تقسیم' کے اصول پر سترہ اضلاع مغربی پنجاب میں اور صرف بارہ مشرقی پنجاب میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو انہیں خوف لاحق ہوا کہ ان کی کمیونٹی دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی اور تقریباً برابر تعداد میں سکھ دونوں ملکوں میں رہ جائیں گے۔ 26 جولائی کو سکھ رہنما گیانی کرتار سنگھ نے اعلان کیا کہ سکھ کمیونٹی غیر منصفانہ تقسیم قبول نہیں کرے گی۔ ہمیں ہر صورت میں ننکانہ صاحب جیسے مقدس مقامات چاہئیں۔ انہوں نے سکھوں کا موقف دہراتے ہوئے کہا کہ پنجاب کی بین الاقوامی سرحد کا تعین کرتے ہوئے ملحقہ مسلم اور غیر مسلم اکثریت کے فیکٹر کے ساتھ 'دیگر عوامل' کو بھی مد نظر رکھا جائے(Tribune, 28 July)۔ دوسری طرف مسلمان جو متحدہ صوبے کے حق میں مہم چلاتے رہے تھے انہوں نے پنجاب مسلم لیگ کی ٹاؤن کمیٹیوں کی طرف سے حکومت کو پٹیشن بھجوانے کا فیصلہ کیا کہ صوبے کو تقسیم نہ کیا جائے۔

23 جولائی کو تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب میں رہنے والے مسلمانوں کی حالت زار کے حوالے سے خدشات پر مبنی ایک دلچسپ خط پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا۔ اس میں بیرسٹر محمد علی نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر مشرقی پنجاب کے غیر مسلم اکثریت والے بارہ اضلاع میں مسلمان انتظامی افسر نہیں ہوں گے تو مسلمان مکمل طور پر غیر مسلم انتظامی افسروں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ انہوں نے خط میں لکھا کہ:

> مسلم افسروں کا پاکستان کو ہجرت کرنا دانشمندی ہو گی نہ اچھی سیاست ہو گی نہ ہی اچھی حب الوطنی۔ میں جانتا ہوں کہ کچھ مسلمان افسر ہندوستان میں اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان ہیں لیکن کیا وہ اپنے ان کروڑوں مسلمانوں کی خدمت کرنے کے لیے خود کو تھوڑا مضبوط نہیں کر سکتے جو پہلے سے کہیں زیادہ آج ان کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں(Pakistan Times, 23 July)۔

میں نے جولائی 2002 میں واشنگٹن میں مشرقی پنجاب کے ضلع لدھیانہ کے گاؤں جگراں سے تعلق رکھنے والے شخص ابو لفضل محمود کا انٹرویو کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ محمد علی جناح نے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ بھارت میں ہی رہیں تاکہ وہاں کی مجموعی مسلم اقلیت کی مدد کی جاسکے۔ میں نے اپنے لیڈر کی اس اپیل پر لبیک کہا لیکن ان حالات میں وہاں رہنا ممکن نہیں تھا کیونکہ غیر مسلم عناصر چن چن کر مسلمانوں کو مار رہے تھے۔ میں (مصنف) نے جناح کی یہ اپیل ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی۔ ان کی تقاریر اور دیگر دستاویزات کے مجموعے 'جناح پیپرز' کو بھی چھان مارا لیکن وہاں سے کچھ نہیں ملا۔ 'پاکستان ٹائمز' اور 'دی ٹربیون' میں بھی یہ اپیل کہیں نظر نہیں آئی۔

بہر حال انتظامیہ کو مسلسل اس بات کی تشویش لاحق تھی کہ پنجاب کی تقسیم کے معاملے (یعنی انتظامی مشینری کی تقسیم) سے کیسے نمٹا جائے۔ جینکنز نے اپنی 14 جولائی کی خفیہ رپورٹ میں لکھا کہ:

> سرحد کی حد بندی کا معاملہ ہر آدمی کے ذہن میں ہے... اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ غیر مسلم ملازمین مغربی پنجاب میں تعیناتی کے حوالے سے کافی گھبرائے ہوئے ہیں جبکہ مسلمان ملازمین مشرقی پنجاب میں نہیں رہنا چاہتے۔ انڈین سول سروس میں ایک بھی سکھ یا ہندو افسر ایسا نہیں جو مغربی پنجاب میں رہنا چاہتا ہو جبکہ صرف ایک مسلم آئی سی ایس افسر جس کا خیال تھا کہ مسلم لیگ اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گی مشرقی پنجاب میں تعیناتی پر رضامند ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ دیگر سروسز میں بھی یہی صورتحال ہے۔ ایسے محسوسات کی موجودگی میں یہ بات حیران کن نہیں۔ سرحدوں کا مسئلہ ایک اہم ایشو بن چکا ہے بلکہ یہ دونوں نئی ریاستوں کے درمیان جنگ کی وجہ بھی بن سکتا ہے۔ باؤنڈری کمیشن کے چیئرمین آج لاہور آئے اور وہ سمجھتے ہیں کہ 15 اگست سے قبل حد بندی کا اعلان ممکن ہے۔ اگر ایوارڈ دیا جاتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ آزادی ہند بل کی دفعہ 4 کے تحت ایوارڈ باؤنڈری 'منطقی' سرحد پر حاوی ہو جائے گا اور 15 اگست کو انتقال اقتدار کے لیے اس پر ہر صورت میں عملدرآمد ہونا چاہیے۔ اگر میری رائے ٹھیک ہے تو کافی زیادہ ابہام پیدا ہو گا کیونکہ ہم نے زیادہ تر تیاری 'منطقی' سرحد کے لیے کی تھی اور تبدیل شدہ صورتحال سے نمٹنے کے لیے کچھ وقت لگ سکتا ہے۔ غالب امکان ہے کہ انتقال اقتدار کے عمل کو بدامنی کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن ابھی واضح نہیں کہ یہ بدامنی 15 اگست سے پہلے یا بعد میں ہو گی اور اس کی شدت کتنی ہو گی۔ سکھ لازمی طور پر مسائل کھڑے کریں گے۔ اس بات کا امکان نہیں کہ وہ کوئی سرحد قبول کریں گے اور اب تو مجھے کانگریس اور مسلمانوں کے حوالے بھی اسی رویے کا مظاہرہ نظر آرہا ہے (Carter, 2007b: 160)۔

مشرقی پنجاب کا سول سیکرٹریٹ شملہ منتقل ہونے کی ہدایت

22 جولائی کو ماؤنٹ بیٹن لاہور میں تھے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ مشرقی پنجاب سیکرٹریٹ کو 10 اگست تک شملہ منتقل کر دیا جائے اور اگر لاہور کو مشرقی پنجاب میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے تو مغربی حصے کا سیکرٹریٹ بھی کسی اور جگہ منتقل ہونے کی تیاری کرے (Tribune, 23 July)۔ اگرچہ اس بیان سے لاہور کے مستقبل کے معاملے میں غیر جانبداری نظر آتی ہے لیکن ہندوؤں اور سکھوں نے اسے اس بات کا اشارہ سمجھا کہ مشرقی پنجاب کے سیکرٹریٹ کو تو لاہور سے دور منتقل ہونے کا حکم دیا گیا ہے جبکہ مغربی

پنجاب کا سیکرٹریٹ بدستور پنجاب میں ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور پاکستان کو دیا جا رہا ہے۔ البتہ لاہور شہر اور ضلع میں مسلمانوں کی واضح اکثریت کے باوجود غیر مسلم بدستور یہ سمجھ رہے تھے کہ 'دیگر عوامل' کی بنا پر لاہور بھارت کو دیا جائے گا۔

میں نے جن ہندوؤں اور سکھوں کے انٹرویو کیے ان میں سے اکثر کا خیال تھا کہ ماؤنٹ بیٹن کے 22 جولائی کے بیان کے بعد مشرقی پنجاب کی طرف سکھوں اور ہندوؤں کی بڑے پیمانے پر نقل مکانی میں تیزی آ گئی۔ جنوری 1947 تک مغربی پنجاب میں ان کی تعداد تقریباً تین لاکھ تھی جن میں اب مسلسل کمی آ رہی تھی۔ اگرچہ فروری سے ہی نقل مکانی کا عمل شروع ہو گیا تھا لیکن مارچ کے فسادات پھر مئی میں آگ لگانے کے واقعات بالخصوص جون کے تشدد سے بڑے پیمانے پر نقل مکانی میں شدت آتی چلی گئی۔ 22 جولائی کے بعد صوبائی دارالحکومت سے مزید کئی غیر مسلم نقل مکانی کر کے محفوظ ٹھکانوں کی تلاش میں چلے گئے۔

جولائی کے اختتام تک انگریزی حکومت کی رٹ انتہائی کمزور ہو گئی اور بدترین تشدد صوبے کے دیگر حصوں تک پھیل گیا۔ زیادہ تر خراب صورتحال ابھی تک شہری علاقوں میں تھی۔ صرف امرتسر میں سکھوں کے منظم جتھوں نے مسلمانوں کے دیہات پر حملے کیے اور انہیں مسلمانوں کے مضبوط گڑھ امرتسر شہر میں پناہ لینے کے لیے مجبور کر دیا۔ 'پاکستان ٹائمز' اور 'دی ٹربیون' نے چھرا گھونپنے، آگ لگانے اور بم پھینکنے کے واقعات کی نئی لہر کی خبریں شائع کیں۔ ماضی کی طرح اس رجحان نے امرتسر اور لاہور کے واقعات کی تقلید میں جڑ پکڑی۔ 26 جولائی اتوار کو لاہور کینٹ کے قریبی علاقے دھرم پورہ میں بم کا زوردار دھماکہ سنا گیا جس میں کئی افراد زخمی ہوئے تاہم کوئی ہلاکت نہ ہوئی۔ ریوالور سے گولیاں بھی چلائی گئیں اور ہنگامہ آرائی ہوئی۔ مغربی پنجاب کے لیے نامزد آئی جی پولیس قربان علی خان، ضلع مجسٹریٹ ایو سٹاس، ایس ایس پی اور کنٹونمنٹ مجسٹریٹ شیخ غلام احمد جائے وقوعہ پر پہنچ گئے اور کچھ گرفتاریاں بھی ہوئیں (Pakistan Times, 29 July)۔

امرتسر میں حالات اب ہندوؤں اور سکھوں کے حق میں بدلنا شروع ہو گئے تھے جبکہ مسلمان تشدد کا مسلسل شکار ہونے لگے تھے۔ بالخصوص دیہی علاقوں میں سکھوں کے جتھے قتل عام اور جلاؤ گھیراؤ میں مصروف تھے۔ ہر حملے میں خواتین کو بھی اغوا کیا گیا۔ ترن تارن کے علاقے میں زوردار بم دھماکے کی آواز سنی گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جی ایم برینڈر، بریگیڈیئر سٹوارٹ، ایس پی ایل وی ڈین، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جے ڈی فریسر اور پولیس کی ایک پارٹی نے تحصیل ہیڈ کوارٹر پر چھاپہ مارا تو وہاں بم بنانے والی فیکٹری پکڑی گئی۔ بظاہر یہ بم اتفاق سے پھٹ گیا تھا۔ 'پاکستان ٹائمز' نے 31 جولائی کو رپورٹ دی کہ ضلع امرتسر کی انتظامیہ نے دوبارہ بتایا ہے کہ ضلع میں حالات ایک بار پھر قابو سے باہر ہو رہے تھے۔

جولائی کا اختتام ہندوؤں کے کانگریس پارٹی امرتسر کے خلاف غم و غصے کے اظہار کے ساتھ ہوا۔ آر ایس ایس طویل عرصے سے کانگریس کی قیادت بالخصوص گاندھی اور نہرو کے خلاف پراپیگنڈہ کر رہی تھی۔ انٹیلی جنس ایجنسیوں نے آر ایس ایس کے اجلاسوں کے بارے میں جو رپورٹیں دیں ان میں نہ صرف جناح اور مسلم لیگی قیادت کو بلکہ گاندھی اور نہرو کو ہندوستان کی تقسیم پر رضامند ظاہر کر کے پنجاب کے ہندوؤں کو نیچا دکھانے کا مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ 31 جولائی کو مہاتما گاندھی کا ٹرین پر کشمیر جاتے ہوئے امرتسر میں سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کیا گیا۔ ہندو طلبا نے امرتسر سٹیشن پر ٹرین روک لی اور 'گاندھی واپس جاؤ، گاندھی، کانگریس مردہ باد' کے نعرے لگائے۔ علاقہ مجسٹریٹ ریاض قریشی نے ریلوے پولیس کو حکم دیا کہ مظاہرین کو پیچھے دھکیل دیا جائے (Pakistan Times, 1 August)۔

30 جولائی کی پندرہ روزہ رپورٹ میں گورنر جینکنز نے مغلپورہ ورکشاپ میں ہونے والے واقعے کا ذکر کیا ہے اور لاہور، امرتسر ریجن سے گورداسپور ضلع اور وہاں سے جالندھر ہوشیارپور بارڈر تک پھیلنے والے تشدد کو نمایاں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ 19 جولائی کے بعد سے تقریباً ہر روز بم دھماکوں کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ یہ شر پسند ہندو اور سکھ تھے۔ لاہور اور امرتسر کے ارد گرد دیہات پر بلا تعطل حملے کیے جا رہے تھے۔ سکھ لیڈروں نے اپنی کمیونٹی کو 27 جولائی کو ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ میں جمع ہونے کی کال دی۔ اس اجتماع میں 1500 افراد نے شرکت کی۔ س موقع پر کی گئی تقریروں میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا مطالبہ کیا گیا تاہم ڈپٹی کمشنر نے موقع پر مداخلت کر کے انہیں پرامن انداز میں منتشر کر دیا(Carter, 2007b:177-9)۔ پنجاب کی مجموعی صورتحال کے بارے میں گورنر نے لکھا کہ:

> تقسیم کے حوالے سے مجموعی طور پر کوئی جوش وجذبہ نظر نہیں آتا۔ قدرتی بات ہے کہ مسلمان قیام پاکستان پر خوش ہیں لیکن پنجاب کی بات ہو تو وہ پورا پنجاب چاہتے ہیں۔ دوسری طرف ہندو اور سکھ ملول ہیں اور لاہور چھوڑنے میں انتہائی ہچکچاہٹ کا شکار ہیں۔ یہ بات انتہائی مشکل ہو گی کہ 30 ملین آبادی والے ایک ایسے صوبے کو محض چھ ہفتوں میں تقسیم کر دیا جائے جو گزشتہ 98 برس سے ایک ہی انتظامی یونٹ کے طور پر چلایا جا رہا تھا۔ چاہے تمام فریق دوستانہ انداز میں ہی تقسیم پر کیوں نہ رضامند ہوں(Ibid: 179)۔

لاہور سے رخصتی کی آپ بیتیاں

ڈاکٹر جگدیش چندر سرن

ڈاکٹر چندر سرن کے مارچ 1947 اور لاہور کے دیگر واقعات کے بارے میں تاثرات قبل ازیں دیے جا چکے ہیں۔ انہوں نے لاہور چھوڑنے کا فیصلہ جولائی میں کیا تھا، وہ یاد کرتے ہیں کہ:

''میں جالندھر جانے کے لیے 9 یا 10 جولائی کو روانہ ہوا کیونکہ میرے بعض دوستوں نے ہمیں خبردار کیا تھا کہ ہمارے گھر پر حملہ ہونے والا تھا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ حالات جب معمول پر آئیں گے تو تم واپس آ جانا۔ میرے دیگر اہل خانہ پہلے ہی جا چکے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کو ڈھونڈنے میں کئی ہفتے لگ گئے۔ میں نے لاہور دوبارہ واپس آنے کا سفر 11 اگست کو شروع کیا کیونکہ مجھے اپنی ملازمت پر پہنچنا تھا۔ البتہ واپس جاتے ہوئے میری ملاقات مغربی پنجاب سے بھاگنے والے ہندوؤں اور سکھوں سے ہوئی۔ ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ چنانچہ میں نے اندازہ لگایا کہ لاہور واپس جانا اب ممکن نہیں۔ لہٰذا میں نے فیصلہ تبدیل کر لیا۔ لاہور میں میرے چچا اور ایک کزن کو چھریوں سے زخمی کر دیا گیا اور وہ میو ہسپتال میں داخل ہوئے۔ انہوں نے میرے کولیگ ڈاکٹر محمد نذیر کو میرا نام بتایا جو میو ہسپتال میں ڈیوٹی پر تھا جس پر اس نے میرے چچا اور کزن کی ایسے دیکھ بھال کی جیسے وہ اس کے بھی چچا ہوں۔''

ڈاکٹر رامانند ساگر

بالی ووڈ کے معروف مصنف، ڈائریکٹر اور فلم اور ٹی وی پروڈیوسر ڈاکٹر رامانند نے بھی لاہور میں اپنے قیام کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اتفاق سے وہ ٹیمپل روڈ لاہور میں میرے آبائی گھر سے ایک کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر واقع محلے میں رہتے تھے جہاں میری پیدائش 24 فروری 1947 کو ہوئی تھی۔ رامانند نے بتایا:

''میں 29 دسمبر 1917 کو لاہور کے چھوٹے سے نواحی گاؤں آصل گرو کی میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا کاروبار کشمیر میں تھا لیکن میں لاہور کے علاقے مزنگ کے محلہ چاہ پچھواڑہ میں اپنے ننھیال کے ساتھ رہتا تھا۔ میرا بچپن چاہ پچھواڑہ میں ہی گزرا۔ ان دنوں تمام مذاہب کے بچے مل کر کھیلتے تھے اور بڑے لوگ دوسرے مذاہب کے افراد اور ان کی روایات کا احترام کرتے تھے۔ کم عمری کے دور میں کبھی کبھار میں مسلمان دوستوں کے ساتھ مسجد میں چلا جاتا تھا اور نماز میں شامل ہو جاتا۔ مجھے یاد نہیں کہ ہمارے محلے میں مختلف خاندانوں کے درمیان کبھی کشیدگی کا کوئی واقعہ رونما ہوا ہو۔

''کچھ عرصے بعد ہم نسبت روڈ کے ایک گھر پر منتقل ہو گئے۔ میں ڈی اے وی ہائی سکول میں پڑھا۔ مارچ 1940 میں مسلم لیگ کی طرف سے برصغیر میں مسلمانوں کے الگ وطن کے قیام کے مطالبے سے ماحول میں کچھ کچھ تناؤ محسوس کیا جا سکتا تھا لیکن مجموعی صورتحال ہم آہنگی کی ہی پائی جاتی تھی۔ اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہندوؤں کو لاہور سے جانا پڑے گا۔ ہمیں یقین تھا کہ لاہور بدستور ہندوستان کا حصہ رہے گا۔ لاہور کی مادی اور ثقافتی ترقی میں ہندوؤں اور سکھوں کا اتنا بڑا حصہ تھا کہ ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ لاہور ہم سے چھین لیا جائے گا۔

''کانگریس کے لیڈروں نے ہم سے کہا تھا کہ ہم (ہندو کمیونٹی) لاہور نہ چھوڑیں۔ البتہ ہر گزرتے روز کے ساتھ ہندوؤں اور سکھوں پر حملوں میں شدت آتی جا رہی تھی۔ جب معاملات بدترین مشکل اختیار کر گئے تو ہم جولائی کے آخر میں لاہور سے فرار ہو گئے۔ ہم پہلے سیالکوٹ گئے اور وہاں سے جموں اور پھر سری نگر پہنچے۔ عظیم اردو شاعر فیض احمد فیض جو میرے قریبی دوست تھے اگست میں کشمیر کے علاقے گلمرگ میں ہمارے گھر آئے اور ہمیں وہ واقعات بتائے جو ہمارے لاہور سے نکلنے کے بعد ہوئے تھے۔

''بعد ازاں اگست کے آخر میں جب پٹھانوں نے کشمیر پر حملہ کیا تو ہم بذریعہ طیارہ سری نگر سے دہلی چلے گئے۔ میں نے کچھ عرصہ دہلی میں کام کیا پھر بمبے آ گیا۔ اب یہاں اس شہر میں رہتے ہوئے مجھے 52 سال ہو گئے ہیں۔ مجھے فلم انڈسٹری میں زبردست کامیابی ملی لیکن میں اب بھی خود کو مہاجر سمجھتا ہوں۔ مہاجر ہونے کا احساس کبھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہ مستقل آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ لاہور ہمیشہ میرے دل میں رہتا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی دوبارہ لاہور جا سکوں گا۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ لاہور اب کافی بدل چکا ہے۔ (اس لیے اسے اب دیکھنے کی بجائے) میں تقسیم سے پہلے والے لاہور کی یادیں اپنے ذہن میں زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ یقیناً یہ ایک پیار محبت اور ہم آہنگی والا شہر تھا۔ اب جب میں پیچھے مڑ کر ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو اس دور کے واقعات دیکھ کر میں پہلے سے زیادہ اس بات کا قائل ہو گیا ہوں کہ ہندوستان کی تقسیم کے پیچھے انگریزوں کا ہاتھ تھا۔ وہ ہمیں آزادی مانگنے کی شیطانی انداز میں سزا دینا چاہتے تھے۔ ان کی حاکمیت کو چیلنج کرنے والوں کو زخم لگانے سے بڑھ کر انہیں کس چیز سے راحت مل سکتی تھی؟ میں نے تقسیم کے موضوع پر اپنے انداز میں ناول لکھا تھا جس کا عنوان تھا 'اور انسان مر گیا'۔''

یہ بات مد نظر رہے کہ راما نند نے 1980 کی دہائی میں ہندو مذہب کے موضوعات پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ مشہور ڈرامہ سیریل 'رامائن' بھی ان کی پیشکش تھی جو ٹی وی پر چلائی گئی۔ انہوں نے ہندو دیومالا پر اور بھی کئی ڈرامے پروڈیوس کیے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ایک سیکولر انسان دوست سوچ سے ہندو سوچ کی طرف مراجعت پر انہیں پشیمانی ہوئی ہے تو انہوں نے بتایا کہ نیکی اور بدی میں ازل سے کشمکش جاری ہے اور اب میں اپنے پیغام کو ہندو سوچ میں پیش کر رہا ہوں اور یہ پیغام دے رہا ہوں کہ نیکی ہی بہتر ہے۔

اگست: تشدد دیہی علاقوں کو بھی لپیٹ میں لے لیتا ہے

پھر اگست کا اہم مہینہ شروع ہو گیا۔ پنجاب کی تقسیم اب دنوں کی بات تھی۔ پنجاب باؤنڈری فورس نے یکم اگست سے امن وامان کی صورتحال قائم رکھنے کے لیے اپنا کام شروع کر دیا تھا لیکن پھر اچانک ہر طرف فسادات پھیل گئے۔ یکم اگست کو شام 6 بجے سے امرتسر شہر کے اندرونی علاقوں میں 36 گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ سکھ جتھوں نے دیہات میں مسلمانوں پر حملے تیز کر دیے تھے لیکن کچھ علاقوں میں مسلمانوں نے سخت مزاحمت کی۔ باؤنڈری فورس نے کچھ دیہات میں پہنچ کر حملہ آوروں کو پسپا کر دیا۔

14 اگست کو ماؤنٹ بیٹن کے نام تفصیلی یادداشت میں گورنر جینکنز نے اس الزام کو چیلنج کیا کہ پنجاب میں ان کی حکومت بدامنی روکنے میں ناکام رہی۔ انہوں نے بالخصوص ان الزامات کو مسترد کر دیا کہ انگریز افسر نااہل اور نرم رویے کے حامل تھے۔ البتہ انہوں نے ضمنی طور پر اس بات سے اتفاق کیا کہ آگ بجھانے والے محکمے بالخصوص امرتسر اور لاہور میں اچھی کارکردگی نہیں دکھا سکے۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ مارشل لا کے نفاذ سے بھی صورتحال میں بہتری نہیں آئے گی (Carter, 2007b:194-211)۔ انہوں نے 2 اگست تک ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد اس طرح بتائی:

الف: شہری علاقے	ہلاکتوں کی تعداد	شدید زخمی
لاہور	382	823
امرتسر	315	666
ملتان	131	230
راولپنڈی	99	171
کل تعداد	927	1890
ب: دیہات	**ہلاکتوں کی تعداد**	**شدید زخمی**
راولپنڈی	2,164	167
اٹک	620	30
جہلم	210	2
ملتان	58	50
گڑگاؤں	284	125
امرتسر	110	70

الف: شہری علاقے	**ہلاکتوں کی تعداد**	**شدید زخمی**
ہوشیارپور	51	19
جالندھر	47	51
دیگر اضلاع	44	36
کل تعداد	3588	550
مجموعی تعداد	**4632**	**2573**

جینکنز نے یہ اعتراف کیا کہ یہ اعداد و شمار نامکمل ہیں۔ بالخصوص گڑ گاؤں کے بارے میں اطلاعات ناقص ہیں جہاں رہنے والوں اور زخمیوں کو ان کے رشتہ دار سامنے نہیں لائے۔ لہٰذا ہلاکتوں کی کم سے کم تعداد 5 ہزار ہے اور 5200 سے زیادہ نہیں۔ شدید زخمیوں کی تعداد بھی تین ہزار سے کم نہیں ہو گی (Ibid: 200-201)۔ مختلف مذاہب کے جانی نقصان کے بارے میں گورنر کا تخمینہ تھا کہ راولپنڈی، اٹک، جہلم اور ملتان کے دیہی علاقوں میں تقریباً تمام مرنے والے افراد غیر مسلم تھے جبکہ دیگر علاقوں میں ہلاک ہونے والوں میں سے 'دو تہائی' مسلمان ہیں۔ چارٹ میں تفصیل اس طرح دی گئی تھی۔

الف: شہری علاقے	**ہلاکتیں**	**شدید زخمی**
مسلمان	522	1,011
غیر مسلم	522	1,012
کل تعداد	1,044	2,023
ب: دیہی علاقے	**ہلاکتیں**	**شدید زخمی**
مسلمان	357	201
غیر مسلم	3,231	349
کل تعداد	3,588	550
ج: مجموعی تعداد (دیہات اور شہر)	**ہلاکتیں**	**شدید زخمی**
مسلمان	879	1212
غیر مسلم	3,753	1316
کل تعداد	**4632**	**2573**

گڑ گاؤں کے بارے میں گورنر نے بتایا کہ وہاں زیادہ تر ہلاکتیں مسلمانوں کی ہوئیں۔ 5 ہزار مرنے والے افراد میں سے 1200 لازماً مسلمان تھے اور 3800 غیر مسلم تھے۔ 3000 شدید زخمیوں میں سے دونوں طرف کے 1500، 1500 افراد شامل تھے (Ibid:202)۔ بہر حال صحیح تعداد کچھ بھی تھی اصل بات یہ تھی کہ صورتحال اچانک بدترین شکل اختیار کر گئی تھی۔ گورنر نے لاہور میں کرفیو کو 15 اگست تک توسیع دے دی لیکن یکم اگست (جمعہ) اور 2 اگست کو شہر میں بم پھینکنے اور آگ لگانے کے واقعات ہوئے۔ 4 اگست کو ضلع فیروز پور کے گاؤں 'کوکڑی آرائیاں' میں

مسلح افراد کے حملے میں 19 ہلاکتیں ہوئیں۔ انہوں نے آتشیں اسلحہ استعمال کیا اور بیشتر اموات رائفلوں کی گولیوں سے ہوئیں(Pakistan Times, August 6 1947)۔ لائل پور اور جالندھر میں بھی دستی بم حملوں کی اطلاعات آئیں۔ جن میں مختلف افراد ہلاک یا زخمی ہوئے۔

14 اپریل سے 14 جولائی کے درمیان آگ لگانے بالخصوص لاہور میں آتشزدگی کے واقعات کے بارے میں جینکنز نے یہ اعداد و شمار دیے:

آگ کی نوعیت	مسلم املاک	غیر مسلم املاک
واقعات	58	112
چھوٹی آتشزدگی	38	149
بڑی آتشزدگی	20	112
کل تعداد	116	373
مجموعی تعداد: 611(Ibid:208)		

انہوں نے تبصرہ کیا کہ:

ان تین ماہ کے دوران آگ لگانے کے 611 واقعات ہوئے۔ (اس دورانیے میں جو بدترین ایام رہے ان میں ایک روز کے دوران 20 یا 30 واقعات ہوئے) ان میں سے 357 پر قابو پالیا گیا جبکہ 254 پر قابو نہیں پایا جاسکا۔ مسلمانوں کی عمارتوں میں آگ پر قابو پانے کی شرح ہندوؤں کی عمارتوں پر قابو پانے کے واقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ چونکہ مسلمانوں نے لاہور نہیں چھوڑا اور وہ اپنی جائیدادیں بچانے میں کافی متحرک کردار ادا کرتے تھے۔ دوسری طرف ہندوؤں نے بڑی تعداد میں عمارتیں خالی کر دی تھیں اور ان میں لگائی گئی آگ کا اس وقت پتہ چلتا تھا جب وہ قابو سے باہر ہو چکی ہوتی تھی(Ibid)۔

مسلمان اخباری ایڈیٹروں کی مشرقی پنجاب میں حملوں کی شکایات

جہاں لاہور میں مسلمانوں کو برتریت حاصل تھی وہاں مشرقی پنجاب میں حالات ان کے خلاف ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لاہور میں مسلم لیگ کے حامی اخبارات کے مدیروں مشہور شاعر فیض احمد فیض (پاکستان ٹائمز)، حمید نظامی (نوائے وقت)، نورالٰہی (احسان)، عنایت اللہ (شہباز) اور مولانا اختر علی (زمیندار) نے اپنے دستخطوں سے ماؤنٹ بیٹن کو ایک تار ارسال کیا:

انتہائی مسلح جتھوں کی طرف سے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے دیہات پر منظم حملوں کا سلسلہ جاری ہے۔ حکومتی مشینری مسلمان اقلیت کو تحفظ دینے میں ناکام نظر آتی ہے۔ آپ سے ذاتی طور پر معاملے میں مداخلت کر کے معصوم افراد کی جانیں بچانے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے کی استدعا ہے(Pakistan Times, 10 August)۔

ان اخباری مدیروں نے مسلم لیگ کے لیڈروں سے بھی درخواست کی کہ وہ تشدد روکنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ انہوں نے بالخصوص سردار شوکت حیات خان (جن کا اسمبلی میں انتخاب اگرچہ مشرقی پنجاب کے حلقے سے ہوا تھا لیکن بنیادی طور پر ان کا تعلق ضلع اٹک سے تھا) سے اپیل کی کہ وہ مشرقی پنجاب کا دورہ کریں اور مسلمانوں کے لیڈر کے طور پر ڈاکٹر گوپی چند بھرگاوہ اور سردار سورن سنگھ کو تنبیہ کریں کہ اگر انہوں نے مسلمانوں کے خلاف منظم نفرت انگیز کارروائیاں نہ روکیں تو ان کے ہم مذہب افراد کو مغربی پنجاب میں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے (Ibid)۔

اگست کے واقعات کے بارے میں سلیم طاہر کے تاثرات

حمید ہمدانی نے لاہور کے مسلمان نوجوان سلیم طاہر کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے جس نے ٹرین کے ذریعے میانوالی سے اسلحے سے بھرے دو صندوق لاہور لانے کا ناپسندیدہ دلیرانہ مشن مکمل کیا تھا۔ سلیم طاہر نے انہیں بتایا کہ انہیں اسلحہ خریدنے کے لیے پیسہ نواب ممدوٹ نے دیا تھا اور یہ اسلحہ مشرقی پنجاب بھجوایا جانا تھا جہاں مسلم لیگ سمجھتی تھی کہ مسلمان لاچارگی کی حالت میں تھے جبکہ ہندو اور سکھ جتھے منظم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ 11 اگست کو لاہور سے میانوالی کے لیے روانہ ہوئے لیکن ان کی واپسی معمول سے زیادہ وقت بعد یعنی 13 اگست کو ہوئی۔ اسلحہ لاتے ہوئے پکڑے جانے کے خطرات کافی زیادہ تھے کیونکہ بھارت جانے والے ہندو اور سکھ افسر بھی انہی ٹرینوں پر سفر کرتے تھے، اس لیے ریلوے افسر ہر بوگی کو چیک کرتے تھے تاہم ریلوے اور پولیس کے مسلمان افسروں کی مدد سے سلیم طاہر آخرکار 13 اگست کو بخیر وعافیت لاہور واپس پہنچ گیا۔ یہ صندوق اگلے روز 14 اگست کو مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے کرنل تجمل کے سپرد کر دیے گئے (Hamdani, 2003:146-54)۔ سلیم طاہر نے لاہور ریلوے سٹیشن پر ہونے والے فائرنگ کے واقعے کی تفصیل اس طرح بتائی ہے:

> یہ فائرنگ بلوچ رجمنٹ کی طرف سے کی جا رہی تھی۔ یہ رجمنٹ پاکستان کے حصے میں آئی تھی اور اس کے تمام افسر اور فوجی مسلمان تھے۔ بھارت سے واپس آتے ہوئے ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے (مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا) قتل عام دیکھا۔ جہاں ان کا بس چلا انہوں نے مسلمانوں کو بچانے کی بھی کوشش کی اور کافی نیک نامی کمائی۔ فوجی جنہوں نے نیزوں اور کرپانوں پر مسلمان بچوں کو اچھالتے دیکھا یا سکھوں کے ہاتھوں مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کے واقعات دیکھے وہ اپنا غم وغصہ ظاہر کرنے کے لیے کسی فوجی یا قانونی ضابطے کو ماننے پر تیار نہیں تھے۔ بلوچ سپاہی اب انگریز فوج کے نہیں بلکہ اللہ کے سپاہی بن چکے تھے۔
>
> جب بلوچ رجمنٹ لاہور پہنچی تو ریلوے سٹیشن پر ہزاروں ہندو اور سکھ اور انڈین آرمی کے فوجی بھارت جانے کے لیے وہاں جمع تھے۔ کچھ افراد جو مال بردار بوگیوں پر سوار تھے کی حفاظت کے لیے پولیس بھی تھی لیکن بلوچ فوجیوں نے اپنی ماؤں، بہنوں اور بچوں (مسلمان) کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا تھا۔ انہوں نے ہزاروں بھوکے پیاسے مسلمانوں کو بھارت سے پاکستان آتے راستے میں دیکھا تھا۔ انہوں نے جب اپنے سامنے ہندوؤں اور سکھوں کو دیکھا تو آپے سے باہر ہو گئے اور ان کے افسر بھی انہیں نہ روک سکے۔ اسلحہ اور ایمونیشن ان کے پاس تھا۔ وہ

سٹیشن پر چاروں طرف پھیل گئے اور فائرنگ شروع کر دی۔ انہوں نے ریلوے کے ہندو ملازمین، ہندو، سکھ فوجیوں یا سویلین کسی کو نہ بخشا(Ibid:151)۔

غالب امکان یہ ہے کہ سلیم طاہر 13 اگست کی بجائے 14 اگست کو واپس لاہور آیا ہو کیونکہ بلوچ رجمنٹ کی طرف سے فائرنگ کا واقعہ 14 اگست کو پیش آیا تھا۔ جیسا کہ ہم یوراج کرشن کے تاثرات تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں جس میں انہوں نے لاہور سے 13 اگست کو رات 8:30 بجے روانگی کی بات کی تھی جس میں انہوں نے ریلوے سٹیشن پر ہندوؤں یا سکھوں کے قتل عام کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کے برعکس انہوں نے امرتسر سے لٹی پٹی عورتوں اور بچوں کی ٹرین آنے کا ذکر کیا ہے۔ مردوں کو یقیناً راستے میں چن چن کر قتل کر دیا گیا ہو گا۔ کھوسلہ رپورٹ میں بھی بلوچ رجمنٹ کی طرف سے فائرنگ کی تاریخ 14 اگست بیان کی گئی ہے(Khosla,1989:122)۔

آشیونی کمار

آشیونی کمار لاہور میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس (اے ایس پی) تھے اور جالندھر میں تعیناتی کے آرڈر موصول ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی کہانی اس طرح سے سنائی:

''ان دنوں مسلم لیگ نیشنل گارڈ نے لاہور ریلوے سٹیشن پر ہندو اور سکھ پناہ گزینوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ ہاکی کے مشہور کھلاڑی علی اقتدار شاہ دارا کی قیادت میں لٹیروں کی ایک ٹیم وہاں سے گزر رہی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ 'شاہ صاحب آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ یہ آپ کے شایان شان نہیں۔' وہ میری بات سے شرمندہ سے نظر آئے۔ انہوں نے عذر پیش کیا کہ وہ انہیں (لیٹروں کو) روکنے کے لیے ساتھ ہیں تاکہ جانی نقصان کو کم سے کم رکھا جا سکے۔

مزنگ کے چند واقعات

لاہور کے علاقے مزنگ جہاں میری پیدائش ہوئی میں اگست کے مہینے میں کافی خون خرابہ ہوا تھا۔ وہاں رونما ہونے والے دو واقعات لوگوں کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے۔ ایک تو معمر سکھ بڑھئی کا قتل اور دوسرا سکھ گوردوارے پر منظم حملہ۔ دونوں واقعات مجھے بار بار سنائے گئے اور شاید اس وقت تک سنائے جاتے رہیں گے جب تک اس دور کے بوڑھے زندہ رہیں گے۔ سکھ گوردوارے میں قتل عام کا واقعہ مجاہد تاج دین نے انٹرویو میں بیان کیا جو اس بدنام زمانہ کارروائی میں شامل تھا۔ میری اپنی والدہ ستارہ بانو نے دوسرا واقعہ مجھے سنایا تھا۔ میری والدہ محترمہ کا انتقال 1990 میں ہوا تھا۔ میں نے اس کے بعد اپنے والد اور دیگر بزرگوں سے رابطہ کیا تو انہوں نے بھی میری والدہ کی تفصیل کی تصدیق کی، ستارہ بانو نے مجھے بتایا:

''اگست کے دوسرے ہفتے میں لاہور میں سنگین گڑبڑ رہی لیکن مسلم اکثریت کا علاقہ ہونے کے باعث مزنگ نسبتاً محفوظ رہا۔ 12 اگست کو میں اتفاق سے گھر کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ہمارا گھر ٹیمپل روڈ پر تھا۔ ٹیمپل روڈ اور بھونڈ پورہ چوک کے درمیان میں نے چند لوفر اور بدمعاش قسم کے افراد کو کھڑا دیکھا۔ ان کے تاثرات سے محسوس ہو رہا تھا

کہ وہ کوئی واردات کرنے کے چکروں میں تھے۔ اس دوران میں نے ایک قومی الجثہ سکھ کو اس طرف آتے دیکھا۔ جیسے ہی وہ بھونڈپورہ چوک پر پہنچا تو غنڈوں نے اس پر حملے کی کوشش کی لیکن سکھ نے جب بندوق تان لی تو وہ تتر بتر ہو گئے۔ نصف گھنٹے کے بعد ایک اور سکھ وہاں آیا وہ پہلے سکھ کی بہ نسبت بوڑھا تھا اور پیشے کے لحاظ سے بڑھئی تھا۔ وہ پرانی سی موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ مزدور پیشہ ورکروں کی طرح اس نے بھی ایک گندے سے کپڑے میں دوپہر کا کھانا باندھ رکھا تھا۔ اسے پنجابی زبان میں پوٹلی کہتے ہیں۔ وہ ایسے وقت میں اپنے کام پر جارہا تھا جب ایک بڑی سیاسی گیم کھیلی جارہی تھی۔ وہاں آتے ہی بدمعاشوں نے اسے دبوچ لیا اور ایک نے اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ وہ چیخنے لگا اور بھاگنے کی کوشش کی۔ ایک تانگہ وہاں سے گزرتے دیکھ کر اس نے اس پر سوار ہونے کی کوشش کی لیکن کوچوان نے ٹھڈا مار کر اسے نیچے پھینک دیا۔ حملہ آوروں نے اسے دوبارہ دبوچ کر مزید چھریاں ماریں۔ وہ چیختے اور مدد مانگتے دم توڑ گیا۔"

بدنام زمانہ ترین حملوں میں سے ایک اور حملہ ٹیمپل روڈ سے ہمارے گھر سے 300 میٹر دور رونما ہوا۔ یہ تاریخی گوردوارے پر منظم حملہ تھا۔ یہ گوردوارہ سکھوں کے چھٹے ہرگوبند رائے نے تعمیر کرایا تھا۔ حملے میں نمایاں کردار ادا کرنے والے مسلمان نے مجھے اندرونی کہانی سنائی:

مجاہد تاج دین

"ہندوستان کی تقسیم کے وقت میں مزنگ میں رہائش پذیر تھا۔ متجسس طبع ہونے کے ناتے میں ہندوؤں کے مندروں، سکھوں کے گوردواروں اور عیسائیوں کے گرجاگھروں میں جایا کرتا تھا لیکن میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان بھی تھا اور پانچ وقت کی نمازیں پڑھتا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ کس طرح اپنی عبادتگاہوں میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے ہیں اور ان کے وہاں اطوار کیسے ہوتے ہیں۔ اب جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو میں یہ بات برملا کہہ سکتا ہوں کہ انگریز انسانیت کی خدمت میں سب سے آگے تھے۔

"میں خاکسار تحریک کا بڑا متحرک اور پرعزم رکن تھا۔ جب ایک اسلامی ملک پاکستان قائم کرنے کا اعلان کیا گیا تو ہم میں سے کئی لوگ اس نعرے سے مسحور ہوئے۔ میں نے ایچی سن کالج کے قریب چار سکھوں کو قتل کیا اور جب شاہ عالمی سمیت لاہور کے دیگر مقامات پر آگ لگائی گئی تو میں لوٹ مار اور قتل عام میں متحرک انداز میں شریک ہوا۔

"سکھ گوردوارے چھیوں پادشاہی Chhevin Padshahi پر حملے کا منصوبہ ساز تھانیدار ملک مقصود (ایس ایچ او مزنگ پولیس سٹیشن) تھا۔ اس نے ہم میں سے بعض نوجوانوں کو چار روز تک تربیت دی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں اور سکھوں کی املاک پر قبضہ کریں گے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اگر ہم لڑتے ہوئے مارے گئے تو شہید ہوں گے اور زندہ رہے تو غازی ہوں گے۔ اس نے بتایا کہ ہندوستان میں ہمارے مسلمان بہن بھائیوں کو قتل کیا جارہا ہے اور ہماری تربیت کا بڑا مقصد مسلمانوں کا تحفظ کرنا اور مشرقی پنجاب میں اپنے بھائیوں کا انتقام لینا ہے۔

"ہمیں ایک سکیورٹی پلان دیا گیا تھا کہ ہم مزنگ کو ہندوؤں اور سکھوں کے ممکنہ حملوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ یوں ہم نے مزنگ کے اطراف میں صفاں والا چوک، مزنگ چونگی اور کنک (گندم) منڈی میں مورچے قائم کر لیے۔ میرے علاوہ

جنہوں نے تربیت میں حصہ لیا ان میں ظہور دین خاکسار، نصیر، باؤ امانت، حسین گنجا (کبڈی کا کھلاڑی)، بشیر، رشید، عالمگیر بلوچ اور شاہ دین شامل تھے۔

"یہ رمضان کی 26ویں تاریخ تھی (13 اگست) ہم نے سکھوں کی عبادت گاہ پر دھاوا بول دیا۔ ہراول دستہ میرے سمیت دیگر حملہ آوروں پر مشتمل تھا۔ ہماری کل تعداد 25 سے 30 تھی۔ ہم نے گوردوارے کی اونچی دیواریں لٹک کر چڑھیں اور سکھوں کو للکار کر کہا کہ باہر نکلو۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس وقت گھپ اندھیرا تھا۔ ہم دروازے توڑ کر عمارت میں گھس گئے۔ سکھوں نے فرش پر گرم سرسوں کا تیل پھینکا تھا جس کی وجہ سے ہمارے پاؤں پھسل رہے تھے۔ یوں ہم نے ماچس جلائی اور آگ لگ گئی۔

"میں نے بڑے تخت پر قبضہ جمالیا۔ ہم سب 'پاکستان زندہ باد' کے نعرے لگا کر سکھوں کو للکار رہے تھے۔ اچانک تخت کے نیچے سے ایک سکھ تلوار سونتے سامنے آگیا۔ اس نے میرے بازو پر ایک وار کیا جس سے میری کلائی پر گہرا زخم آیا۔ تاہم میں اس سے تلوار چھننے میں کامیاب ہوگیا اور اسے قتل کردیا۔ اس دوران کئی دیگر افراد بھی اندر آگئے۔ اس کے بعد سکھوں سے دست بدست لڑائی شروع ہوگئی۔ تلواروں، ڈنڈوں اور چھروں کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ کچھ پستولوں سے بھی گولیاں چلائی گئیں۔ ایک نے پٹرول چھڑک کر آگ لگادی۔ مجھے شبہ ہے کہ تھانیدار ملک مقصود نے ہمارے گروپ میں سے کسی ایک کو پٹرول دیا تھا۔ البتہ مجھے اس کی خبر نہیں دی گئی۔ کچھ روز قبل مزنگ میں 200 کے لگ بھگ سکھ تھے لیکن اب بیشتر نقل مکانی کر کے جاچکے تھے۔ جب ہم نے حملہ کیا تو صرف 20 سے 30 سکھ مرد اور عورتیں تھیں۔ وہ سب آگ میں زندہ جلادیے گئے۔ ہماری طرف سے صرف ایک نوجوان نصیر مارا گیا۔

"ہمیں بتایا گیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کا نظام ایک بار پھر زندہ کیا جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں جو کافر ہیں کو ہلاک کردیا جائے یا پاکستان سے نکال دیا جائے۔ صرف ایسی صورت میں پاکستان حقیقی معنوں میں کامیاب اسلامی ملک بن سکتا ہے۔ جب پاکستان بن گیا تو میرے سمیت کئی دیگر افراد بے تابی سے اسلامی ریاست اور معاشرے کے احیا کا انتظار کرنے لگے۔ ایوب خان کے دور میں بالخصوص مجھے امید پیدا ہوئی کہ صورتحال میں تبدیلی آئے گی۔ چنانچہ میں نے جنرل ایوب اور گورنر پنجاب (غالباً مغربی پاکستان، ون یونٹ) نواب امیر محمد خان آف کالاباغ کو خط بھی لکھے اور ان کے کافی نزدیک آگیا۔ اس کے بعد میں نے جنرل ضیاالحق سے امیدیں باندھ لیں۔ میں نے اس امید پر شاہ ایران اور کئی دیگر مسلم حکمرانوں کو بھی خطوط لکھے کہ شاید وہ اسلام کی فتح اور مسلمانوں کی بہتری کے لیے کوئی اقدامات کریں۔ (مجاہد تاج دین کے جس کمرے میں میں نے انٹرویو کیا وہاں کئی ممتاز شخصیات کے خطوط تھے اور وہ تلوار بھی پڑی تھی جو اس نے سکھ سے چھینی تھی) لیکن ہمیں اسلامی ریاست کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ ہر حکمران نے ہمیں لوٹا۔ پاکستان نہایت کرپٹ معاشرہ ہے۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو ہمیں وہ کام (سکھوں پر حملے وغیرہ) کرنے کے لیے کیوں کہا گیا۔

"میں 1968 میں حضرت نظام الدین اولیا کے عرس میں شرکت کے لیے زائرین کے ایک وفد کے ساتھ دہلی گیا۔ سرحد پر سکھوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے ہم میں سے ہر ایک کو دومالئے اور ایک سیب دیا۔ دہلی میں مجھے ایک ہندو نے پہچان لیا جو انار کلی میں رہتا تھا۔ اس نے نہایت مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر کسی قسم کی خدمت فراہم کرنے کی پیشکش کی۔ وہاں لوگوں نے اتنی بار محبت کا اظہار کیا کہ میں نے سکھوں اور ہندوؤں کے قتل پر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا

شروع کر دی۔ میرے اندر احساس ہے کہ اللہ میری حیثیت سے خبر دار ہے اور اس نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ ہمیں گمراہ کیا گیا تھا اور ہمارے سیاستدانوں نے ہمیں استعمال کیا۔"

مجاہد تاج دین ایک اور خونریزی میں بھی ملوث تھا جسے وہ چھپا گیا ہے۔ مزنگ کے ہی ایک بزرگ شاعر سلیم شہزاد نے مجھے بتایا کہ پولیس نے تاج دین سمیت بعض دیگر افراد کو ایک اور ہولناک قتل عام میں بھی استعمال کیا۔ لاہور جیل سے ایک روز ہندو اور سکھ قیدیوں سے بھری بس کچہری جا رہی تھی کہ لٹن روڈ پر اس کا انجن فیل ہو گیا۔ قیدیوں کو باہر نکال کر قتل کر دیا گیا اور لاشیں گلو دی پیلی (کھیت) میں پھینک دی گئیں۔

امرتسر

اگرچہ طاقت کا توازن کم سے کم جولائی کے وسط سے ہندوؤں اور سکھوں کے حق میں ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن امرتسر کے مسلمان اب بھی اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ امرتسر پاکستان کو دیا جائے گا۔ دراصل 3 جون کے پارٹیشن پلان میں 'منطقی تقسیم' کی بنیاد پر امرتسر کو مشرقی پنجاب میں شامل کرنے کی تجویز کے بارے میں شہر کے مسلمانوں کو آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔ لگتا ہے کہ ان کے لیڈر بھی کسی سحر میں مبتلا تھے۔ کسی اعلیٰ انتظامی افسر کی حمایت سے پہلا متعصبانہ حکم نئے سپرنٹنڈنٹ پولیس پنڈت اوتار کشن کاؤل جو کشمیری برہمن تھا نے جاری کیا۔ اس نے امرتسر پولیس کے تمام مسلمان اہلکاروں کو غیر مسلح ہونے کا حکم دیا(Mansergh and Moon,1983: 667;826)۔ اس زبانی حکم کی انہوں نے اپنے سینئر افسروں سے اجازت بھی طلب نہیں کی تھی۔ اس حکم کا نتیجہ بڑے پیمانے پر ڈیوٹی سے سرتابی کی صورت میں نکلا۔ 10 اگست کو دہلی سے کراچی جانے والی ٹرین کو مشرقی پنجاب کے علاقے بھٹنڈہ میں بارودی سرنگ کے دھماکے سے نشانہ بنایا گیا۔ واقعے میں ایک خاتون اور بچے کی موت ہوئی لیکن اس کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بظاہر پاکستان جانے والی ٹرینوں پر حملوں کی سازش میں ماسٹر تارا سنگھ کا ہاتھ تھا(Note on the Sikh Plan,1948: I-III)۔

13 اگست کو پنجاب باؤنڈری فورس نے ضلع امرتسر کے علاقے مجیٹھہ میں ایک بڑا آپریشن کیا جس میں 61 شرپسندوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ یہ لوگ مارٹر گولوں، برین گن، سٹین گن اور دیگر جدید اسلحے سے لیس تھے۔ جہاں ماسٹر تارا سنگھ اور سردار اشہر سنگھ مجھیل بظاہر امن کے قیام کے لیے دیہی علاقوں کا دورہ کر رہے تھے وہاں امرتسر کے مسلم لیگ کے مرکزی رہنما اور پنجاب مسلم لیگ کے نائب صدر شیخ صادق حسن اور انکی اہلیہ لاہور روانہ ہو گئے تا کہ امرتسر میں تشدد رکوانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر سکیں(Pakistan Times,15 August)۔

سر ایوان جینکنز کے ٹیلی گرام

یکم سے 14 اگست کے دوران گورنر پنجاب نے ماؤنٹ بیٹن کو جو ٹیلی گرام ارسال کیے اور جن کی کاپیاں وزیر امور ہندوستان کو لندن میں بھجوائی گئیں سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح پنجاب تیز رفتاری سے طوائف الملوکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یکم سے 11 اگست کے درمیان جو تار بھیجے گئے ان میں مغربی پنجاب میں لاہور میں سکھوں اور ہندوؤں پر حملوں جبکہ مشرقی پنجاب

کے علاقوں امر تسر، گورداسپور، فیروز پور میں مسلمانوں پر حملوں کی تفصیل دی گئی تھی۔ 12 اگست کو پہلا ٹیلی گرام صبح 9:10 پر بھیجا گیا جس میں لاہور میں وسیع پیمانے پر بدامنی کا ذکر کیا گیا اور یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ بلاشبہ یہ امر تسر میں پاکستان سپیشل ٹرین پر حملے اور مسلمان پولیس اہلکاروں کو غیر مسلح کرنے کا ردعمل ہے۔ جینکنز نے لکھا کہ لاہور شہر میں عمومی تاثرات غیر یقینی حد تک برے ہیں اور انسپکٹر جنرل پولیس نے مجھے بتایا کہ مسلم لیگ نیشنل گارڈز، اپنی وردی میں کارروائیاں کر رہے ہیں جبکہ پولیس غیر فعال ہے (Carter, 2007b: 226)۔

اسی روز 11 بجے رات کو ایک اور تار ارسال کیا گیا کہ 11 اور 12 اگست کی رات کو لاہور کے نواحی علاقے کاہنہ کاچھ میں ایک اور ٹرین حملہ کیا گیا ہے۔ ٹرین پر سوار سکھ مسافروں نے اندر سے لیور کھینچ کر گاڑی کو روکا اور پانچ مسلمانوں کو ہلاک اور پانچ دیگر کو زخمی کر دیا۔ اسی روز ضلع امر تسر میں پچیس مسلمان اور سات سکھ مارے گئے۔ گورداسپور کے علاقے بٹالہ میں بھی متعدد ہلاکتوں کی اطلاعات وصول ہوئی ہیں۔ اس طرح سیالکوٹ، گوجرانوالہ، لائل پور، فیروز پور اور انبالہ میں بھی اموات ہوئیں۔ اسی تار میں گورنر نے بتایا کہ "کئی اضلاع سے مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر نقل مکانی بھی ہو رہی ہے" (Ibid: 227)۔ 11 بجے رات کو تیسرے ٹیلی گرام میں انہوں نے لکھا کہ:

> امر تسر اور لاہور میں پولیس اب قابل اعتبار نہیں رہی۔ لاہور کے ریکروٹمنٹ ٹریننگ سنٹر میں سنگین بدنظمی نظر آ رہی ہے اور 300 سے 500 تک (زیر تربیت) اہلکار ایمرجنسی ڈیوٹی کے لیے استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ ابھی تک امر تسر کے دیہی پولیس سٹیشنوں کے بارے میں واضح رپورٹیں موصول نہیں ہوئیں تاہم اطلاعات ہیں کہ ان میں سے بعض نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ امن وامان برقرار رکھنے کے لیے ہمارے پاس پولیس کی درکار نفری موجود نہیں اور فوج کی مدد کے بغیر ریلوے قطعی محفوظ نہیں ہوگی۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈز اب لاہور میں کافی متحرک ہے اور غیر مسلموں کے خلاف جارحانہ کارروائیوں میں ملوث ہے (Ibid: 227-8)۔

13 اگست کو رات 10:40 بجے جینکنز نے بتایا کہ لاہور شدید بدامنی کا شکار ہے۔ 12 اگست کو چالیس افراد چھرا گھونپنے یا دیگر حملوں میں مارے گئے۔ ان میں سے چونتیس غیر مسلم تھے۔ مسلمانوں نے کینٹ کے علاقے میں سندھ ایکسپریس پر حملہ کیا جس میں نو افراد ہلاک اور تیس غیر مسلم مسافر زخمی ہو گئے۔ امر تسر میں مسلمان ہر طرف سے حملوں کی زد میں تھے۔ پٹھان مزدوروں کے ایک گروہ نے چیہارٹا (Chheharta) کے قریب جی ٹی روڈ پر ایک کارروائی میں تیس افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پنجاب باؤنڈری فورس کے کمانڈر نے مجھے بتایا کہ جنڈیالہ کے قریب سکھوں نے 200 مسلمانوں کو ہلاک کر دیا۔ پی بی ایف کی ایک نفری نے ٹینکوں کے ساتھ کارروائی کر کے حملہ آوروں کو نشانہ بنایا جس سے اکسٹھ سکھ ہلاک اور نو زخمی ہو گئے۔ سیالکوٹ، لدھیانہ، فیروز پور اور گورداسپور سے بھی ہلاکتوں کی اطلاعات ملی ہیں۔ اس کے فوراً بعد ایک اور ٹیلی گرام میں بتایا گیا کہ لاہور کے شہری علاقے اور امر تسر ضلع کنٹرول سے باہر ہیں۔ گورنر نے گوردوارہ ڈیرہ صاحب میں تلاشی کا حکم دیا کیونکہ وہاں سے سکیورٹی فورسز پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔ مجسٹریٹ جتھے کے خلاف سخت کارروائی سے امر تسر

میں کافی مزاحمتی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ کمانڈر پی بی ایف نے امید ظاہر کی ہے کہ وہ دو بریگیڈ نفری کے ساتھ صورتحال کو معمول پر لا سکتے ہیں(Ibid: 233)۔

گورنر کی آخری پندرہ روزہ رپورٹ: 13اگست 1947

اپنی آخری پندرہ روزہ رپورٹ میں سر ایوان جینکنز نے صورتحال کی تفصیلی منظر کشی کی ہے۔ انہوں نے کوئی لگی پٹی رکھے بغیر اعتراف کیا کہ:

> میں نے موجودہ حالات پر روزانہ کی بنیاد پر رپورٹیں بھجوائی ہیں۔ یہ تقریباً مکمل ہیں کیونکہ حملے اور قتل وغارت کے واقعات اب اتنی تیزی سے ہو رہے ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ انتقال اقتدار کے لیے مختلف محکموں کی تنظیم نو سے ہماری کارکردگی اور مختلف تجزیاتی رپورٹیں جمع کرنے کی صلاحیت بہتر نہیں ہو سکی(Ibid: 228)۔

انہوں نے اپنے سابق موقف کا اعادہ کیا کہ پنجاب باؤنڈری فورس کو کم از کم 20ہزار موثر لڑاکا فوجیوں کی ضرورت ہے۔ 7ہزار یا معمولی تربیت کے ساتھ دیگر اہلکاروں سمیت 9ہزار افراد سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ انہوں نے بعض عمومی حالات کا بھی ذکر کیا:

> 1946تک میرا یہ خیال نہیں تھا کہ ہمیں ہندوستان میں شہروں سے باہر کبھی کسی بڑی شورش کا سامنا کرنا پڑا...ماسوائے موپلہ بغاوت کے۔ 1947 کے فسادات کا سبق یہ ہے کہ جب تمام دیہی علاقوں میں مختلف مذاہب کے افراد باہم دست وگریبان ہو جائیں تو مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ بڑے پیمانے پر مسلح دستوں کو تعینات کیا جائے۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ضلع امرتسر کو اس وقت دو مکمل بریگیڈ فوج اور روایتی پولیس فورس کی ضرورت ہے لیکن اس وقت وہاں صرف ایک کمزور بریگیڈ تعینات ہے جبکہ پولیس زیادہ تر انتشار کا شکار ہے۔
>
> فی الوقت مستقبل کے بارے میں وثوق سے کچھ بھی کہنا ممکن ہے۔ یقیناً سکھوں کے ذہن میں 2مقاصد ہیں۔ ایک تو وہ راولپنڈی میں سکھوں کے قتل عام کا انتقام لینے کے خواہاں ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ سرحدوں کی حد بندی پر اپنا موقف منوانا چاہتے ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ سکھوں کے نکتہ نظر کا بلا چوں وچرا دفاع کیا جائے تاہم مسلمان راولپنڈی کے واقعات سے پیدا ہونے والی دہشت کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ وہ سوچ رہے ہیں کہ تشدد کے اقدامات سے سکھوں کو دبایا جا سکتا ہے۔ مجھے اس پر بہت زیادہ شبہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لاہور میں تشدد سے سکھوں کے غصے میں اضافہ ہی ہوگا۔
>
> دوسری طرف ہندو خوفزدہ ہیں کیونکہ مسلمانوں نے مشرقی حصے میں جو تحریک چلائی اس میں مغرب میں چلائی گئی ہندوؤں کی تحریک سے توازن آ گیا ہے۔ اس وقت ہمیں ہندوؤں اور سکھوں کی بم چلانے کی سازشوں پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ ہندوؤں کو لاہور سے بے دخل ہونے سے زیادہ کسی چیز پر تشویش نہیں۔

کئی مسلمان عجیب سی خوش فہمی کا شکار ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جیسے ہی انگریز ہندوستان چھوڑ دیں گے تو امن بحال ہو جائے گا۔ کافی عرصے سے یہ افواہ گردش کر رہی ہے کہ ممتاز دولتانہ اور ان کے ہم خیال عناصر یہ چاہتے ہیں کہ انتقال اقتدار سے قبل جتنا ممکن ہو گڑبڑ پیدا کی جائے تا کہ انگریزوں کو بدنام کیا جا سکے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اس بات کی ستائش ہوتے نظر نہیں آتی کہ 15 اگست کی صبح کو لاہور میں اچانک مار دھاڑ روک دی جائے۔ تب یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ قتل عام کے پیچھے مقامی لیڈروں کا ہاتھ تھا۔ اس صورتحال سے کچھ مسلمان بے چینی بھی محسوس کر رہے ہیں اور ایک بہت اچھے مسلمان پولیس افسر نے حال ہی میں احتجاجاً استعفیٰ بھی دے دیا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ افسر مذہبی بنیادوں پر استوار کسی حکومت کے لیے خدمات انجام نہیں دینا چاہتا (Ibid: 231)۔

اس خفیہ رپورٹ کا اختتام نسبتاً جذباتی الفاظ میں ہوا ہے: "میرے خیال میں یہ پنجاب کے کسی انگریز افسر کا کسی انگریز وائسرائے کو آخری خط ہے۔ میں جناب کے لیے نہایت نیک جذبات کا اظہار کرتا ہوں" (Ibid: 232)۔

آخری ٹیلی گرام

اپنے دفتر میں گورنر جینکنز نے آخری روز پنجاب کو مکمل طوائف الملوکی اور شورش میں گھرا دیکھا۔ 14 اگست کو رات 9:10 بجے اپنے آخری ٹیلی گرام میں گورنر نے لاہور اور امرتسر میں صورتحال کو انتہائی غیر اطمینان بخش قرار دیا۔ راولپنڈی میں دو ٹرینوں پر حملہ ہو چکا تھا۔ یہ بظاہر مسلمانوں کی کارروائی تھی جو وسطی پنجاب میں سکھوں کی سرگرمیوں کا ردعمل تھا۔ آخری فقرے میں لکھا کہ "اس صورتحال سے اب نئی حکومت کو نمٹنا ہو گا" (Ibid: 234)۔

15 اگست سے پہلے جبری نقل مکانی

گورنر جینکنز اور چیف سیکرٹری اختر حسین دونوں نے ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوؤں، سکھوں یا مسلمانوں کی نقل مکانی کرنے والی تعداد کا تخمینہ نہیں دیا۔ جولائی تک مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر حملے شروع نہیں ہوئے تھے۔ گورنر کا خیال ہے کہ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کی پہلی بڑی ہجرت 12 اگست کو ہوئی تھی۔ دوسری طرف ہندو اور سکھ اپنی حفاظت کے لیے 1945 کی انتخابی مہم میں ہونے والے تشدد کے بعد سے نقل مکانی شروع کر چکے تھے۔ صوبہ سرحد کے علاقے ہزارہ اور پھر مارچ کے فسادات کے بعد ضلع ملتان بالخصوص راولپنڈی ڈویژن کے بعض اضلاع سے سکھوں کی بڑی تعداد مشرقی اور وسطی پنجاب کے محفوظ ٹھکانوں کی طرف منتقل ہو گئی تھی۔ میجر جنرل فضل مقیم خان نے مارچ کے فسادات کا تخمینہ یہ بتایا ہے کہ:

> 1947 کے موسم بہار میں پنجاب کے کچھ علاقوں میں گڑبڑ کے بعد مغربی پنجاب، سرحد اور بلوچستان سے دو سے تین لاکھ ہندوؤں اور سکھوں نے رضاکارانہ طور پر نقل مکانی کی۔ انہیں توقع تھی کہ یہ علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے۔ ان مہاجرین

نے مسلمانوں کے خلاف نہایت چالاکی سے نفرت کو ابھارا۔ جھوٹی کہانیاں پھیلائی گئیں۔ اصل صورتحال سے ہٹ کر جھوٹے جذباتی ڈرامے کھیلے گئے (Khan,1963:62)۔

اگر زیادہ نہیں تو موسم بہار کے ہنگاموں کے بعد مزید دو لاکھ افراد نے اپنے گھر چھوڑے۔ اس کا مطلب ہے کہ بھارت کے معرض وجود میں آنے تک مشرقی پنجاب میں پہلے ہی پانچ لاکھ ہندو اور سکھ مہاجر موجود تھے۔

لاہور سے نقل مکانی کرنے والے لوگ

مشہور بھارتی مصور ستیش گجرال ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے قریب رہتے تھے جو ہندو اکثریتی علاقہ ہونے کے باعث بظاہر محفوظ تھا۔ لیکن اگست میں لاہور کا کوئی علاقہ ہندوؤں یا سکھوں کے لیے محفوظ نہ رہا۔ ستیش گجرال لکھتے ہیں کہ:

> اس سے پہلے کہ لٹیرے میری جمع پونجی لوٹنے آتے، میرے پاس لاہور سے بھاگنے کا کافی وقت موجود تھا۔ میرے لیے واحد محفوظ ٹھکانا لاجپت رائے بھون ہو سکتا تھا جہاں میرے والد کے دوست لالہ اچنت رام اور 'خدام عوام سوسائٹی' کے دیگر ارکان مقیم تھے۔ میں نے 5 کلومیٹر کا فاصلہ دوڑ کر طے کیا۔ میں نے آس پاس کئی غضبناک مسلمان بھی دیکھے جو ہندوؤں اور سکھوں کی زندگی اور املاک کے درپے تھے (Gujral, 1997: 73)۔

ستیش گجرال مسلمانوں سے اچھوت کا سلوک کرنے پر پنجاب کے ہندوؤں کو موردالزام ٹھہراتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان کے والد نے جہلم میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب لانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن وہ ہندو جو کانگریس میں شامل ہو گئے تھے وہ ہندوستان کی آزادی کے مطالبے پر تو جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے تھے لیکن مسلمانوں کو دوست بنانے یا اچھوتوں سے متعلق رویہ تبدیل کرنے کے سرمو خواہاں نہیں تھے۔ انہوں نے قبائلی پٹھانوں کی طرف سے جہلم میں ہندوؤں اور سکھوں پر حملوں کے واقعات کا ذکر کیا ہے جبکہ سرحد کی دوسری جانب بھارت میں مسلمانوں پر حملوں کی بھی تفصیل دی ہے:

> ایسے حملوں میں بدترین واقعہ امرتسر کے مسلم گرلز ہاسٹل پر حملہ تھا (یہ 15 اگست 1947 کو ہوا)۔ ہاسٹل کی مکینوں کو باندھ کر جبر اُہال بازار تک جلوس نکالا گیا۔ وہاں لڑکیوں سے اجتماعی زیادتی کی گئی اور ایسا بھیانک سلوک کیا گیا جس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے اور پھر انہیں قتل کر دیا گیا (Ibid: 80)۔

کمار چند

پروفیسر انجلی گیر ارائے کا تعلق فیصل آباد کے اروڑہ خاندان سے تھا اور سنگاپور میں میری ان کے ساتھ پنجاب کی تقسیم کے مسئلہ پر تفصیلی بحث ہوئی۔ 2010 میں ایک روز وہ مجھے کمار چند اور میر اچند سے سنگاپور میں ان کی رہائش گاہ پر ملوانے لے گئی۔ میں

نے ان کی کہانی سنی تھی لیکن اس کی اشاعت سے پہلے واقعات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ کمار چند نے 1947 میں لاہور سے نقل مکانی سے پہلے کی کہانی ان الفاظ میں سنائی:

''بنیادی طور پر ہمارا خاندان سندھ کا ایک تاجر خاندان تھا جو 1940 کی دہائی میں لاہور آباد ہو گیا۔ مختلف مقامات پر رہنے کے بعد آخر میں ہم قلعہ گوجر سنگھ کے علاقے میں منتقل ہو گئے جہاں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ لاہور میں کئی ہفتوں سے فسادات جاری تھے۔ میری والدہ اور بہنوں کو حفاظتی نکتہ نظر سے پہلے ہی ایک پہاڑی تفریحی مقام پر بھیجا جا چکا تھا۔ اگست کے ایک روز شام کو ہجوم ہمارے علاقے میں آیا۔ انہوں نے قتل و غارت اور لوٹ مار شروع کر دی۔ یہ منظر دیکھ کر ہمارے دل میں خوف پھیل گیا۔ ہم گھر کے عقبی دروازے سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ اس سے ہماری جان بچ گئی کیونکہ حملہ آور قیمتی اشیا لوٹنے میں مصروف تھے۔ البتہ کچھ دیر بعد وہ ہمارے پیچھے لگ گئے تاہم کسی نہ کسی طرح ہم ریلوے سٹیشن کے قریب پناہ گزین کیمپ تک پہنچ گئے۔ موت کے اتنے قریب آنے کا لمحہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔''

پران نوائل

''میں 1946 میں دہلی میں سرکاری ملازمت میں شامل ہوا لیکن ہنگاموں کے وقت میرے والدین لاہور میں تھے۔ جون کے ایک دن میرے والد مغلپورہ سے واپس تانگے پر آ رہے تھے کہ مسلمانوں کے ہجوم نے انہیں پہچان لیا کہ وہ ہندو تھے لیکن ایک شخص جس پر میرے والد نے کبھی احسان کیا تھا نے انہیں روک دیا بلکہ وہ بیڈن روڈ کے ایک محفوظ ٹھکانے تک ان کے ساتھ آیا۔ اگرچہ میرے اہل خانہ بحفاظت لاہور سے نکل گئے لیکن میرے کئی سکول اساتذہ اور کالج کے پروفیسروں کو قتل کر دیا گیا۔

''میرے والد محکمہ ڈاک کے ملازم تھے اور انہوں نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جس وقت حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے تو ان کے مسلمان دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ لاہور سے چلے جائیں۔ انہوں نے کہا: 'پنڈت جی آپ فی الحال چلے جائیں، جیسے ہی حالات بہتر ہوں گے تو آپ واپس آ جائیں۔' چنانچہ وہ 14 اگست کو امرتسر کے لیے ٹرین پر روانہ ہوئے۔ ان کے دوست انہیں اور میری والدہ کو نشستوں پر بٹھا کر آئے۔ وہ بحفاظت امرتسر پہنچ گئے لیکن 3 ہفتے تک ان سے ہمارا رابطہ نہ ہو سکا۔ میرے والد لاہور چھوڑنے کے صدمے سے کبھی نہ نکل سکے۔ ان کی تعیناتی انبالہ میں ہوئی جہاں 1954 میں وہ آنجہانی ہو گئے۔ ایک شکستہ دل انسان کی عمر محض 58 سال تھی۔''

نرمل تیج سنگھ چوپڑا

''لاہور میں 1947 میں آزادی سے قبل گزاری گئی زندگی کے واقعات یاد کرنا تکلیف دہ ہے۔ پنجاب کا دارالحکومت لاہور ان دنوں قتل و غارت، خواتین سے زیادتی، آگ لگانے، لوٹ مار اور دیگر بہیمانہ جرائم کا گڑھ بن چکا تھا۔

''ہمارا گھر اندرون شاہ عالمی دروازے کے قریب ایک تنگ سی گلی کوچہ موٹا سنگھ میں تھا۔ قدیم لاہور کا یہ محلہ ہندو اکثریت والے علاقے کا حصہ تھا۔ یہ گلی مین بازار سے ہٹ کر تھی اور میرے پردادا سے موسوم تھی۔ ہمارا آبائی گھر پانچ

منزلوں پر مشتمل ایک بڑی عمارت تھی جو دو گلیوں تک پھیلی تھی۔ مکان میں اٹھارہ کمرے تھے اور اکثر کمروں کی چھتیں کافی اونچی تھیں۔ انہی کمروں میں میری دو بہنوں، تین بھائیوں اور خود میری پیدائش ہوئی تھی اور یہیں پلے بڑھے۔ ہمارا گھر اتنا اونچا تھا کہ چھت سے ہم لاہور شہر کا بیشتر حصہ دیکھ سکتے تھے۔

''میرے والد جو ملٹری اکاؤنٹس کے ڈپٹی کنٹرولر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے کی محلے کے تمام گھرانے بہت عزت کرتے تھے۔ ہمارے گھر کے علاوہ محلے میں دس دیگر مکانات اور ایک بڑی حویلی بھی تھی۔ زیادہ تر گھرانے ہندو تھے لیکن تین مسلم خاندان بھی وہاں مقیم تھے۔ صرف ہمارا ایک گھر سکھوں کا تھا۔ جو نہ صرف اس گلی بلکہ اردگرد کے علاقے کا واحد سکھ گھرانہ تھا۔ البتہ تمام ہندو، سکھ اور مسلمان مثالی ہم آہنگی کے ساتھ رہتے تھے اور ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں حصہ لیتے تھے۔ (دیوالی، ہولی، عید وغیرہ)۔ ان تہواروں اور شادی بیاہ جیسے خوشی کے مواقع پر تحائف کا بھی تبادلہ کیا جاتا تھا۔ اندرون شہر کے مخصوص کلچر کی طرح ہمارے تمام مکانات کی دیواریں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ میرے تین بڑے بھائی ہندوستانی فوج میں افسر تھے۔ دو بڑے بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی اور بچے بھی تھے۔ تیسرا بھائی غیر شادی شدہ تھا اور سنگاپور میں انگریز فوج میں تعینات تھا۔ 1947 میں میری عمر سترہ سال تھی اور میں ایف سی کالج میں بی اے کا طالب علم تھا۔ میں لاہور میں اپنے والدین اور بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔

''حالات میں بگاڑ مارچ سے اپریل 1947 کے دوران پیدا ہوا۔ لاہور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ تصادم معمول بنتا جا رہا تھا۔ ہم نے ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لیے ایسی اشیائے خوردنی کا ذخیرہ کرنا شروع کر دیا جو خراب نہ ہو سکتی ہوں۔ جب یہ اعلان ہوا کہ انگریز ہمارے ملک سے واپس چلے جائیں گے اور ہندوستان دو حصوں پاکستان اور بھارت میں تقسیم ہو گا جبکہ پنجاب کے بھی دو حصے ہوں گے تو کشیدگی میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ پنجاب کی حقیقی حد بندی مقرر نہ ہونے کے باعث لاہور اور دیگر شہروں میں مظاہرے، ہڑتال اور احتجاج شروع ہو گیا۔

''البتہ کرفیو میں نرمی ہونے پر ہمیں بدستور لاہور میں تازہ سبزیاں، پھل، دودھ اور دیگر ایسی اشیا دستیاب تھیں، زیادہ تر کرفیو رات کو نافذ کیا جاتا تھا۔ ہماری گلی کے داخلی راستے پر ایک بہت بڑا پرانا اور مضبوط گیٹ نصب تھا۔ ان دنوں ہم اسے بند رکھ کر اندر سے کنڈا لگا لیتے تھے۔ بالخصوص رات کو یا جب کسی ہجوم کے حملے کی اطلاع ملتی تو ہم اسے بند رکھتے۔ ہماری گلی کے ساتھ والی گلیاں بھی تنگ، تنگ تھیں اور آپس میں ایسی ملی تھیں کہ آپ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جا سکتے تھے۔ میں ان دنوں کا سوچ کر اب بھی خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ ہم مکان کی کھڑکی سے اردگرد رونما ہونے والے واقعات دیکھا کرتے تھے۔

''میں نے گلی کے گیٹ سے باہر اپنی آنکھوں سے مردوں اور عورتوں کو بے رحمی سے قتل ہوتے دیکھا۔ کبھی کبھی حملہ آور لاشیں کھلی جگہ پر پھینک دیتے تھے۔ البتہ بیشتر لاشیں گلی کے نکڑ کے پاس واقع کنویں میں پھینک دی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی ہندو بھی راہگیر مسلمانوں کو ہلاک کر دیتے تھے لیکن زیادہ تر قتل عام مسلمان غنڈے ہی کرتے تھے۔

''میں نے نوجوان مسلمانوں کو کئی لڑکیوں سے ان کے والدین کے سامنے زیادتی کرتے بھی دیکھا۔ یہ لوگ بعد ازاں ان کو قتل کر دیتے۔ کئی عورتوں کو قتل کرنے سے پہلے بیدردی سے ان کی چھاتیاں کاٹ ڈال گئیں۔ ہمیں لوگ بتاتے تھے کہ ایسے انسانیت سوز واقعات پورے شہر میں ہو رہے تھے۔

''میرے خیال میں کوئی ہندو یا مسلمان اپنے درست حواس میں ایسے انسانیت سوز اقدامات میں ملوث نہیں ہو سکتا بلکہ یہ ایک انتہائی نوعیت کا پاگل پن تھا جس نے بعض ہندوؤں اور مسلمانوں کو مذہب کے نام پر ایسے فرقہ وارانہ فسادات کی طرف مائل کیا اس میں کچھ سیاسی عزائم بھی تھے۔

''جون اور جولائی 1947 کے دوران ہجوم نے شہر میں ادھر ادھر عمارتوں کو آگ لگانے کی کارروائیاں تیز کر دی تھیں۔ رات کو پیٹرول یا مٹی کے تیل میں بھگوئے پرانے کپڑوں کو آگ لگا کر چھتوں سے دوسرے مکانات پر پھینکا جاتا تھا۔ یہ آتشی گولے جگہ جگہ گرتے اور آگ لگاتے نظر آتے تھے۔

''ہم میں سے کئی کو اس بات کا یقین تھا کہ علاقے میں ہندوؤں کو بے دخل کرنے کے لیے مسلمان پولیس افسروں نے غنڈوں اور بدمعاشوں کو استعمال کیا۔ مجھے اب ایسے افراد کے نام تو یاد نہیں لیکن کچھ افسروں کے نام کھلے عام سامنے رکھے تھے۔ اس کے باوجود ان کے خلاف اعلیٰ حکام نے کوئی ایکشن نہیں لیا۔

''ہماری گلی میں جو مسلمان گھرانے تھے ان میں سے ایک میں نوجوان رفیق رہتا جو بہت اکھڑ مزاج انسان تھا۔ میرے خیال میں اس کے ڈر سے ہماری گلی کی طرف کوئی آگ کا گولہ نہیں پھینکا گیا اور کسی حد تک یہ علاقہ محفوظ تھا۔ ہاں میں تسلیم کرتا ہوں کہ رفیق نے ہمیں ہمسایہ ہونے کے ناتے تحفظ فراہم کیا تھا۔ دوسری طرف میرے والد نے اپنی گلی کے مسلمانوں کی حفاظت کی۔ جون کے اختتام تک ہمارے علاقے کے مسلم خاندان نے خود کو غیر محفوظ سمجھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ غیر مسلم اکثریت والے محلوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ ہماری گلی کے بعض ہندو بھی محفوظ علاقوں کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ ان حالات میں ہمارے خاندان نے بھی عدم تحفظ محسوس کرنا شروع کر دیا۔ ہماری گلی یا قرب و جوار میں کوئی ٹیلی فون نہیں تھا۔ ہماری زندگیاں خطرے میں تھیں لیکن ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم صرف دعا کر سکتے تھے کہ بھگوان کسی کو ہمیں بچانے کے لیے بھیجے۔

''میرے بھائی لیفٹیننٹ کرنل گرچرن سنگھ چوپڑا ڈیفنس فورسز کے دہلی میں ہیڈ کوارٹر میں تعینات تھے۔ انہوں نے انگریز افسروں کی مدد سے ایک سٹیشن ویگن جس میں انگریز فوجی سوار تھے بھجوائی تاکہ ہمیں لاہور سے بحفاظت نکالا جا سکے۔ ہر قسم کے خطرات کا سامنا کرتے ہوئے میرا بھائی ہمیں ریسکیو کرنے کے لیے 2 اگست 1947 کو آیا۔ اس نے گاڑی مین روڈ پر کھڑی کی اور انگریز فوجیوں کے ساتھ آیا اور کہا کہ فوراً یہاں سے نکلو، وقت کم ہے اور ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ چنانچہ افسردہ دل کے ساتھ میرے والدین اور میری بہنیں وہاں سے نکلے۔ ہم اپنے ساتھ صرف تن کے کپڑے لے جا سکے۔ جب ہم انتہائی محفوظ سٹیشن ویگن میں سفر کر رہے تھے اور ٹامی گن پکڑے گورے فوجی ساتھ تھے تو ہم نے سڑکوں پر ادھر ادھر بے قابو ہجوم دیکھے۔ شاہ عالمی دروازے کے قریب عمارتیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ لوگ ہمیں بالخصوص مسلح انگریز فوجیوں کو دیکھ کر خوفزدہ تھے۔ ہمارے انگریز ڈرائیور نے نہایت تیزی سے ہجوم کے درمیان سے گاڑی نکالی اور ہم بحفاظت

دہلی پہنچ گئے۔ ہم لاہور میں اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے محروم ہو گئے۔ ایک دم میرے والد کنگال ہو گئے اور ہم سب مہاجر بن گئے۔ اس کے باوجود جان بچنے پر ہم خدا کے حضور شکر گزار تھے۔ ہم خوش قسمت تھے کہ میرے بھائی کرنل گرچرن چوپڑا نے عین آخری وقت پر ہمیں بچالیا اور دہلی میں اپنے بنگلے میں پناہ دی۔"

ہرکشن سنگھ سرجیت

"میں 9اگست 1947 میں لاہور میں تھا۔ ہم جیسے سیاسی طور پر باخبر افراد پر بالکل واضح ہو چکا تھا کہ لاہور پاکستان میں شامل ہو گا کیونکہ امرتسر کے بعد واہگہ سے آگے تک علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ میں 12 اگست کو لاہور سے اپنے آبائی شہر جالندھر کے لیے روانہ ہوا۔ دیگر کامریڈ حضرات جیسا کہ سوہن سنگھ جوش چند روز پہلے لاہور چھوڑ چکے تھے جبکہ تیج سنگھ سواتنتر تقسیم کے چند روز بعد گئے۔ جب میں 1946 سے پہلے مغربی پنجاب میں گزارے ایام یاد کرتا ہوں تو مجھے تینوں بڑے مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان کہیں نفرت نظر نہیں آتی۔ البتہ حالات ایک دم تبدیل ہو گئے۔ لوگوں کا ایک دوسرے کو دیکھنے کا انداز بدل گیا۔ کوئی بھی محفوظ نہ رہا۔ میں لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے دوستوں نے سمجھایا کہ میں عارضی طور پر چلا جاؤں۔ حالیہ برسوں میں میں نے کئی بار لاہور جانے کا ارادہ کیا لیکن انتہا پسند خالصتانی سکھوں (جو 1980 کے عشرے کے بعد سے لاہور میں مقیم تھے) نے مجھے دھمکی دے کر روکا۔"

ہرکشن سرجیت نے مارچ 2005 میں دیگر کمیونسٹوں کے ساتھ لاہور کا دورہ کیا۔ انہوں نے نہ صرف تقسیم سے پہلے کے اپنے کمیونسٹ دوستوں سے ملاقات کی (ان میں ممتاز کمیونسٹ رہنما سی آر اسلم نمایاں ہیں) بلکہ (سابق) صدر مشرف سے بھی ملے۔ مشرف نے اس وفد کے ذریعے بھارتی حکومت کو تعلقات معمول پر لانے کا پیغام بھجوایا۔

گیانی مہندر سنگھ

"میں لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی کے قریب جنرل لوکل گوردوارہ کمیٹی کا سربراہ تھا۔ مجھے ایک سٹیشن ویگن دے کر لاہور کے متاثرہ علاقوں میں محصور سکھوں کو بچانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ 12 اگست تک ہندو اور سکھ لاہور میں ہزیمت کا شکار تھے۔ 12، 13 اگست کو مزنگ میں مشہور تاریخی گوردوارے چیون پادشاہی کو نذر آتش کر دیا گیا۔ یہ حملہ صبح کو کیا گیا۔ اس وقت سردار سورن سنگھ، سردار کپور سنگھ، سردار سمپورن سنگھ اور ڈاکٹر گوپی چند بھرگاوہ لاہور ہی میں تھے۔ میں نے ان سے التجا کی کہ وہ مدد کے لیے فوج کو طلب کریں چنانچہ ہم نے پنجاب باؤنڈری فورس کے جنرل ریس سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر کہا کہ اب کوئی ان کی بات پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔

"جب ہم مزنگ کے گوردوارہ چیون پادشاہی آئے تو کوئی سکھ زندہ نہیں بچا تھا۔ لاہور کے سکھوں نے مدد مانگنے کے لیے مجھے دہلی بھیجا۔ فیصلہ یہ طے پایا کہ میں سردار بلدیو سنگھ سے ملوں۔ ان دنوں گیانی کرتار سنگھ بھی دہلی میں تھے۔ سردار بلدیو سنگھ ہمیں سردار پٹیل کے پاس لے گئے۔ وہ ایک صوفے پر دراز تھے۔ میں نے انہیں لاہور کا پورا قصہ بیان کیا۔ وہ سن کر انہوں نے گرج کر کہا 'قتل کر دو۔' میں نے پوچھا سردار جی یہ کیسا مشورہ ہے، اگر ہماری مدد نہ کی گئی تو مسلمان نہیں بلکہ ہم

(لاہور کے سکھ) صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ لاہور کا مقدمہ ہم ہار چکے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ پٹیل کو لاہور کی صورتحال کی پوری سمجھ نہیں آئی اور وہ نشے یا غنودگی کی حالت میں بات کر رہے تھے۔

''میں پھر لاہور کبھی واپس نہ جا سکا کیونکہ پاکستان معرض وجود میں آ چکا تھا۔ میرے بچے پہلے ہی امرتسر بھیجے جا چکے تھے۔ سکھ پنجاب کی تقسیم نہیں چاہتے تھے لیکن اگر ایسا ناگزیر ہو جاتا تو وہ اپنے حقوق کا مکمل تحفظ چاہتے تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ محمد علی جناح کے ساتھ کسی سمجھوتے پر متفق ہونا چاہتے تھے لیکن ماسٹر تارا سنگھ نے اس کی مخالفت کی۔ اگر پنجاب کی تقسیم ہوتی تو سکھ ایک الگ صوبہ چاہتے تھے۔ سب سے زیادہ نقصان ہمارا ہوا۔ مسلمان لیڈر سکھوں کو پاکستان میں رکھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔''

یوراج کرشن

''اگست کے اوائل میں کئی ہندو اور سکھ مشرقی پنجاب کی طرف روانہ ہو گئے۔ شاید کسی کے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ وہ مستقل طور پر منتقل ہو رہے تھے۔ یہ بات مد نظر رہے کہ جناح سمیت تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے اقلیتوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے گھروں سے نقل مکانی نہ کریں لیکن چونکہ انتظامی مشینری کو 'منطقی' بنیادوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا، اس لیے وہ متحدہ ریاست کے امکانات کے پابند نہیں رہے تھے۔ چنانچہ سرکاری حکام اور ملازمین کھلے عام اپنے ہم مذہب افراد کی حمایت کر رہے تھے۔ لاہور کے سکھوں اور ہندوؤں نے محسوس کیا کہ لاہور میں مسلم کمیونٹی کے جرائم کے خلاف انہیں کوئی تحفظ نہیں رہا۔

''چونکہ میں نے بھارت جانے کا فیصلہ کیا تھا، اس لیے مجھے 14 اگست کو جالندھر پہنچ کر اپنا چارج سنبھالنا تھا۔ ابھی تک ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان نہیں کیا گیا تھا لیکن مشرقی اور مغربی پنجاب کے درمیان 'منطقی' حد بندی طے پا چکی تھی۔ ہم میں سے اکثر جانتے تھے کہ مسلم اکثریت والے کون سے علاقے ہیں اور کن علاقوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت زیادہ تھی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ لاہور پاکستان کو اور جالندھر بھارت کو ملے گا۔ امرتسر بھی بھارت میں شامل ہونے والا تھا۔ غیر مسلم بالخصوص سکھوں کو یہ امید تھی کہ 'دیگر عوامل' کی بنیاد پر لاہور انہیں ملے گا۔

''13 اگست کو میں کرفیو شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے شام 6 بجے لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچا تاکہ جالندھر کے لیے ٹرین پکڑ سکوں۔ ان دنوں شام 6 بجے کرفیو لگ جاتا تھا۔ ہماری ٹرین رات ساڑھے 8 بجے روانہ ہونی تھی۔ میرے ساتھ جنوبی ہندوستان سے تعلق رکھنے والا عیسائی افسر بھی تھا۔ بڑا افسر ہونے کی وجہ سے اسے ٹرین میں الگ سیلون ملا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ سفر کروں تاہم ٹرین کچھ لیٹ ہو گئی۔ ایک گھنٹے بعد ساڑھے 9 بجے اس کا سیلون آیا البتہ جو ٹرین ہمیں لے کر جانی تھی وہ تاحال نہیں پہنچی تھی۔ میرا چپڑاسی جو ریٹائر فوجی تھا بھی میرے ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ ہم سیلون میں نہ بیٹھیں کیونکہ اکیلے بیٹھ ناخطرناک ہو گا۔ چنانچہ وہ بوگی دوبارہ واپس بھیج دی گئی کیونکہ ہم اس میں سفر کرنے کے خواہاں نہیں تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس فیصلے نے ہمیں بچا لیا۔ 14 اگست سے پہلے لاہور سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کوئی قتل نہیں ہوا تھا بلکہ ارد گرد کے یارڈز میں قتل کے واقعات ہوئے تھے۔

''مجھے یاد ہے کہ اس دوران امر تسر سے مسلمان مہاجرین کی ٹرین وہاں پہنچی۔ مسافروں میں سے اکثر خواتین تھیں۔ کئی عورتوں کی گود میں ان کے بچے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ راستے میں حملہ آوروں نے مردوں کو ہلاک کر دیا جبکہ عورتوں اور بچوں کی جان بخشی کر دی گئی۔ آج اس واقعے کو گزرے 52 سال ہو چکے ہیں اور اس عمر میں یاداشت مجھے دھوکہ سکتی ہے لیکن مجھے دہشت زدہ خواتین کے چہرے اچھی طرح یاد ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس ٹرین کی آمد کے بعد لاہور سمیت مغربی پنجاب میں انتقامی کارروائیاں ہوں گی۔ بالا آخر رات گئے ٹرین روانہ ہو گئی۔ 14 اگست کی صبح کو میں بحفاظت جالندھر پہنچ گیا۔''

خشونت سنگھ

برصغیر کے ممتاز مصنف خشونت سنگھ نے تقسیم کی پچاسویں سالگرہ پر 'لاہور میں آخری ایام' کے نام سے ایک آرٹیکل لکھا ہے، انہوں نے لکھا کہ فسادات میں شدت وسط جون میں آئی:

بلاشبہ سکور میں مسلمانوں کو برتری حاصل تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امپائر بھی مسلمان تھے۔ پنجاب پولیس کی 80 فیصد تعداد مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ریاستی مشینری میں بھی مسلمانوں کا غلبہ تھا۔ یہ صورتحال پورے مغربی پنجاب میں نظر آتی تھی۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کی اکثریت والے علاقوں سے لاہور منتقل ہو رہے تھے۔ لاہور میں بھی حالات ویسے ہی پائے گئے چنانچہ یہ لوگ امرتسر اور مشرقی پنجاب کے دیگر شہروں کی طرف جانے لگے جہاں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ تھی۔

1947 کے جون کی وہ سہ پہر میرے دماغ میں نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ میں ہائی کورٹ سے واپس آیا تھا کہ میں نے شور و غوغا سنا۔ میں اپنے اپارٹمنٹ کی چھت پر چڑھ گیا۔ سورج قہر برسا رہا تھا۔ شہر کے وسط سے دھوئیں کا کثیف بادل اٹھتا دیکھا۔ مجھے اندازے لگانے کی ضرورت نہیں۔ شاہ عالمی کا سکھ محلہ شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ مسلمان غنڈوں نے غیر مسلموں کی مزاحمت کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ شاہ عالمی کے واقعے کے بعد سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ لڑائی لاہور کے دیگر علاقوں میں بھی پھیل گئی۔ ہم خاموش تماشائی بن کر مسلم لیگ کے کارکنوں کو ٹرکوں پر مارچ کرتے دیکھتے۔ یہ لوگ 'پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ' کے نعرے لگاتے تھے۔

شہر میں برپا شورش کا لارنس گارڈن (آج کا باغ جناح) یا مشرقی لاہور کے آخر میں واقع نہر کے ارد گرد کے علاقوں پر کم ہی اثر ہوا۔ ہم اپنی کاروں پر دفاتر جاتے تھے۔ شام کو کاسموپولیٹن کلب یا جم خانہ میں ٹینس کھیلتے اور ڈنر پارٹیوں میں شرکت کرتے جہاں سکاچ کی بوتل 11 روپے میں ملتی تھی اور شراب دریائے راوی کے پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ اشرافیہ کے علاقوں میں 'ہندو مسلم بھائی بھائی' کے پرانے فلسفے پر عملدرآمد بدستور جاری رہا۔ خراب صورتحال میں تیزی آ گئی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے جائیدادیں بیچ کر مشرقی پنجاب کی طرف کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے ہمسائے کی دیوار پر اردو میں نمایاں الفاظ پینٹ ہوتے دیکھے 'یہ پارسی کا مکان ہے'۔ دوسری طرف بھی سفید الفاظ میں ایک بڑی

پینٹنگ تھی۔ اس طرح ہندوؤں اور سکھوں کے مکانات پر نشان لگا دیا گیا۔ ہماری رہائش مزنگ سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ جو مسلمان غنڈوں کا گڑھ تھا۔

جولائی 1947 تک مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے خلاف تشدد کے واقعات کی داستانیں لاہور پہنچنا شروع ہو گئیں اور بڑی تعداد میں لوگ نقل مکانی کر کے بھی مغربی پنجاب کی طرف آئے۔ اس سے مسلمانوں میں مزید اشتعال پھیل گیا۔ آزادی سے ایک ہفتہ قبل سی آئی ڈی پنجاب کے انگریز سربراہ کرس ایوریٹ نے مجھے مشورہ دیا کہ میں لاہور سے چلا جاؤں۔ 6 بلوچ کانسٹیبلوں کی نگرانی میں میں اور میری بیوی کالکا جانے والی ٹرین کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہماری منزل کاسولی تھی جہاں ہمارے بچے پہلے ہی اپنے ننھیال بھیجے جا چکے تھے"(Ibid)۔

امرتسر سے رخصت ہونے والے مسلمان

نیچے جو عینی شاہدین کے تاثرات کے اقتباسات دیے گئے ہیں ان کے بارے میں ہم قبل ازیں بھی کچھ باتیں دے چکے ہیں۔ پہلے مارچ 1947 کے واقعات کا احاطہ کیا گیا تھا۔

چودھری محمد سعید

مسلمانوں کے حوصلے 10 اگست تک بلند رہے اور کہیں بھی کمزوری کے آثار نہیں نظر آئے۔ اگرچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے پنجاب کی 'منطقی' تقسیم کے لیے آئینی ترامیم کے اعلان کے بعد مسلمانوں کی جارحیت کی ہمت کم ہو گئی تھی۔ (جس کے تحت امرتسر مشرقی پنجاب میں شامل ہونا تھا)۔ 10 اگست کو سپرنٹنڈنٹ پولیس امرتسر مسٹر کول نے مسلمان کانسٹیبلوں کو طلب کیا تاکہ ان سے رائے معلوم کی جاسکے کہ وہ مشرقی پنجاب میں خدمات انجام دینا چاہتے تھے یا مغربی پنجاب جانا چاہیں گے حتیٰ کہ دیگر اضلاع سے طلب کی گئی ریزرو فورس کے اہلکاروں سے بھی ایسی ہی رائے پوچھی گئی جن پولیس اہلکاروں نے مغربی پنجاب جانے کو ترجیح دی انہیں اسلحہ جمع کرانے اور پولیس لائن میں رہنے کا حکم دیا گیا۔ کچھ اہلکاروں نے انکار کر دیا۔۔۔ مسلمان کانسٹیبلوں کی خالی اسامیوں پر نئے افراد کو بھرتی کر لیا گیا اور کہا جاتا ہے کہ وہ انڈین نیشنل آرمی کے رکن تھے۔ دراصل یہ لوگ راشٹریہ سیوک سنگھ اور پنتھک پارٹی کے رکن تھے۔ ان لوگوں نے شہر میں دہشت پھیلا دی اور پہلی ہی رات انہوں نے مسلمانوں پر بلا امتیاز فائرنگ کی اور نہایت منظم انداز میں مسلمانوں کے علاقوں پر اپنی نگرانی میں حملے کرائے۔

نفری کی کمی کا بہانہ کر کے مسلمان علاقوں میں قائم پولیس چوکیاں بھی ختم کر دی گئیں۔ شہر میں تعینات فوجیوں نے بھی فسادیوں کے ساتھ سازش کی حتیٰ کہ مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے فوج کی جعلی وردیوں میں ملبوس اہلکار بھی استعمال کیے گئے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے حوصلے مکمل طور پر ٹوٹ گئے۔ بدحواسی میں یہ لوگ مسلمان اکثریت والے علاقوں سے شریف پورہ کی طرف بھاگے یا ریلوے سٹیشن کی طرف گئے۔ ان میں سے بڑی تعداد کو راستے میں ہی قتل کر دیا گیا۔

سب سے بڑی پناہ گاہ مشن ہاسپٹل فار ویمن، مہان سنگھ گیٹ کی حدود میں میسر آئی۔ مس اٹکنسن کی مہربان شخصیت کی وجہ سے 5 ہزار افراد کو پناہ ملی اور پھر انہیں امرتسر کینٹ منتقل کر دیا گیا۔

14 اگست کو امرتسر شہر کے مورچوں اور نواحی علاقوں سے مسلمان شریف پورہ کی طرف آ گئے۔ اسی طرح یہاں کی آبادی اچانک ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ دیہات سے آنے والوں نے بتایا کہ کس طرح سکھ ریاستوں کپور تھلہ اور پٹیالہ کی سرکاری گاڑیوں کی مدد سے مسلمان خواتین کو اغوا کیا گیا۔ شریف پورہ میں ایسے 600 واقعات ہمارے علم میں آئے۔ حتیٰ کہ شہر میں بھی خواتین کے اغوا کے واقعات بھی ہوئے۔

مہان سنگھ گیٹ سے شریف پورہ آنے والی بعض خواتین کو بھی دن دہاڑے زبردستی اٹھا لیا گیا اور برج بھائی پھولا سنگھ منتقل کر دیا گیا۔ معاملہ ایس پی سی آئی ڈی رائے بہادر بدری داس کے نوٹس میں 15 اگست کو لایا گیا لیکن انہوں نے مسلمان لڑکیوں کو بچانے کے لیے کچھ نہ کیا (Said 1993: 143-8)۔

شیخ ارشد حبیب

"ہمارا خاندان امرتسر کا ممتاز کاروباری خاندان تھا۔ پہلے سب مذاہب کے افراد پرامن انداز میں رہتے تھے اور چند شرپسندوں کو چھوڑ کر سب لوگ دوستانہ انداز اور باہمی تعاون کے ساتھ رہتے تھے۔ پنجاب کے دیگر حصوں کی طرح یہاں بھی مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کی طرح معاشی طور پر اتنے مضبوط نہیں تھے۔ امرتسر میں 18 مکانات اور ہوزری کے 3 کارخانے ہماری ملکیت میں تھے۔ میرے والد کانگریس کے کٹر حامی تھے لیکن مسلم لیگ کا یہ پراپیگنڈہ کہ امرتسر پاکستان میں شامل ہو گا اتنا موثر تھا کہ میرے والد بھی یہ سمجھنے لگے کہ ایسا ہی ہو گا۔ مارچ کے آخر تک مسلم لیگ کے لیڈر روزانہ کی بنیاد پر لاہور سے امرتسر آتے جاتے۔ ان میں سے سردار شوکت حیات زیادہ تواتر سے آتے تھے۔ امرتسر کے مسلمانوں کو بتایا گیا کہ امرتسر کو پاکستان میں میں شامل کرانے کے لیے انہیں اپنا تاریخی کردار ادا کرنا ہو گا۔ عملی پہلو سے اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے مضبوط گڑھ چوک فرید کے جرائم پیشہ عناصر اور لاہور کے مسلم لیگی لیڈروں کا پہلے سے ہی گٹھ جوڑ موجود تھا۔ مسلم لیگ کی قیادت نے غریب مسلمانوں کو یہ کہہ کر استعمال کیا کہ پاکستان بن گیا تو یہ لوگ ہندو لالوں اور سکھوں کی جائیدادوں کے مالک ہوں گے۔

"مارچ میں تشدد شروع ہونے کے بعد پھر امرتسر میں کبھی امن نصیب نہ ہوا۔ تقریباً ہر روز چھرا گھونپنے کے واقعات رونما ہوئے۔ امرتسر کا ڈپٹی کمشنر اور پولیس سربراہ انگریز تھے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ انہوں نے تشدد میں ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ امرتسر پولیس کے بیشتر افسر اور اہلکار مسلمان تھے۔ جب تک انگریز افسر انچارج رہے انہوں نے جرائم پیشہ عناصر کی بلا تفریق گوشمالی کی۔ پولیس بروقت جرائم پیشہ لوگوں کو پکڑنے کے لیے مسلمان علاقوں کا گشت کرتی تھی۔ ہندو اور سکھ محلوں میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔

"ہم 10 اگست کو لاہور روانہ ہوئے کیونکہ اس وقت تک امرتسر میں غیر مسلم انتظامی مشینری چارج سنبھال چکی تھی اور بلاشبہ اپنے ہم مذہب عناصر کی حمایت پر اتری ہوئی تھی۔ یہی وہ صورتحال تھی جس میں مسلمان خاندانوں نے ہجرت شروع کر دی۔ میرے والد پہلے ہمیں لاہور چھوڑ کر واپس چلے گئے اور آخر کار 22 اگست کو مستقل طور پر لاہور آ گئے۔ اس وقت تک مسلمانوں کا گاجر مولی کی طرح قتل عام شروع ہو چکا تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح جتھے

انہیں قتل کر رہے تھے۔ لاہور آتے ہوئے راستے میں ہم نے کئی بے گور و کفن لاشیں دیکھیں۔ یہ سب غیر ضروری تھا۔ پنجاب میں ماضی والا امن اور سکون دوبارہ کبھی نہ آ سکا۔"

چودھری محمد صدیق

"میری پیدائش اندرون امرتسر کی وڈی گلی آرائیاں دی میں ہوئی۔ محلے میں چھوٹی گلی آرائیاں دی بھی تھی۔ ہمارے ساتھ والی گلی تیواڑیاں مکمل طور پر ہندو خاندانوں کا مسکن تھی۔ ان دنوں گھروں کے دروازے کھلے رہتے اور ایک دوسرے پر مکمل اعتبار کیا جاتا تھا۔ تمام برادریوں کے بڑے اس بات پر نظر رکھتے تھے کہ کسی کو ہراساں کیا جائے نہ نقصان پہنچایا جائے۔ ہر کوئی خود کو محفوظ سمجھتا تھا۔ حتیٰ کہ امرتسر میں فسادات پھوٹ پڑے تو بھی ہمارے ہمسایوں نے ہم پر حملے نہ کیے۔ اسی طرح ہم نے بھی اس بات کو یقینی بنایا کہ جرائم پیشہ افراد ہمارے ہندو یا سکھ ہمسایوں کو گزند نہ پہنچائیں۔ زیادہ حالات بیرونی عناصر نے خراب کیے۔ یہ سب اجنبی لوگ تھے جو وہاں آ کر بم پھینکتے تے اور بھاگ جاتے تھے۔ 10 اگست کے بعد مسلمانوں کا امرتسر میں رہنا محال ہو گیا کیونکہ انتظامی کنٹرول ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ مسلح جتھوں نے بھی امرتسر پر حملے شروع کر دیے تھے۔ ہم امرتسر سے 13 اگست کو روانہ ہوئے۔ میرے دادا میاں چنن دین وہیں رہ گئے اور اصرار کیا کہ پہلے میرے والد بچوں اور خواتین کو لاہور منتقل کریں اور پھر آ کر انہیں لے جائیں۔ ہم ترن والا بازار سے ہاتھی دروازہ گئے۔ ہم 300 افراد تھے۔ پھر میرے والد میاں عبدالغنی میرے دادا کو لینے واپس امرتسر گئے لیکن افسوس کہ کسی نے میرے دادا کو قتل کر دیا تھا۔ اسی طرح آتے ہوئے ریلوے سٹیشن پر میری خالہ مریم کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ میں ان کا لاڈلہ بھانجا تھا اور آج تک مجھے اپنے دادا اور خالہ یاد آتے ہیں۔ دونوں بہت نیک روحیں تھیں۔

"ریلوے سٹیشن پر فائرنگ کے واقعات میں ڈرامائی اضافہ ہو چکا تھا۔ یقیناً ہندو اور سکھ حملہ آور بھاگنے والے مسلمانوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ میں نے کئی افراد کی لاشیں زمین پر پڑی دیکھیں۔ سٹیشن بے خانماں افراد سے بھر چکا تھا۔ یہ انتہائی بدامنی کا منظر تھا۔ ٹرین میں انتشار تھا کہ ہمارا خاندان اکٹھے سفر نہ کر سکا اور ہمیں مختلف بوگیوں میں جانا پڑا۔ لاہور روانہ ہوئے تو خالصہ کالج کے قریب ہم نے کئی لاشیں پڑی دیکھیں۔ لاہور سٹیشن پر بھی ویسی ہی بدامنی نظر آئی۔ پلیٹ فارموں اور سٹیشن کے باہر بھی جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ سڑک پار کرنے کے لیے ہمیں لاشوں کے اوپر سے گزرنا پڑا۔ یہ 14 اگست کی صورتحال تھی۔"

عمر سعید

"بنیادی طور پر ہمارے خاندان کا تعلق شمالی پنجاب کے علاقے گوجر خان سے تھا لیکن 1920 کی دہائی کے آخر میں میرے دادا امرتسر میں آباد ہو گئے۔ چونکہ وہ سرکاری ملازم تھے اور طویل عرصہ امرتسر مقیم رہے چنانچہ انہوں نے وہیں سکونت برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ہمارا گھر جلیانوالہ باغ کے قریب تھا۔ امرتسر ایک متحرک سیاسی مرکز تھا۔ یہاں خاکسار اور احرار کے کارکن سڑکوں پر مارچ کرتے تھے جبکہ ہندو اور سکھ بھی سیاسی طور پر کافی منظم تھے۔ یہ کانگریس کا بھی مضبوط گڑھ تھا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو سمیت کئی مسلمان بھی کانگریس کے متحرک رکن تھے تاہم مسلم لیگ کے ساتھ ہمدردی کے

جذبات حاوی تھے کیونکہ میرے والد سمیت کئی مسلمانوں کا خیال تھا کہ صرف ایک اسلامی ریاست میں انصاف کا بول بالا ہو گا۔ شہر میں گڑبڑ 1945 کی انتخابی مہم سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ میں ان دنوں ایم اے او کالج میں سال اول کا طالبعلم تھا۔ مارچ کے اوائل میں سکھوں نے اشتعال انگیزی میں پہل کی۔ اس کے بعد حالات کبھی معمول پر نہ آ سکے۔ کئی ہندو اور سکھ بھی میرے دوست تھے۔ بلراج باوا، پریم چند وہرہ اور نہال سنگھ ہماری ہی گلی میں رہتے تھے۔ حسن بخش اور محمد سرور بھی میرے دوست تھے جو ہال بازار میں مقیم تھے۔ ہمارا ایک گروہ تھا، ہم مل کر فلمیں دیکھنے جاتے تھے۔ ہم موسیقی اور گانوں کے بھی شوقین تھے۔ آپ شاید یقین نہ کریں لیکن قتل اور زخمی کرنے کے کئی بہیمانہ واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئے۔ البتہ ہمارے گروپ میں کوئی ناچاقی نہ ہوئی۔

''جب صورتحال کافی بگڑ گئی تو بھی ہم دوست بلا توقف ملتے جلتے تھے۔ کافی عرصے بعد میرے ہندو اور سکھ دوست آئے اور ہمیں مشورہ دیا کہ ہم یہاں سے نکل جائیں کیونکہ آر ایس ایس، اکالی دل والے حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اس وارننگ کے باوجود میرے والد کو علاقہ چھوڑنے پر تامل تھا کیونکہ اسی علاقے میں ان کے ایک دوست رہتے تھے جنہیں ہم انکل مہتہ کہتے تھے۔ یہ دونوں پوسٹل سروس میں ملازم تھے اور ہمارے خاندانوں کے درمیان بھی مراسم تھے۔ مجھے انکل مہتہ کی بیٹی پروہتی کی شادی آج بھی یاد ہے۔ اس نے رخصتی سے پہلے میرے ماں باپ کے پاؤں بھی چھوئے تھے۔ یہ شادی 1946 کو ہوئی۔

''جون کے شروع میں ہم شریف پورہ میں منتقل ہو گئے۔ ہم وہاں گوجر خان کے ایک اور خاندان کے گھر مقیم ہو گئے۔ اگست کے اوائل تک مسلمان تیزی سے نقل مکانی کر رہے تھے۔ امرتسر کے اردگرد کے دیہات میں بڑی تعداد میں مسلمان خواتین کو اغوا کیا گیا اور ہر روز لٹے پٹے مسلمان شریف پورہ آ رہے تھے۔ میں نے سنا کہ کئی بزرگوں کو گھروں میں اکیلے چھوڑ دیا گیا کیونکہ وہ چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ ایک لڑکی کی شکل آج بھی یاد ہے جس کا چہرہ بری طرح مسخ تھا اور چھاتیاں زخمی تھیں۔ اس نے حملہ آور سکھوں کے ساتھ مزاحمت کی تھی جس پر اسے کرپانوں کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ 12 اگست کو ہماری روانگی سے پہلے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسی۔ اس کا والد پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ کئی اور لوگوں نے بھی شریف پورہ میں پناہ حاصل کی تھی۔ سینکڑوں افراد نے پٹیاں باندھ رکھی تھیں جبکہ کچھ افراد جسمانی اعضا سے محروم کر دیے گئے۔ بے شمار افراد کو دکھ اور تکلیف میں دیکھنا ایک دہشت انگیز امر تھا۔ شریف پورہ میں حالات کافی سرد گرم تھے۔ لیکن بہرحال لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ خواتین ہر وقت قرآن کی تلاوت کرتیں جبکہ مسلمان شریف پورہ کی حفاظت کرتے تھے۔ کئی بار سکھ جتھوں نے حملے کیے لیکن انہیں پسپا کر دیا گیا۔

''12 اگست کو میرے ماموں ٹرک لے کر آئے۔ ان کے قریب ترین دوست ریٹائر فوجی افسر تھے جنہوں نے گوجر خان میں ہندوؤں کا چھوڑا خالی ٹرک قبضے میں لے لیا۔ ہم رات گئے روانہ ہوئے۔ کئی دیگر لوگ بھی ہمارے ساتھ آنا چاہتے تھے لیکن ٹرک میں صرف گوجر خان کے دو خاندان اور راولپنڈی کا ایک خاندان ہی سما سکے۔ چونکہ رات کا وقت تھا اس لیے مجھے علم نہیں ہو سکا کہ ہم کس وقت لاہور پہنچے۔ لاہور میں ہر طرف آگ لگی تھی۔ ہم وہاں چند گھنٹے ہی ٹھہرے اور پھر گوجر خان روانہ ہو گئے۔ میرے والد اور ان کے دوست کے درمیان 1950 کے عشرے تک خط

وکتابت ہوتی رہی۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ میں اپنے جوانی کے دوستوں کے بارے میں کچھ جان سکوں لیکن اس کی نوبت کبھی نہ آ سکی۔ اب میں بوڑھا اور بیمار ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ دنیا سے رخصتی تک میرے دوست اور امرتسر شہر میری یادوں میں زندہ رہیں گے۔"

علی بخش

"میرا تعلق جوتے بنانے والی برادری سے تھا۔ ہماری برادری کا ایک نوجوان تھا جس نے فروری 1947 کی تحریک راست اقدام کے دوران امرتسر جیل کی دیوار پر مسلم لیگ کا پرچم لہرا دیا تھا۔ اسے پولیس نے گولی مار دی تھی۔ ہمارے محلے میں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی اور ہمارے کئی نوجوانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے علاقوں پر حملوں میں حصہ لیا۔ دونوں اطراف مسلح تھیں اور ایک دوسرے کو ہلاک کرنے میں کوئی بھی رحمدلی کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔ امرتسر کے مسلمان رہنما مسلمانوں کو یہ یقین دلا رہے تھے کہ امرتسر نہ صرف پاکستان میں رہے گا بلکہ انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی کی جدوجہد میں قائدانہ کردار ادا کرے گا۔

"پاکستان بننے سے ایک ماہ پہلے سکھ جتھے کافی متحرک ہو گئے اور انہوں نے امرتسر کے نواحی علاقوں پر حملے شروع کر دیے تھے۔ آئے روز دباؤ بڑھ رہا تھا اور قریبی دیہات سے لوگ خوفناک داستانوں سمیت یہاں منتقل ہونے لگے تھے۔ 13 اگست کو ہمارے پورے محلے نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے نکلا جائے اور لاہور میں پناہ لینی چاہیے۔ ہمارے کچھ نوجوانوں کے پاس اسلحہ تھا لیکن ہم زیادہ تر اپنے (موچیوں والے) اوزاروں سے مسلح تھے۔ اس لیے ہم سٹیشن تک سکھوں کو دور رکھنے میں کامیاب رہے۔ البتہ فائرنگ سے ہمارے 500 کے گروپ میں سے بعض افراد مارے گئے۔ ان میں میرا دوست اسلم بھی تھا۔ یہ ایک بہیمانہ قتل تھا۔ اسے گردن کے قریب گولی لگی تھی۔ اس نے مرنے سے پہلے جو اذیت برداشت کی وہ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ ایک اچھا گلوکار تھا اور ہم اچھے دوست تھے۔

"ریلوے سٹیشن پہنچنے تک ہمارے گروپ کے نصف درجن کے لگ بھگ افراد موت کا شکار ہو گئے۔ وہ لاشیں مناسب اسلامی طریقے کے بغیر دفنا دی گئیں۔ ہم اور کر بھی کیا سکتے تھے؟ ریلوے سٹیشن پر قیامت کا سماں تھا۔ صدمے سے بے حال مرد، عورتیں اور بچے بھوک اور پیاس کا بھی شکار تھے۔ لاہور جانے والی ٹرین پر سوار ہونے کی کشمکش بھی ایک خوفناک منظر تھا۔ ہم نے اپنے چاقوؤں اور دیگر آہنی آلات کی مدد سے اپنی جگہ بنائی۔ لاہور تک کا سفر بہت سست رفتار اور تکلیف دہ تھا۔ کئی گھنٹے بعد ہم لاہور پہنچے۔ یہ 14 اگست کا دن تھا اور لاہور سٹیشن پر مردہ ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں ادھر ادھر پڑی تھیں۔

"اندرون شہر تک ہم نے پیدل سفر کیا جہاں ہمارے بعض رشتہ دار مقیم تھے۔ شاہ عالمی اور ہندوؤں کے دیگر علاقے جلائے جا چکے تھے۔ دھوئیں کے کثیف بادل ہر جگہ نظر آ رہے تھے۔ میرے قریبی رشتہ داروں میں سے کوئی بھی موت کا شکار نہیں ہوا۔ البتہ میں سمجھتا ہوں پاکستان کے لیے ہزاروں افراد نے جانیں دیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ آج وہی پاکستان ہے جو ہم چاہتے تھے۔ ہم امرتسر کے غریب لوگ تھے اور لاہور میں بھی ہمارے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے باوجود ہم پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔"

انٹرویوز

ستارہ بیگم (والدہ مصنف)، انہوں نے 1990 میں انتقال سے پہلے اپنی زندگی میں کئی بار تفصیلات بتائیں۔

پران نوائل، نئی دہلی 18 اکتوبر 1999

ہرکشن سنگھ سرجیت، نئی دہلی 18 اکتوبر 1999

یوراج کرشن، نئی دہلی 21 اکتوبر 1999

ڈاکٹر جگدیش چندر سرن، نئی دہلی 24 اکتوبر 1999

رامانند ساگر (بالی ووڈ کے معروف مصنف اور فلمساز) نئی دہلی 25 اکتوبر 1999، ممبئی 18 اکتوبر 2001

مجاہد تاج دین، لاہور 02 اور 25 فروری 2000

سلیم شاہد، لاہور 5 اپریل 2003

چودھری محمد صدیق، لاہور 27 اپریل 2003

گیانی مہندر سنگھ، امرتسر 27 مارچ 2004

عمر سعید اور شیخ ارشد حبیب، لاہور 27 دسمبر 2004

علی بخش، لاہور 30 دسمبر 2004

آشوینی کمار، نئی دہلی 2 دسمبر 2005

کمار چند، سنگاپور 10 مئی 2010

نرانجن سنگھ چوپڑہ، سنگاپور (بذریعہ ای میل) 5 جنوری 2011

References

Gujral, Satish, *A Brush with Life*: An Autobiography, New Delhi: Viking, (1997).Hamdani, Hamid, *'Lahore Jall Raha Tha'* (*Lahore was Burning*) in Chughtai, Hakim Muhammad Tariq Mehmood Abqary Mujadidi (compiler and editor), *1947 ke Muzalim ki Kahani khud Muzlumon ki Zabani* (*The Story of the 1947 Atrocities from the Victims' Themselves*), Lahore: Ilm-o-Irfan Publishers, (2003).

Said, Chaudhri Mohammad, *'A Brief Account of the Happenings in Amritsar'* by Ch. Mohammad Said M.A., L.L.B., ex-Terminal Tax Superintendent, Municipal Committee, Amritsar, Present Address:- 3/30, Nisbet Road, Lahore', *The Journey to Pakistan: A Documentation on Refugees of 1947, Islamabad: National Documentation Centre.*

Singh, Khushwant, *'Last Days in Lahore: From the brittle security of an elite rooftop, a view of a city burning' Outlook*, Delhi, (28 May 1997).

Talib, S.G.S., *Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab in 1947:* Delhi: Voice of India, (1991).

Official documents

Carter, Lionel, (ed), 2007b, *Punjab Politics, 1 June 1947 – 14 August 1947: Tragedy, Governors' Fortnightly Reports and other Key Document,* New Delhi: Manohar.

Fortnightly reports of Chief Secretary for 1947, IOR L/P & J/5/250, (on microfilm), London: British Library.

Khan, Fazal Muqeem (Maj-General), *The Story of the Pakistan Army*, Karachi: Oxford University Press, 1963.

Mansergh, N. and Moon, P. (eds.), *The Transfer of Power 1942-47*, Vol. XII, July 8 to August 15, 1947, London: Her Majesty's Stationery Office, (1983).

Note on the Sikh Plan, Lahore: Government Printing Press, (1948).

Newspapers

The Pakistan Times, Lahore, 1947.

The Tribune, Lahore, 1947.

سکھ
12,500
25,000
نقشے میں دکھائی گئی حد بندی نہ تو بالکل
درست ہے نہ ہی مستند ہے۔
ATTOCK
RAWALPINDI
JHELUM
GUJRAT
SIALKOT
SHAHPUR
GUJRANWALA
SHEKHUPURA
Lahore
AMRITSAR
MIANWALI
JHANG
LYALLPUR
LAHORE
FEROZPUR
MUZAFFAR-
GARH
MONTGOMERY
MULTAN
DERAGHAZI
KHAN
BAHAWALPUR
CHAMBA
PUNJAB STATES
KANGRA
GURDASPUR
KAPURTHALA
HOSHIAR
PUR
JALANDHAR
LUD
PUNJAB HILL
STATES
PATIALA AND OTHER
STATES
KARNAL
HISSAR
ROHTAK
DELHI
GURGAON
ریڈ کلف لائن
صوبائی حد بندی
ضلعی حد بندی
نوابی ریاستیں

PARTITION BOUNDARIES IN THE PUNJAB
Showing national boundaries as laid down in the First Schedule of the Indian Independence Act 1947,
and boundaries as finally demarcated by the Boundary Commission.
International frontier
Provincial & State boundary
District boundary
National boundary between India & Pakistan
Final boundary between India & Pakistan as demarcated by the Boundary Commission
AFGHANISTAN
BALUCHISTAN
N.W. FRONTIER PROVINCE
PESHAWAR
Campbellpore
ATTOCK
Rawalpindi
RAWALPINDI
KASHMIR
MIANWALI
Mianwali
JHELUM
Jhelum
GUJRAT
Gujrat
Chenab
SHAHPUR
Sargodha
JHANG
Sialkot
SIALKOT
Gujranwala
GUJRANWALA
GURDASPUR
Gurdaspur
CHAMBA
Chamba
Dhamsala
KANGRA
Shekhupura
SHEKHUPURA
Amritsar
AMRITSAR
LAHORE
HOSHIARPUR
Hoshiarpur
MANDI
Sundarnagar
Lyallpur
LYALLPUR
Ravi
Kapurthala
KAPURTHALA
Jullundur
JULLUNDUR
Simla
Ferozepore
FEROZEPORE
Ludhiana
LUDHIANA
AMBALA
Nahan
Montgomery
MONTGOMERY
MUZAFFARGARH
PATIALA
Patiala
Ambala
Dera Ghazi Khan
Muzaffargarh
Multan
MULTAN
Sutlej
PUNJAB STATES
Jumna
DERA GHAZI KHAN
KARNAL
Karnal
UNITED PROVINCES
HISSAR
Hissar
Indus
ROHTAK
Rohtak
DELHI
Gurgaon
GURGAON
Miles
Km
RESEARCH DEPT. F.O. September 1948

تیسرا مرحلہ: نسلی صفایا، 15 اگست–31 دسمبر 1947

تعارف

15 اگست کو اقتدار مشرقی اور مغربی پنجاب کی حکومتوں کو منتقل کر دیا گیا۔ سی ایم تری ویدی مشرقی پنجاب کے گورنر اور لاہور سے تعلق رکھنے والے کانگریس کے لیڈر ڈاکٹر گوپی چند بھرگاوہ وزیر اعلیٰ بن گئے۔ سندھ کے گورنر سر فرانسس موڈی کو تبدیل کر کے مغربی پنجاب میں گورنر جبکہ نواب افتخار حسین ممدوٹ کو وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ مختلف قوانین کے ذریعے دونوں صوبوں کی حکومتوں کو اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے آپس میں تعاون کرنے کا پابند بنایا گیا چونکہ انگریزوں کا اقتدار ختم ہو چکا تھا، اس لیے یہ صوبائی حکومتیں صرف اپنی اپنی قومی حکومتوں کے سامنے جوابدہ تھیں۔ جیسا کہ قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ انتظامی مشینری کی طرف سے 1945 کی انتخابی مہم سے ہی اپنے ہم مذہب افراد کی پشت پناہی کرنے کی روش شروع ہو چکی تھی۔ آنے والے دور میں یہ روایت مزید مستحکم ہو گئی۔ 15 اگست سے آگے اختیارات کا غلط استعمال ایک قاعدہ بن گیا تاہم بعض معاملات میں استثنیٰ بھی تھا۔

یہ بات حیران کن نہیں کہ دونوں طرف کی انتظامیہ ایک دوسرے سے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ میں ناکامی کے الزامات دھر رہی تھیں۔ بعض مشترکہ کمیٹیوں کے اجلاس بھی ہوئے جن میں معلومات کے ساتھ الزامات کا بھی تبادلہ ہوا۔ گورنر موڈی نے 5 ستمبر 1947 کو گورنر جنرل محمد علی جناح کو لکھا کہ مغربی پنجاب میں باقی ماندہ سکھوں اور ہندوؤں کو مشرقی پنجاب کی جانب دھکیلنے کی ضرورت ہے۔

> میں ہر کسی کو کہہ رہا ہوں کہ مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ سکھ کیسے سرحد پار کرتے ہیں۔ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو ان سے نجات حاصل کی جائے۔ اس بات کی موہوم علامات موجود ہیں کہ لائل پور میں مقیم (نہری علاقوں والے) 3 لاکھ سکھ یہاں سے نکلیں گے لیکن آخر کار انہیں جانا ہی پڑے گا (Singh,1989:145)۔

یہ خط دراصل کھوسلہ رپورٹ (1989:169) میں شائع ہوا لیکن پنجاب کی تقسیم پر تحقیق کرنے والے مصنف کرپال سنگھ نے جسٹس کھوسلہ سے رابطہ کر کے دریافت کیا کہ کیا مغربی پنجاب کے گورنر کی یہ بات درست ہے۔ جس پر کھوسلہ نے جواب دیا کہ انہیں اس خط کی فوٹو کاپی فراہم کی گئی جو پنجاب کی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے پکڑی تھی۔ بعد ازاں کرپال سنگھ نے بھی تصدیق کی کہ اس خط کے مندرجات گورنر فرانسس موڈی کے ہی تھے (Ibid: footnote pp.145-6)۔ خود میں بھی چندی گڑھ میں 2 جنوری 2003 کو پروفیسر کرپال سنگھ سے ان کے گھر پر انٹرویو کے بعد اس خط کے درست ہونے کی تصدیق کرتا ہوں۔ اس خط کو کسی سازش کے طور پر نہیں لینا چاہیے بلکہ یہ اس وقت کے حالات کے تخمینے کی کوشش تھی اور خط کے اندر لہجہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔

'پاکستان ٹائمز' کی 4 دسمبر 1947 کی اشاعت میں بتایا گیا کہ تارا سنگھ نے ہندوؤں اور سکھوں کی پاکستان واپسی کی مخالفت کی اور چاہتے تھے کہ بھارتی مسلمان پاکستان کو ہجرت کر جائیں۔ انہوں نے کہا کہ:

> سکھوں اور ہندوؤں کو واپس پاکستان جانے کا مشورہ دینا خطرات سے بھرپور ہے۔ میرا پاکستان میں موجود سکھوں اور ہندوؤں کو مشورہ یہ ہے کہ وہ فوراً وہاں سے نکل آئیں اور جو جلد پاکستان نہیں چھوڑتے وہ شدید مصائب کا شکار ہوں گے۔ کوئی سکھ یا ہندو ایک اسلامی ملک پاکستان کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح بھارتی مسلمانوں کی ہمدردی پاکستان کے ساتھ ہو گی اور ان سب پر اعتبار کرنا ناقابل معافی غلطی ہو گی۔

مغربی پنجاب کی طرف مسلمانوں کی بڑی تعداد میں نقل مکانی

پاکستان ٹائمز نے 13 اگست کو خبر شائع کی کہ گزشتہ 3 روز کے دوران ضلع گورداسپور سے لاہور میں 5 ہزار مہاجرین داخل ہوئے ہیں۔ 24 اگست کو ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ یہ تعداد بڑھ کر ڈیڑھ لاکھ ہو گئی تھی۔ 8 ستمبر کی اشاعت میں خبر دی گئی کہ یومیہ 50 ہزار مہاجرین لاہور میں پہنچ رہے تھے۔ 14 ستمبر کو مہاجرین کی کل تعداد 12 لاکھ بتائی گئی۔ لاہور میں واہگہ بارڈر کے ذریعے 5 لاکھ مہاجرین، قصور کے راستے 4 لاکھ افراد، نارووال سرحد سے 2 لاکھ مہاجرین آئے جبکہ ایک لاکھ دیگر پناہ گزین سیلمانکی کے راستے پیدل داخل ہوئے۔ ان بے گھر افراد کو آباد کرنے کے حوالے سے اخبار میں بتایا گیا کہ ضلع منٹگمری اور ملتان میں ساڑھے 3 لاکھ افراد آباد ہوئے جبکہ ایک لاکھ مہاجرین کو لاہور میں پناہ ملی۔ باقی ماندہ پناہ گزین جھنگ، سرگودھا، گجرات، گوجرانوالہ اور شیخوپورہ میں منتقل ہو گئے۔ 15 اکتوبر کو پاکستان ٹائمز نے اطلاع دی کہ مشرقی پنجاب کے 54 لاکھ مزید پناہ گزین مغربی پنجاب آئیں گے۔ خبر میں 4 لاکھ 95 ہزار ہندوؤں اور سکھوں کی بھی نقل مکانی کرنے کی اطلاع دی گئی۔ ایک لاکھ 17 ہزار 712 مہاجرین والٹن کے پناہ گزین کیمپ میں مقیم تھے۔ یہ خبر پاکستان ٹائمز کی 7 نومبر کی اشاعت میں شائع ہوئی۔ 6 نومبر کو محمد علی جناح نے والٹن کیمپ کا دورہ کیا اور دیکھا کہ مہاجرین کے حوصلے کافی بلند تھے۔

9 نومبر کو خبر دی گئی کہ پنجاب کے وزیر پناہ گزین و بحالیات میاں افتخار الدین نے بتایا کہ مشرقی پنجاب سے 18 لاکھ 81 ہزار 939 مہاجرین مغربی پنجاب میں منتقل ہوئے۔ پاکستانی فوج کے شعبہ انتقال مہاجرین کے سربراہ بریگیڈیئر ایف ایچ سٹیونز نے بتایا کہ ساڑھے 3 لاکھ مسلمان اب بھی مشرقی پنجاب میں محصور تھے اور پاکستان آنے کے خواہاں تھے۔ 25 دسمبر کو اخبار نے لکھا کہ 10 دسمبر تک 46 لاکھ 80 ہزار افراد نے نقل مکانی کی۔

مشرقی پنجاب کی طرف بڑی تعداد میں نقل مکانی کرنے والے سکھ اور ہندو

'دی ٹریبون' نے 29 اگست کی اشاعت میں بتایا کہ سینکڑوں ہندو اور سکھ مغربی پنجاب سے فرار ہو رہے تھے۔ یکم اکتوبر کو خبر دی گئی کہ مشرقی پنجاب کی حکومت نے مغربی پنجاب سے غیر مسلم پناہ گزینوں کی منتقلی کے لیے 1500 ٹرک اور

2 بٹالین فوج مختص کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسی اخبار نے 4 اکتوبر کو بتایا کہ مغربی پنجاب میں اب بھی 14 لاکھ 31 ہزار ہندو اور سکھ مشرقی پنجاب کو نقل مکانی کے منتظر تھے۔ اسی تاریخ کو بتایا کہ ایک لاکھ 15 ہزار پناہ گزین پیدل بھارت کو مارچ کر رہے تھے۔ 7 اکتوبر کو بلوکی کے مقام پر پاکستان حکومت کی طرف سے 50 ہزار مہاجر ہندوؤں اور سکھوں کو روکنے کے افسوسناک واقعے کا ذکر کیا گیا۔ 8 اکتوبر کو خبر دی گئی ہے کہ لائل پور میں ہندو اور سکھ قافلوں پر حملے کیے جا رہے تھے جبکہ مشرقی پنجاب کے وزیر سردار اشہر سنگھ مجھیل نے اعلان کیا کہ مسلم قافلوں پر مسلح جتھوں کے حملوں کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ مشرقی پنجاب کی حکومت کو امرتسر میں محصور لاکھوں مہاجرین کو منتقل کرنے میں مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ دیگر سکھ رہنماؤں نے بھی اپیل کی کہ پاکستان جانے والے مسلمانوں پر حملے نہ کیے جائیں۔ 10 اکتوبر کو اخبار نے لکھا کہ لائل پور اور شیخوپورہ سے ہندوؤں اور سکھوں کو نکالنے کے لیے مزید فوجی دستے تعینات کیے جا رہے تھے۔ 12 اکتوبر کی اشاعت میں بتایا گیا کہ صرف جہلم شہر میں 10 ہزار ہندو اور سکھ نقل مکانی کے منتظر تھے۔

16 اکتوبر کو 'دی ٹریبون' نے خبر دی کہ بھارتی حکومت نے پاکستان کے دور افتادہ علاقوں سے ہندوؤں اور سکھوں کو نکالنے کے لیے 12 ڈکوٹا طیارے چارٹر کیے تھے۔ ہر طیارے میں 57 مسافر لے جانے کی گنجائش تھی۔ 18 اکتوبر کو بتایا گیا کہ 20 لاکھ ہندو اور سکھ اب بھی پنجاب اور سرحد سے نقل مکانی کے منتظر تھے۔ اس کے علاوہ بلوکی سے پیدل قافلے بھی بھارت میں داخل ہو رہے تھے۔ 16، 17، 18 اور 19 نمبر قافلے آئے۔ ہر قافلے میں اوسطاً 40 سے 50 ہزار مہاجرین موجود تھے۔ 29 اکتوبر کے اخبار میں بتایا گیا کہ پاکستانی فوج نے سرگودھا، میانوالی اور راولپنڈی کے اندرونی علاقوں سے ہندوؤں اور سکھوں کی بحفاظت منتقلی میں تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ موقف اختیار کیا کہ یہ لوگ بھارت نہیں جانا چاہتے۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ ان علاقوں میں 8 لاکھ سے 10 لاکھ ہندو اور سکھ اب بھی مقیم تھے۔ 16 نومبر کو دی ٹریبون نے بتایا کہ 6 نومبر تک 32 لاکھ ہندو اور سکھ مغربی پنجاب سے بھارت پہنچے تھے۔ ان میں سے 29 لاکھ مغربی پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے سے آئے تھے۔ 10 لاکھ اب بھی نقل مکانی کے منتظر تھے۔

پنجاب باؤنڈری فورس کی تحلیل

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ پنجاب باؤنڈری فورس (پی بی ایف) جولائی میں قائم کی گئی تھی اور یکم اگست کو اس نے کام شروع کیا۔ اس کو وسطی اضلاع میں امن وامان بحال رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ پنجاب کی تقسیم سے مراد یہ ہے کہ مغربی پنجاب میں لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، شیخوپورہ، لائل پور اور منٹگمری کے اضلاع جبکہ مشرقی پنجاب میں امرتسر، گورداسپور، ہوشیارپور، جالندھر، فیروزپور اور لدھیانہ کے اضلاع تقسیم ہوئے۔ پی بی ایف 9 ہزار سے 15 ہزار نفری پر مشتمل تھی۔ میجر جنرل فضل مقیم خان (1964:66) تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ فورس اپنے قیام سے ہی جانبداری کا شکار ہو گئی کیونکہ اسے اس کی بساط سے بڑی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس کے علاوہ فسادات سے کئی اہلکار اور افسر بھی متاثر ہوئے جس سے ان کی جانبداری پر حرف آیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ پی بی ایف کو سکھوں کی خودمختار ریاستوں میں مداخلت کے

اختیارات حاصل نہیں تھے جہاں کہ مسلمانوں کا بدترین قتل عام ہو رہا تھا۔ جب اس فورس کو تحلیل کیا گیا تو دونوں طرف کی حکومتیں مہاجرین کے مسائل کو اپنی اپنی فوج کے ذریعے حل کرنے پر متفق ہو گئیں۔ جنرل فضل مقیم خان لکھتے ہیں کہ:

پنجاب باؤنڈری فورس کی تحلیل کے بعد پاکستان آرمی کے دستے اپنی سرحد کے اندر اور بھارتی فوج کے اہلکار اس کی سرحد کے اندر واپس بلائے گئے۔ جو یونٹ پہلے پی بی ایف میں اکٹھے تھے وہ اب الگ ہو چکے تھے۔ اس بات پر بھی اتفاق کیا گیا کہ پاکستانی دستے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو بچانے کے لیے استعمال کیے جائیں گے۔ اس طرح سے بھارتی فوج پاکستانی حدود میں یہی کام کرے گی۔ یہ دستے ایک ملک سے دوسرے حصے میں علاقے کے فوجی کمانڈر کے تحت کارروائی کر سکتے تھے۔ جن دستوں کے ساتھ فوج تعینات ہوتی ان میں سے شاید ہی کوئی پناہ گزین زندگی سے ہاتھ دھوتا (Ibid: 67-73)۔

آصف علی شاہ جن کے ساتھ میری 'ڈیلی ٹائمز' میں کالم نگاری کے سلسلے میں اکثر خط و کتابت ہوتی ہے نے مجھے مشورہ دیا کہ میں لیفٹیننٹ جنرل آفتاب احمد خان سے رابطہ کروں جو پی بی ایف اور اس کے بعد مربوط ملٹری فورس دونوں میں کام کرتے رہے۔ چنانچہ میں نے لیفٹیننٹ جنرل (ر) آفتاب احمد جو ان دونوں فوج میں میجر تھے کو ایک خط لکھا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ فورس مکمل طور پر پاکستان اور بھارتی عملے پر مشتمل تھی اور اکا دکا افسر ہی انگریز تھے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ فورس بے سروسامانی کے عالم میں کام کر رہی تھی اور نفری میں کمی کے علاوہ اسے دھماکہ خیز صورتحال سے نمٹنے کا واضح پلان بھی نہیں دیا گیا تھا۔ اس بے سروسامانی کے باوجود سینکڑوں، ہزاروں افراد کی جانیں بچائی گئیں اور جہاں فوج کا قافلہ موجود ہوتا وہاں مہاجرین محفوظ رہتے۔ مہاجرین کے کٹھے پھٹے قافلے بسا اوقات 20 سے 30 میل لمبے ہوتے اور ان میں ڈیڑھ لاکھ تک پناہ گزین شامل ہوتے تھے۔ بیل گاڑیاں، ٹرک، مویشی، مرد، عورتیں، بچے، بیمار اور بوڑھے سب ساتھ ہوتے تھے۔ جنرل آفتاب نے کئی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی جان بچانے کی مثالیں دیں۔

میجر جنرل فضل مقیم خان نے اپنی کتاب میں، نہ لیفٹیننٹ آفتاب نے میرے ساتھ رابطے میں 25 اور 26 اگست کو شیخوپورہ میں بلوچ رجمنٹ کی طرف سے ہندوؤں اور سکھوں پر فائرنگ میں حصہ لینے کے واقعے کا ذکر کیا حالانکہ یہی واقعہ پی بی ایف کو توڑنے کی وجہ بنا تھا۔ وہ مسلمان جنہوں نے اس قتل عام میں حصہ لیا تھا دلیل دیتے ہیں کہ پہلے غیر مسلموں نے ہم پر فائرنگ کی تھی لیکن اس فوجی یونٹ کے ہندو فوجیوں نے اس اقدام کو چیلنج کیا تھا۔ پی بی ایف تحلیل ہونے کے بعد فوجی حکام نے ذمہ داری فوجیوں کے خلاف انکوائری واپس لے لی (Jeffrey,1974: 516)۔ مسئلہ یہ تھا کہ پنجاب میں جابجا گھومنے والے قاتلوں کے مقابلے میں پی بی ایف کی نفری بہت کم تھی۔ اس کے علاوہ اگست کے اختتام تک اپنے ہم مذہب افراد کی تکالیف دیکھ کر پی بی ایف کے مسلم اور غیر مسلم اہلکاروں نے ایک دوسرے پر بھی فائرنگ شروع کر دی تھی (Marston, 2009: 496)۔

نتیجتاً ہندوستان اور پاکستان کے فوجی حکام نے مشترکہ ریسکیو یونٹ تشکیل دینے پر اتفاق کر لیا۔ لیفٹیننٹ جنرل آفتاب خان ان فوجیوں میں شامل تھے جنہوں نے ہزاروں، لاکھوں افراد کو بحفاظت بھارتی سرحد پار کرنے میں مدد فراہم کی۔ انہوں نے منٹگمری (ساہیوال) کے علاقے میں کافی فعال کردار ادا کیا۔ پاکستانی فوج کے ایک اور افسر میجر جنرل (ر) سید وجاہت حسین تھے۔ انہوں نے جالندھر، لدھیانہ اور کپور تھلہ ریاست میں امدادی سرگرمیوں کی تفصیل بتائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا انخلا ستمبر کے دوسرے نصف سے شروع ہوا تھا (Husain, 2010: 54-73)۔

1947 کے اختتام تک دونوں طرف سے مہاجرین کا مکمل انخلا نہیں ہو سکا تھا۔ یہ عمل 1948 کے ابتدائی مہینوں تک جاری رہا۔ تشدد 15 اگست سے وسط ستمبر تک زوروں پر رہا۔ زبانی واقعات سن کر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لوگ عموماً اپنے گھر اور جائیدادیں چھوڑنے پر تیار نہیں تھے لیکن انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ کئی افراد امید کر رہے تھے کہ امن وامان کی صورتحال معمول پر آتے ہی وہ واپس اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں پتہ نہیں تھا کہ دونوں نئے ملکوں کی فوج اور بارڈر پولیس نے سرحدوں پر کنٹرول سنبھال کر گشت شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد پناہ گزینوں کی آر پار آمدورفت صرف حکومت وقت کے مفادات مد نظر رکھ کر ممکن ہوئی۔ اپنے آبائی گھروں کو واپسی کی تمام افواہیں اس وقت دم توڑ گئیں جب 1950 میں پاکستان اور بھارت کی حکومتوں نے اقلیتوں کے حقوق کے معاہدے جسے نہرو لیاقت سمجھوتہ کہتے ہیں پر دستخط کر دیے۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق تھا تو اس سمجھوتے سے "واپسی کے حق" پر یونیورسل ڈیکلریشن آف ہیومن رائٹس (1948) کے تحت انسانی حقوق پر زد نہیں پڑتی تھی لیکن یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ اقلیتوں کو بلا تفریق مذہب تمام حقوق حاصل ہوں گے۔ اس میں کہا گیا کہ دونوں حکومتیں اپنے شہریوں کو زندگی، کلچر، املاک، عزت نفس، دونوں ملکوں کے آر پار نقل وحرکت، کاروبار، اظہار، عبادت کی آزادی یقینی بنائیں گی (Middle East Journal, 1950: 344)۔ اس نکتے کو ان مندرجات سے مزید تقویت پہنچائی گئی کہ "دونوں حکومتیں اس خواہش کا اظہار کرتی ہیں کہ دونوں اطراف کی اقلیتیں اس ملک سے وفاداری ظاہر کریں جہاں وہ مقیم ہیں اور ان کے مسائل کا ازالہ وہی حکومت کرے گی جس کے وہ شہری ہیں"۔ اس سے بالکل واضح ہو گیا تھا کہ پنجاب کی تقسیم کا عمل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھا۔

انٹرویوز

کرپال سنگھ، چندی گڑھ 2 جنوری 2005

آصف علی شاہ، لاہور (بذریعہ ای میل) 3 جنوری 2006

لیفٹیننٹ جنرل (ر) آفتاب احمد خان، لاہور (بذریعہ خط) 2 فروری 2007

References

Husain, Syed Wajahat, *Memories of a Soldier: 1947 – Before During After*, Lahore: Ferozsons (Pvt) Ltd.

Jeffrey, Robin, *'The Punjab Boundary Force and the Problem of Order, August 1947', Modern Asian Studies*, Vol. VIII, No. 4, Cambridge: Cambridge University Press, (1974).

Marston, Daniel P., *'The Indian Army, Partition, and the Punjab Boundary Force, 1945-1947' War in History*, Vol. XVI. No. 4, London: Sage Publications.

Singh, Kirpal., *The Partition of the Punjab*, Patiala: Punjabi University, (1989).

Khan, Fazal Muqeem Khan (Major-General), *The Story of the Pakistan Army*, Karachi, Lahore: Oxford University Press, (1963).

Khosla, Gopal Das (first published in 1949), *Stern Reckoning: A Survey of the Events Leading Up To and Following the Partition of India*, New Delhi: Oxford University Press, (1989).

Official documents

Agreement between India and Pakistan on Minorities: Jawaharlal Nehru and Liaquat Ali Khan, Middle East Journal, Vol. IV, No. 3, July, Washington DC (1950).

Newspapers

The Pakistan Times, 1947.
The Tribune, 1947.

سنیل دت کے ساتھ جو گاؤں خرد، ضلع جہلم کے رہائشی تھے۔ 20 اکتوبر 2001، ممبئی، انڈیا

کھڑے ہوئے بائیں سے دائیں: خواجہ وقاص، مصنف اور خواجہ طارق مسعود۔
بیٹھے ہوئے بائیں سے دائیں: حسن عامر شاہ اور علی ہارون۔ 29 نومبر 2009، لاہور، پاکستان

امرتسر کے پرانے رہائشی خواجہ افتخار کے ساتھ۔ 17 اپریل 2003، لاہور، پاکستان۔

ملتان کے پرانے رہائشی اجیت رائے سیٹھی اور لاہور کی سابقہ شہری وِمل ایسر۔ 10 جنوری 2003، نئی دہلی، انڈیا۔

ہیتش گوسین، دیویندر سنگھ، اوم پرکاش، بیدی ریاست کے ہمراہ۔ 28 نومبر 2005، شیخ فیض محمد صاحب، انڈیا

اندرون بھاٹی دروازہ، 28 دسمبر 2004، پاکستان
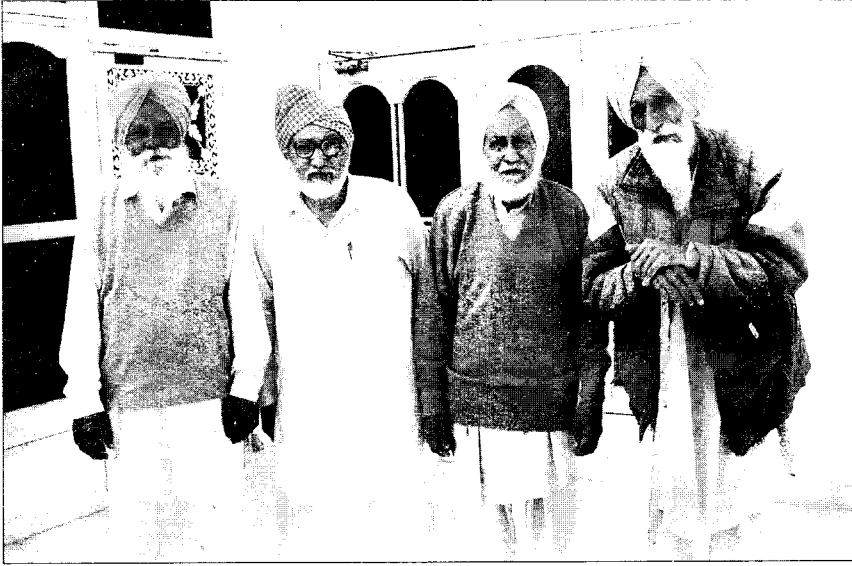
انٹرویو دینے والوں میں شامل اجیب سنگھ (انتہائی دائیں) اور ہرمیل سنگھ (دائیں سے دوسرا)، گاؤں گجروال۔ 29 نومبر 2005، ضلع لدھیانہ، انڈیا۔

بیگم کلدیپ کور چوپڑہ، سابقہ مکین، دہریوال، ضلع گوجرانوالہ، اور نرمل سنگھ چوپڑہ، سابقہ مکین، لاہور۔ 20 اپریل 2011، سنگاپور۔

کپورتھلہ کی موریش مسجد۔ 3 جنوری 2005، کپورتھلہ، انڈیا
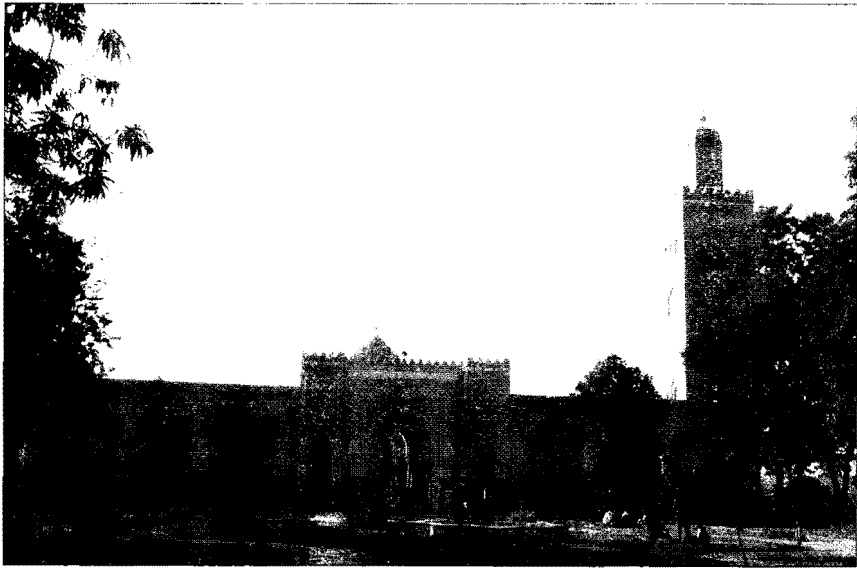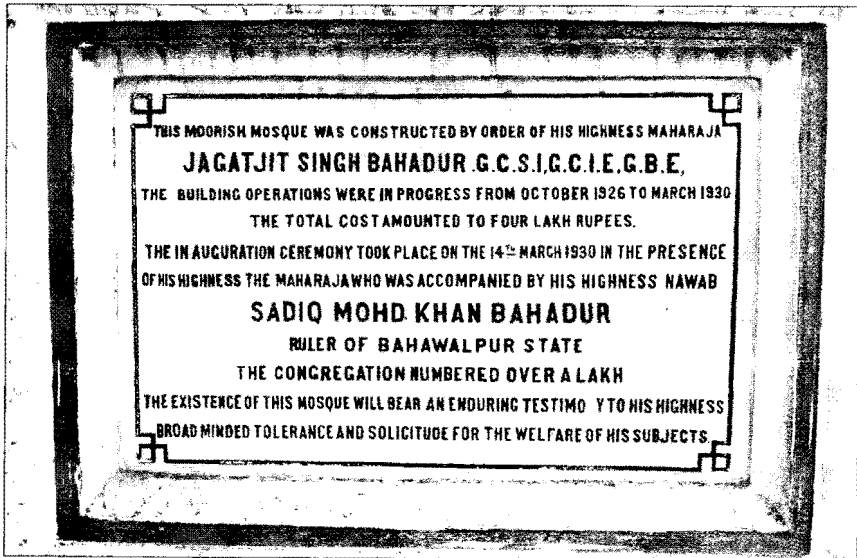
کپورتھلہ کی موریش مسجد میں نصب سنگ مرمر کی تختی۔ 3 جنوری 2005، کپورتھلہ، انڈیا

نصیب کور (بچپن میں عظمت بی بی)، گاؤں چھول خرد، ضلع روپ نگر (روپار)۔29نومبر 2005، انڈیا۔

نصیب کور اپنے خاندان کے ساتھ، گاؤں چھول خرد، ضلع روپ نگر (روپار)۔29نومبر 2005، انڈیا۔

پران نیول اور یوراج کرشن، لاہور کے سابقہ رہائشی۔ 9 جنوری 2005، نئی دہلی، انڈیا۔

اوما سود کے ساتھ، 7 جنوری 2005، نئی دہلی، انڈیا۔

بی۔ آر۔ چوپڑہ کے ساتھ جو لاہور کے رہنے والے تھے۔ 4 جنوری 1997، ممبئی، انڈیا۔

وِل لیسر (بائیں) اور وِمّو وِرمانی کے ساتھ
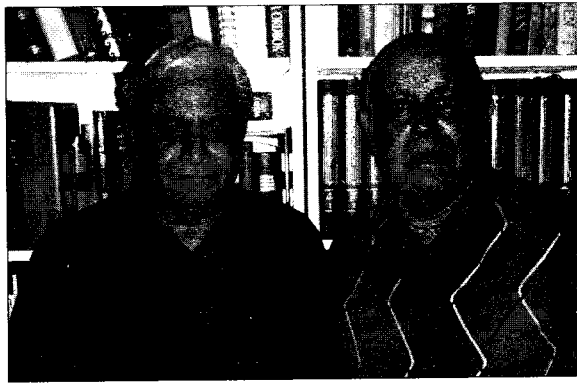
ریاض احمد چیمہ (بائیں) اور مشتاق احمد (دائیں)۔ 21 مارچ 2011، اسٹاک ہوم، سویڈن۔

لاہور کے پرانے رہائشی رام آنند ساگر کے اہل خانہ کے ساتھ، 18 اکتوبر 2001، ممبئی، انڈیا۔
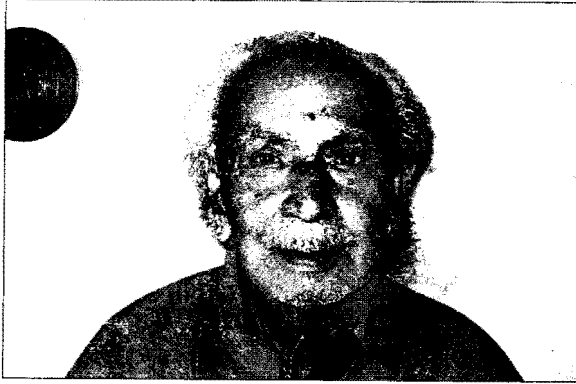
پنڈت موہن لال بلو۔ 7 جنوری 2005، پٹیالہ، انڈیا۔

کرنل جس راج چوپڑہ اور پشپا جس کے ساتھ، 31 مارچ 2004، نئی دہلی، انڈیا۔

یتیش گوسین (بائیں) اور تیجا سنگھ، گاؤں بوراں، ریاست پٹیالہ، ضلع فتح گڑھ صاحب، انڈیا۔

راجہ محمد ریاست، 15 دسمبر 2004، چوخا خصہ، ضلع راولپنڈی، پاکستان۔

چودھری عبدل شکور (بائیں)، کانگڑا گاؤں، ریاست پٹیالہ کے سابقہ رہائشی
اور ڈاکٹر نظام دین۔ 4 جنوری 2005، ملیر کوٹلا، انڈیا۔

ضلع ہوشیار پور کے پرانے رہائشی احمد سلیم (دائیں) اور رانا محمد راشد (درمیان) کے ساتھ۔
18 اپریل 2003، لاہور، پاکستان۔

گاؤں لکھن پور، ضلع گرداس پور کے پرانے رہائشی چودھری محمد بشیر کے ساتھ۔
18 اپریل 2003، لاہور، پاکستان۔

جمیلہ، ہم، مجین، زبیدہ (بیٹھے ہوئے)، خورشید، رضوان، اقبال (بائیں)۔

گجروال، ضلع لدھیانہ کے سابقہ رہائشی ایم۔ اے شمشاد۔ 21 دسمبر 2004، ملتان، پاکستان۔
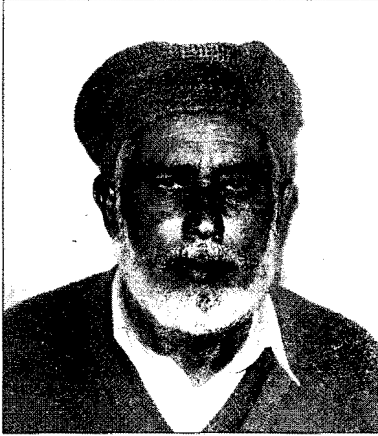
آدم پور، ریاست پٹیالہ، کلر سیداں کے پرانے رہائشی چودھری روشن دین۔ 15 دسمبر 2004، ضلع راولپنڈی، پاکستان۔

شیخ ارشد حبیب، امرتسر کے سابقہ رہائشی۔ 26 دسمبر 2004، لاہور، پاکستان۔
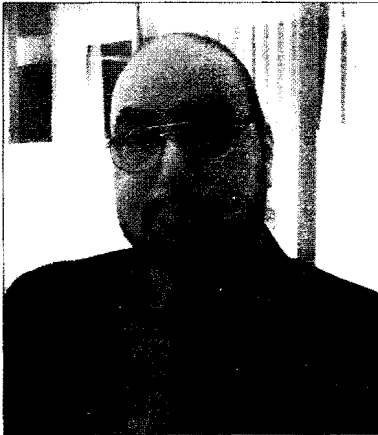
راولپنڈی کے پرانے رہائشی موتی چڈھا۔ 6 دسمبر 2003، نئی دہلی، انڈیا۔

چودھری محمد صدیق، امرتسر کے سابقہ رہائشی۔
27 اپریل 2003، لاہور، پاکستان۔

بابو خان، گاؤں کانگڑا، پٹیالہ کے سابقہ رہائشی۔
4 جنوری 2005، مالیر کوٹلہ، انڈیا

سید خورشید عباس گردیزی۔ 22 دسمبر 2004، ملتان، پاکستان۔
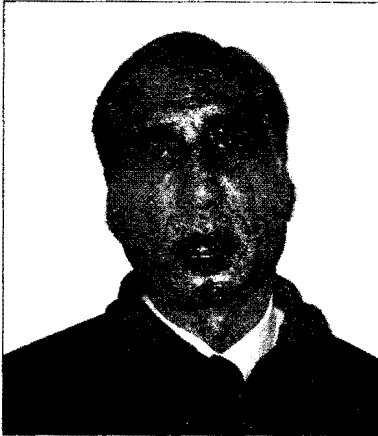
چودھری عبدل واحد، سابقہ رہائشی، ڈنگولی، روپ نگر (روپار)۔
20 دسمبر 2004، ملتان، پاکستان۔
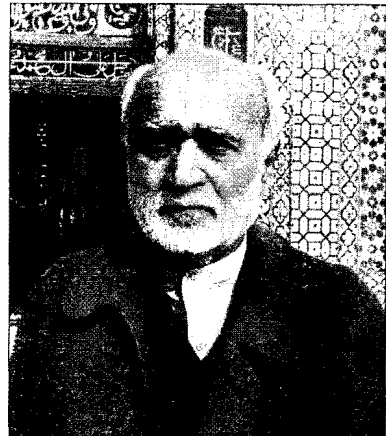
حاجی شیر خان، تحصیل، 14 دسمبر 2004، ضلع راولپنڈی، پاکستان۔

حاجی عبدالرحمن گل۔ 30 دسمبر 2004، لاہور، پاکستان۔

مجاہد الحسینی، سلطان پور لودھی، کپور تھلہ کے سابقہ رہائشی۔
19 دسمبر 2004، فیصل آباد (لائل پور)، پاکستان۔
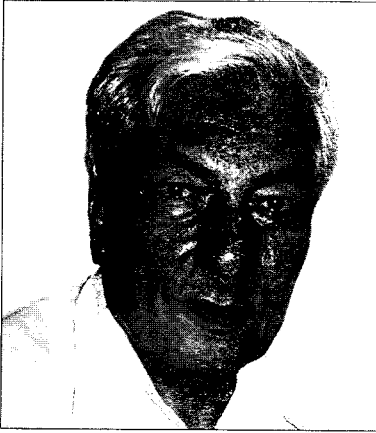
کلب علی شیخ۔ 18 اپریل 2011، لاہور، پاکستان۔
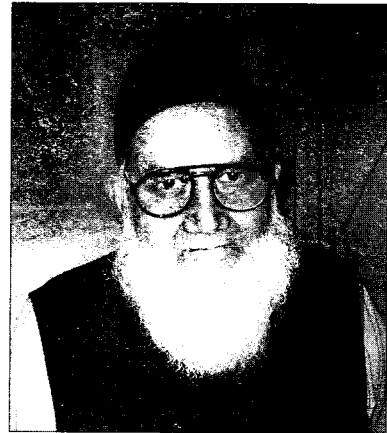
نسیم حسن، شملہ کے سابقہ رہائشی
12 اپریل 2011، ہوکیسن، ڈیلاویر، یو ایس اے۔

مجاہد تاج دین، 60 کی دہائی میں لی گئی تصویر۔ لاہور، پاکستان۔

رگھبیر سنگھ ساہنی، گاؤں گھیال، تحصیل چکوال، ضلع جہلم کے سابقہ
رہائشی۔ 7 جنوری 2005، پٹیالہ، انڈیا۔
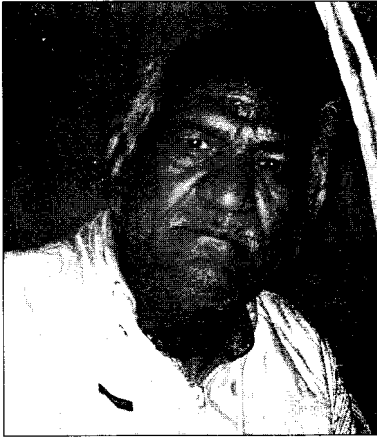
قمر یورش، امرتسر کے سابقہ رہائشی۔
27 دسمبر 2004، لاہور، پاکستان۔

رتی نند میسی، 5 جنوری 2006، بینیڈ کوس، ویلز، برطانیہ۔

ششیر جیت سنگھ ورک، کٹھیالہ ورکن گاؤں کے سابقہ رہائشی۔
7 جنوری 2005، گاؤں سہمری، ضلع روشیتہ، انڈیا۔

رنجیت سنگھ بیدی، تھمالی، ضلع راولپنڈی کے سابقہ رہائشی۔ 3 جنوری
2005، پور کھلہ، انڈیا۔

رنجیت سنگھ عرف اجیت سنگھ، 4 جنوری 2005، گاؤں نتھو مجرا، انڈیا۔

مغربی پنجاب سے انبوہ کثیر کا انخلا

14
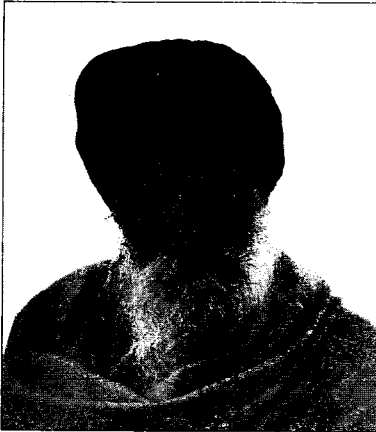
لاہور ڈویژن

لاہور ڈویژن وسطی پنجاب میں واقع تھی جس میں لاہور، امرتسر، گورداسپور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور شیخوپورہ کے اضلاع شامل تھے۔ امرتسر کے سوا تمام اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت شامل تھی۔ لیکن ہندو اور سکھ بھی نمایاں تعداد یعنی 37 فیصد میں موجود تھے۔ 'منطقی تقسیم' کے تحت امرتسر مشرقی پنجاب میں شامل کیا گیا اور اس بات کی تصدیق ریڈکلف ایوارڈ نے بھی کی۔ البتہ معمولی مسلم اکثریت کا حامل ضلع گورداسپور تقسیم کیا گیا اور شکر گڑھ تحصیل جو راوی کے مغربی کنارے پر واقع تھی مغربی پنجاب کو دے دی گئی۔ 15 اگست 1947 تک مغربی پنجاب کے بیشتر سکھ اور ہندو اپنے آبائی علاقوں میں ہی مقیم تھے تاہم مارچ 1947 کے فسادات کے بعد سے مغربی پنجاب سے مشرقی پنجاب کو منتقلی کی لہر چل رہی تھی۔ 17 اگست کے بعد مشرقی پنجاب میں شامل ہونے والے علاقوں میں مسلمانوں پر حملے تیز کر دیے گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں لاکھوں افراد کی مغربی پنجاب میں آمد شروع ہو گئی۔ اس کے بعد انتقامی طور پر ان سکھوں اور ہندوؤں کو نشانہ بنایا جانے لگا جو اب بھی مغربی پنجاب میں تھے۔

تحصیل شکر گڑھ، ضلع گورداسپور

دریائے راوی کے مغربی کنارے پر واقع تحصیل شکر گڑھ کے دریا کی دوسری طرف واقع چھوٹے علاقے بھی پاکستان کو دے دیے گئے۔ اس طرح کسی دریا کو قدرتی بین الاقوامی سرحد تسلیم کرنے کی بجائے تحصیل کو انتظامی یونٹ قرار دے دیا گیا۔ اس قسم کا بے ہودہ انتظام دوسری سمت میں بھی کیا گیا اور بھارت کو بھی مغربی کنارے پر پاؤں جمانے کا موقع مل گیا۔ 15 دسمبر 2006 کو میں نے چودھری انور عزیز سے ملاقات کی جو پاکستان کی وفاقی کابینہ میں دوبار وزیر رہ چکے تھے۔ پہلے وہ بھٹو کابینہ میں رہے پھر وزیراعظم جونیجو نے انہیں وزیر بنا دیا۔

چودھری انور عزیز

"جولائی 1947 میں ہم ہوشیار پور میں تھے۔ جہاں اس مہینے حالات بگڑنا شروع ہوئے تو ہمارا خاندان سیالکوٹ منتقل ہو گیا۔ میں نے تحصیل شکر گڑھ میں اپنے آبائی گاؤں میری پور جانے کا فیصلہ کیا۔ ہمارا تعلق گوجر برادری سے تھا اور اردگرد کے دیہات میں ہمارا کافی اثرورسوخ تھا۔ میرا خیال ہے کہ 14 اگست کو جمعہ تھا (حقیقت میں جمعہ 15 اگست کو تھا: مصنف) یہ رمضان کا بھی مہینہ تھا۔ میں نماز پڑھنے جامع مسجد میں جایا کرتا تھا۔ اردگرد کے کئی دیہات کے لوگ وہاں جمع ہوا کرتے تھے۔ مجھے کہا گیا کہ تم موجودہ حالات کی وضاحت کے لیے مجمع میں تقریر کرو۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ علاقے کے

تینوں مذاہب کے درمیان یہ اتفاق رائے ہوا کہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کی جائے گی۔ ہمارے علاقے میں ہندو برہمنوں کا گاؤں ریحال تھا۔ وہاں کے برہمن اپنی نیک عادات اور شرافت کے باعث بہت مشہور تھے۔ وہ انسانوں حتیٰ کہ جانوروں کو بھی مختلف سہولیات کسی معاوضے کے بغیر فراہم کرتے تھے اور انہیں تمام مذاہب میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک برہمن رام سرن شرما نے فارسی گرامر کی ایک کتاب لکھی تھی جو سکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد چند مسلمانوں نے اسی کتاب پر اپنا نام لکھ کر شائع کر دی۔ میں نے خود فارسی زبان ماسٹر شرما سے پڑھی۔ وہ واقعی ایک صاحب علم انسان تھے۔

''ان دنوں یہ ابہام بہت زیادہ تھا کہ ضلع گورداسپور بھارت میں شامل ہو گا یا پاکستان میں۔ گورداس پور میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کے باوجود ریڈکلف ایوارڈ میں اسے تقسیم کر دیا گیا۔ البتہ شکر گڑھ تحصیل پاکستان کے حصے میں آئی۔ اس وقت بڑے پیمانے پر تشدد پھوٹ پڑا۔ وہ برہمن میرے والد کے پاس آئے اور مدد کی درخواست کی۔ وہ رونے لگے تو ہمارے بڑوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے کیونکہ ہمارے درمیان بہت قریبی مراسم تھے۔ دونوں طرف سے عورتیں بھی رونے لگیں۔ ہندوؤں نے جان کے تحفظ کے انعام کے طور پر ہمیں اپنے زیورات دینا چاہے لیکن میرے والد نے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں اور ہمارے ہوتے آپ لوگ فکر نہ کریں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خاندان کی سات لڑکیاں ہمارے گھر میں چھوڑ جائیں۔ وہ سب نہایت خوبصورت، شائستہ اور تعلیم یافتہ تھیں۔ ان کے علاوہ باقی ماندہ خواتین اور ہندوؤں کو ہم بیس سے زائد نوجوان اور بڑے ساتھ لے کر دریا کے پار پہنچا کر گئے۔ دریا کے ہمارے والے کنارے پر ایک کشتی میں زخمی مسلمانوں کو لایا گیا۔ خواتین کی چھاتیاں کاٹی ہوئی تھیں اور وہ نہایت تکلیف میں تھیں۔ جب ان مسلمانوں کو پتہ چلا کہ ہم ہندوؤں کو بحفاظت دوسری طرف پہنچانا چاہتے ہیں تو وہ غصے میں آ گئے اور ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہم نے ان کی کوشش ناکام بنا دی اور کہا کہ یہ ہندو اپنے ہم مذہب افراد کی بداعمالیوں کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ہم تعداد میں زیادہ تھے اور ان سے بہتر مسلح تھے چنانچہ وہ برہمن بحفاظت دوسری طرف پہنچا دیے گئے۔

''ان کی ساتوں لڑکیاں سات ماہ تک ہمارے گھر میں مقیم رہیں۔ اگرچہ وہ نہایت شائستہ اور احترام کرنے والی تھیں لیکن انہوں نے ہمارے برتنوں میں کھانا کھانے سے انکار کر دیا، چنانچہ ہم نے ان کے لیے الگ رسوئی اور برتنوں کا اہتمام کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے صحن میں گارے کا ایک چھوٹا سا مندر بنا لیا اور اپنی رسوم کے مطابق شام کو وہاں دیا جلاتی تھیں۔ ایک دن بھارتی فوج کے اہلکار وہاں آئے۔ کسی نے انہیں غلط اطلاع دی تھی کہ ہم نے ہندو لڑکیوں کو ان کی مرضی کے خلاف گھر میں رکھا ہوا تھا چنانچہ فوجیوں نے ہمارے گھر کا محاصرہ کر لیا اور برین گنیں تان کر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ ان میں ایک کپتان تھا جسے میں نے کہا 'تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ تم لوگوں نے ہم پر بندوقیں کیوں تان رکھی ہیں؟' اس نے جواب دیا 'ہم نے سنا ہے کہ تمہارے قبضے میں ہندو لڑکیاں ہیں۔' میں نے کہا کہ تم لڑکیوں سے خود بات کر لو۔ صورتحال بہت کشیدہ ہو گئی۔ اچانک ان لڑکیوں کے دور رشتہ دار چھپی ہوئی جگہ سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ ہمارے بزرگوں کو دیکھ کر پھر رونے لگے اور ہماری بھی آنکھیں بھر آ گئیں۔ فوجی کیپٹن شرمسار ہو گیا اور معذرت کر لی کیونکہ ہندو لڑکیوں نے تصدیق کی کہ ہم نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ ہم نے ان کے زیورات بھی انہیں لوٹا دیے۔ پھر وہ لوگ چلے گئے، حقیقتاً وہ بہت برے دن تھے۔''

لاہور شہر

پران نوائل نے اپنی کتاب 'لاہور: ایک جذباتی سفر' Lahore: A Sentimental Journey میں پورے جذبے کے ساتھ لاہور میں اپنی پیدائش، ایامِ جوانی کے علاوہ یہاں کے زندہ دل شہریوں کا ذکر کیا ہے اور ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے سکینڈلوں اور دیگر دلچسپ واقعات کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے 1947 میں لاہور کو خیر باد کہنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے دل کے زخموں کو بھی الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "اپنے محبوب لاہور کو چھوڑنا اور اس سرحدی لکیر کے پار پناہ لینا ایک دل فگار تجربہ تھا جس نے برصغیر کو تقسیم کر دیا۔ وہ شہر جہاں صدیوں سے ہمارے ارد گرد ہمارے پیارے رہ رہے تھے وہاں اب کسی کو مڑ کر دیکھنے کو کوئی نہیں رہ گیا تھا" (1993: 18)۔

سوم آنند

لاہور کے ایک اور ہندو سوم آنند نے لاہور سے ہندوؤں کو جبراً بے دخل کرنے کے واقعے پر بوجھل دل کے ساتھ تاثرات بیان کیے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ:

> مارچ 1947 کے بعد سے فرقہ وارانہ واقعات تسلسل سے ہونے لگے تھے اور ایسا لگتا کہ مسلم قیادت شہر کو غیر مسلم باشندوں سے پاک کرنے کے درپے تھی۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ لاہور کا ہر ایک مسلمان ان ناخوشگوار واقعات پر خوش تھا۔ یہ محض چند لوگ تھے جو اپنے فائدے کے لیے سکھوں اور ہندوؤں کا انخلا چاہتے تھے۔ یہ غیر مسلم جان بچانے کے لیے لاہور سے جا تو رہے تھے لیکن ایسے افراد اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے قاصر تھے (1998: 36)۔

سوم آنند نے اگست کے بد قسمت ایام کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

"ہم ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے جو اپر مڈل کلاس کا مسکن تھا اور وہاں زیادہ تعداد ہندوؤں اور سکھوں کی تھی۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ میرے والد کے ایک دوست مسٹر بی پی ایل بیدی (مشہور بھارتی فلم ایکٹر کبیر بیدی کے والد) جو لاہور کے جانے پہچانے کمیونسٹ لیڈر تھے ہمارے گھر آئے اور میرے والد سے کہا 'لالہ جی مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔' میرے والد لالہ فقیر چند آنند جو ایک بینکار تھے بولے 'بیدی جی آج تو اتوار ہے اور بنک بند ہیں' لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ چونکہ آپ کے پاس بینک کی چابی ہے اس لیے ہم وہاں جا کر روپے لے سکتے ہیں۔ چنانچہ میرے والد مان گئے اور اس کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ ان دنوں ہمارے گھر میں ہمارا ایک رشتہ دار بھی مقیم تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں پانچ سال بڑا تھا۔ ہم نے ایک مشترکہ دوست سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ہم گھر سے نکلے تو بعض آفریدی پٹھانوں نے مکان پر حملہ کر دیا۔ ان دنوں کئی پٹھان قبائلی علاقوں سے لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ جو ادھر ادھر گھوم کر غیر مسلموں کو لوٹتے رہتے تھے۔ ان میں سے دس اور بارہ کا گروہ تانگوں پر ہمارے گھر آن پہنچا۔ ٹھیک اس لمحے ہمارا مسلمان ہمسایہ مولوی صاحب جو کانگریس پارٹی کا حامی تھا وہاں آیا۔ اس کے اور ہمارے گھر کا پورچ مشترکہ تھا۔ جب اس نے پٹھانوں کو دیکھا تو ان پر چڑھ دوڑا اور کہا کہ تمہیں اس غلط کام کا خدا کے حضور جوابدہ ہونا پڑے

گا۔ پٹھانوں نے اس کی بات سے متاثر ہونے کی بجائے الٹا اس پر غصے کا اظہار کیا کہ وہ ہندوؤں کی حمایت کر رہا تھا۔ اس بحث و تکرار کے دوران شور سن کر قریبی گھر کا مغرز سکھ بزرگ کرتار سنگھ بھی وہاں آ گیا۔ اس کا پورا خاندان جا چکا تھا اور وہ خود بھی یہاں سے نکلنے کے لیے ٹرک کا انتظار کر رہا تھا۔ پٹھانوں نے اسے دیکھتے ہی گولی مار کر ہلاک کر ڈالا۔ کچھ لوگ بتاتے ہیں کہ وہ پٹھان اس بات پر افسوس کرتے رہے کہ اس بوڑھے پر گولی کیوں ضائع کی اسے تو خنجر سے با آسانی ٹھکانے لگایا جا سکتا تھا۔

"بدترین حالات کے باوجود میرے والد لاہور میں ہی رہے۔ انہوں نے ایک مسلمان خاتون سے شادی کی تھی۔ وہ ایک بنک کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے اور حکومت پاکستان کو ان کی خدمات کی ضرورت تھی۔ جب 1957 میں ان کا انتقال ہوا تو میں ان کی چتا جلانے کی تقریب میں شرکت کے لیے لاہور آیا۔ ایک پنڈت جو سرکاری ملازم تھا اور لاہور سے نہیں نکلا تھا نے آخری رسوم ادا کیں۔ حالانکہ وہ پیشہ ور پنڈت نہیں تھا۔"

سوم آنند نے اپنی کتاب میں بالخصوص اردو کے ادبی مجلہ 'ادبی دنیا' کے مدیر مولانا صلاح الدین اور پنجابی شاعر استاد دامن کو خراج تحسین پیش کیا۔ یہ دونوں غیر مسلموں کے لاہور سے انخلا پر کافی افسردہ تھے (Ibid)۔ مصنف کا یہ کہنا ہے کہ اگرچہ ہندوؤں اور سکھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ لاہور پاکستان کا حصہ بنے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس فیصلے کو اتنی آسانی سے قبول کر لیں گے۔ کئی غیر مسلم لیڈروں کا خیال تھا کہ وہ شہر میں غیر مسلموں کے بھاری بھرکم معاشی مفادات کی بنیاد پر لاہور حاصل کر لیں گے۔ سوم آنند کے والد سمیت کئی دیگر افراد یہ کہتے تھے کہ حالات کچھ بھی ہوں غیر مسلم پاکستان میں رہ سکتے ہیں۔ البتہ جب فسادات میں شدت آئی تو یہ اختیار کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ سوم آنند بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کی تھی۔ خصوصاً لاہور کے قریبی علاقے راج گڑھ پر حملے نے صورتحال کو دھماکہ خیز بنا دیا تھا۔ ایسی سرگرمیوں کے پیچھے آر ایس ایس اور دیگر ہندو مسلح تنظیموں کا ہاتھ تھا (29 :1998)۔

میں نے اکتوبر 1999 میں دہلی میں ایک شام سوم آنند کے ساتھ گزاری۔ انہوں نے کئی دیگر کہانیوں کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے اکنامکس کے پروفیسر برج نرائن کے المناک قتل کا بھی واقعہ سنایا جو ہندو ہونے کے باوجود قیام پاکستان کے حامی تھے اور یہ معاشی دلائل دیتے تھے کہ پاکستان کا وجود برقرار رہے گا۔ سوم آنند نے مجھے بتایا کہ:

"پروفیسر برج نرائن قیام پاکستان کے تصور کے زبردست حامی تھے۔ وہ مختلف مضامین میں معاشی پہلوؤں سے دلائل دیتے تھے کہ پاکستان ایک کارآمد اور قابل عمل ملک بنے گا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جناح نے انہیں پاکستان میں رہنے کو کہا تھا اور پروفیسر نے بھی خود کو پاکستان کے لیے وقف کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ وہ نہایت خلوص سے کہتے تھے کہ جناح ایک ایسی جمہوری ریاست بنانا چاہتے تھے جہاں غیر مسلموں کو بھی یکساں حقوق میسر ہوں۔ مئی 1947 کے بعد ہندو بڑی تعداد میں نقل مکانی کر رہے تھے اور 15 اگست تک 10 ہزار ہندو اب بھی لاہور میں مقیم تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ حالات جلد بہتر ہو جائیں گے اور وہ بدستور پاکستان میں ہی مقیم رہیں گے کیونکہ ان کی جڑیں یہیں تھیں لیکن جیسے ہی ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان ہوا تو جرائم پیشہ افراد لوٹ مار اور قتل و غارت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ان عناصر نے ایسے افراد کی امیدوں پر پانی پھیر دیا جو جناح کے سیکولرازم پر یقین رکھتے تھے۔ البتہ پروفیسر نرائن کے پایہ استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ وہ کہتے پاکستان ہی ان کا حقیقی وطن ہے اس لیے یہاں سے جانے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔

"ایک دن ایک ہجوم ان کے گھر آیا۔ وہ لوگ ہندوؤں اور سکھوں کے خالی مکانات کو آگ لگا رہے تھے۔ نرائن ان کے پاس گئے اور سمجھایا کہ ایسا مت کرو کیونکہ اب یہ پاکستان کی پراپرٹی ہے۔ واعظ کا پہلے گروہ پر مثبت اثر ہوا اور وہ لوگ منتشر ہو گئے لیکن کچھ عرصے بعد ایک گروہ وہاں چلا آیا اور جلاؤ گھیراؤ اور توڑ پھوڑ شروع کر دی، پروفیسر نرائن نے وہی دلائل انہیں بھی دیے لیکن ایک حملہ آور چلایا "یہ کافر ہے، اسے مار ڈالو۔" ہجوم ان پر ٹوٹ پڑا اور پاکستان کا بہت بڑا حامی ہندو بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔ جب اس واقعے کی خبر عام ہوئی تو کسی سکھ یا ہندو کو شاید ہی شائبہ رہ گیا ہو کہ جناح کا پاکستان کسی غیر مسلم کے لیے محفوظ جگہ ہو گی لہٰذا بچھے کچھے ہندو اور سکھ بھی فوراً لاہور سے نکل گئے۔"

مجھے (مصنف کو) ایک عزیز سے معلوم ہوا کہ پروفیسر برج نرائن نکلسن روڈ پر رہتے تھے۔ اسی ممتاز شخصیت سے متعلق واقعے کی ایک اور مشہور کتاب (Remembering Lahore: An Autobiography) 'لاہور: آپ بیتی' (مصنف گوپال میتل) میں بھی تفصیل دی گئی ہے۔ گوپال میتل کا بنیادی طور پر تعلق مشرقی پنجاب کے علاقے ملیر کوٹلہ سے تھا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے صحافی، مصنف اور شاعر تھا جس نے لاہور کو اپنا گھر بنالیا اور زیادہ تر وقت مسلمان دوستوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ وہ بھی لاہور سے نہیں جانا چاہتا تھا لیکن پروفیسر برج نرائن کے قتل نے اس کی سوچ تبدیل کر دی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> پروفیسر برج نرائن بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر اقتصادیات تھے۔ جہاں بیشتر ماہرین معیشت دعویٰ کرتے تھے کہ پاکستان معاشی طور پر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکے گا وہاں پروفیسر برج نرائن نے کئی مضامین لکھے جن میں دلائل دیے گئے کہ پاکستان معاشی طور پر اپنا وجود برقرار رکھے گا اور خود کفیل ہو گا۔ انہوں نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگ سے انتہائی وابستگی رکھنے والا کوئی شخص بھی یہ نہیں سوچتا تھا کہ برج نرائن پاکستان کے بارے میں کوئی تعصب رکھتے تھے۔ ان کے قتل نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ میرے استاد تھے اور انہوں نے میری شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ میرا خاندان پہلے ہی میرے پاکستان میں رہنے کے خلاف تھا لیکن اب میرا اپنا عزم بھی ڈگمگا گیا تھا۔ جب بسوں کا آخری قافلہ لاہور سے امرتسر کے لیے روانہ ہوا تو میں بھی ایک بس پر سوار ہو گیا (2003:143-4)۔

رتن چند

19 اکتوبر 1999 کو میری دریا گنج دہلی میں رتن چند سے ان کے گھر پر ملاقات ہوئی جہاں میں نے ان کی دل فگار داستان قلمبند کی:

"میرے خاندان کا گھر اگرچہ لاہور سٹیشن کی دوسری جانب واقع آبادی میں تھا لیکن میرا فوٹو گرافی کا کاروبار آسٹریلیا بلڈنگ کے قریب تھا۔ جولائی 1947 میں فرقہ وارانہ حملوں میں شدت آ گئی جبکہ اگست کے اوائل میں تو ہمارے ارد گرد گویا جہنم کی دیوار بن گئی۔ سٹیشن کے ارد گرد محلوں میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں پر خون کے پیاسے گروہ حملے کر رہے تھے۔ ہم میں سے کئی افراد نے ہندو ہاسٹل میں پناہ لی۔ مجھے اس ہاسٹل کا اب نام تو یاد نہیں لیکن وہ بہت آسان ہدف ثابت ہوا۔ چنانچہ ہم میں سے پچاس مردوں، خواتین اور بچوں نے نولکھا چرچ کے قریب پناہ لے لی۔ البتہ ہم اپنا سامان ہوسٹل میں ہی چھوڑ آئے۔ عیسائی پادری جو ہندو مت سے عیسائیت میں داخل ہوا تھا اور اس کا

نام اب بھی ہندوانہ تھا نے ہمیں تحفظ دیا۔ وہ ہمیں پر تعیش کھانا کھلاتا۔ اس نے حکام سے رابطہ کیا اور امداد کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔ کچھ عرصے بعد ایک فوجی ٹرک جس میں گورکھا فوجی سوار تھے وہاں آیا اور ہمیں لاہور کینٹ کے محفوظ علاقے میں منتقل کر دیا۔

''اس عرصے کے دوران ایک سکھ خاتون جس کا شوہر قتل ہو گیا تھا کے ساتھ میری بیوی اور میری بے تکلفی ہو گئی۔ اس کا بچہ بھی فسادات کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ ہماری چھوٹی بیٹی کو گود لے کر پیار کرتی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی اس کی حالت زار پر کافی افسردہ تھے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کے ساتھ ہاسٹل کے کمرے میں چلوں اور وہاں سے اس کا سامان واپس لے آؤں۔ میں خود بھی اپنا صندوق لانا چاہتا تھا۔ 15 اگست کو میں ہاسٹل واپس گیا لیکن ہر چیز لوٹی جا چکی تھی۔ اس سے بھی خوفناک بات یہ ہوئی کہ مشتعل ہجوم نے مجھے گھیر لیا۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ ان میں مقامی قصاب بھی تھے۔ وہ اپنے چھرے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ میرے پیچھے لگ گئے۔ مجھے لگا موت سر پر کھڑی ہے۔ اچانک مجھے سامنے پولیس تھانے کی عمارت نظر آئی۔ میں اس کی چھوٹی دیوار پھلانگ کر اندر گھس گیا۔ صحن میں ایک انگریز پولیس افسر کرسی پر بیٹھا تھا جبکہ مسلمان سٹاف اس کے ارد گرد کھڑا تھا۔

''میں اس انگریز کے قدموں میں گر گیا اور زندگی بچانے کی التجا کی۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر میں دوسرے پولیس افسر کی طرف متوجہ ہوا اور یہی درخواست کی۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر برا بھلا کہا اور رائفلوں کے بٹ مارے۔ انہوں نے کہا کہ کوئی تمہاری جان کے درپے نہیں۔ اس لیے خوا مخواہ پریشانی پیدا مت کرو۔ پولیس سٹیشن کے باہر ہجوم اب بھی میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے بھانپ لیا کہ ایک عبرتناک موت کسی بھی وقت مجھ پر وار د ہو سکتی تھی چنانچہ میں نے فرار کی ایک اور کوشش کی۔ میں پولیس سٹیشن سے اس سمت کو بھگا۔ جو میرے خیال میں نسبتاً محفوظ تھی۔ وہ لوگ بھی میرے تعاقب میں لگ گئے۔ مجھے لگا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ موت کے خوف سے کسی اور چیز کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں سڑک کے عین بیچ میں بھاگ رہا تھا۔ اچانک کسی طرف سے سکھ سٹاف پر مشتمل فائر بریگیڈ کا ٹرک نمودار ہوا۔ میں نے خود کو اس کے سامنے لٹا دیا۔ وردیوں میں سکھوں کو دیکھ کر ہجوم ایک دم تتر بتر ہو گیا۔ لہٰذا وہ مجھے کینٹ کے علاقے میں لے گئے جہاں میرا خاندان پناہ گزین تھا۔

''ہم بھارت کی سرحد میں 16 اگست کو داخل ہوئے۔ ہمیں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارا سب کچھ چھن گیا۔ واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔ بہر حال میں دہلی چلا گیا۔ جہاں میں ایک مسلمان کی ملکیت کیمرہ شاپ میں ملازم ہو گیا۔ کیمرہ شاپ کے مالک مسٹر احمد حسن نے 1948 میں پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا۔ میں سخت محنت کے ساتھ ایک بار پھر خوشحالی کے راستے پر گامزن ہو گیا۔ میں دہلی فوٹو گرافرز ایسوسی ایشن کا صدر منتخب ہو گیا۔ کچھ ہی سال پہلے میں ریٹائر ہوا ہوں۔ میں آج بھی لاہور میں گزرے ایام یاد کرتا ہوں۔ ان دنوں تمام مذاہب کے افراد امن اور دوستی کے ساتھ رہتے تھے۔ کراچی اور لاہور میں اب بھی میرے مسلمان دوست ہیں۔ ان میں سے بعض مجھے ملنے یہاں بھی آئے۔ انہوں نے مجھے اپنے بچوں کی شادیوں پر بھی مدعو کیا لیکن میں اپنی یادوں میں سے وہ لمحات نہیں کھرچ سکا جب ہجوم میری جان لینے کے لیے میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ یہ خوف میرے ساتھ رہے گا۔ میں لاہور واپس جا کر آبائی شہر کو دیکھنا چاہتا ہوں لیکن ایسا کبھی نہیں کروں گا۔''

رام پرکاش کپور

لاہور سے نقل مکانی کا ایک اور واقعہ مجھے رام پرکاش کپور نے سنایا جن کا تعلق شہر کے اعلیٰ طبقے سے تھے لیکن ان کا انخلا ذرا مختلف انداز میں ہوا۔ اس ہندو خاندان کے مسلم لیگی لیڈروں سے بھی تعلقات تھے۔

"میری پیدائش 1924 میں لاہور کے درسی کتب شائع کرنے والے ایک معروف خاندان میں ہوئی۔ ہمارے ادارے کا نام عطر چند کپور اینڈ سنز تھا۔ اس فرم کے بانی میرے پڑدادا تھے۔ میرے دادا کا 1925 میں انتقال ہونے کے بعد میرے والد لالہ رام جوایا کپور اور ان کے بھائیوں نے کاروبار سنبھال لیا۔ نشاط سینما جو ہماری ملکیت تھا کے عقب میں ہمارا بہت بڑا پرنٹنگ پریس تھا۔ پریس 1927 میں لگایا گیا جبکہ سینما 1928 میں قائم ہوا۔ میرے والد نے دن رات محنت کی اور اپنے ادارے کو برطانوی پبلشروں کے معیار کے برابر لا کھڑا کیا۔ 1927 میں وہ میونسپل کمشنر نامزد ہوئے۔ وہ انگریزوں کے اتنے قریب تھے کہ گورنر خود انہیں فون کر کے مشورہ کرتا تھا کہ کس ہندو کو کابینہ میں وزیر لیا جائے۔ اس وقت تک انتخابات کا نظام رائج نہیں ہوا تھا بلکہ گورنر کی وزارتی کونسل کام کرتی تھی۔

"میرے والد کے مسلمان لیڈروں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات تھے۔ سر سکندر حیات، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، ممتاز دولتانہ اور کئی دیگر رہنما ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ فیروز خان نون، نواب افتخار ممدوٹ اور شوکت حیات بھی میرے والد کے قریبی دوست تھے۔ ان دنوں نچلی اور اونچی کلاس تک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی کشیدگی نہیں تھی۔

"14 اگست کی صبح کو شوکت حیات اور نواب ممدوٹ میرے والد سے ملنے آئے۔ مسلم لیگ کی کابینہ میں شوکت حیات وزیر تھے جبکہ نواب ممدوٹ وزیر اعلیٰ تھے۔ انہوں نے میرے والد سے کہا کہ آپ لاہور چھوڑ کر نہ جائیں۔ میرے والد پاکستان میں قیام برقرار رکھنا، کاروبار چلانا اور بھارت کے ساتھ کاروباری تعلقات بڑھانا چاہتے تھے۔ دونوں نے میرے والد سے کہا کہ آپ کو ہر ممکن تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ جب انہوں نے سنا کہ نئے ملک پاکستان کے 2 لیڈر انہیں مکمل تحفظ فراہم کریں گے تو انہوں نے لاہور نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ 10 ایجرٹن روڈ پر ہمارا گھر تھا۔ جو ڈھائی ایکڑ پر بنایا گیا تھا۔ لاہور میں ہمارا کاروبار نہایت مستحکم اور کامیاب تھا۔ چنانچہ انہیں لاہور چھوڑ کر بھارت جانے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی لیکن 16 اکتوبر کے بعد لاہور بالخصوص اندرون شہر میں فرقہ وارانہ جنونیت نے زور پکڑ لیا۔ اس وقت تک ہمارے علاقے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ میرے والد شہر کے اعزازی مجسٹریٹ بھی تھے۔ ڈپٹی کمشنر لاہور کے دفتر کے انگریز افسر مسٹر ولیمز نے میرے والد سے کہا کہ آپ (بطور اعزازی مجسٹریٹ) متاثرہ علاقوں کا دورہ کریں۔ چنانچہ حکومتی ہدایت پر میرے والد نے عمل کیا۔ اس وقت سٹی مجسٹریٹ مسٹر چیمہ تھا۔ اس نے میرے والد سے کہا کہ "تمہارا یہاں کیا کام ہے؟ پاکستان بن چکا ہے اور اب شہر کا انچارج میں ہوں"۔ میرے والد بولے مجھے مسٹر ولیمز نے ہدایت کی تھی کہ جا کر صورتحال کا جائزہ لوں۔ اگر وہ مجھے منع کر دیں تو میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ یہ شخص چیمہ ہندوؤں کا سخت مخالف تھا۔ اس نے مسٹر ولیمز سے رابطہ کیا چنانچہ اگلے روز ولیمز کا فون آیا کہ آپ شہر کا مزید کوئی گشت نہ کریں کیونکہ اس سے آپ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گا۔ میرے والد رام جوایا نے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کو فون کیا اور تمام صورتحال بتائی جس پر انہوں نے تسلی دی کہ آپ کوئی فکر نہ کریں، آپ کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔

"اس دوران مشرقی پنجاب میں بڑے پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ درحقیقت مغربی پنجاب میں 3مارچ کے بعد سے فسادات ہو رہے تھے، میرا یہ خیال ہے کہ لوگوں کو یہ کہہ کر اشتعال دلایا گیا کہ پاکستان میں ایک اسلامی ریاست بننے والی ہے چنانچہ غیر مسلموں کو نکالے بغیر مناسب اسلامی ریاست نہیں بن سکتی۔ جب مسلم لیڈروں نے 'اسلام خطرے میں ہے' کا نعرہ لگایا تو لوگوں نے فوراً اسے قبول کر لیا۔ بہر حال تمام تر حالات میں ہم لاہور میں مزید کچھ روز مقیم رہے۔

"5 ستمبر کو ممدوٹ اور شوکت حیات دوبارہ ہمارے گھر آئے۔ انہوں نے انتہائی افسوس کا اظہار کیا کہ حالات قابو سے باہر ہو چکے ہیں اور وہ ہمیں مزید تحفظ فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ میرے والد نے کہا، 'اب میں کیسے یہاں سے جا سکتا ہوں؟ 14 اگست تک تو میں لاہور چھوڑنے والے دیگر افراد کی مدد حاصل کر سکتا تھا۔ اب میرے پاس کوئی ٹرک نہیں جس پر میں اشیا ساتھ لے کر جاؤں۔' انہوں نے کہا: 'آپ کا کاروبار پاکستان میں رہے گا، البتہ آپ کی ذاتی اور گھریلو اشیا آپ کے ساتھ جائیں گی۔ ہم آپ کے لیے ٹرانسپورٹ کا بندوبست کریں گے۔ پولیس سکیورٹی بھی فراہم کی جائے گی تاکہ آپ بحفاظت بھارت کی سرحد عبور کر سکیں'۔"

"انہوں نے ہمیں تین ٹرک فراہم کیے۔ ہم فوج کے ایک افسر کو بھی جانتے تھے۔ اس نے ہمیں مزید ایک یا دو ٹرک دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ہمارا خاندان اور چچاؤں کے خاندان 7 ستمبر کو ایبٹ آباد روڈ سے روانہ ہوئے۔ باغبانپورہ سے واہگہ بارڈر کی طرف جاتے ہوئے ایک پولیس انسپکٹر نے ہمیں روک لیا۔ اس نے کہا 'تم لوگ اتنا زیادہ سامان اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ یہ سب اب حکومت پاکستان کی ملکیت ہے۔' البتہ نواب ممدوٹ نے ایک ایس پی کو حکم دیا کہ ہمیں ہمارے سامان سمیت بحفاظت سرحد پار کرانے میں مدد کی جائے۔ انسپکٹر نے تنگ آ کر کہا 'تم کون ہو؟ یہ سامان پاکستان کی ملکیت ہے۔' ایس پی نے انسپکٹر کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ وزیر اعلیٰ کے حکم پر عملدرآمد کرا رہا تھا اور اگر تم نے رکاوٹ ڈالی تو میں تمہیں معطل کرنے کا بھی اختیار رکھتا ہوں۔ انسپکٹر بدستور اپنی بات پر اڑا رہا۔ آخر کار ایس پی نے اسے حکم دیا کہ اپنی پیٹی اور بیج اتار کر دو، تم معطل ہو۔ اس کے بعد ایس پی ہماری طرف آیا اور کہا کہ 'جیسے ہی آپ سرحد پار پہنچیں گے تو سرکاری ٹرک خالی کر کے واپس بھجوا دیں۔' میرے والد نے ایسا ہی کیا اور امرتسر پہنچ کر ٹرک واپس بھیج دیے۔ تقسیم کے وقت فسادات کی ذمہ داری جناح پر عائد ہوتی تھی۔ وہ ہر قیمت پر پاکستان چاہتے تھے جبکہ ہمارے کانگریس کے بے وقوف لیڈر ان کے ہاتھ میں کھیلتے رہے۔

"ہمارے خاندان کے کسی فرد نے تشدد اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کیونکہ ہم میں سے کوئی قدیم شہر یا متاثرہ مقامات پر نہیں گیا تھا۔ ہمارا علاقہ اونچی کلاس والا علاقہ تھا۔ لوہاری دروازہ، شاہ عالمی گیٹ، انارکلی، اچھرہ، چوبرجی، حتیٰ کہ ہمارے قریبی علاقے قلعہ گوجر سنگھ میں بھی فسادات ہوئے۔ ہمارے کارخانے میں زیادہ تر کاریگر مسلمان تھے۔ وہ میرے والد کے مکمل وفادار تھے۔ ان میں سے کسی نے ہمارے لیے کوئی مشکل کھڑی کی نہ کوئی گڑبڑ کی۔

"ہم نے اپنی جائیداد لاہور ڈویژن کے سکولوں کے انسپکٹر شیخ نورالٰہی کی نگرانی میں چھوڑی۔ وہ میرے والد کے بھائیوں جیسے تھے۔ نہر کنارے پر ہماری پینٹ فیکٹری کریسنٹ پینٹ اور وارنش کا ایک کارخانہ تھا۔ میرے والد نے فیکٹری اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا 'براہ کرم اسے اپنے کنٹرول میں رکھو، اگر ہم واپس آئے تو ہم پھر سے کام سنبھال لیں گے۔ اگر نہ آئے تو تم اپنے پاس رکھو کیونکہ کوئی اور اس پر قبضہ کر لے گا۔'

"پرنٹنگ پریس اور دیگر املاک میرے سب سے چھوٹے چچا کے کنٹرول میں رہیں جو لاہور میں ٹیمپل روڈ پر مقیم اپنے دوست میر حسین ثانی کے پاس رہ گئے۔ وہ ذیابیطس کے شدید مریض تھے۔ ان کا خاندان سرحد پار کر کے بھارت جا چکا تھا لیکن وہ اس امید پر پیچھے رہ گئے کہ وہ جائیداد جو تمام بھائیوں کی مشترکہ ملکیت کی دیکھ بھال کر سکیں۔ دو سال بعد انہوں نے بھی سرحد پار کر لی لیکن جس روز وہ امرتسر پہنچے ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ قبول کرنے پر کانگریس قیادت سے سخت نالاں تھے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ان دنوں کیا ہوا تھا۔ 14 اگست سے کچھ روز قبل نہرو لاہور میں تھے۔ انہوں نے کانگریسی لیڈر بھیم سین سچر کے گھر کئی ممتاز افراد سے ملاقاتیں کیں، وہاں تمام ملاقاتیوں نے نہرو کو بتایا کہ جو حالات چل رہے ہیں ان میں کسی بھی ہندو کا پاکستان میں قیام ناممکن ہو گا۔ پنڈت جی کا جواب تھا کہ ماضی میں ہندو مغلیہ دور میں بھی مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہیں اور پاکستان میں بھی اسی طرح رہیں گے۔ میرے والد بولے 'پنڈت جی ان دنوں ہندو متحدہ ہندوستان میں رہتے تھے اور مغل بھی غیر منقسم ہندوستان کے حکمران تھے وہ اپنی ہی ریاست سے ہندوؤں کو نکال باہر نہیں کر سکتے تھے۔ اب صورتحال قطعی مختلف ہے۔ آپ ہندوستان کا ایک حصہ مکمل طور پر کاٹ کر پاکستان کو دے رہے ہیں۔ وہ یہاں محض ایک مسلم سلطنت نہیں بلکہ اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی کسی ریاست سے میں ہندو ہرگز محفوظ نہیں ہوں گے اور ان کی یہاں کوئی گنجائش بھی نہیں ہو گی۔ آپ ہندوستان کی تقسیم قبول نہ کریں۔' ان دلائل سے نہرو کے چہرے پر ناراضگی کے نمایاں آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے کہا 'تم لوگوں کو کسی بات کی سمجھ نہیں ہے۔ تم لوگ نہیں چاہتے کہ انگریز یہاں سے جائیں۔'

"نہرو کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ زیادہ تفصیل نہیں بتانا چاہتے تھے۔ مزید یہ کہ وہ بھارت کے وزیراعظم بننا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے پاکستان کا مطالبہ مان لیا اور گاندھی کو بھی اس پر رضامند کر لیا۔ میں کبھی کبھی سوچتا کہ ممدوٹ، شوکت حیات اگرچہ میرے والد کے اچھے دوست تھے لیکن اگر وہ مخالفت کرتے تو لاہور میں فسادات برپا نہ ہوتے۔ کسی نہ کسی سطح پر وہ بھی ہندوؤں پر حملوں کے قائل ہو گئے تھے۔ وہ غیر مسلموں کی کسی رکاوٹ کے بغیر پاکستان پر حکمرانی کرنا چاہتے تھے۔"

ڈاکٹر پریم صوبتی

صدر جمہوریہ ہند کے ذاتی معالج ڈاکٹر پریم صوبتی نے ان بدقسمت ایام کی کہانی مجھے 31 اکتوبر 2001 کو سنائی۔ انہوں نے بھی کئی ہندوؤں کی اس توقع کی تصدیق کی کہ لاہور بھارت میں شامل ہو گا۔ انہوں نے بتایا:

"لاہور مذہبی امن و سلامتی اور یگانگت کا ایک نمونہ تھا حتیٰ کہ جس وقت سیاستدان اپنے تقسیم کرنے والے ہتھکنڈوں میں مصروف تھے اور صورتحال آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہی تھی تب بھی کوئی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ پنجابی ایک دوسرے کو قتل کریں گے لیکن پھر میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھا۔ میں کالج سے واپسی پر کہیں کام کرتا تھا اور میری میڈیکل کی تعلیم بھی معمول سے کچھ زیادہ عرصے میں مکمل ہوئی۔ تقسیم سے کوئی دو ہفتے قبل میں گائناکالوجی پڑھنے بمبے چلا گیا کیونکہ لاہور میں اس شعبے پر بہت کم تحقیق ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں خواتین اپنے مخصوص مسائل کے علاج کے لیے بہت کم ہسپتالوں کا رخ کرتی تھیں۔ ہندوؤں کا یقین تھا کہ لاہور کے بھارت میں شمولیت کے امکانات کافی زیادہ تھے۔ اس لیے میں بمبے میں ہونے کے باوجود والدین کی لاہور میں موجودگی پر پریشان نہیں تھا لیکن جب یہ اعلان ہوا کہ لاہور پاکستان

میں شامل ہو گا اور فسادات شروع ہو گئے تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دہلی پہنچا تا کہ لاہور کے لیے ٹرین پکڑ سکوں۔ میرے دو بھائی بھی پاکستان میں تھے۔ اس وقت میری جیب میں صرف 50 روپے تھے۔ جب ہم لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو یہ غالباً 19 اگست کی تاریخ تھی۔ امرتسر پہنچنے میں ہمیں 22 گھنٹے لگے۔ پھر میں کسی مدد کے لیے امرتسر کے میڈیکل کالج پہنچا۔ وہاں جا کر مجھے پتہ چلا کہ لاہور کسی کی مدد کے بغیر پہنچنا محال تھا۔ میرا ایک دوست جو سرکاری ملازم تھا نے مجھے فیروز پور جانے کا مشورہ دیا کیونکہ وہاں سے لاہور جانا آسان تھا۔

"میں نے فیروز پور میں رضاکارانہ طور پر مغربی پاکستان سے آنے والے زخمیوں کی مرہم پٹی کی اور انہیں انجکشن لگائے ۔ پھر میں ایک مسلمان پرویز کا نام اختیار کر کے پاکستان میں داخل ہو گیا۔ ہوشیار پور سے تعلق رکھنے والی ایک انتہائی خوبصورت اور جوان لڑکی جس کی عمر شاید بیس سال تھی نے التجا کی کہ میں اسے لاہور لے جاؤں کیونکہ اس کے والدین مارے جا چکے تھے اور اس کا بھائی کہیں کھو چکا تھا۔ اس نے شکایت کی کہ مہاجر کیمپ میں لوگ اس سے زیادتی کرتے رہے ہیں اور اسے خدشہ ہے کہ اس کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک ہو سکتا ہے۔ میں نے اس سے جھوٹ بولا کہ میں عیسائی ہوں اور کوئی مسلمان یہ برداشت نہیں کرے گا کہ ایک مسلمان لڑکی کسی عیسائی مرد کے ساتھ ہو۔ لہذا میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کیمپ کے خواتین والے حصے میں منتقل ہو جائے اور وہاں کسی سے مدد مانگے۔ وہاں میری میڈیکل کالج کے اپنے ساتھی طلبا سے ملاقات ہوئی۔ میں ڈر گیا لیکن ان طلبا میں سے ایک مجھے پکڑ کر مہاجرین کے امور کی نگرانی کرنے والے سکھ فوجی افسر کے پاس لے گیا۔ وہ میرے ایک دوست کا بڑا بھائی نکل آیا۔ اس نے ایک مسلح فوجی کے ساتھ فوجی گاڑی پر مجھے لاہور بھجوا دیا۔ جب میں گھر پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہمسایہ مسلمانوں سے پوچھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ لوگ ڈی اے وی کالج میں قائم مہاجر کیمپ میں منتقل ہو گئے تھے۔ مسلمان ہمسایوں نے اپنے تانگے پر انہیں کیمپ بھجوایا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہندو اور سکھ مہاجرین پر مشتمل 3 ٹرک اسی روز صبح امرتسر روانہ ہوئے تھے لیکن ان میں سے 2 واپس آ رہے ہیں کیونکہ ٹرکوں پر حملوں سے بھاری جانی نقصان ہوا تھا۔ تیسرا ٹرک اس لیے سرحد پار کر گیا کیونکہ پولیس اس کی حفاظت کے لیے آن پہنچی تھی۔ اسی دوران لٹے پھٹے دو ٹرک واپس آ گئے۔ یہ ایک دل دہلا دینے والا منظر تھا۔ حملہ آوروں نے کسی کو بھی نہیں بخشا تھا۔ میں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی مسخ شدہ لاشیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے والدین ان میں شامل نہیں تھے چنانچہ میں امرتسر پہنچ گیا۔ وہاں میں نے ایک ٹرین بھی دیکھی جو مسلمانوں کی لاشوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ کیمپ سے بھی زیادہ خوفناک منظر تھا۔ تقریباً ہر مسافر کو ذبح کر دیا گیا تھا۔ زندہ بچنے والے ایک بوڑھے نے مجھے بتایا کہ سکھوں نے ٹرین پر حملہ کر کے ہر کسی کو بے رحمی کے ساتھ مار ڈالا۔ اگلے دن میں نے امرتسر میں دیکھا کہ مغربی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں سے بھری ایک ٹرین آئی۔ زخمی مسافر درد سے کراہ رہے تھے۔ ٹرین کے تقریباً نصف مسافروں کو ہلاک کر دیا گیا تھا جبکہ باقی ماندہ شدید زخمی تھے۔ پھر میرے اس دوست جس نے مجھے فیروز پور جانے کا مشورہ دیا نے مجھے انبالہ جانے میں مدد فراہم کی۔ میں دہلی جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں ہمارے رشتہ دار تھے اور مجھے یقین تھا کہ میرے والدین اگر زندہ ہیں تو وہ دہلی گئے ہوں گے۔ خوش قسمتی سے انبالہ میں مجھے ارجن سنگھ کی معاونت مل گئی جو بعد میں بھارتی ائیر فورس کے مشہور ائیر مارشل بنے۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں مجھ سے دو سال جونیئر تھے۔ انہوں نے اپنی گاڑی میں مجھے دہلی بھجوانے کا انتظام کیا۔ دہلی میں میری اپنے بچھڑے والدین سے ملاقات ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد میرا بھائی بھی بھارت آ پہنچا۔

"چند روز بعد میں دوبارہ لاہور گیا کیونکہ ہمارے ڈاکٹروں کا ایک گروپ لاہور کے مشہور سر گنگا رام ہسپتال میں داخل زخمی ہندوؤں اور سکھوں کی رضا کارانہ مدد کرنا چاہتا تھا وہاں بھی روح فرسا منظر دکھائی دیے۔ ٹانگیں، بازو اور ہاتھ کاٹ دیے گئے تھے۔ خواتین کے ساتھ کئی کئی مردوں نے زیادتی کی تھی۔ یہ ایسا منظر تھا جسے بیان کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ اس کے بعد ہم کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج گئے جہاں اساتذہ نے ہمیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ ہم یہیں رہیں اور اپنی تعلیم مکمل کریں۔ جب ہم کالج میں تھے تو کسی نے ہمیں بتایا کہ ہمارے کلاس فیلو شانتی جس نے لاہور میں قیام کا فیصلہ کیا تھا کو قتل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم فوراً کالج سے نکلے۔ آخر کار پروفیسر آف میڈیسن ڈاکٹر شاہ اور انکی صاحبزادی جو میری بہنوں جیسی تھی کی مدد سے میں نے ایک بنک کے لاکر سے زیورات نکلوائے۔ اس کے بعد میں دہلی آ گیا۔ یہ اگست کے اختتامی ایام ہوں گے۔ میں نے سرحد کے دونوں طرف آگ و خون برستے دیکھے۔"

جولائی 2002 میں میں نے امریکہ کا دورہ کیا اور وہاں آباد لاہوریوں سے مجھے کافی باتیں سننے کا موقع ملا۔ ان میں دو آپ بیتیاں میں نیچے پیش کر رہا ہوں۔ اس میں ایک خاص شخص کے قتل اور ملزم کا ذکر ملے گا:

کانتا سنگھ لٹھرا

"میں 1935 میں پیدا ہوئی میری والدہ کا تعلق میانوالی کے ایک غریب خاندان سے تھا۔ جب میں چھوٹی تھی تو میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ میرے چچا مدن گوپال سنگھ جن کو میں اپنا والد ہی سمجھتی تھی وہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں رجسٹرار تھے ہم یونیورسٹی کی فراہم کردہ رہائشگاہ میں ہی رہتے تھے۔ میں سر گنگا رام گرلز سکول میں پڑھنے کے لیے جایا کرتی تھی۔ میرے آنجہانی والد کے کئی مسلمان دوست تھے۔ مجھے ایک کا نام عبدالرحمان آج بھی یاد ہے۔ وہ ملتان سے ہمیں ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک میری ہم عمر لڑکی ممتاز تھی جو میری قریبی سہیلی تھی۔ ہم بچے مختلف مذاہب کی پابندیوں کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہ بہت ہی اچھے دن تھے۔ میرے چچا مدن گوپال سنگھ نہ صرف ادب بلکہ مذاہب کے علوم کے مشہور سکالر تھے۔ انہوں نے ہمیں تمام مذاہب کا احترام کرنا اور ایک خدا پر یقین کرنا سکھایا تھا۔ تقسیم کے وقت انہوں نے میری والدہ اور بچوں کو جالندھر بھیج دیا لیکن خود لاہور میں رہ گئے کیونکہ پنجاب یونیورسٹی کی تقسیم کے بعد اس کا ریکارڈ بھی تقسیم ہونا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی اب مشرقی پنجاب میں بھی قائم ہونا تھی۔ مجھے وہ بدبخت دن آج بھی یاد ہے۔ 31 اگست 1947 کو ایک روز قبل ہی ہم جالندھر پہنچے تھے اور ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس میں قیام پذیر تھے۔ یہ شام کا وقت تھا اور ایک فوجی ٹرک ہمارے گھر آیا۔ کیپٹن ورمانے ہمیں بتایا کہ ہمارے والد (دراصل چچا) کو اسی صبح یونیورسٹی آفس میں قتل کر دیا گیا تھا۔ ہم واپس لاہور گئے۔ اگرچہ میری ماں مجھے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی تھی لیکن میں اپنے باپ کا آخری دیدار کرنے کے لیے مسلسل روتی رہی۔ ہم سر گنگا رام ہسپتال گئے اور وہاں ان کی لاش دیکھ لی۔ انہیں جسم پر چھریوں کے 14 زخم آئے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ مرنے سے پہلے میرے والد نے کلمہ پڑھ لیا تھا۔ جالندھر واپس آئے تو وہاں بھی ہم نے اسی طرح کی نفرت اور پاگل پن کا مشاہدہ کیا۔ یہ منظر میرے ذہن میں ثبت ہو کر رہ گیا۔ ایک دن میں نے سکھوں اور ہندوؤں کا ایک گروہ دیکھا جو 'ہر ہر مہادیو' اور 'واہ گورو جی دی فتح' کے نعرے لگا رہا تھا۔ وہ نیزوں اور لاٹھیوں سے دو نیم برہنہ مسلم خواتین

کو دھکیل رہے تھے۔ زخمی خواتین ان کے قدموں میں گر کر رحم مانگتی رہیں۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ اس روز میں نے سوچا کہ کیا خدا مر چکا ہے یا بے حس ہو گیا ہے کیونکہ اس کے بندے اس کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے شیطان کے آلہ کار بن گئے تھے۔"

پروفیسر شوکت علی

امریکہ میں قیام کے دوران ہی کانتا سنگھ لتھرا سے ملاقات کے چند روز بعد میں مینز فیلڈ شہر میں ایک بزرگ پاکستانی ماہر تعلیم شوکت علی سے ملنے گیا جو اپنے بیٹے ڈاکٹر سلیم علی کے گھر میں مقیم تھے۔ پروفیسر شوکت کی زبانی تقسیم سے قبل لاہور کے حالات اور ان کے ہندو اساتذہ کا ذکر پہلے ہی باب 2 میں کیا جا چکا ہے۔ انٹرویو کے دوسرے حصے کا تعلق 1947 میں ہونے والے واقعات سے تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی جب انہوں نے مدن گوپال سنگھ کے قتل کی تصدیق کی اور کہا کہ وہ قاتل کا نام جانتے ہیں۔ انہوں نے انٹرویو میں بتایا کہ:

"مئی 1947 کے بعد اندرون شہر میں حالات مسلسل خراب رہے۔ قدیم لاہور کا پرسکون طرز زندگی تبدیل ہو چکا تھا اور لوگ ہر وقت حملوں کے خوف میں مبتلا رہتے تھے۔ جس وقت ہندوؤں کی مخصوص آبادیوں پاپڑ منڈی اور شاہ عالمی میں آگ کے شعلے سب کچھ نگل رہے تھے اس وقت بھی بھاٹی گیٹ میں امن کی فضا برقرار تھی۔ زیادہ تر مظاہرے اور احتجاج مال روڈ اور شہر کے دیگر نئے حصوں میں ہوتے تھے۔ مجھے مسلم لیگ کے مظاہروں میں 'پاکستان کا مطلب کیا' کے نعرے اور خضر حیات حکومت کے خلاف دشنام طرازی کے الفاظ آج بھی یاد ہیں۔ 14 اگست سے چند روز قبل محلہ جلوٹیاں جہاں ہم مسلمان اقلیت میں تھے۔ وہاں گھروں کے باہر حملہ آوروں نے نشان لگا دیے، ان لوگوں نے ہندوؤں کے گھروں کے باہر پینٹ کے نشانات لگائے لیکن ہمارے گھر ان میں شامل نہیں تھے۔ اس عمل سے سراسیمگی پھیل گئی اور کچھ ہندو خاندان اپنے گھر چھوڑ کر چلے گئے لیکن چونکہ بیشتر ہندو چھوٹی کلاس سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا ان کے پاس کہیں اور جانے کا کوئی چارہ نہیں تھا۔ شام کو ان کے گھروں کو آگ لگا دی گئی اور مکینوں کی دلدوز چیخیں دور دور تک سنی جا سکتی تھیں۔ جلتی انسانی کھالوں کی سٹرانڈ ہر طرف پھیلی تھی، اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود میں سکون کی نیند نہیں سو سکتا اور بے گناہ افراد کی آوازیں مجھے تنگ کرتی ہیں۔

"تم (مصنف) نے کانتا لتھرا کی کہانی کا حوالہ دیا ہے۔ جو کچھ اس نے بتایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ مدن گوپال سنگھ ایک انتہائی معزز سکالر اور یونیورسٹی کے محنتی رجسٹرار تھے۔ انہیں ان کے اپنے سٹینو گرافر نے قتل کیا جس کی کرسی ان کے آفس کے ساتھ ہوتی تھی۔ مجھے اس کا نام اب یاد نہیں (کوشک کے مطابق اس کا نام غلام حسن تھا، Kaushik, 2011)۔ ہندوستان کی تقسیم زیادہ تر غیر ضروری تھی۔ ہزاروں برسوں کے ہم آہنگی کے عمل کو دنوں اور ہفتوں میں الٹا کر رکھ دیا گیا۔ کوئی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ پنجاب میں ایک نیا ہولوکاسٹ ہونے والا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے انتہائی قابل احترام استاد پریم کرپال بحفاظت بھارت پہنچ گئے۔ البتہ پروفیسر نیئر کے حال احوال کا مجھے کچھ علم نہیں۔ امید ہے کہ وہ بھی بچ نکلے ہوں گے۔ دونوں بہت عظیم انسان تھے اور میں ہمیشہ انہیں اپنے محسنوں کے طور پر یاد رکھوں گا۔"

کلب علی شیخ

قبل ازیں کتاب میں مئی 1947 کے چوڑیوں اور مہندی کے واقعے کے پس منظر کی تفصیل کلب علی شیخ کی زبانی بتائی جاچکی ہے۔ ان کے پاس اگست 1947 کے دوسرے ہفتے میں ہونے والے واقعات بتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔

''اگست 1947 میں لاہور جلتا آتش فشاں تھا۔ شہر سے بیشتر سکھ اور ہندو فرار ہو چکے تھے۔ ان کی لاہور میں رہنے کی خواہش کرچی کرچی ہو چکی تھی لیکن کچھ غیر مسلم اب بھی لاہور نہ چھوڑنے پر مصر تھے۔ وہ ایسے ظاہر کر رہے تھے جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ میں نے تین افراد کو اپنی آنکھوں سے مرتے دیکھا۔ ایک وجیہ خوش لباس سکھ ریلوے سٹیشن کے عقب میں ہمارے گھر کے پاس سے پورے اعتماد کے ساتھ سائیکل پر جارہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس علاقے سے شناسا تھا۔ اس لیے بڑی بے فکری کے انداز میں سائیکل چلا رہا تھا۔ اچانک غنڈوں کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ انہوں نے سکھ کو پیچھے سے زور کے ساتھ ڈنڈا مارا۔ وہ نیچے گرا تو انہوں نے بیدردی کے ساتھ اس پر چھریاں چلا دیں۔ وہ درد سے چیختے چلاتے موت کے منہ میں چلا گیا۔ دوسرا واقعہ ہمارے ہمسائے میں ایک ہندو دکاندار کا ہے۔ وہ کوکنگ آئل فروخت کیا کرتا تھا۔ اس روز بھی وہ کوکنگ آئل لینے کے لیے نکلا اور سائیکل کے ساتھ ڈرم باندھے تھے۔ قاتلوں نے اسے بھی چھریاں ماریں۔ وہ یقیناً اس کی رقم چھیننا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کا بٹوہ چھینا اور فرار ہو گئے۔ تیسرا شخص کوئی اجنبی تھا جو زخمی حالت میں اپنے ہی خون کے تالاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے نہیں پتہ کہ وہ مسلمان تھا یا ہندو، یہ تینوں افراد اس وقت قتل ہوئے جبکہ شہر میں کرفیو نافذ تھا۔ یقیناً یہ تینوں وارداتیں جرائم پیشہ عناصر کی تھیں جنہوں نے قانون توڑ کر ایسے گھناؤنے جرائم کرنے کی جرأت کی۔ لاہور میں اصل ہلاکتیں 17 اگست 1947 کے بعد شروع ہوئیں جب امرتسر سے لٹے پٹے مہاجرین ہزاروں کی تعداد میں یہاں وارد ہوئے۔ ان میں امرتسر کے نامی گرامی غنڈے بھی شامل تھے۔ ان کے یقیناً انتظامی عہدیداروں سے روابط تھے۔ کچھ کا تعلق ان گروہوں سے تھا جو سردار شوکت حیات نے امرتسر کے دوروں میں بنائے تھے۔ ان میں سے کئی کو بعد ازاں خدمات کے صلے میں غیر مسلموں کی خالی کردہ انارکلی میں دکانیں اور مکانات کی الاٹمنٹ کی گئی۔

''لاہور ریلوے سٹیشن پر ہر روز مشرقی اور مغربی پنجاب کے علاقوں سے آنے والی ٹرینیں آرہی تھیں جو لاشوں سے بھری ہوتی تھیں۔ میرے والد جو ریلوے پولیس میں کانسٹیبل تھے نے ایک روز میری والدہ کو بتایا کہ اگرچہ پنجاب کے دونوں حصوں سے لاشوں سے بھری ٹرینیں آرہی تھیں لیکن انہوں نے سنا کہ شمالی پنجاب سے آنے والی ایک ٹرین کو کاموں کے قریب روک کر تمام ہندو اور سکھ مسافروں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ (اس واقعے کی مزید کچھ تفصیل اسی باب میں آگے دی گئی ہے)۔ اس کے بعد ٹرین کو صفائی کے لیے واشنگ شیڈ بھجوادیا گیا۔ لگتا ہے کہ وہ اس واقعے کو کوئی خاص اہمیت دینا چاہتے تھے، البتہ یہ بات اہم ہے کہ لاہور کی ضلعی انتظامیہ کو اب بھی ان عناصر سے خطرہ تھا جنہوں نے تقسیم کے بعد قانون شکنی کی تھی۔ ایک وجہ یہ تھی کہ پولیس میں کئی افسر اب بھی انگریز تھے۔ پنجاب پولیس کے نئے مقامی انسپکٹر جنرل قربان علی خان بھی غیر معمولی خوبیوں کے حامل افسر تھے۔''

ضلع لاہور

سردار شوکت علی

جہاں میں نے اس کتاب میں لاہور شہر کے بارے میں وافر کہانیاں شامل کی ہیں وہاں یہ کام نہایت مشکل تھا کہ میں ایسے افراد سے ملوں جو مجھے ارد گرد کے دیہات میں رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ کر سکیں۔ البتہ 3 مئی 2003 کو میری بزرگ کمیونسٹ لیڈر سردار شوکت علی سے ان کی رہائشگاہ نیو گارڈن ٹاؤن میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے ایسے واقعات بتائے جس سے ضلع لاہور میں ان کے گاؤں کے بارے میں تفصیلات سامنے آئیں۔ انہوں نے بتایا:

"ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد حملہ آوروں اور لٹیروں کے گروہ ہر طرف مٹر گشت کرتے دکھائی دیے۔ کمیونسٹ پارٹی نے غلام نبی بھلر کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ ستلج اور بیاس کی دوسری طرف بے آسرا مسلمانوں کو پاکستان لائیں اور اسی طرح یہاں سے سکھوں اور ہندوؤں کو بھارت منتقل کریں۔ خود میں نے دریا کے اسی طرف کئی ہندوؤں اور سکھوں کی مدد کی۔ میرا ایک سکھ کامریڈ جوگندر سنگھ تھا۔ ایک روز وہ اور اس کا بھائی ہمارے پاس قرآنی نسخوں سے بھری بوری لے کر آئے جو مسلمان بھاگتے ہوئے پیچھے چھوڑ گئے۔

"اس دوران ستلج سے 8 سے 10 میل کے فاصلے پر واقع گاؤں کے سکھوں کا ایک قافلہ دریا پار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ برسات کا موسم تھا، دریاؤں اور ندی نالوں میں طغیانی تھی۔ یہ ایک بڑا قافلہ تھا اور بیشتر سکھ تیرنا نہیں جانتے تھے جبکہ کشتیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ان پر مسلمان غارت گروں نے حملہ کر دیا اور کئی سکھ قتل کر دیے۔ خواتین نے طلائی زیورات اپنے جسموں کے ساتھ باندھ لیے تھے لیکن حملہ آوروں نے ان کے کانوں اور گردنوں سے زیورات نوچ لیے اور جسموں کے ساتھ باندھا سونا بھی چھین لیا۔ وہاں ایک جگہ تھی منڈی عثمان والا۔ وہاں کے وہابی مولویوں نے زیورات کی لوٹ مار میں متحرک کردار ادا کیا۔ انہوں نے کئی سکھوں کو قتل بھی کر دیا۔

"لاہور شہر میں بھی حملے ہوئے کیونکہ غنڈوں اور بدمعاشوں کی پشت پناہی سیاستدان کر رہے تھے۔ سیاستدانوں کے دو دھڑے تھے۔ مسلم لیگی لیڈر اس لحاظ سے اس کام میں ملوث تھے کیونکہ ان کے غنڈوں کے ساتھ قریبی روابط تھے۔ میاں امیر الدین کا گھر ایسی سرگرمیوں کا گڑھ تھا تاہم بعض شائستہ مسلم لیگی لیڈر بھی تھے۔ شیخ محمد امین کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے لیکن پارٹی کی ہدایت پر انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ شیخ امین اور مسلم لیگی طلبا یونین کے رہنما احمد سعید کرمانی نے ہندوؤں اور سکھوں پر حملوں کی حوصلہ شکنی کی۔ میاں افتخار الدین، دانیال لطیفی، سوہن سنگھ جوش، ٹکارام سوہن سینئر کامریڈ تھے۔ جنہوں نے اپنی اپنی کمیونٹی کو قتل و غارت سے روکنے کے لیے اثر و رسوخ استعمال کیا۔ شمیم اشرف ملک اور میں کم عمر مسلم حلقے سے تعلق رکھتے تھے اور جو ہمارے بس میں تھا ہم نے کیا۔ اس دور میں جو انسانیت سوز واقعات ہوئے وہ اب بھی مجھے بے چین رکھتے ہیں۔ ہندوستان کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کرنا انتہائی غلط فیصلہ تھا۔ اس سے مذہبی انتہا پسندوں کو شناخت اور اہمیت مل گئی۔ جنہوں نے اس موقع پر مذہبی نفرت پھیلانے کے لیے استعمال کیا۔"

18 مارچ 2004 کو میں نے اور وکی نے مشرقی پنجاب کے ضلع موگا کے بڑے گاؤں کشن پورہ کا دورہ کیا۔ ہمیں پتہ چلا تھا کہ ضلع لاہور سے آنے والے مہاجرین اس گاؤں اور قریبی دیہات میں آباد تھے۔

پیاراسنگھ نولکھ

''میرا نام پیاراسنگھ ولد کندن سنگھ نولکھ ہے۔ ہمارا گاؤں نولکھا بنگا ضلع لاہور کی تحصیل چونیاں میں واقع تھا جہاں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ ہم سب امن وسکون کے ساتھ رہتے تھے اور تمام مذاہب کے افراد کے درمیان بہت محبت تھی۔ یہ 1947 کی بات ہے کہ مسلم لیگ کے کارکنوں نے ہمارے گاؤں کا چکر لگایا۔ انہوں نے گاؤں کے ایک درزی فقیرا کو اپنے مقصد کے لیے قائل کر لیا۔ انہوں نے اس کے گھر قیام کیا۔ تاہم کوئی ناخوشگوار واقعہ کوئی نہیں ہوا۔ سکھ لیڈر بلدیو سنگھ نے ہمیں پیغام بھجوایا کہ اگر سکھوں پر حملہ ہوا یا انہیں جبراً بے دخل کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ ہماری مدد کے لیے فوجی دستے بھجوائیں گے۔ ہمیں بتایا گیا کہ تحصیل چونیاں جو ضلع لاہور میں شامل تھی اور تحصیل زیرہ جو دریائے ستلج کے دوسرے کنارے پر ضلع فیروزپور میں واقع تھی کے بارے میں تنازع تھا۔ تحصیل زیرہ میں مسلمان جبکہ چونیاں میں سکھ اور ہندو اکثریت میں تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اگر محمد علی جناح چونیاں تحصیل کو پاکستان میں شامل کرنے کا فیصلہ کریں گے تو ہم یہاں بدستور رہ سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں جناح زیرہ تحصیل سے اس لیے دستبردار ہوئے کیونکہ اس کا پاکستان کے ساتھ براہ راست زمینی رابطہ نہیں تھا کیونکہ دریائے ستلج کو دونوں ملکوں کے درمیان سرحد قرار دیا گیا تھا۔

''ایک دن ہم نے سنا کہ پاکستان معرض وجود میں آ چکا تھا۔ ہمارے ہمسایوں نے وعدہ کیا کہ وہ کسی بھی جارحیت یا تشدد کے خلاف ہمیں تحفظ فراہم کریں گے۔ یہ 15 اگست سے چند روز بعد کی بات ہے کہ ہم رات کو چھتوں پر سو رہے تھے کہ شور اور گولیوں کی آواز سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ چنانچہ چند منٹوں میں ہم (غیر مسلم) اکٹھے ہو گئے اور دریائے ستلج کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے۔ اصل میں وہ ہمیں ڈرا دھمکا کر بھگانا چاہتے تھے۔ راستے میں ہم پر حملہ بھی کیا گیا جس میں کئی ساتھی مارے گئے۔ یہ رات کا وقت تھا اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ جان بچانے کے لیے کدھر جائے لیکن اس دوران فوج آ گئی اور ہم بڑے نقصان سے بچ گئے۔ میرے خیال میں ہمارے گاؤں میں ہلاکتوں کی تعداد پچاس سے زائد نہیں۔ ہمارے گاؤں کے پاس ہی خالصتاً مسلمانوں کے گاؤں ستوکی اور مہمندہ تھے۔ حملہ آور ان دیہات کے بھی نہیں تھے۔ یہ لوگ باہر کے علاقوں سے آئے تھے اور زیادہ تر جرائم پیشہ عناصر تھے جو لوٹ مار کرنا چاہتے تھے۔

''ہمارے سوا سکھوں اور ہندوؤں کے قافلے زیادہ خوش قسمت نہیں رہے۔ ہمارے پیچھے آنے والے ایک کارواں پر مسلمان فوجیوں اور پولیس اہلکاروں نے حملہ کر کے دو سے ڈھائی سو افراد کو قتل کر دیا۔ یہ لوگ خواتین اور بچوں کو ساتھ لے گئے۔ کچھ خوش قسمت افراد بھاگ کر ہمارے قافلے سے آ ملے اور بتایا کہ کیا واقعہ ہوا تھا۔ ہماری سکیورٹی پر مامور بھارتی فوج کے اہلکار یہ محسوس کر کے خوفزدہ ہو گئے کہ وہ تعداد میں کم تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی مطلوبہ تعداد میں نہیں تھے تاہم یہ ہم تھے جنہوں نے ان کے حوصلے بڑھائے۔ ہمارے گاؤں کے بعض پناہ گزین اچھے گھڑ سوار تھے اور قافلے کی حفاظت کے لیے انہوں نے فوج کی مدد کی۔ قافلے کی تعداد ہزاروں تک بڑھ گئی تھی۔ شاید 50 ہزار ہو گئی۔

''آخر کار ہم جمبر میں پناہ گزین کیمپ تک پہنچ گئے اور ستمبر کے شروع میں ہم نے سرحد پار کی۔ ہم نے کسی کو پیچھے نہ چھوڑا۔ وہ بوڑھے جو زیادہ چل نہیں سکتے تھے اور خواتین اور بچوں کو چھکڑوں پر سوار کر دیا گیا۔ پہلے ہم

امرتسر اور پھر زیرہ گئے اور پھر ہمیں کسی نے کشن پور جانے کا مشورہ دیا۔ گاؤں میں پانچ پٹیاں تھیں۔ چار ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھیں جبکہ ایک مسلمانوں کی تھی۔ ہم مسلم پٹی میں مقیم ہوگئے جہاں کے آرائیں پاکستان کو ہجرت کر چکے تھے۔"

شیخوپورہ

بلاشبہ مغربی پنجاب میں مذہبی طور پر شیخوپورہ سکھوں کے لیے سب سے اہم ضلع تھا۔ وہ کسی بھی اور جگہ سے زیادہ اسے مشرقی پنجاب میں شامل کرنے کے خواہاں تھے کیونکہ سکھ مذہب کے بانی بابا گورونانک اسی ضلع کے گاؤں تلونڈی (جسے بعد میں ننکانہ صاحب کہا جانے لگا) میں پیدا ہوئے تاہم شیخوپورہ میں آبادی کا فیکٹر مسلمانوں کے حق میں تھا۔ 8لاکھ 25ہزار 508 کی کل آبادی میں سے مسلمانوں کی تعداد 6لاکھ 41ہزار 448 تھی۔ (63.62 فیصد) لیکن سکھوں کی آبادی بھی کافی تھی یعنی ایک لاکھ 6 ہزار 706 (18.85 فیصد) جبکہ ہندوؤں بشمول شیڈول کاسٹس کی تعداد 77ہزار 740 (9.12 فیصد) تھی۔ شروع میں ریڈکلف ایوارڈ کی جانب سے شیخوپورہ پاکستان کو دینے کے بعد بھی سکھوں نے یہاں اپنا قیام جاری رکھا۔ اس کے علاوہ فوری طور پر مسلمانوں نے بھی ہندوؤں اور سکھوں کو یہاں سے بے دخل کرنے کی کوشش نہ کی۔ البتہ جب مشرقی پنجاب سے مسلمان مہاجرین کی آمد شروع ہوئی تو صورتحال ایک دم بدل گئی۔

مغربی پنجاب میں ہونے والے بدترین قتل عام والے علاقوں میں شیخوپورہ شامل تھا۔ ایس جی پی سی رپورٹ اس کی بھرپور عکاسی کرتی ہے:

> شاید راولپنڈی اور ملتان کے بعد شیخوپورہ کے ہندو اور سکھ پاکستانی تعصب اور خون آشام قاتلانہ جنونیت کے سب سے زیادہ شکار ہوئے۔ سکھوں اور ہندوؤں پر اچانک حملہ کیا گیا اور محض 2 دنوں میں 10 ہزار سے 20ہزار سکھوں، ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا(1991:167)۔

کھوسلہ رپورٹ میں بھی قتل عام کے چند بدترین واقعات کی تفصیل دی گئی ہے۔ کھوسلہ نے مسلمان ضلعی انتظامیہ حتیٰ کہ انگریز ڈپٹی کمشنر سی ایچ ڈزنی تک پر اس سازش کا فریق ہونے کا الزام عائد کیا ہے۔ ڈی سی نے اس مبینہ سازش کا آغاز 24اگست کو شام 6 بجے سے صبح 6 بجے تک کرفیو لگا کر کیا حالانکہ اس وقت تک شیخوپورہ کسی بھی قسم کے تشدد سے پاک تھا۔ جو واقعات ہوئے بھی تھے وہ لاہور سے لائل پور جانے والی ٹرینوں کے مسافروں پر 21اگست سے چھریوں سے حملے کے تھے۔ تشدد کے عام واقعات 25اگست کو شروع ہوئے جب ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں کو آگ لگا ئی گئی۔ پولیس اور فوج وہاں آ گئی اور گھروں سے باہر نکلنے والوں کو گولیاں مارنا شروع کر دیں۔ 26اگست کو کشیدگی عروج پر پہنچ گئی(Khosla,1989:126-9)۔

میں نے ایسے افراد کا سراغ لگایا جو ان دنوں شیخوپورہ میں ہونے والے واقعات کے بارے میں کچھ بتا سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے میری 8 مارچ 2004 کو دہلی میں ایک معزز انسان سے ملاقات ہوئی جس نے مجھے تفصیل بتائی۔ میں نے اس کے بعد 30 جنوری 2006 کو فون پر ان واقعات کی مزید وضاحت بھی معلوم کی۔

کیول کرشن طولی

"میں 1936 میں شیخوپورہ میں پیدا ہوا۔ ہمارا گھر شیخوپورہ کی اعواناں دی گلی میں تھا۔ یہ گلی مکمل طور پر بند تھی۔ ہمارا ہمسایہ ایک مسلمان وکیل تھا جس کا نام میں اب یاد نہیں کر سکتا۔ حالات نہایت پرامن اور دوستانہ تھے۔ ہم گلی محلوں میں آزادانہ کھیلتے پھرتے تھے۔ کوئی بھی مذہبی اختلافات کے بارے میں نہیں سوچتا تھا، میرے والد لالہ رام رکھا مل آڑھتی تھے۔ ہمارا کاروبار کافی منافع میں جا رہا تھا۔ گڑبڑ اچانک شروع ہوئی یہ پنجاب باؤنڈری فورس میں شامل بلوچ رجمنٹ کے سپاہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کو مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم کا بدلہ لینے کے لیے اکسایا۔ ایک دم سراسیمگی پھیل گئی کیونکہ مختلف جتھوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو چھرے گھونپنا اور لوٹنا شروع کر دیا۔ یہ یقیناً بہت افسوسناک تجربہ تھا کیونکہ ہجوم مردوں اور عورتوں کا تعاقب کر کے انہیں بے دردی سے قتل کر دیتا تھا۔

"ہم نے فوراً اگلی صبح اپنا مکان چھوڑا اور کسی محفوظ مقام پر پناہ لے لی۔ ہم نے ہندوؤں اور سکھوں کو ریلوے سٹیشن یا سردار آتما سنگھ کی رائس مل کی طرف بھاگتے دیکھا۔ یہ ایک بڑا احاطہ تھا۔ میرے خیال میں وہاں ہزاروں افراد نے پناہ لی۔ فوج نے مل کو گھیرے میں لے کر مشین گنیں سیدھی کر لیں اور ہندوؤں اور سکھوں کو ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا اور کہا کہ تمام سونا، زیورات اور نقدی جمع کرا دی جائے۔ ہمیں کہا گیا کہ اگر ہم تعاون کریں گے تو فوجی ہمیں ہندوؤں اور سکھوں کے پناہ گزین کیمپ میں بحفاظت بھجوا دیں گے۔ سونے اور چاندی کے زیورات کا بڑا ڈھیر وہ لوگ ساتھ لے گئے۔ کچھ جرائم پیشہ عناصر نے نوجوان خواتین سے زیادتی کرنا شروع کر دی۔ ایک فوجی نے سکھ لڑکی کو گھسیٹ کر لے جانے کی کوشش کی لیکن اس کے بھائیوں نے فوجی کو پکڑ کر مار ڈالا۔ بس پھر تو مشین گنیں حرکت میں آ گئیں۔ فائرنگ کا نشانہ بننے والے جہاں کھڑے تھے وہیں ڈھے گئے۔ ہر طرف خوف و ہراس تھا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ میرے والد ریلوے سٹیشن کی طرف بھاگے جبکہ میں اور میری والدہ جن کی گود میں میری چھ مہینے کی بہن تھی مخالف سمت کی طرف دوڑ پڑے۔ میرے والد کو ہزاروں دیگر افراد کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا۔ حملہ آور ہجوم کسی کو نہیں بخش رہا تھا۔ خوش قسمتی سے میری شیرخوار بہن کو کسی نے کچھ نہ کہا۔ وہ زمین پر گر گئی اور ارد گرد پڑا خون چاٹ کر زندہ رہ گئی۔ کسی نے اسے اٹھا کر امرتسر پہنچا دیا جہاں ہم دوبارہ اس سے مل گئے۔ اب وہ انڈین ائیر فورس میں ملازم ہے۔ میری ماں اور میرے پیچھے بھی کچھ لوگ لگے ہوئے تھے لیکن مشرقی پنجاب سے آنے والے ایک مسلمان مہاجر نے ہمیں بچا لیا۔ اس نے کسی کو ہماری جان نہ لینے دی۔ پھر وہ ہمیں ایک پناہ گزین کیمپ میں چھوڑ گیا۔ شیخوپورہ میں 15 ہزار غیر مسلم مارے گئے تھے۔ میں اپنے تصور میں آج بھی سردار آتما سنگھ کی مل کے اندر اور اس کے باہر پڑی لاشیں دیکھ سکتا ہوں۔ مشین گن کی فائرنگ سے خون پانی کی طرح بہنے لگا تھا۔ ہم پناہ گزین کیمپ میں ہی مقیم تھے جب پنڈت جواہر لال نہرو شیخوپورہ آئے۔ انہوں نے المناک تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اس کے بعد ہمیں ٹرین

میں سوار کرا دیا گیا جس میں سینکڑوں افراد بیٹھے تھے، جن میں سے کئی زخمی تھے۔ یہ ایک سست رفتار سفر تھا۔ پہلے ہم لاہور پہنچے پھر کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد امرتسر آ گئے۔

"امرتسر میں ہم اپنے والد کو ڈھونڈتے رہے۔ کسی نے بتایا کہ آخری بار انہیں سٹیشن کی طرف بھاگتے دیکھا گیا تھا۔ کسی نے کہا کہ اس نے میرے والد کی لاش دیکھی تھی۔ امرتسر میں مکمل طور پر بدنظمی پھیلی تھی۔ بہر حال ہم انہیں دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکے۔ میں آج بھی ان کے بارے میں اکثر سوچتا ہوں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ بہت شفیق انسان تھے اور مسلمان بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ البتہ اپنی ننھی بہن کو زندہ پا کر ہمارے دلوں کو کچھ سکون ملا۔ مجھے پتہ چلا کہ حملہ کرنے والے ہمارے علاقے کے مسلمان آرائیں تھے۔ میں وہ قتل عام کبھی نہیں بھلا سکتا۔"

چودھری نذیر احمد ورک

چونکہ شیخوپورہ میں ہندوؤں اور سکھوں کا قتل عام ایک بدنام واقعہ تھا لہٰذا ہم نے کسی ایسے مسلمان کی تلاش شروع کی جو ایسے واقعات کا عینی شاہد ہو۔ چودھری نذیر احمد ورک نے نوعمری میں اپنی آنکھوں کے ساتھ یہ واقعات دیکھے تھے۔ احمد سلیم اور میں نے 30 دسمبر 2005 کو ان کا انٹرویو کیا تھا۔ گفتگو کی تفصیل اس طرح سے ہے:

"میں شیخوپورہ کے قدیم حصے میں 18 جنوری 1935 کو پیدا ہوا۔ میں 1947 میں گورنمنٹ ہائی سکول میں ساتویں جماعت کا طالبعلم تھا۔ یہ ایک چھوٹا قصبہ تھا۔ یہاں کبھی کوئی (فرقہ وارانہ) تصادم نہیں ہوا تھا۔ جاٹوں کے ورک قبیلے کا ایک بڑا چودھری ابراہیم ورک میونسپل کمیٹی شیخوپورہ کا چیئرمین تھا۔ ایک سکھ سوامی نند سنگھ کمیٹی کا رکن تھا۔ جب لاہور اور امرتسر جل رہا تھا تو یہ دونوں تانگے پر گھوم کر اعلان کرتے رہے کہ، 'بھائیو، شیخوپورہ ایک چھوٹا شہر ہے۔ ہم یہاں امن کے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ خدارا اپنے شہر کو فرقہ واریت کے وائرس سے بچاؤ۔ اگر کسی کو لڑنے کا شوق ہے تو وہ لاہور اور امرتسر جا کر شوق پورا کر لے۔ اس کو کرایہ ہم دیں گے لیکن خدا کے لیے شیخوپورہ میں امن اور بھائی چارے کی فضا مت خراب کرو۔'

"ایک روز ہم محلے کی مسجد کے عقب میں کھیل رہے تھے کہ ہمارے علاقے کا موچی امام دین آیا اور بتایا کہ مشرقی پنجاب سے ایک (مسلمانوں کی) لاشوں سے بھری ٹرین آئی ہے۔ عورتوں کی چھاتیاں کٹی ہوئی ہیں اور بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے ہیں۔ پوری ٹرین میں خون ہے اور کوئی زندہ نہیں بچا۔ ہم بھاگ کر ٹرین دیکھنے گئے۔ یہ 25 یا 26 اگست کی تاریخ ہو گی۔ احمد پورہ محلے کے چند نوجوان مشتعل ہو گئے اور ٹوکے اور بلم اٹھا کر آ گئے اور بازار میں خریداری کرنے والے کچھ سکھوں کے ٹکڑے کر دیے۔ اگلے روز تقریباً 12 یا ایک بجے دن کو ایک فوجی جیپ آئی جس میں ایک مسلمان صوبیدار اور 3 سپاہی تھے۔ انہوں نے چیخ چیخ کر کہا 'کیا تم (مسلمان) سوئے ہوئے ہو؟۔ تمہیں نہیں پتہ کہ مشرقی پنجاب میں تمہارے بھائیوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ہمارا ساتھ دو تا کہ ہم اپنے ہم مذہب بھائیوں کا انتقام لیں۔' میرا ایک رشتہ دار چودھری محمد شفیع اور اس کا مزارع محمد بلوچ جیپ کی طرف بھاگ کر گئے۔ صوبیدار نے ان سے کہا کہ تمہارے پاس کوئی بندوق ہے تو لے آؤ۔ اس وقت محلے میں صرف ایک رائفل دستیاب تھی۔

"عطا محمد اعوان جو ڈپٹی کمشنر کا باورچی تھا کے پاس ایک نالی والی بندوق تھی۔ وہ جا کر بندوق لے آیا۔ فوجیوں نے ہجوم سے کہا کہ مٹی کے تیل کا بھی انتظام کرو۔ چنانچہ مٹی کے تیل سے بھرا ایک ڈرم تیار کر لیا گیا۔ قریبی ہندو سکھ محلے رام گڑھ کے سامنے لنڈا گیٹ کے پاس فوجیوں نے ریلوے لائن کے قریب لیٹ کر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ انہوں نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ باگڑا سنگھ کی فیکٹری کو تیل چھڑک کر آگ لگا دیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ فیکٹری کے اندر موجود سکھ چھت پر چڑھ گئے اور فائرنگ شروع کر دی کیونکہ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ جس پر فوجیوں نے جوابی فائرنگ کر کے ایک سکھ کو مار ڈالا۔ اس کے بعد پورے شہر میں فائرنگ شروع ہو گئی۔ سنتوخ سنگھ کا مکان بھی نذر آتش کر دیا گیا۔ اس کے بعد محلہ ٹھنڈ پوریاں کو آگ لگائی گئی۔ اس شام ہر کوئی خوف کا شکار تھا۔ اگلے روز صبح کو اعلان کیا گیا کہ ایک پناہ گزین کیمپ قائم کر دیا گیا ہے۔ اس لیے سب سکھ اور ہندو وہاں چلے جائیں چنانچہ یہ لوگ گھروں سے نکل کر جنڈیالہ روڈ پر آتما سنگھ کی فیکٹری کے قریب کیمپ میں چلے گئے۔ ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ پھر ٹینک وہاں آئے جن پر مشین گنیں نصب تھیں اور ان کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا گیا۔

"خود جواہر لال نہرو کو بھی اس قاتلانہ حملے کی اطلاع ملی جس پر انہوں نے شیخوپورہ آنے کا فیصلہ کیا۔ پولیس کو دورے کی اطلاع ملی تو اس نے چند چماروں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ غیر مسلموں کی لاشیں جلادیں یا چھپادیں۔ چنانچہ اچھوت ذات کے افراد نے لاشیں اٹھا کر کنوؤں، گھاٹیوں یا کھیتوں میں پھینک دیں لیکن ہلاکتوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ نہرو کی آمد پر ریلوے سٹیشن اور لاہور شیخوپورہ روڈ کے ارد گرد کئی لاشیں اب بھی پڑی تھیں۔ جب نہرو نے آ کر لاشیں دیکھیں تو وہ اپنی کار سے باہر نکل آئے اور عوام کو مخاطب کر کے کہا کہ 'تم بے رحم اور ظالم لوگ ہو۔' ایک شخص جو باریش عالم تھا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا 'جی نہیں، تم زیادہ متعصب ہو کیونکہ قتل عام کا آغاز پہلے تمہاری طرف سے ہوا۔ اب کس لیے چیخ رہے ہو؟'

"کئی سکھوں اور ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں ایک سکھ کاکا سنگھ تھا جو مسلمانوں کے کافی قریب تھا وہ کچھ روز شیخوپورہ میں ہی رہا لیکن جب مہاجرین بھارت کو جانے لگے تو وہ بھی چلا گیا۔ دو پولیس اہلکار اور چند غنڈے دو لڑکیوں کو لے کر ہمارے گھر آئے اور کہا کہ انہیں یہاں رکھ لیں۔ ہم واپسی پر انہیں لے جائیں گے۔ وہ لوگ لوٹ مار کرنے جا رہے تھے۔ 10 منٹ کے بعد ایک سکھ، اس کی بیوی اور اس کے چھوٹے بچے ہمارے گھر آئے اور مدد کی درخواست کی۔ وہ سکھ بولا 'ہم تمہارے بھائی بہن ہیں۔ ہم ایک ہی قصبے کے رہنے والے ہیں اور ہمیشہ سے یہاں رہ رہے ہیں۔ خدارا ہماری مدد کرو۔' ہم نے انہیں بھی اندر بلا لیا۔ دونوں لڑکیاں اسی خاندان کی تھیں۔ وہ اپنے رشتہ داروں کو دیکھ نہال ہو گئیں اور ان سے معانقہ کیا۔ البتہ وہ بہت بری طرح خوفزدہ تھے۔ کچھ دیر بعد وہی پولیس والے اور غنڈے آئے اور لڑکیوں کا تقاضا کیا لیکن ہم نے صاف انکار کر دیا جس پر وہ چلے گئے۔ وہ سکھ مسلمان ہو گیا اور لڑکیوں نے بھی قرآن سیکھنا شروع کر دیا۔ البتہ انہوں نے محسوس کیا کہ لوگ انہیں (کلمہ پڑھنے کے باوجود) شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو انہوں نے بھارت جانے کا ارادہ کر لیا اور بھارتی فوج کے ٹرک میں سوار ہو کر چلے گئے۔

"اچھے اور عزت دار گھرانوں نے قتل و غارت گری اور لوٹ مار میں بالکل حصہ نہیں لیا۔ جب مشرقی پنجاب کا قافلہ شیخوپورہ پہنچا تو وہ زمین پر سجدہ ریز ہو گئے اور 'پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ' کے نعرے لگائے۔ کشیدگی میں کمی آنے پر کچھ ہندو واپس شیخوپورہ آئے۔ حتیٰ کہ اب بھی سکھ ہر سال گورونانک کے جنم دن کی تقریبات کے موقع پر یہاں آتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ قتل عام ایک ہولوکاسٹ تھا۔ لیکن لوگوں نے سب کچھ اچانک اشتعال میں آ کر کیا اور کوئی

پیشگی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ کچھ سکھوں نے چند مسلمانوں کو بھی شیخوپورہ میں قتل کیا۔ ان دنوں میں انسان وحشی بن گئے تھے۔ میرے اندازے میں شیخوپورہ میں 20 ہزار انسان مارے گئے تھے۔"

جواہر لال نہرو کا دورہ شیخوپورہ

خرم علی شفیق نے اپنے جریدے 'کرانیکل آف پاکستان' کی ستمبر کی اشاعت میں بتایا کہ بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظم جواہر لال نہرو اور لیاقت علی خان ایک معاہدے کے تحت ان علاقوں کا دورہ کرتے تھے جو تشدد سے زیادہ متاثر تھے۔ 3 ستمبر 1947 کو دونوں نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس کی جس میں انہوں نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ دونوں مرکزی اور صوبائی حکومتیں فوری طور پر امن وامان بحال کرائیں گی اور ہر قسم کی لاقانونیت کو کچل دیا جائے گا اور ذمہ داروں کو سزا دی جائے گی۔ یہ بھی کہا گیا کہ املاک پر غیر قانونی قبضے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور جائیدادیں اصل مالکان تک پہنچائی جائیں گی۔

دونوں وزرائے اعظم نے امرتسر، بٹالہ، ہوشیارپور، لاہور اور شیخوپورہ کے دورے کیے اور مہاجر کیمپوں کی حالت زار دیکھ کر کافی کبیدہ خاطر ہوئے۔ جہاں ہزاروں افراد یا تو دوسری طرف جانے یا بحالی کے منتظر تھے۔ شیخوپورہ میں ایک بزرگ کسان نے کہا کہ "اس ملک نے کئی حکمرانوں کو بدلتے دیکھا۔ وہ لوگ آئے اور چلے گئے لیکن ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ حکمرانوں کی تبدیلی کے ساتھ رعایا کو بھی تبدیل ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔" ایک معمر ہندو عورت نے نہرو سے کہا کہ "بٹوارہ ہر خاندان میں ہوا ہے، جائیدادوں کے مالک تبدیل ہوتے ہیں لیکن سب کچھ پرامن ہوتا ہے۔ تو اب یہ خونریزی، لوٹ مار اور اغوا کیوں؟ کیا تم لوگ مہذب انداز میں خاندانوں کو تقسیم نہیں کر سکتے تھے؟"(Chronicle, September 1947)۔

شیخوپورہ کا قتل عام اور پنجاب باؤنڈری فورس کی تحلیل

رابن جیفری کے مطابق بلوچ رجمنٹ کا 25 اور 26 اگست کو شیخوپورہ میں ہندوؤں اور سکھوں کے قتل عام میں متحرک کردار پنجاب باؤنڈری فورس توڑنے کا باعث بنا۔ یہ فورس اگرچہ کئی مخلصانہ کوششوں کے باوجود تشدد کے آگے بند باندھنے میں ناکام رہی لیکن جب شیخوپورہ میں پی بی ایف کا متعصبانہ کردار سامنے آیا تو دونوں طرف کی حکومتوں نے یہ فورس تحلیل کرنے پر اتفاق کر لیا۔ اس بارے میں مسلمانوں کی دلیل یہ ہے کہ پہلے غیر مسلموں نے ان پر فائرنگ کی لیکن پی بی ایف کے ہندو سپاہی یہ بات تسلیم نہیں کرتے۔ بلوچ سپاہیوں کے طرز عمل کے بارے میں انکوائری کا حکم دیا گیا لیکن پی بی ایف تحلیل ہونے کے بعد پاکستانی حکام نے انکوائری ختم کر دی(1974:516)۔

سکھوں کی طرف سے غیرت کے نام پر قتل

مارچ 2004 میں جب میں اور روکی لدھیانہ میں تھے تو ہماری ملاقات ایک سکھ پولیس انسپکٹر سے ہوئی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے خاندان نے شیخوپورہ سے رخصت ہوتے وقت تمام خواتین خانہ کو ہلاک کر دیا مبادا وہ مسلمانوں

کے پیچھے چڑھ جائیں۔ جب میں نے اگلے سال دوبارہ بھارت کا دورہ کیا تو میں اس سکھ انسپکٹر سے ملنے ہریانہ میں اس کے گاؤں گیا۔ اس وقت ان کے خاندان میں کسی شادی کی تقریب جاری تھی اور خوشی کے موقع پر ماضی کی تلخ یادیں زندہ کرنا مناسب نہیں تھا لیکن غیرت کے نام پر قتل کی تفصیل براہ راست سننے کا یہ ہمارا واحد چانس تھا اور بزرگوں نے نہایت خوشدلی سے ہمیں انٹرویو دیا۔ ہم ریاست ہریانہ کے ضلع کوروکھیشتر کے گاؤں لکھ مری میں دوپہر کے وقت پہنچے۔ یہ لوگ ورک جاٹ تھے اور ضلع شیخوپورہ کی تحصیل مریدکے کے گاؤں کٹھیالہ ورکاں سے ان کا تعلق تھا۔ ہماری ملاقات ایک انتہائی وجیہہ شخص شمشیر جیت سنگھ ورک سے ہوئی۔ اس نے ہمیں اپنے بزرگوں سردول سنگھ ورک اور فقیر سنگھ ورک سے ملوایا۔

سردول سنگھ ورک

"میرا نام سردول سنگھ ہے اور میں 1928 میں پیدا ہوا۔ میں نے 1944 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر فارمین کرسچین کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں میں 1947 تک زیر تعلیم رہا۔ ہمارا گاؤں کافی بڑا تھا جس میں 400 سکھ اور 6 ہزار مسلمان تھے لیکن تقریباً تمام اراضی ہم ورک جاٹوں کے ملکیت تھی۔ مسلمان ہمارے مزارع اور کاشتکار کے طور پر کام کرتے تھے۔ مارچ 1947 کے شروع تک زندگی پر سکون اور سہل تھی۔ تب راولپنڈی اور صوبہ سرحد سے بے دخل سکھوں اور کچھ ہندوؤں کا پہلا گروپ ہمارے علاقے میں آیا جس سے ہمیں پنجاب میں بڑھتے تناؤ کا اندازہ ہوا۔ بہرحال ریڈکلف ایوارڈ سامنے آنے تک ہمارے گاؤں میں امن ہی رہا۔ ہم چھت پر کھڑے ہو کر دوربین کی مدد سے لاہور، گوجرانوالہ اور شیخوپورہ میں لگائی آگ کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے۔ ہمیں تسلی تھی کہ ننکانہ صاحب مشرقی پنجاب میں ہی شامل ہو گا چنانچہ ہم نے ہر صورت میں اپنے گاؤں میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔

"22 اگست کو علاقے کے خدا ترس ایس ایچ او محمد غوری نے ہندو، سکھ اور مسلمان برادری کے نمائندہ افراد کا اجلاس طلب کیا۔ اس نے ہمیں کہا کہ وہ مزید ہماری سلامتی کی ضمانت نہیں دے سکتا لیکن ہمیں وہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ہمارے علاقے میں گورداسپور سے بے دخل مسلمان آرہے ہیں جو خود پر مظالم کی کئی داستانیں سنا رہے ہیں۔ اس لیے حالات جلد قابو سے باہر ہو سکتے ہیں لہٰذا غیر مسلموں کو جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ حقیقت میں اب ہمارے علاقے میں بھی تشدد پھیلنے لگا تھا۔ اردگرد کے دیہات کے ہزاروں سکھ اور ہندو پناہ کے لیے ہمارے گاؤں آگئے تھے یا کھیتوں میں سو رہے تھے۔ 25 اگست کو ہزاروں افراد جمع ہو چکے تھے۔ ہمارے پاس آتشیں اسلحہ بھی تھا۔ چنانچہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ ہم 3 یا 4 کلو میٹر آگے گئے تھے کہ ہمیں پٹھانوں نے گھیر لیا۔ رات ہو گئی تو ہمارے کچھ لوگ ڈر کر بھاگ گئے اور کچھ واپس گاؤں چلے گئے۔ ہم جو باقی رہ گئے تھے انہوں نے رات خوف اور دہشت میں گزاری۔ پھر ہم میں سے بھی کچھ واپس چلے گئے اور بعض مسلمان ہو گئے۔ البتہ ہم ورک ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ہم نے اپنی عورتوں کو مسلمانوں کے ہاتھ دینے کی بجائے مارنے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود بھی عزت کی موت مرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ہم نے اپنے خاندان کی کی 33 خواتین کا سر قلم کر دیا۔ کچھ تو نو عمر بچیاں تھیں۔"

فقیر سنگھ ورک

جب انٹرویو جاری تھا تو خاندان کا ایک اور بزرگ سکھ فقیر سنگھ ورک بھی گفتگو میں شریک ہو گیا۔ اس نے اپنا واقعہ اس طرح بتایا:

''ہمارا خاندان کتھیالہ ورکاں کا ممتاز خاندان تھا۔ ہم زمیندار تھے اور زیادہ تر زمین ہماری ہی ملکیت تھی۔ ہمارے گاؤں میں ایک پرائمری سکول بھی تھا۔ جہاں ایک مسلمان اور ایک ہندو استاد تھا۔ مسلمانوں میں سب سے زیادہ احترام مولوی محبوب عالم کا کیا جاتا تھا جو مسجد کا پیش امام تھا وہ نہایت نیک انسان تھا۔ پیر مقبول شاہ قریبی گاؤں جونیاں والا میں رہتا تھا۔ وہ بھی بہت اچھا شخص تھا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر ہمارے گاؤں آیا کرتا تھا۔ ہمارے خاندان کا کوئی شخص احتراماً گھوڑے کی باگ تھامتا تو وہ نیچے اترتا تھا۔ یہ ایک روایت تھی اور ہم ہر مذہب کے بزرگوں اور روحانی شخصیات کے لیے نہایت احترام کا اظہار کرتے تھے۔

''میرا خیال ہے یہ 25 اگست کی تاریخ تھی جب سینکڑوں یا شاید ہزاروں مسلح افراد نے ہمارے گاؤں کا محاصرہ کرنا شروع کر دیا۔ ہم میں سے کچھ بھاگ کر کھیتوں میں چھپ گئے۔ مجھے اور چند دیگر سکھوں کو پیراں دتہ آرائیں نے بچا لیا اور اپنے گھر لے گیا۔ ان دنوں تیز بارشیں ہو رہی تھیں لیکن ہم ایک ہفتے تک باہر پانی پینے کے لیے بھی نہیں نکل سکے۔ میں اس کے ساتھ تین مہینے تک رہا۔ وہ ہماری زمین کاشت کرتا تھا اور نہایت اچھا انسان تھا۔ اگرچہ بیشتر حملہ آور باہر سے آئے لیکن گاؤں کے چند افراد نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ہم نے سنا کہ حملہ آوروں میں سے زیادہ تر بٹالہ سے آئے تھے۔ کئی ہندوؤں نے بھی ہمارے گاؤں میں پناہ لی تھی۔ البتہ حملہ آور اپنی بھاری تعداد کے باعث ہم پر غالب آ گئے۔ حملے میں 300 یا 400 افراد مارے گئے۔ سکھوں نے اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا۔ صرف ہمارے خاندان میں مردوں نے کرپانوں کے ساتھ چھوٹی، بوڑھی اور جوان 33 عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہم نے سنا کہ پاکستانی فوج گاؤں پر حملہ کرنے والی تھی اور ہم نے فوج کی مزاحمت کرنے میں خود کو بے دست و پا پایا۔ ہمارے بزرگ گربخش سنگھ نے فیصلہ کیا کہ ہمیں تمام خواتین کو عزت بچانے کے لیے مار ڈالنا چاہیے۔ ان میں سے بعض دہشت زدہ ہو کر رونے لگیں تاہم اکثریت نے فیصلہ قبول کر لیا اور آبرومندانہ انداز میں زندگی ختم کرنے کو ترجیح دی۔

''میں نے 1995 میں تقریباً پچاس سال بعد گاؤں کا دوبارہ چکر لگایا تو وہاں کے باسیوں نے کھلے بازوؤں کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ ان میں سے کئی لوگ ہمارے بھارت کی سرحد پار کرنے کے سفر کی تفصیل جاننا چاہتے تھے۔ میں پیراں دتہ آرائیں اور مولوی محبوب عالم کی قبروں پر گیا اور انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ میں اس شخص سے بھی ملا جسے میں نے ایک ہندو کو قتل کرتے دیکھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس نے ہندو کو کھینچ کر زمین پر پھینکا اور کلہاڑے سے اس کو مار ڈالا۔ البتہ اب اس نے میرے ساتھ نہایت محبت والا سلوک کیا۔ ایک بوڑھی خاتون جسے ہم بواء کہتے تھے شمشیر سنگھ کا پوچھنے لگی کہ وہ بچا یا نہیں جو ان دنوں 4 سال کا تھا۔ وہ بولی 'شمشیر سنگھ بڑا پیارا چھوٹا بچہ تھا'۔''

پھر فقیر سنگھ ورک نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا جس پر ہم نے انٹرویو روک دیا۔ میں نے فقیر سنگھ سے پوچھا کہ کیا وہ ہندو کے قاتل کا نام بتانا پسند کرے گا لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب انسان وحشی بن گیا تھا۔ اسی خاندان کے ایک کمہار نے اسے بچا لیا۔ ہمیں مسجد میں لے جا کر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ کچھ سکھ مسلمان ہو گئے تاہم جب بعد میں بھارتی فوجی آئے تو وہ بھارت روانہ ہو گئے۔ اسی گھر میں ایک ہندو بھی تھا جو حملہ آوروں کے ہاتھوں مارا

گیا۔ اس کی بیوی نے ڈر کر کنویں میں چھلانگ لگا دی لیکن اسے بچا لیا گیا۔ خدا بھلا کرے سب انسپکٹر غوری کا اس نے کئی سکھوں کی جان بچائی۔ شمشیر جیت سنگھ جس سے ہماری پہلے ملاقات ہوئی تھی اور جس نے اپنے بزرگوں سے ہمیں ملوایا تھا بھی 1947 کے واقعات کا عینی شاہد تھا۔ اس کی ماں بھی ان بدقسمت خواتین میں شامل تھی جنہیں انکے اپنے رشتہ دار سکھوں نے غیرت کے نام پر قتل کر دیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور حیران ہوا کہ چار سال کی عمر میں ماں کے سائے سے محروم ہونے پر اس کے احساسات کیسے ہوں گے۔ اس نے بتایا کہ وہ 1998 میں گاؤں گیا اور بوا پھوپھی کے بارے میں پوچھا لیکن وہ ان دنوں گاؤں سے کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ جس پر میں اس کے لیے کچھ تحائف چھوڑ آیا کیونکہ اس نے مجھے یاد کیا تھا۔ وہاں سے رخصتی سے قبل ہم نے اس خاندان کے بزرگوں سے پوچھا کہ جب فوجی گاؤں میں آئے تو کیا ہوا تھا۔ ستم ظریفی یہ دیکھیں کہ گاؤں کے سکھ جس فوج کے آنے سے خوفزدہ ہوئے تھے وہ پاکستانی نہیں بھارتی فوج تھی۔ اگر سکھوں نے اپنی عورتوں کو نہ مارا ہوتا تو ان میں سے کچھ شاید آج بھی زندہ ہوتیں۔

چودھری توکل اللہ ورک

کٹھیالہ ورکاں میں سکھوں کی طرف سے اپنی خواتین اور بچوں کو قتل کرنے کا واقعہ آج بھی گاؤں میں زیر بحث رہتا ہے۔ 30 دسمبر 2005 کو جس روز ہم نے نذیر احمد ورک کا انٹرویو کیا اسی دن ہم نے شیخوپورہ کے ممتاز رکن قومی اسمبلی چودھری توکل اللہ ورک کے خیالات بھی ریکارڈ کیے۔

"میرا نام چودھری توکل اللہ ورک ہے۔ میں 5 جولائی 1937 کو اپنے آبائی گاؤں چاندی کوٹ میں پیدا ہوا۔ ان دنوں تحصیل ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ کا حصہ تھی لیکن اب ننکانہ صاحب ضلع بن چکا ہے۔ میں 1970 میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوا۔ ایک بار پنجاب اسمبلی اور دو بار قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ ورک جاٹوں کی سب سے بڑی تعداد ضلع شیخوپورہ میں آباد تھی۔ ان میں سے 10 فیصد مسلمان اور 90 فیصد سکھ تھے۔ سکھ جنگجو لوگ تھے۔ میرے خاندان کی ملکیت میں 15 ہزار ایکٹر زمین تھی اور علاقے میں ہمیں نہایت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سکھ اور مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ بلا تفریق مذہب ہم ایک ہی برادری تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے ہم کوئی امتیاز نہیں برتتے تھے۔ بربریت پہلے مشرقی پنجاب میں شروع ہوئی اور جب وہاں سے لٹے پٹے مسلمان مہاجرین آئے تو یہاں بھی رد عمل سامنے آنے لگا۔

"ہمارے علاقے کے ہندوؤں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات تھے۔ کم از کم ہمارے علاقے سے بیشتر سکھ اور ہندو بحفاظت نکل گئے تھے۔ ہمارا منشی سوہن سنگھ بھی سرحد پار کر گیا لیکن ہمارے رابطے پھر بھی رہے۔ اس کے بیٹے کی امرتسر میں بک شاپ تھی۔ وہ ہمیں خط لکھتا ہے۔ وہاں کے ورک سکھ بھی ہمارے پاس آتے رہتے ہیں۔ جب بھی وہ ننکانہ صاحب کی یاترا کرتے ہیں تو ہمارے پاس ضرور آتے ہیں۔

"1947 میں سکھ ہمارے پاس آئے۔ میرے والد چودھری خوشی محمد نے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ لوگ ہمیں چھوڑ کر جائیں۔ وہ ہماری دعوت سے متاثر ضرور ہوئے تھے لیکن اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ کہتے تھے یہ سکھ عقیدے سے غداری ہو گی۔ جہاں تک کٹھیالہ ورکاں کی کہانی کا تعلق ہے تو اس گاؤں کے سکھ بہت خوددار لوگ تھے۔ انہوں نے اوباش افراد کے ہاتھ لگنے کے خدشے کے پیش نظر اپنی رشتہ دار عورتوں

کو خود جان سے مار ڈالا۔ زیادہ تر لاشیں صندوقوں میں بند کر دی گئیں۔ شاید کچھ کی چتا بھی جلائی گئی۔ جب مہاجرین یہاں آئے تو لاشوں کا پتہ چلا۔ طویل عرصے تک علاقے کے لوگوں کٹھیالہ ورکاں میں رونما ہونیوالے روح فرسا واقعات کی باتیں کرتے رہے۔"

گربچن سنگھ ٹنڈن

گربچن سنگھ کی داستان 1947 کی عجیب اور افسوسناک ترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ مجھے اس کے بارے میں گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر کے شعبہ سیاسیات کے پروفیسر گرنام سنگھ نے بتایا۔ انٹرویو 29مارچ 2004 کو دہلی کے نواحی علاقے نوئیڈا میں ان کی رہائشگاہ پر ریکارڈ کیا گیا:

"میں 25جولائی1934کوٹپیالہ Tapiala دوست محمد، تحصیل شاہدرہ، ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں لاہور اور گوجرانوالہ کے درمیان ریلوے لائن پر واقع ہے۔ میرے والدین کھتری ہندوؤں کی ذیلی ذات ٹنڈن سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن میں نے سکھ مذہب جوانی میں ہی قبول کر لیا تھا۔ مغربی پنجاب کے کھتری ہندوؤں میں یہ رسم عام تھی کہ وہ ایک بیٹے کو سکھ بنا دیتے تھے۔ مجھے سکھ بنوانے کی ایک خاص وجہ تھی۔ میری پیدائش سے پہلے میرے والدین کی صرف بیٹیاں تھیں اور اولاد نرینہ نہیں تھی۔ انہوں نے خدا سے منت مانگی کہ اگر ان کا بیٹا ہوا تو وہ اسے سکھ بنا دیں گے، یوں یہ میری شناخت بن گئی۔ میرا چھوٹا بھائی بھی سکھ بن گیا۔

"ہمارا گاؤں بین المذاہب ہم آہنگی کا گہوارہ تھا۔ تمام مذہب کے بزرگوں کا بہت احترام کیا جاتا تھا اور ان کی باتوں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ٹپیالہ دوست محمد میں دو تہائی آبادی مسلمانوں کی تھی جبکہ ہندو ایک تہائی تھے۔ سکھوں کے صرف دو خاندان آباد تھے۔ ہمیں ہندوؤں کو لالہ کہا جاتا تھا جو تاجر ہندوؤں کے لیے استعمال ہونے والی اصطلاح تھی۔ البتہ کچھ کھتری زراعت پیشہ بھی تھے۔ ہماری ایک بڑی حویلی تھی جبکہ 25،30ایکڑ اراضی بھی تھی۔ مسلم زمیندار خود کو چودھری کہلواتے تھے۔

"میں 1947 میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ گاؤں کے سکھوں میں ہر کمیونٹی کے بچے پڑھتے تھے۔ ہمارے مذہبی عقائد ہماری دوستی کے درمیان رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔ اس طرح گاؤں میں مختلف تقریبات بھی سانجھی ہوتی تھیں۔ ہم روزانہ تاش کھیلتے اور کشتی بھی لڑتے تھے۔

"اسی دوران فرقہ وارانہ کشیدگی اور فسادات کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ گاؤں میں بیٹری سے چلنے والے ایک یا دو ریڈیو تھے۔ نوائے وقت، ویر بھارت اور میلاپ جیسے اخبار بھی کبھی کبھار آجاتے تھے۔ 15 اگست کو جب لاہور میں آزادی کا جشن منایا جارہا تھا تو ہمارے ارد گرد دیہی منظر عام بدلنا شروع ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے مسلم لیگ کے زیر اہتمام گاؤں میں اجلاس کئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے شرکاء زیادہ تر باہر کے لوگ تھے۔ ان کے پاس نیزے، کلہاڑے اور تیز دھار دیگر آلات تھے۔ مسلمان بزرگوں نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے انہیں گڑبڑ کرنے سے روکا۔ بالخصوص چودھریوں نے واضح کیا کہ وہ کسی غیر مسلم کو نقصان نہیں پہنچانے دیں گے۔ اس موقع پر ایک امن کمیٹی قائم کی گئی۔ مجھے اس کمیٹی کے 2ارکان چودھری معاف علی اور شیخ محمد بشیر کے نام آج بھی یاد ہیں۔

"وسط اگست کے بعد لاہور میں بھڑکنے والی آگ اب ہمارے گاؤں سے بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ جو ہمارے شہر سے 25 کلو میٹر ہی دور تھا۔ رات کے وقت ہم لاہور کی سمت میں آسمان سے باتیں کرتے شعلے باآسانی دیکھا کرتے تھے۔ یہ گویا نہ ختم ہونے والی روشنی تھی۔ امرتسر اور پنجاب کے دیگر حصوں میں ہلاکتوں اور آگ لگانے کے واقعات کی خبریں بھی ہمارے گاؤں میں گردش کرنے لگی تھیں۔ البتہ یہاں زندگی بدستور معمول پر رہی۔ تاش کھیلنے والے گاؤں کے درختوں کے نیچے تاش کھیلتے رہے جبکہ اکھاڑوں میں کشتیاں بھی ہوتی رہیں۔ اس دوران گورداسپور سے بڑی تعداد میں مہاجرین ہمارے گاؤں میں بھی آنے لگے۔ یہی وہ وقت تھا جب گاؤں میں حالات بدلنے لگے۔ وہ مہاجرین بتایا کرتے کہ ہم تو اپنے گھر بار لٹا کر یہاں آئے ہیں تو اس گاؤں میں کھتری کیوں اب تک بیٹھے ہیں؟

"ان لوگوں نے ٹپیالہ دوست محمد کے ارد گرد 12، 13 دیہات کے لوگوں سے رابطہ کیا تاکہ ہمارے گاؤں پر حملہ کیا جا سکے۔ تاہم یہ اطلاعات امن کمیٹی تک پہنچ گئیں۔ انہوں نے سازش کرنے والوں کو خبردار کیا کہ ہندوؤں اور سکھوں کو مارنے سے پہلے تمہیں ہماری لاشوں سے گزرنا پڑے گا۔ بصورت دیگر ہم تمہارے عزائم پورے نہیں ہونے دیں گے۔ بہر حال 25، 26 اگست کو 15 ہزار مسلح افراد نے اچانک گاؤں پر حملہ کر دیا۔ خطرہ بھانپتے ہی تمام ہندو کھتری گاؤں کے ممتاز ہندوؤں کی ملکیت کثیر المنزلہ عمارت کی طرف چلے گئے۔ میری چھوٹے بھائی، دو بہنوں اور والدہ نے منوہر لال کے گھر میں پناہ لی۔ امن کمیٹی کے ارکان نے مزاحمت کی لیکن حملہ آور ان پر غالب آ گئے اور انہوں نے ان دو بڑے مکانوں کا محاصرہ کر لیا جہاں 60 ہندو خاندان موجود تھے۔ حملہ آوروں نے منوہر لال سے کہا کہ تم اگر اپنی رائفل پھینک دو تو تمہیں اور تمہارے خاندان کو چھوڑ دیا جائے گا۔ وہ مان گیا اور ہمیں کہا کہ تم لوگ کہیں اور چلے جاؤ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔

"ہجوم گھروں میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ محصور افراد میں سے کسی نے ان پر اینٹ پھینکی جس سے ایک آدمی مارا گیا جس پر وہ لوگ مشتعل ہو گئے اور انتقام کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ اس موقع پر فیصلہ کیا گیا کہ ہم اپنی عورتوں کو ان کے حوالے کرنے کی بجائے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالیں۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک نوجوان لڑکی کو ذبح کر دیا گیا۔ اس موقع پر گھر میں شدید خوف و ہراس پھیل گیا۔ گھر کے عقبی طرف ایک راستہ تھا اور کسی نے مشورہ دیا کہ ہم سامان وغیرہ کی فکر چھوڑ کر اس طرف سے بھاگ جائیں۔ ہم میں سے 10، 12 افراد نے ایسا کرنے کی کوشش کی، میں اور میرا بھائی بھی ان کے پیچھے گئے لیکن قاتل گھات لگا کر بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے بھائی کو گرتے دیکھا۔ خود مجھ پر بھی کلہاڑے سے وار کیا گیا۔ (گربچن سنگھ نے مجھے اپنے سر پر زخم کا نشان بھی دکھایا، ٹخنے اور کندھے پر بھی گہرے گھاؤ تھے)۔

"سر پر زخم آنے سے میں بے ہوش ہو کر گر گیا۔ یہ واقعہ دن کے 11 بجے ہوا تھا۔ کئی ہندو مارے گئے۔ 4 بجے ہمارے گاؤں کے مسلمانوں نے لاشیں کھینچ کر قریبی برساتی نالے ڈیک میں پھینکنا شروع کر دیں۔ جب کسی نے میری ٹانگ کھینچی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ آدمی حیرت سے بولا 'یہ لالوں کا لڑکا ہے۔' میں نے کراہتے ہوئے کہا 'پانی۔' وہ مجھے اپنے گھر لے گیا اور پانی اور میٹھا دودھ پینے کو دیا۔ پھر وہ مجھے گاؤں کی مسجد میں لے گیا جہاں گاؤں کے دیگر ہندوؤں نے پناہ لے رکھی تھی۔ وہاں میری بہنیں اور والدہ بھی تھیں۔ کچھ دیر بعد میرے دادا اور میرے والد ہری رام جو کھیتوں میں چھپ گئے تھے بھی وہاں آ گئے۔ البتہ میرا چھوٹا بھائی مارا گیا تھا۔

''وہ رات ہم نے مسجد میں گزاری۔ پھر ہمیں ایک گھر منتقل کر دیا گیا جہاں ہم 10، 12 دن تک مقیم رہے۔ اس دوران ہم پر تین بار پھر حملہ کیا گیا لیکن اب ہمارے گاؤں کے مسلمان بھائیوں نے پوری تیاری کر رکھی تھی۔ اس لیے ہم محفوظ رہے۔ اس کے بعد فوج آئی اور ہمیں 10 ستمبر کے لگ بھگ لاہور میں گورنمنٹ کالج کے کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ کیمپ پر بھی حملے کیے گئے۔ ہم 14 ستمبر کو امرتسر پہنچے۔ میرا بہنوئی پہلے ہی وہاں تھا۔ ہمیں پتہ چلا کہ ہمارا بہنوئی جو فوج میں صوبیدار تھا اور خالصہ کالج کے قریبی گاؤں گوپارائے میں مقیم تھا۔ وہ فوجی ٹرک میں ہمیں بچانے ٹپیالہ دوست محمد جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ میرے والدین اسے روکنا چاہتے تھے کیونکہ ہم تو پہلے ہی وہاں سے نکل چکے تھے۔ گوپارائے امرتسر کا نواحی گاؤں تھا چنانچہ میرے والدین صبح 4 بجے ہی پیدل وہاں کے لیے چل پڑے۔ راستے میں ان کی ملاقات ایک برہمن سے ہوئی جو کلینک چلاتا تھا۔ اس نے پوچھا 'تم لوگ کون ہو اور کہاں جا رہے ہو۔' میرے والد نے بتایا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں اور لال شاہ (ہندو ساہوکاروں کو شاہ کہا جاتا تھا) کے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ جی ٹی روڈ پر مت چلو کیونکہ پاکستانی فوج وہاں گشت کر رہی ہے۔ تم لوگ کھیتوں والے راستے سے آگے جاؤ۔ انہوں نے مشورہ مان لیا۔ یہ ایک پھندہ تھا۔ آگے گئے تو چار سکھ جاٹ ڈاکو گھات میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ جو کچھ پاس ہے وہ نکال دو۔ ان کے پاس صرف 7 روپے تھے۔ ڈاکوؤں نے پیسے لے لیے لیکن لال شاہ ایک مشہور شخصیت تھی اس لیے انہوں نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے میرے ماں باپ کو ہلاک کر دیا۔''

واقعہ سناتے ہوئے گربچن ٹنڈن دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کی بیوی اور بیٹیاں بھی رونے لگیں چنانچہ میں نے انٹرویو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

گوجرانوالہ

گوجرانوالہ ایسا ضلع تھا جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ ان کی آبادی 70.4 فیصد تھی جبکہ ہندوؤں اور سکھوں کی مجموعی آبادی 22.7 فیصد تھی۔ سکھوں کے تاریخی نکتہ نظر کے لحاظ سے اس ضلع کی اہمیت یوں تھی کہ پنجاب کا آخری مقامی حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ اسی ضلع کا رہنے والا تھا۔ تقسیم کے وقت یہاں کے سماجی معاشی معاملات ویسے ہی تھے جیسے کہ صوبے کے دیگر حصوں کے تھے۔ کاروباری مفادات اور تجارت عمومی طور پر غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھی۔

حافظ تقی الدین گوجرانوالہ کے رہائشی ہیں اور انہوں نے مارچ 1947 سے شروع ہونے والے فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جولائی میں شہر کو گڑبڑ والا علاقہ قرار دے دیا گیا اور 15 اگست کے بعد جلاؤ گھیراؤ اور قتل کے واقعات میں تیزی آنے پر سکھوں اور ہندوؤں کو یہاں سے جانا پڑا۔ کھوسلہ اور ایس جی پی سی رپورٹ میں ڈاکٹر تیج بھان اور اس کے اہل خانہ کی پولیس کے ہاتھوں ہلاکت کا ذکر ہے۔ حافظ تقی الدین بھی ہمیں اس قتل اور مرکزی ملزم تھانیدار چودھری علم دین کے بارے میں تفصیل بتاتے ہیں۔ انہوں نے ان واقعات کا بھی ذکر کیا ہے جو ڈاکٹر تیج بھان کی ہلاکت کا باعث بنے۔ علم دین کے مطابق وہ ایک کانسٹیبل کے ساتھ یہ تفتیش کرنے گئے تھے کہ کیا ڈاکٹر تیج بھان کے گھر میں کوئی اسلحہ جمع کیا گیا تھا؟ وہاں سے انہیں کچھ نہ ملا لیکن اس چھاپے کے دوران کافی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور یہاں تک افواہ پھیل گئی کہ

علم دین اور کانسٹیبل کو قتل کر دیا گیا ہے لہٰذا پولیس نے اس گھر پر حملہ کر دیا۔ 27 اگست کو کارروائی کے وقت گھر میں موجود تمام 12 افراد ہلاک ہو گئے (1999: 285-6)۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ہندوؤں اور سکھوں کو گوجرانوالہ سے بھاگنا پڑا۔

لیکن حافظ تقی الدین کہتے ہیں کہ گوجرانوالہ میں گڑبڑ اس وقت شروع ہوئی جب یہ افواہ تیزی سے پھیل گئی کہ غیر مسلموں کی اکثریت والے علاقے میں مسلمانوں کی ایک مسجد کو آگ لگا دی گئی ہے۔ انہوں نے عہد کیا کہ وہ خود چندہ جمع کر کے مسجد کی تعمیر نو کریں گے۔ بعد میں پتہ چلا کہ مسجد کے قریب ایک مسلمان رنگساز کی دکان تھی جو مسجد کے دروازے کے پاس کپڑے رنگتا تھا۔ کرفیو لگا تو وہ چولہا بند کرنا بھول گیا جس سے آگ لگ گئی اور مسجد کو بھی لپیٹ میں لے لیا لیکن شرپسند گوجرانوالہ میں پوری طرح متحرک تھے اور انہوں نے واقعے کو ہندوؤں کی سازش کا شاخسانہ قرار دے دیا۔ شہر میں چاقوؤں اور لمبے پھل والے دیگر ہتھیاروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ پھر ایک دن نوجوان مسلمان سردار شاہ جو احرار کا متحرک کارکن تھا مسلمانوں کی اکثریت والے علاقے میں مردہ پایا گیا۔ اس کا الزام بھی بلا ثبوت غیر مسلموں پر لگا دیا گیا۔ اس سے بھی فرقہ وارانہ تعلقات میں مزید دراڑیں پڑ گئیں۔ سکھوں اور ہندوؤں میں عدم تحفظ کا احساس مزید گہرا ہو گیا۔

قتل کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کے سربراہ احرار کے مقامی رہنما پیر سید فیض الحسن اور کانگریسی لیڈر نرنجن داس بگا تھے جبکہ مسلم لیگ، اکالی دل اور خاکسار تحریک کے رہنماؤں کو بطور رکن شامل کیا گیا۔ ایک دن مسلمان مزدور کی لاش محلہ ریتاں والا سے برآمد ہوئی۔ وہ گوجرانوالہ سے باہر کے علاقے کا تھا۔ اس کے بارے میں بھی یہ چہ مگوئیاں پھیلیں کہ اسے ہندوؤں نے قتل کیا۔ نرنجن داس بگا ننگے پاؤں اور ننگے سر اظہار افسوس کے روایتی طریقے کے ساتھ اس محلے میں آیا لیکن وہاں کے مشتعل افراد نے گھروں کی چھت سے اینٹیں مار کر اسے ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد پیر فیض الحسن آیا۔ اس نے لاش اٹھائی اور نرنجن داس کے گھر لے گیا۔ اس بہیمانہ قتل سے گوجرانوالہ کے تمام شائستہ طبع افراد کے دل ٹوٹ گئے۔ پیر فیض الحسن اور دیگر قوم پرست مسلمانوں نے آخری رسومات میں شرکت کی تاہم اس کے بعد حالات قابو سے باہر ہوتے چلے گئے۔ ان دنوں گوجرانوالہ کا ڈپٹی کمشنر سندر داس میدھا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد اس کا تبادلہ جالندھر کر دیا گیا جہاں اس نے غیر مسلموں کو مسلمانوں پر حملوں کے لیے اشتعال دلایا (Ibid: 289-92)۔

کدرناتھ ملہوترا

میری کدرناتھ ملہوترا سے ملاقات دہلی میں 10 مارچ 2004 میں ہوئی۔ وہ اگست 1947 کے آخر میں گوجرانوالہ سے فرار ہوا تھا اور اپنی کہانی ان الفاظ میں مجھے سنائی:

"17 اگست کے بعد پولیس اور نیشنل گارڈز نے گوجرانوالہ میں گشت شروع کر دیا تھا اور ہندوؤں اور سکھوں پر کئی حملے کیے گئے۔ بالخصوص ڈاکٹر تیج بھان کی ہلاکت نے ہندوؤں اور سکھوں میں سراسیمگی پیدا کر دی۔ وہ ایک خدا ترس انسان تھے اور ہر مذہب کے افراد کی مدد کیا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے خاندان میں دس سے زائد افراد تھے۔ کسی بوڑھے کو بھی بخشا نہیں گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے خاندان کا پاکستان میں رہنے کا عزم ٹوٹ گیا۔ گوجرانوالہ شہر میں ہمارا جنرل سٹور تھا۔ میرے والد کا خیال تھا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی کیونکہ محمد علی جناح ایک روشن خیال انسان

تھے۔ اس کے علاوہ میرے والد کے بہت اچھے دوست مسلمان تھے۔ انہوں نے ہمیں یقین دلایا کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تاہم ایک احتیاطی تدابیر کے طور پر والد نے میری والدہ، بہن اور چھوٹے بھائی کو جالندھر میرے ننھیال بھجوا دیا۔ میں ان دنوں 20 سال کا تھا اور لاہور میں پڑھتا تھا۔ اگست میں، میں گوجرانوالہ میں تھا۔ میں بھی گوجرانوالہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ 27 اگست یا ایک آدھ دن آگے پیچھے کی تاریخ تھی جب ڈاکٹر تیج بھان کے کنبے کا قتل عام کیا گیا۔ ہم لوگ ایک گوردوارے میں جمع ہو گئے جہاں سے ہمیں بھارت روانہ ہونے کی امید تھی۔ یہ سہ پہر کے بعد کا وقت تھا جب پولیس، نیشنل گارڈ اور دیگر مسلح افراد نے گوردوارے پر دھاوا بول دیا۔ یہ لوگ کلہاڑیوں اور نیزوں سے لیس تھے۔ گوردروارے کے اندر کچھ لوگوں کے پاس رائفلیں تھیں جبکہ بیشتر افراد کے پاس کرپانیں تھیں یا وہ سرے سے غیر مسلح تھے۔ اس عمارت میں انجینئر وجے شرما، لالہ کشوری لال کھنہ اور کئی دیگر ہندو بھی موجود تھے۔ ہر کوئی دعا کر رہا تھا۔

''''عمارت کا پانی کا کنکشن پہلے ہی کاٹا جا چکا تھا اور بچے اور بیمار سخت تکلیف کا شکار تھے۔ جب پہلا حملہ ہوا تو خواتین نے چیخنا چلانا اور بین کرنا شروع کر دیا۔ گوردوارے کے بعض افراد نے باہر نکل کر حملہ پسپا کر دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک نوجوان سکھ بہادری سے لڑا لیکن بالآخر نیچے گر گیا۔ اس کی لاش گوردوارے میں اندر لائی گئی۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ خواتین اور بچوں کو حملہ آوروں کے حوالے کرنے سے بہتر ہے مار ڈالا جائے لیکن آپس میں بحث و مباحثے کے دوران کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہمارے کچھ بڑے سرکاری حکام سے مدد لینے بھی گئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہندو یا سکھ پولیس اہلکار یا تو بھارت جا چکے تھے یا ہلاک ہو گئے تھے۔

''شام کو کچھ لوگ بھاگ کر قریبی گلیوں میں چلے گئے۔ ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ البتہ میرے والد گوردوارے سے نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے مدد کے لیے اپنے دوست رمضان کو پیغام بھیجا۔ چاچا رمضان اپنے خاندان میں فوتیدگی کی وجہ سے کچھ روز پہلے کامونکے گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں گوردوارے سے نکالنے کے لیے اپنا بیٹا بھیجا۔ میرے والد نے کہا کہ میں یہاں سے نکل جاؤں، البتہ وہ گوردوارے میں ہی رہیں۔ اس طرح ہمارے بچنے کے ففٹی ففٹی امکانات تھے۔ شام کے 7 بجے میں گوردوارے سے نکلا۔ میرا خیال ہے کہ ٹھیک نصف گھنٹے بعد گوردوارے کو آگ لگا دی گئی اور اندر پناہ گزین ڈیڑھ سو کے لگ بھگ افراد کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ چاچا رمضان میرے والد منوہر لال کو ساتھ نہ لانے پر اپنے بیٹے اور میرے ساتھ سخت ناراض ہوئے لیکن اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں چند روز تک چاچا رمضان کے گھر رہا۔ انہوں نے میرے ساتھ نہایت مشفقانہ برتاؤ کیا۔ انہوں نے مجھے کھانے کے لیے سبزیاں دیں اور میں ان کے برتنوں کی بجائے نل سے براہ راست پانی پیتا تھا۔ ایک قدامت پرست ہندو ہونے کے باعث کسی مسلمان کے گھر کھانے پینے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔ میری ان کے بیٹے جاوید کے ساتھ گہری دوستی ہو گئی۔ وہ مجھ سے چند سال چھوٹا تھا۔ ستمبر کے اوائل میں بھارتی فوج گوجرانوالہ آئی اور میں دیگر مہاجرین کے ساتھ امرتسر چلا گیا۔ میں نے راستے سے کئی لاشیں دیکھیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ مسلمانوں کی لاشیں تھیں۔ میں جالندھر چلا گیا جہاں میرے خاندان کے باقی ارکان مقیم تھے۔ اگرچہ جالندھر میں اب بھی کچھ مسلمان رہ رہے تھے لیکن بیشتر مسلمان محلے ویران ہو چکے تھے۔ یہ بات واضح تھی کہ ان لوگوں کو بھی (ہماری طرح) سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمیں وہاں پاؤں جمانے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑی۔ میری والدہ اپنے شوہر کو کھونے کے صدمے سے کبھی نہ نکل سکیں۔ 1950 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میرے بھائی اور بہن جالندھر میں رہتے ہیں لیکن میں دہلی

منتقل ہو گیا ہوں۔ جہاں میری بیٹی اور بیٹا مقیم ہیں۔ اکثر اوقات میں گوجرانوالہ کے بارے میں سوچتا ہوں۔ مجھے اپنا گھر اور چاچار مضان والا محلہ بھی یاد آتا ہے۔ اب میری عمر 81 سال ہے اور جاوید کی عمر بھی 78، 79 سال ہونی چاہیے۔ میں اس مسلم خاندان کو ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھتا ہوں۔"

سدھر شن کمار کپور

"میں 31 جولائی 1931 کو پیدا ہوا۔ میرا آبائی علاقہ گجرات کا قصبہ جلالپور جٹاں تھا۔ ہمارے قصبے کی آبادی 17 ہزار تھی اور ان میں سے ایک تہائی ہندو اور باقیماندہ مسلمان تھے۔ 14 مارچ 1947 کو ہم یہاں سے رخصت ہوئے۔ میرے والد کو ان کے ایک مسلمان دوست محمد حسین ڈار نے خبردار کیا کہ جلالپور جٹاں پر حملے کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ البتہ یہ حملہ مارچ میں نہیں ہوا بلکہ اگست میں جا کر ہوا۔ ان دنوں میں اپنے میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا لیکن ہمیں جان بچانے کے لیے گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ ہم یہاں سے گوجرانوالہ کے علاقے اکال گڑھ چلے گئے جہاں میرے ننھیالی رشتہ دار رہتے تھے۔ وہاں ہم 5 ماہ مقیم رہے۔ اگست کے پہلے ہفتے مسلمانوں نے اکال گڑھ کے ہندوؤں پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے ہندوؤں کی املاک کو لوٹا اور آگ لگا دی۔ قریبی گاؤں رام نگر پر بھی حملہ کیا گیا جس سے وہاں کی تمام ہندو آبادی کو علاقہ چھوڑنا پڑا۔ ہندوؤں نے اکال گڑھ آریہ سماج مندر میں پناہ لے لی۔ مقامی ہندوؤں اور سکھوں نے ان کو ہر ممکن امداد فراہم کی۔ علاقے کے ممتاز مسلمانوں نے بھی انہیں ہر ممکن تحفظ کا یقین دلایا اور کہا کہ حالات کچھ ہی ہوں آپ یہاں سے نہ نکلیں۔ چنانچہ ہندو اور سکھ اکال گڑھ کے گوردوارے میں جمع ہوئے اور عہد کیا کہ وہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔ البتہ انہوں نے ہمیں اس عہد میں شامل نہیں کیا کیونکہ ہم اکال گڑھ کے رہائشی نہیں تھے۔ ہمیں کہا گیا کہ آپ جہاں جانا چاہیں چلے جائیں۔

"14 اگست کو میں اکال گڑھ میونسپل کمیٹی میں پاکستان کا پرچم لہرانے کی تقریب میں شریک تھا۔ 18 اگست کو ہم نے سنا کہ گوجرانوالہ اور میرے آبائی قصبے جلالپور جٹاں میں فسادات شروع ہو گئے تھے۔ 100 سے زائد ہندو مارے گئے۔ میں چاچا محمد حسین ڈار کا ممنون ہوں کہ جنہوں نے ہمیں قبل از وقت خبردار کیا کر کے بچا لیا۔ وہ بہت اچھے نعت خواں تھے۔ 22 اگست کو ہم ڈوگرہ فوج کی معیت میں سرحد پار کر گئے۔ بعد میں مجھے بدری ناتھ کپور سے پتہ چلا کہ 7 ستمبر 1947 کو اکال گڑھ میں حملہ کر کے تمام غیر مسلموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مشرقی پنجاب میں بھی ہم نے ہزاروں مسلمانوں کو ایسی بربریت کے ساتھ قتل ہوتے دیکھا۔"

کامونکی میں ٹرین میں قتل عام

ٹرینوں پر حملوں کا سلسلہ مارچ 1947 سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ آغاز میں درجنوں افراد مارے گئے۔ البتہ 14 اگست کے بعد اس قسم کے حملوں میں شدت آگئی اور ہزاروں افراد کو ہلاک کر دیا گیا۔ مجھے پاکستان آرمی کے ایک ریٹائر افسر نے بتایا کہ 1948 کے آغاز میں اس نے بھارت جانے والی ٹرین اپنی آنکھوں سے لاشوں سے بھری دیکھی۔ تاہم نومبر 1947 کے بعد ٹرین پر حملوں میں نمایاں کمی آگئی تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں کی ٹرین پر حملوں میں ایک بدترین حملہ 25 اور 26 ستمبر کو کامونکی

میں کیا گیا۔ اسی باب میں قبل ازیں ہم نے کلب علی شیخ کے تاثرات بیان کیے ہیں۔ ان کے والد ریلوے پولیس میں ملازم تھے جنہوں نے کاموکی میں ٹرین میں قتل عام کا ذکر کیا تھا۔ اخبار دی ٹربیون جو لاہور سے مشرقی پنجاب میں منتقل ہو گیا تھا نے اس افسوسناک واقعے کی رپورٹ یکم اکتوبر 1947 میں بیان کی اور کہا کہ واقعہ 30 ستمبر کو رونما ہوا۔ یہ تاریخ درست نہیں۔ کھوسلہ اور ایس جی پی سی رپورٹوں میں اس واقعے کا ذکر ہے۔ بہر حال یہ ٹرین ضلع جہلم کے گاؤں پنڈ دادنخان سے بھارت کے لیے روانہ ہوئی۔ اس پر ضلع گوجرانوالہ کے علاقے (اب تحصیل) کاموکی میں حملہ کیا گیا۔ دی ٹربیون کے مطابق 3500 میں سے صرف 150 افراد زندہ بچ سکے۔ 2 اکتوبر کی 'ٹربیون' کی اشاعت میں بچنے والے افراد نے بتایا کہ ٹرین کو لاہور کا سفر جاری رکھنے کی بجائے واشنگ شیڈ بھیج دیا گیا۔ میری ملاقات مسز ساوتری دت چیڑ سے دہلی کے نواحی علاقے نوئیڈا میں 29 مارچ 2004 کو ہوئی۔ اس نے بتایا کہ پنڈ دادنخان میں ان کی رشتہ داری تھی۔ ٹرین میں ان کے کئی رشتہ دار حتیٰ کہ خالہ اور خالو بھی سوار تھے۔ کوئی زندہ نہ بچا۔ کھوسلہ رپورٹ میں بھی اس واقعے کا ذکر ہے۔ ٹربیون نے ہلاکتوں کی جو تعداد بتائی ہے وہ اس لیے درست نہیں کیونکہ کھوسلہ رپورٹ کے مطابق 600 عورتوں کو اغوا بھی کر لیا گیا تھا۔ (2-151:1989)۔ پنجاب پولیس کی 27 ستمبر 1947 کی انٹیلی جنس رپورٹ میں بتایا گیا کہ: "کاموکی میں 408 ہندو اور سکھ مارے گئے۔ 50 افراد شدید جبکہ 537 معمولی زخمی ہوئے۔ بڑی تعداد میں خواتین کے اغوا کی بھی اطلاعات ہیں" (Disturbances in the Punjab 1995: 384)۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سکھوں نے سرحد پار کر کے قصور اور دیگر علاقوں میں مسلمانوں پر حملے کیے۔ کئی مسلمان خواتین کو بھی اغوا کرنے کی اطلاعات ہیں لیکن آفیسر کمانڈنگ میجر دلجیت سنگھ نے اس کے سدباب کے لیے کچھ نہیں کیا۔ (Ibid: 384-5)۔

ایک چشم دید گواہ کے تاثرات

ایک سینئر پاکستانی افسر جو اپنی شناخت ظاہر نہیں کرنا چاہتا نے کاموکی ٹرین پر حملے کے بارے میں مجھے یہ تفصیلات بتائیں:

''میرے والد دہلی میں رہ گئے تھے کیونکہ وہ ماؤنٹ بیٹن کی سربراہی میں قائم پارٹیشن کونسل کے معاملات میں شامل تھے۔ ہم اور چھ دیگر پاکستانی خاندان پالم ائیر پورٹ کے قریب مقیم تھے۔ پہلے علاقے کی سکیورٹی بلوچ رجمنٹ کے سپرد تھی لیکن ایک روز میرے والد نے دیکھا کہ ان کی جگہ گورکھا اور ڈوگرہ فوج نے لے لی تھی۔ اس سے وہ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ ایک شام کو ہجوم نعرے لگاتا ہمارے علاقے میں آیا۔ ہمارے پاس کوئی آتشیں اسلحہ نہیں تھا۔ میرے والد اور بڑے بھائی جن کی عمر محض چودہ سال تھی کے پاس صرف چھڑیاں تھیں۔ باقی تمام اہل خانہ سے کہا گیا کہ چار پائیوں کے نیچے چھپ جاؤ۔ خوش قسمتی سے ہجوم حملہ کیے بغیر چلا گیا لیکن اگلے روز میرے والد نے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ بدستور دہلی میں رہنے پر تیار ہیں لیکن میرے خاندان کو پاکستان بھجوا دیا جائے۔ چنانچہ ہمیں چارٹر طیارے پر بٹھا دیا گیا۔ پائلٹ جو انگریز تھا کو جب پتہ چلا کہ ہمارا تعلق جالندھر سے تھا تو اس نے طیارے کو نیچے لا کر کہا کہ 'دیکھو تمہارے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔' نیچے کے مناظر نہایت ہولناک تھے۔ ہر طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ مکانات کو آگ لگی تھی۔ یہ ایک پریشان کن منظر تھا۔ بہر حال ہمارا طیارہ لاہور ائیر پورٹ اتر آیا جہاں ہم چند روز مقیم رہے۔ پھر ہمیں ٹرین سے راولپنڈی بھجوا دیا گیا۔

”ٹرین میں ہمارا الگ کمپارٹمنٹ تھا۔ جو ہم نے اندر سے بند کر رکھا تھا تا کہ حملہ آوروں سے بچ سکیں۔ راستے میں ٹرین کاموکی پر رک گئی۔ میری والدہ نے ایک کھڑکی کا دروازہ اوپر اٹھا دیا اور باہر ایک روح فرسا منظر دکھائی دیا۔ مجھے بالخصوص گلابی کپڑوں میں ملبوس خاتون ٹرین کے بالکل پاس پڑی یاد ہے۔ وہ نئی نویلی دلہن لگ رہی تھی۔ اسے بھی بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا۔ بالائی پنجاب سے آنے والے ہندو اور سکھ مسافروں کو ذبح کر دیا گیا تھا۔ ہر طرف لاشیں پڑی تھیں۔ میرے والد ٹرین سے نیچے اترے اور اتفاق سے ان کی ملاقات اپنے کزن سے ہو گئی جو پولیس میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور گوجرانوالہ میں تعینات تھے۔ اس کزن نے بتایا کہ مرکزی کابینہ نے حکم دیا تھا کہ ٹرین کو روک کر غیر مسلموں کو قتل کر دیا جائے کیونکہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر مظالم روکنے کا اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ جو میں نے سنا ہے وہ یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد مشرقی پنجاب سے پاکستان آنے والی ٹرینوں پر حملے بند ہو گئے۔

”بعد میں جہلم میں، میں نے اپنی آنکھوں سے قتل عام ہوتا دیکھا۔ چاقوؤں، نیزوں اور دیگر تیز دھار آلات سے مسلح مسلمان ہندو اور سکھ مردوں، خواتین اور بچوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ متاثرہ افراد زور زور سے چلا رہے تھے، رو رہے تھے۔ یہ ایک روح فرسا منظر تھا۔“

وزیر آباد کے بارے میں ایک ای میل

وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ کا ایک شہر ہے۔ جو تقسیم ہند سے پہلے بھی چھریاں چاقو تیار کرنے کے حوالے سے مشہور تھا۔ کارخانوں کے مالکان زیادہ تر ہندو تھے۔ تقسیم پنجاب کے وقت یہاں کی ہندو اور سکھ اقلیت شدید حملوں کی زد میں آئی۔ اس کی ایک مثال وزیر آباد سے سیالکوٹ جانے والی ٹرین میں غیر مسلموں کا قتل عام ہے۔ دیگر کئی مواقع کی طرح یہاں بھی ایسے واقعات ہوئے جس میں دوستوں اور تعلق داروں نے کئی بے گناہ جانیں بچائیں۔ مجھے 14 دسمبر 2004 کو دیویندر بھردواج کی ایک ای میل موصول ہوئی جس میں انہوں نے مجھے اپنے نانا کے فرار کی تفصیلات بتائیں:

”میرے نانا جی پنڈت بسنت رام وزیر آباد کی ممتاز شخصیت تھے۔ وہ میونسپل کمیٹی کے امور میں کافی فعال تھے اور شہر کے امیر ترین افراد میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی جان ایک وفادار مسلمان نے بچائی تھی۔ انہوں نے جموں و کشمیر جانے کا ایک طویل راستہ اختیار کیا اور جب وہ جموں پہنچے تو ان کے پاؤں بری طرح سوج چکے تھے۔ ان کے اسی دوست نے نانا کا بچا کھچا سامان بھی پیچھے بھیج دیا۔ حالانکہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی پوری گلی کو آگ لگا دی تھی۔ میرے نانا خط و کتابت کے ذریعے مسلسل اپنے دوستوں کے ساتھ وزیر آباد میں رابطے میں رہے۔ یہ سلسلہ ان کی موت تک جاری رہا۔ وہ ہر روز وزیر آباد کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کے لیے ایک لحاظ سے وقت جامد ہو گیا تھا اور وہ خود کو ذہنی اور جذباتی طور پر اپنے پرانے شہر میں ہی مقیم تصور کرتے تھے۔“

دیویندر بھردواج کا میرے ساتھ رابطہ لاہور کے ایک پاکستانی کے توسط سے ہوا جو اس پوری داستان سے آگاہ تھا حتیٰ کہ اس خاندان کو بھی جانتا تھا جس نے پنڈت بسنت رام کو بحفاظت بھارت منتقل ہونے میں مدد فراہم کی تھی۔ جس شخص کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ سٹاک ہوم میں میرا ایک پرانا واقف کار تھا۔ اکرم وڑائچ اب پاکستان واپس جا چکا ہے اور پنجابی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں کافی متحرک ہے۔ اس نے مجھے درج ذیل تفصیلات 22 دسمبر 2004 کو ارسال کی:

"تقسیم کی ہزاروں کہانیاں ہیں۔ پنڈت جی کی زندگی مستری نصیر نے بچائی تھی۔ مستری صاحب کا انتقال چند برس پہلے ہوا ہے۔ اس کا بیٹا جو قوت بصارت سے محروم تھا کو بھی اپنے والد اور پنڈت بسنت رام کی دوستی کا علم ہے۔ اندھا ہونے کے باوجود وہ وزیر آباد میں پیپلز پارٹی کے جیالے کارکن کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اس نے فوجی اقتدار کے خلاف مظاہروں میں حصہ لیا۔ وہ پولیس کے لاٹھی چارج سے خوفزدہ نہیں۔ آپ کو پنڈت جی کے واقعے کی تفصیل سننے کے لیے اس سے ملنا ہوگا۔"

سیالکوٹ

قدیم شہر سیالکوٹ میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی۔ البتہ ہندو اور سکھ شہر کی اقتصادی سرگرمیوں بالخصوص کھیلوں کے سامان کی تیاری میں کافی متحرک تھے۔ 1941 کی مردم شماری کے مطابق ضلع سیالکوٹ کی آبادی 12 لاکھ سے معمولی کم تھی۔ جس میں 62.90 فیصد مسلمان، 19.41 فیصد ہندو اور 11.71 فیصد سکھ تھے۔ دیگر علاقوں کی طرح سیالکوٹ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات دوستانہ تھے لیکن وسط اگست سے فسادات پھوٹ پڑے جس میں کئی افراد کی جانیں چلی گئیں۔ مرنے والوں میں اکثریت ہندوؤں اور سکھوں کی تھی (Khosla 1989:142-6; SGPC 1991)۔ سیالکوٹ جموں کی سرحد پر واقع ہے اور تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات کی وجہ سے جموں سے بڑی تعداد میں مہاجرین سیالکوٹ آ گئے۔ میری دہلی میں 9 مارچ 2004 کو ایک معمر سکھ سمپورن سنگھ سے ملاقات ہوئی جس کا آبائی علاقہ سیالکوٹ شہر تھا۔ اس نے مجھے سیالکوٹ کے واقعات کی تفصیل یوں بتائی:

"میری پیدائش سیالکوٹ کے کھتری برادری کی ذیلی ذات سچدیو سے تعلق رکھنے والے سکھ گھرانے میں 1921 میں ہوئی۔ جب ہنگامے شروع ہوئے تو میرے اہل خانہ اور میں نے گوردوارہ باؤلی صاحب میں پناہ لی جہاں کئی دیگر سکھ بھی موجود تھے۔ حملہ اس وقت ہوا جب پاکستان بن چکا تھا۔ ہم نے خراب حالات کے باوجود سیالکوٹ میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ میرے والد ڈاکیا تھے اور ہر مذہب کے افراد ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کے پاس دانتوں کے علاج کا ایک خاندانی نسخہ تھا جو وہ ہر کسی کو مفت دیا کرتے تھے۔ اس لیے ہر کسی کو ان کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ حملے کی قیادت پولیس اور مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی وردی میں ملبوس افراد نے کی یہ لوگ 'اللہ اکبر' اور 'یا علی مدد' کے نعرے لگا رہے تھے۔ سکھوں نے بھی جواب میں نعرے لگائے۔ لیکن ہماری تعداد بہت کم تھی اور ہم چاروں طرف سے محاصرے میں تھے۔ ہم نے مزاحمت کی بھرپور کوششیں کی لیکن گولیوں کے سامنے ہماری کوئی نہ چلی۔ کچھ لوگوں نے ڈر کر گوردوارے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ میں اور میرے والد بھی باہر نکل آئے۔ ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ میرے والد بوڑھے تھے اس لیے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بہنیں اور ماں بھی نہیں بھاگ سکتی تھیں۔ کچھ لوگ ہمیں مارنے کی نیت سے ہمارے پیچھے لگے لیکن اچانک ایک بدمعاش جس کا نام یقیناً بشیرا تھا نے دھاڑ کر کہا 'خبردار کوئی انہیں نہ مارے یہ میری پناہ میں ہیں۔' حملہ آور گروہ رک گیا۔ وہ ہمارے علاقے میں ہی رہتا تھا اور میرے والد نے ایک بار اسے دانتوں کے درد کی دوا دی تھی۔ بس اس سے ہماری جان بچ گئی لیکن میری والدہ اور بہنوں کو اس وقت زندہ جلایا جا چکا تھا۔ مجھے آج بھی اپنی ماں یاد آتی ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی اور اس

کی کئی مسلمان سہیلیاں بھی تھیں۔ وہ بہت نیک خاتون تھی۔ اس سال سردیوں میں میری چھوٹی بہن کی شادی ہونے والی تھی جبکہ اس سے چھوٹی سکول جایا کرتی تھی۔ وہ سب ماری گئیں۔ حملے میں کم از کم پچاس افراد کو قتل کیا گیا۔

"ہم مہاجر کیمپ میں کئی ماہ تک مقیم رہے۔ آخر کار فوجی آئے اور نومبر کے شروع میں ہمیں ساتھ بھارت لے گئے۔ میرے والد شدید صدمے میں تھے اور اپنی بیوی اور بیٹوں کی جدائی نہ سہ سکے۔ بہر حال دس سال بعد وہ بھی چل بسے، میں نے ذرا تاخیر سے شادی کی اور دہلی آ گیا۔ آج ہمارے ہمسائے میں مسلمان گھرانے ہیں۔ وہ اچھے لوگ ہیں اور ہمارے خوشگوار تعلقات ہیں لیکن میرے دل پر جو زخم لگا ہے وہ کبھی مندمل نہیں ہو گا۔ میں اپنے بچوں کو یہ واقعات سنانا چاہتا ہوں لیکن شاید انہیں ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

کرنل (ر) ہنس راج چوپڑہ

کھوسلہ اور ایس جی پی سی رپورٹوں میں سیالکوٹ سے فرار ہونے والے ہندوؤں اور سکھوں پر دل فگار حملوں کے کئی واقعات درج ہیں۔ بالخصوص ٹرینوں پر حملوں کا ذکر نمایاں ہے۔ مجھے ایک چشم دید گواہ ایسا مل گیا جس نے وزیر آباد سے سیالکوٹ آنے والی ٹرین کو مسخ شدہ لاشوں سے بھرا دیکھا۔ کرنل (ر) ہنس راج چوپڑہ نے ڈیفنس کالونی نئی دہلی میں اپنی رہائشگاہ پر مجھے 31 مارچ 2004 کو انٹرویو دیا اور اپنے سیالکوٹ سے فرار سے متعلق کہانی سنائی:

"میرا تعلق پنجاب رجمنٹ کے 16 ویں یونٹ سے تھا۔ ہم نے دوسری جنگ عظیم کے دوران برما کے محاذ پر خدمات انجام دیں۔ مارچ 1947 میں میرا تبادلہ راولپنڈی کر دیا گیا۔ وہاں جو فسادات ہوئے یہ دراصل پہلا اشارہ تھا کہ حالات ٹھیک نہیں تھے۔ پھر مجھے سیالکوٹ بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی صورتحال قابو سے باہر تھی۔ سینکڑوں افراد مارے گئے۔ زیادہ تر ہلاکتیں ہندوؤں اور سکھوں کی تھی لیکن چونکہ جوابی کارروائیاں بھی ہوئیں لہذا قدرتی طور پر مسلمانوں کی بھی چند ہلاکتیں ہوئیں۔ یہاں تک کہ کینٹ کے علاقے میں بھی حملے ہوئے۔ میرے سینئر انگریز افسر نے ایک رات مجھے 12 بجے طلب کیا اور بتایا کہ انہوں نے مجھے ہندوؤں اور سکھوں کے پناہ گزین کیمپ کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے (14 اگست کو) سیالکوٹ سے 2، 3 کلو میٹر دور ایک ٹرین کو پٹڑی سے اترے دیکھا۔ اس میں وزیر آباد کے سینکڑوں ہندو اور سکھ سوار تھے جو سیالکوٹ کے ذریعے جموں جانے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ خون ریل کی بوگیوں سے باہر بہہ رہا تھا اور اندر لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ قتل و غارت کی ایسی مثال تو برما کے محاذ جنگ پر بھی نظر نہیں آئی۔ میرے چچا چیت رام چوپڑہ ان دنوں جموں کے گورنر تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں پناہ گزین ان کی طرف بھیج رہا ہوں۔

"میری بیوی پشپا ہنس (مشہور پنجاب لوک گلوکارہ) چاہتی تھی کہ ہم پاکستان چھوڑ کر نہ جائیں کیونکہ اس کا خاندانی تعلق لاہور سے تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ حالات کچھ عرصے بعد معمول پر آ جائیں گے لیکن میرے ایک مسلمان دوست نے مجھے خبردار کیا کہ کچھ شر پسند عناصر میری جان کے درپے تھے اور میں کینٹ کے علاقے میں بھی محفوظ نہیں۔ میں نے اس کا ذکر اپنے اعلیٰ افسر سے کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ میں بھارت اور پاکستان کی بجائے خاموشی سے سرحد پار کر کے جموں چلا جاؤں اور اپنی جان بچاؤں۔ اس نے سیالکوٹ جموں بارڈر تک چند مسلح محافظ میرے ساتھ بھیجے۔ جہاں سے میں جموں کی طرف چل

پڑا۔ وہاں میں نے انڈین ملٹری بیس پر رپورٹ کر دی۔ ان کے پاس میرے بھارت منتقل ہونے سے متعلق میرے کسی فیصلے کا سرکاری ریکارڈ نہیں تھا لیکن بہر حال میں نے انہیں رضامند کر لیا اور فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ انگریزوں نے ہندوستان چھوڑتے ہوئے کوئی گندی چال نہیں چلی۔ انہوں نے امن وامان بر قرار رکھنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن اگست کے وسط تک صورتحال اتنی بگڑ چکی تھی کہ جرائم پیشہ عناصر کو قتل وغارت اور لوٹ مار سے روکنا اور معصوم افراد کو بچانا ناممکن ہو گیا تھا۔''

سیالکوٹ کے دیہی علاقے

جنوری 2005 کو میری بٹالہ اور گورداسپور کے دورے میں کئی ایسے افراد سے ملاقاتیں ہوئیں جن کا تعلق سیالکوٹ کے دیہی علاقوں سے تھا۔ کچھ لوگ بھارتی سرحد پار کر کے بخیر وعافیت جموں پہنچ گئے جبکہ بعض افراد کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ یہاں میں کانگریس پارٹی بٹالہ کے آفس سیکرٹری بھگوان داس کی آپ بیتی بتا رہا ہوں جو انہوں نے مجھے 3 جنوری 2005 کو سنائی:

بھگوان داس

''میں تحصیل پسرور کے تھانہ قلعہ سوبھا سنگھ کے گاؤں میاں ہرپال میں پیدا ہوا۔ یہ ایک بڑا گاؤں تھا جہاں ہر مذہب کے افراد کے ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ میاں ہرپال گاؤں میں برہمن، کھتری، سکھ جاٹ، مسلمان اور عیسائی بھی تھے۔ زیادہ آبادی لوہار برادری کی تھی جو لاہور میں کام کرتے تھے۔ زمیندار سکھ جاٹ تھے۔ ہم رام داسی ہندو تھے۔ میرے والد چودھری جگت رام کانگریس پارٹی کے سرگرم ورکر تھے۔ گاؤں میں سیاسی سرگرمیاں غیر معمولی بات تھی لیکن دیہات میں سیاسی شعور بیدار ہونا شروع ہو چکا تھا۔ میں گاؤں سے 5 کلومیٹر دور سکول پڑھنے جایا کرتا تھا۔ یہ صرف چوتھی کلاس تک سکول تھا۔ استاد یا تو برہمن تھے یا مولوی۔ دونوں بہت اچھے تھے اور نہایت شفقت اور توجہ کے ساتھ ہمیں پڑھاتے تھے۔ جب حالات خراب ہونا شروع ہوئے تو گاؤں کے ہندوؤں اور سکھوں نے عہد کیا کہ اگر حملہ آور ان کے ہم مذہب ہوئے تو مسلمانوں سے پہلے وہ ان کا مقابلہ کریں گے جبکہ مسلمانوں نے بھی قسم کھائی کہ حملہ آور اگر مسلمان ہوئے تو پہلے وہ ان کا سامنا کریں گے۔ پھر ایک دن یہ افواہ پھیلی کہ سکھ جتھے ہمارے گاؤں کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ جس پر گاؤں کے سکھ اور ہندو باہر نکل آئے لیکن یہ افواہ غلط ثابت ہوئی۔ اس کی بجائے ان کا تصادم پھاگووال (قریبی گاؤں) کے مسلمانوں سے ہو گیا اور کئی افراد مارے گئے ۔کچھ لوگوں نے کھیتوں میں چھپ کر جان بچائی۔ گاؤں کے باقی ماندہ سکھوں نے بھی باہر جا کر ان کا مقابلہ کرنا چاہا لیکن وہ تعداد میں زیادہ تھے جس پر یہ لوگ واپس آ گئے۔ ایک دن ایک بڑے گروہ نے گاؤں پر دھاوا بول دیا۔ اصل میں ہمارے ہی گاؤں کی بعض کالی بھیڑوں نے انہیں حملے کی دعوت دی تھی۔ ان میں سے ایک عبدل تیلی تھا۔

''حملہ آوروں کا سرغنہ علاقے کے مشہور اور بڑے گاؤں علی پور سیداں کا مہدی شاہ تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کئی ہندوؤں اور سکھوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ گاؤں کے دیگر سادات بہت اچھے لوگ تھے۔ ایک اور بدمعاش چک قریشیاں کا قائم بروالا تھا۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ ہمارے گاؤں کے مسلمانوں نے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن حملہ آور غالب آ گئے۔ لاتعداد ہندوؤں اور سکھوں کو قتل کیا گیا اور بربریت میں مہدی شاہ سب سے آگے تھا۔ دو سکھوں نے بھاگ کر

کراولی میں موجود فوج کو اطلاع دی۔ یہ پاکستان کی حدود میں نہر کے پاس تھی۔ پھر بھارتی فوج نے آ کر ہمیں بچایا۔ زیادہ تر سکھ مارے گئے۔ 150 تو صرف ہمارے گاؤں کے تھے۔ چند عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کیا گیا۔"

رچپال سنگھ

میں نے دسمبر 2004 میں ضلع فتح گڑھ صاحب (سابق پٹیالہ ریاست کا حصہ) کے علاقے سرہند کے قریب گاؤں آدم پور کا دورہ کیا تاکہ ضلع راولپنڈی کے علاقے کلر سیداں کے چودھری روشن دین نے گاؤں میں مسلمانوں کے بدنام زمانہ قتل عام کا جو دعویٰ کیا تھا اس کی تصدیق کر سکوں۔ ہتیش گوسین اور ورندر سنگھ میرے ساتھ تھے۔ سیالکوٹ کے کئی سکھ اس گاؤں میں مقیم تھے۔ اگرچہ مقامی افراد بھی یہاں تھے۔ گاؤں کے سرپنچ رچپال سنگھ نے مجھے یہ کہانی سنائی:

"میں سیالکوٹ کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوا۔ جہاں دیگر علاقوں میں قتل و غارت کا بازار گرم رہا وہاں ستمبر تک ہمارا علاقہ پرامن ہی رہا۔ باہر سے ایک حملہ ضرور کیا گیا لیکن ہمارے گاؤں کے نوجوان مسلمانوں نے باہر نکل کر دفاعی دیوار قائم کر دی اور کہا کہ ہماری لاشوں سے گزر کر ہی تم لوگ غیر مسلموں کو نشانہ بنا سکتے ہو۔ چنانچہ خطرہ ٹل گیا اور کسی نے حملے کی جرأت نہ کی۔ پھر مسلمان ہمیں ڈسکہ کے پناہ گزین کیمپ میں چھوڑ آئے۔ کیمپ سے ہم اکتوبر کے اوائل میں بھارت روانہ ہوئے۔ 80، 81 دیہات کے ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل بڑا قافلہ جموں کی سرحد کی طرف روانہ ہو گیا، ہمارے خیر خواہ مسلمان ہمارے ساتھ سرحد تک آئے۔ ان میں سے ایک چودھری فتح داد اور اس کے بیٹے صادق، غلام حسن چیمہ اور فتح دین ملتا کے نام آج بھی یاد ہیں۔ یہ بہادر لوگ تھے جنہوں نے ہمیں اپنے بھائیوں کی طرح بچایا۔ ان میں کئی ہماری طرح جاٹ تھے۔ شاید برادری ایک ہونے کی وجہ سے بھی انہوں نے ہماری حفاظت کرنا ضروری سمجھا ہو گا لیکن یہ بات مکمل طور پر درست نہیں۔ جتنا مجھے یاد ہے۔ ہمارے کسی آدمی کو قتل نہیں کیا گیا۔ ہم 20 ہزار افراد کے قافلے نے بحفاظت سرحد پار کی۔ ہمیں پہلے کپور تھلہ بھجوایا گیا پھر یہاں آدم پور میں زمین الاٹ کر دی گئی۔ سرحد کی دوسری طرف میں نے جو قتل و غارت کے مناظر دیکھے وہ بیان کرنا ممکن نہیں۔"

انٹرویوز

سوم آنند، رتن چند اور رام پرکاش، نئی دہلی اکتوبر 1999

ڈاکٹر پریم صوبتی، صدر بھارت کے ذاتی معالج، دہلی 31 اکتوبر 2001

مسز کانتا سنگھ لتھرا، سالم، اوریگان 15 جولائی 2002

پروفیسر ایمریٹس شوکت علی، میساچوسٹس 29 جولائی 2002

سردار شوکت علی، لاہور 3 مئی 2003

کیول کرشن طولی، نئی دہلی 8 مارچ 2004، بذریعہ فون وضاحت 30 جنوری 2006

سمپورن سنگھ سچدیو، کدھر ناتھ ملہوترا، نئی دہلی، پیارا سنگھ نولکھ، موگا مارچ 2004

گربچن سنگھ ٹنڈن اور مسز ساوتری دت چیڑ، نوئیڈا 29 مارچ 2004

کرنل ہنس راج چوپڑہ، نئی دہلی 29 مارچ 2004

دیوندر بھردواج، بذریعہ ای میل، امریکہ 14 دسمبر 2004

اکرم وڑائچ، بذریعہ ای میل، لاہور 22 دسمبر 2004

کلب علی شیخ، لاہور 25 دسمبر 2004

بھگوان داس، بٹالہ 3 جنوری 2005

سردول سنگھ ورک، فقیر سنگھ ورک، شمشیر جیت سنگھ، ضلع کور کھشیتر، 8 جنوری 2005

چودھری انور عزیز، لاہور 15 دسمبر 2006

چودھری توکل اللہ ورک اور چودھری نذیر احمد ورک، شیخوپورہ 30 دسمبر 2005

References

Anand, S., *Lahore: Portrait of a Lost City*, Lahore: Vanguard Books, (1998).

Jeffrey, Robin. *'The Punjab Boundary Force and the Problem of Order: August 1947', Modern Asian Studies*, Vol. VIII, No. 4, (1974).

Kaushik, 'Compliments returned', *The Tribune*, Chandigarh, 31 Aug. 2011.

Khan, Fazal Muqeem Khan (Major-General), *The Story of the Pakistan Army*, Karachi, Lahore: Oxford University Press, (1964).

Khosla, Gopal Das, *Stern Reckoning: A Survey of the Events Leading Up To and Following the Partition of India*, New Delhi: Oxford University Press, (1989).

Mittal, G., *Lahore ka jo Zikr Kiya: Aap Biti* (*Remembering Lahore: An Autobiography*), Lahore: Book Home, (2003).

Nevile, Pran, *Lahore, a Sentimental Journey*, Delhi and Karachi: Allied Publishers Ltd, (1993).

Taqi-ud-din, H, *Tarikh ki Adalat Mein*, (*In the Court Room of History*), Gujranwala: Jeenay Do Publications, (1999).

Singh, Kirpal. *The Partition of the Punjab*, Patiala: Punjabi University, (1989).

Talib, S. Gurbachan, *Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab 1947*, New Delhi: Voice of India (1991).

Shafique, Khurram Ali (compiler) *The Chronicle of Pakistan*,
http://therepublicofrumi.com/chronicle/1947_09.htm, (accessed on 13 December 2010).

Official documents

Disturbances in the Punjab, Islamabad: National Documentation Centre, (1995).

15

راولپنڈی ڈویژن

انگریز دور میں راولپنڈی ڈویژن شمال مغربی اضلاع گجرات، شاہ پور، راولپنڈی، اٹک اور میانوالی پر مشتمل تھی۔ یہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ سکھوں اور ہندوؤں کی مجموعی تعداد 14 فیصد بنتی تھی۔ راولپنڈی ڈویژن پاکستان کے حصے میں آئی۔ میں نے پنجاب کی تقسیم اور اس عمل کے دوران روح فرسا ہولوکاسٹ کی جامع منظر کشی کی تحقیق کرتے ہوئے کئی کہانیاں جمع کی ہیں۔

راولپنڈی شہر

اگرچہ راولپنڈی شہر اور گردونواح کے دیہی علاقوں میں بدترین فرقہ وارانہ فسادات دیکھنے میں آئے۔ لازمی بات ہے کہ دیہات میں سکھوں پر یک طرفہ حملے ہی ہوئے تھے تاہم مارچ 1947 کے بعد حالات مستحکم ہو گئے تھے۔ البتہ اگست میں صورتحال ایک بار پھر بگڑ گئی۔ اگرچہ ڈپٹی کمشنر شیخ انوار الحق نے معاملات سنبھالنے کی جابکدستی سے کوشش کی لیکن ان کے ماتحت سرکاری ملازمین اور پولیس نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ جیسا کہ کھوسلہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے(196 :1989)۔ محمد فیروز ڈار جن کی راولپنڈی کے بارے میں کہانی قبل ازیں بیان کی جاچکی ہے کا کہنا ہے کہ بالخصوص جولائی سے ستمبر 1947 کے درمیان کا عرصہ میرے جیسے کسی گیارہ سالہ بچے کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔

محمد فیروز ڈار

"یہ جولائی کے آخر یا اگست کے اوائل کے دن ہوں گے کہ راولپنڈی میں بہیمانہ قتل اور لوٹ مار کے واقعات میں ایک بار پھر تیزی آگئی۔ ہم آفیسرز کالونی سے ریلوے ورکرز کالونی کے کوارٹر منتقل ہو گئے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ایک صبح میں دودھ خریدنے گیا۔ میرے ہم عمر کچھ لڑکے میرے پاس جمع ہو گئے اور بتایا کہ کئی افراد کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے اور لاشیں ریلوے کالونی کی مسجد سے 200 میٹر دور پڑی ہیں۔ یہ ایک انتہائی روح فرسا منظر تھا۔ ایسا منظر میں نے پہلے یا بعد میں کبھی نہیں دیکھا۔ شیر خوار بچوں کی کھوپڑیاں دیوار سے مار کر پھوڑ دی گئی تھیں جبکہ بڑوں کی لاشیں ٹکڑے ٹکڑے کی گئی تھیں۔

"وہاں سے واپسی پر میں نے آفیسرز کالونی میں دو ہندو بھائیوں کی ملکیت کو دیکھا۔ اوم اور پرکاش محکمہ ریلوے کے مشہور اتھلیٹ تھے۔ ان کا گھر جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ ایک انگریز افسر نے دونوں بھائیوں اور ان کے اہلخانہ کی جان بچائی۔ ان کے مسلمان اتھلیٹ دوست حنیف رضا اور باؤر فیع بے بسی سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے مسلمان غنڈوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ البتہ ایک اور ہولناک منظر ابھی میرا منتظر تھا۔

"ہندوستان سے ہزاروں مہاجرین راولپنڈی آنا شروع ہو گئے تھے۔ ان کے ساتھ وہاں بہیمانہ سلوک کیا گیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ان کا نقصان پاکستان میں غیر مسلموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ ریلوے نے راولپنڈی سے بڑی تعداد میں بھارت جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کے لیے خصوصی ٹرینیں چلائیں۔ مجھے یاد نہیں کہ راولپنڈی چھوڑنے والے میرے کسی واقف کار ہندو یا سکھ کو دوبارہ کبھی اس شہر میں واپس آنا نصیب ہوا ہو۔ خود میں پاکستان سے گزشتہ چالیس سال سے دور ہوں۔"

کملا سیٹھی

"میرے والد سر گوکل چند نارنگ ہندو مہا سبھا پنجاب کے لیڈر تھے۔ میری شادی 1937 میں ایک فوجی افسر سے ہوئی۔ دوران سروس ہماری پوسٹنگ مختلف مقامات پر ہوئی۔ راولپنڈی میں ان کا تبادلہ 1945 میں ہوا جہاں ہم 3 اکتوبر 1947 تک مقیم رہے۔ ان 2 برسوں کے دوران فضا میں پایا جانے والا تناؤ محسوس کیا جا سکتا تھا لیکن فوجی بنگلوں میں کوئی غیر معمولی واقعہ شاید ہی دیکھنے میں آیا ہو۔ ہمارے ملازمین شہر سے واپسی پر جلسے جلوسوں اور فرقہ وارانہ تصادم کی خبریں لایا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مارچ میں کچھ عرصے کے لیے راولپنڈی میں حالات خراب ہوئے اور بالخصوص دیہی علاقوں میں ہجوم کی طرف سے سکھوں اور ہندوؤں کو انتہائی تشدد کا نشانہ بنایا گیا لیکن چھاؤنی کے علاقے میں ہمیں کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ پھر تقسیم ہند کا عمل ہوا اور میرے شوہر جنہوں نے بھارت جانے کا فیصلہ کیا تھا کی پوسٹنگ دہلی کر دی گئی۔

"چھاؤنی میں کافی دوستانہ ماحول تھا۔ گل شیر علی نون بھارت سے پہلے ہی پاکستان منتقل ہو چکا تھا۔ ان کے خاندان اور ہم کئی ماہ تک ایک ہی مکان میں رہے۔ نصف حصہ ہمارے پاس اور نصف ان کے پاس تھا۔ چھاؤنی میں بڑی تعداد میں انگریز بھی تھے۔ اگست اور بعد میں راولپنڈی میں کافی قتل و غارت ہوئی۔ ہمارے ایک انگریز دوست بل گراہم جن کے ساتھ ہم برج کھیلتے تھے نے ایک شام ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند شر پسندوں نے ہمارے قریبی علاقے میں حملہ کر دیا تھا۔ وہ انگریز پوچھنے آیا تھا کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت تو نہیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہم نے عدم تحفظ محسوس کیا۔ پنجاب کی تقسیم تمام پنجابیوں کے لیے انتہائی بڑا صدمہ تھا۔ یہ صرف روایتی مڈل کلاس کا ہندو طبقہ تھا جو مسلمانوں کے ساتھ اچھوتوں کا برتاؤ کرتا تھا جبکہ تعلیم یافتہ طبقے میں یہ تصور عرصہ دراز سے متروک ہو چکا تھا۔ میرے والد نے ایک جلسے سے خطاب میں 1932 میں خبردار کر دیا تھا کہ تقسیم ہند کا نتیجہ بڑے پیمانے پر قتل عام کی صورت میں نکلے گا اور پھر یہی کچھ ہوا۔"

بشام کمار بکشی

"ہم راولپنڈی میں سید پور روڈ پر رہتے تھے۔ اگست 1947 میں میری عمر گیارہ سال تھی۔ مارچ کے فسادات کافی شدید تھے۔ راولپنڈی شہر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی قریب قریب برابر تھی۔ ان دنوں میں لال کرتی کے ایک سکول میں پڑھتا تھا۔ نواحی دیہات کے ہجوم نے ہمارے علاقے کی طرف دھاوا بولا لیکن وہ لوگ ہمارے محلے کی طرف نہ آئے۔ یہ فسادات دس روز تک جاری رہا۔ پھر ہم جموں چلے گئے جہاں میرے ننھیال رہتے تھے۔ وہاں ہم کئی ماہ تک مقیم رہے۔ پھر دہلی اور دیگر علاقوں سے مسلمان راولپنڈی آنا شروع ہو گئے۔ میرے والد رادھا کرشن نے پاکستان میں

ہی رہنے کے حق میں لکھ کر دے دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم آئندہ بھی یہاں رہ سکتے ہیں۔ میری دادی ہمارے آبائی گاؤں مٹور میں رہتی تھیں۔ گاؤں میں ہمارے ہمسایوں نے کسی حملہ آور کو انہیں چھونے کی اجازت نہ دی۔ 1986 میں جب میں نے مٹور کا دوبارہ دورہ کیا تو بوڑھے افراد نے مجھ سے پوچھا کہ کیا دادی بخیر وعافیت راولپنڈی پہنچ گئی تھیں۔ ہمارے خاندان کا کوئی فرد قتل نہیں ہوا تھا۔ فسادات کے دوران سکھوں اور ہندوؤں کو بچانے میں راولپنڈی کے خاکساروں نے شاندار کردار ادا کیا تھا۔

''ڈاکٹر بدھ سنگھ نے 29 اگست کو ایک طیارہ چارٹر کیا۔ میرے والد نے پہلے مجھے طیارے پر دہلی بھجوایا پھر میری بہن سکھ فوجیوں کی سکیورٹی میں ٹرین کے ذریعے آئی۔ وہاں سے انبالہ پہنچنے میں ہمیں 10، 12 دن لگے۔ میرے والد اکتوبر میں بھارت آئے۔ میں، میری والدہ اور بہن میرٹھ میں مقیم تھے۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ کون کہاں ہے۔ اس سال بہت بارشیں ہوئیں۔ پھر ہم نے ریڈیو پر ایک دوسرے کے بارے میں خیر خبر لی اور وسط اکتوبر میں ہم دوبارہ آپس میں مل گئے۔ میرے والد انتہائی سیکولر اور روشن خیال انسان تھے۔ انہوں نے گاؤں میں کنواں کھدوانا شروع کیا تو ہمارے چند رشتہ دار آئے کہ کنویں کا پانی صرف برہمنوں کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ میرے والد نے یہ بات سن کر کنویں کی کھدوائی روک دی اور مٹی دوبارہ بھر دی گئی۔ یہ دیکھ کر برہمنوں کی سوچ تبدیل ہوئی جس کے بعد وہ کنواں ہر خاص وعام کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ یہ کنواں اب بھی موجود ہے۔ میں نے اپنی بیوی کے ساتھ 1992 میں راولپنڈی کا دورہ کیا۔ ہمارا کوچوان خان بہادر بہت اچھا انسان تھا۔ ہم نے اس کا اتہ پتہ لینے کی کوشش کی لیکن وہ کافی عرصہ پہلے انتقال کر چکا تھا۔ البتہ اس کا چھوٹا بھائی رمضان اب بھی زندہ ہے۔ رمضان میرا بچپن سے دوست تھا۔ ہماری آمد پر اس نے رشتہ داروں کو جمع کر کے ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا۔ وہاں اس نے رشتہ داروں کو مخاطب ہو کر کہا کہ 'یہ لوگ جو ہمارے مہمان ہیں ان کا تعلق ہندوؤں کی اونچی ذات سے ہے۔' ایک دن میں اس (بشام کمار) کے برآمدے میں بیٹھا تھا تو ان کا والد آیا اور مجھے اندر لے گیا اور چائے پلوائی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ بہت اچھے لوگ تھے۔

''میں نے اپنی بیوی کو کہا کہ دیکھو ہندو جب اچھوت کا سلوک کرتے ہیں تو ان مسلمانوں کو بہت برا لگتا ہے۔ دونوں مذاہب کے درمیان دوری میں ہندوؤں کے رویے نے بڑا کردار ادا کیا۔ البتہ مسلمانوں نے اچھوتیت کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ 1986 میں ہم گاؤں گئے لیکن 92-1991 میں ہمیں حکومت پاکستان کی طرف سے اجازت نہ ملی۔ انڈین فوج کے افسر جنرل شاہنواز خان ہمارے گاؤں کے بلکہ ہمسائے تھے۔''

راولپنڈی کے دیہی علاقے

پنجاب میں ہونے والے فسادات کے نتیجے میں کیمپبل پور، راولپنڈی اور جہلم اضلاع سے سکھوں کی بہت بڑی تعداد وسطی اور مشرقی پنجاب میں منتقل ہوئی۔ جو لوگ ابھی تک وہیں مقیم تھے وہ بھی خاموشی سے نکل رہے تھے اور اگست 1947 تک بیشتر افراد نقل مکانی کر چکے تھے۔ اس کے باوجود جو سکھ وہاں رہے۔ انہیں حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ ان متاثرہ افراد کو مشرقی پنجاب کی طرف جاتے ہوئے سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

گجرات

گجرات میں مسلمان غالب اکثریت (85.58 فیصد) میں تھے جبکہ ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی ملا کر 14 فیصد بنتی تھی۔ گجرات میں بیشتر دکانوں اور کاروبار کے مالک ہندو تھے۔ البتہ سکھوں کی بھی کافی دکانیں اور کاروبار تھے۔ مارچ 1947 میں زیادہ تر ہندوؤں اور سکھوں کو راولپنڈی اور کسی حد تک جہلم میں نشانہ بنایا گیا لیکن وسط اگست سے گجرات میں بھی غیر مسلموں پر حملوں میں تیزی آگئی تھی۔ کئی معمر افراد نے مجھ سے بات چیت کے دوران اعتراف کیا کہ وہ ان حملوں میں ملوث رہے۔ درج ذیل کہانی سے اس کی مفصل تصویر کشی ہوتی ہے۔

کرنل (ر) نادر علی

''ہمارے خاندان نے گجرات میں کانگریس پارٹی کی ہمیشہ حمایت کی۔ یہ تاثر غلط ہے کہ مسلمان کانگریس پارٹی میں شمولیت سے احتراز کرتے تھے۔ جو لوگ ہندوستان کی انگریزوں سے آزادی پر یقین رکھتے تھے وہ یا تو کانگریس میں یا خاکسار یا احرار جیسی اسلامی تحریکوں میں شامل تھے۔ ہاں کچھ افراد کیمونزم پر بھی یقین رکھتے تھے۔ گجرات میں کانگریس پارٹی کا ایسا نیٹ ورک تشکیل دیا گیا تھا جس میں ہندو، مسلمان حتیٰ کہ کچھ سکھ بھی سیاسی طور پر منظم تھے۔ مسلم لیگ شروع سے ہی نعرے باز اور انگریزوں کے ماضی میں وفادار لوگوں پر مشتمل تھی اور یہ لوگ مسلمانوں کی الگ ریاست کے خواہاں تھے۔ گجرات سے بڑے پیمانے پر پہلی نقل مکانی جنوری 1947 میں ہوئی۔ اس سے معاشرے کے تمام طبقوں میں فرقہ واریت کا زہر پھیل گیا تھا لیکن غیر مسلموں کے خلاف پر تشدد کارروائیاں تقسیم سے چند روز پہلے ہی شروع ہوئیں۔ مجھے شہر کے بڑے بازار پر جنونی عناصر کے حملے کا منظر آج بھی یاد ہے۔ زیادہ تر کاروبار ہندوؤں کا تھا۔ یہ لوگ نہایت دیانتدار اور مہذب تھے۔ حملہ آوروں میں نمایاں تھورے شاہ تھا۔ سادات خاندان کے اس شخص کا تعلق نواحی گاؤں معین الدین پور سے تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کئی ہندوؤں کو چھرے گھونپے اور دکانیں لوٹیں۔ انہوں نے لوٹ مار کے گروہ تشکیل دے رکھے تھے اور ان کی کارروائیوں سے بے گناہ غیر مسلم گجرات سے فرار ہو رہے تھے۔ ان لوگوں نے قریبی قصبے جلال پور جٹاں پر بھی حملے کر کے متعدد ہندوؤں کو جان سے مار ڈالا۔ ان جرائم پیشہ عناصر کے خلاف کبھی قانونی کارروائی نہیں کی گئی۔''

مہندر ناتھ کھنہ

3 جنوری 2005 کو امرتسر کے موہن ہوٹل کی لابی میں میری ملاقات ایک معمر ہندو مہندر ناتھ کھنہ سے ہوئی جس کا آبائی تعلق ضلع گجرات سے تھا، انہوں نے مجھے اگست 1947 میں گجرات میں سکھوں اور ہندوؤں کے قتل عام کی دل دہلانے والی تفصیل سنائی:

''میں 30 مئی 1926 کو گجرات میں پیدا ہوا۔ مین بازار میں میرے والد کی دکان تھی۔ ہمارا بنیادی کاروبار کپڑے کی فروخت کا تھا لیکن ہم ساہوکاری بھی کرتے تھے۔ بیشتر دکانیں کھتری ہندوؤں کی ملکیت تھیں۔ میرے والد دمے کے مریض تھے۔ ہمارا خاندان کافی بڑا تھا اور میرے دادا اور دادی بھی ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ ہم تین بھائی

اور تین بہنیں تھیں۔ میری خالہ بھی بیوہ ہو کر ہمارے ساتھ رہ رہی تھیں۔ بہر حال ہمارا کنبہ کافی خوشحال تھا۔ گجرات کے قریبی دیہات میں ہمارے رشتہ دار رہتے تھے۔ میرے ماما اگرچہ محکمہ ریونیو میں ملازم تھے تاہم ان کا گھر شہر کے دوسرے حصے میں واقع تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کافی خوشگوار تھے۔ حقیقت میں ہمارے زیادہ تر گاہک بھی مسلمان تھے اور ہمیں ان سے لین دین میں کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ میں میونسپل کمیٹی سکول میں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ وہاں ہر مذہب کے بچے ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ شہر میں پہلی بار تناؤ اس وقت پیدا ہوا جب مسلم لیگ نے (23 مارچ) 1940 میں لاہور میں جلسہ کیا۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں بازار میں لوگ یہ بحث کرتے رہے کہ اگر ایک مسلمان ریاست وجود میں آئی تو وہاں ان کے کاروبار محفوظ نہیں ہوں گے لیکن بہر حال کوئی شخص خوفزدہ نہیں تھا اور زندگی معمول کے مطابق ہی رہی۔

''ایک نوجوان لڑکی عموماً ہماری دکان کے سامنے سے گزر کر جایا کرتی تھی۔ اگرچہ وہ برقعہ پہنے ہوتی تھی لیکن کبھی کبھار میں اس کی چہرے کی جھلک دیکھ لیا کرتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور اسے بھی علم تھا کہ میں ہمیشہ اسی کی طرف دیکھتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اس کے والدین کی صحت ٹھیک نہیں تھی کیونکہ اس کی ماں اور باپ دونوں سہارا لے کر چلتے تھے۔ وہ زیادہ امیر بھی نہیں ہو سکتے تھے لیکن ان دنوں کسی لڑکی سے بات چیت کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا اور کسی اجنبی لڑکی سے گفتگو تو بالکل ممکن نہیں تھی۔ کسی ہندو لڑکی سے بھی بات نہیں کی جا سکتی تھی کجا کہ مسلمان لڑکی کو مخاطب کیا جائے۔

''جنوری 1947 کے آخر میں مسلمانوں نے گجرات میں بڑے پیمانے پر تحریک شروع کر دی۔ اگرچہ مظاہرین نے تشدد سے گریز کیا لیکن وہ نعرے لگاتے ہوئے دھمکی دیتے تھے کہ پاکستان میں اسلام نافذ کرتے ہوئے سکھوں اور ہندوؤں پر بھی شریعت کا نفاذ کیا جائے گا۔ مجھے یاد ہے کہ ان دھمکیوں سے ہندوؤں میں سخت تشویش پھیل گئی۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ کسی حملے سے بچنے کے لیے ہندوؤں کے بڑے مندر کی حفاظت کی جائے گی۔ بازار میں ہم اکثریت میں تھے لیکن ایک قسم کے عدم تحفظ کا احساس بہر حال ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ کئی ہندو خاندان کاروبار فروخت کر کے کسی اور جگہ پر رشتہ داروں کی طرف منتقل ہو گئے تھے لیکن ہمارے تو سارے رشتہ دار بھی گجرات کے ہی تھے۔ میرے والد کو مستقبل کے بارے میں تشویش لاحق تھی کیونکہ میں ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور میری عمر بیس سال تھی۔ 1947 میں میری سب سے چھوٹی بہن صرف سات برس کی تھی لیکن ہمارے پاس اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور گجرات سے نقل مکانی کا آپشن ابھی تک گھر میں زیر بحث نہیں آیا تھا۔

''جولائی میں تشدد کے واقعات رونما ہوئے اور یہ افواہ پھیل گئی کہ مسلمان ہندوؤں پر حملہ کرنے ہی والے تھے۔ پھر اگست میں آزادی سے چند روز پہلے بتایا گیا کہ بازار میں حملہ کیا گیا تھا۔ کچھ دکانداروں کی ہلاکت سے سراسیمگی پھیل گئی۔ چونکہ میری دادی بیمار اور ضعیف تھی جبکہ والد دمے کے مریض تھے چنانچہ ان کے لیے گھر بار چھوڑنا بہت مشکل تھا۔ پہلے حملے کے بعد اکثر ہندوؤں نے نقل مکانی شروع کر دی تھی۔ پھر عید الفطر کے دو روز بعد (بدھ، 20 اگست) ہمارے گھر پر حملہ کر دیا گیا۔ یہ اگرچہ ہندوؤں کی اکثریت والا علاقہ تھا لیکن یہاں کے بیشتر باسی علاقے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ کچھ اچھے تن و توش والے نوجوان ہماری حفاظت کے لیے مامور تھے۔ حملہ کرنے والے اسی علاقے کے غنڈے تھے۔

ہم ان سب کو جانتے تھے لیکن اس روز وہ جارحانہ موڈ میں تھے۔ میرے والد ان سے بات چیت کرنے کے لیے گھر سے باہر گئے۔ حملہ آور چاہتے تھے کہ ہم تمام زیورات اور رقم ان کے سپرد کر دیں۔ میرے والد نے اس شرط پر تمام سامان ان کے حوالے کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ ہمیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچایا اور کہا کہ ہم فوراً وہاں سے نکل جائیں۔ ہم ریلوے سٹیشن کی طرف چلنا شروع ہو گئے جو تھوڑے فاصلے پر تھا۔ وہ غنڈے تھوڑی دیر تک ہمارے ساتھ چلے پھر کہیں اور لوٹ مار کرنے کے لیے واپس روانہ ہو گئے۔ راستے میں کئی اور سکھ اور ہندو ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ گجرات فرقہ وارانہ تشدد سے جل رہا تھا اور لاشیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ میرے دادی پاؤں پر چل نہیں سکتی تھیں، اس لیے انہیں مندر میں چھوڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ میرے دادا نے بھی جانے سے انکار کر دیا اور ہمیں کہا کہ تم لوگ چلے جاؤ۔ میرے والد رونے لگے اور التجا کی آپ تھوڑی سی ہمت کر کے ہمارے ساتھ ہی چلیں۔

''ہم سٹیشن کے قریب ہی پہنچے تھے کہ ایک بڑا ہجوم 'یا علی، یا علی' کے نعرے لگاتا ہندوؤں اور سکھوں کے لگ بھگ 500 افراد پر مشتمل قافلے پر ٹوٹ پڑا۔ ہمارے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے والد پر اپنی آنکھوں سے بھالے سے وار ہوتا دیکھا۔ میری والدہ انہیں بچانے آگے بڑھیں تو کسی نے ان کے سر پر ہتھوڑے سے حملہ کر دیا۔ ان کی کھوپڑی چیخ گئی تھی اور وہ نیچے گر گئی۔ میں خوفزدہ ہو کر سٹیشن کی طرف دوڑا۔ کچھ اور لوگ بھی میرے پیچھے جان بچانے کے لیے بھاگے لیکن میرے بہن بھائیوں سمیت دیگر کم عمر افراد اور بوڑھے ایسا نہ کر سکے۔ اس روز گجرات میں صحیح معنوں میں قتل و غارت کا کھیل کھیلا گیا۔

''ہم میں سے کچھ نوجوان مل کر شمال (جہلم) کی طرف سے آنے والی ٹرین کی ایک بوگی میں سوار ہو گئے۔ ٹرین لاہور جا رہی تھی۔ خوش قسمتی سے بعض انگریز بھی ڈبے میں بیٹھے تھے۔ اس لیے گاڑی بحفاظت لاہور پہنچ گئی۔ لاہور سٹیشن پر بھی حالات انتہائی دگرگوں تھے۔ لیکن ہماری ملاقات چند گورکھا فوجیوں سے ہوئی جو ہمیں ساتھ لے کر ڈی اے وی کالج میں قائم کیمپ میں لے گئے۔ کیمپ کی حالت زار نہایت خستہ تھی۔ تقریباً ہر کسی کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار کھو چکا تھا۔ اور لگتا تھا کہ ہم کسی مرگ پر وہاں جمع تھے۔ ہم ستمبر کے پہلے ہفتے تک لاہور میں رہے۔ میں ہر کسی سے پوچھتا کہ کوئی گجرات سے آیا ہے کہ نہیں۔ کچھ خاندان آئے بھی تھے لیکن میرا کوئی اہل خانہ ان میں شامل نہیں تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ مندر جہاں میرے دادا اور دادی نے پناہ لی کو آگ لگا دی گئی اور اندر موجود تمام افراد زندہ جل گئے۔ ہم امرتسر چلے آئے جہاں مسلمانوں کا ہماری طرح برا حال تھا۔ ہم سب اندر سے نہایت دکھی تھے۔ ہم میں ہر کسی کا قریبی رشتہ دار کھو چکا تھا۔ پھر ہم سے کسی نے کہا کہ ہمیں مسلمانوں سے انتقام لینا چاہیے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے سمیت کئی گجراتی ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملوں میں حصہ لیا۔ کتنے لوگوں کا خون کیا تھا؟۔ میرا خیال ہے کہ کلہاڑے سے پہلا قتل کرنے کے بعد میں نے گنتی چھوڑ دی۔ اب اس بات کو طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ سب قتل و غارت فضول تھا لیکن ہوا۔ میں کبھی شادی نہیں کر سکا کیونکہ میں دکھ اور صدمے سے کبھی نہیں نکل سکا۔ میری زندگی تو 1947 میں ہی بکھر کر رہ گئی تھی۔''

گجرات کے دیہی علاقے

جگن ناتھ

"میں گجرات شہر کے مغرب میں واقع گاؤں کیرووال میں 1926 میں پیدا ہوا۔ مین بازار میں میرے والد کی کپڑے کی دکان تھی۔ گاؤں میں تین ہندو خاندان تھے جبکہ باقی تمام گھر سادات مسلمانوں کے تھے۔ ہمارے ان کے ساتھ شاندار تعلقات تھے۔ پورا گاؤں ایک بڑے خاندان جیسا تھا جس میں ہر مذہب کے افراد ایک دوسرے کے تہواروں اور خوشیوں میں شامل ہوتے۔ اگرچہ ہم نے گجرات شہر میں کشیدگی کی خبریں سنی تھیں لیکن ہمارے گاؤں میں کشیدگی کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ اچانک عید کے دن (سوموار 18 اگست) ہم نے سنا کہ سکھوں کے جتھے مسلمانوں پر حملے کے لیے آرہے تھے۔ یہ دراصل ہم پر حملے کا بہانہ بنایا گیا تھا۔ ہم میں سے اکثر نے دکانیں کرائے پر لی تھیں اور مالکان مسلمان تھے جب حملہ ہوا تو ہم لوگ دکانیں کھلی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ حملہ آوروں کا تعلق گاؤں سے نہیں تھا۔ سیدوں نے حملہ نہیں کیا تھا۔ جب حالات زیادہ بگڑ گئے تو انہوں نے ہمیں کہا کہ ہم مسلمان بن جائیں۔ ہم نے چند روز کے لیے (یعنی جھوٹی موٹی) ان کی بات مان لی لیکن جب فوج ہمارے گاؤں میں آئی تو ہمیں گجرات کے ایک پناہ گزین کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ میرا کوئی قریبی رشتہ دار ہنگاموں میں نہیں مرا۔ ہم گجرات سے 25 ستمبر کو روانہ ہوئے۔ سفر سست رفتار اور تھکا دینے والا تھا۔ ہم نے ایک رات گوجرانوالہ میں جبکہ دوسری ایک نہر کے کنارے گزاری۔ ایک فوجی کیپٹن ہمارے ساتھ تھا۔

"وہ ہمیں ننکانہ صاحب لے گیا جہاں ہم نے دوراتیں بسر کیں۔ اس کے بعد چند روز ہم ڈی اے وی کالج میں مقیم رہے۔ وہاں آر ایس ایس کے ارکان بھی تھے جنہوں نے ہمیں خوراک اور دیگر امداد فراہم کی۔ آخر کار ہم 2 اکتوبر کو امرتسر پہنچ گئے۔ میرے گاؤں کیرووال کا لمبردار غلام قادر تھا۔ مزمل شاہ اور غوث شاہ میرے بہت اچھے دوست تھے۔ یہ لوگ سنی سادات تھے۔ ہمارا گاؤں ہی سنی مسلمانوں کا تھا۔ مجھے گاؤں کی گلیاں آج بھی یاد ہیں۔ میرا ایک دوست بشیر تھا جس کا تعلق نائی برادری سے تھا۔ وہ مجھے بعد میں خط لکھا کرتا تھا۔ ہندوؤں پر حملوں کی شہ مولویوں نے دی لیکن حملہ آور بہرحال باہر کے لوگ تھے۔ ہمیں بھارت آکر کافی مسائل کا سامنا کرنا پڑا لیکن میرے قریبی رشتہ دار محفوظ رہے۔ اپنے پاؤں جمانے اور روزگار ڈھونڈنے میں کافی لمبا عرصہ لگا۔ کیرووال ہمیشہ میری سوچوں میں رہتا ہے۔ مجھے مسلمانوں پر کوئی غصہ نہیں۔ انہیں 1947 کے واقعات پر مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ دونوں طرف برے اور ظالم لوگ موجود تھے۔"

میں نے پنجابی کے مشہور شاعر اور مصنف پروفیسر محمد شریف کنجاہی (مرحوم) سے 20 اپریل 2003 کو گجرات میں 1947 کے واقعات کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ انہوں نے نہایت دلچسپ تاریخی پس منظر بیان کیا جس سے کشیدگی اور تقسیم کے وقت فسادات کی اندرونی وجوہات کا پتہ چلتا ہے۔

پروفیسر محمد شریف کنجاہی

"میں 13 اکتوبر 1915 کو کنجاہ میں پیدا ہوا جو ضلع گجرات کی اہم منڈی تھی۔ ارد گرد کے دیہات کے لوگ یہاں خرید وفروخت کرنے آیا کرتے تھے۔ ہمارے قصبے میں 1903 سے ہائی سکول اور ڈاکخانہ بھی تھا۔ سکول میں ہر مذہب کے طلبا تعلیم حاصل

کرتے تھے۔ ہمارے ہندو اور مسلمان دونوں اساتذہ بہت مہربان اور نیک لوگ تھے۔ کنجاہ ایک چھوٹا مگر بہت اچھی طرح بنا قصبہ تھا۔ کنجاہ میں فرقہ وارانہ زہر اس وقت گھلنا شروع ہوا جب 28-1927 میں ایک سکھ لیڈر کھڑک سنگھ نے بیان دیا کہ سکھ مسلمان قصابوں سے گوشت مت خریدیں کیونکہ وہ اسلامی طریقے سے جانور ذبح کرتے ہیں۔ اس نے جھٹکے سے جانور ذبح کرنے کی روایت کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے دکان بھی کھول لی۔ جہاں جانور کو جھٹکے سے ذبح کیا جاتا تھا۔ یہ اقدام فرقہ وارانہ بھائی چارے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد مولوی عبداللہ نے 1930 میں مسلمانوں کا الگ سکول کھول لیا۔ تاہم سکھ اور ہندو بھی داخلہ لے سکتے تھے اور کچھ غیر مسلم طلبا نے داخلہ لیا بھی۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے ملازمت کی تلاش شروع کی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اس پر میں انگریزوں کے خلاف ہو گیا۔ میں کانگریس پارٹی کی طرف مائل ہوا جس کی شاخ گجرات اور کنجاہ میں بھی تھی۔ میں مجلس احرار کا بھی رکن تھا۔ اگرچہ کانگریس کے زیادہ تر ارکان ہندو تھے لیکن سامراجیت کے مخالفین مسلمان بھی کانگریس میں شامل تھے۔ ہمیں اعلیٰ قیادت کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ ہم گاؤں گاؤں جا کر آزادی کی تبلیغ کریں۔ کانگریس اچھوتیت کے خلاف تھی لیکن کنجاہ کے ہندو اس مذہبی ضابطے سے دور نہیں ہوئے۔ مثال کے طور پر کنجاہ میں ایک حلوائی تھا۔ کبھی کبھار ہم اس سے لسی پینے چلے جاتے۔ اس نے مسلمان گاہکوں کے لیے الگ برتن رکھے ہوئے تھے اور لسی پینے کے بعد انہیں خوب اچھی طرح دھو دیتا۔ مجھے نہیں پتہ کہ عام کسانوں کے کیا احساسات تھے لیکن میں نے اس سلوک پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ مسلمان اس حقیقت سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے کہ سکھ اور ہندو معاشی طور پر ہم سے آگے تھے۔ یہ لوگ امیر ہونے کے باعث پکے مکانوں میں جبکہ مسلمان کچے گھروں میں رہتے تھے۔

''اس کے باوجود گہری دوستیاں موجود تھیں۔ میرا ایک دوست نیر چند تھا جس کی شادی ہونے والی تھی۔ ہم نے بارات کے ساتھ وزیر آباد جانا تھا۔ میں نے کہا کہ میں ساتھ نہیں جاتا کیونکہ وہاں مجھے الگ کھانا دیا جائے گا۔ اس نے یہ بات اپنی ماں سے کہی تو وہ بولیں 'ان احمقانہ ہندو رسوم کا برا مت مانو۔ تم دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر کھاؤ، ہم دیکھ لیں گے کیا ہوتا ہے۔' چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور کسی نے برا محسوس نہ کیا لہٰذا ہم نے یہ سلسلہ آگے بھی جاری رکھا۔ اگر ہندو اپنی روش بدل لیتے تو شاید ان حالات کی نوبت نہ آتی۔ اب آزادی کے بعد بھارت میں بھی یہی سوچ موجود ہے۔ مذہبی اختلافات کو سیاستدان مزید ہوا دیتے ہیں۔ انگریزوں نے بھی اپنی حاکمیت برقرار رکھنے کے لیے ان اختلافات کو ابھارا۔

''بابا سندر داس کنجاہ کا واحد ڈاکٹر تھا۔ وہ خود مریضوں کے پاس جا کر ان کا علاج کیا کرتا تھا۔ وہ معمولی فیس وصول کیا کرتا تھا اور غریبوں کا مفت علاج کرتا تھا۔ پھر تقسیم کے وقت ایک پاگل پن لوگوں کے سر پر سوار ہو گیا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی کچھ ہندو اور سکھ ہمارے علاقے میں رہے۔ جرائم پیشہ عناصر اور مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے ارکان غیر مسلموں پر حملوں میں ملوث تھے۔ کنجاہ میں حملہ 18 اگست کو کیا گیا۔ یہ ایک بڑا حملہ تھا اور حملہ آوروں نے قتل و غارت اور جلاؤ گھیراؤ کا بازار گرم کر دیا۔ گاؤں میں ہر طرف بدمعاش دندناتے تھے۔ وہ کچھ (غیر مسلم) خواتین کو بھی اغوا کر کے ساتھ لے گئے۔ حتیٰ کہ صوبہ سرحد سے بھی مسلح پٹھان مال غنیمت لوٹنے آئے تھے۔ انہوں نے انتہائی گھناؤنے جرائم کیے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بالکل بے گناہ افراد کو جانوروں کی طرح ذبح ہوتے دیکھا۔ یہ مناظر آج بھی مجھے یاد ہیں۔ صرف کنجاہ میں 500 سے زائد ہندوؤں اور سکھوں کو ہلاک کیا گیا۔ ہر طرف صورتحال خراب تھی۔ کنجاہ کے ایک برہمن بیلی رام نے بھارت رخصت ہونے سے قبل

مجھے گھر کی چابیاں دیں۔ اس کے 3 مکانات تھے۔ بعد میں اس کا بیٹا پولیس کی معیت میں وہاں آیا۔ انہوں نے اپنے خالی مکانات میں سونا اور زیورات زمین کھود کر دبا رکھے تھے۔ سونا نکال کر وہ چلے گئے۔ فرقہ واریت کا زہر گھولنے کی ذمہ دار حکومتی ایجنسیاں تھیں۔ وہ بدگمانی پیدا کرنے کے لیے اپنے ایجنٹ استعمال کرتی تھیں۔ احرار کبھی بدعنوان نہیں تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ یونینسٹ پارٹی نے (اپنی ماضی کی روایات کے برعکس) مسلمانوں کی حمایت کی تھی۔ تقسیم ناگزیر نہیں تھی۔"

سید آفتاب حسن

ایک اور تفصیلی بیان سید آفتاب حسن کا ہے جن کا انٹرویو میں نے پروفیسر شریف کنجاہی کے بعد کیا۔ انہوں نے مجھے یہ تفصیل سنائی:

"میں مارچ 1939 میں گجرات کے قریب ایک گاؤں جمنا میں پیدا ہوا۔ لیکن تقسیم کے وقت میرے والد جو پوسٹ مین تھے کا تبادلہ گجرات کے قصبے شادیوال میں کر دیا گیا۔ یہاں مسلمان اور ہندو دونوں مذاہب کے افراد امن اور بھائی چارے کے ساتھ رہتے تھے۔ ہمارے گاؤں کے ہندو اچار اور دیسی گھی کا چھوٹا سا کاروبار کرتے تھے اور ان کی کافی دور تک مانگ تھی۔ قصبے میں کپڑے کی مارکیٹ بھی تھی، میرے والد سید فضل حسین شاہ شیعہ مسجد کے پیش امام بھی تھے اور تمام مذاہب کے افراد ان کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے ہندو اکثریت کے علاقے میں قیام کو ترجیح دی تھی اور انہیں کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ عموماً ہندو نہایت مہذب، تعلیم یافتہ اور امن پسند لوگ تھے۔ ہم کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ ہمارے ہمسایوں میں انکل دیوان چند اور ان کی بیوی چانن بائی ہمارے کافی قریب تھے۔ وہ جو چیز اپنے بیٹے کے لیے لاتی وہی میرے لیے لے کر آتی۔ پاکستان بن چکا تھا اور یہ عید کا دن تھا۔ میرے والد عید کی نماز پڑھانے گئے ہوئے تھے۔ ایک افواہ پھیلی کہ سکھوں نے عید کے اجتماع پر حملہ کر دیا تھا اور میرے والد بھی ہلاک ہو چکے تھے۔ یہ سن کر مسلمان مشتعل ہو کر باہر نکل آئے اور قریبی نہر کے پل پر تصادم شروع ہو گیا۔ تین سکھ مارے گئے۔ اس رات مسلمان غنڈوں نے شادیوال پر منظم حملہ کر دیا اور ساٹھ ہندو مارے گئے۔ انہوں نے لاشیں نہر میں پھینکنے کی کوشش کی لیکن جن چھکڑوں پر لاشیں رکھی تھیں ان کے جانور اتنا وزن اٹھا کر نہ چل سکے۔ اگلے روز میرے والد نے صورتحال کو قابو میں کر لیا اور ہندوؤں سے کہا کہ وہ ہمارے گھر میں آ کر رہیں۔ اس دوران مسلمانوں کا ایک ہجوم آیا اور ہندوؤں کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ میرے والد نے کہا، 'ہندوؤں سے پہلے تم لوگوں کو میری، میرے بچے اور بیوی کی لاش سے گزرنا پڑے گا۔ میں نے ان لوگوں کو پناہ دی ہے اور پناہ میں آنے والوں کو کسی کے حوالے کرنا ہماری روایت نہیں۔' کچھ حملہ آوروں نے اپنے چہرے ڈھاٹے سے چھپا رکھے تھے۔ اصل میں یہ لوگ شادیوال کے تھے اور بدمعاشوں سے مل کر لوٹ مار کرنا چاہتے تھے۔ میرے والد کی بات سن کر انہوں نے چہرے بے نقاب کر دیے اور واپس چلے گئے۔ چنانچہ دیگر حملہ آور بھی گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ تین روز بعد ہندو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے پھر بھارتی فوج آ گئی اور انہیں ساتھ لے گئی۔

"ایک ہندو سادھو رام آسرا جو شمشان گھاٹ کے قریب رہتا تھا نے اعلان کیا کہ وہ مسلمان بننا چاہتا ہے۔ کلمہ پڑھنے پر اس کا نیا نام اللہ آسرا رکھ دیا گیا۔ ایک روز وہ سڑک پر جا رہا تھا اور اس کی جیب میں دس روپے تھے کہ اسے قتل کر دیا گیا۔ میرے والد اس وقت ڈاک تقسیم کر رہے تھے۔ ہمارے خیال میں اللہ آسرا کو صرف پیسوں کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ اسے دفن کرنے

کی بجائے ان لوگوں نے اس کنویں میں لاش پھینک دی جہاں سے پہلے ہندو پانی نکالا کرتے تھے، کچھ عرصے بعد ہمارے گاؤں کے بچ جانے والے ایک ہندو کی کہانی بھارتی اخبار میں شائع ہوئی تو میرے والد نے وہ کہانی پڑھ کر ہمیں سنائی۔

''ہریانہ سے آنے والے کچھ مسلمان شادیوال میں آباد ہو گئے۔ انہوں نے ہریانہ کے جاٹ ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم کی داستانیں سنائیں۔ ایک لڑکے نے مجھے بتایا کہ لاہور کے قریب والٹن مہاجر کیمپ میں اس کے ساتھ مسلمانوں نے زیادتی کی۔ وہ مشرقی پنجاب سے فرار ہونے سے زیادہ اس جنسی زیادتی کے واقعے سے دکھ کا شکار تھا۔''

کھوسلہ رپورٹ میں ایک مسلمان فوجی افسر میجر اسلم کا ذکر ہے جس نے نہایت دیانت کے ساتھ ڈیوٹی کرتے ہوئے منڈی بہاؤالدین (گجرات کی تحصیل پھالیہ کا حصہ، اب الگ ضلع) میں سینکڑوں ہندوؤں اور سکھوں کی جان بچائی (1989:156)۔

جہلم

شمالی پنجاب کے اس ضلع میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت یعنی 89 فیصد تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی ملا کر 11 فیصد بنتی تھی۔ ضلع جہلم کے دیہات میں ظلم و بربریت کا بازار پہلے ہی گرم ہو چکا تھا اور مارچ 1947 کے فسادات کے بعد جہلم شہر میں پناہ گزین کیمپ بھی قائم کر دیا گیا تھا۔ محفوظ ٹھکانوں کی تلاش میں کئی ہندو اور سکھ اپنے دیہات چھوڑ کر کیمپ کی طرف گئے جہاں ایک فوجی دستہ مستقل طور پر تعینات تھا۔ اگست کا مہینہ امن و امان سے گزر گیا لیکن ستمبر کے شروع میں تشدد دوبارہ پھوٹ پڑا۔

سنیل دت

مشہور بھارتی اداکار سنیل دت کا تعلق جہلم سے 20 کلومیٹر دور واقع گاؤں خورد سے تھا۔ میری ان سے ملاقات ممبئی میں 20 اکتوبر کو ان کی رہائشگاہ پر ہوئی۔

''میں 6 جون 1929 کو چھوٹے سے گاؤں خورد میں پیدا ہوا۔ جو جہلم شہر سے زیادہ دور نہیں۔ وہاں ہندوؤں (زیادہ تر دت برہمن) مسلمانوں اور کچھ سکھوں کی بھی آبادی تھی۔ دت برادری برہمنوں کی محیل ذات کا حصہ ہے جن کے بزرگ رحاب سدھو دت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ واقعہ کربلا کے وقت وہ عرب میں تھے۔ انہوں نے امام حسینؑ کے ساتھ مل کر یزیدی فوج کے ساتھ لڑائی کی اور اپنی جان قربان کر دی۔ چنانچہ ہماری برادری میں واقعہ کربلا کی یاد منانے کی روایت آج بھی قائم ہے، اگرچہ ہم بدستور ہندو ہیں۔

جب میں پانچ برس کا تھا تو میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ میرا چھوٹا بھائی سوم محض شیر خوار بچہ تھا۔ ہماری پرورش ہمارے تایا جی نے کی۔ ہمارے خاندان کی معاشی حالت بہت اچھی تھی کیونکہ ہم گاؤں کے بڑے زمیندار تھے۔ تقسیم کے وقت میں بھارتی پنجاب کی حدود میں تھا جبکہ میرا پورا خاندان گاؤں میں ہی تھا۔ پھر ایک فوجی ٹرک آیا اور گاؤں کے ہندوؤں کو جہلم کے پناہ گزین کیمپ میں منتقل کر دیا۔ یہ غالباً ستمبر کا دوسرا ہفتہ تھا۔ میرے سب رشتہ دار ٹرک میں بیٹھ گئے، البتہ تایا جی بدستور گاؤں میں رہے کیونکہ عام تاثر یہی تھا کہ شاید حالات جلد بہتر ہو جائیں۔ رخصتی سے کچھ دیر پہلے ہی میری ماں نے بتایا کہ انہوں نے گھر میں ایک جگہ پر اپنا سارا زیور چھپا کر رکھ دیا ہے۔ جب سب چلے گئے تو میرے تایا گاؤں میں ہی رہے۔ روایت کے مطابق

میرے تایا گاؤں کے کنویں پر حقہ پینے چلے گئے۔ حالات معمول کے مطابق ہی تھے۔ پھر جمعہ کی نماز کے اجتماع میں مولوی نے کہا کہ حیرت ہے ایک ہندو اب بھی گاؤں میں باقی ہے۔ میرے تایا کے بعض دوستوں نے انہیں گاؤں سے چلے جانے کا مشورہ دیا تاہم انہوں نے ایسے ظاہر کیا جیسے انہیں کوئی پریشانی نہیں اور اگلی صبح کنویں پر پھر چلے گئے لیکن پھر وہ گھر آئے، زیورات جمع کیے اور دوسرے گاؤں نواں کوٹ چلے گئے تاکہ میرے آنجہانی والد کے کلاس فیلو اور دوست یعقوب سے مدد حاصل کر سکیں۔ تایا نے انہیں بتایا کہ میری زندگی خطرے میں ہے اور میرے پاس میری بھابھی (سنیل دت کی والدہ) کے زیورات ہیں۔ یعقوب نے انہیں کہا کہ تم فکر مت کرو۔ اگر کسی نے تمہیں مارنے کی کوشش کی تو اسے تمہیں چھونے سے پہلے مجھے اور میرے بھائیوں کو مارنا پڑے گا۔

"گاؤں میں ان کی عدم موجودگی کا فوراً ہی پتہ چل گیا۔ شر پسند عناصر کو اچھی طرح پتہ تھا کہ تایا ضرور یعقوب کی طرف گئے ہوں گے کیونکہ اس کے سوا وہ اپنے پاؤں پر اس علاقے سے نہیں نکل سکتے تھے۔ ان میں سے کچھ افراد یعقوب کے پاس آئے اور کہا کہ میرے تایا کو ان کے حوالے کر دیا جائے لیکن یعقوب اور ان کے بھائیوں نے بندوقیں تان کر کہا کہ ان کے مہمان کی زندگی ان کی اپنی زندگی سے قیمتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ واپس پلٹ گئے لیکن پھر علاقے کے ایک پیر نے یعقوب کو پیغام بھجوایا کہ وہ ان کی طرف آرہا ہے تاکہ پتہ چلا سکے کہ آخر ایک کافر کو تحفظ کیوں فراہم کیا جارہا ہے۔ اس موقع پر یعقوب نے تایا سے کہا کہ آپ فوراً علاقے سے نکل جائیں۔ اس نے تایا کو جہلم پہنچنے کے لیے ایک گھوڑا بھی دیا۔ تایا آدھی رات کو وہاں سے نکلے اور جہلم مہاجر کیمپ پہنچ گئے۔ دو روز بعد یعقوب مہاجر کیمپ آیا تاکہ پتہ کر سکے کہ تایا بحفاظت پہنچے ہیں کہ نہیں، یہ ہے پوری کہانی جس سے میرے خاندان کی کسی نقصان کے بغیر نقل مکانی کا پتہ چلتا ہے۔"

(سنیل دت کا انتقال 2 مئی 2005 میں ہوا۔ ان کی بیوی مشہور اداکارہ نرگس ایک مسلمان تھیں جبکہ بیٹا سنجے دت بھی مشہور اداکار ہے)

رگھبیر سنگھ ساہنی

"میں 1926 کو تحصیل چکوال ضلع جہلم تھانہ تمن کے گاؤں گجیال میں پیدا ہوا۔ ہمارے گاؤں میں تمام سکھوں کا تعلق ساہنی برادری سے تھا۔ جبکہ باقی آبادی مسلمانوں کی تھی۔ ہم ساہوکار تھے اور ہماری کچھ دکانیں بھی تھیں۔ بھارت کے وزیر اعظم من موہن سنگھ کا تعلق بھی ہمارے ضلع سے تھا۔ مسلمانوں سے ہمارے اچھے مراسم تھے۔ وہ ہماری بہت عزت کرتے تھے۔ جب بیرونی عناصر نے ہمارے گاؤں پر حملہ کیا تو مسلمانوں نے ہماری حفاظت کی۔ قریبی گاؤں 'فتاکی' میں بھی ہماری ایک دکان تھی۔ شاہ محمد دکان سے میرے والد کو اٹھا کر بحفاظت گاؤں لے آیا۔ ہمارے گاؤں کے کئی نوجوان فوج میں ملازم تھے۔ خود میرے چاچا جی بھی فوج میں تھے۔ گاؤں کے ہی ایک مسلمان گھرانے کے 7 بھائی فوج میں ملازم تھے۔ انہیں جنگ عظیم کے دوران جرمنوں نے قیدی بنا لیا تھا۔ ان کی عدم موجودگی میں ہم نے ان کی تنخواہوں اور جائیدادوں کی دیکھ بھال کی۔ وہ جب قید سے رہا ہو کر واپس آئے تو انہیں پتہ چلا کہ ہم نے ان کے مفادات کی بہت اچھی طرح نگہبانی کی تھی۔ حتیٰ کہ ہم نے ان کے لیے مزید جائیدادیں خریدی تھیں۔

"جب باہر سے حملہ ہوا تو انہی سات جوانوں نے حملہ آوروں کو پسپا کیا۔ ان کی والدہ نے انہیں کہا: 'بیٹو میں تمہیں دودھ اسی وقت بخشوں گی جب تم لوگ ان ہندوؤں کے کام آؤ گے۔' ایک بھائی کا نام بوستان خان تھا۔ وہ سب ہمارے گھر کی چھت پر چڑھ گئے۔ اس وقت ہمارے گھر میں 9-10 سکھ خاندان اور 60-70 افراد جمع تھے۔ ان بھائیوں نے حملہ آوروں سے کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ہم تمہیں گولی مار دیں گے چنانچہ وہ سب بھاگ گئے۔ پھر فوج کو بلایا گیا اور ہم سب روانہ ہو گئے۔ اس وقت میرا چھوٹا بھائی صرف چالیس روز کا تھا۔ ہم وہاں سے چکوال آ گئے اور کلیکے گاؤں میں ٹھہرے۔ پاکستان بننے کے پندرہ روز بعد ہم پٹیالہ منتقل ہو گئے۔ میرے والد، دادا اور چچا واپس جا کر اپنی ہر چیز ساتھ لے آئے۔ ہمارا نقصان صرف وہ رقم تھی جو ہم نے مسلمانوں کو بطور قرض دی تھی۔ ہم بہت تھوڑا سود لیتے تھے۔ 100 روپے کے اوپر ہم چونی یا اٹھنی سود لیتے تھے۔"

تلک راج اوبرائے

"میرا تعلق ضلع جہلم، تحصیل چکوال کے بڑے گاؤں حاصل سے ہے۔ ہمارے مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ ہمارے گھر سے ایک کھڑکی بڑی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ جس سے ہم باہر کے لوگوں سے ہر وقت رابطہ رکھتے تھے۔ مارچ 1947 میں، میں راولپنڈی میں تھا۔ جہاں میں امپیریل بنک میں ملازمت کرتا تھا۔ ہمارے گاؤں پر بھی حملہ ہوا تھا لیکن ہمارے گاؤں کے مسلمانوں نے ہمیں بچا لیا۔ لہذا حاصل گاؤں کسی بڑے سانحے سے محفوظ ہی رہا۔ البتہ اگست میں حالات قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ مقامی افراد چاہنے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ پاکستان بنا تو ہندوؤں اور سکھوں کے لیے وہاں کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ میرے والدین اور اہل خانہ اٹک چلے گئے اور وہاں کئی ماہ تک مقیم رہے۔ وہاں دو لاکھ افراد پر مشتمل بڑا مہاجر کیمپ تھا۔ اس کے بعد ان لوگوں کو فوج کی حفاظت میں بھارت منتقل کر دیا گیا۔ میں راولپنڈی میں تھا لیکن کچھ عرصے کے لیے مجھے پتہ نہ چلا کہ میرے والدین کہاں ہیں۔ میں اکتوبر میں بھارت گیا۔ ٹرین کے ساتھ بھی فوج تھی۔ اس لیے کوئی حملہ نہ ہوا۔"

ضلع شاہ پور

ضلع شاہ پور جس میں آج کا جدید شہر سرگودھا شامل تھا میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت تھی اور یہ راولپنڈی ڈویژن کا حصہ تھا۔ سکھوں اور ہندوؤں کی تعداد ملا کر 15 فیصد بنتی تھی۔ 30 نومبر 2005 کو جب میں پانی پت گیا تو میرا دوست ہتیش گوسین مجھے پروفیسر نریندر موہن وید سے ملوانے لے گیا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے والد ملتان ڈویژن کے علاقے بوریوالا سے نکلے تھے۔ میرا میزبان مجھے چمن لال آہوجہ سے بھی ملوانے لے گیا۔ وہ یہ جان کر رو پڑے کہ میں پاکستان سے آیا تھا۔ وہ سرگودھا کے حریت پسند تھے اور میاں افتخار الدین کے ساتھ اکٹھے جیل کاٹی۔ وہ میاں افتخار کو بڑا انسان اور لیڈر سمجھتے تھے۔ چمن لال آہوجہ نے بتایا کہ سرگودھا میں بیشتر لوگ دوستانہ انداز میں رہتے تھے۔ گڑبڑ اگست 1947 میں شروع ہوئی۔ بعد میں میں نے ہتیش گوسین کی والدہ کا انٹرویو کیا۔ جو ضلع شاہ پور سے تعلق رکھتی تھیں تاہم 1947 میں وہ ہندو اکثریت کے تاریخی شہر بھیرہ میں رہتی تھیں۔

راج رانی گوسین

"ہم پنجابی برہمن ہیں، میں جنوری 1918 کو ضلع شاہ پور کے قصبے سرگودھا میں پیدا ہوئی۔ ہمارا گھر بلاک 2 میں تھا۔ 9 مئی 1930 کو میری شادی میانی کے گوسین کرشن لال سے ہوئی۔ ان کی زرعی اراضی ملکوال میں تھی۔ میرے شوہر پیشے کے لحاظ سے ڈسپنسر تھے۔ شادی کے بعد میں کئی علاقوں سرگودھا، پھلروان وغیرہ میں رہی۔ 1947 میں ہم بھیرہ میں تھے جہاں کے سول ہسپتال میں میرے شوہر تعینات تھے۔ تقسیم ہند کی باتیں ہونے سے پہلے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مراسم قطعاً معمول پر رہے۔ دیوالی جیسے تہواروں پر ہم محلے کے معزز مسلمان گھرانوں میں مٹھائیاں بھیجا کرتے تھے۔ اسی طرح عید جیسے اسلامی تہواروں پر مسلمان بھی ہندو دکانوں یا ہندوؤں کے ذریعے ہمیں مٹھائیاں بھیجتے تھے۔

"لیکن تقسیم سے کچھ عرصہ قبل حالات بگڑنا شروع ہوگئے۔ ایسی افواہیں پھیل رہی تھیں کہ مسلمان ہندوؤں پر حملے کر کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو مار رہے تھے اور لوٹ مار بھی کر رہے تھے۔ جولائی کے آخر تک تو صورتحال انتہائی گھمبیر ہو چکی تھی۔ ہم خواتین گھروں میں ہر وقت لال مرچوں، پتھروں اور پانی سے بھری بالٹیاں تیار رکھتی تھیں۔ چھتوں پر بھی پانی ذخیرہ رکھا جاتا تھا تاکہ اگر مسلمانوں کا ہجوم آگ لگائے تو وہ بجھائی جا سکے۔ جبکہ مرد اپنے خنجر تیار رکھتے تھے۔ خواتین کو زہر کی پڑیاں بھی دی گئی تھیں تاکہ مرد اگر لڑتے ہوئے مارے جائیں تو وہ زہر پھانک لیں۔ عزت گنوانے سے مر جانا بہتر ہے۔ اگرچہ ہمارے علاقے میں کوئی حملہ نہیں ہوا تاہم دو واقعات کافی خوفناک تھے۔

"ایک بار محلے کی تمام خواتین تنور پر روٹیاں پکوانے گئیں۔ اچانک شور بلند ہوا 'آ گئے، آ گئے۔' ہم ڈر کر فوراً بھاگ گئیں۔ برتن، آٹا اور روٹیاں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ اپنے اپنے گھروں میں جا کر ہم نے اندر سے دروازے بند کر لیے اور چھتوں پر چڑھ کر دفاعی سامان تیار کر لیا۔ خوش قسمتی سے کوئی ہجوم ہمارے محلے میں نہ آیا۔ جولائی کے آخر تک میرے شوہر دو پولیس اہلکاروں کی معیت میں ہسپتال ڈیوٹی پر جایا کرتے تھے۔ اس طرح واپسی پر بھی پولیس کی سکیورٹی ساتھ ہوتی تھی۔ یہ پولیس اہلکار اگرچہ مسلمان تھے لیکن قابل اعتبار تھے۔ البتہ اگست میں ہسپتال میں پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے میرے شوہر کو حقہ تازہ کرنے کا حکم دیا۔ میرے شوہر ڈسپنسر تھے انہوں نے کہا کہ چپڑاسی آ کر حقہ بنا دے گا جس پر سب انسپکٹر سیخ پا ہو گیا اور بولا 'ہنگامے شروع ہونے دو میں پورا برسٹ تیرے سینے میں اتاروں گا۔' میرے شوہر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ 'دیکھ لیں گے۔'

"نواحی علاقے ملک وال میں زبردست خونریزی کی افواہیں پھیلنے لگی تھیں۔ اس لیے میرے جیٹھ گوسین بانج ناتھ اور ان کے خاندان، اسی طرح میری بہن لاجونتی اپنے اہل خانہ سمیت بھیرہ میں ہمارے گھر منتقل ہو گئے۔ تقسیم کے وقت ہمارے گھر میں انیس افراد مقیم تھے۔ البتہ میرے شوہر کا چھوٹا بھائی گوسین شالگ رام میانی قصبے کی جھکی گلی میں رہتا تھا۔ تقسیم سے دو ہفتے قبل ہم نے خبریں سنیں کہ میانی میں کئی ہندوؤں کو قتل کر دیا گیا ہے اور بچنے والے بھاگ کر بھیرہ آ گئے ہیں۔ میرے شوہر اور جیٹھ دوڑ کر بھیرہ ریلوے سٹیشن گئے اور روتے ہوئے واپس آئے۔ پناہ گزین ہندوؤں نے بتایا کہ شالگ رام کو مسلمانوں نے ہلاک کر دیا تھا۔ اس نے حملے کے وقت گھر سے بھاگ کر قریبی ستھریاں دادھرم شالا میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ اس گھر میں کوئی نہیں رہتا تھا اور ہر وقت کھلا رہتا تھا اور لوگ یہاں سے پانی بھرتے تھے۔ کنویں کے پیچھے ایک بڑا درخت تھا۔ شالگ رام نے

ربڑ کی چپل پہن رکھی تھی اور درخت سے لٹک کر اگلے گھر میں جانے کی کوشش میں اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اس دوران حملہ آور پہنچ آئے اور اسے قتل کر ڈالا۔ اس روز 10، 12 افراد کو قتل کیا گیا۔ عینی شاہدین نے بتایا کہ بعد ازاں مرنے والوں کی چتی لال وسان کے لکڑیوں کے ٹال میں اجتماعی چتا جلائی گئی۔

''میانی میں ایک اور واقعہ بھی رونما ہوا جس کا ہمیں بعد میں پتہ چلا۔ وہاں ہماری برادری کا ایک دبلا پتلا سا شخص دیوان جگدیش رہتا تھا۔ وہ کافی رقبے کا مالک تھا اور علاقے میں اس کی بڑی عزت تھی۔ میانی میں اس کا گھر ہمارے مکان کے بالکل عقب میں تھا۔ یہ دونوں گھر دو منزلہ تھے۔ دیوان جگدیش کی چار بیٹیاں تھیں اور وہ اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ وہ اپنی زرعی اراضی پر کام کرنے والے مسلمان مزارعوں سے نہایت شفقت سے پیش آتا تھا۔ جب کشیدگی عروج پر تھی تو مشرقی پنجاب سے آنے والے چند مسلمان مہاجروں نے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے بند دروازے سے پوچھا کہ کون؟ تو جواب ملا 'باؤ جی اسی تہاڈے واسطے آئے ہاں' چنانچہ جب جگدیش نے دروازہ کھولا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ حملہ کرنے والوں نے جگدیش کی لاش لسی کی ایک چاٹی میں ڈال دی۔ اس کا سر اندر ڈالا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت اس کی بیوی اور بیٹیاں ہمسایوں کے گھر میں تھیں۔ انہوں نے ہمیں یہ قصہ سنایا۔

''بھیرہ میں ایک اور بااثر ہندو دیوان صاحب تھا۔ اس نے ایک انگریز خاتون سے شادی کی تھی اور تقسیم کے وقت دہلی میں مقیم تھا۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کسی نے اسے دہلی میں کہا کہ بھیرہ میں تمہارے رشتہ دار مشکل میں ہیں چنانچہ اس نے بھیرہ سے ہندوؤں کو منڈی بہاؤالدین منتقل کرنے کے لیے ایک بٹالین مرہٹہ فوج کی خدمات حاصل کیں جہاں سے انیس ٹرکوں پر متاثرہ افراد کو امرتسر بھجوا دیا گیا۔ 14 اگست کے چند روز بعد ہم مختصر سامان کے ساتھ بھیرہ سٹیشن آئے۔ خوش قسمتی سے زیورات اور نقد رقم ہم ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے گھر کو تالا لگا کر چابیاں بابا رحمانی جو ہسپتال کا چپڑاسی تھا کے سپرد کر دیں۔ ہم نے کہا کہ اگر ہم واپس آئے تو چابیاں واپس لے لیں گے۔ ورنہ یہ سارا سامان اور گھر تمہارا ہے۔ بابا رحمانی اور محلے کے دیگر مسلمانوں نے دعا کی کہ ہم حالات بہت ٹھیک ہونے پر جلد واپس آئیں لیکن ایسا کبھی نہ ہو سکا۔

''ہم بھیرہ سٹیشن سے روانہ ہوئے۔ ٹرین تھوڑی سی چل کر پھر رک گئی اور واپس سٹیشن پر آ گئی۔ ہر کوئی خوفزدہ ہو گیا۔ مرہٹہ فوجیوں نے مختلف سمتوں میں اپنی مشین گنیں سیدھی کر لیں لیکن کچھ نہ ہوا اور ٹرین دوبارہ چل پڑی۔ ہم منڈی بہاؤالدین پہنچ گئے۔ ہمیں ایک قلعہ نما عمارت میں بڑے گیٹ سے اندر پہنچایا گیا۔ ہمارے پاس کھانے پینے کا کافی سامان (سنیکس) تھا۔ اگلے روز افواہ پھیل گئی کہ مقامی مسلمان شرپسندوں نے باہر کی کھانے پینے والی اشیا اور پانی میں زہر ملا دیا تھا۔ ہم میں سے کسی نے باہر کی کوئی چیز نہ کھائی بلکہ آپس میں ہم نے گھر کی تیار کردہ اشیا بانٹ لیں جبکہ اس عمارت کے اندر محفوظ پانی کا بھی انتظام کر لیا گیا۔ تیسرے روز ٹرک آیا۔ ہم ایک قطار میں باہر نکلے۔ ہمیں کہا گیا کہ ہم صرف وہ سامان ساتھ رکھیں جو ہاتھ میں پکڑ سکتے ہیں۔ کئی افراد کو اپنا سامان چھوڑنا پڑا۔ مقامی پولیس اہلکاروں نے فی کس 100 روپیہ رشوت لی۔ انہوں نے پیسہ کھانے کے چند اور ہتھکنڈے بھی استعمال کیے۔ ٹرکوں کے ساتھ مرہٹہ سپاہی بھی تھے اور انہوں نے ہمیں ہدایت کی کہ سفر کے دوران ہم اپنے سر نیچے رکھیں۔ ہم کسی ناخوشگوار واقعے کے بغیر اٹاری بارڈر پر

پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد ٹرک روک دیے گئے اور کھلے میدان میں دائرے کی شکل میں کھڑے ہو گئے۔ ہم سب درمیان میں تھے۔ ہمیں خبردار کیا گیا کہ اگر حملہ ہو تو ہم سب زمین پر لیٹ جائیں۔ سپاہی پوری رات ہماری حفاظت کے لیے چوکس کھڑے رہے۔ اگلے روز ٹرین آئی۔ ان دنوں تمام ٹرینوں میں سفر مفت ہوتا تھا۔ ہم بخیر و عافیت امرتسر پہنچ گئے اور گولڈن ٹیمپل پر حاضری دی۔ امرتسر میں کافی زیادہ مہاجرین تھے اور کچھ افراد کو ہیضہ بھی تھا۔ میری بہن کا شوہر امرتسر آتے ہوئے لاہور میں ہی مارا گیا تھا۔ ہم فوری طور پر ایک اور ٹرین میں بیٹھے اور جالندھر آ گئے۔ ایک عزیز نے ہمیں کھانا کھلایا۔ ہم ریلوے سٹیشن پر ہی سو گئے اور بالآخر لدھیانہ کے راستے کورکھشیتر جانے والی ٹرین پر سوار ہو گئے جہاں ہمارے کئی اور رشتہ دار بھی آ گئے۔

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے کہ بھیرہ میں ہمارے کئی مسلمان خاندانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ ان میں سے ایک مرزا خاندان تھا۔ مرزا صاحب بھی ہسپتال میں ڈسپنسر تھے۔ ان کی بیوی بہت اچھی عورت اور میری گہری دوست تھی۔ اس کے دادا ہندو تھے اور اس میں اب بھی ہندوؤں والی کافی رسمیں باقی تھیں۔ اس کی دو پیاری سی بیٹیاں ممتاز اور ثریا تھیں۔ وہ میری بیٹیوں سوراج، سوندر اور دیا کی ہم عمر تھیں۔ یہ سب مل کر کھیلتی تھیں اور ایک دوسرے کے گھر میں کھاتی پیتی بھی تھیں۔ اگرچہ بڑی عمر کے ہندو مسلمانوں کے گھروں میں کھانے پینے سے احتراز برتتے تھے لیکن بچوں پر ہم نے کوئی قدغن نہیں لگائی تھی۔ حقیقت میں مسلمانوں نے کبھی اس بات کا برا نہیں منایا تھا کیونکہ ہم ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کرتے تھے۔"

میانوالی

میانوالی میں ہندو، سکھ اقلیت کا تناسب 14 فیصد تھا جبکہ زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی۔ کھوسلہ رپورٹ میں درج ہے کہ 26 اگست تک میانوالی میں غیر مسلموں پر کوئی بڑا حملہ نہیں ہوا تھا۔ البتہ 26 اگست کو پائی خیل ریلوے سٹیشن پر ایک سکھ فوجی افسر کیپٹن گریوال کا قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ڈپٹی کمشنر نے ضلع سے غیر مسلموں کے انخلا کے منصوبے کا اعلان کر دیا۔ بظاہر اس اقدام سے مسلمانوں کی ہندوؤں سکھوں پر حملہ کرنے کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ پہلا حملہ 2 ستمبر کو ہوا اور پھر یہ سلسلہ تیز تر ہو گیا (1989:204-8)۔ ایس جی پی سی رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ میانوالی میں تقریباً 3500 سکھوں اور ہندوؤں کو قتل کیا گیا (1991:197)۔

8 جون 2006 کو میں ری لنگ براڈوے لندن کے زیر زمین سٹیشن پر کھڑا تھا۔ میں بھول کر غلط ٹیوب میں داخل ہو گیا تھا کہ ایک معمر سکھ نے میری رہنمائی کی۔ وہ نہایت دوستانہ اور معاون ثابت ہوا۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ میری درخواست پر اس نے مجھے اپنی اور اپنے اہل خانہ کے واقعے پر مشتمل تحریریں دیں۔ یہ لوگ میانوالی سے تعلق رکھتے تھے۔

جسپال سنگھ کوہلی

"ہمارا اصل علاقہ ضلع جہلم کا گاؤں دینہ تھا۔ میرے والد جو پولیس میں سب انسپکٹر تھے کا تبادلہ 1947 میں میانوالی میں ہوا۔ ان دنوں میں چھٹی جماعت کا طالبعلم تھا۔ میرے دادا اور نانا دونوں دینہ کے رہنے والے تھے۔ مارچ 1947 میں غیر

مسلموں پر حملوں کے بعد میرے نانا، نانی چکوال کے گاؤں گاہ سے دینہ منتقل ہو گئے۔ میری شادی شدہ بہن جو جہلم میں رہتی تھی بھی خوشی غمی کے مواقع پر دینہ آجاتی تھی۔ تقسیم کے وقت میرے والد نے پاکستان میں ہی قیام برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا جس کا انکے ساتھیوں نے خیر مقدم کیا لیکن ستمبر کے بعد سے مشرقی پنجاب سے بے گھر مسلمان مہاجرین کی میانوالی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے ریٹائر فوجیوں کے ساتھ مل کر غیر مسلموں پر منظم حملوں کا آغاز کر دیا۔ سکھ ہونے کی بنا پر ہماری شناخت نہایت آسان تھی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ اتوار کی چھٹی کا روز تھا۔ سب لوگ گھر پر ہی تھے کہ مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی معیت میں ایک گروہ نے حملہ کر دیا۔ علاقے کے کئی دیگر سکھ بھی ہمارے گھر جمع ہو گئے کیونکہ میرے والد کے پولیس ملازم ہونے کی وجہ سے اسے محفوظ ٹھکانہ سمجھا جاتا تھا۔ گھر میں میرے والد کے پاس سرکاری ریوالور تھا اس لیے شروع میں حملہ آور زیادہ قریب آنے سے گریزاں تھے لیکن دیکھتے دیکھتے ان کی تعداد ہزاروں میں پہنچ گئی اور یقیناً ان میں سے بعض کے پاس بندوقیں بھی تھیں۔ میرے والد، ہمارا ہمسایہ سنتوخ سنگھ اور اس کے دو بیٹے گھر کی مختلف اطراف سے حفاظت کر رہے تھے لیکن اسلحہ صرف میرے والد کے ہی پاس تھا۔ جب اندھیرا پھیلا تو حملہ آوروں نے دوبارہ حملہ کر دیا اور میرے والد سمیت یہ چاروں افراد مارے گئے۔ حملہ آور نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے لیکن کسی وجہ سے انہوں نے بوڑھی عورتوں اور بچوں کو بخش دیا۔ میری والدہ نے مجھے اپنے پیچھے چھپا لیا۔ صبح کے وقت علاقے کے مسلمان عمائدین ہمارے گھر آئے اور کہا کہ ہم تم لوگوں کو مہاجر کیمپ تک پہنچا آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہی لوگوں کی وجہ سے ہماری زندگی بچ گئی۔

"ہم پناہ گزین کیمپ آئے جہاں سے ٹرکوں پر ہمیں امرتسر بھجوا دیا گیا۔ اس سفر میں کئی روز لگ گئے۔ ہم اکتوبر کے آغاز پر امرتسر پہنچے۔ میرے ننھیال اور بہن کا خاندان زیادہ خوش قسمت ثابت نہ ہوئے۔ انہیں دینہ میں قتل کر دیا گیا۔ میں 1959 میں لندن منتقل ہو گیا۔ میری کبھی کبھار دینہ اور جہلم کے مسلمانوں سے ملاقات ہو جاتی ہے لیکن میانوالی سے شاذونادر ہی کوئی ملتا ہے۔ مختلف علاقوں کے مختلف پنجابی کے لہجے سن کر حیرت ہوتی ہے۔ میں اپنے والد کو کبھی نہیں بھلا سکا۔ وہ بہت دراز قامت اور وجیہ انسان تھے۔ انہوں نے لڑتے ہوئے جان دی۔ کئی دیگر افراد نے بھی ایسا کیا۔ میرے خیال میں حملے میں دس سے بارہ افراد قتل ہوئے جبکہ پانچ لڑکیاں اغوا کی گئیں۔ زندگی بسا اوقات ہمارے لیے کافی جبر آمیز ثابت ہوتی ہے لیکن پھر بھی گزارنا پڑتی ہے۔"

انٹرویوز

اداکار سنیل دت، ممبئی 20 اکتوبر 2001

پروفیسر محمد شریف کنجاہی، گجرات 20 اپریل 2003

سید آفتاب حسن، گجرات 20 اپریل 2003

کرنل (ر) نادر علی، لاہور 5 اپریل 2003

کملا سیٹھی، 7 مارچ، جگن ناتھ 8 مارچ، نئی دہلی 2004
رگھبیر سنگھ ساہنی پٹیالہ 7 جنوری 2004
تلک راج اوبرائے، چنڈی گڑھ 2 جنوری 2005
مہندر ناتھ کھنہ، امرتسر 3 جنوری 2005
چمن لال آہوجہ، پانی پت 30 نومبر 2005
راج رانی گوسین، نوئیڈا 21 دسمبر 2005
جسپال سنگھ کوہلی، لندن 8 جون 2006
بشام کمار بخشی، دہلی سے ای میل 5 مارچ 2007
محمد فیروز ڈار، سٹاک ہوم 18 فروری 2008

References

Khosla, Gopal Das, *Stern Reckoning: A Survey of the Events Leading Up To and Following the Partition of India*, New Delhi: Oxford University Press (1989).
Talib, S. Gurbachan, *Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab 1947*, New Delhi: Voice of India, (1991).

16

ملتان ڈویژن اور ریاست بہاولپور

تقسیم سے قبل ملتان پنجاب کی انتہائی جنوب میں واقع ڈویژن تھی۔ جس میں منٹگمری (ساہیوال)، لائل پور (فیصل آباد)، جھنگ، ملتان، مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے اضلاع شامل تھے۔ علاوہ ازیں بلوچ قبائل کی پٹی والا علاقہ بھی ملتان ڈویژن کا حصہ تھی۔ اس ڈویژن میں ہندوؤں اور سکھوں کی مجموعی آبادی 22 فیصد تھی۔ زیادہ تر سکھ مشرقی اضلاع کے ان دیہات میں مقیم تھے جہاں بعد ازاں انگریزوں نے نہری کالونیاں قائم کیں۔ کھوسلہ اور ایس جی پی سی دونوں رپورٹوں میں ہندوؤں اور سکھوں پر ملتان ڈویژن میں حملوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

ملتان شہر

مارچ 1947 میں پہلے ہی ضلع ملتان میں ہندو کمیونٹی کی پر خطر حالت زار سامنے آچکی تھی۔ سکھوں کی تعداد تو ہندوؤں سے بھی کم تھی۔ مارچ میں ہندوؤں نے علاقے سے نقل مکانی کی لیکن یہ زیادہ بڑی تعداد میں نہیں۔ ریڈ کلف، باؤنڈری ایوارڈ کے اعلان کے بعد بھی اکثر ہندو یہیں مقیم رہے۔ ان لوگوں کو امید تھی کہ امن وامان کی صورتحال جلد معمول پر آجائے گی اور یہ بدستور ملتان شہر اور دیہات میں مقیم رہیں گے۔ تاہم یہ محض واہمہ ثابت ہوا کیونکہ مشرقی پنجاب سے لٹے پٹے مہاجرین نے یہاں بھی آکر غیر مسلموں پر حملوں کی شہ دی جس کے نتیجے میں ملتان کے ہندوؤں اور سکھوں کو بھاری جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ کہیں کہیں جبری تبدیلی مذہب کے واقعات بھی ہوئے لیکن فوجی تعاون حاصل ہوتے ہی یہ لوگ بھارت کے لیے روانہ ہوگئے۔ کھوسلہ رپورٹ میں ملتان کے ایسے کئی واقعات کی تفصیل موجود ہے جب ٹرینوں کا محاصرہ کیا گیا۔ دیہات میں بھی قتل عام کے کئی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔

لاجپت رائے سیٹھ

"میری پیدائش ملتان شہر کے وسط میں ہندو چھجہ کے قریب حملہ پیپل تھلا میں ہوئی۔ ہمارا اجناس کی خرید وفروخت کا کاروبار تھا اور ہم پنجاب کی جیلوں میں اناج سپلائی کرتے تھے۔ ہمارے آباؤاجداد کا قدیم تعلق ملتان سے تھا اور کئی صدیوں تک متعدد مسلمان حکمران آنے کے باوجود ان لوگوں نے اپنا مذہب برقرار رکھا۔ ہندو برادری زیادہ تر شہر کے وسط میں رہتی تھی جبکہ مسلمان بیرونی علاقے میں آباد تھے۔ نچلی ذات کے ہندو بھی شہر سے باہر کے علاقوں رہتے تھے۔ ہمارا مسلمان دھوبی خدا بخش میری والدہ کا منہ بولا بھائی بن گیا اور میری ماں نے اسے راکھی بھی باندھی تھی۔ ہمارے بااعتماد کاروباری شراکت داروں میں سے ایک ضیاالدین بھی مسلمان تھا۔ وہ اکثر ہماری دکان پر آتا تھا۔ وہ ہمارے لیے گاہک لاتا تھا اور سودے پر کمیشن لیتا تھا۔ ہم

گوشت کھاتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں بھی تامل نہ کرتے تھے۔ تمام مذاہب کے درمیان تعلقات قریبی اور دوستانہ تھے۔

''مارچ میں ہونے والے فسادات نے پہلے ہی ہندوؤں کو تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ہندوؤں کی املاک کو آگ لگائی اور کئی ہندو قتل بھی ہوئے لیکن پھر صورتحال کنٹرول میں آگئی اور حالات وسط اگست تک ٹھیک رہے۔ اگست میں گڑبڑ کے بعد بھی ہمیں امید تھی کہ پاکستان بننے کے بعد حالات معمول پر آجائیں گے۔ 14 اگست کو چوک بازار میں پرچم کشائی کی تقریب ہوئی اور پاکستان بننے کا جشن منایا گیا لیکن اس کے فوری بعد ارد گرد کے دیہات سے ہندو بڑی تعداد میں ملتان شہر منتقل ہونے لگے۔ مشرقی پنجاب سے مسلمان مہاجرین بھی کافی تعداد میں آرہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد اور دیگر بڑے بیٹھ کر شہر کی صورتحال پر بات چیت کرتے تھے۔ کئی غیر مسلم اپنے اہل خانہ سے محروم ہو چکے تھے اور ہر وقت جبری تبدیلی مذہب کے واقعات ہو رہے تھے۔ دیہات میں حملوں میں اچانک تیزی آگئی تھی۔ کئی ہزار وحشی انسان اچانک شہر میں نمودار ہو گئے تھے۔ اس وقت میری عمر صرف تیرہ سال تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ملتان میں کوئی تشدد نہیں دیکھا۔ خود ہندوؤں نے بھی قاتلانہ حملے کیے اور میرے والد کا مسلمان دوست دایا موچی تھا جو ہمارے گھر میں بیٹھ کر حقّہ پیتا تھا کو ہندوؤں نے مار ڈالا۔ ہندوؤں کے علاقے میں داخل ہونے والے مسلمانوں کو بخشا نہیں جاتا تھا لیکن بلاشبہ مسلمانوں کی بالادستی حاصل تھی۔ اگست کے آخر تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہمارا اب ملتان میں رہنا ممکن نہیں۔

''ہمارے اپنے محلے میں ایک نوجوان ہندو سدآنند رہتا تھا۔ اس نے خراب صورتحال کے باوجود کوئٹہ میں اپنی ڈیوٹی پر پہنچنے کی کوشش کی۔ لوگوں نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ وہ بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ چنانچہ کوئٹہ میں اس کے گھر پر حملہ ہو گیا۔ اس نے بیوی بچوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ حملہ آوروں نے سدآنند کو قتل کر دیا اور فوراً فرار ہو گئے۔ اس طرح اس کے اہل خانہ کی زندگی بچ گئی اور بعدازاں وہ دہلی چلے گئے۔

''ملتان سے نکلنے کے لیے ہم نے ٹرین میں سفر نہ کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ غیر محفوظ تھا۔ ہم نے ملتان ائیرپورٹ پر پہنچنے کی تین بار کوشش کی لیکن ناکام رہے کیونکہ ائیرپورٹ جانے والی سڑکوں پر مسلح مسلمان گینگ قابض تھے۔ ضیاالدین نے ہمیں ائیرپورٹ تک پہنچنے میں مدد دی اور ہم فلائٹ پکڑ کر انبالہ چلے گئے۔ یہ غالباً ستمبر کا کوئی دن تھا لیکن مجھے درست تاریخ یاد نہیں۔ ہمارا کوئی قریبی رشتہ دار قتل نہیں ہوا۔ انبالہ میں سٹیشن ماسٹر مسٹر کپور نے ہماری بہت مدد کی۔ وہ بھی بنیادی طور پر ملتان کا رہنے والا تھا۔ اس نے ہمیں ایک ریلوے مکان میں رہنے کی اجازت دے دی۔ ہم نے انبالہ میں ہر طرف مسلمانوں کی لاشیں بکھری دیکھیں جو گل سڑ رہی تھیں۔

''مسلمان مہاجرین کے قافلے بھی ریلوے کوارٹروں کے پاس سے گزرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ضیاالدین ملتان سے دو سوٹ کیس لے آیا جو ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ وہ اتنا بہادر تھا کہ اکتوبر میں دہلی ہمیں سوٹ کیس پہنچانے آگیا۔

''بھارت میں زندگی ایک بڑی جدوجہد ثابت ہوئی۔ ہم ایک امیر خاندان کے تھے لیکن تقسیم کی وجہ سے مفلس ہو گئے۔ مجھے تعلیم جاری رکھنے کے لیے وظیفے اور دیگر امداد کا سہارا لینا پڑا۔ بھگوان نے مہربانی کی اور آج پھر ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے

ہیں لیکن میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں مرنے سے پہلے ایک بار ملتان جاسکوں۔"
یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جس پر میں نے انٹرویو ختم کر دیا۔

ملتان کے دیہی علاقے

میں دہلی کی سپر مارکیٹ میں اپنے دوست ہارون شاہ کی بیوی شیریں کے لیے شاپنگ کرنے گیا تو وہاں سے میں نے لاہور فون کیا تاکہ معلوم کر سکوں کہ کیا میں چوڑیاں خریدنے کے لیے درست مقام پر پہنچا ہوں جس دکان سے میں نے فون کیا اس کے مالک کے ساتھ میری بات چیت شروع ہو گئی۔ مسٹر گلاٹی اس بات پر خوش تھے کہ میں پاکستان سے تعلق رکھنے والا پنجابی ہوں۔ اس نے مجھے ملتان کے ایک گاؤں کا قصہ سنایا جہاں ہندوؤں کی بڑے پیمانے پر نسل کشی کی گئی۔

تری لوک کمار گلاٹی

"میں 10 اکتوبر 1946 کو تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان کے گاؤں خان بیلہ میں پیدا ہوا۔ میری والدہ نے ستمبر 1947 میں ہمارے گاؤں اور قریبی دیہات میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں قتل عام کا واقعہ سنایا تھا۔ کسی کو اصل تعداد کا علم نہیں۔ گاؤں کی سب سے بڑی دکان ہماری تھی اور میرے والد لالہ نریش کمار کی گاؤں میں بہت عزت تھی۔ اگرچہ اکثریت مسلمانوں کی تھی تاہم بہت بڑی تعداد میں ہندو بھی وہاں آباد تھے۔ حملہ ہوا تو بدحواسی میں غیر مسلم ہر سمت کو دوڑ پڑے۔ میری والدہ جن کی گود میں، میں تھا کو گاؤں کے مولوی کی بیٹی نے پناہ دی۔ ان دونوں کی گہری دوستی تھی۔ اس خاتون نے ہمیں مسجد کے پچھواڑے چھپا دیا جبکہ حملہ آور ظلم و بربریت کا بازار گرم رکھے ہوئے تھے۔ میری والدہ اور میرے سوا کوئی نہ بچا۔ بعد ازاں اسی رات کو ہمیں قریب ہی تعینات فوجی کیمپ تک پہنچا دیا گیا۔ مولوی کی بیٹی اور میری والدہ دونوں نے نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ اس لڑکی کا بھائی جو بہت اچھا انسان تھا ہمارے ساتھ تھا۔ اس طرح ہم حملہ آوروں کے جھرمٹ میں سے گزرنے میں کامیاب ہو گئے۔

"والدہ نے بتایا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے گاؤں کو جلتے دیکھا۔ کھیتوں میں جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ میری والدہ اور دیگر بچ جانے والے قریبی دیہات کے افراد کو ٹرک میں سوار کرا دیا گیا۔ 12 گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ملتان شہر پہنچے۔ میری والدہ کو تین روز تک کھانے کو کچھ نہ ملا پھر کوئی امدادی سامان آ گیا۔ اس کے بعد ہمیں ٹرین پر سوار کرا دیا گیا جس کی حفاظت پر فوج مامور تھی۔ وہاں سے ہم لاہور آئے اور پھر بھارت کی سرحد پار کر لی۔ اس وقت میرے والد کی عمر محض تیس سال تھی۔ انہیں اور میرے دادا کو قتل کر دیا گیا۔ صرف میرا ایک ماموں جو دوسرے گاؤں میں تھا بچ سکا۔ باقی تمام رشتہ دار مارے گئے۔ ہم کچھ عرصہ مشرقی پنجاب میں رہے پھر میری والدہ دہلی چلی آئیں۔ جہاں میرے ماما جی سکونت اختیار کر چکے تھے۔ ہم نے بڑی مشکل زندگی گزاری۔"

کھوسلہ رپورٹ میں خان بیلہ، کھاجی والا، جلال پور پیر والہ، بودھی اور ملتان کے کئی دیگر دیہات میں قتل عام کا کافی تفصیل سے ذکر ہے (1989: 184-9)۔

لائل پور (فیصل آباد)

لائل پور ایک نہری کالونی تھی جس کا نام ایک انگریز گورنر لائل کے نام پر رکھا تھا۔ (کچھ عرصہ قبل مسٹر لائل کے صاحبزادے مارک گرانٹ لائل پاکستان میں برطانیہ کے ہائی کمشنر بھی تعینات رہے۔) یہاں کی دو تہائی آبادی ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔ شہر کی کل آبادی 69 ہزار 930 میں سے سکھ اور ہندو 62 فیصد کی اکثریت میں تھے۔ یہ شہر پنجاب بھر سے آنے والے افراد نے آباد کیا تھا۔ یہ انتہائی پلاننگ سے آباد کیا گیا شہر تھا۔ کئی فیکٹریاں بالخصوص کاٹن جننگ اور ویونگ کے کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ دیگر علاقوں کی طرح لائل پور میں بھی اکثر انڈسٹری کے مالک سکھ یا ہندو تھے۔ پنجاب باؤنڈری کمیشن میں سکھوں اور ہندوؤں نے ضلع لائل پور کو مسلمانوں کی اکثریتی آبادی کے باوجود بھارت میں شامل کرنے کا بھرپور مگر ناکام مقدمہ لڑا۔ اگست سے پہلے یہاں فرقہ وارانہ تصادم کے اکا دکا واقعات ہی ہوتے تھے۔ البتہ مئی کے بعد سے یہاں سے ہندوؤں اور سکھوں نے دھیرے دھیرے نقل مکانی شروع کر دی تھی۔ پنجاب ہندو مہا سبھا کے صدر سر گوکل چند نارنگ کے بیٹی مسز وملا ورمانی اپنے شوہر کے ساتھ لائل پور میں رہتی تھیں۔

وملا ورمانی

''میری پیدائش لاہور میں ہوئی اور میں نے کنیرڈ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ میرے والد سر گوکل چند نارنگ ہندو مہا سبھا پنجاب کے لیڈر تھے۔ وہ بہت خوبصورت دن تھے۔ اچھے خاندانوں کی لڑکیاں آپس میں مل بیٹھتی تھیں اور مذہبی تفریق کی کم ہی فکر کی جاتی تھی۔ میرے شوہر ایبٹ آباد کی ممتاز کھتری خاندان کے چشم و چراغ تھے لیکن لائل پور میں ان کی کافی جائیداد تھی۔ پہلے ہم کراچی رہتے تھے پھر لائل پور آ گئے۔ ہمارا گھر اونچے طبقے کی آبادی سول لائنز ایریا میں تھا جو ڈپٹی کمشنر آفس کے بالکل قریب تھا۔ یہ ایک پر سکون شہر تھا۔ ہر کام اچھے طریقے سے ہوتا تھا۔ ہم مسلمان خاندانوں سے میل جول رکھتے تھے اور کافی ہلا گلا رہتا تھا۔ مجھے پیانو بجانے کا شوق تھا اور بسا اوقات مسلم خواتین بھی پیانو سننے آتی تھیں۔ کبھی کبھار ضلع کے مسلمان ڈپٹی کمشنر بھی ہمارے گھر آتے اور مذاق میں کہتے کہ پاکستان بننے کے بعد وہ اپنا گھر ہمارے گھر کے ساتھ بدل لیں گے۔ ڈی سی کا نام مجھے اب یاد نہیں۔ پنجاب میں ہر جگہ حالات بگڑ رہے تھے۔ لاہور میں آئے روز فسادات برپا ہوتے تھے اور جلاؤ گھیراؤ اور چھرا گھونپنے کے واقعات بھی عام تھے۔ یہ مئی کے آخری ایام تھے یا جون کا آغاز تھا جب ہم نے لائل پور چھوڑ دیا اور میسوری ہل سٹیشن منتقل ہو گئے۔ ہم نے کافی زیادہ جائیداد لائل پور میں چھوڑی لیکن ان دنوں بالخصوص جون 1947 میں کسی کو یقین نہیں تھا کہ آبادی کی نقل مکانی مستقل بنیادوں پر ہو گی۔ لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہوا میں نے اپنی آنکھوں سے کہیں تشدد نہیں دیکھا لیکن جب ہندو فوجی پنجاب سے بھارت آئے تو انہوں نے قتل، زیادتی اور زخمی کرنے کے ہولناک واقعات سنائے۔ ستمبر میں فیصل آباد میں ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف پوری شدومد سے حملے شروع ہو گئے۔ مجھے اس بات کا پتہ بھارت آنے والے خاندانوں سے چلا۔ تقسیم سے ایک پر امن اور پر مسرت پنجاب تباہ ہو گیا۔ میرے والد دہلی میں کبھی خوش نہیں رہے اور ہمیشہ لاہور کو یاد کرتے۔ یہی حال میرے سسر اور دیگر بڑوں کا تھا۔''

نقش لائل پوری

"میری بالی ووڈ کے معروف نغمہ نگار نقش لائل پوری سے ملاقات 2 جنوری 1997 کو ہوئی۔ پرانے (متحدہ) پنجاب بالخصوص اپنے آبائی شہر لائل پور کے لیے ان کا ناسٹلجیا ایک فطری امر تھا کیونکہ اس کا تعلق ان کے بچپن اور لڑکپن سے ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہندوستان کی تقسیم کے وقت میں لاہور کے ایک اخبار میں بطور صحافی کام کر رہا تھا۔ چنانچہ اطلاع ملنے پر میں جلدی میں لائل پور کی طرف گیا۔ ہم سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل بڑے قافلے میں شامل ہو گئے۔ دیگر واقعات کی طرح مجھے بھی تقسیم کے وقت جہاں انسانیت سوز کہانیاں سننے کو ملیں وہاں انسانی رحمدلی اور ہم آہنگی کی بھی شاندار مثالیں موجود ہیں۔ دوران سفر مجھے اتنی سخت بھوک لگی تھی کہ میں خوراک کی تلاش میں قریبی گاؤں چلا گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ میں اکیلا تھا اور نہ جانے اب میرے ساتھ کیسے حالات پیش آئیں۔ لیکن یہ خوف بلاجواز ثابت ہوا۔ میری ملاقات ایک کسان سے ہوئی تو میں نے کہا کہ مجھے کچھ کھانے کو دو۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ وہ میرے لیے سبزیاں، آٹا اور دودھ لے آیا کیونکہ میں نے اسے بتایا تھا کہ ہمارے قافلے میں شیر خوار بچے بھی تھے۔ اس کا نام عنایت علی تھا۔ قافلے پر راستے میں کئی بار حملہ ہوا لیکن کارواں میں مسلح سکھ ہونے کی وجہ سے ہم محفوظ رہے۔ انہوں نے انتہائی خطرناک حملے بھی پسپا کر دیے۔ راستے میں ہم نے ہزاروں لاشیں دیکھیں جن سے بدبو آ رہی تھی۔ سرحد پار مناظر بھی کچھ کم ہولناک نہیں تھے۔ میں کسی بھی مذہب کو 1947 کے واقعات پر موردالزام نہیں ٹھہراتا۔"

غلام رسول تنویر

"میں لائل پور میں 1924 میں پیدا ہوا۔ میں نے 46-1942 کے درمیان اسلامیہ ہائی سکول اور پھر خالصہ کالج لائل پور میں تعلیم حاصل کی۔ یہ دراصل سکھوں کا تعلیمی ادارہ تھا لیکن چند ہندو اور مسلمان بھی وہاں پڑھتے تھے۔ بعد ازاں میں نے لاہور کے مشہور گورنمنٹ کالج سے ایم اے کیا اور انگریزی پڑھانا شروع کر دی۔ میں فیصل آباد زرعی یونیورسٹی سے انگلش کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔

"لائل پور جو اب فیصل آباد ہے اتنا پرانا شہر نہیں تھا۔ بلکہ یہ انگریزوں کی بنائی نہری کالونیوں میں سے ایک تھا۔ چنانچہ تمام باسی نئے تھے اور مختلف علاقوں سے وہاں منتقل ہوئے تھے۔ میرے اپنے خاندان کا بنیادی طور پر تعلق مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ سے تھا۔ لائل پور کے دیہات میں مشرقی پنجاب سے پورے کے پورے دیہات لا کر بسائے گئے تھے۔ اس لیے جہاں شہر لائل پور میں لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے وہاں دیہات میں روابط ویسے ہی رہے جیسا کہ پہلے تھے۔

"چنانچہ شہر میں روشن خیال سماجی روایات نے فروغ پایا۔ جب میں کالج میں تھا تو تحریک پاکستان اپنے جوبن پر تھی۔ اگرچہ ماحول بدستور دوستانہ اور ہم آہنگی والا تھا لیکن فرقہ وارانہ حساسیت اتنی بڑھ چکی تھی کہ کوئی ایک چھوٹا سے واقعہ بھی جذبات کو اشتعال دلانے کا باعث بن سکتا تھا۔ غیر اہم معاملات کو بھی اہمیت دی جانے لگی تھی۔ مسلمان مجموعی طور پر غریب تھے اور صرف منشی محلہ میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی۔ اس کے علاوہ ارد گرد کے تمام علاقوں میں اکثریتی آبادی ہندوؤں

اور سکھوں کی تھی۔ یہ لوگ مسلمانوں کو کاروبار کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ صرف پانچ یا چھ دکانیں مسلمانوں کی تھیں۔ لہذا معاشی میدان میں غیر مسلموں کی مکمل اجارہ داری تھی۔ یہاں تک کہ ہندوؤں نے اب منشی محلے کی جائیدادیں خریدنا بھی شروع کر دی تھیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کو لائل پور کے دیگر علاقوں کی طرف جانا پڑا۔ یہ ایک نئی کالونی تھی جسے میاں غلام باری کے بڑے بھائی اور مسلم لیگی لیڈر عبدالباری نے آباد کرنا شروع کیا تھا۔

''صرف ایک محلے میں تمام مذاہب کی ملی جلی آبادی تھی۔ یہ محلہ وکیلاں تھا جہاں میری پیدائش ہوئی تھی۔ یہاں زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگ رہتے تھے۔ کچھ ہندو نہایت شائستہ اور شریف بھی تھے۔ لائل پور کے بڑے ڈینٹسٹ ڈاکٹر ڈوڈی اور ان کی اہلیہ بہت روشن خیال تھے۔ وہ بنیادی طور پر ضلع گجرات کے علاقے کنجاہ کے رہنے والے تھے۔ یہاں تک کہ ہم ان کے کچن میں بھی چلے جاتے تھے لیکن وہ غیر مسلموں کے اس اقدام کا کبھی برا محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہ خود بھی ہماری طرف آکر ہمارے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ جب کبھی ڈاکٹر ڈوڈی اور ان کی بیوی فلم دیکھنے جاتے تھے تو وہ اپنا لڑکا اور چھوٹی بچی ہمارے گھر میں چھوڑ جاتے تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں روشن خیال تھے لیکن ان کے رشتہ دار ان کی روشن خیالی پر اعتراض کرتے تھے۔

''تقسیم کے وقت لائل پور میں شاید ہی کوئی سنگین نوعیت کا تصادم ہوا ہو۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر عبدالحمید سختی سے غیر جانبداری پر عمل کر رہے تھے، یہی وجہ تھی کہ غیر مسلم بحفاظت قصبے سے چلے گئے۔ ستمبر 1947 کے آخر تک شہر میں غیر مسلم بڑی تعداد میں موجود رہے۔ البتہ مجھے ایک واقعہ یاد ہے۔ تقسیم کے بعد ڈپٹی کمشنر شہر کے مشہور گھنٹہ گھر چوک پر تمام برادریوں کے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ اگر غیر مسلم پاکستان میں رہنا چاہیں تو وہ اسے ہر صورت میں یقینی بنائیں گے۔ ابھی ڈپٹی کمشنر خطاب کر رہے تھے کہ مجمع میں شور بلند ہوا کسی نے بعض افراد کو چھرا گھونپ دیا تھا۔ کچھ غیر مسلم زخمی ہوئے اور غالباً مر بھی گئے تھے۔ یہ ایک بڑا اجتماع تھا لیکن واقعے کے فوراً بعد لوگ منتشر ہو گئے اور فضا مکدر ہو گئی۔''

کھوسلہ رپورٹ میں بھی یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ ڈپٹی کمشنر لائل پور آغا عبدالحمید نے اپنی ڈیوٹی غیر جانبداری سے نبھائی اور ہزاروں غیر مسلموں کو بچایا تاہم یہ الزام لگایا گیا کہ آخر میں ڈپٹی کمشنر کی اتھارٹی کمزور پڑ گئی اور صورتحال کنٹرول سے باہر ہوتی چلی گئی۔ بالخصوص سکھوں کو چن چن کر نشانہ بنایا گیا کیونکہ مشرقی پنجاب میں زیادہ تر ظلم و جبر ان کے ہم مذہب بھائیوں نے ہی برپا کر رکھا تھا (Khosla,1989:166)۔ زیادہ تر بہیمانہ واقعات دیہی علاقوں میں پیش آئے۔

لائل پور کے دیہی علاقے

عبدالباری

''ہمارا تعلق آرائیں برادری سے ہے۔ ہمارا خاندان 1898 میں ضلع ہوشیارپور سے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک گاؤں میں منتقل ہوا تھا۔ ہمارے گاؤں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی تاہم بودھووالا کے چند کھتری ہندوؤں کی بھی کچھ دکانیں تھیں۔ ہندو تعلیم یافتہ تھے اور ہمارے ان کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ اس کے باوجود وہ ہمیں اپنے باورچی خانے میں داخل ہونے دیتے تھے نہ

ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ ہمارے علاقے میں سکھوں کے بھی کافی دیہات تھے۔ پاکستان اگرچہ بن چکا تھا لیکن اس کے باوجود سکھ اور ہندو یہاں سے نہیں نکلے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں نے حملے شروع کر دیے اور کئی سکھ مارے گئے۔ کچھ نوجوان ڈر کر کھیتوں میں چھپ گئے اور اس وقت تک چھپے رہے جب تک فوجی انہیں بچانے کے لیے نہ آ گئے۔ حملہ آور مسلمان جھنگ سے آئے تھے۔ ہماری طرح سکھ بھی یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔

"ایک سکھ گربچن سنگھ بھی میرا دوست تھا اور میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ وہ قریبی گاؤں میں رہتا تھا۔ اس کے والد حاکم سنگھ فوج سے کرنل کے عہدے پر ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ دو ماہ پہلے ہی ریٹائر ہوئے تھے اور بھارت منتقل ہو گئے تاہم والدین کے کہنے کے باوجود گربچن سنگھ نے جانے سے انکار کر دیا۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ مجھے ملنے آیا تھا لیکن میں کسی کام سے جھنگ گیا ہوا تھا۔ ہمارے گاؤں کے سکھوں نے اسے کہا: 'تم عبدالباری کے دوست ہو اس لیے ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے لیکن تم یہاں سے چلے جاؤ۔' وہ چلا گیا لیکن ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اسے قتل کر دیا گیا۔ میں کبھی کبھار اسے یاد کرتا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو نکل آتے ہیں۔ وہ نہایت شائستہ انسان تھا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہندوؤں کو کم ہی چھیڑا گیا لیکن سینکڑوں سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی مشرقی پنجاب میں سکھوں کی بربریت کی داستانیں زبان زد عام تھیں۔ کئی سکھ خواتین اغوا بھی ہوئیں۔ بعض کو بازیاب کرا لیا گیا لیکن تمام عورتیں برآمد نہیں ہو سکیں۔

"لائل پور میں سکھوں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی کیونکہ نہری کالونی بناتے وقت انگریزوں نے سب سے زیادہ زمینیں انہی کو الاٹ کی تھیں۔ اگرچہ ان دیہات میں بھی تشدد کے واقعات ہوئے تاہم دیگر اضلاع کی بہ نسبت یہاں ہندوؤں اور سکھوں کا جانی نقصان کم ہی ہوا تھا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے اور نیچے دیے گئے انٹرویوز سے بھی اس کو تقویت ملتی ہے کہ یہ بات درست ہے۔ مارچ 2004 کے دوران میرے دوست وِکی، ڈرائیور نانک سنگھ اور میں نے لدھیانہ کے کئی دیہات کا دورہ کیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ لائل پور کے کئی سکھ دیہاتی لدھیانہ آکر آباد ہوئے تھے۔ صیغہ واحد متکلم میں چند تاثرات نیچے دیے گئے ہیں۔

"ایک اور حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ جن غیر مسلم قافلوں کی حفاظت فوج کر رہی تھی وہ حملوں کے باوجود زیادہ نقصان سے بچے رہے جبکہ جہاں فوج نہیں تھی وہاں مسلح افراد کے باوجود حملہ آوروں نے کافی تباہی پھیلائی۔ اس کی ایک مثال نیچے دی گئی ہے۔ یہ قافلہ فوج کی سکیورٹی کے بغیر 15 اگست کو بھارت کے لیے روانہ ہوا۔ اس کے بعد ستمبر میں ایک اور قافلہ چلا لیکن اس کے ساتھ فوج تھی۔ دونوں واقعات میں فرق صاف ظاہر ہے۔"

نشاطر سنگھ

"میں ضلع و تحصیل لائل پور کے چک نمبر 275 میں پیدا ہوا۔ ہم سب آبادکار تھے۔ گاؤں میں چند گھرانے تیلی مسلمانوں کے تھے، لیکن زمیندار ایک بھی نہیں تھا۔ ہمارے ہمسایہ دیہات کے مسلمانوں سے اچھے مراسم تھے۔ مسلمان زیادہ تر ورک اور گل Gill جاٹ تھے جبکہ ہم گریے وال تھے۔ 15 اگست کو لائل پور سے نقل مکانی کرنے والا پہلا قافلہ ہمارا تھا۔ ہماری اچانک روانگی کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان ورک جاٹوں نے ہمیں خبردار کیا تھا کہ جھنگ سے غیر مسلموں پر حملوں کی منصوبہ بندی کی جا رہی تھی۔ ارد گرد کے کئی دیہات کے افراد نے بھی ہمارے ساتھ جانے کی ٹھان لی تاہم کئی افراد نے ہمارا مذاق اڑایا کہ ہم ضرورت

سے زیادہ خوفزدہ ہوئے ہیں۔ راستے میں کئی دیگر دیہات کے سکھ بھی کارواں میں شامل ہوتے گئے۔ یہ قافلہ اتنا طویل تھا کہ کسی کو کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ اس میں کیا ہو رہا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ قافلہ 32 میل لمبا تھا۔ اس میں 50 ہزار افراد شامل ہوں گے۔ ہم کسی فوجی سکیورٹی کے بغیر روانہ ہوئے۔ جڑانوالہ میں ہمیں ایک گہری اور چوڑی نہر پار کرنا تھی۔ وہاں ہمیں پاکستان آرمی کے چند یونٹ ملے۔ انہوں نے حکم دیا کہ ہمارے پاس جو اسلحہ ہے وہ ان کے حوالے سے کر دیا جائے۔ قافلے میں کئی ریٹائر فوجی بھی شامل تھے۔ چند پینشنر کیپٹن سکھ آگے آئے اور کہا کہ وہ ہتھیار نہیں حوالے کریں گے۔ ان فوجیوں نے اسلحہ چھیننے کی کوشش کی اور کچھ بندوقیں لے بھی گئے۔ اس موقع پر فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا۔ دو خواتین، ایک مرد اور دو بچے اس کارروائی میں مارے گئے۔ قافلے میں سے جو فائرنگ ہوئی اس کے نتیجے میں چھ مسلمان مارے گئے اور سات کو ہم نے زندہ پکڑ لیا۔ 3 ہزار راؤنڈ بھی ہم نے قبضے میں لے لیے۔

''نہر کے ساتھ دونوں طرف سے مسلح افراد نے پوزیشنیں سنبھال لیں جس کی وجہ سے قافلے کو سفر روکنا پڑا۔ جب ہم نہر سے پانی لینے جاتے تو پولیس یا فوج والے ہم پر گولیاں چلاتے۔ ان کے پاس برین گنیں اور دیگر خودکار اسلحہ تھا۔ نہر پر ہمیں اٹھارہ روز تک رکنا پڑا۔ ہمیں جو کچھ ملتا کھا لیتے بارشیں شروع ہو گئیں اور ہیضہ اور ملیریا کی وبائیں پھوٹ پڑیں۔ پھر ایک روز بھارتی فوج کے ڈوگرہ سپاہی وہاں آ نکلے۔ وہ ہمیں بلوکی ہیڈورکس پر لے گئے۔ کئی قافلے والے شدید بیمار تھے۔ کارواں کی قیادت کرنے والے افراد نے بتایا کہ سفر کے دوران ایک ہزار لوگ مارے گئے۔ بھارتی سرحد پار کرتے ہمیں مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے چند قافلے نہر پار کرتے نظر آئے۔ ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھا گیا۔ مزید سات روز بعد ہم مشرقی پنجاب کے علاقے کھیم کرن پہنچے۔

''مجھ سے یہ بات مت پوچھیں کہ اس طرف میں نے کیا دیکھا۔ ہر طرف عورتوں، مردوں اور بچوں کی لاشیں بکھری تھیں۔ کتے اور گدھیں مردہ لاشیں کھا رہے تھے۔ تقسیم کے وقت ہزاروں افراد موت کا شکار ہوئے اور بیشتر افراد مون سون کی بھاری بارشوں اور بیماریوں کے باعث ہلاک ہوئے۔''

گردیو سنگھ

''میں 1922 میں چک نمبر 68 ضلع لائل پور میں پیدا ہوا۔ ہم گاؤں کے نمبر دار اور ذیلدار تھے۔ دو نمبرداروں میں سے ایک ہمارے بزرگ بدھ سنگھ تھے۔ بھشن سنگھ ذیلدار تھے۔ مسلمانوں کی کاریگر برادریوں کے افراد بھی ہمارے گاؤں میں رہتے تھے۔ ان میں تیلی، جولاہے اور لوہار شامل تھے۔ ہمارا گاؤں جھنگ برانچ نہر کے کنارے واقع تھا۔ اکالی لیڈر گیانی کرتار سنگھ ہمارے ہی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس نے لائل پور سے رخصتی کے وقت ہماری کوئی مدد نہیں کی لیکن ہمیں جبراً وہاں سے نکالا گیا۔ دراصل 15 اگست کے بعد زیادہ ہلاکتیں نہیں ہوئیں۔ پھر ہم نے سنا کر سرگودھا میں ہندوؤں پر حملے کر کے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا۔ انہیں بھارت جاتے ہوئے ہمارے علاقے سے ہی گزرنا پڑا لیکن یہاں پھر لائل پور شہر کے علاقے طارق آباد کے مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔ کئی افراد مارے گئے۔ پھر گیانی کرتار سنگھ آیا اور کہا کہ ہم مزید بدترین حالات کے لیے تیار رہیں۔ ہم نے صوبہ سرحد کے مسلمانوں سے اسلحہ خرید رکھا تھا اور ہمارے

پاس لائسنسی ہتھیار بھی تھے۔ علاقے کے مسلمان تھانیدار نے ہمیں کہا کہ اسے ہمارا اسلحہ ضبط کرنے کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا ہم ہتھیار چھپالیں۔ تھانیدار کا نام بہادر شیر تھا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا جو جانتا تھا کہ ہتھیاروں کے بغیر ہم ہر طرف سے ہونے والے حملوں کے مقابلے میں بے دست و پا ہو جائیں گے۔ ہم چک نمبر 40 میں گئے اور گیانی کرتار سنگھ کے والد بھگوان سنگھ سے ملے۔ اس نے کہا کہ تم لوگ اپنے گھوڑے تیار رکھو لیکن گیانی سنگھ نے کہا کہ فوجی دستے آنے تک ہم ہرگز یہاں سے نہ نکلیں۔ چک نمبر 9 کے گل جاٹ بھی قافلے میں شامل ہو گئے۔

''ہم گورکھا اور ڈوگرہ سپاہیوں کی حفاظت میں 31 ستمبر کو روانہ ہوئے۔ ہمیں سڑک پر چلنا تھا کیونکہ 90 سے 100 دیہات کے لوگ کارروان میں شامل ہو چکے تھے۔ میرے خیال میں چک نمبر ایک سے چک 100 تک کے مکین شامل تھے۔ زیادہ پریشان کن مسئلہ بوڑھے اور بیمار افراد کا تھا۔ حاملہ عورتیں اور بچوں کا بھی مسئلہ تھا۔ یہ مایوس اور خوفزدہ انسانیت کا ایک سمندر تھا۔ ہم ان دیہات سے رخصت ہو رہے تھے جو ہم نے محنت اور لگن سے آباد کیے تھے۔ راستے میں کئی جگہ مسلح تصادم ہوا، لیکن حملوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی کیونکہ گورکھا اور ڈوگرہ فوجی کافی محتاط تھے۔ ان کی وجہ سے قافلے پر کوئی بڑا حملہ نہ ہوا۔ میرا خیال ہے 100 سے کم افراد نے جان سے ہاتھ دھوئے۔

''ہمیں لائل پور کے خالصہ کالج بھجوایا گیا۔ (اس موقع پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا) وہاں ہم نے دو روز تک انتظار کیا۔ بلوکی ہیڈورکس کے قریب سے ہم نے بھارت کی سرحد پار کرنا تھی۔ وہاں کافی مقدار میں پاکستانی فوج بھی موجود تھی۔ انہوں نے ہمارے مویشی چھیننے شروع کر دیے حتیٰ کہ انہوں نے ہمیں پانی حاصل کرنے سے بھی روکا۔ ایک انگریز افسر ان کے ساتھ تھا۔ وہ پاکستانی فوجیوں کے مویشی لے جانے کے عمل کی نگرانی کر رہا تھا۔ پھر ہمارے ساتھ ایک گورکھا فوجی بھی تھا اس نے احتجاج کرتے ہوئے اپنی رائفل تان لی اور کہا: 'تم لوگ لڑنا چاہتے ہو یا انصاف کا بول بالا چاہتے ہو؟' چنانچہ ہمارے جانور ہمیں واپس کر دیے گئے۔ پھر ایک سکھ فوجی افسر آگے بڑھا اور انگریز افسر کو کہا کہ تم نے شراب پی رکھی ہے اور تمہیں کچھ پتہ نہیں کہ تمہارے ماتحت فوجی کیا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم قصور پہنچے اور پھر بھارت داخل ہو گئے۔ وہاں سے ہمیں کپور تھلہ بھجوایا گیا (غالب کلاں ضلع لدھیانہ)۔

''ہم میں سے کئی آج سے آٹھ یا نو سال پہلے ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ کی زیارت کے لیے پاکستان گئے۔ وہاں پولیس نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا کہ ہمارے آبائی گاؤں کے چند مسلمان ہمیں ملنے کے لیے آئے ہیں۔ ان تمام برسوں میں ان مسلمانوں کی طرف سے ہمیں کئی پیغام موصول ہوتے رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم ان سے ملیں بھی اور مقدس مقامات کی زیارت کرنے بھی آئیں۔ خطوط اور دیگر ذرائع سے ہمارے رابطے برقرار رہے۔ جب ہم ملے تو گلے لگ کر رونے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ جب ہم یہاں رہتے تھے تو زندگی بہت اچھی تھی۔ ہمارے بعد جو مسلمان یہاں گاؤں میں آباد ہوئے ان کے ساتھ پیار محبت کے وہ تعلقات کبھی فروغ نہ پا سکے جو ہمارے ساتھ تھے۔ یہ ہمارے سابقہ ہمسائے آج بھی اتنے غریب ہیں جتنے پہلے تھے۔ ہم نے انہیں اونی کپڑے اور تحائف دیے۔ وہ رو دیے اور ہماری بھی آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں ہمیشہ وہ پرامن اور دوستانہ تعلقات یاد کرتا ہوں جو کبھی ہم پاکستان میں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔''

گوبند ٹھکرال

"بعض اوقات بچپن کی کچھ خوفناک یادوں کو دہرانا شاید اصل واقعات سے زیادہ المناک ثابت ہوتا ہے۔ یہی کچھ تقسیم کے وقت ایک پوری نسل کے ساتھ ہوا۔ ان لوگوں کو ہندوستان کی سیاسی تقسیم کی وجہ سے اپنے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے ساتھ اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اس کے بعد مہاجرین کے انبوہ کثیر کا سامنا کرنا پڑا۔ تشدد کے جو مناظر انہوں نے دیکھے ہزاروں افراد کی ہلاکت اور اپنے ہی ہمسایوں یا دوستوں کے ہاتھوں ظلم و جبر دیکھنے سے ان کے لاشعور پر ناقابل تلافی اثرات مرتب ہوئے اور وہ ان سوچوں کی یلغار سے کبھی نہ نکلے۔ اس کے بعد یہ قسمت کے مارے آپس میں بیٹھ کر اپنے کھوئے ہوئے گھروں، زمینوں، چراگاہوں اور دریاؤں کو برسوں بلکہ مرنے تک یاد کرتے رہے۔ یہ لوگ اپنے پیاروں کو یاد کرتے لیکن ان کے اندر ڈراؤنے خوابوں کی فلم ہمیشہ چلتی اور ستاتی رہتی۔ کبھی کبھی اس کا ردعمل کتھارسس کی صورت میں بھی سامنے آتا۔ نیچے ہم نے گوبند ٹھکرال کی داستان غم رقم کی ہے جو بچپن کے المناک واقعات کے پہلو سے بیان کی گئی ہے۔

"مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میرا سب سے چھوٹا، طویل القامت اور وجیہ چچا ایک روز کسووال ضلع منٹگمری سے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہمارے گاؤں جھکڑ ملنے آیا۔ وہ میرے والد، ماموں اور دیگر بڑے کزنوں کے ساتھ بیٹھ کر اردو اخبارات اور نقشوں کی مدد سے یہ واضح کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ کس طرح ہندوستان تقسیم ہونے والا تھا اور ہمیں جلد یا بدیر یہ گھر چھوڑ کر امرتسر کے اس طرف جانا پڑے گا۔ اگرچہ وہ اخبارات سے پڑھ کر خبریں سناتا تھا لیکن کسی کو بھی اس کی بات کا یقین نہیں آتا تھا۔ میرے والد کو بھی اس کا یقین نہیں تھا بلکہ انہوں نے چچا کا مذاق بھی اڑایا لیکن خود اندر سے وہ بہت تنہا اور اداس تھے کہ 'اگر ایسا ہو تو کیا ہو گا؟' اس کے بعد زندگی کی معمول کی رونق، کھیتوں کی طرف گھوڑے پر بیٹھ کر جانے سے یہ خوف مجھ سے دور ہی رہا۔ سکول میں جہاں میں دوسری جماعت کا طالبعلم تھا۔ وہاں ہمارا ٹیچر ایک مسلمان تھا وہ ایک چاقو پاس رکھتا تھا اور کبھی کبھی چاقو نکال کر مذاق میں ہمیں کہتا کہ کس طرح وہ ہمارے (غیر مسلموں کے) گلے کاٹے گا۔ دوسرے کلاس ٹیچر مولوی غلام محمد (جو ہمارے والد کا گہرا دوست تھا) نے اس ٹیچر کو گالیوں سے جواب دیا۔

"ہم اس ناخوشگوار لطیفے سے زیادہ خوفزدہ نہ ہوئے اور سکول میں اپنی معمول کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ہم گنتی یاد کرتے اور نظمیں پڑھتے تھے، یہاں تک کہ بیک وقت آزادی اور تقسیم کا اعلان ہو گیا۔ عام آدمیوں کو اس کا اندازہ نہ ہو سکا کہ آخر ایک اچھی لہر بری لہر میں کیوں تبدیل ہو گئی۔ لیکن یہ بات ہمارے بڑوں پر واضح ہو چکی تھی کہ اب انہیں اپنا تحفظ کرنا پڑے گا اور شاید انہیں کسی محفوظ جگہ پر منتقل ہونا پڑے گا۔ سکھوں اور ہندوؤں جو ایک دوسرے کے خونی رشتہ دار تھے نے ایک کمیٹی تشکیل دی تاکہ وہ ان مسلمانوں دوستوں کے ساتھ اپنے تحفظ کے لیے مذاکرات کر سکیں جن کے ساتھ ان کے صدیوں پر محیط مراسم تھے۔ ہم ایک دوسرے کی عبادتگاہوں میں بھی جاتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں کئی مساجد، درگاہیں، شیوجی کا مندر اور ایک بڑا گوردوارہ تھا۔ ہم ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے اور تہواروں اور کھیتی باڑی میں ساتھ ہوتے تھے۔ کچھ کے آپس میں تجارتی روابط بھی تھے۔

"جلد ہی ہمارا گاؤں چھوٹے سے قلعے میں تبدیل ہو گیا جہاں ہر کسی کے پاس گنڈاسہ، مضبوط لاٹھی، تلوار یا بندوق تھی۔ ہم اپنے چھوٹے سے گاؤں کے اردگرد آبادیوں میں چیخیں سنتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گاؤں کے کچھ مسلمان اپنے غیر مسلم

دوستوں اور ہمسایوں کے پاس جاتے اور انہیں بر ملامشاورت اور اخلاقی حمایت کا یقین دلاتے۔ کچھ نے تازہ سبزیاں بھی خریدیں اور وعدہ کیا کہ وہ غیر مسلموں کے مویشیوں اور کھیتوں کی دیکھ بھال کریں گے۔ بلاشبہ ایک پر سکون گاؤں جارحانہ اور مسلح کیمپوں میں تبدیل ہو گیا۔ ہر کوئی دوسرے سے خوفزدہ تھا۔ اچانک ہم بچوں کی کھیلیں کبڈی یا فٹبال سے جنگی مشقوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہمارے پاس بھی چھوٹے ہتھیار ہوتے تھے اور ہم اپنے دشمن سے تصوراتی لڑائی لڑتے۔ مجھے اپنے ارد گرد ہونے والے مذاکرات کا تو علم نہیں تھا لیکن بہر حال یہ خوفزدہ کرنے والا عمل تھا۔ رات کو دور سے چیخوں اور بین کرنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

''ہم نے سنا کہ ایک خاندان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا تھا۔ کچھ روز بعد ہمارے بڑوں نے ایک قافلے کے ساتھ قریبی قصبے کمالیہ منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ مجھے علم تو نہیں لیکن غالباً بزرگوں نے حفاظتی نکتہ سے ایسا کیا۔ شاید مقامی انتظامیہ نے انہیں خبر دار کیا تھا کہ یہ علاقہ اب پاکستان کا حصہ ہے اور غیر مسلموں کو یہاں سے ہندوستان جانا ہو گا کیونکہ یہاں صرف مسلمان ہی رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہم مسلسل لفظ 'تقسیم' سننے لگے۔ البتہ اس کا مطلب ہمیں پتہ نہ چل سکا۔ ماسوائے اس بات کہ اب ہم مسلمان بچوں کے ساتھ نہیں کھیل سکیں گے۔ ہم ایک دوسرے کو عرفیت سے بلاتے تھے۔ ہم میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا صرف تہواروں پر لباس مختلف ہوتا تھا لیکن اس سے کم ہی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

''تمام سامان باندھ لیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ میری ماں نے چرخہ بھی باندھ لیا۔ وہ کتنی پر امید ہوں گی لیکن اس وقت انہیں اندازہ نہیں ہو گا کہ وہ اب کبھی اس گاؤں، اس گھر اور مٹی پر واپس نہیں آئیں گی۔ ہمیں مویشی پیچھے ہی چھوڑنا پڑے۔ کمالیہ میں ہم اپنے رشتہ داروں کے گھر مقیم ہو گئے۔ یہ ایک قلعہ نما بڑی حویلی تھی جس کا تہہ خانہ بھی تھا۔ تمام صندوق اور دیگر سامان ترتیب سے لگا دیا گیا اور جس وقت خواتین ان کاموں میں مصروف تھیں اس وقت مرد گھر اور باہر کی حفاظت پر مامور تھے۔ کچھ خستہ حال ہتھیار تھے اور کچھ دستی بندوقیں تھیں لیکن ہم بچوں کو یہی کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کیا ہمیں اب نئے کپڑے اور پیسے ملیں گے۔ ہم کو روزانہ برفی یا لڈو خریدنے کے لیے ایک آنہ ملتا تھا۔ ہم کھا کر بہت خوش ہوتے اور ادھر ادھر کھیلتے رہتے۔ ہم شہر میں کبھی اتنے عرصے تک نہ رہے تھے اس لیے ہمارے لیے یہ بھی ایک نئی چیز تھی۔ لیکن یہ عرصہ بھی جلد بیت گیا۔

''ایک روز فوجی ٹرک آئے اور تمام مرد، عورتیں اور بچے جلدی سے اس قافلے میں شامل ہو گئے جو دور کی سرزمین ہندوستان جا رہا تھا۔ ہم نے پہلی بار لفظ قافلہ سنا لیکن یہ تباہی کا ہم مترادف بن گیا۔ وہ دو یا تین ٹرک ایک ہندو افسر کے رشتہ داروں کو لے کر جالندھر چلے گئے اور جو افراد باقی رہ گئے وہ لٹیروں اور قافلوں کے نرغے میں آ گئے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو بین کرتی عورتیں اور چیختے چلاتے بچے پیچھے رہ گئے۔ میں آگ لگنے اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ کا مفہوم نہ جان سکا۔ میں نے لوگوں کو اپنے ہی خون میں نہائے دیکھا۔ ہم سب خوفزدہ تھے۔ اگلے کئی روز تک ہم ایک سکول میں پناہ گزین رہے۔ ہمارے رشتہ دار ہم سے بچھڑ گئے اور اچھی جسامت والے مسلح افراد ہماری حفاظت کر رہے تھے۔ میں نے اس سے پہلے لوگوں کو کبھی اس طرح دعائیں کرتے نہیں سنا تھا۔ کھانے پینے کو بہت کم چیزیں ملتی تھیں۔ بچوں کو ایک خستہ حال کچن سے کچھ کھانے کو ملتا تھا۔ ایک نلکے سے پانی حاصل کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف رہتے۔ ہم ارد گرد فائرنگ کی آوازیں سنتے بلکہ سکول میں دستی بم بھی پھینکے گئے۔ کچھ روز بعد فوج آ گئی۔ ایک قافلہ تشکیل دیا گیا اور ہمیں غلہ منڈی جو کبھی بھرپور شہر تھا کی طرف

لے جایا گیا۔ وہاں زندگی ایک عذاب تھی۔ محدود خوراک ملتی جبکہ برتن ندارد۔ دہشت زدہ لوگ چپکے سے بیٹھے صرف آپس میں سرگوشیاں کررہے تھے۔ وہ ان لوگوں کی گنتی کررہے جو کیمپ میں پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ جب بھوک ناقابل برداشت ہوگئی تو میرے والد اور ان کے ایک دوست تلوار ہاتھ میں سونت کر 2 کلومیٹر دور قصبے کی طرف روانہ ہوگئے تا کہ کچھ غذا اور برتن خریدے جاسکیں۔ خواتین نے روتے ہوئے انہیں دہائی دی کہ خطرہ مت مول لیں لیکن وہ چلے گئے اور کچھ دیر بعد ایک بڑے برتن کے ساتھ آئے۔ کچھ دیر بعد ہمارے مسلمان چچاؤں اور پھوپھیوں نے خوراک بھی بھیج دی۔ مجھے اپنی پسندیدہ آنٹی جو ہمارے وجیہ انکل کالو جھکڑ کی طویل القامت بہن تھیں کی بری طرح یاد آنے لگی۔ مجھے ان کی گرمجوش جپھی یاد آرہی تھی۔ مجھے آج بھی ان کی چٹکیاں اور بوسے یاد آتے ہیں۔ میرے والد کے نزدیک وہ ان کی سگی بہن جیسی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔

"ایک ماہ بعد مزید چند فوجی ٹرک آئے اور ہمارا کارواں پھر چل پڑا اور ہمیں لاہور پہنچا دیا۔ کچھ لوگ ٹرین پر بیٹھ کر لاہور پہنچے۔ راستے میں چار سو ہم تباہی دیکھ سکتے تھے، لاشیں اور اجاڑی گئی فصلیں ہر طرف دکھائی دے رہے تھیں۔ سڑکوں اور کھیتوں میں مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں تھیں۔ کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ اگلا سانس بھی لے سکے گا یا نہیں۔ پھر ہم نے لاہور میں اپنی پہلی اور آخری رات گزاری۔ متحدہ پنجاب کا وہ دارالحکومت جس کے بارے میں جانے ہم نے کیا کیا خوبصورت کہانیاں سنی تھیں اور ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہم اعلیٰ تعلیم لاہور میں حاصل کریں گے۔ یہ ایک دل فگار عبوری دور تھا۔ اس دوران پیچش کی وبا پھیل گئی تھی اور لوگ ادھر ادھر الٹیاں اور گند کررہے تھے۔ خوش قسمتی سے ہم (یہ بات ہماری ماں نے ہمیں بتائی) پیاز کی مدد سے بچ گئے جو ہماری والدہ نے جھولے میں ڈال رکھے تھے۔

"اگلی صبح ہم لاہور سے نکلے اور جب ہم نے واہگہ بارڈر پار کی اور ہندوستان پہنچے تو ہمیں اس نئی سرزمین یا وہاں اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود لوگ خوشی سے نعرے لگا رہے تھے اور ہندوستان کی مٹی کو چوم رہے تھے۔ جو لوگ بچ گئے وہ شکر ادا کررہے تھے اور ان لوگوں کو رورہے تھے جو ان سے بچھڑ چکے تھے۔ مجھے ٹرکوں سے پناہ گزینوں کے زمین پر خوشی سے کودنے کا منظر آج بھی یاد ہے۔ شاید وہ اسی بات پر خوش تھے کہ زندہ بچ گئے تھے۔"

پروفیسر پریم سنگھ کاہلوں

میرا پروفیسر پریم سنگھ کاہلوں سے رابطہ انٹرنیٹ سے ہوا کیونکہ ہم دونوں پنجابی ثقافت اور یہاں کے لوگوں کی گزر بسر کے موضوع میں دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ وہ میری کتاب کے لیے اپنے خاندان کی 1947 میں بھارت کو ہجرت کی داستان لکھیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا کہ:

"میں 1947 میں گیارہ سال کا تھا اور ضلع لائل پور کی تحصیل جھنگ کی سرحد کے قریبی گاؤں میں پرورش پائی۔ علاقے میں اکثریتی آبادی مسلمانوں کی تھی۔ اگست میں ہم اپنے گاؤں سے اپنے ننھیالی گاؤں کوٹ نہال سنگھ منتقل ہوگئے۔ (اس سٹیشن کا نام اب تبدیل ہوچکا ہے، یہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نزدیک گوجرہ سٹیشن سے ذرا پہلے آتا ہے: مصنف)۔ لائل پور سے گوجرہ جاتے ہوئے راستے میں سکھوں کے بے شمار دیہات آتے تھے۔ اس علاقے میں ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ

وہاں سکھوں کی بھاری آبادی موجود تھی جن کے پاس مقامی ساختہ کافی اسلحہ بھی تھا۔ میں نے سنا کہ ٹرینوں کو مسلمانوں کے دیہات کے قریب روک لیا جاتا اور مسلمان غنڈے ٹرینوں میں کود کر لوٹ مار اور قتل وغارت کرتے تھے۔ جب وہ اپنا کام کر لیتے تو کنڈکٹر سٹی بجاتا اور ٹرین اگلے گاؤں کے لیے روانہ ہو جاتی۔ البتہ ایسے عناصر ہمارے علاقے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہاں مسلح سکھوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد ہمیں کچھ گاؤں خالی کرنا پڑے اور ہم ریلوے لائنوں سے دور چلے گئے۔ ہم سب ٹھیکری والا بنگلہ میں جمع ہو گئے جو لائل پور-جھنگ روڈ پر لائل پور شہر سے 10 میل کے فاصلے پر تھا۔

"ایک روز ایک پولیس اہلکار میرے والد کے پاس آیا اور کہا کہ تھانیدار نے انہیں طلب کیا ہے۔ جب وہ پولیس سٹیشن گئے تو اس نوجوان ایس ایچ او نے کہا: 'چاچا توپاں شوپاں بند کرو، نئی تے ملٹری آئے گی۔' (غالباً وہ سکھوں کی بندوقوں، رائفلوں کا حوالہ دے رہا تھا)۔ یہ شخص جھنگ کا رہنے والا تھا اور اس کا والد ہمارے خاندان کو جانتا تھا۔ ان دنوں ایک پولیس افسر کسی بھی شہری کو اٹھوا کر قتل کر سکتا تھا۔ اصل میں وہ ہماری مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس علاقے میں مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی آبادی تھی جنہوں نے شکایت کی تھی کہ کیمپ لگانے والے مسلح سکھوں سے ان کی جان کو خطرہ تھا۔ میرے والد نے سکھوں سے کہا کہ وہ مشق کرنا بند کر دیں ورنہ فوج حملہ کر سکتی تھی۔ 15 اکتوبر کو ہم نے بھارتی فوج کی بھاری جمعیت کے ساتھ 20 کلومیٹر طویل چھکڑوں کے قافلے کا سفر شروع کیا۔ 8 دن کے سفر کے ساتھ ہم نے کھیم کرن کے مقام پر سرحد پار کی۔ مجھے اپنے علاقے میں کسی جانی یا مالی نقصان کا پتہ نہیں۔ کئی سال بعد جب میں بڑا ہوا تو میں نے گوجرہ میں ریلوے لائنوں کے قریب آبادی کے بارے میں سنا۔ مجموعی طور پر مقامی مسلم آبادی سکھوں کی حامی تھی۔"

بورے والا

پروفیسر نریندر موہن وید

30 نومبر 2005 کو ہتیش گوسین اور میں پانی پت، ہریانہ میں پروفیسر نریندر موہن وید کے گھر گئے۔ پروفیسر وید کا تعلق بنیادی طور پر بورے والا سے تھا جو 1947 میں ضلع ملتان کا ایک چھوٹا قصبہ تھا (بورے والا اب ضلع وہاڑی کی تحصیل ہے) اور اسے منڈی بورے والا کہا جاتا تھا۔ میں نے جو انٹرویو کیا وہ کہیں گم ہو گیا چنانچہ میں نے ہتیش گوسین سے درخواست کی کہ وہ مجھے پروفیسر وید کی بورے والا سے رخصتی کے بارے میں کہانی مہیا کرے۔ یہ انٹرویو 14 اپریل 2010 کو پروفیسر کے بھائی اروند وید نے کر کے مجھے ای میل کیا:

"میرے والد آنجہانی ڈاکٹر رام جی لال وید احمد پور سیال ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے تاہم لاہور کے میڈیکل کالج سے ڈاکٹر بننے کے بعد انہوں نے بورے والا منڈی میں پریکٹس شروع کر دی اور اہل خانہ سمیت وہیں مقیم ہو گئے۔ انہوں نے خود کو سماجی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا اور مہاتما گاندھی کی تعلیمات کے پیروکار تھے۔ وہ کانگریس پارٹی کے بھی سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے پاکستان سے ہجرت کرنے کا کبھی نہیں سوچا تھا اس وقت بھی جبکہ یہ طے ہو گیا تھا کہ پاکستان ضرور بنے

گا۔ جب پاکستان معرض وجود میں آگیا تو بھی میرے والد اور کئی دیگر ہندو اپنے گھروں میں ہی رہے۔ پھر اچانک کشیدگی میں اضافہ شروع ہو گیا۔ صورتحال سے نمٹنے کے لیے ایک امن کمیٹی بنائی گئی اور میرے والد کو بھی اس کا ممبر نامزد کیا گیا۔ البتہ پرامن فضا زیادہ دیر برقرار نہ رہی اور ہندوؤں اور سکھوں پر حملے شروع ہو گئے۔ میرے والد کے ایک مسلمان دوست اللہ یار جو پولیس میں ڈی ایس پی تھے نے انہیں خبردار کیا کہ کچھ لوگ آپ کی جان کے درپے ہیں چنانچہ بہتر ہو گا کہ آپ بھارت چلے جائیں۔ انہوں نے ہمیں ٹرین میں سوار ہونے میں مدد دی۔ ٹرین کی حفاظت پر گورکھا سپاہی مامور تھے۔ رخصتی کا فیصلہ اتنا اچانک تھا کہ ہم ضروری سامان بھی اپنے ساتھ نہ لے جاسکے۔ ہم منڈی بورے والا سے ستمبر کے اوائل میں روانہ ہوئے۔ گورکھا فوجی ہمارے نجات دہندہ تھے کیونکہ جہاں کہیں ٹرین کھڑی ہوتی یہ جوان رائفلیں تان کر کھڑے ہو جاتے۔ مسلح مسلمانوں کے گروہ نعرے لگاتے ٹرین کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے لیکن گورکھا فوجیوں کی موجودگی انہیں ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہونے دیتی۔ پتوکی سٹیشن پر ہم نے ٹرین تبدیل کی اور دوسری ٹرین پکڑ کر فیروزپور روانہ ہو گئے۔

''میرا چھوٹا بھائی چندر 5 ستمبر 1947 کو فیروزپور میں ہی پیدا ہوا۔ اُس وقت میں صرف ڈھائی سال کا تھا۔ ان دنوں فیروزپور میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ چنانچہ ہم لدھیانہ منتقل ہو گئے لیکن وہاں بھی ہیضہ پھیل گیا لہٰذا ہمیں کورکھشیتر جانا پڑا۔ پھر ہم پانی پت آ گئے اور وہاں مستقل قیام کر لیا۔ ہمارے والدین ہمیشہ پاکستان میں اپنے گھر اور دوستوں کو یاد کرتے۔ وہ ہمیشہ سمجھتے رہے کہ جو علاقے وہ پیچھے چھوڑ آئے وہ بہت بہتر تھے لیکن زندگی بہرحال چلتی رہتی ہے اور اب پانی پت ہمارا مسکن ہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ظلم کا بازار دونوں طرف سے گرم ہوا۔ ان دنوں انسانیت کا جنازہ اٹھ گیا تھا۔''

منٹگمری (ساہیوال)

انگریز دور میں پنجاب کی دوسری نہری کالونی منٹگمری تھی جس کا نام ایک انگریز گورنر اور دوسری جنگ عظیم کے فیلڈ مارشل لارڈ منٹگمری کے دادا سے موسوم تھا۔ یہاں سکھوں (بیدی اور سوڈھی برادری) کو وسیع و عریض اراضی الاٹ کی گئی جبکہ کاروبار اور فیکٹریاں ہندوؤں کی ملکیت تھیں۔ منٹگمری میں ہندوؤں اور سکھوں کی مجموعی آبادی 28 فیصد کے قریب تھی۔ کھوسلہ رپورٹ کے مطابق ساہیوال میں 10 اگست تک امن رہا کیونکہ منٹگمری ضلع کے ڈپٹی کمشنر سید زمان ایک اچھے انسان تھے لیکن 11 اگست کو جیسے ہی نئے ڈپٹی کمشنر راجہ حسن اختر نے چارج سنبھالا تو تشدد پھوٹ پڑا اور بالخصوص سکھوں کو بہیمانہ حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ 11 اگست سے 25 اگست کے درمیان منٹگمری شہر اور قریبی دیہات میں سرگرم گروہوں نے سکھوں پر حملے کیے (Khosla:161)۔

کچھ تفصیلات نیچے دی گئی ہیں۔ پہلا واقعہ یکم اگست 2005 کو مسز اندرجیت کور نے مجھے بھیجا جو منٹگمری گرلز ہائی سکول کپورتھلہ مشرقی پنجاب کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ قبل ازیں لاہور سے متعلق ہماری خط و کتابت ہوتی رہی تھی کیونکہ وہ مذہبی مقامات کی زیارت کے لیے مغربی پنجاب آئی تھیں۔ وہ جس سکول کی سربراہ تھیں وہ تقسیم کے بعد کپورتھلہ منتقل ہونے والے سردار جرنیل سنگھ پسریچہ نے قائم کیا تھا۔ سردار جرنیل کا انٹرویو میری طرف سے محترمہ اندرجیت کور نے کیا تھا۔

سردار جرنیل سنگھ پسریچہ

"جب تقسیم کا المیہ ہوا تو میری عمر محض دس سال تھی۔ چونکہ منٹگمری میں تمام مذاہب کی ملی جلی آبادی تھی چنانچہ میرے والد کے کئی مسلمانوں کے ساتھ گھریلو تعلقات بھی تھے۔ ہم سب نہایت دوستانہ، بھائی چارے اور محبت والے ماحول میں رہتے تھے لیکن اگست 1947 میں منٹگمری میں فرقہ وارانہ جنونیت کا دورہ پڑ گیا۔ سخت کرفیو لگا دیا گیا اور دن رات کے کسی حصے میں کسی کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے باوجود چھرا گھونپنے اور اجتماعی قتل عام کے واقعات نہ تھم سکے۔ منٹگمری نفرت اور فرقہ وارانہ کشیدگی کی آگ میں جلنے لگا۔ مجھے ایک مسلمان یاد ہے جو کرفیو کی پابندی توڑتے ہوئے سڑک پر نعرے لگاتے نکل آیا۔ فوجیوں نے اسے واپس جانے کا حکم دیا لیکن وہ نہ مانا جس پر اسے گولی مار دی گئی کیونکہ سکیورٹی اہلکاروں کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم تھا۔ اس عمل سے مسلمانوں میں سخت اشتعال پھیل گیا کیونکہ ان کو شبہ تھا کہ ان کے ہم مذہب شخص کو سکھ لیڈر سردار حکم سنگھ کی شہ پر گولی ماری گئی۔ سردار حکم سنگھ مسلمان فسادیوں کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ پھر اس علاقے کے تمام سکھوں اور ہندوؤں کو اس فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ کچھ غیر مسلم ٹرین پر علاقے سے نکلے تو مسلمانوں نے ٹرینیں روک کر قتل و غارت، عصمت دری اور لوٹ مار کے جرائم کیے۔ جو ٹرین رائے ونڈ روکی گئی اس میں بڑے پیمانے پر خونریزی کی گئی۔

"فوج نے سردار حکم سنگھ کو فوجی وردی پہنا کر لاہور سمگل کر دیا جہاں اس نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی اور انہیں منٹگمری میں پر تشدد واقعات کی تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ کس طرح سکھ خواتین اپنی عزت بچانے کے لیے کنوؤں میں کود گئیں۔ پھر سردار حکم سنگھ پنڈت نہرو اور مسٹر لیاقت علی خان کو ساتھ لے کر منٹگمری آیا تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے سکھوں اور ہندوؤں کے خلاف ظلم دیکھ سکیں۔ اس کے بعد نہرو نے منٹگمری سے فوج کی حفاظت میں سکھوں اور ہندوؤں کو مشرقی پنجاب کے شہر فیروزپور لانے کے لیے خصوصی ٹرینیں چلانے کا حکم دیا۔ انہی ٹرینوں میں میرے والد بھائی گوبند سنگھ پسریچہ اور ان کا خاندان بھی سوار تھے۔ بعض مہاجرین اپنی زندگی بچانے کے لیے ٹرینوں کی چھت پر سوار ہو گئے۔ یہ ایک خوفناک تجربہ تھا کیونکہ مہاجرین کو فیروزپور کے امدادی کیمپ میں پندرہ روز تک رہنا پڑا۔ پھر ہمارے ایک رشتہ دار نے مسلمان کا خالی کردہ ایک جلا ہوا گھر ہمارے لیے مخصوص کر دیا۔ یہ مکان حکومت نے ہمیں مستقل الاٹ کر دیا۔ یہاں ہم 1994 تک مقیم رہے۔

"مشرقی پنجاب میں رہتے ہوئے میرے والد نے منٹگمری میں گزارے ایام یا 1947 کے پر تشدد واقعات کے بارے میں کبھی کوئی بات نہ کی۔ وہ ایک مثبت سوچ کے حامل انسان تھے اور انہوں نے نئے عزم کے ساتھ مشرقی پنجاب میں سکول اور کالج کھولنے شروع کر دیئے۔ میں 1983 میں اپنے خاندان اور منٹگمری کے سابق 20 باسیوں کے ساتھ پاکستان گیا لیکن بدقسمتی سے ہمیں اپنے مقدس گوردواروں کے درشن کے لیے حکومت پاکستان نے مناسب اجازت نامے جاری نہ کیے۔"

پروفیسر ونائے کمار

پروفیسر ونائے کمار اور میرا طویل عرصے سے ای میل پر رابطہ تھا۔ انہوں نے مجھے اوکاڑہ میں اپنے خاندان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سنانے پر رضامندی ظاہر کی۔ 3 فروری 2005 کو وہ سٹاک ہوم (سویڈن) کے نواح میں سولانا کے علاقے میں

کیرولینسکا انسٹی ٹیوٹ میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے۔ ہم نے سٹاک ہوم میں ایک چائنیز ریستوران میں ملاقات کی جہاں میں نے ان کے تاثرات قلمبند کیے۔

''میں دسمبر 1944 کو اوکاڑہ میں پیدا ہوا۔ میرے نانا ڈاکٹر اتم چند آہوجہ دراصل لاہور کے رہنے والے تھے۔ چونکہ وہ پنجاب سول میڈیکل سروس میں ملازم تھے۔ اس لیے انہوں نے صوبے کے کئی مقامات پر کام کیا۔ جب وہ تقسیم سے پندرہ سال پہلے ریٹائر ہوئے تو انہوں نے اوکاڑہ شہر میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا۔ جو ان دنوں ضلع منٹگمری کا حصہ تھا۔ اوکاڑہ میں ان کا ایک بڑا گھر تھا۔ وہ مریضوں سے کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔ ان کے کمپاؤنڈر ہربنس لال کے پاس ایک ڈبہ پڑا ہوتا تھا۔ اگر کوئی مریض چاہتا تو اس میں پیسے ڈال دیتا لیکن علاج کی بہرحال کوئی فیس نہیں تھی۔ وہ ایک بڑے دل کے نیک انسان تھے جنہوں نے مذہب کی بنیاد پر کبھی مریضوں سے کوئی امتیاز نہیں برتا تھا۔ لوگ 50-60 کلومیٹر دور سے رات کو بھی آجاتے کہ ہمارے ساتھ مریض بچے یا حاملہ عورت کا علاج کرنے چلیں۔ وہ اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیتے۔ اس مہربانی کا بدلہ لوگ کبھی کبھار اس طرح دیتے کہ کوئی گائے، گھوڑا یا مویشی بطور تحفہ میرے نانا کو دے جاتے۔

''اوکاڑہ میں نانا جان معاشرتی زندگی کا لازمی حصہ تھے۔ ان کی خدمات کے پیش نظر ان کو قصبے سے نکالنا اپنا ہاتھ یا ٹانگ کاٹنے کے مترادف تھا۔ ان کے پاس دو تانگے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اکثر وہ مجھے تانگے پر شام کو گھمایا کرتے تھے۔ اگرچہ میں ان دنوں بہت چھوٹا تھا لیکن مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہ مجھ سے راستے میں پوچھتے رہتے تھے: 'یہ درخت کون سا ہے؟' میں کہتا 'لالہ جی یہ ٹالی ہے۔' جس درخت کا مجھے پتہ نہ ہوتا اس کا کہتا کہ مجھے پتہ نہیں۔ ایک دن میرا کزن جو عمر میں بڑا تھا مجھے والی بال کھیلانے گراؤنڈ میں لے گیا۔ میں وہاں گم گیا۔ لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور گھر کہاں ہے؟ جب میں نے نانا جی کا نام بتایا تو منٹوں میں مجھے گھر پہنچا دیا گیا کیونکہ ڈاکٹر آہوجہ بہت مشہور شخصیت تھے۔

''جب تقسیم ہند کا عمل شروع ہوا تو سکھوں اور ہندوؤں میں بے چینی پیدا ہوگئی کیونکہ وہ اوکاڑہ میں اقلیت میں تھے۔ جب گڑبڑ کا آغاز ہوا تو تحصیلدار اور لمبردار دیگر عمائدین علاقہ کے ساتھ ہمارے گھر آئے۔ انہوں نے میرے نانا سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ یہاں سے نہیں جائیں گے، آپ ہمارے ہیں، ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نانا جان نے کہا کہ کوئی شک نہیں کہ میرا تعلق اسی مٹی سے ہے۔ میں نے تو یہاں سے جانے کا سوچا تک نہیں۔ تاہم جب مہاجرین کا ریلا اوکاڑہ آیا تو صورتحال ایک دم تبدیل ہونا شروع ہوگئی۔ تب وہ افراد نم آنکھوں کے ساتھ دوبارہ نانا کے پاس آئے اور اپنی پگڑیاں ان کے قدموں میں رکھ کر کہا: 'ڈاکٹر صاحب ہم انتہائی شرمندہ ہیں۔ ہمیں معاف کردیں۔ ہم مزید آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اوکاڑہ کے لوگ تو آپ کو چھونے کی بھی ہمت نہیں کریں گے لیکن مشرقی پنجاب سے جو ہزاروں مہاجرین آئے ہیں۔ انہیں کنٹرول کرنا مشکل ہے۔ البتہ ہم اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ آپ کو اپنی حفاظت میں سرحد پار کرادیں۔' انہوں نے وہی کیا جو انہوں نے کہا اور اپنی حفاظت میں سرحد پار کرادی۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ کون سا مہینہ تھا لیکن یہ اکتوبر یا نومبر ضرور ہوگا۔

''نقل مکانی کے باعث میرے نانا اندر سے بکھر کر رہ گئے۔ وہ ضلع لدھیانہ کے علاقے کھنہ میں آباد ہوگئے۔ وہاں بھی انہوں نے فیس مانگے بغیر مریضوں کے علاج کا عمل جاری رکھا۔ جو مریض جتنے پیسے دیتا وہ رکھ لیتے۔ وہ پنجاب کی روایتی کُھلے

والی پگڑی پہنے تھے۔ یہ ساری تفصیل مجھے لالہ جی (والد) اور ماموں نے سنائی۔ میرے والد کی پوسٹنگ 1947 میں آگرہ میں ہوئی۔ وہ فوج کے آرڈیننس کور میں ملازم تھے اس لیے تقسیم کے عمل سے متاثر نہ ہوئے۔"

بزرگ مسٹر اروڑہ

مشرقی پنجاب کے ضلع موگا کے گاؤں کشن پورہ میں میری ملاقات ایک بزرگ ہندو سے ہوئی۔ میں یہاں ان کا نام صرف اروڑہ صاحب کے طور پر دے رہا ہوں (پنجاب میں عموماً بزرگوں سے نام پوچھنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہاں اگر خود کوئی بتا دے تو اور بات ہے)۔ وہ اوکاڑہ سے یہاں منتقل ہوا تھا۔

"میں ضلع منٹگمری کی تحصیل چوچک کے گاؤں مٹھا بھٹی میں 1897 یا 1898 بکرمی (دیسی کیلنڈر) میں پیدا ہوا۔ اب میری عمر 106 سال ہے۔ ہمارے گاؤں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، صرف ایک سکھ اور ایک ہندو خاندان تھا۔ ہمارے قریب ایک گاؤں تھا کلووال۔ جہاں ساہوکار لشمن (لچھمن) داس، رام داس اور گیند ارام رہتے تھے۔ وہ ہماری طرح اروڑہ برادری کی ذیلی شاخ سوانی سے تعلق رکھتے تھے۔

"میں ایک محنتی لیکن غریب دکاندار تھا۔ میں نے بدترین غربت دیکھی تھی لیکن سخت محنت کی۔ میرے تین مسلمان ملازم تھے۔ جو میرے بہت وفادار تھے کیونکہ میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔ اہل دیہات کے ساتھ بھی میرے شاندار تعلقات تھے۔ میں نے ان کے ساتھ کبھی بدمزاجی کا برتاؤ کیا نہ انہیں گھٹیا معیار کی اشیا فروخت کیں۔ وہ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھتے تھے لیکن سوانی ہندو ساہوکار اور لالچی تھے۔ چنانچہ جب تقسیم ہوئی تو دیہاتیوں نے ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ انہیں جبراً بڑا گوشت (گائے کا) کھانے پر مجبور کیا گیا۔ میرے ساتھ یا میرے اہل خانہ کے ساتھ ایسا توہین آمیز برتاؤ نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس ہماری حفاظت کی گئی یہاں تک کہ فوجی ٹرک ہمیں لینے آ گئے۔ میں اپنے ملازمین کو اچھی تنخواہیں دیتا تھا۔

"منگھیانہ، ملیانہ اور چندر ہمارے گاؤں کے مسلمانوں کی ذاتیں تھیں۔ میں، میری بیوی اور چار بیٹے ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان کے نو روز بعد گاؤں سے نکل گئے۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو کچھ لوگ آئے اور ہمیں 5 کلو گھی دیا، کچھ دیگر گاؤں والوں نے میرے بیٹوں کو پیسے دیے۔ وہاں سے آنے کے بعد بھی پرانے تعلقات برقرار رہے۔ وہ مجھے اور میں ان کو خط لکھتا تھا۔ کچھ برسوں کے بعد یہ سلسلہ تھم گیا۔ اب میں کوئی خط نہیں لکھتا۔ میں کشن پورہ میں آباد ہو گیا۔ جب ہم روانہ ہوئے تو ڈوگرہ فوجی ہماری حفاظت کر رہے تھے۔ قافلہ 9 میل لمبا تھا۔ رخصتی کے وقت میاں خان وٹو گاؤں کے مکینوں نے ہمیں پیغام بھجوایا کہ تم لوگ مویشی یہیں چھوڑ جاؤ اور صرف ضروری سامان لے جاؤ لیکن ڈوگرہ فوجیوں نے کہا کہ تم لوگوں کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے مویشی ساتھ لے جاؤ۔ ہمارے ہوتے ہوئے کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ کوئی حملہ نہ ہوا۔ ہم پہلے بھارتی قصبے فاضلکا میں ٹھہرے پھر ہمیں سہارن پور اور اس کے بعد انبالہ بھجوایا گیا۔ ہم ایک کیمپ میں ٹھہرے تھے۔ مقامی لوگ ہمیں کھانے کو مٹھائیاں بھجواتے تھے۔ میرے بیٹے میرے ساتھ تھے۔ اس وقت میرا بیٹا چھٹی جماعت میں تھا۔ بعد ازاں میں شہباز پور منتقل ہو گیا جہاں ہمارے کچھ رشتہ دار بھی تھے۔ تین سال بعد میں کشن پورہ آ گیا۔ یہاں میں چھکڑے پر سبزیاں بیچا کرتا تھا اور پھر 1954 میں ایک چھوٹی دکان بنائی۔ میرا کاروبار

شروع ہو گیا۔ میرے مقابلے میں دو دیگر دکاندار بھی تھے لیکن مجھے زیادہ کامیابی ملی۔ اب میر ازرعی رقبہ بھی ہے اور ہم کافی خوشحال ہیں۔"

پاکپتن

پاکپتن ایک مشہور شہر ہے۔ اس کی وجہ شہرت یہ ہے کہ انتہائی قابل احترام صوفی بابا فرید الدین گنج شکرؒ یہاں مدفون ہیں۔ کھوسلہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکپتن میں لوٹ مار 23 اور 24 اگست کو ہوئی اور اگلے روز ہندوؤں اور سکھوں کا قافلہ یہاں سے روانہ ہوا۔ اس کو چک دولہ بالا میں مسلمان ذیلدار نے روکا اور اعلان کیا کہ اسے ڈپٹی کمشنر اور ایس پی پولیس نے حکم دیا ہے کہ قافلے میں شامل تمام سکھوں کو مار ڈالا جائے۔ البتہ ہندو اسلام قبول کر کے جانیں بچا سکتے ہیں لیکن سکھوں کو مشرقی پنجاب میں اپنے ہم مذہب افراد کی کرتوتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا لیکن جب بھارتی فوج آئی تو ان لوگوں نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ واقعہ 29 ستمبر کو پیش آیا (Khosla,1989:163)۔ مجموعی طور پر پاکپتن میں زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا۔ سید افضل حیدر جن کا بیان ہم قبل ازیں پیش کر چکے ہیں نے پاکپتن کے واقعات کا ان الفاظ میں احاطہ کیا ہے:

سید افضل حیدر

"میرے والد سید محمد شاہ نے تحریک آزادی کے دوران برصغیر کے مسلمانوں کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا، وہ پنجاب میں مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ اگرچہ عقیدے کے لحاظ سے میرے والد شیعہ تھے لیکن وہ مسلم لیگ کی حمایت کے لیے نماز جمعہ کے بعد (سنی مکتبہ فکر کی) شہر کی مرکزی جامع مسجد میں تقریر کیا کرتے تھے۔ اسی طرح میری والدہ خواتین جن میں گاؤں کی عورتیں بھی شامل تھیں کو متحرک کیا کرتی تھیں۔ پاکپتن میں سب سے بااثر حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے مزار کے سجادہ نشینوں کا دیوان خاندان تھا۔ پاکپتن میں ہندوؤں کی بڑی بڑی جائیدادیں تھیں۔ اچھے رہائشی علاقے بھی ہندوؤں کی ملکیت تھے۔ ان کا اپنا بینک تھا اور پاکپتن کی تجارت (معیشت) پر مکمل طور پر ان کا قبضہ تھا۔ ہندوؤں کے دیوان صاحب کے ساتھ اچھے تعلقات تھے دوسری طرف مسلمان غریب تھے۔ 1910 میں مسلمان جاگیرداروں نے پاکپتن میں سکول کھولنے کی مخالفت کی۔ اس کے رد عمل میں میرے والد نے مسلمانوں کو تعلیم دینے کی تحریک شروع کی۔ انہوں نے ایک کوآپریٹو بینک بھی قائم کیا۔ میرے دادا 81 مربعوں (2025 ایکڑ) کے مالک تھے لیکن ان دنوں زرعی رقبے کی آمدن اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ زرعی آمدن کا ٹیکس دینا بھی مشکل ہوتا تھا۔ اصل پیسہ کاروبار اور تجارت میں تھا۔

"حقیقت یہ ہے کہ پاکستان 14 اگست کو نہیں بلکہ 15 اگست 1947 کو قائم ہوا تھا۔ 15 اگست کو میرے والد کے منشی اللہ دتہ نے انہیں اطلاع دی کہ پاکپتن میں ایک فرقہ وارانہ تصادم ہوا ہی چاہتا ہے۔ اس وقت والد صاحب نماز ظہر ادا کر رہے تھے۔ وہ بروقت جائے وقوعہ پر پہنچ گئے تاکہ تصادم کو روکا جا سکے۔ ایک طرف ہندو ہتھیار بند کھڑے تھے تو دوسرے مسلمان مورچہ زن تھے۔ کچھ روز بعد ہندو سلیمانکی بیراج کے راستے بھارت نقل مکانی کر گئے۔ پاکپتن میں معدودے چند ہلاکتیں ہوئیں۔ ہندوؤں کے جانے کے بعد ان کی جائیدادیں لوٹ لی گئیں۔

"ایک ہندو اپنی نوجوان بیٹیوں کے ساتھ نہر کے کنارے جا رہا تھا۔ جب وہ بصیر پور پہنچے تو ہندو کو کسی نے حملہ کر کے ہلاک کر دیا اور نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر لیا۔ اس واقعے سے علاقے میں سخت اشتعال پھیل گیا۔ اس موقع پر ایک مقامی صوفی نے مداخلت کی اور لڑکیوں کو واپس ان کے گھر پہنچایا۔ انہوں نے اغواکنندگان سے کہا کہ وہ خود اس بات کا فیصلہ چند روز میں کریں گے کہ ان لڑکیوں سے کون شادی کرے گا۔ لیکن اگلی صبح اس بزرگ نے لڑکیوں کو سلیمانکی تک بحفاظت پہنچایا اور پھر سرحد پار کرا دی۔

"دوسری جانب سکھ بھارت سے پاکستان میں داخل ہونے والے مسلمانوں کے ایک قافلے پر حملہ کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس موقع پر وہی لڑکیاں آگے بڑھیں اور کہا کہ ان کی جان رحمدل مسلمانوں نے بچائی ہے اور اگر کسی نے مسلمان عورت کو ہاتھ بھی لگایا تو ہم خودکشی کر لیں گی۔ اس دھمکی سے سکھوں نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا اور مسلمان بخیریت سرحد پار کر گئے۔ یہ کہانی ہمیں ایک مسلمان مہاجر نے سنائی۔"

بتول بیگم

بریگیڈیئر (ر) یعسوب علی ڈوگر کی والدہ محترمہ بتول بیگم نے اپنے والد چودھری مولا بخش ڈوگر کی یہ کہانی سنائی کہ کس طرح انہوں نے سکھ خواتین اور لڑکیوں کی جان بچائی جنہیں ان کے اپنے ہی خاندان سے خطرہ تھا:

"1947 کے قتل عام (ہالوکاسٹ) کے دوران میرے دادا جو اس علاقے کے نمبردار بھی تھے نے سنا کہ ان کے گاؤں چک 68 ای بی عارف والہ کے قریبی گاؤں چکی کے سکھ اپنی خواتین کو غیرت کے نام پر قتل کرنے کے درپے تھے۔ وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوئے اور ٹاپیں بھرتے روانہ ہو گئے۔ تیز رفتاری میں وہ مٹی کی دیواریں اور دیگر رکاوٹیں بھی پھلانگتے گئے۔ جب وہ چکی گاؤں پہنچے تو انہوں نے گرج کر سکھ سرداروں سے کہا کہ وہ عورتوں کو نذر آتش کرنے سے باز رہیں۔ ان سکھوں کے لیڈر جو میرے والد کا دوست بھی تھا نے بتایا کہ وہ ان عورتوں کو یہاں چھوڑنے یا ساتھ لے جانے کی سکت نہیں رکھتے کیونکہ انہیں خطرہ ہے کہ بھارت جاتے ہوئے ان پر حملہ ہو گا۔ لہٰذا اغوا یا قتل یا زیادتی کا خطرہ مول لینے سے بہتر ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے نذر آتش کر دیں۔ ہم علاقے کے چودھری ہونے کی حیثیت سے اپنی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتے۔ البتہ میرے والد نے سرداروں کو یقین دلایا کہ ہم آپ کی خواتین کو سکیورٹی فراہم کریں گے۔ ان کے دلائل سے اتفاق کر لیا گیا اور سکھ عورتوں کی جان بچ گئی۔ پھر والد نے ان لوگوں کو سلیمانکی بارڈر تک سکیورٹی فراہم کی۔ اسی طرح ہمارے خاندان نے چیچہ وطنی کے قریب چک نمبر 9 اور چک نمبر 10 کے سکھوں کو سکیورٹی فراہم کی۔ لیفٹیننٹ کرنل ہرگروجیت ڈوگر جو میرے والد کے کلاس فیلو تھے اور ان دیہات سے تعلق رکھتے تھے کو بھی سرحد تک سکیورٹی دی گئی۔"

جھنگ، میانوالی، ڈیرہ غازی خان اور بہاولپور ریاست

مغربی پنجاب کے آخری حدود پر واقع اضلاع جھنگ، میانوالی، شاہ پور، مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان میں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں کی مجموعی آبادی 17 فیصد بنتی تھی، ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی جبکہ سکھ بہت کم تعداد میں تھے۔ کھوسلہ اور ایس جی پی ایس رپورٹوں میں یہاں 15 اگست کے بعد کے واقعات کی لمبی

تفصیل دی گئی ہے۔یہاں جان ومال کا نقصان بھی کافی زیادہ رہا۔کھوسلہ رپورٹ کے مطابق راجہ سلطان لال حسین 20اگست تک مظفر گڑھ کا ڈپٹی کمشنر رہا۔اس کے تبادلے کے بعد غیر مسلم مکینوں پر وحشیانہ طریقوں سے حملے کیے گئے(1989: 191-6)۔

جھنگ

کھوسلہ رپورٹ میں الزام لگایا گیا ہے کہ پنجاب مسلم لیگ کے عہدیدار پیر مبارک علی شاہ،ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ظفرالحق خان، ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ محمد اکبر اور سٹی مجسٹریٹ حسنات احمد نے غنڈوں کی مدد سے ہندوؤں اور سکھوں کو نشانہ بنایا۔ فسادات 25اگست کو شروع ہوئے(1989: 179-84)۔

گردیو سنگھ

''میں جھنگ مین بازار میں اپنے فروٹ سٹال پر کھڑا تھا کہ مسلمان غنڈوں نے بازار کو آگ لگادی۔جہاں بیشتر دکانیں ہندوؤں کی تھیں۔سکھوں کی چند ہی ریڑھیاں تھیں۔مجھے تاریخ یاد نہیں کیونکہ میں خواندہ نہیں ہوں لیکن پاکستان بن چکا تھا۔مقامی ہندوؤں اور سکھوں نے اسی علاقے میں رہنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ہمارے مسلمانوں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے لیکن پھر شاہ جی (پیر مبارک شاہ) نے غنڈوں کو اکسایا۔حالانکہ اس سے پہلے عاشورہ کے موقع پر سکھ اور ہندو ماتمی جلوسوں میں حصہ لیتے تھے اور مبارک شاہ ہمیں دعائیں دیتا تھا لیکن اب وہ عفریت بن کر سامنے آیا۔حملے کے لیے رائفلیں، نیزے اور لمبے چھرے استعمال کیے گئے۔ہمارے پاس چونکہ کرپانیں تھیں اس لیے ہم محفوظ رہے لیکن ہندو غیر مسلح تھے۔ان کو مسلمانوں نے باآسانی قابو کرلیا۔کچھ ہندوؤں نے اسلام قبول کرلیا جبکہ بعض مارے گئے۔

''میں اور میرا کزن بوٹا سنگھ کئی روز کھیتوں میں چھپے رہے۔ہمارے اردگرد آگ ہی آگ لگی تھی اور لوگ روتے ہوتے رحم کی درخواست کررہے تھے لیکن غنڈوں نے کسی قسم کی رحمدلی نہیں دکھائی۔حتیٰ کہ بچوں کو قتل کرکے ان کی لاشیں نیزوں پر اچھالی گئیں۔ہم رات کو اپنے ٹھکانے سے نکل آئے اور کھانے کو کوئی خوراک تلاش کرتے یا گھاس کھاتے یوں ہم دو ہفتے تک زندہ رہے۔آہستہ آہستہ کھیتوں میں چھپے ہندو اور سکھ جمع ہونا شروع ہوگئے اور کسی مدد کا انتظار کرنے لگے۔پھر ایک انگریز افسر پولیس کے ساتھ وہاں آیا اور زندہ بچنے والے لوگوں کو جمع کرلیا۔کچھ غیر مسلموں نے مسلمانوں کے گھروں میں بھی پناہ لیے رکھی۔تمام مسلمان برے نہیں تھے۔پھر ہمیں ٹرکوں پر سوار کرکے سلیمانکی لایا گیا جہاں سے ہم نے بھارت کی سرحد پار کرلی۔میرا اپنا کوئی خاندان نہیں تھا اور میں نے اپنے چچا کے گھر پرورش پائی۔وہ پاکستان بننے سے کچھ عرصہ پہلے انتقال کرگئے۔ ان کی بیوی تو بہت پہلے مرچکی تھی لہٰذا میں اور میرا کزن ہی بھارت چلے گئے۔

''میں اعتراف کرتا ہوں کہ بعدازاں ہم نے مشرقی پنجاب میں سکھ جتھوں میں شمولیت اختیار کرلی۔مسلمانوں پر کئی حملے کیے۔مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ میں نے کسی کو جان سے بھی مارا تھا یا نہیں۔قتل کرنا گناہ ہے لیکن وہ زمانہ ہی بہت برا تھا۔ ہاں میں نے پہلے فاضلکا اور پھر مکتسر میں کئی لاشیں بکھری دیکھیں۔

بی آر لال

"میں 15 مئی 1925 کو ضلع جھنگ کے گاؤں احمد پور سیال کے ایک اروڑہ ہندو خاندان میں پیدا ہوا۔ مغربی پنجاب میں تجارت زیادہ تر اروڑہ اور کھتری ذات کے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ ہمارا بھی احمد سیال میں چھوٹا سا کاروبار تھا جہاں 90 فیصد آبادی مسلمانوں کی تھی۔ میں نے اسلامیہ پرائمری سکول میں تعلیم حاصل کی پھر ڈی اے وی سکول میں سکالرشپ پر داخلہ لیا اور خانیوال سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1947 سے پہلے یہاں کوئی کشیدگی نہیں تھی البتہ مارچ میں جھنگ میں ہلکے پھلکے فسادات ضرور ہوئے تھے۔ گڑبڑ کا آغاز اگست کے آخر میں ہوا اور احمد پور سیال بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایک ہجوم نے ہمارے گھر کا محاصرہ کر کے دیسی ساختہ بم پھینکے جس سے میرے والد اور بھائی کی موت واقع ہو گئی۔ باقی بچنے والے اہل خانہ فوج کی نگرانی میں لاہور آ گئے جہاں کچھ عرصے تک ہم ڈی اے وی کالج مہاجر کیمپ میں رہے اور پھر بھارتی سرحد عبور کر لی۔ وہاں (یہ واضح نہیں کہ مہاجر کیمپ میں یا سرحد پار کر کے) کسی نے میرے بھائی کو چھرا مار کر قتل کر دیا۔ پتہ نہیں کہ کس نے یہ کام کیا۔ یوں تقسیم کے دوران میں نے اپنے والد اور دو بھائیوں کو کھو دیا۔ ہمیں شدید صدمے اٹھانا پڑے لیکن اب حالات بہتر ہو چکے ہیں۔ یہاں دہلی میں میرے کئی مسلمان دوست ہیں۔"

ڈیرہ غازی خان

کھوسلہ رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ ڈیرہ غازی خان میں لوگ نظریہ پاکستان سے تقریباً لاعلم تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی 12 فیصد تھی۔ تقریباً تمام غیر مسلم ہندو تھے البتہ چند سکھ بھی تھے۔ یہاں غیر مسلموں کا بڑے پیمانے پر قتل عام نہیں ہوا اور لوٹ مار بھی غیر مسلموں کے جانے کے بعد ہوئی۔ ایک گاؤں داجل میں چالیس غیر مسلموں کو 13 ستمبر کو قتل کیا گیا جبکہ ستمبر ہی میں ستائیس کھنجیان میں غیر مسلموں کو ذبح کیا گیا۔ پھر ڈوگرہ سپاہی آئے اور غیر مسلموں کو محفوظ مقامات پر لے گئے۔ لیکن اکتوبر تک بھی غیر مسلم ڈیرہ غازی خان میں تھے۔ 6 اکتوبر کو واہوا سے ڈیرہ غازی خان جانے والی بس پر حملہ کر کے نو غیر مسلموں کو قتل کر دیا گیا۔ (12-208 : 1989)۔ دہلی یونیورسٹی میں انگلش لٹریچر کے استاد پروفیسر جے ایم منچندا نے لاہور سے شائع ہونے والا میرا کالم پڑھ کر مجھ سے رابطہ کیا۔ مجھے پتہ چلا کہ ان کے خاندان کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے تھا۔ میں نے جب مارچ 2007 کو دہلی کا مختصر دورہ کیا تو میں نے پروفیسر منچندا سے ملاقات کی۔ میری طرف سے انہوں نے ڈیرہ غازی خان سے تعلق رکھنے والے دو معمر افراد کے انٹرویو کیے اور پھر 11، 12 مارچ کو مجھے بھجوا دیے۔"

من موہن تنیجا

"میں (پروفیسر منچندا) نے 77 سالہ من موہن تنیجا سے 7 مارچ اور پھر 10 مارچ 2004 کو ملاقات کی۔ اس نے بتایا کہ جب تقسیم کا اعلان ہوا تو وہ لاہور میں تھا جہاں کشیدگی شروع ہو گئی۔ سکھوں نے مسلمان شرپسندوں پر جوابی حملے کیے اور راولپنڈی میں کچھ ہندوؤں نے بھی گھریلو ساختہ بندوقوں سے گولیاں چلائیں۔ چنانچہ حالات خراب دیکھ کر من موہن واپس ڈیرہ غازی خان چلا آیا اور کرایے پر مکان لے کر رہنے لگا۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق روجھان سے تھا لیکن اس نے سکیورٹی کے نکتہ نظر سے

شہر میں رہنے کو ترجیح دی۔ روجھان اس زمانے میں پر سکون علاقہ تھا لیکن پھر بھی ہندوؤں نے چند بااثر مسلمانوں سے اپنے تحفظ کی ضمانت حاصل کر لی کیونکہ اخبارات میں مختلف علاقوں میں فسادات کی خبریں تواتر سے آرہی تھیں۔ تحصیل راجن پور کے قصبے عمر کوٹ سے تعلق رکھنے والے کچھ ہندوؤں نے یہاں سے انخلا کے لیے ٹرک کرائے پر لیا لیکن راستے میں انہیں لوٹ لیا گیا۔ چنانچہ مسٹر تنیجا اور اس کے اہل خانہ نے وہیں رہنے کا فیصلہ کیا یہاں تک کہ گورکھا فوجی آئے اور انہیں امرتسر منتقل کر دیا۔ مجھے (پروفیسر منچندا) من موہن کے بیان سے ڈیرہ غازی خان میں فسادات کا کوئی اشارہ نہیں ملا تاہم دیہی علاقوں میں غریب مسلمانوں کی طرف سے اکا دکا تشدد کے واقعات ضرور رونما ہوئے تھے۔

''امید ہے کہ آپ (مصنف) مفید معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اگرچہ من موہن نے مجھے کوئی ٹھیک تاریخ نہیں بتائی لیکن اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ کئی ہفتوں تک ڈیرہ غازی خان میں رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈیرہ غازی پر امن علاقہ تھا یا پھر اس نے احتیاطی تدابیر کے طور پر وہیں قیام جاری رکھا۔ اس کا ڈی جی خان سے امرتسر تک کا سفر کئی مراحل میں مکمل ہوا اور وہ تقسیم کے کئی ماہ بعد بھارت پہنچا۔ اس وقت تک بھارت اور پاکستان دونوں حکومتوں نے صورتحال پر قابو پا لیا تھا اور تشدد کا خاتمہ ہو چکا تھا۔''

ڈاکٹر ستیہ پال بے در

''میں (پروفیسر منچندا) آج ڈاکٹر ستیہ پال 'بیدر' (11 مارچ 2007) سے ملا۔ وہ ہماری یونیورسٹی کے شعبہ ہندی سے تقریباً دس سال پہلے ریٹائر ہو گئے تھے۔ وہ ایک منفرد شاعر ہیں اور آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ بیرونی سروس کے سرائیکی زبان میں پروگرام کرتے تھے۔ ڈاکٹر بیدر ڈیرہ غازی خان سے 18 میل دور واقع گاؤں جھوکوترہ کے رہنے والے تھے۔ یہاں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا پائی جاتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اگست 1947 کے آخر کے بعد سے ان کے علاقے میں کافی کشیدگی پیدا ہوئی چنانچہ وہ جان بچانے کے لیے اکتوبر میں ڈیرہ غازی خان آنے پر مجبور ہو گئے۔ اگاؤں میں اگرچہ 80 فیصد آبادی مسلمانوں کی تھی تاہم تقسیم سے قبل ہندوؤں کا اقلیت کے باوجود پلڑا بھاری تھی۔ یہاں تشدد کے واقعات میں 25 ہندوؤں کو قتل کیا گیا۔ گڑبڑ کا آغاز اردو کے اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں سے ہوا۔ (انہوں نے زمیندار، میلاپ اور پرتاپ اخبارات کا نام لیا) اس کے علاوہ نواب جمال خان لغاری اور دیگر مسلم لیگی لیڈروں کے پراپیگنڈے نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ہندوؤں کو یہ چوائس دی گئی کہ وہ اسلام قبول کر لیں اور اپنی بیٹیاں مسلمان نوجوانوں کے نکاح میں دے دیں۔ انہوں نے بتایا کہ قریبی دیہات سے ہندوؤں کی ڈیرہ غازی خان کو نقل مکانی کی وجوہات میں ہندو خواتین کے اغوا کی وجہ بھی شامل تھی۔ چونکہ ڈپٹی کمشنر ایک انگریز تھا اس لیے اس نے معاملات کو بگڑنے سے روکا۔ ڈاکٹر ستیہ پال بے در وہاں ڈیڑھ مہینے کے لگ بھگ رہے اور نومبر میں گورکھا فوج کی معیت میں دریائے سندھ کی دوسری طرف اور آگے روانہ ہو گئے۔ گورکھا فوجیوں نے خبردار کیا کہ جس نے بھی فساد کرنے کی کوشش کی اسے گولی ماردی جائے گی۔ ایک موقع پر 7 ہزار مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مہاجرین نے پہلے فوجی ٹرکوں پر اور پھر ٹرین کے ذریعے سفر کیا اور واہگہ بارڈر پار کرتے ہی سکون کا سانس لیا۔

ڈاکٹر تیج سنگھ

ڈاکٹر تیج سنگھ اور میرے درمیان ای میل رابطے کا سلسلہ 2006 میں شروع ہوا۔ میری درخواست پر انہوں نے پنجاب کی تقسیم کے دوران اپنے اہل خانہ کے مصائب کی کہانی لکھی۔ انہوں نے لکھا کہ:

"میرے دادا سردار بہادر لبنا سنگھ (آرڈر آف برٹش ایمپائر) ضلع منٹگمری کے چک نمبر 134/9 ایل کے رہائشی تھے۔ انہیں پہلی جنگ عظیم میں انگریز فوج میں خدمات انجام دینے کے صلے میں حکومت نے جاگیر عطا کی۔ دادا کے چھوٹے بیٹے یعنی میرے والد گیانی سنگھ دیال سنگھ کالج کے گریجوایٹ تھے۔ وہ متحدہ پنجاب کی ملتان ڈویژن میں مجسٹریٹی اختیارات کے ساتھ ریونیو افسر تعینات رہے۔ پھر ان کا تبادلہ لائل پور ہو گیا جہاں میں اور میرا بھائی کالج میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ 1946 میں ان کی تعیناتی ڈیرہ غازی خان کے علاقے تونسہ شریف میں ہو گئی لیکن ہم بھائی لائل پور میں ہی رہ کر تعلیم حاصل کرتے رہے۔

"بہت جلد یہ واضح ہو گیا کہ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہے گا۔ ایک رجائیت پسند اور وفادار شخص ہوتے ہوئے اور کئی مسلمان دوست رکھنے کے باوجود میرے والد خلوص نیت کے ساتھ یقین رکھتے تھے کہ حکومت کی تبدیلی کا مطلب رہائش میں تبدیلی نہیں۔ چنانچہ انہوں نے حکومت پاکستان کی ملازمت اختیار کرنے کا آپشن چنا۔ جب 14 اگست 1947 کو باضابطہ طور پر پاکستان معرض وجود میں آگیا تو انہوں نے حکومتی افسر ہونے کے ناتے نہایت فرض شناسی کے ساتھ دفتر کی عمارت پر پاکستان کا پرچم لہرایا۔

"تقسیم ہند سے کچھ ہی عرصہ پہلے میری والدہ کو گورداس پور شہر سے 3 میل کے فاصلے پر واقع گاؤں گھوسٹ پوکر Ghost Poker میں شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے جانا پڑا۔ والد صاحب خود تونسہ میں رہے لیکن ہم دونوں بھائی بھی خصوصی تقریب ہونے کی وجہ سے لائل پور سے گورداسپور چلے گئے۔ بعد میں ہمیں مشورہ دیا گیا کہ ہم اپنے قیام میں توسیع کر دیں کیونکہ پنجاب کے بعض علاقوں میں صورتحال تیزی سے خراب ہو رہی تھی۔ ابھی ہم وہیں تھے کہ شہروں میں بڑے پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے لہٰذا ہم نے وہاں سے نکلنے کی کوشش نہ کی۔

"میرے والد کو ان کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ اپنے تحفظ کے لیے وہ مشرقی پنجاب چلے جائیں۔ موسم برسات کے باعث ضلعی ہیڈ کوارٹر ڈیرہ غازی خان کے لیے جانے والی سڑک بند تھی۔ اس کے بعد ایک ہی راستہ تھا کہ وہ کشتی پر دریائے سندھ پار کر کے ٹرین کے ذریعے ملتان اور پھر آگے چلے جائیں۔ یہ غالباً ستمبر کے شروع کے ایام تھے۔ مون سون کی بارشوں اور پہاڑوں پر برف پگھلنے سے دریائے سندھ بھرا ہوا تھا۔ تین مسلمان اور ایک ہندو جس نے مسلمانوں جیسا لباس پہن رکھا تھا میرے والد کے ساتھ اسی مقام تک گئے جہاں سے کشتی نے خطرناک دریا میں سفر شروع کرنا تھا۔ دریا پر ان کے مسلمان چپڑاسیوں نے انہیں الوداع کہا اور اس امید کا اظہار کیا کہ وہ جلد واپس تونسہ آئیں گے جبکہ ہندو جس کا نام بھانجن تھا بھارت تک ان کے ساتھ رہا۔ بحفاظت دریا پار کرنے کے بعد میرے والد ٹرین میں اپر کلاس کی بوگی میں سوار ہو گئے جس میں شاید ہی کوئی اور مسافر تھا۔ اگلے سیکشن پر ان کا واقف کار ایک مسلمان بھی ڈبے میں سوار ہو گیا۔ والد کو اکیلے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ بہر حال وہ ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور سرحد کے دونوں طرف پیش آنے والے خوفناک واقعات انہیں سنائے۔ غالباً پہلی

بار میرے والد کو اندازہ ہوا کہ امن وامان کی صورتحال کتنی خراب تھی۔ انہوں نے والد صاحب کو خبردار کیا کہ آپ ہوشیار رہیں کیونکہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کی وردی میں کچھ جرائم پیشہ عناصر انتقام لے رہے تھے اور آپ ان کا آسان ہدف بن سکتے ہیں کیونکہ داڑھی اور سکھوں والی مخصوص پگڑی کی وجہ سے آپ باآسانی پہچانے جاسکتے ہیں۔

''ملتان جہاں لائل پور تبادلے سے پہلے والد صاحب نے تین سال تک کام کیا تھا میں آکر انہوں نے لاہور جانے کے لیے ٹرین تبدیل کرنا تھی لیکن انہیں یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ ریل گاڑی منسوخ کی جاچکی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ اب انہیں مزید انتظار کرنا پڑے گا، وہ بھانجن کے ساتھ سرکاری افسروں کے ویٹنگ روم کی طرف چلے گئے تاکہ دن بھر کے سفر کے بعد کچھ دیر کے لیے ستالیں۔

''بھانجن سٹیشن کے عملے کی طرف گیا تاکہ ٹرین کی روانگی کا وقت معلوم کرسکے۔ اسے بتایا گیا کہ اگلے چند روز تک لاہور کے لیے کوئی ٹرین دستیاب نہیں تھی۔ ہمیں مشورہ دیا گیا کہ ہم اندرون شہر (فصیل کے اندر ملتان) کے علاقے کٹرہ چلے جائیں جہاں ہم جیسے کئی غیر مسلم ٹرین کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اب رات ہونے لگی تھی چنانچہ والد نے فیصلہ کیا کہ ویٹنگ روم سے نکل کر ان کے جاننے والے مسلمان زمیندار کے گھر چلے جائیں۔ بھانجن سامان باندھ کر سٹیشن کے باہر کوئی تانگہ لینے آیا۔ راستے میں کوچوان کو چونگی کے قریب روک لیا گیا تاکہ قابل ٹیکس چیزوں کی تلاشی لی جاسکے۔ چونگی کلرک نے ایک دم والد صاحب کو پہچان لیا اور بولا، 'سردار صاحب' آپ رات کے اس وقت سفر کر رہے ہیں؟ امن وامان کی صورتحال بالکل خراب ہے اور آپ پر کسی بھی لمحے کہیں بھی حملہ ہوسکتا ہے۔' یہ سن کر تونسہ سے روانہ ہونے کے بعد والد کے ذہن میں پہلی بار خوف جاگا۔ اب صورتحال کتنی مختلف تھی۔ پہلے اس شہر میں والد مجسٹریٹ تھے اور انہوں نے محرم کے دوران امن وامان کی حساس صورتحال سے بخوبی نمٹا تھا۔ اب شورش کا دور دورہ تھا اور اہم سرکاری افسر تک محفوظ نہیں تھے۔ وہ جلدی جلدی اپنے دوست کی کوٹھی پر پہنچے جہاں ملازمین نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔

''اگلی صبح ناشتے کے بعد مسلمان دوست نے بہ نفس نفیس میرے والد کا خیر مقدم کیا۔ اس نے ادھر ادھر سے معلومات حاصل کرنے کے بعد کہا کہ آپ کا فصیل شہر سے باہر کے علاقے میں قیام کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ اس دوست نے والد کو کٹرہ میں بحفاظت پہنچانے کی پیشکش کی جہاں ان جیسے دیگر بے آسرا افراد کی حفاظت کا پورا بندوبست تھا۔ وہاں آکر والد نے بھی اطمینان محسوس کیا کیونکہ ان سب پناہ گزینوں کو حکام نے یقین دہانی کرائی تھی کہ ان لوگوں کو جلد بذریعہ ٹرین لاہور روانہ کر دیا جائے گا۔ یہ انتظار توقع سے طویل ثابت ہوا۔ غالباً والد کو تین ہفتے تک وہیں قیام کرنا پڑا۔ آخرکار انہیں بتایا گیا کہ ٹرین دستیاب ہے اور پھر انہیں سکیورٹی کے ساتھ ریلوے سٹیشن پہنچا دیا گیا۔ ضلع کا ڈپٹی کمشنر پہلے ہی وہاں تھا۔ اس کے اردلی نے میرے والد کو پہچان کر سلیوٹ کیا اور ان کا تعارف ڈپٹی کمشنر سے کرایا جس نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ میرے والد سے مصافحہ کیا۔ پنجاب کی موجودہ صورتحال پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے ڈی سی نے میرے والد سے کہا کہ آپ مشرقی پنجاب جاکر امن وامان بہتر کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔ پھر اردلی میرے والد کو ٹرین کے مخصوص الگ کمپارٹمنٹ میں لے گیا۔ اس مہربانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میرے والد نے اسے کہا کہ عام مسافروں کو بھی ڈبے میں آنے دو کیونکہ دیگر بوگیوں میں کافی رش تھا۔

''لاہور کے لیے طویل سفر نہایت سست رفتاری کے ساتھ شروع ہوا۔ صرف ایک انگریز افر کی کمانڈ میں تین گورکھا سپاہیوں کو سکیورٹی کے لیے تعینات کیا گیا تھا۔ منٹگمری تک سفر خیر خیریت سے گزر گیا۔ ابھی نصف سفر طے ہوا تھا۔ والد صاحب نے مجھے بتایا کہ منٹگمری میں وہ اپنے چک والا علاقے دیکھ رہے تھے جہاں کا لمبر دار (اصل لفظ لمبر دار ہے لیکن بعض دیہاتی نمبر دار بھی کہتے ہیں۔) ورے سنگھ تھا جو اپنی سرکاری ڈیوٹی کی انجام دہی کے لیے گاہے بگاہے شہر جاتا رہتا تھا۔ چنانچہ اسے نہ پتہ چل سکا کہ گاؤں کے مکین کارواں کی شکل میں پیدل ہی مشرقی پنجاب کی طرف نقل مکانی کر چکے تھے۔ چونکہ گاؤں کے کچھ بڑے پہلی جنگ عظیم کے ریٹائر فوجی تھے اس لیے وہ قافلے کی خود رہنمائی کر رہے تھے۔

''منٹگمری میں قیام کافی طویل ثابت ہوا۔ بعض مسافر ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم پر کچھ کھانے پینے کو گئے تو انہیں کوئی وینڈر نظر نہ آیا۔ اس کی بجائے انہیں ایک مشتعل مسلمان گروہ کے نعروں اور گولی چلانے کی آواز سنائی دی۔ گورکھا فوجی اور ان کا افسر پلیٹ فارم پر گشت کر رہے تھے اور مسافروں کو بحفاظت ٹرین پر واپس سوار کرانے کی پوری دیانتداری سے کوشش کر رہے تھے۔ اس ناخوشگوار واقعے سے تاخیر کی گھڑیاں طویل تر ہو گئیں۔ یہ خراب صورتحال دیکھ کر ٹرین ڈرائیور نے سفر آگے جاری رکھنے میں تامل ظاہر کیا چنانچہ ایک فوجی اس کی سکیورٹی کے لیے انجن پر تعینات کر دیا گیا۔ جن مسافروں کے پاس کھانے پینے کی جو چیزیں فالتو تھیں وہ انہوں نے دوسرے بھوکے بچوں کو دے دیں۔ ٹرین اب رات کی تاریکی میں سست رفتاری سے سفر کر رہی تھی۔ صبح منہ اندھیرے مسافروں نے ٹرین کی وسل مسلسل سنی اور وہ آہستہ آہستہ کھڑی ہو گئی۔ والد نے ایک نیزہ بردار گینگ کو قریبی گاؤں سے پٹڑی کی طرف دوڑتے دیکھا۔ مسافروں کی جان خطرے میں دیکھ کر فوجیوں نے حملہ آوروں کی طرف بندوقیں تان لیں۔ ڈرائیور کی سکیورٹی کے لیے مامور فوجی نے اسے کہا کہ رفتار تیز کر دو۔ حملہ آور گورکھا فوجیوں کی موجودگی میں حملہ کرنے سے ڈر رہے تھے۔ اسی طرح کا واقعہ آگے ایک اور جگہ بھی پیش آیا اور ٹرین وسل بجاتی ایک بڑے گاؤں کے قریب رک گئی۔ حملہ آوروں نے ٹرین کی طرف اپنے بھالے تان لیے۔ گورکھا فوجیوں نے حملہ آوروں کے باز نہ آنے کی صورت میں انہیں گولی مارنے کی تیاری کر لی۔

''بالآخر ٹرین ضلع لاہور کی حدود میں داخل ہو گئی جہاں کئی تباہ شدہ اور جلے ہوئے مکانات تھے۔ بظاہر اس علاقے میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار پیچھے چھوڑ آنے والے علاقوں سے زیادہ ہوئی تھی۔ اگلے ایک گھنٹے میں وہ صوبائی دارالحکومت کے نواح میں تھے۔ وہ سفر جو آٹھ گھنٹے کا تھا اسے طے کرنے میں دو روز سے زائد لگ گئے۔ ان کے پاس کھانے کی اشیا ختم ہو چکی تھیں۔ لاہور پہنچنے پر سب نے سکون محسوس کیا۔ ٹرینوں پر حملوں میں زیادہ تر ہلاکتیں کچھ روز پہلے ارد گرد کے علاقوں میں ہوئی تھیں۔ انہیں لاہور سے نکلنے اور سرحد پار کرنے کے لیے ٹرین کے انتظار میں ایک اور دن گزارنا پڑا۔

''البتہ مجھے اپنے والد کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ آزادی اور قیام پاکستان کے بعد میں گورداسپور سے امرتسر آ گیا۔ میں گولڈن ٹیمپل سے متصل جگہ پر رہتا تھا اور اپنے والد کا کوئی نام و نشان ڈھونڈ رہا تھا۔ میں روزانہ جی ٹی روڈ پر فوج کے زیر کنٹرول چیک پوائنٹ پر بھی جاتا جہاں ہر قسم کے قافلے کو تلاشی کے بعد آگے جانے دیا جاتا تھا۔ میں ہر روز لوگوں سے اپنے والد کے بارے میں پوچھتا اور پھر شام کو دربار صاحب پر جا کر دعائیں کرتا اور سنگ مرمر پر سو کر رات گزارتا۔ جوانی کے اس پریشانی کے دور میں گورو کے لنگر نے مجھے کافی سہارا دیا۔ وہاں گزارے گئے وقت کے دوران مجھے زائرین اور عقیدتمندوں سے

ملاقات کرنے اور مذہب کے نام پر قتل وغارت کی تفصیلات اور خیالات جاننے کا موقع ملا۔ کئی لوگوں نے ایسی آزادی پر لعنت بھی بھیجی جس نے انہیں اپنے ہی صوبے میں مہاجر بنا کر رکھ دیا تھا۔ میں روز بروز مایوس ہوتا جارہا تھا اور مجھے مسلسل ایک ہی جواب ملتا تھا، 'ہمیں تمہارے والد کا کچھ پتہ نہیں۔' اچانک کسی نے ایک دن مجھے بلایا اور بتایا کہ اس نے میرے والد کو کسی ٹرین میں دیکھا ہے۔ یہ خبر میرے لیے بڑا سرپرائز تھی اور دل کہتا تھا کہ یہ اطلاع سچی ہی ہو۔ میں نے دوبارہ اس سے تصدیق چاہی تو اس نے یقین دہانی کرائی کہ اس نے ٹھیک آدمی (یعنی مجھ) سے رابطہ کیا ہے۔ اس نے بالکل سچ کہا تھا۔"

بہاولپور ریاست

ریاست بہاولپور ملتان ڈویژن سے متصل تھی۔ 1941 کی مردم شماری میں یہاں کی آبادی 13 لاکھ 41 ہزار 209 تھی اور رقبہ 45 ہزار مربع کلومیٹر (17,494 میل) تھا۔ 1947 میں بہاولپور کے مسلمان نواب نے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کیا۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 83 فیصد تھا۔ باقی ماندہ مکین زیادہ تر ہندو تھے جبکہ سکھوں اور عیسائی کی تھوڑی سی تعداد بھی تھی۔ آبپاشی کی نہروں اور دیگر زرعی سہولیات کے باعث ریاست کے شمالی حصوں میں کچھ کالونیاں بھی قائم ہو چکی تھیں۔ جہاں کے آباد کار زیادہ تر مسلمان تھے۔ البتہ کچھ سکھوں کو بھی زمینیں دی گئی تھیں۔ اگست میں بہاولپور میں بھی فسادات شروع ہوئے۔ 1947 میں ریاست کے وزیر ریونیو، پبلک ورکس پنڈرل مون کے مطابق ان دنوں نواب صاحب انگلینڈ میں تھے اور اکتوبر سے پہلے ان کی واپسی ممکن نہ ہو سکی۔ وہ اپنی سکھ اور ہندو رعایا کی نقل مکانی کے حق میں نہیں تھے البتہ چونکہ پورے پنجاب، ملحقہ ریاست راجستھان اور دیگر خود مختار ہندو ریاستوں میں بھی گڑبڑ ہوئی اس لیے بہاولپور بھی فسادات کی زد میں آگیا۔ بہر حال یہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کو سرحد پار کرنے میں مدد فراہم کی گئی اور فوج نے پیدل اور ٹرین والے قافلوں کی حفاظت کی۔ محض چند واقعات میں سکیورٹی پر مامور اہلکار لوٹ مار میں ملوث پائے گئے لیکن مجموعی طور پر نقل مکانی پرامن رہی (1998: 232-35)۔

انٹرویوز

نقش لائل پوری، ممبئی 2 جنوری 1997
سید افضل حیدر، لاہور 13 اپریل 2003
بی آر لال، مسز وملا درمانی، گردیو سنگھ (سابق تعلق جھنگ) مارچ 2004
بوڑھا مستر اروڑہ، کشن پورہ، موگا، مشرقی پنجاب 17 مارچ 2004
گردیو سنگھ (سابق تعلق لائل پور) گاؤں غالب خان، ضلع لدھیانہ، 18 مارچ 2004
نشتر سنگھ، گاؤں غالب خان، ضلع لدھیانہ، 18 مارچ 2004
غلام رسول تنویر، فیصل آباد 19 دسمبر 2004

عبدالباری، ملتان 20 دسمبر 2004

لاجپت رائے سیٹھ، تری لوک کمار گلاٹی، جنوری 2005

پروفیسر ونائے کمار، سٹاک ہوم 3 فروری 2005

پروفیسر پریم سنگھ کاہلوں، امریکہ سے بذریعہ ای میل 15 جون 2005

ایس جرنیل سنگھ پسریچہ جن کا انٹرویو محترمہ اندرجیت کور ہیڈ مسٹریس گورنمنٹ منٹگمری گرلز سکول کپور تھلہ نے کیا۔ بذریعہ ای میل یکم اگست 2005

منموہن تنیجا اور ڈاکٹر ستیہ پال بے در کا انٹرویو پروفیسر مچندہ نے مارچ 2007 کو کر کے 11 مارچ کو ارسال کر دیا

ڈاکٹر تیج سنگھ، ایڈمنٹن، کینیڈا بذریعہ ای میل 17 مارچ 2007

گوبند ٹھکرال، چندی گڑھ 21 جولائی 2007

پروفیسر نریندرہ موہن وید، پانی پت جن کا انٹرویو محترم اروند وید نے کیا۔ بذریعہ ای میل 14 اپریل 2010

بتول بیگم، جن کا انٹرویو ان کے بیٹے بریگیڈیر یعسوب علی ڈوگر، لاہور نے کیا۔ بذریعہ ای میل 3 مارچ 2011

References

Moon, Penderel, *Divide and Quit: An Eyewitness Account of the Partition of India*, New Delhi: Oxford University Press.

مشرقی پنجاب اور خود مختار ریاستوں سے مہاجرین کا سیلاب

17

امرتسر اور گورداسپور کی تین تحصیلیں

3 جون 1947 کے 'منطقی تقسیم' کے اصول کے مطابق ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت والے ضلع امرتسر کو مشرقی پنجاب میں رکھا گیا۔ ریڈ کلف ایوارڈ نے بھی اس کی توثیق کی۔ اگر 3 جون کا پلان مد نظر رکھیں تو اس میں ضلع گورداسپور پاکستان میں شامل کرنے کو کہا گیا تھا لیکن ریڈ کلف ایوارڈ میں تین تحصیلوں گورداسپور، بٹالہ اور پٹھان کوٹ کو بھارت میں شامل کر دیا گیا چنانچہ اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ ایسے غیر متوقع فیصلوں سے پریشان کن حالات پیدا ہوئے اور رد عمل سامنے آئے۔

امرتسر شہر

امرتسر شہر میں مسلمان اور ہندو سکھ غنڈوں کی جرائم پیشہ انڈر ورلڈ کے درمیان طویل ترین لڑائی ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان تک جاری رہی۔ ان لوگوں کو سیاسی پارٹیوں اور انتظامی مشینری میں شامل ان کے ہمدردوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔ جس طرح لاہور شہر اور ضلع میں مسلمانوں کی واضح اکثریت کے باوجود ہندو اور سکھ توقع کر رہے تھے کہ لاہور مشرقی پنجاب میں شامل ہوگا اس طرح امرتسر میں اقلیت ہونے کے باوجود مسلمان اس واہمے کا شکار تھے کہ امرتسر پاکستان کو دے دیا جائے گا۔ حالانکہ امرتسر میں سکھوں کا مقدس ترین مقام دربار صاحب (گولڈن ٹیمپل) واقع تھا۔

پاکستان کے سابق وزیر اعظم اور بیوروکریٹ چودھری محمد علی نے اپنی کتاب Emergence of Pakistan میں ایک انگریز افسر کا بیان دیا ہے جس نے امرتسر میں بدترین قتل و غارت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ "15 اگست کو پنجاب میں بھرپور انداز میں یوم آزادی منایا گیا، دوپہر کے دوران سکھ ہجوم نے امرتسر کی سڑکوں پر برہنہ مسلمان خواتین کو گھمایا، پھر اجتماعی زیادتی کی اور آخر میں کرپانوں سے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جبکہ باقی خواتین کو زندہ جلا دیا" (Ali, 1973: 256)۔ امرتسر میں عورتوں کی برہنہ پریڈ کا ذکر خواجہ افتخار نے اپنی تصنیف 'جب امرتسر جل رہا تھا' میں بھی کیا ہے، اگرچہ وہ اس واقعے کو مارچ میں ظاہر کرتے ہیں۔ تاہم کئی مصنفین نے 15 اگست کی ہی تاریخ دی ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ خواجہ افتخار مسلمانوں کی زیادتی کے واقعات سرسری انداز میں بیان کرتے ہیں جبکہ جہاں مسلمانوں پر مظالم کی بات ہو تو ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اگرچہ یہی واقعہ وہ بھی بیان کرتے ہیں تاہم ان کا انداز بیان قطعاً مختلف ہے۔ وجوہات کچھ بھی تھیں بہرحال اگست کے وسط تک امرتسر میں مسلمان مکمل طور پر شکست سے دوچار ہو چکے تھے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جو مسلمان امرتسر سے نقل مکانی نہ کر سکے یا محفوظ مسلم آبادی شریف پورہ میں منتقل نہ ہوئے وہ ذبح کر دیے گئے۔ قبل ازیں ہم نے جامع مسجد رنگریزاں میں پناہ لینے والے مسلمانوں کے بہیمانہ قتل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کارروائی میں شیرخوار بچوں تک کو نہ بخشا گیا جبکہ برہنہ عورتیں اور بچیاں اپنے ہی خون کے تالاب میں ڈوبی

پڑی تھیں (14-212 :1991)۔ دوسری جانب یہ حقیقت سامنے آنے کے بعد کہ امرتسر پر دعوے کی جنگ مسلمان ہار چکے تھے امرتسر شہر میں مسلمانوں کا جانی نقصان بدستور جاری رہا۔ البتہ جو لوگ شریف پورہ منتقل ہوئے انہیں بحفاظت نکال لیا گیا۔ خواجہ افتخار نے لکھا کہ:

> امرتسر کے مسلمانوں نے اس المیے کی تفصیل وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان کو لکھی۔ شہر کے ممتاز مسلمانوں خواجہ غلام نبی، ایڈووکیٹ خواجہ غلام حسن اور صوفی غلام محمد نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ برہنہ خواتین کی لاشوں کے ٹکڑے جمع کیے۔ انہیں سفید کفن میں لپیٹا اور پھر لیاقت علی خان کے دورے کا انتظار کرنے لگے۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق وزیراعظم لیاقت علی خان امرتسر کے فوجی اڈے پر اترے اور مہاجر کیمپ میں مسلمانوں سے ملاقات کی۔ انہوں نے متاثرہ افراد سے براہ راست ان کی المناک داستانیں سنیں اور رونے لگے۔ وہ اتنے آزردہ خاطر ہوئے کہ ان میں مسجد رنگریزاں جاکر جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے کی بھی ہمت نہ پڑی اور وہ واپس چلے گئے۔ وہاں جاکر انہوں نے امرتسر میں پھنسے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے فوجی ٹرک اور خصوصی ٹرینیں بھجوائیں جن سے نقل مکانی میں زبردست آسانی ہوئی (Ibid: 214-15)۔

چودھری محمد سعید

چودھری محمد سعید کے تاثرات بھی ہم قبل ازیں اس کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ پہلے انہوں نے مارچ 1947 کے واقعات بیان کیے۔ اب یہاں اگست اور بعد کے حالات کا ذکر ان کی زبانی کیا جارہا ہے:

> 15 اگست کی صبح سویرے پناہ گزین کیمپ (شریف پورہ) کی انتظامی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ آزادی کے بعد بھارتی پرچم بھی لہرایا جائے اور مقامی حکام کے سامنے اسے سلام کیا جائے اور اس کے بدلے مسلمانوں کی بحفاظت ہجرت کی یقین دہانی حاصل کی جائے۔
>
> چنانچہ مقامی حکام سے رابطہ کیا گیا تو ایس پی سی آئی ڈی آر ای بدری داس، ڈی ایس پی ایس اجاگر سنگھ اور ایم ایل اے سیٹھ سنت رام شریف پور آئے۔ ان کی موجودگی میں بھارتی پرچم لہرایا گیا اور بدلے میں مسلمانوں کی جان، عزت اور املاک کی حفاظت کی ضمانت دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ ان تمام افسروں اور عوامی نمائندوں نے اجتماع سے خطاب کیا اور حفاظتی اقدامات کرنے کا یقین دلایا۔ اس سے مسلمانوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔۔۔ لیکن عملاً انتظامیہ نے کچھ نہ کیا۔
>
> اگلے روز (16 اگست) ہم انتہائی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شریف پور کی حدود سے نکلے اور ڈپٹی کمشنر مسٹر نوکل سین سے ملاقات کرنے گئے (ڈپٹی کمشنر نوکل سین نے 23 اگست کو چارج سنبھالا، اس لیے اس معاملے میں ابہام موجود ہے: مصنف) ڈی سی نے بھی وعدہ کیا لیکن عملاً کچھ نہ ہوا۔
>
> اگلے دن میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر گیا اور زادراہ کے لیے راشن کی درخواست کی۔ ایک مسلمان میجر کی مدد سے میں دو فوجی لاریاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور شام تک شریف پور میں 200 بوری سامان خورد و نوش لے آیا۔ اس سے راشن میں قلت کے ہمارے خدشات جاتے رہے۔ اس کے بعد جب بھی ہمیں ضرورت پڑی راشن کنٹرولر ہمیں گاہے بگاہے سامان بھجواتا رہا۔

پناہ گزین کیمپ کے مکینوں کو یہ جان کر نہایت خوشی ہوئی کہ حکومت پاکستان نے آئی سی ایس افسر مسٹر اے کے ملک کو لائزان افسر مقرر کیا تھا۔۔شاید انہی کی کوششوں سے ہم خصوصی ٹرینیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔یہ ٹرینیں دن میں دو مرتبہ امرتسر سے لاہور تک چلتیں اور شریف پورہ میں محصور افراد کو نکالتیں۔ہر چکر میں تقریباً 5ہزار افراد کو منتقل کیا جاتا۔

باؤنڈری کمیشن ایوارڈ کے اعلان کے ساتھ ہماری امرتسر میں ہی رہنے کی آخری امید بھی دم توڑ گئی تھی۔۔۔۔اگرچہ شریف پورہ میں خوف وہراس تھا لیکن فوجی مورچے ہونے کی وجہ سے معاملہ خراب نہ ہوا اور لوگ اکٹھے رہے۔

15 اگست کو پنڈت جواہر لال نہرو کے پہلے دورے میں، میں نے شریف کیمپ کے نمائندے کے طور پر ان سے ملاقات کی۔مجھے فوج کی سکیورٹی میں ان کی رہائشگاہ پر ملانے لے جایا گیا۔میں نے ان کو تمام واقعات بالخصوص 10 اگست کے حالات سے آگاہ کیا۔انہوں نے نہایت تحمل سے میری بات سنی لیکن جواب کافی جذباتی دیا۔انہوں نے کہا کہ بالکل اسی طرح مغربی پنجاب میں بھی کام ہو رہا ہے لیکن جواب صرف مشرقی حصے میں دیا جارہا ہے۔میں اتنی بڑی اور معزز شخصیت کے منہ سے ایسا جواب سن کر دنگ رہ گیا۔انہوں نے کہا کہ انخلا بہت ضروری ہے تاہم وہ مسلمان جو امرتسر میں ہی رہنا چاہتے ہیں ان کی حفاظت یقینی بنائی جاسکتی ہے۔میری موجودگی میں حکام نے کوچہ رنگریزاں کے واقعے کی تصدیق کی۔

27 اگست کو مجھے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر نے اطلاع دی کہ شریف پورہ سے قافلہ 28 اگست کو روانہ ہو گا۔۔۔لیکن 28 کو کارواں نہ چل سکا کیونکہ ہمیں بتایا گیا ضلع لاہور میں راوی کے قریب کوئی واقعہ ہوا تھا اور اگر اسی تاریخ کو قافلہ روانہ ہوا تو سب کے سب لوگ مارے جائیں گے۔

30 ستمبر کی شام کو عزت ماب مسٹر لیاقت علی خان، عزت مآب شوکت حیات خان اور مشرقی پنجاب کے وزیر ایس سورن سنگھ کے ساتھ شریف پورہ سے گزرے۔میں نے انہیں کیمپ کی حالت زار سے آگاہ کیا اور ان کی مدد سے قافلہ 31 اگست کو صبح 7 بجے چل پڑا۔

کنٹونمنٹ کے کیمپ میں ہم نے سنا کہ نوشہرہ پنواں تحصیل ترن تارن میں 1100 افراد کا قتل عام کیا گیا تھا اور کچھ لوگ اب بھی وہاں چھپے ہوئے تھے۔میں فوجیوں کے ساتھ جائے وقوعہ پر گیا اور زندہ بچنے والے 59 افراد کو ساتھ لے آیا۔وہاں اور کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔انہوں نے الزام لگایا کہ وہاں تعینات ڈوگرہ سپاہیوں نے قتل عام میں متحرک کردار ادا کیا تھا۔

میں خود 4 ستمبر 1947 کو رات ساڑھے 8 بجے فوجی کانوائے کے ساتھ لاہور پہنچا (The Journey to Pakistan1993:148-53)۔

چودھری سعید نے اپنی کتاب میں مزید کئی تفصیلات بھی بیان کی ہیں کہ کس طرح وہ شریف پورہ کیمپ میں آئے اور دیگر راشن کی سپلائی سے پہلے انہیں کئی دن ایسے ہی گزارنا پڑے۔نکاسی آب کی صورتحال بدترین تھی۔پانی اور بجلی بھی غائب تھی۔انہیں یکم ستمبر سے کئی روز تک کچھ کھانے پینے بغیر پولیس کی حراست میں بھی رہنا پڑا۔اسی کی وجہ یہ تھا کہ چودھری سعید نے علاقے سے تانگہ لے جانے کی کوشش کرنے والے پولیس کانسٹیبل کی مزاحمت کی تھی۔انہیں 4 ستمبر کو رہا کیا گیا اور اسی روز وہ روانہ ہو گئے (Ibid: 153)۔

اے حمید

لاہور میں میری ملاقات 24 اپریل 2003 کو معروف اردو ادیب اے حمید سے سمن آباد میں ان کی رہائشگاہ پر ہوئی۔ وہ انٹرویو دینے میں چنداں دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور مجھ سے گریزپا ہی رہے لیکن آخر انہیں میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ میں ان سے ملنے کا اس لیے مشتاق تھا کیونکہ کشمیری نسل کے وہ ایک ٹھیٹھ امرتسری تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کی اپنے آبائی شہر کے ساتھ محبت مدھم پڑنے کی بجائے تیز ہوئی تھی۔ اس لیے مجھے سمجھ آرہی تھی کہ وہ یادیں تازہ کرنے سے کیوں گریز کررہے تھے اور انٹرویو کے دوران ان کی کچھ جھجک واضح بھی ہوتی گئی:

''میں 1928 کو امرتسر کے محلہ کٹیالہ سنگھ میں پیدا ہوا۔ یہاں اکثر گھرانے کشمیریوں کے تھے۔ محلے کے قریب ایک ہندو آبادی بھی تھی۔ ہم مسلمان بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ اگرچہ ہندو اور سکھ بھی تھے لیکن میرے بیشتر دوست مسلمان تھے۔ امرتسر مجلس احرار اور قوم پرست مسلمانوں کا گڑھ تھا لیکن جب مسلم لیگ نے پاکستان کا نعرہ لگایا تو امرتسر کی سیاست میں اچانک تبدیلی آ گئی۔ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مسلمان پاکستان چاہتے تھے اور پوری شدت کے ساتھ چاہتے تھے۔ قائداعظم کو با آسانی حقیقی لیڈر تسلیم کر لیا گیا جبکہ احراروں اور خاکساروں کو حقیر جانتے ہوئے نکال باہر کر دیا گیا۔ جب تک ماسٹر تارا سنگھ نے یہ نہیں کہا تھا کہ 'ہم پاکستان نہیں بننے دیں گے' تب تک امرتسر میں کوئی تصادم نہیں ہوا تھا۔ البتہ گروپ بندی ضرور شروع ہو چکی تھی۔ اس کے بعد حالات قابو سے باہر ہوتے چلے گئے لیکن اشتعال انگیزی کا آغاز صاف طور پر سکھوں کی طرف سے ہوا جنہوں نے 4 مارچ کو ڈھول پیٹتے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں سے اٹھ کھڑے ہونے اور مسلم لیگ کو اقتدار میں آنے سے روکنے کو کہا تھا۔ چوک پراگ داس میں قتل عام میں ہندو ملوث نہیں تھے۔ صرف سکھوں نے جامع مسجد میں نماز پڑھتے مسلمانوں پر حملوں سے کارروائی کا آغاز کیا۔

''ہمیں یقین تھا کہ امرتسر پاکستان کا حصہ بنے گا۔ یہی وجہ ہے کہ امرتسر سے آخر تک لوگوں نے نقل مکانی نہیں کی تھی۔ ہاں انہیں شریف پورہ میں پناہ لینے پر مجبور ضرور کر دیا گیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ لاہور سے مسلم لیگی لیڈروں نے امرتسر آکر ہماری حوصلہ افزائی کی کہ ہم بدستور امرتسر میں رہیں اور اصرار کیا کہ امرتسر پاکستان میں شامل ہوگا۔

''امرتسر پاکستان کا حصہ بنے گا۔ مسلمانوں کو اس بات کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ دوبارہ کبھی واپس امرتسر نہیں آسکیں گے۔ فسادات میں ہمارے خاندان کا کوئی فرد نہیں مارا گیا۔ صرف وہی مسلمان قتل ہوئے جو ہندوؤں اور سکھوں کے محلوں میں قیام پذیر تھے۔ یہ بات سچ ہے کہ بدترین حالات کے دوران بعض سکھ کمیونسٹ ہمارے پاس آئے اور ہمیں قرآن مجید کے نسخے (بے حرمتی سے بچانے کے لیے) واپس کیے۔ انہوں نے مغوی مسلمان لڑکیاں بھی ہمیں واپس لوٹائیں۔ امرتسر سے مسلمانوں کو پاکستانی فوج نے نکالا۔ مجھے یہ پتہ نہیں کہ دیہات میں کیا ہوا تھا البتہ اگست میں دیہی علاقوں سے مسلمان پناہ گزین امرتسر شہر میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں کہ امرتسر شہر میں کتنے مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ میرے خیال میں دونوں طرف کا جانی نقصان برابر ہی تھا۔

''اگر پاکستان نہ بنتا تو ہندو ہمیں (مسلمانوں کو) غربت اور ذات برادری کے نظام میں جکڑے رکھتے۔ اصل میں مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک ہندوؤں پر برتری رکھی چنانچہ انگریزوں کے بعد متحدہ ہندوستان میں وہ مسلمانوں سے اس کا انتقام لیتے۔ اس

لیے پاکستان بننانہایت ضروری تھا۔ پاکستان کا حقیقی اسلامی فلاحی ریاست نہ بننا ایک المیہ ضرور ہے لیکن ہم نے جو خواب سوچا تھا وہ یہ تھا کہ پاکستان میں استحصال سے پاک معاشرہ قائم ہو۔

''ہاں میرے بعض ہندو اور سکھ دوست بھی تھے۔ ان میں سے کچھ کمیونسٹ تھے لیکن وہ اس کے باوجود مندر اور گوردوارے میں عبادت کے لیے جاتے تھے۔ جواہر لال نہرو ایک سیکولر سوچ کے حامل دانشور تھے لیکن کانگریس کی مرکزی قیادت ایسی نہیں تھی۔ ولبھ بھائی پٹیل مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان حالات میں جناح ہمارے لیے پاکستان مانگنے میں حق بجانب تھے۔ پاکستان کے بغیر ہماری کوئی شناخت نہ ہوتی۔ آپ نے مجھ سے ان مسلمانوں کے بارے میں پوچھا جو پیچھے بھارت میں رہ گئے تو آپ کو نظر نہیں آتا کہ کس طرح ان کے خلاف کارروائیاں ہوتی ہیں اور انہیں مارا جاتا ہے۔ آپ ہندو کا ذہن نہیں سمجھ سکتے۔ وہ بہت مکار تھے۔ مسلمان ہندو جیسے نہیں بن سکتے۔ خصوصاً سنی مسلمان معاشرتی مساوات پر یقین رکھتے ہیں اور 'انصاف سب کے لیے' کے نعرے نے ہمیشہ انہیں اپنی طرف مائل کیا۔''

میں نے مارچ 2004 میں امرتسر میں کئی روز تک قیام کیا اور شہر کے مکینوں سے کافی انٹرویو کیے۔ ان میں سے بعض انٹرویو نیچے دیے جارہے ہیں۔

گرچرن داس اروڑہ

''جو کچھ امرتسر میں ہوا وہ ناگزیر تھا۔ یہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی بہت سیاست زدہ شہر تھا۔ 13 اپریل 1919 میں جلیانوالا باغ میں ہونے والے قتل عام کے بعد امرتسر میں سیاسی سرگرمیاں کبھی نہیں تھم سکیں۔ سیاسی میدان میں مجلس احرار اور خاکسار تحریک کے ذریعے مسلمانوں کا کردار کافی متحرک تھا۔ مسلم لیگ امرتسر میں بہت بعد میں آئی اور امرتسر کے مسلمان 46-1945 کی انتخابی مہم میں بھرپور طریقے سے شریک ہوئے۔ یہی وہ وقت تھا جب لاہور سے تعلق رکھنے مسلم لیگی رہنما باقاعدگی کے ساتھ امرتسر کے دورے کرنے لگے۔ میرے خیال میں یہ لوگ لاہور میں انگریز گورنر اور دیگر اعلیٰ افراد کی موجودگی میں جو کچھ نہ کر سکے وہ انہوں نے امرتسر میں کر دیا۔ امرتسر میں ہمیشہ بڑی جماعت کانگریس ہی رہی۔ ستیہ پال اور سیف الدین کچلو ان کے لیڈر تھے۔ امرتسر ہندو، سکھ، مسلم اتحاد کی بہترین مثال تھا۔ امرتسر میں کئی مسلمان شاعر تھے جو اپنے بنیاد پرست اشتراکی نظریات سے عوام کو متحرک کر سکتے تھے۔ کبھی کبھار فرقہ وارانہ تصادم کے ہلکے پھلکے واقعات بھی ہو جاتے تھے لیکن ان کی کوئی گہری جڑیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ یہ غلط فہمی کے نتیجے میں جنم لیتے تھے۔ درحقیقت 1945 سے پہلے کا امرتسر سیکولر، سامراج مخالف قوتوں کا قلعہ تھا جو تمام ہندوستان کی بلا امتیاز آزادی چاہتی تھیں۔

''میں اس بات کی تردید نہیں کروں گا کہ آر ایس ایس اور سکھوں نے بدترین کارروائیوں کی تیاریاں شروع کر دی تھیں لیکن مسلم نیشنل گارڈ بھی پیچھے نہیں رہی۔ اب میں بوڑھا ہوں لیکن ان دنوں میں بہت کم عمر تھا اور ہندوؤں کی مذہبی رسومات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ میرے والد لالہ گیان چند مندر کمیٹی کے سربراہ تھے۔ مذہب سے ہماری یہ وابستگی آزادی کے لیے ہماری جدوجہد کی راہ میں حائل نہیں ہوتی تھی۔ یہی بات نیک اور اچھے مسلمانوں پر صادق آتی تھی۔ ہندو

مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر نہیں کھاتے تھے۔ یہ بات ماننا پڑے گی۔ یہ عادت بہت پہلے ختم ہو جانی چاہیے تھی لیکن ان دنوں لوگ اس کو بڑا مسئلہ نہیں بناتے تھے۔

"سب کچھ مارچ 1947 میں تبدیل ہوا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ محبت اور ہم آہنگی کے جذبات خوف اور شکوک و شبہات میں بدل رہے تھے۔ اب باہر نکلنا محفوظ نہیں رہا تھا۔ ہندو اور سکھ اپنی آبادیوں میں جبکہ مسلمان اپنے محلوں تک محدود ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس تمام صورتحال کی منصوبہ بندی کہیں اور کی گئی تھی۔ شاید انگریز ہی اس کے پیچھے تھے۔ بہرحال جون کے بعد مسلمان دفاعی پوزیشن میں چلے گئے تھے۔ حالانکہ پہلے (مسلمان) غنڈے کافی جرائم میں ملوث رہے۔

"مجھے یاد ہے کہ نواحی دیہات سے لٹے پٹے مسلمان امرتسر شہر آرہے تھے اور سکھوں کی بربریت کے واقعات سنا رہے تھے۔ اگست میں اس صورتحال میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس وقت تک مسلمانوں کو کافی حد تک منظر عام سے ہٹایا جا چکا تھا اور اکثریت اب شریف پورہ اور قدیم شہر کے دیگر حصوں میں محصور تھی۔ آپ جاننا چاہتے ہیں کہ 1947 کے اختتام تک امرتسر میں جانی نقصان کتنا تھا؟ تو سنو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں افراد کا قتل کیا گیا۔ میں نے لاشوں، بچوں تک کی، کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھا۔ ایک عورت کی شرمگاہ میں بھی نیزہ مارا گیا تھا۔ یہ ایک کریہہ منظر تھا۔ یہ واقعہ بٹالہ سے امرتسر آنے والی مین روڈ پر ہوا۔ وہ عورت غالباً کسی گاؤں سے جان بچا کر آئی تھی کیونکہ اس کا لباس دیہاتیوں والا تھا۔ وہ مسلمان تھی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد حملوں میں زبردست تیزی آئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ شریف پورہ میں محصور افراد فوج آنے کی وجہ سے کسی نقصان کے بغیر پاکستان نقل مکانی کر گئے۔ اگست کے بعد جو مسلمان مارے گئے وہ دیہات کے رہنے والے تھے۔

"یہ سچ ہے کہ چند مسلم خواتین کو امرتسر میں سرعام برہنہ گھمایا گیا۔ یہ ایک مکروہ فعل تھا۔ مجھے تاریخ تو یاد نہیں البتہ یہ واقعہ اگست میں ہوا تھا۔ مجھے نہیں پتہ کہ ایسا مارچ میں پہلے بھی ہوا تھا جیسے کہ آپ نے بتایا ہے تاہم اگست کا واقعہ کافی بدنام ہے۔ خدا اس فعل میں ملوث عناصر کو کبھی معاف نہیں کرے گا لیکن ایسے جرائم کی ذمہ داری مسلم لیگ پر بھی عائد ہوتی ہے جو ہمارے مادر وطن (ہندوستان) کو تقسیم کرنے کے درپے تھی۔ اب کبھی کبھار لاہور سے امرتسری مسلمان امرتسر کا دورہ کرتے ہیں۔ چونکہ میں امرتسر میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا اور علاقے میں ہماری دکان بھی تھی اس لیے بعض امرتسریوں نے ان مسلمانوں کو میری طرف بھی بھیجا۔ اکثر وہ ان سڑکوں پر جانا چاہتے تھے جہاں وہ تقسیم سے پہلے رہتے تھے۔ ان میں سے کئی زار و قطار روتے بھی تھے۔ کبھی کبھی وہ مذاق میں کہتے تھے کہ وہ واپس امرتسر آنا چاہتے ہیں لیکن یہ جذبہ امرتسر کی نئی نسل میں مفقود ہے جو امرتسر کی محبت اور مسرت کی روایت سے عاری ہے۔ میں اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گا تو ان پرانے امرتسریوں کو اپنے آبائی گھر تلاش کرنے میں کون مدد دے گا؟ یہ (تقسیم، فسادات) سب کچھ غیر ضروری تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا ہے اور اب امرتسر بالکل مختلف جگہ ہے۔

"کچھ کشمیری ہنرمند اور تاجر امرتسر میں ہی رہ گئے۔ اگر آپ آج بھی ہال بازار کے عقب میں جائیں تو یہ کشمیری آپ کو وہاں بیٹھے کام کرتے یا اپنی چیزیں فروخت کرتے نظر آئیں گے۔ اگر آپ شہر کے وسط میں جائیں تو نظر آئے گا کہ مساجد دوبارہ آباد ہو چکی ہیں۔ نہ صرف کشمیری بلکہ کئی مسلمان 'بھیے' (اردو بولنے والے) بھی آپ کو کافی تعداد میں

دکھائی دیں گے۔ یہ 'بھیے' زیادہ تر یوپی اور بہار کے ہیں۔لہذا مسلمان آہستہ آہستہ امرتسر کو واپس آرہے ہیں۔ مجھے پتہ نہیں کہ یہاں دوبارہ مختلف عقائد کے لوگوں کو ایک ساتھ آباد کرنا مناسب ہے یا نہیں لیکن بھارت ایک جمہوری ملک ہے جہاں کوئی بھی کسی جگہ آباد ہو سکتا ہے یا کام کر سکتا ہے۔ مسلمان دوبارہ واپس آسکتے ہیں لیکن وہ اجنبی ہی ہوں گے۔ وہ مسلمان شعراً اور ادیب جو امرتسر کی زندگی کا جزو لازم تھے اب قصہ پارینہ بن چکے ہیں اور یہ حقیقت میری نسل کو ہمیشہ کچوکے لگاتی رہے گی۔"

ماضی کے واقعات نے گرچرن داس اروڑہ کی شخصیت پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ میرے ساتھ ملاقات کے دوران انہوں نے احساس گناہ اور ناسٹلجیا کے ساتھ گفتگو کی تاہم وہ مسلم لیگ کو بھی اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جس نے مسلمانوں کو یہ غلط تاثر دیا کہ امرتسر مسلمانوں کے پاس رہے گا۔ بعد ازاں میں نے اور وکی نے امرتسر کی کئی سڑکوں پر گھوم پھر کر کشمیری درزیوں اور اونی شال کے تاجروں کو مصروف کار دیکھا۔ بظاہر ان کی رہائش وہیں تھی جہاں وہ کام کرتے تھے لیکن یہ میرا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مساجد کے میناروں پر تازہ تازہ پینٹ بھی اس بات کی دلالت کرتا تھا کہ یہ آباد ہیں۔

ضلع امرتسر

18 اگست سے آگے تک امرتسر اور تحصیل ترن تارن کے مسلمان سکھ جتھوں کے رحم وکرم پر تھے، اگرچہ پنجاب باؤنڈری فورس بھی متحرک تھی لیکن نفری اور ضروری ہتھیاروں کی کمی کی وجہ سے وہ قتل عام رکوانے میں ناکام رہی۔ مسلمانوں اور پاکستانی داستانوں میں امرتسر کے دیہی علاقے اور امرتسر سے واہگہ جانے والے راستے "قتل گاہیں" تھے۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ پہلے امرتسر میں اختیارات کے غلط استعمال میں جو بھی رکاوٹ تھی لیکن جیسے ہی مقامی انتظامیہ میں مسلمان حکام کو نکال دیا گیا تو صورتحال ایک دم بدل گئی اور مسلمانوں کو بے رحمی کے ساتھ کاٹ کے رکھ دیا گیا۔

لیجنڈ گلوکار محمد رفیع کا گاؤں

امرتسر سے شمال مشرق میں 25 کلومیٹر دور چھوٹے سے قصبے مجیٹھ کو جانے والی بڑی سڑک پر ایک شادی ہال کے سامنے کوٹلہ سلطان سنگھ (تحصیل و ضلع امرتسر) واقع ہے۔ میرے کئی قارئین کے لیے کوٹلہ سلطان سنگھ شاید کسی خاص اہمیت کا حامل نہ ہو لیکن وہ لوگ جو 1950 کی دہائی سے ہندوستانی موسیقی سنتے آئے ہیں ان کے لیے یہ گاؤں ایک عقیدت کا مرکز ہے۔ عظیم گلوکار (اردو، ہندی، پنجابی فلموں کا شنکر) محمد رفیع (انتقال 31 جولائی 1981) یہیں پیدا ہوا تھا۔ 27 مارچ 2004 کو وکی، نانک سنگھ اور میں نے کوٹلہ سلطان سنگھ کا دورہ کیا۔ یہ مشرقی پنجاب کے طوفانی دوروں کا گیارہواں روز تھا۔ 2200 کلومیٹر پر محیط اس سفر کے دوران میں نے تقسیم پنجاب کے عینی شاہدین کے کئی انٹرویو کیے۔ اس دورے کا اختتام ایک ایسی شخصیت کے آبائی گاؤں پر کرنا نہایت مناسب تھا جسے بلا تفریق مذہب برصغیر میں نہایت مقبولیت حاصل تھی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ گاؤں میں محمد رفیع کے عقیدت مند مسلسل آتے جاتے رہتے تھے اور ان کی رہائشگاہ پر آکر خراج عقیدت پیش کرتے تھے۔ گاؤں میں ہمیں ایک بزرگ معزز سکھ کے پاس لے جایا گیا جو روایتی انداز میں چارپائی پر بیٹھا تھا۔

سردار کندن سنگھ سمرا

"ہم گاؤں کے زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے گاؤں کی نصف آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ گاؤں کا مجموعی ماحول برادرانہ تھا اور ہر کمیونٹی کے ارکان نہ صرف ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے بلکہ مذہبی تہواروں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اگرچہ محمد رفیع، ان کا خاندان اور مسلمانوں کے اکثریتی ارکان سنی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے لیکن کچھ شیعہ مسلمان بھی تھے۔ وہ محرم کا جلوس نکالنے کے لیے ہمارا گھوڑا استعمال کرتے تھے۔

"بیشتر مسلمان غیر زراعتی پیشوں سے وابستہ تھے۔ 1945 میں محمد رفیع کی شادی ان کی کزن بشیراں سے ہوئی۔ وہ بھی اسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ ہم سب نے شادی کی تقریبات میں حصہ لیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ محمد رفیع لاہور کی فلم انڈسٹری سے پلے بیک سنگر کے طور پر کیریئر کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ جلد ان کے نغمے ریڈیو سے چلنا شروع ہو گئے۔ پھر ہم نے سنا کہ وہ قسمت آزمائی کے لیے بمبئے چلے گئے تھے۔ 1956 میں محمد رفیع ایک محفل موسیقی میں حصہ لینے کے لیے واپس امرتسر آئے۔ ہم میں سے بعض اہل دیہہ شوشروع ہونے سے پہلے ان سے ملنے امرتسر گئے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ کافی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا اور دوبارہ گاؤں آنے کا وعدہ کیا۔ ہمارے گاؤں کا کوئی بھی فرد جب کبھی بمبے جاتا تو محمد رفیع اس کی ہر ممکن مدد کرتے تھے بلکہ وہ ان کے گھر میں ہی ٹھہرتا اور ان کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاتا۔ بدقسمتی سے محمد رفیع اپنی زندگی میں دوبارہ کبھی کوٹلہ سلطان سنگھ نہ آسکے۔"

میں نے دہلی میں محمد رفیع کی کہانی ممتاز صحافی نروپما دت کو سنائی تو انہوں نے وضاحت کی کہ رفیع آخر کیوں آبائی گاؤں جانے میں ہچکچاہٹ کا شکار رہے۔ انہوں نے بتایا، "کوٹلہ سلطان سنگھ کی کچھ خواتین نے بتایا تھا کہ جب 1947 میں اس گاؤں کے مسلمانوں پر حملے کیے گئے تو محمد رفیع کی بعض رشتہ دار خواتین کو بھی اغوا کر لیا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس بنا پر گاؤں آنے میں جھجک محسوس کرتے ہوں۔" نروپما کی یہ بات مجھے کافی مناسب لگی۔

ضلع امرتسر کے ایک اور دیہی علاقے ترن تارن سے تعلق رکھنے والے ایک مسلمان مہاجر نے مجھے ان دنوں کے واقعات کی تفصیل ان الفاظ میں سنائی۔

حاجی محمد اکرم

"ہم ترن تارن کے نواحی علاقے میں رہتے تھے۔ یہ بنیادی طور پر جاٹ برادری کا گاؤں تھا۔ اکثریت سکھوں کی تھی لیکن کچھ نسلوں سے بعض گھرانوں کے بزرگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ جولائی بلکہ اس سے بھی پہلے سکھ جتھوں نے ہمارے گاؤں پر حملے شروع کر دیے تھے۔ ہمارے اپنے گاؤں کے سکھ اور ہندو اچھے لوگ تھے۔ اصل میں تمام مذہب کے عمائدین نے عہد کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد پتہ چلا کہ ہمارا گاؤں بھارت میں شامل ہوا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ارد گرد کے دیہات کے سکھ مسلمان دیہات پر حملہ کرنے والے ہیں اور ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوگی کہ ہم انہیں روک نہیں سکیں گے۔ اس اطلاع پر خوف وہراس پھیل گیا۔

''اگلے روز (18 اگست) عید تھی لیکن ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم سورج طلوع ہونے سے قبل گاؤں چھوڑ دیں گے۔ میرے دادا بہت ضعیف اور بیمار تھے۔ ہمارے پاس سواری کے لیے صرف ایک دو بیل گاڑیاں تھیں۔ بزرگوں نے کہا کہ وہ نوجوانوں کو موقع دینے کے لیے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو وہ بچ جائیں گے بصورت دیگر ان کا وقت تو پورا ہو ہی چکا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بزرگوں کو ساتھ نہ لے جانے پر میرے والد رو پڑے لیکن ہم آخر کیا کر سکتے تھے۔ اس رات کوئی بھی نہ سویا۔ رات گئے میرے دادا نے میرے والد سے کہا، 'ساجے اک دفعہ اکرم نوں کہہ اچی اچی واز وچ رسول پاکؐ دی شان وچ او نعت سنا جیہڑی اوہ سنادا ہوندا اے' (ساجد ایک دفعہ اکرم سے کہو کہ وہ اونچی اونچی آواز میں وہ نعت رسولؐ سنائے جو وہ سناتا رہتا ہے)۔ میری عمر اس وقت صرف تیرہ سال تھی۔ میرے آواز میں کافی ترنم تھا اور میں اسلامی اہمیت کے دنوں میں نعتیں پڑھا کرتا تھا۔ جب میں نے نعت پڑھنا شروع کی تو سب لوگ رونے لگے۔ مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ البتہ یہ واضح ہو چکا تھا کہ ہم جدا ہو رہے تھے اور ہماری زندگیاں خطرے میں تھیں۔ میں نے یہ پڑھا 'یا نبیؐ سلام علیک، یا رسولؐ سلام علیک' تو گاؤں کے سکھ اور لالہ جی (ہندو دکاندار) تک بھی رونے لگے۔ دادا جی نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، 'پتر مینوں بھل نہ جاویں۔' میں ان کا اکلوتا پوتا تھا کیونکہ میرے تایا کی صرف بیٹیاں ہی تھیں جبکہ میری پھوپھی کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی اور وہ کپورتھلہ چلی گئی تھیں۔

''تھوڑی دیر بعد ہم سڑک پر تھے۔ ہمارے گاؤں کے کچھ لوگوں کے رشتہ دار لاہور میں تھے چنانچہ ہم ان کے پیچھے چل پڑے۔ قافلے میں 800 افراد شامل ہوں گے۔ بوڑھی عورتوں، حاملہ خواتین اور چھوٹے بچوں کو چھکڑوں پر بٹھا دیا گیا جبکہ باقی سب لوگ پیدل چلنے لگے۔ کچھ بزرگوں نے بھی آخری وقت پر ہمارے ساتھ آنے کا فیصلہ کیا لیکن انہیں بھی پیدل چلنا پڑا۔ پروگرام یہ تھا کہ ہم مین روڈ پر چلیں گے چنانچہ دیگر ملحقہ دیہات کے کئی افراد بھی ہمارے ساتھ آ گئے۔ لگتا ہے کہ ان لوگوں نے بھی سورج نکلنے سے پہلے علاقہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ خواتین قرآنی آیات پڑھ رہی تھیں جبکہ جوان مرد حفاظت کا کام کر رہے تھے۔ جلد ہی قافلے کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ جب دن چڑھ آیا تو سکھوں کے پہلے جتھے نے ہر طرف سے دھاوا بول دیا۔ ان کے پاس رائفلوں، ریوالور سمیت ہر قسم کا اسلحہ تھا تاہم اکثریت کے پاس نیزے اور کرپانیں تھیں۔ ہم نے ابھی عید کی نماز تک نہیں پڑھی تھی کہ اچانک کربلا برپا ہو گئی۔

''میری والدہ کا گزشتہ گرمیوں میں انتقال ہو چکا تھا اس لیے مجھے صرف میرے والد نے پالا۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم کھیتوں میں بھاگ رہے تھے۔ اگرچہ گاؤں کے کئی دیگر افراد بھی ہمارے ساتھ تھے لیکن جب حملہ شروع ہوا تو ہر کوئی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ اس دوران والد صاحب کو گولی لگی اور وہ نیچے گر گئے لیکن میں بھاگتا رہا تاکہ کھیتوں میں چھپ سکوں۔ ہمارے اردگرد زخمی لوگوں کی آہیں اور سسکیاں سنائی دے رہی تھیں جبکہ سکھ نعرے لگا رہے تھے اور پنجابی میں گالیاں دے رہے تھے۔

''جلد مجھے کھیتوں میں چھپے دیگر لوگ بھی مل گئے۔ ان میں ہمارے گاؤں کا عالم پیر عبد الصمد شاہ بھی تھا۔ میں نے اس سے قرآن پڑھنا سیکھا تھا اور مجھے نعتیں پڑھنا بھی اس نے سکھائی تھیں۔ اس نے نہایت پیار سے میری دکھ بھال کی اور جلد گاؤں کے دیگر لوگ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہم سب رو رہے تھے تو شاہ جی نے ہم سب کو تسلی دی۔ شاہ جی کی

اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی ایک ہی شادی شدہ بیٹی تھی جو ان دنوں امید سے تھی۔ اس کا شوہر کلکتہ میں کہیں کام کرتا تھا۔ وہ بھی دیگر عورتوں کے ساتھ بیل گاڑی پر بیٹھی تھی۔ جب سکھوں نے حملہ کیا تو شاہ جی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ بیٹی کے ساتھ کیا ہوا۔ انہوں نے قرآنی آیات کی تلاوت شروع کر دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ ہمارا امتحان لے رہا ہے۔ ہمیں اللہ کی رحمت پر یقین قائم رکھنا چاہیے۔ سکھ جتھے ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ ایک بار تو وہ ہمارے کھیت کے پاس بھی آ گئے۔ انہیں وہاں کوئی مل گیا جسے انہوں نے قتل کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ نوجوان عورتوں کو ساتھ لے گئے تھے۔

''جب رات ہوئی تو ہم لوگ کھیتوں سے نکل آئے۔ کچھ لوگوں کو لاہور جانے کا راستہ آتا تھا چنانچہ ہم اس سمت کو روانہ ہو گئے۔ ہماری تعداد سینکڑوں میں ہو گی۔ کچھ عورتیں بھی بھاگ کر کھیتوں میں آ گئی تھیں۔ کئی سو لوگ مارے بھی گئے تھے۔ ہم نے کئی افراد کی لاشیں دیکھیں۔ ہمارے گاؤں کے لوہار کرم دین کی لاش بھی تھی جس کی گردن میں بھالا مارا گیا تھا۔ ہر طرف لاشوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ یہ ایک کریہہ منظر تھا۔ میں واپس جا کر اپنے والد کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن مجھے سب نے منع کر دیا۔

''اگلے روز مزید مسلمان ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہم نے مین روڈ پر چلنے سے گریز کیا اور دو روز بعد واہگہ پہنچے۔ ہم میں سے کئی افراد بہت زخمی تھے۔ کچھ راستے میں چل بسے۔ جب ہم پاکستان کی حدود میں داخل ہوئے تو ہم اپنے پیاروں کو یاد کر کے پھر رو پڑے۔ دوسری طرف ہندوؤں اور سکھوں کی لاشوں سے سڑانڈ اٹھ رہی تھی۔ موت کے فرشتے نے کسی بھی نہیں بخشا تھا۔

''سچ تو یہ ہے کہ 1947 سے پہلے مختلف مذاہب کے درمیان کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں ایک ہندو گاؤں میں واقع سکول میں پڑھنے جایا کرتا تھا جو ہمارے گاؤں سے تھوڑی دور تھا۔ ارد گرد کے دیہات کے ہندو اور سکھ طلبا بھی ہمارے ساتھ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں مسلمان اکثریت میں تھے لیکن سکھ اور ہندو بھی تھے۔ وہ اسلام کے مذہب کا نہایت احترام کرتے تھے اور ہم بھی ان کے عقائد کا اسی طرح احترام کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں کسی قسم کا مسئلہ نہیں تھا۔ ہم میں سے اکثر ایک ہی کنواں اور دیگر سہولیات استعمال کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد میری زندگی دوبارہ کبھی ویسی نہیں رہی، اگرچہ میں نے کافی کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ میرا بیٹا سعودی عرب چلا گیا جہاں اس نے اچھی کمائی کی۔ میرے پوتے پوتیوں نے تعلیم کے شعبے میں اچھی کارکردگی دکھائی ہے۔ ایک پوتا انجینئر ہے وہ بھی سعودی عرب میں ہے۔ اب پاکستان ہمارا وطن ہے لیکن میں ہمیشہ اس گاؤں کے بارے میں سوچتا ہوں جہاں میری ماں دفن ہے۔ شاید دادا اور والد بھی وہیں دفن ہوں گے۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اور مجھے نہیں پتہ چلا کہ کیا ہوا۔ البتہ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ حملہ آوروں نے گاؤں میں باقی رہ جانے والے تمام مسلمانوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ کسی کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔

بٹالہ، گورداسپور اور پٹھان کوٹ

مسلمانوں کے نکتہ نظر سے پنجاب کی تقسیم کا سب سے ڈرامائی کلائمیکس اور اینٹی کلائمیکس مشرقی پنجاب میں شامل کی جانے والی ضلع گورداسپور کی تین تحصیلوں میں 15 سے 17 اگست کے درمیان وقوع پذیر ہوا۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ گورداسپور

میں مسلمانوں کی اکثریت برائے نام یعنی 51 فیصد تھی۔ 14 اگست کو ان تمام تحصیلوں میں مسلمانوں نے پاکستانی پرچم لہرایا جو سمجھتے تھے کہ ضلع گورداسپور مکمل طور پر پاکستان میں شامل ہوگا، چاہے وہاں ان کی اکثریت انتہائی کم ہی کیوں نہ تھی۔ درحقیقت حکومت پاکستان نے اپنے افسر مشتاق احمد چیمہ کو گورداسپور کا ڈپٹی کمشنر بھی مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے 14 اگست سے 17 اگست تک چارج بھی سنبھالا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس عرصے میں ہندوؤں کی جائیدادوں اور کاروبار کو ہتھیانا شروع کر دیا تھا اور کافی تشدد بھی پھیلایا۔ اس کا اعتراف بعض مسلمانوں نے بھی کیا جن سے میں نے انٹرویو کیے لیکن انہوں نے 2، 3 دنوں میں پیدا ہونے والے تشدد کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا۔ البتہ جب 17 اگست کو عوامی سطح پر یہ بات منظر عام پر آئی کہ یہ 3 تحصیلیں بھارت کو دے دی گئی ہیں تو جواباً ہندوؤں اور سکھوں نے خونریز تشدد شروع کر دیا۔

سید ضیا محی الدین

"بٹالہ میں ہمارے خاندان کو نہایت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کیونکہ ہم علاقے کے ممتاز پیر تھے۔ چونکہ میرے والد پیر تھے اس لیے ہندو اور سکھ بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ ایک ہندو رائے بہادر بھوانی سنگھ ہمارا قریبی دوست تھا۔ وہ راجپوت تھا۔ ہم ان کے اہل خانہ کو بہن بھائی سمجھتے تھے۔ ہم ہندوؤں کے ساتھ مٹھائیوں کا تبادلہ کرتے تھے۔ میرے والد کا نام سید نذر محی الدین ہے۔ وہ ہمیشہ بٹالہ میونسپلٹی کے بلامقابلہ رکن منتخب ہوتے تھے۔ بٹالہ میں کچھ انڈسٹری بھی تھی۔ سی ایم لطیف جو بعدازاں پاکستان کے ممتاز صنعتکار بنے کا تعلق بھی بٹالہ سے تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ بٹالہ پاکستان میں شامل ہوگا۔ گورداسپور ضلع کا سب سے بڑا شہر بٹالہ تھا۔ 14 اگست کو یہ افواہ پھیل گئی کہ بٹالہ پاکستان میں شامل کر دیا گیا ہے چنانچہ اگلے 3 روز تک پاکستانی پرچم بٹالہ میں لہرایا گیا۔ ہم نے اپنے ہندو دوستوں کو پناہ دینا شروع کر دی لیکن 17 اگست کو صورتحال اچانک بدل گئی لیکن ہم نے اس کے کوئی اثرات محسوس نہ کیے۔ ہندوؤں نے ہمیں ہراساں نہیں کیا تھا۔ ہمارا کوئی تصادم نہیں تھا۔ ہمیں براہ راست کوئی نقصان نہیں پہنچا، البتہ دیہی علاقوں میں سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام ضرور کیا۔ اصل لڑائی سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان تھی۔ گورداسپور کے دیہی علاقوں میں سکھ کافی عسکریت پسند تھے۔ ہزاروں افراد پناہ کے لیے ہمارے گھر آنا شروع ہو گئے تھے۔ 17 سے 20 اگست کے درمیان ہمارے خاندان کے بیشتر افراد پاکستان منتقل ہو چکے تھے۔ ہم 8 افراد البتہ مسلمانوں کی مدد کے نکتہ نظر سے وہیں مقیم رہے۔ ہم نے دیکھا کہ بٹالہ کے نواحی علاقوں میں مسلمانوں کو ہلاک کیا جا رہا تھا۔ پھر ہم بھی 10 ستمبر کو پاکستان آ گئے۔ رخصتی کے وقت ہندو ہمارے پاس آئے اور بولے، 'آپ کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔' ایک سکھ ڈاکٹر اور ایک سینئر ہندو ڈاکٹر لڈر رمائی ہمارے پاس آئے اور کہا کہ، 'آپ مت جائیں، ہم آپ کا خیال رکھیں گے۔' پھر بولے 'اچھا کچھ عرصے کے لیے چلے جاؤ، پھر واپس آ جانا۔' خود میرے والد کی بھی یہی رائے تھی۔ ہم لاہور آتے جاتے رہتے تھے۔ بٹالہ لاہور سے صرف 60 میل کے فاصلے پر تھا۔ ہجرت کے باعث ہمیں اپنی جائیداد سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ہمارا خاندان پاکستان میں سیالکوٹ میں آ کر آباد ہو گیا۔ ہمارے کئی مرید تھے۔ میرے والد عوامی نمائندہ منتخب ہو گئے۔ پھر ہمیں لاہور میں 49 جیل روڈ لاہور پر ایک کرنل کا خالی مکان الاٹ کر دیا گیا۔"

ایاز خان

"بٹالہ میرا آبائی شہر ہے جہاں ککے زئی پٹھانوں کی ہماری کئی نسلوں نے جنم لیا تھا۔ میری والدہ پٹھان کوٹ سے تعلق رکھتی تھی۔ میں اپنے نانا کے گھر پٹھان کوٹ میں ہی پیدا ہوا تھا۔ میں 1947 میں بانساں والا بازار کے قریب واقع ایم بی ہائی سکول بٹالہ میں پانچویں جماعت کا طالبعلم تھا۔ مارچ میں بٹالہ میں کوئی فسادات نہیں ہوئے تھے۔ جون یا جولائی میں البتہ کچھ گڑبڑ ضرور ہوئی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں میرا چھوٹا بھائی اعجاز خان اور میں لاہور گئے۔ وہاں ہم نے سنا کہ امرتسر کے علاقے مجیٹھ کے سکھوں نے بٹالہ میں حملے کر کے خوف وہراس پھیلایا تھا۔ انہوں نے ہمارے گھر کو بھی نشانہ بنایا لیکن خوش قسمتی سے میری والدہ اور چھوٹا بھائی اظہار خان کسی نہ کسی طرح بھاگ کر بچ گئے اور پھر ٹرک سے لاہور چلے گئے۔ میرے والد کے ایم نذیر پیدل ہی لاہور کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے کرکٹ باؤلر والی ہیٹ پہن رکھی تھی اور ایک کارواں میں شامل ہو گئے جو ہزاروں مردوں اور خواتین پر مشتمل تھا۔ مسلم لیگ بٹالہ کے صدر سید بہاالدین کو پولیس سٹیشن میں مسلمانوں کے لیے پناہ لینے کی کوشش کے دوران سر میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ (ایک ہندو عینی شاہد کے مطابق بہاالدین کا سر قلم کر دیا گیا تھا)۔

"میرے ماموں شیخ محمد ریاض مسلم لیگ تحصیل گورداسپور کے صدر تھے۔ وہ لاہور ریلوے سٹیشن پہنچے اور گجرات جانے کے لیے ایک ٹرین کا انتظار کر رہے تھے جہاں ہمارا سرکاری ملازم قریبی رشتہ دار تعینات تھا۔ سٹیشن پر کسی نے میری نانی کی چوڑیاں چھیننے کی کوشش کی تو انہوں نے شور مچاتے ہوئے کہا، 'ریاض، ریاض یہ آدمی میرا کڑا چھیننے کی کوشش کر رہا ہے۔' جس پر ماموں بولے 'ماں جی! یہ آدمی ہم سے زیادہ ضرورتمند لگتا ہے، اسے کڑا دے دیں۔' ہمارے بعض رشتہ دار حملوں میں مارے گئے تاہم اکثریت 18 اگست کے بعد بخیریت پاکستان کی سرحد پار کر گئی تھی اور آنے والے دنوں میں قتل عام اور لوٹ مار سے بچ گئے۔"

نہرو نے بٹالہ کے متاثرین کی مدد کی

پنجاب مسلم لیگ کی ممتاز رہنما بیگم شاہنواز جن کے والد سر محمد شفیع ایک دور میں محمد علی جناح کے سیاسی قد کے لیڈر تھے کا بٹالہ کے ارد گرد کے دیہات میں کافی رشتہ دار تھے۔ انہوں نے ان دنوں کے کچھ واقعات بتائے ہیں لیکن تاریخ کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ لگتا ہے کہ یہ 11 اگست کے بعد کے ہی واقعات تھے۔

> نواب ممدوٹ نے مجھے ایک رات 10 بجے فون کیا اور کہا کہ انہیں باوثوق ذرائع سے پتہ چلا تھا کہ اس رات سکھ بٹالہ شہر پر حملہ کرنے والے تھے۔ وہ شہر ہمارے قبیلے کے افراد سے بھرا پڑا تھا۔ (بیگم شاہنواز آرائیں برادری سے تعلق رکھتی تھیں) اس کے علاوہ میری خالہ لیڈی رشید (پاکستان کے پہلے چیف جسٹس میاں عبد الرشید کی اہلیہ) اور ان کا پورا کنبہ بھی وہیں تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تم بڑا قتل عام روکنے کے لیے جو کچھ کر سکتی ہو کر لو۔ میں یہ سن کر بہت پریشان ہو گئی اور گورنر سر فرانسس موڈی کی بھتیجی مس مکوئین کو فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ گورنر کی طبیعت خراب تھی اور وہ سو گئے تھے۔ میں نے درخواست کی کہ انہیں جگائیں اور بتائیں کیونکہ یہ ایک اہم کال ہے۔ چنانچہ گورنر نے مجھ سے بات کی تو میں نے انہیں درخواست کی کہ آپ گورنر جنرل انڈیا لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو فون کر کے بٹالہ شہر کو بچانے کی کوشش کریں۔ میں نے انکل

رشید کولانے کے لیے اپنی کار بھیجی۔ وہ آئے تو میں نے انہیں کہا کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو کو فون کریں لہٰذا انکل (چیف جسٹس) نے پنڈت جی سے بات کی تو انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس وقت میری والدہ دہلی میں میرے بھائی میاں محمد رفیع جو سنٹرل اسمبلی کے سیکرٹری تھے کے پاس تھیں۔ میں نے انہیں بھی فون کیا اور کہا کہ وہ اگلی صبح پنڈت جی سے مل کر بٹالہ کے مسلمانوں کی مدد کرنے کی کوشش کریں۔ وہ اگلے روز پنڈت جی سے ملیں۔ وہ میری والدہ کی نہایت عزت کرتے تھے اور انہوں نے مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ میں اور تازی پوری رات سونہ سکے لیکن خدا کا شکر ہے کہ بٹالہ کو بچالیا گیا(2002:210-11)۔

چودھری محمد بشیر

''صرف تین روز کے لیے گورداسپور پاکستان میں شامل رہا۔ پھر خبر آئی کہ یہ ضلع بھارت کو دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہم تحصیل پٹھان کوٹ کے گاؤں مکھن پور سے جلدی میں نکلے۔ گاؤں کی نصف آبادی مسلمان اور نصف ہندو تھی۔ ہمارے گاؤں کے کسی ہندو نے ہم پر حملہ نہیں کیا تھا اور نہ ہم نے ایسی کوئی کارروائی کی۔ جب ہم روانہ ہوئے تو ملحقہ گاؤں کے سکھ چرن سنگھ اور دلیپ سنگھ بارڈر تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ اگر وہ ہماری مدد نہ کرتے تو حالات مختلف ہوتے۔ ہم کشمیر کی طرف چلے گئے پھر دریا پار کر کے شکر گڑھ تحصیل میں داخل ہوگئے۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھے۔ والدین پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے چنانچہ میں، میرے چار بھائی اور دادی پاکستان آ گئے۔

''اس کے بعد میں لاہور آ گیا اور گاؤں میں رہ جانے والی جائیداد کا کلیم تیار کیا لیکن حکومت پاکستان نے ہماری کوئی مدد نہ کی۔ ہمارے گاؤں کے ہندو اچھے لوگ تھے۔ مکھن پورہ میں ہمارے گھر کے ساتھ ایک برہمن بوا دتہ رہتا تھا۔ وہ ایک ساہوکار تھا اور بہت کم سود وصول کرتا تھا۔ ایک روز میں آنکھیں متورم ہونے کی وجہ سے رو رہا تھا کہ وہ آیا اور میری آنکھوں میں کوئی دوائی ڈال دی۔ میں جلد ٹھیک ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ ' کبھی جھوٹ نہ بولو' لہٰذا میں سب کچھ سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ (ہندو) لوگ بہت اچھے تھے، ہم وہاں خود کو محفوظ محسوس کرتے تھے۔ ہم اس مٹی کا حصہ تھے۔ میں ہمیشہ واپس جانے کی خواہش رکھتا رہا۔ میں نے پاکستان میں جرائم پیشہ عناصر کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ آج میرے دو بیٹے وکیل ہیں۔ ہم نے مشکلات کے باوجود اچھی زندگی گزارنے میں کامیابی حاصل کی لیکن ہمارے سادہ سے گاؤں میں زندگی زیادہ بہتر تھی۔''

مارچ 2004 میں بٹالہ کا ہمارا دورہ کافی مفید ثابت ہوا کیونکہ ہماری 1947 کے واقعات کے بعض عینی شاہدین سے ملاقاتیں ہوئیں۔

اندرجیت

''میری پیدائش بٹالہ میں ہوئی۔ وہاں سکھ اور مسلمان مکمل امن اور شانتی کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم مذہبی تہواروں کے موقع پر مٹھائیوں کے تبادلے کرتے تھے۔ ہندو مسلمانوں سے کھانے کے تحفے کے طور پر کچا گوشت (صرف مٹن) وصول کیا کرتے تھے۔ میرے دو بہت قریبی دوست ستار اور یوسف تھے۔ چکری بازار ہندوؤں کا مضبوط گڑھ تھا۔ وسط میں ہندوؤں کے مکانات

تھے جبکہ ارد گرد مسلمانوں کی رہائش گاہیں تھیں۔ ڈھائی روز کے لیے گورداسپور کو پاکستان کا حصہ سمجھا گیا پھر اعلان ہوا کہ تحصیل شکر گڑھ چھوڑ کر باقی ضلع بھارت میں شامل ہو گا۔ ان دنوں بٹالہ میں ایک مسلمان پولیس ایس ایچ او شیخ غلام ربانی تھا۔ کرفیو نافذ کیا جا چکا تھا۔ ایس ایچ او نے میرے بھائی کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس بھیجی کیونکہ مسلمانوں نے درخواست دی تھی کہ انہیں نوجوان ہندوؤں سے جان کا خطرہ تھا۔ سکیورٹی کے لیے بلوچ، سکھ اور گورکھا رجمنٹ کے فوجی شہر میں موجود تھے۔

"بٹالہ بھارت میں شامل ہونے سے پہلے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے ان کے مکانات اور خواتین چھیننے کا منصوبہ بنایا۔ ان میں مسلم لیگ کا مقامی صدر بہاالدین شامل تھا۔ وہ کھلے عام بڑھکیں مارا کرتا تھا۔ وہ بٹالہ کے اچھلی دروازے کا رہنے والا تھا۔ اس طرح کی نفرت انگیز مہم چلانے والا ایک مسلمان حمید ٹیڑھی موچھاں بھی تھا۔ ان ڈھائی ایام میں گاؤں چووال پر حملہ کیا گیا۔ لوٹ مار اور قتل و غارت میں حصہ لینے کے لیے شریف پورہ ضلع امرتسر جیسے دور دراز کے علاقوں سے بھی حملہ آور بٹالہ آئے تھے۔

"تاہم 17 اور 18 اگست کو صورتحال اس وقت اچانک تبدیل ہو گئی جب ہم نے سنا کہ بٹالہ بھارت میں شامل کر دیا گیا ہے۔ بہاالدین کا سر قلم کر دیا گیا جبکہ حمید خواتین والا برقعہ پہن کر فرار ہو گیا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں سے بھری بس نذر آتش کر دی۔ بس میں ایندھن ختم ہو گیا تھا۔ ڈی ایس پی سپورن سنگھ نے تمام ہندوؤں کو بچا لیا۔ میں خود بھی چھرا پکڑ کر کسی مسلمان کو ذبح کرنے نکلا لیکن مجھے کوئی ہاتھ نہ آیا۔ میرے پاس بڑا چھرا تھا لیکن ہمارے فوجیوں نے رشوت لے کر مسلمانوں کی 7 بسوں کو زندہ سلامت جانے دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کو 24 گھنٹے کے لیے بیرنگ روڈ کے مہاجر کیمپ میں رکھا گیا۔ وہاں فائرنگ بھی شروع ہو گئی۔ مجھے یاد ہے کہ فوجی خون آلود زیورات ہماری دکان پر بیچنے آیا کرتے تھے۔ میرے والد زرگر تھے۔ بٹالہ اور گورداس پور میں ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ قتل عام میں ڈوگرہ فوج ملوث تھی۔

"تقسیم کے چھ یا سات ماہ بعد لاہور میں ایک کرکٹ میچ تھا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کیونکہ ایسے کئی مقابلے ہوا کرتے تھے۔ ہم میں سے کئی نوجوان پاکستان گئے۔ میری ملاقات اپنے دوست یوسف سے ہوئی جو میرے ساتھ نہایت مہمان نوازی سے پیش آیا۔ ہم لاہور کے کی گیٹ کے علاقے میں ٹھہرے تھے۔"

انٹرویوز

سید ضیا محی الدین، سٹاک ہوم، 24 جون 2002

چودھری محمد بشیر، لاہور، 10 اپریل 2003

حاجی محمد اکرم، لاہور، 23 اپریل 2003

گرچرن داس سنگھ اروڑہ، امرتسر، 24 مارچ 2004

سردار کندن سنگھ سمرا، 27 مارچ 2004

ایاز خان، لنکوپنگ، سویڈن (بذریعہ ای میل)، 14 جنوری 2007

References

Ali, Chaudhri Muhammad, *The Emergence of Pakistan,* Lahore; Research Society of Pakistan, (1973).

Iftikhar, Khawaja, *Jabb Amritsar Jall Reha Thaa* (*When Amritsar was Burning*). Lahore: Khawaja Publishers, (1991).

Said, Chaudhri Mohammad, *'A Brief Account of the Happenings in Amritsar'* by Ch. Mohammad Said M.A., L.L.B., ex-Terminal Tax Superintendent, Municipal Committee, Amritsar, Present Address:- 3/30, Nisbet Road, Lahore, *'The Journey to Pakistan: A Documentation on Refugees of 1947,'* Islamabad: National Documentation Centre.

Shahnawaz, Begum Jahanara, *Father and Daughter: A Political Biography,* Karachi: Oxford University Press, (2002).

18

جالندھر ڈویژن

جالندھر ڈویژن وسطی پنجاب کے کانگڑہ، جالندھر، لدھیانہ اور فیروز پور کے اضلاع پر مشتمل تھی۔ یہاں مسلمان نمایاں تعداد میں اقلیت تھے۔ 1947 میں یہاں مسلمانوں کی مجموعی آبادی 34 فیصد تھی۔ ان چاروں اضلاع میں مجموعی طور پر کسی میں مسلمان اکثریت میں نہیں تھے۔ البتہ کئی شہروں میں مسلمان اکثریت میں ضرور تھے۔ 3 جون 1947 کی 'منطقی تقسیم' کے تحت جالندھر ڈویژن مشرقی پنجاب کا حصہ تھی اور ریڈ کلف ایوارڈ میں بھی اسے کسی تبدیلی کے بغیر بھارت میں شامل کر دیا گیا۔

فیروز پور

ضلع امرتسر کے جنوب میں جالندھر ڈویژن واقع تھی جس کے ضلع فیروز پور کی سرحدیں ضلع لاہور سے نہیں ملتی تھیں بلکہ درمیان میں دریائے ستلج تھا۔ ضلع فیروز پور میں مسلمانوں کی آبادی 45 فیصد تھی۔ اس ضلع کی دو تحصیلوں زیرہ اور فیروز پور کے بارے میں ایک تلخ تنازعہ پایا جاتا تھا۔ (کل پانچ تحصیلیں تھیں)۔ یہ دونوں تحصیلیں پہلے پاکستان میں شامل کی گئیں پھر ماؤنٹ بیٹن کے دباؤ پر بھارت کے سپرد کر دی گئیں۔ اس کے نتیجے میں فیروز پور میں فوجی اسلحہ ڈپو بھی بھارت کو مل گیا (Roberts, 1995: 94)۔

فیروز پور شہر

فیروز پور شہر بشمول کینٹ کے علاقے میں مسلمانوں کی آبادی 47 فیصد کے لگ بھگ تھی۔ یہاں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے حامی موجود تھے۔ اگست 1947 سے پہلے یہاں تشدد کے چند نہایت سنگین واقعات رونما ہوئے۔

ملک محمد اسلم

''17 اگست کو جب ریڈیو پر اعلان ہوا کہ فیروز پور ضلع بھارت میں شامل کیا جا چکا تھا تو وہاں کے مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچا۔ مسلمانوں کو اس کی امید نہیں تھی۔ مسلم لیگ پنجاب کے مرکزی رہنما نواب ممدوٹ گاہے بگاہے فیروز پور آتے جاتے تھے لیکن انہوں نے یا ان کے ساتھیوں نے کبھی یہ اشارہ نہیں کیا تھا کہ فیروز پور پاکستان سے الگ رکھا جائے گا۔ ان دنوں میں بسلسلہ تعلیم لاہور میں مقیم تھا۔ وہاں میرے ایک ماموں نسبت روڈ کی بغلی گلی میں مقیم تھے۔ ہمارے ہندوؤں کے ساتھ فیروز پور میں اچھے تعلقات تھے۔ 17 اگست کی دوپہر کو ان ہندوؤں میں سے ایک لالہ دونی چند

میرے والد کے پاس آئے اور خبردار کیا کہ انہیں اطلاع ملی تھی کہ سکھ اور آر ایس ایس کے مسلح افراد مسلمانوں پر حملے کی تیاری کر رہے تھے۔

''یہ سن کر فیروزپور میں ہی قیام رکھنے کے ہمارے خواب بکھر کر رہ گئے۔ در حقیقت میرے والد مہاتما گاندھی کے زبردست حامی تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور کانگریس پارٹی میں ان کے کئی دوست تھے۔ وہ اس وقت تک گومگو کی کیفیت میں رہے جب تک کہ اس شام سورج غروب ہونے کے بعد گھڑ سوار مسلح سکھ آئے اور مسلمانوں پر فائرنگ نہ کر دی۔ اس سے خوف وہراس پھیل گیا۔ خوش قسمتی سے میرے نانا، نانی ان دنوں پہلے ہی لاہور میں میرے ماموں کے گھر تھے۔ یوں گھر میں صرف میرے والدین، میری تین بہنیں اور میں ہی پیچھے رہ گئے تھے۔ ہمارے اردگرد رہنے والے مسلمان روتے ہوئے میرے والد کے پاس آئے چونکہ میرے والد تعلیم یافتہ تھے اس لیے وہ لوگ چاہتے تھے کہ میرے والد ان کی رہنمائی کریں۔

''رات 10 بجے کے قریب ایک اور حملہ ہوا۔ کچھ اور لوگ روتے ہوئے ہمارے گھر آئے اور بتایا کہ آر ایس ایس مسلمانوں پر حملے کر رہی تھی۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ سب مسلمان ایک ایک نشانہ بننے کی بجائے جامع مسجد میں جمع ہو جائیں۔ مسجد میں پہلے کبھی خواتین داخل نہیں ہوئی تھیں اور وہاں ان کے لیے کوئی الگ جگہ بھی نہیں تھی۔ پناہ لینے والوں کی مجموعی تعداد 300 تھی۔ جامع مسجد پولیس سٹیشن کے قریب تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ پولیس اپنے تھانے کے قریب کسی کو حملہ کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ میرے والد اور بعض دیگر عمائدین سید صفدر حسین شاہ، پیر فضل حق اور میاں امجد حسن پولیس سٹیشن گئے اور تھانہ انچارج کے ساتھ ملے۔ وہ ایک ہندو تھا جس کا تعلق سرسا کے علاقے سے تھا اور وہ یہاں مارچ میں تعینات ہوا تھا۔ کچھ مسلمان پولیس اہلکار بھی تھے۔ ایس ایچ او نے انہیں بتایا کہ وہ چند پولیس اہلکار مسجد کے باہر تعینات کر دیتا ہے لیکن اس کا مشورہ تھا کہ مسلمان اگلے روز صبح سویرے یہاں سے نکل جائیں کیونکہ وہ یہ ضمانت نہیں دے سکتا کہ اگلے روز کیا ہو گا۔

''وہ رات لگتا تھا کبھی ختم نہیں ہو گی۔ ہر طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم نے مردوں، عورتوں حتیٰ کہ بچوں کی درد اور خوف سے چیخنے کی آوازیں سنیں۔ ہمارے پاس ڈنڈوں کے سوا شاید ہی کوئی ہتھیار ہو گا۔ کچھ لوگ چاقو بھی لے آئے تھے۔ ایک ہاکی کے کھلاڑی نے ہاکی پکڑ رکھی تھی۔ اگرچہ ہم آسان ہدف تھے لیکن سکھوں کے جتھے اور آر ایس ایس کی ٹولیاں مسجد سے دور رہیں۔ یقیناً ایس ایچ او جس کا نام شاید تری لوک ناتھ تھا نے انہیں خبردار کیا تھا کہ وہ حملے سے باز رہیں۔

''رات کے 3 بجے لالہ دونی چند کا بیٹا امرناتھ مسجد آیا تا کہ دیکھ سکے کہ حالات ٹھیک تھے یا نہیں۔ اگرچہ کرفیو نافذ تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح مسجد پہنچ ہی گیا۔ میرے والد ذیابیطس کے مریض تھے۔ وہ یا تو انسولین لانا بھول گئے یا پھر انہوں نے لاپرواہی کی۔ اب رات گئے ان کی طبیعت انتہائی خراب ہو گئی۔ میری والدہ اور بہنیں رونے لگیں۔ دیگر افراد نے بھی ہمدردی کا اظہار کیا لیکن اہم بات تو انسولین حاصل کرنا تھی۔ لالہ جی کی شہر میں دوائیوں کی دکان تھی چنانچہ امرناتھ نے پیشکش کی کہ وہ دکان پر جا کر انسولین لے آتا ہے۔ وہ بے چارہ کبھی واپس نہ آیا۔ بعد ازاں ہم نے سنا کہ اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ آر ایس ایس والے مسلمانوں کے ہمدرد ہندوؤں کے بھی خلاف تھے۔ اس افسوسناک خبر کی بعد میں قصور اور لاہور میں ملنے والے افراد نے بھی تصدیق کی۔ صبح ہونے تک والد صاحب کی طبیعت انتہائی بگڑ گئی۔ وہ بمشکل بات کر سکتے تھے۔ انہوں نے

کہا کہ ہم انہیں مسجد میں چھوڑ کر خود چلے جائیں لیکن میری والدہ نے اس بات سے اتفاق نہ کیا اور کہا، 'ملک صاحب میں آپ کو چھوڑ کر جانے کی بجائے آپ کے قریب مرنا پسند کروں گی۔' ہم بچوں نے بھی ایسے تاثرات کا اظہار کیا۔ والد صاحب نے بڑی مشکل سے بولتے ہوئے کہا، 'زینت تمہیں اپنی تین بیٹیوں اور بیٹے کا سوچنا چاہیے۔ کم از کم ان کے پاس والدین میں سے ایک تو ہونا چاہیے۔' انہوں نے مجھے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اب تم خاندان کے واحد مرد ہو لہٰذا خاندان کی ذمہ داری سنبھالو۔ خاندان کے دیگر بڑوں نے بھی ہمیں سمجھایا چنانچہ ہم انہیں مسجد میں چھوڑنے پر رضامند ہو گئے۔ میرا خیال ہے بعض دیگر بزرگ بھی مسجد میں پیچھے رہ گئے تھے۔ والد صاحب کی عمر اس وقت صرف 51 سال تھی لیکن شوگر کی بیماری کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔

''مسجد کے باہر دو مسلمان پولیس اہلکار ڈیوٹی پر تعینات تھے لیکن جیسے ہی کارواں چلنے لگا تو وہ بھی ہمارے ہمسفر بن گئے۔ ان کا اسلحہ بھی ان کے پاس تھا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ ہمیں حسین والا۔ گنڈا سنگھ والا روٹ اختیار کر کے قصور پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جیسے ہی ہم فیروزپور کے نواح میں پہنچے تو سکھوں نے ہمیں آن لیا۔ میری والدہ اور بہنیں قافلے کی دیگر خواتین کے ساتھ تھیں جبکہ ہم مرد صورتحال کو کنٹرول کرنے کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ کچھ لوگوں کے پاس سائیکل تھی جبکہ ایک دو لوگ موٹر سائیکل پر بھی سوار تھے۔ باقی سب افراد کو پیدل ہی چلنا تھا۔ بچے رو رہے تھے۔ کچھ بوڑھی خواتین اور مرد تھوڑا چلنے کے بعد آگے جانے کے قابل نہ رہے اور انہوں نے اپنے اپنے کنبوں سے کہا کہ تم لوگ چلے جاؤ۔ یہ ایک روح فرسا منظر تھا۔ کچھ افراد کے پاس اسلحہ بھی تھا لیکن سکھوں کی تعداد بھی زیادہ تھی اور وہ پوری طرح مسلح بھی تھے۔ انہوں نے ہمیں چاروں اطراف سے گھیرے میں لے لیا۔ حملے انتہائی تیز رفتار اور پوری طرح منظم تھے۔ کسی کو نہ چھوڑا گیا۔

''مجھے بھی سر پر چوٹ لگی اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میرے ارد گرد لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ شام ہونے والی تھی اس لیے میرا اندازہ ہے کہ میں وہاں 12 گھنٹے تک بے ہوش رہا۔ میری والدہ، تینوں بہنوں اور ہمارے کئی ہمسایوں کی لاشیں وہاں پڑی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ میں واپس مسجد چلا جاؤں۔ شاید میرے والد اب بھی زندہ ہوں۔ میں اپنے خاندان کو ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ میری عمر صرف انیس سال تھی اور میرے سب رشتہ دار مارے جا چکے تھے۔ کچھ دیر بعد پنجاب باؤنڈری فورس کی جیپ نمودار ہوئی۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ کون لوگ تھے۔ میں بس بت بن کر کھڑا رہا۔ ٹیم کا انچارج ایک انگریز تھا جس نے مجھ پر رحم کھایا اور مجھے قصور تک چھوڑنے گیا۔ پاکستان کی طرف جا کر دیکھا تو ہر طرف ہندوؤں اور سکھوں کو بے رحمی سے قتل کیا جا رہا تھا۔ ہمیں بعض مسیحی رضاکاروں نے طبی امداد فراہم کی۔ یہ رضاکار کیمپوں میں ہزاروں افراد کی مدد کر رہے تھے۔

''آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں 58 سال کے بعد کیا محسوس کرتا ہوں؟ آپ مجھے بتائیں کہ ایسے حالات اگر آپ پر گزرتے تو آپ کیسا محسوس کرتے؟ سینکڑوں شاید ہزاروں افراد محض اس لیے مارے گئے کیونکہ سیاستدان اس بات پر متفق نہیں ہو سکے تھے کہ انتقال اقتدار کس طریقے سے ہو۔ یہ اقتدار کی ہوس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مجھے آج بھی وہ رات یاد ہے جب ایک ہندو امرناتھ نے رضاکارانہ طور پر میڈیکل سٹور جا کر میرے والد کے لیے انسولین لانے کی کوشش کی لیکن اسے

اس کے اپنے ہم مذہب انتہاپسندوں نے مار ڈالا۔ جوان بیٹے کی موت پر اس کے والدین پر کیا بیتی ہو گی۔ میرا سب کچھ تقسیم کے وقت لٹ گیا تھا۔"

فیروزپور کے دیہی علاقے

بیگم شاہنواز

فیروزپور کے دیہی علاقہ جات کے بارے میں واقعات کا ذکر بیگم شاہنواز کی کتاب میں بھی ملتا ہے۔ انہوں نے لکھا:

> صبح سویرے جب ہم ناشتہ کر رہے تھے تو ہم نے کسی کے چیخنے اور رونے کی آوازیں سنیں۔ ملازمین نے ہمیں بتایا کہ ضلع فیروزپور کا انتہائی بااثر زمیندار چودھری شفقت رسول ہمارے گھر آیا تھا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ جب میں اس سے ملی تو وہ صدمے کی ایسی خوفناک کیفیت میں تھا کہ اپنی بپتا سنانے کے بھی قابل نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ جب اس کی شدت میں کمی آئی تو اس نے مجھے فیروزپور ضلع میں ہونے والی داستان خونچکاں سنائی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک طویل راستہ اختیار کر کے بچاتے بچاتے اللہ کے فضل سے لاہور پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کی دو جوان بیٹیوں سمیت اہل خانہ اور دیگر 70 ہزار افراد دو نہروں کے درمیان جزیرے پر محصور تھے اور فرید کوٹ ریاست سے تعلق رکھنے والے سکھ ان کا قتل عام کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی بچیوں کو سکھوں کے ہاتھ لگنے سے مارنا بہتر سمجھے گا۔ ہر طرف سے ایسی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ سکھ بڑی عمر کے افراد کو ہلاک کر دیتے تھے جبکہ نوجوان خواتین کو اغوا کر لیا جاتا تھا۔ وہ صرف اپنے خاندان کی عزت کی حفاظت کے لیے دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور منتیں کر رہا تھا۔
>
> پورے دو روز تک میں ان لوگوں کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہی لیکن مجھے کوئی کامیابی نہ مل سکی۔ شفقت رسول دکھ اور صدمے سے پاگل ہو رہا تھا۔ تیسرے روز میں نے باؤنڈری فورس کے سیکنڈ ان کمانڈ بریگیڈیئر محمد ایوب (بعد ازاں صدر پاکستان) سے مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے انہیں فون کیا تو وہ ہمارے گھر آ گئے جس پر چودھری شفقت رسول نے انہیں تمام واقعات سنا دیئے۔ ایوب خان نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور کہا کہ وہ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ شفقت رسول کو مسلح فوجیوں کے ساتھ وہاں بھیج دیں۔ پھر انہوں نے فیروزپور میں پی بی ایف کے انچارج کو فون کیا۔ جب انہوں نے مجھے اس انچارج کا نام بتایا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ میں اسے بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ اسی شام شفقت رسول کو مسلح دستے کے ساتھ فیروزپور بھجوا دیا گیا۔ میرا فیروزپور کے انچارج بریگیڈیئر کے نام خط بھی اس کے پاس تھا۔ فوج کا یہ یونٹ ٹھیک اس لمحے فیروزپور پہنچا جبکہ سکھوں نے حملہ شروع ہی کیا تھا۔ اس طرح تمام محصور بے گناہ مسلمانوں کی جان بچالی گئی (2002:211-12)۔

جالندھر

ضلع جالندھر میں مسلمان 45 فیصد کے تناسب سے بہت بڑی اقلیت میں تھے۔ یہ مسلم لیگ کا مضبوط گڑھ تھا لیکن کانگریس اور آر ایس ایس کے بھی کافی زیادہ حامی تھے۔

جالندھر شہر

جالندھر شہر اور کنٹونمنٹ میں مسلمان 59 فیصد اکثریت میں تھے۔ یہاں مسلم لیگ کی حمایت کافی زیادہ تھی۔ البتہ کانگریس اور آر ایس ایس کے حامی بھی بڑی تعداد میں تھے۔ تاہم سکھوں کا کوئی نمایاں گروپ یہاں نہیں تھا۔

میاں جلال دین

''جالندھر کو پاکستان میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ یہاں مسلمانوں کی واضح برتری تھی جو مختلف تحصیلوں کے ذریعے لاہور سے منسلک تھی۔ ریڈکلف پر ماؤنٹ بیٹن نے دباؤ ڈالا تھا کہ جالندھر پر مسلمانوں کے دعوؤں کو تسلیم نہ کیا جائے۔ ہم نظریہ پاکستان پر زبردست یقین رکھتے تھے کیونکہ ہم اسلام پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ میرا خاندان ممتاز اہمیت کا حامل تھا۔ میرے دادا ایک امیر زمیندار تھے اور انہوں نے شہر میں کئی مکانات تعمیر کرائے تھے۔ یہ سچ ہے کہ جالندھر کے ہندو نہایت اچھے لوگ تھے لیکن انتہاپسند تنظیم آر ایس ایس کا یہاں کافی اثر و رسوخ تھا۔ آر ایس ایس اور مسلم لیگ نیشنل گارڈز میں اکثر و بیشتر کشیدگی پیدا ہوتی رہتی تھی۔ ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان پر جالندھر میں کافی تناؤ پیدا ہوا۔ کچھ عرصے تک ہمارے بڑوں نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں رہیں گے لیکن اس دوران مغربی پاکستان میں مسلمانوں کے ظلم و ستم کی داستانوں کے ساتھ بڑی تعداد میں ہندو اور سکھ شہر میں آنا شروع ہو گئے جس سے سکھ جتھے اور آر ایس ایس والے دہشت گردی پھیلانے میں متحرک ہو گئے۔ اس کے باوجود مسلمان سمجھتے تھے کہ وہ صورتحال سے نمٹ سکتے تھے۔ البتہ ہندو ڈپٹی کمشنر کافی متعصب انسان تھا۔ وہ حال ہی میں گوجرانوالہ سے تبدیل ہو کر جالندھر میں لگا تھا جہاں یقیناً اس نے اپنے ہم مذہب افراد کے خلاف مسلمانوں کے مظالم دیکھے ہوں گے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف مظالم میں اضافہ ہوتا گیا بلکہ میں کہوں گا کہ ہر گھنٹے کے ساتھ جبر بڑھتا گیا۔ جرائم پیشہ عناصر ہر قسم کا اسلحہ استعمال کر رہے تھے۔ میرا راسخ یقین ہے کہ یہ لوگ کپورتھلہ ریاست سے گھوڑوں اور گاڑیوں پر سوار ہو کر جالندھر آئے تھے۔ انہوں نے فائرنگ کرنا اور عورتوں کو جلانا شروع کر دیا۔ کسی پر رحم نہ کھایا۔

''میرا ایک ہندو دوست اروند شرما تھا۔ وہ برہمن تھے۔ اس کے والد سرکاری ملازم تھے اور دہلی میں تعینات تھے۔ ایک روز وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ اس نے سنا تھا کہ مشرقی پنجاب سے تمام مسلمانوں کو نکال باہر کرنے کا منصوبہ بن چکا تھا چنانچہ آپ کا بھلا اسی میں تھا کہ آپ بھی پاکستان چلے جائیں۔ اکثر لوگ کیمپوں میں منتقل ہو چکے تھے لیکن ہمارا گھرانہ کافی بااثر تھا۔ اس لیے ہم کسی خطرے کے بغیر بعد ازاں اکتوبر میں روانہ ہوئے۔ میرے والد نے تین ٹرکوں کا بندوبست کیا جن پر ہم نے اپنے قریبی رشتہ دار اور ضروری سامان لاد دیا۔ واہگہ بارڈر تک مسلمان سپاہی ہمارے ساتھ تھے۔ راستے میں میں نے ہر طرف لاشیں بکھری دیکھیں۔ مسلمانان ہند کے لیے واحد حل پاکستان کا قیام تھا۔ کبھی کبھار میں جالندھر کے بارے

میں سوچتا ہوں۔ ہم نے جالندھر سے ہجرت کر کے یہاں آنے والے خاندانوں سے رابطے برقرار رکھے۔ ان کے درمیان شادی بیاہ بھی ہوئے لیکن نئی نسل کے دل میں جالندھر کے لیے کوئی محسوسات نہیں۔ 1960 کے عشرے میں مجھے ایک بار جالندھر جانا پڑا۔ پرانی عمارتیں اب بھی تھیں۔ حافظ آباد سے آنے والے ہندو کھتری خاندان کو ہمارا گھر الاٹ کیا گیا تھا۔ انہوں نے نہایت مہربانی کا مظاہرہ کیا اور مجھے گھر میں میرا کمرہ دیکھنے دیا جہاں میں پڑھتا تھا اور سوتا تھا۔ انہوں نے مجھے چائے بھی پلائی اور ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ان کی کہانی بھی ہماری کہانیوں جیسی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ پرانی عمارتیں اب بھی ویسی ہیں لیکن جالندھر پہلے جیسا نہیں رہا۔"

محمد ایوب خان

محمد ایوب خان کی کتاب میں سے جالندھر کے کچھ واقعات اس باب میں پہلے پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہاں 'تحریک پاکستان اور جالندھر' میں سے 15 اگست کے بعد کے چند اہم واقعات پیش کیے جا رہے ہیں۔

> اوائل ستمبر میں (غالباً 15 اگست کے فوراً بعد) آل انڈیا کانگریس نے جالندھر کی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے اپنے پارٹی صدر ڈاکٹر ذاکر حسین (بعد میں بھارت کے صدر بن گئے) کو بھیجا۔ (مصنف کا نوٹ: ڈاکٹر ذاکر حسین ان دنوں کانگریس کے صدر نہیں تھے بلکہ کانگریس نواز تعلیمی ادارے جامعہ ملیہ میں پروفیسر تھے) جب یہ خبر پھیلی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین آ رہے ہیں تو شہر کے نواحی علاقوں میں خوف کی حالت میں مقیم مسلمان بڑی تعداد میں اہل خانہ سمیت شہر میں آنا شروع ہو گئے۔ انہیں امید تھی کہ اب ان کی زندگی کو لاحق خطرات کی صورتحال میں بہتری آئے گی۔ لیکن یہ لوگ اس طرح سکھ جتھوں کا آسان شکار بن گئے۔ مجسٹریٹ خان طارق اسماعیل خان اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ کرنال سے جالندھر آئے تھے چونکہ ان کا رنگ روپ گوروں جیسا تھا اور وضع قطع بھی غیر ملکیوں جیسی تھی اس لیے وہ سکھوں کو غچہ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ جالندھر سٹیشن کا پلیٹ فارم لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ انتظار گاہ میں سات آٹھ ہزار مسلمان پناہ لیے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مسلمانوں کے لباس میں تھے اس لیے بعض افراد نے ان پر بھی حملے کی کوشش کی لیکن کانگریس کے کارکنوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال کر حملے کی کوشش ناکام بنادی۔ جب خان اسماعیل کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین جالندھر سٹیشن پر تھے تو وہ خود چند دیگر مسلمان عمائدین کے ساتھ وہاں گئے اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو انتظار گاہ میں پناہ گزین مسلمانوں کی حالت زار کے بارے میں بتایا اور مداخلت کی درخواست کی۔ ڈاکٹر ذاکر نے کانگریس کے کارکنوں اور وہاں موجود حکومتی افسروں پر زور دیا کہ وہ ان مسلمانوں کی پناہ گزین کیمپ تک رسائی میں مدد کریں ورنہ وہ (ڈاکٹر ذاکر) بطور احتجاج دھرنا دیں گے۔ اس بات سے کانگریس کے ورکروں کا رویہ تبدیل ہو گیا اور انہوں نے ٹرکوں کا بندوبست کر کے مسلمانوں کو پناہ گزین کیمپ تک پہنچایا (2002:271-3)۔
>
> 24 ستمبر (24 اگست یا پہلے) کو وزیراعظم جواہر لال نہرو نے جالندھر کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ لدھیانہ کے مجلس احرار کے قوم پرست مولوی بھی تھے۔ (ان میں سے ایک مولانا حبیب الرحمان تھا۔ اس کا پتہ مجھے لدھیانہ میں ان کے پوتے جو ایک

جامع مسجد کے خطیب تھے کا انٹرویو کرتے ہوئے لگا) اس موقع پر کمپنی باغ میں جلسہ عام ہوا جس میں لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ مسلمانوں کی طرف سے مسلم لیگی ورکر شمس الحق شہید نے خطاب کیا اور سکھوں اور ہندوؤں کے مظالم کی تفصیل بتائی۔ نہرو نے اپنی تقریر میں کہا کہ ایسی حرکتیں مہذب اور شائستہ لوگ نہیں کر سکتے۔ یہ جرائم پیشہ لوگوں اور غنڈوں کی کارستانیاں ہیں۔ پھر ایک سکھ کمیونسٹ لیڈر نے کہا، "چاہے یہ جرائم پیشہ عناصر ہیں یا غنڈے، یہ سب آپ کے ارد گرد ہیں۔" یہ سن کر نہرو بولے "میں یہاں امن اور بھائی چارے کے فروغ کے لیے آیا ہوں۔ جو لوگ حالات کے باعث گھر چھوڑ کر گئے ہیں، میں انہیں واپس لاؤں گا۔" پھر انہوں نے ہندوؤں، سکھوں اور انتظامیہ کے افسروں کو سختی سے کہا کہ وہ امن و امان بحال کرائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں پر حملوں کی شدت میں نمایاں کمی آگئی (Ibid: 273)۔

پنڈت نہرو کے دورے کے ایک ہفتے بعد مرکزی وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل جالندھر آئے۔ عوام سے ملاقات کرنے کی بجائے انہوں نے خود کو انتظامی افسروں اور کانگریس کے ورکروں سے رابطوں تک محدود رکھا۔ اس دورے کا مقصد کیا تھا؟ یہ خفیہ رکھا گیا لیکن جیسے ہی وہ واپس گئے تو مسلمانوں پر حملوں میں تیزی آگئی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سردار پٹیل کے دورے کا مقصد نہرو کے دورے کے مقاصد کو ناکام بنانا تھا۔ ان کی رخصتی کے بعد کرفیو لگا دیا گیا۔ در حقیقت کرفیو صرف مسلمانوں کی نقل و حرکت پر تھا جبکہ سکھ اور ہندو بلا روک ٹوک آتے جاتے تھے۔ ان کی تلواریں اور کرپانیں ساتھ تھیں۔ ڈیوٹی پر موجود فرض شناس گورکھا فوجیوں کو اس لیے ہٹا لیا گیا تھا کیونکہ وہ سکھوں اور ہندوؤں کو حملوں سے روک رہے تھے۔ ان کی جگہ ڈوگرہ فوجی تعینات کر دیے گئے جو نہایت متعصب تھے۔ انہوں نے جالندھر کے ممتاز مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا (2002: 273-4)۔

جہاں تک کتاب کے اس اقتباس کا تعلق ہے تو اس میں درج تاریخیں درست نہیں تاہم واقعات کی تصدیق دیگر ذرائع سے ہوتی ہے۔ کتاب میں مسلمانوں کے علاقوں میں ڈوگرہ فوجیوں اور ہندوؤں سکھوں کے گٹھ جوڑ سے بعض ممتاز مسلمانوں کے قتل کی تفصیل دی گئی ہے۔ البتہ بعض روایتیں کمزور ہیں۔ مثلاً یہ کہ "زخمی مسلمانوں کا ہسپتال میں مناسب علاج نہ کیا گیا بلکہ بعض کو پھانسی دے دی گئی" (Ibid: 275)۔

ایوب خان لکھتے ہیں کہ مسلم لیگ کے لیڈروں اور کارکنوں نے زیادتیوں کے خلاف مزاحمت جاری رکھی۔ انہیں ہندوؤں اور سکھوں کے عزائم کی تین مسلمان انٹیلی جنس رپورٹ دے دیتے تھے۔ ان میں ایک مسلمان عبدالغنی تھا جو ایک ہندو کی ملکیت پرنٹنگ پریس میں کام کرتا تھا۔ وہ ہندی اور گورمکھی زبان پڑھ سکتا تھا، اس لیے وہ ان زبانوں میں بھیجے گئے پیغامات پڑھ لیا کرتا تھا۔ دوسرا مسلمان حوالدار عبدالحمید تھا جو سی آئی ڈی برانچ میں تعینات تھا۔ تیسرے مسلمان کا نام اے ایس آئی شیخ عبدالرحیم تھا۔ البتہ ایک بدنام مسلمان جس نے ہندوؤں اور سکھوں کا ساتھ دیا وہ خوشی محمد تھا۔ وہ بھی پولیس میں اے ایس آئی تھا۔ وہ اپنے غیر مسلم افسروں کو خوش کرنے کے لیے مسلم لیگ کے لیڈروں کے گھروں پر چھاپے مارا کرتا تھا۔ ان واقعات میں جیل توڑنے کا بھی واقعہ درج ہے۔ قیدیوں نے جیل عملے کو قابو کر لیا تھا۔ بعض فرار ہو گئے جبکہ کچھ تصادم میں مارے گئے (Ibid: 317-20)۔

جب نور پور مہاجر کیمپ پر حملہ کیا گیا تو غیر مسلموں کے ہتھے چڑھنے کی بجائے 150 مسلمان لڑکیوں نے کنویں میں کود کر خود کشی کر لی۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے کارکنوں اور ہندو۔ سکھ حملہ آوروں کے درمیان جالندھر کے دیہات میں تصادم کے باعث 60 سے 70 ہزار مسلمان مرنے کی اطلاعات کتاب میں دی گئی ہیں جبکہ 10 سے 12 ہزار ہندو ہلاک ہوئے۔ ایوب خان نے کتاب میں یہ بھی لکھا کہ "کیمپ میں پناہ گزین 700 سے 800 خواتین نے اس لیے دریائے ستلج میں کود کر جان دے دی کیونکہ کیمپ کی حفاظت کا مناسب بندوبست نہیں تھا اور ان کے مرد ہندو، سکھ جتھوں سے برسرپیکار تھے" (Ibid: 320-25)۔

کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کی رپورٹ

کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کی 21 ستمبر 1947 کو تیار کردہ ایک تفصیلی رپورٹ میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر حملوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جالندھر شہر سے 24 اگست 1947 کی ایک رپورٹ میں جواہر لال نہرو کے جالندھر شہر کے دو دوروں کا ذکر ہے۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ دونوں دورے 25 اگست سے پہلے کے تھے اور یہ بات بالکل درست ہے۔ محمد ایوب خان اپنی کتاب میں دعویٰ کرتے ہیں پی بی ایف میں پاکستان کی نمائندگی کرنے والے کرنل ایوب خان نے نہرو کے بعد جالندھر کا دورہ کیا تھا۔ انگریز میجر جنرل ریس کی کمان میں پاکستانی اور بھارتی فوجیوں پر مشتمل پنجاب باؤنڈری فورس یکم ستمبر کو تحلیل کر دی گئی تھی تاہم دونوں ملکوں کی افواج مہاجرین کی نقل مکانی میں بہت بعد تک بھی ایک دوسرے سے تعاون کرتی رہیں۔ کیمونسٹ پارٹی کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ جالندھر کے مسلمانوں کو یقین تھا کہ جالندھر ڈویژن پاکستان میں شامل ہو گی چنانچہ انھوں نے نقل مکانی کی تو کوئی تیاری نہیں کی، البتہ فسادات کے لیے بہر حال تیار ہو گئے۔ دوسری طرف آر ایس ایس اور کئی مجسٹریٹوں نے مسلمانوں پر حملوں کی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کی تھی۔ 17 اگست کو اس منصوبے کا آغاز جالندھر شہر سے کیا گیا۔ درحقیقت راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) نے 15 اگست کو ہی یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ لاہور میں مسلمانوں نے ہندوؤں کی تمام آبادیوں اور کاروبار کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ویسٹھ نے لاہور سے آنے والے سرکاری افسروں کی طرف سے فرضی واقعات بھی گھڑ گھڑ کر سنائے۔ سیالکوٹ اور گوجرانوالہ میں ہندوؤں اور سکھوں پر مظالم کی کہانیاں بھی پھیلائی گئیں۔ ایسی تصاویر بھی دکھائی گئیں جن میں مسلم لیگ کے جھنڈے کے قریب ہندو عورتوں سے اجتماعی زیادتی کی جا رہی تھی۔ بم حملوں کا الزام بھی مسلمانوں پر دھر دیا گیا چاہے مرنے والے یا زخمی مسلمان ہی کیوں نہ تھے۔ ایک اور فوٹو میں ڈیرہ اسماعیل خان یا ڈیرہ غازی خان میں ایک برہنہ ہندو عورت کو گھماتے دکھایا گیا (1993: 170-71)۔ حتیٰ کہ ممتاز اور مہذب ہندوؤں نے بھی ایسے پراپیگنڈے میں حصہ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے خلاف غم و غصے کی فضا پیدا ہو گئی۔ یوں 17 اگست سے بعد تک مسلمانوں کے گھر منظم طریقے سے جلائے گئے۔ کچھ خواتین بشمول خاتون لیڈر شمیم کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ لوٹ مار، قتل و غارت کے واقعات کھلے عام ہوئے۔ رائفلیں، سٹین گنیں اور دیگر ہتھیار آزادانہ طور پر استعمال کیے گئے۔ پنجاب ریلیف ورکرز کے بہروپ میں ریلوے سٹیشن کا کنٹرول آر ایس ایس اور سکھ کارکنوں کے حوالے کر دیا گیا۔ قابل احترام کانگریسی لیڈر ڈاکٹر ذاکر حسین کو نہایت مشکل سے بچایا گیا۔ نہرو کے دورے

کے بعد جالندھر میں مسلمانوں کا مہاجر کیمپ قائم کیا گیا۔ کچھ دیگر مسلمان شہر کے نواح میں پٹھانوں کی آبادیوں یا ایسی دیگر جگہوں پر چلے گئے جہاں مسلمان جمع تھے۔ مہاجر مسلمانوں جو مسلح تھے نے بجلی گھر اور دیگر تنصیبات کو نشانہ بنایا۔ 24 اگست 1947 تک ایک تہائی آبادی اب بھی شہر میں اپنے گھروں یا دیگر بستیوں میں تھی۔

رپورٹ ہمیں بتاتی ہے کہ نہرو نے دوبارہ جالندھر کا دورہ کیا تو اس کے بعد حالات میں بہتری آنا شروع ہوگئی۔ البتہ قریبی دیہات میں صورتحال بدستور کشیدہ رہی اور خوفناک مظالم کا مظاہرہ کیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کی رپورٹ کے مطابق ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (بھلہ) نے کھلے عام ہمیں بتایا کہ وہ مسلمانوں کی بستیاں جلانے کے منصوبے سے آگاہ تھا اور یہ کہ اگر وزیراعظم نہرو جالندھر میں نہ آتے تو مسلمانوں کے سب سے بڑے محلے کرار خم کو 22 اگست کو آگ لگائی جانی تھی جبکہ اس کے بعد دیگر آبادیوں کی باری آتی (Ibid: 172)۔

30 اگست 1947 کے ایک اور مراسلے میں جالندھر کے دیہی مقامات پر مسلمانوں کے خلاف حملوں کے بارے میں تفصیلی اعداد و شمار دیے گئے ہیں۔ 15 اگست کو مسلمانوں نے یوم آزادی کے جشن کی تقریبات میں حصہ لیا لیکن اکالی پراپیگنڈے سے جو فضا زہر آلود ہو چکی تھی اس میں بہتری نہ آئی۔ 15 اگست کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر میدھا (جس کے بیٹے کو گوجرانوالہ میں چھرا گھونپا گیا تھا) نے شرپسندوں کو کھلی چھٹی دے دی کہ وہ تین روز تک جو چاہیں کر لیں۔ مبینہ طور پر اس نے لوگوں سے کہا کہ "وہ اس کے بیٹے پر حملے کا بدلہ جی بھر کر لیں۔" پولیس اور فوج کے اہلکاروں نے اسلحہ تقسیم کیا اور لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ میں شریک رہے۔ ضلعی کانگریس کمیٹی کے صدر دربارہ سنگھ نے مال غنیمت میں سے بھاری حصہ وصول کیا (Ibid: 174-5)۔

ایسے مربوط تشدد جس میں سرکاری عمال، سویلین افراد، فوجی، آر ایس ایس، اکالی اور کانگریسی ورکروں نے حصہ لیا کو دیکھنے کے بعد مسلمان اس بات کے قائل ہو گئے کہ بھارتی حکومت مسلمانوں کا تحفظ نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی میں ایک اکالی لیڈر سنت ہری سنگھ کہن پوری نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے جتھوں کو فرید کوٹ ریاست کے سرکاری دستوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس کی ملیشیا کے 2500 ارکان کو جدید اسلحے سمیت فرید کوٹ ریاست کے مراکز میں تربیت فراہم کی گئی۔ رپورٹ میں لکھا ہے کہ "سنت ہری سنگھ مسلمانوں کے لیے دہشت کی علامت بن گیا۔ اپنے بڑے گروہ کے ساتھ وہ گاؤں گاؤں جاتا۔ وہ متاثرہ گاؤں میں 3 سے 4 ہزار افراد کے اجتماع سے خطاب کرتا تھا۔ اس موقع پر سنت ہری ایک جذباتی تقریر کرتا جس میں سکھ ریاست کی فتح اور مغربی پنجاب میں سکھوں پر مسلمانوں کے تشدد کا ذکر ہوتا اور کہتا کہ "یہ خالصہ کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو مٹا دیں۔ آخر میں وہ کہتا کہ مسلمان مذہب تبدیل کر لیں ورنہ لوٹ مار کر کے ان سب کو قتل کر دو" (Ibid: 175)۔

میجر جنرل (ر) سید وجاہت حسین نے پی بی ایف میں خدمات انجام دی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ 23 اگست کی دوپہر کو بذریعہ ٹرین جالندھر آئے۔ ان کے ساتھ مختلف مذاہب کے سپاہیوں پر مشتمل چھوٹی سی فورس بھی تھی۔ آمد کے فوری بعد یہ لوگ 30 ٹینکوں پر کنٹونمنٹ، مسلمان پٹھان محلوں اور بستیوں کی طرف پیش قدمی کر گئے۔ کئی نامور مسلمان ان علاقوں میں رہتے تھے۔ انہیں بچا کر مہاجر کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا اور پھر یہ لوگ پاکستان چلے گئے (Husain 2010: 58)۔

جالندھر کے دیہی علاقے

محمد عاشق راحیل

29 دسمبر 2004 کو احمد سلیم اور میں نے پنجابی مصنف محمد اسحاق راحیل کا آؤٹ فال روڈ سنت نگر لاہور میں انٹرویو کیا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ:

''میں اپنے ننھیال کے علاقے قصبہ نور محل میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا گاؤں ریاست پٹیالہ کا گاؤں پنڈھور تھا۔ ہم بھٹی راجپوت ہیں۔ میری پرورش جالندھر میں ہوئی کیونکہ پٹیالہ میں ہمارے علاقے میں کوئی سکول نہیں تھا چنانچہ میرے ماموں مجھے یہاں لے آئے تا کہ میں سکول جا سکوں۔ جب تقسیم ہوئی تو میں ساتویں جماعت میں تھا۔ نور محل میں زیادہ ہندو اور مسلمان تھے۔ وہاں کوئی حملہ نہیں ہوا۔ ہمارا پورا خاندان نور محل میں تھا۔ اس کے بعد ہم نکودر مہاجر کیمپ میں منتقل ہو گئے جہاں ہم کئی ماہ تک مقیم رہے۔ پھر اکتوبر کے وسط میں ایک ٹرین آئی اور ہمیں پاکستان پہنچا دیا۔ ہمیں رش کی وجہ سے بوگی کی چھت پر بیٹھ ناپڑا۔ ایک ماہ بعد لاہور میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میں اس وقت بھی نو عمر تھا جبکہ میرا چھوٹا بھائی صرف ایک سال کا تھا۔ اس کے بعد بڑی بہن نے ہمیں پالا۔ میرے والد کو نابھہ اور پٹیالہ ریاست کی سرحد پر قتل کر دیا گیا۔

''میں نے بھارت میں اپنے ایک سکھ کلاس فیلو سے رابطے بر قرار رکھے۔ وہ بعد ازاں کلکتہ چلا گیا جہاں اس کی موت واقع ہو گئی۔ کچھ برس پہلے میں نے نور محل کا دورہ کیا۔ کئی لوگوں کو اب بھی میرے نانا اور ماموؤں کے نام یاد تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ سگے بیٹے جیسا سلوک کیا۔ وہاں سے واپسی ایک جذباتی تجربہ تھا۔ اس کے بارے میں میں نے اپنی کہانیوں میں کافی کچھ لکھا ہے۔''

ڈاکٹر افضل

ڈاکٹر محمد افضل کے ساتھ میرا رابطہ آصف علی شاہ کے توسط سے ہوا جن کا ذکر قبل ازیں میں نے پی بی ایف کے فوجی افسر لیفٹیننٹ جنرل آفتاب احمد خان کے حوالے سے کیا تھا جنہوں نے پہلے پی بی ایف اور بعد ازاں پاکستان اور بھارت کی فوجوں کے مہاجرین کی امداد کے مشترکہ آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ ڈاکٹر افضل نے پنجاب حکومت میں متعدد اہم عہدوں پر کام کیا اور ڈپٹی سیکرٹری لوکل گورنمنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ڈاکٹر افضل نے مجھے اپنی کتاب 'داستان سندھام' ارسال کی تھی جو ان کا آٹو بائیو گراف بھی تھا۔ اس کتاب میں 15 اگست کے بعد مسلمانوں کے قتل عام کی کافی دل فگار تفصیل موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میں جولائی 1938 کو تحصیل وضلع جالندھر کے گاؤں سندھام میں پیدا ہوا۔ 1947 میں یہ گاؤں جالندھر اور ہوشیار پور ضلع کی سرحد پر واقع تھا۔ تمام آبادی آرائیں برادری کے چھوٹے کاشتکاروں پر مشتمل تھی۔ ماضی میں یہ گاؤں کافی بار ملیا میٹ ہوا لیکن پھر آباد ہو گیا۔ بالخصوص انیسویں صدی میں سکھوں کے عروج کا دور اس گاؤں کے مکینوں کے لیے برا ثابت

ہوا۔ 23 جولائی 1947 کو اہل گاؤں معمول کے مطابق کاموں میں مصروف تھے کہ نزدیکی گاؤں 'سوس' کے سکھوں نے حملہ کر دیا۔ اس وقت ایک نوجوان عورت، اس کا بھائی اور بچہ اس علاقے سے گزر رہے تھے کہ انہیں حملہ کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ شیر خوار بچے کو ہوا میں اچھال کر نیچے نیزہ کر دیا گیا۔ نوجوان آدمی نے اپنے دفاع کی کوشش کی لیکن اسے بے رحمی سے ہلاک کر دیا گیا۔ نوجوان خاتون سے پہلے جنسی زیادتی کی گئی پھر اسے مار ڈالا گیا۔ اس واقعے کی تفتیش اے ایس پی رانا محمد حنیف نے کی تو ہمیں اس روح فرسا حرکت کا علم ہوا۔

25 جولائی کو سکھ جتھے نے مسلمان کسان مولوی اللہ بخش کو گاؤں ڈھوبولی کے قریبی کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ہلاک کر دیا۔ گاؤں سندھام سے بھی کچھ افراد پیر شاہ محمد اور چودھری محمد اسماعیل کی قیادت میں ڈھوبولی کے متاثرہ افراد کی مدد کرنے گئے۔ وہاں شدید لڑائی چھڑ گئی۔ سکھوں کے لیڈر کو قتل کر دیا گیا تاہم چودھری اسماعیل کے بھی چھرا لگ گیا۔ انہیں زخمی حالت میں گاؤں شام چوراسی لے جایا گیا اور ہندو ڈاکٹر نے ان کا آپریشن بھی کیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔

(اس کے بعد گاؤں کے مسلمانوں کے قتل کی تفصیلات بتائی گئی ہیں)

26 اگست کو علی الصبح سکھ جتھوں نے سندھام کے جنوب مغرب میں کھیڑا کے مقام پر جمع ہونا شروع کر دیا۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں مزاحمت کرنی چاہیے لیکن سکھ بڑی فصلوں کی آڑ لے کر گاؤں میں گھس آئے اور سندھام کے لوگوں پر حملہ کر دیا۔ حملہ آوروں نے مکانات جلا ڈالے۔۔۔۔ ستمبر کے اوائل میں 15 ہزار مسلمان شام چوراسی کے علاقے میں جمع ہونا شروع ہو گئے اور خود کو اپنے دفاع کے لیے منظم کرنے لگے۔ انہوں نے جالندھر کینٹ میں مہاجر کیمپ میں منتقل کرنے تیاری شروع کر دی۔ مسئلہ یہ تھا کہ شام چوراسی میں ہندوؤں کی موجودگی کے باعث یہ منصوبہ خفیہ رکھنا ممکن نہیں تھا۔ مسلمانوں کے تحفظ کے لیے تعینات ڈوگرہ فوجی شام چوراسی کے ارد گرد سکھ دیہات میں تھے۔ ایسی افواہیں تھیں کہ یہ فوجی بھی سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ حملوں میں حصہ لیں گے۔

13 ستمبر کو سکھ جتھوں نے چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ گاؤں پوری طرح محاصرے میں تھا اور نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چونکہ حملہ سورج طلوع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے کیا گیا تھا اس لیے مسلمان اپنے دفاع کے لیے تیار نہیں تھے۔ پہلے حملوں میں سکھ نیزے، تلواریں اور دیگر پرانا اسلحہ استعمال کرتے آئے تھے لیکن اس روز انہوں نے رائفلیں اور بندوقیں بھی استعمال کیں۔ فوجیوں کی مدد سے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ تقریباً 300 مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

شام چوراسی مڈل سکول کا صرف ایک گیٹ تھا اور صحن مسلمان مہاجرین سے بھرا پڑا تھا۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے ان سب کو ہلاک کر دیا گیا۔ گاؤں کی گلیاں اور کھیت لاشوں سے بھرے تھے۔ سکول سے 200 میٹر کے فیصلے پر ایک مسجد شور گراں تھی۔ مسلمان وہاں نماز فجر ادا کر رہے تھے جبکہ مولوی سلطان علی آف کوٹلی امامت کرا رہے تھے۔ مسجد کا بھی محاصرہ کر کے نمازیوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ خون سے مسجد کا صحن

لال ہو گیا۔ حملے میں میرے دادا چودھری علی بخش اور ان کے بھتیجے چودھری فضل محمد شہید ہو گئے۔ ان کا نام تاریخ اسلام کے ایسے افراد میں شامل ہو گیا جنہیں نماز پڑھتے ہوئے شہید کیا گیا۔۔۔۔

اس کے بعد مجبور و لاچار مہاجرین پر حمیرہ، ڈھلوان اور بیاس ریلوے سٹیشن کے پاس گزرتے ہوئے حملے کیے گئے — بھوکے پیاسے مہاجرین بے رحم سکھوں کے حملوں کے سامنے بے بس تھے کہ اچانک دریائے بیاس کا پانی بھی چڑھ آیا۔ اس وقت رات گہری ہو چکی تھی۔ سیلابی ریلہ آنے پر ارد گرد کے درخت سانپوں سے بھر گئے۔ دوسری طرف سٹیشن پر سکھ ان کے منتظر تھے — یہ بے بس لوگ کہاں جاتے؟ — ہزاروں افراد بیاس میں ڈوب گئے — جو لوگ بچے انہیں ہیضے نے آن لیا۔ بے شمار لوگ قتل بھی ہوئے" (Afzal, n.d: 48-57)۔

ضلع لدھیانہ

ضلع لدھیانہ میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 37 فیصد تھا۔ سکھوں کی آبادی تمام مذاہب سے زیادہ یعنی 42 فیصد تھی۔ سکھوں کی خود مختار ریاستوں کے علاوہ مشرقی پنجاب میں ہونے والے بدترین ہلاکتوں کے واقعات میں سے بیشتر لدھیانہ کے دیہی علاقوں میں ہوئے۔

لدھیانہ شہر

لدھیانہ شہر بشمول کنٹونمنٹ علاقے میں مسلمانوں کی آبادی 63 فیصد کے قریب تھی۔ منطقی سرحد دریائے ستلج سے مزید مشرق اور جنوب میں واقع ہونے کے باوجود لدھیانہ میں اکثریت ہونے کی وجہ سے لوگوں کا خیال تھا کہ لدھیانہ پاکستان میں شامل ہو گا۔ ایس جی پی سی رپورٹ بتاتی ہے کہ مسلم لیگ لدھیانہ میں کافی متحرک تھی۔ اگرچہ تصادم کے کچھ واقعات ہوئے تھے لیکن اگست کے اوائل تک مجموعی صورتحال پرامن ہی رہی۔ ایڈووکیٹ اور گاؤں ورک ضلع لدھیانہ کے سرپنچ موہن لال جھانجی نے ہمیں بتایا کہ فسادات سے پہلے لدھیانہ میں بھائی چارے کی زبردست فضا پائی جاتی تھی۔ دو مشہور مسلمان شعراء ساحر لدھیانوی اور طفیل ہوشیارپوری ان کے قریبی دوست تھے۔ لدھیانہ کے ہی باسی بلدیو ورما نے مجھے بتایا کہ ان کے والد غدر پارٹی کے ممتاز ورکر تھے۔ اس پارٹی کے خلاف انگریزوں نے اٹھارویں صدی میں بغاوت کا مقدمہ چلایا تھا۔ ان کے والد کو 14 سال قید کی سزا سنائی گئی۔ بلدیو ورما نے بھی تصدیق کی کہ لدھیانہ روشن خیال لوگوں کا شہر تھا لیکن 1946 کے انتخابات کے بعد فرقہ وارانہ تعلقات میں تیزی سے کشیدگی آنے لگی۔

سید محمد اسلام شاہ

"بنیادی طور پر ہمارے خاندان کا تعلق شملہ سے تھا لیکن میرے والد لدھیانہ میں کافی عرصہ پہلے آباد ہو گئے تھے۔ وہ ایک حکیم اور خدا خوف انسان تھے اور تمام مریضوں کا محبت اور ہمدردی کے ساتھ علاج کرتے تھے۔ وہ صوفی بھی تھے اور سلسلہ چشتیہ سے بیعت تھے۔ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی... سب ان کے پاس علاج کے لیے آتے تھے جو نہایت سستا ہوتا۔ وہ غریبوں سے کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔

"اگرچہ شہر میں کچھ گڑبڑ ہوئی تھی لیکن تمام مذاہب کے پیروکاروں کا یہ اتفاق رائے تھا کہ امن اور ہم آہنگی برقرار رکھی جائے۔ البتہ اگست میں صورتحال تیزی سے بگڑنے لگی۔ شہر میں ہر طرف مسلمانوں پر حملے ہونے لگے۔ لوگوں کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحد کس جگہ پر کھینچی جائے گی۔ لدھیانہ کے مسلمانوں نے گھربار چھوڑنے اور روانہ ہونے کی کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ عید نہایت نیم دلی کے ساتھ منائی گئی۔ لوگ مساجد اور عیدگاہوں میں عید ملے۔ ایسے اجتماعات سے یہ موقع میسر آیا تھا کہ مسلمان اپنے مستقبل پر مشاورت کریں۔ حملوں کی شدت مسلسل بڑھ رہی تھی۔ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر بااثر افراد کی حویلیوں میں پناہ لینے لگے تھے۔ مشکل وقت میں مسلمان ایک ہو گئے۔ ہر کسی کو دوسرے کی ضرورت تھی۔ چند روز میں مسلمانوں کے محلوں پر حملے شروع کر دیئے گئے۔ انتظامی مشینری متعصب اور مکمل جانبدار ہو چکی تھی۔ وہ کسی کی مدد کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ اگرچہ کچھ ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے تعلق والے مسلمانوں کو پناہ دی تھی لیکن مجموعی طور پر کوئی بھی آر ایس ایس اور سکھ جتھوں سے تصادم نہیں چاہتا تھا جو لدھیانہ میں کافی متحرک تھے۔

"جلد ہی مسلمانوں کا ایک بڑا جلوس پناہ گزین کیمپ کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اچانک سکھوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہ ہم پر حملہ آور ہونے ہی والے تھے کہ ایک سکھ نے میرے والد صاحب کو پہچان لیا۔ میرا خیال ہے کہ سکھ کا نام ملکھا سنگھ تھا۔ اس نے چلا کر کہا کہ ایسے نیک سیرت انسان پر حملہ مت کرو جس نے بلا تفریق مذہب انسانوں کی ہر مشکل وقت میں خدمت کی۔ اس کے الفاظ کا جادوئی اثر ہوا اور سکھوں نے ہمیں جانے دیا اس طرح ہم خوفناک صورتحال سے بچ گئے۔ اللہ نے ہمیں بچایا۔ ملکھا سنگھ ہمارے لیے فرشتہ ثابت ہوا۔ یہ واقعہ ستمبر کے شروع کا تھا۔ البتہ میں یقین سے تاریخ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں ان دنوں محض ایک لڑکا تھا۔"

مولانا حبیب الرحمان ثانوی لدھیانوی

لدھیانہ میں قیام کے دوران مجھے یہ جان کو نہایت حیرت ہوئی جب بلدیو ورما نے مجھے بتایا کہ ممتاز انگریز مخالف احرار عالم دین شاہ عبدالقادر لدھیانوی کا پڑپوتا ان دنوں لدھیانہ کی ایک جامع مسجد کا امام ہے اور نماز جمعہ کے اجتماع میں ہزاروں مسلمان شرکت کرتے ہیں اور رش کے باعث قریبی سڑکوں پر ٹریفک بند ہو جاتی ہے۔ میں اسی روز 4 جنوری 2005 کو مولانا حبیب الرحمان ثانوی لدھیانوی سے ملا۔ انہوں نے مجھے یہ داستان سنائی:

"میرے پڑدادا کے والد شاہ عبدالقادر لدھیانوی پنجاب میں پہلے لیڈر تھے جنہوں نے 1857 کی جنگ آزادی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے۔ انہوں نے ایک بڑی فوج تیار کی جس میں ہندو اور سکھ بھی شامل تھے اور انگریزوں کو نہ صرف لدھیانہ بلکہ پانی پت سے نکال باہر کیا۔ پھر وہ اپنے مسلح مجاہدین کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کی مدد کے لیے دہلی روانہ ہوئے۔ 1857 میں چاندنی چوک پر انہوں نے ہزاروں دیگر افراد کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا۔

"ان کے بعد ان کے جانشینوں نے انقلابی تحریکوں کی حمایت جاری رکھتے ہوئے غدر پارٹی اور بھگت سنگھ کے ساتھیوں سے تعاون کیا۔ انہوں نے ممتاز حریت پسند سبھاش چندر بوس کو شمال مغربی سرحدی صوبے میں جانے کے لیے پنجاب سے

بحفاظت گزرنے میں مدد فراہم کی۔ چندی گڑھ کے اخبار 'دی ٹربیون' نے 2001 میں میرے خاندان کی سامراج مخالف خدمات کی تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے۔

"میرے دادا مولانا حبیب الرحمان (ہم نام) لدھیانوی مجلس احرار کے بانی کارکن تھے۔ ستمبر 1947 میں سکھوں کے خوفناک حملوں کے باعث عارضی طور پر ہمیں لدھیانہ سے نکلنا پڑا۔ بڑی مشکل کے ساتھ ہمارا خاندان لدھیانہ ریلوے سٹیشن پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں ہزاروں افراد پاکستان جانے کے لیے ٹرین کے منتظر تھے۔ ہم ایک ٹرین پر بیٹھنے میں کامیاب ہو گئے۔ فوج کی سکیورٹی کے ساتھ ہم کئی گھنٹوں بعد آخر بخیریت لاہور پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

"دادا ایک روز لاہور میں رہے جہاں ہماری دیکھ بھال کے لیے بعض رشتہ دار موجود تھے۔ پھر وہ دہلی چلے گئے کیونکہ لدھیانہ جانا ناممکن تھا۔ نہرو نے ان کا نہایت احترام سے استقبال کیا۔ وہ میرے دادا کو بھارت کا نائب صدر بنانا چاہتے تھے لیکن علمائے دیوبند حسد کرنے لگے اور درپردہ اس فیصلے کی مخالفت پر اتر آئے۔ داداجان کچھ عرصہ دہلی میں رہے پھر آہستہ آہستہ لدھیانہ کی جامع مسجد کا انتظام دوبارہ ہمارے سپرد کر دیا گیا۔ میرے دادا اپنا یہ فرض سمجھتے تھے کہ مشرقی پنجاب میں باقی رہ جانے والے مسلمانوں کی مدد کے لیے وہاں رہ جائیں۔ مشرقی پنجاب میں ادھر ادھر کافی تعداد میں مسلمان باقی رہ گئے تھے۔ زیادہ تر غریب لوگ ہی زندہ بچے تھے۔ اب لدھیانہ میں دوبارہ مسلمان ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ یہ پنجابی نہیں بلکہ یوپی اور بہار کے ٹیکسٹائل کاریگر ہیں۔"

میجر جنرل (ر) سید وجاہت حسین جو قبل ازیں جالندھر میں تعینات تھے کو اگست کے آخر میں لدھیانہ جانے کا حکم ملا۔ انہوں نے شہر میں خوفناک مناظر کی تفصیل بیان کی ہے۔ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا گیا اور لاشیں ہر طرف بکھری پڑی تھیں۔ انہوں نے ایک نان کمیشنڈ ہندو جاٹ کی حکم عدولی کا بھی واقعہ لکھا ہے جس نے ایک ٹرین پاکستان جانے سے روکنے کی کوشش کی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ٹرین میں ہندو جاٹ خواتین کو اغوا کر کے لے جایا جا رہا تھا۔ پی بی ایف نے اسے گرفتار کر کے بند کر دیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ملے جلے مذاہب پر مشتمل باؤنڈری فورس بھی فرقہ واریت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی (2010: 58-9)۔ جنرل وجاہت کے اس واقعے میں کچھ ابہام پایا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان کے وقت وہ لدھیانہ میں تھے (حالانکہ یہ اعلان 17 اگست کو ہو چکا تھا)۔

انور علی

مشہور پاکستانی کارٹونسٹ اور فکشن رائٹر انور علی ('ڈیلی پاکستان ٹائمز' میں شائع ہونے والے کارٹون کردار ننھا کے خالق) 1947 میں وہ لاہور کے میو سکول آف آرٹس میں طالب علم تھے کہ تقسیم کے فسادات پھوٹ پڑے۔ انہوں نے مجھے یہ تفصیل سنائی:

"اگست کے پہلے ہفتے جب میں لدھیانہ کو روانہ ہوا تو لاہور فسادات کی آگ میں جل رہا تھا۔ بعض وجوہات کی بنا پر لدھیانہ کے مسلمان بدستور یہ سمجھتے رہے کہ لدھیانہ پاکستان میں شامل ہو گا۔ جب ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان ہوا تو ابتری پھیل گئی۔ خوش قسمتی سے میں اپنے اہل خانہ کو لدھیانہ سے بحفاظت لاہور لانے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے ان دنوں برپا ہونے والی قیامت صغریٰ کے مناظر دیکھے تھے۔ تقسیم کے کھیل میں سب سے زیادہ نقصان عام لوگوں کا ہوا۔ یہ وہ لوگ

تھے جن سے کبھی نہیں پوچھا گیا کہ وہ کیا چاہتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ لدھیانہ میں زیادہ ہوزری فیکٹریاں ہندوؤں کی تھیں جبکہ مسلمان اور سکھ صرف مزدوری کرتے تھے۔ ایسی معاشی ناہمواری نے پنجاب میں ناقابل کنٹرول صورتحال کو جنم دیا۔ اس کا نتیجہ دونوں طرف سے قتل عام کی صورت میں نکلا۔"

سیلجا سائنی

جہاں وسط اگست میں لدھیانہ کے مسلمانوں پر حملے شروع ہوئے وہاں مسلمانوں کی خوفناک جارحیت کے بھی واقعات دیکھنے میں آئے۔ میری سیلجا سائنی سے ملاقات مشرقی پنجاب میں میرے پہلے دورے میں 20 مارچ 2004 کو پروفیسر بھوپندر برار کے گھر پر ہوئی۔ وہ بتاتی ہیں کہ:

"تقسیم کے وقت میرے عمر چار سال تھی۔ یہ اپریل یا مئی 1947 کا مہینہ تھا کہ بھارتی فوج میں ملازم میرے ماموں بھگت سنگھ رہا ہو کر گھر آئے۔ انہوں نے 35 سال کی عمر میں بھارتی فوج میں خدمات انجام دیں پھر جاپانی فوج کی قید کے بعد وہ انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے۔ بھگت سنگھ سمیت کئی دیگر افراد کے خلاف مقدمات چلائے گئے تاہم انگریزوں کی رخصتی سے پہلے ہی یہ مقدمات بتدریج ختم ہو چکے تھے۔

"میرے نانا گاؤں کے لمبر دار تھے۔ ہمارے گاؤں کے پاس ہی مسلمانوں کا گاؤں تھا۔ اگست میں چار قریبی دیہات کے مسلمان ہمارے ہمسایہ گاؤں میں جمع ہو گئے۔ میرے ماما دراز قد اور وجیہ انسان تھے اور میری والدہ ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ماما اور چند دیگر سکھ مسلمانوں کے پاس گئے اور انہیں یقین دہانی کرائی کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ ماما نے فوج میں سروس کے دوران مسلمانوں کے ساتھ ہی خدمات انجام دی تھیں، اس لیے ان کی مسلمانوں سے کوئی رنجش نہیں تھی۔ وہ اور ان کے چند دوست مشکل کی گھڑی میں مسلمانوں کی مدد کرنا چاہتے تھے لیکن جب وہ دوستی کا پیغام لے کر مسلمانوں کے گاؤں گئے تو کسی نے للکار کہا 'انہیں مار ڈالو' چنانچہ یہ لوگ واپس دوڑ پڑے لیکن کسی نے گنڈاسے کا وار کر کے انہیں بے رحمی سے ہلاک کر ڈالا۔ ان کی لاش ہمیں کبھی نہ مل سکی۔ اپنے جواں سال بھائی کی موت کے بعد میری ماں کبھی سوگ سے نہیں نکلیں۔ ماموں کی دو بیٹیاں تھیں۔ چھوٹی ان کی موت کے بعد پیدا ہوئی۔ اگرچہ اس واقعے کو لمبا عرصہ گزر چکا ہے لیکن میری ماں کا زخم آج بھی ہرا ہے۔ وہ آج بھی اس امید میں بیٹھی ہیں کہ ان کا بھائی زندہ واپس لوٹ آئے گا۔ لدھیانہ کے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہوا یہ آپ خود معلوم کریں لیکن میں ان لوگوں کو جانتی ہوں جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دنوں واقعی قتل عام ہوا ہو لیکن میں چھوٹی تھی۔ دراصل میں ان دنوں خوشاب میں تھی جہاں میرے والد کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔"

لدھیانہ کے دیہی علاقے

لدھیانہ کے دیہی علاقوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی واضح اکثریت تھی۔ لدھیانہ کے ارد گرد واقع دیہات میں مسلمانوں پر انتہائی خوفناک انداز میں حملے کیے گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ راولپنڈی میں سکھوں کے ساتھ بد سلوکی کی کہانیاں یہاں گردش کر رہی تھیں اور سکھوں نے یہاں شمالی پنجاب اور ہزارہ میں ہونے والی خونریزی سے بھی بڑے پیمانے پر قتل عام کی نیت کر رکھی تھی۔

امر سنگھ

قبل ازیں امر سنگھ کا ذکر راولپنڈی کے واقعات کے تناظر میں ہو چکا ہے۔ وہ ایسے لوگوں میں شامل تھا جو مغربی پنجاب سے جان بچا کر مشرقی حصے کی طرف فرار ہو گئے اور پھر عسکریت پسند بن کر انتقام لینے لگے۔ اس نے مجھے یہ داستان سنائی:

"اسی اک نئی جان و تا (ہم نے ایک بھی مسلمان کو زندہ نہیں جانے دیا)۔ موگا کے علاقے میں ان کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔ کھنہ سٹیشن پر آخری مسلمان تک کو قتل کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ کپورتھلہ اور پٹیالہ میں کوئی زندہ نہ بچا۔ یہ حملے ستمبر میں ہوئے اور اکتوبر کے آخر تک جاری رہے۔ اگرچہ سکھوں کے جلسوں میں راولپنڈی کے سکھوں نے خود پر مظالم کی کہانیاں سنائیں لیکن مشرقی پنجاب میں بیشتر حملے دیہات کے جاٹوں کی قیادت میں کیے گئے۔ البتہ اصل حملے اس وقت شروع ہوئے جب پاکستان سے ہندوؤں اور سکھوں کی لاشوں سے بھری ٹرینیں آنے لگیں۔ اس سے وہ مہم لمحوں میں شروع ہو گئی جس کی تیاری میں پہلے کئی ماہ لگے تھے۔ یہ سچ ہے کہ سکھوں نے پھر کسی رحمدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیکن آپ کو یاد ہے کہ مسلمانوں نے ہمارے ہم مذہب بھائیوں سے کیا کیا؟ انتقام ہم پر واجب تھا۔"

وکی کے کلاس فیلو کا والد

تھوماجرہ جو اب ضلاع سنگروڑ میں ہے لیکن 1947ء میں یہ ضلع لدھیانہ کا حصہ تھا کے دورے میں میری ملاقات وکی کے کلاس فیلو کے والد سے ہوئی۔ بدقسمتی سے میں ان کا نام دریافت نہ کر سکا کیونکہ وہاں ماحول اس قسم کا تھا کہ ہم مختلف موضوعات پر مسلسل بحث کرتے رہے اور اس بنا پر مجھے نام پوچھنا یاد نہ رہا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ:

"اپریل 1947 میں مجھے امرتسر میں ایک اجلاس میں شرکت کا موقع ملا جہاں سکھ رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ اگر پنجاب کی تقسیم ناقابل قبول حد بندی کے ساتھ کی گئی تو ہم اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا کوئی نام و نشان بھی نہ باقی نہ رہے۔ پھر تقسیم کا فیصلہ ہونے کے بعد مغربی پنجاب کے علاقے تخت ہزارہ سے ایک شخص آیا۔ اس کا نام ارجن سنگھ تھا۔ اس نے مہاراجہ پٹیالہ سے ملاقات کی اور اس پر زور دیا کہ ملیر کوٹلہ سے مسلمانوں کو بے دخل کر دیا جائے۔ اس علاقے میں قتل عام کا سلسلہ بہادر گڑھ سے شروع ہوا اور تیزی سے ارد گرد کے علاقے میں پھیل گیا لیکن ملیر کوٹلہ کی حدود میں داخل ہونے والے کسی مسلمان کا تعاقب نہیں کیا جاتا تھا۔ لہٰذا یقیناً مہاراجہ نے ارجن سنگھ کا مطالبہ مسترد کر دیا ہوگا۔ کیونکہ گورو گوبند سنگھ کے فرمان میں سکھوں سے کہا گیا تھا کہ مستقبل میں کسی بھی تصادم کی صورت میں ملیر کوٹلہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو مسلمان اس ننھی ریاست کی حدود میں داخل ہو جائے گا وہ محفوظ ہو گا۔ اس طرح ہزاروں مسلمانوں کی جان بچ گئی۔ میرے والد سردار کندن سنگھ کانگریس پارٹی میں تھے۔ انہوں نے بھی کئی مسلمانوں کی جان بچانے میں مدد کی۔ حملوں کے ایک ماہ بعد ایک مسلمان خاتون (زخمی) زندہ مل گئی۔ مناسب خوراک کے بغیر جس طرح وہ زندہ ملی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان بدترین حالات میں بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ انگریزوں کی عملداری والے دیہات (یعنی ملیر کوٹلہ سے باہر) میں زندہ بچنے والے مسلمان اکتوبر کو پاکستان روانہ ہوئے جبکہ کچھ ملیر کوٹلہ میں مستقل آباد ہو گئے۔"

رنجیت سنگھ (اجیت سنگھ)

مارچ 2004 میں مشرقی پنجاب کے میرے پہلے دورے سے پہلے پروفیسر برار کی ہدایت پر وکی نے کئی دیہات کا چکر لگایا۔ تھوماجرہ میں اس کی ملاقات رنجیت سنگھ (اسے اجیت سنگھ بھی کہا گیا اس لیے اصل نام پردہ اسرار میں ہی رہا) سے کرائی گئی جس نے اعتراف کیا کہ اس نے مسلمانوں پر حملوں میں حصہ لیا۔ اس نے ہزاروں مسلمانوں کو قتل کرنے کا دعویٰ کیا۔ ہم نے ناتھوماجرہ کا دورہ مارچ 2004 میں کیا لیکن ہمیں بتایا گیا کہ وہ گاؤں سے باہر گیا ہے۔ جنوری 2005 میں میرے دوسرے دورے میں ہم دوبارہ گاؤں ناتھوماجرہ گئے۔ اس وقت وہ انٹرویو پر مان گیا بلکہ تصویر اتارنے کی بھی اجازت دے دی۔ اس نے یہ کہانی سنائی:

''ہمیں سکھوں کے مصائب کا پہلی بار اس وقت پتہ چلا جب دسمبر 1946 میں ہزارہ کے علاقے سے سینکڑوں خاندانوں نے پٹیالہ میں پناہ لی۔ نوجوان خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔ کچھ کی چھاتیاں بھی کٹی ہوئی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ کئی سکھ مارے بھی گئے ہیں۔ پھر مارچ 1947 میں پھر راولپنڈی میں مسلمانوں کے گروہوں کے ہاتھوں لٹنے والے سکھ خاندان یہاں آئے۔ اس کے بعد ہم نوجوانوں نے قسم کھائی کہ اگر موقع ملا تو ایک بھی مسلمان کو بخشا نہیں جائے گا۔ پاکستان کے علاقے سے بھاگ کر آنے والوں نے ہمیں سکھوں کے قتل اور عورتوں سے زیادتی کی کئی کہانیاں سنائیں۔ جب ایک روز لائل پور سے لاشوں سے بھری ٹرین آئی تو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ بالخصوص پیپال میں قائم پناہ گزین کیمپ میں ہم نے خوب قتل عام کیا۔ 5 گھنٹے کے اندر تمام خواتین اور بچوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ ہم تعداد میں 35 تھے اور ہم نے 20 ہزار افراد کو ہلاک کیا۔ ہمارے پاس دو ریوالور اور ایک رائفل تھی۔ اس دوران 400 دیگر حملہ آور بھی ہمارے ساتھ آ ملے۔ ہم نے نوجوان مردوں کو قتل کیا اور عورتوں اور بچوں کو کچھ نہ کہا۔ کچھ خواتین کو اغوا بھی کیا گیا۔

''یہاں مسلمانوں پر حملہ 2 ستمبر کو شروع ہوا جو پوری شدت سے مسلسل چار روز تک جاری رہا۔ سکھ جتھوں کے پاس گھوڑوں پر تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت کرنے کی سہولت موجود تھی۔ مسلمانوں کے 25 سے 35 ہزار افراد کے ایک قافلے پر بھی ہم نے دھاوا بول دیا۔ میرا خیال ہے کہ بیشتر کو جان سے مار دیا گیا البتہ کچھ نے کھیتوں میں چھپ کر جان بچائی۔ میرا اندازہ ہے کہ مشرقی پنجاب میں 5 لاکھ کے لگ بھگ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ حملوں کی منصوبہ بندی کرنے والے سرغنوں سے میرا رابطہ تھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ 5 سے 7 لاکھ مسلمانوں کو ذبح کیا گیا۔

''البتہ ملیر کوٹلہ کی حدود میں داخل ہونے والے کسی مسلمان کو ہم نے قتل نہ کیا۔ اس نے پنجابی میں یہ الفاظ استعمال کیے ''باؤ جی جیڑا مسلمان ملیر کوٹلہ جاون والی سڑک دے دوسرے پاسے انگریز علاقے وچ سی اونہوں اسی چھڈیا نئیں تے جیڑا ایس پاسے آ گیا سی، اسی اونہوں ہتھ نئیں لایا'' (جو مسلمان ملیر کوٹلہ جانے والی سڑک کے دوسری طرف انگریز انتظامیہ کے علاقے میں تھے اسے چھوڑا نہ گیا اور جو اس طرف تھا اسے ہم نے ہاتھ تک نہیں لگایا)۔ سڑک پر پکڑے جانے والوں کو بھی کاٹ دیا گیا۔ حملوں سے بچنے کے لیے ان کا ملیر کوٹلہ کی حدود میں داخلہ ضروری تھا۔

''ہم نے سرہند اور رائے کوٹ میں قائم کیمپوں کی طرف نقل مکانی کرنے والوں کو بھی نہ چھوڑا۔ البتہ جو وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے وہ بچ گئے۔ بدترین قتل عام اگست اور ستمبر میں ہوا۔ میں نرنجن سنگھ کے جتھے سے تعلق رکھتا تھا۔ جاگیر سنگھ اور کرتار سنگھ بھی اسی جتھے کے رکن تھے۔

''میں سمجھتا ہوں کہ جو ہوا غلط ہوا۔ کسی انسان کو جان سے مارنا پاپ ہے لیکن ہم نے اس کو مذہبی لڑائی (دھرم یودھ) سمجھا۔ ہم نے اپنے گاؤں کے مسلمانوں کو کچھ نہیں کہا۔ خود میں نے 3 ہزار مسلمانوں کو قتل کیا، اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ گجر، آرائیں، جاٹ، فقیر، تیلی۔۔۔ ہر برادری کے مسلمان ہمارا جائز ہدف تھے۔''

ہنس راج کھتری

17 مارچ 2004 کو میں نے ہنس راج کھتری (پیدائش 1920) کا انٹرویو کیا۔ ان کا تعلق ضلع لدھیانہ، تحصیل جگراں کے گاؤں سلیم پورہ کے جڑواں گاؤں سدھواں بیت Sidhwan Bet سے ہے۔ انہوں نے مجھے 2 مسلمان بہنوں کی دل فگار داستان سنائی:

''تقسیم سے قبل تحصیل جگراں سمیت پورے ضلع کے دیہات میں آرائیں مسلمانوں کی کافی زیادہ آبادی تھی۔ ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان ہونے کے بعد سکھ جتھے کافی متحرک ہو گئے تھے چنانچہ ہمارے علاقے کے مسلمانوں نے نقل مکانی کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ قریبی گاؤں کشن پورہ کے سکھ بھائی سخا سنگھ نے مسلمانوں کو تسلی دی کہ انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دونوں مذاہب کے پیروکار پرامن انداز میں لمبے عرصے سے اکٹھے رہ رہے تھے اور اب جبکہ مسلمان رخصت ہونے والے ہیں تو انہیں مہاجر کیمپ تک بحفاظت پہنچایا جائے گا۔ انہوں نے بھائی سخا سنگھ کا اعتبار کر لیا اور اگلے روز قافلہ مہاجر کیمپ کے مختصر سفر پر روانہ ہو گیا۔ اچانک مسلمانوں کی طرف گولیوں کے 2 فائر کیے گئے۔ اس موقع پر بھائی سخا سنگھ نے کہا کہ ہم مسلمانوں کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے، اس لیے مرد اپنے طور پر پناہ گزین کیمپ چلے جائیں جبکہ عورتوں اور بچوں کو ہماری حفاظت میں چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ خواتین اور بچوں کو سکھوں کے سپرد کر کے صحتمند مرد چلے گئے۔ اس دوران بعض شرپسندوں نے حملہ کر کے بھائی سخا کی حفاظت میں موجود خواتین میں سے کچھ کو اغوا کر لیا۔ ان میں 2 شادی شدہ بہنیں رمضان بی بی اور زینب بی بی بھی تھیں۔ ان دنوں مغوی عورتوں کو صرف 300 روپے میں فروخت کیا جارہا تھا۔ مغوی بہنوں نے التجا کی کہ پہلے ان کے اہل خانہ کو ان کی قیمت لگانے کی اجازت دی جائے۔ وہ مان گئے اور انہوں نے کشن پورہ کے ہی فوجی ملازم اندر سنگھ سے رابطہ کیا تاکہ مغوی بہنوں کے والدین کو تلاش کیا جا سکے۔ اندر سنگھ نے مجھے کہا کہ میں ان سے بات کروں۔ ان غنڈوں نے ایک بہن کا تاوان ایک ہزار روپیہ مانگا۔ ان دنوں رمضان بی بی کا شوہر انگلستان میں تھا۔ اس کے سسر عطا محمد مہر نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اگر اس نے بیوی کی رہائی کی کوشش نہ کی تو وہ بیٹے کو تمام زندگی معاف نہیں کرے گا۔ بہر حال کچھ لے دے کے 700 روپے پر خاتون کا سودا طے پا گیا جبکہ زینب بی بی کے سسر نے صرف 300 روپے دینے پر حامی بھری اور کہا کہ وہ اس سے زائد ادائیگی نہیں کر سکتا۔ اس کے شوہر نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ اغوا کاروں نے اصرار کیا کہ وہ ایک ہزار روپے فی خاتون سے کم پر سودا نہیں کریں گے۔ انہوں نے مؤقف اختیار کیا کہ زینب بی بی رمضان بی بی سے کم عمر اور خوبصورت ہے۔ لیکن سسرال نے مزید رقم دینے سے انکار کر دیا اور وہ خاتون کبھی واپس نہ کی گئی۔ مجھے نہیں پتا کہ اس کے ساتھ بعد میں کیا ہوا۔''

حمید اختر

سینئر صحافی حمید اختر اردو کے معروف کالم نگار تھے۔ وہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے روح رواں سمجھے جاتے تھے۔ میری ان سے ملاقات لندن میں ہوئی جہاں ہم دونوں عالمی پنجابی کانگریس میں شرکت کے لیے مئی 2002 میں وہاں آئے تھے۔ انہوں نے اپنے گاؤں سے لاہور فرار ہونے کی کہانی ان الفاظ میں مجھے سنائی:

''میں 1924 میں تحصیل جگراں کے گاؤں تہاڑا میں پیدا ہوا۔ جالندھر اور فیروزپور کی سرحدیں بھی ہمارے گاؤں سے ملتی تھیں۔ گاؤں کے مغرب میں واقع کشن پورہ ضلع فیروزپور میں تھا جبکہ شمال میں نکودر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے گاؤں کو تہاڑا (تین اطراف والا) کہا جاتا تھا۔ میری عمر تین سال ہی تھی کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور مجھے قرآن مجید حفظ کرایا گیا۔ ہم دہلی میں مدفون عظیم صوفی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی اولاد میں سے تھے۔ تہاڑا گاؤں میں خانقاہ شاہ دیوان آج بھی مرجع خلائق ہے۔ جن لوگوں کی اولاد نرینہ نہیں تھی وہ یہاں آکر بیٹے کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ 1947 میں گاؤں کی آبادی 1800 نفوس پر مشتمل تھی اور اکثریت مسلمان گھرانوں کی تھی۔ ہائی سکول میں داخلے کے لیے دس سال کی عمر میں، میں لدھیانہ شہر آگیا۔ مذہبی ہم آہنگی اتنی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو سکھ، مسلمان یا ہندو نہیں سمجھتے تھے۔ اکا دکا جھڑپیں ضرور ہوتی تھیں لیکن 1947 سے پہلے کسی نے انہیں سنجیدگی سے نہیں لیا۔

''اگست 1947 میں ساحر لدھیانوی اور میں بمبے میں تھے۔ ہم 9 اگست کو بمبے سے روانہ ہوئے۔ میرے بھائی نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا اور باقی اہل خانہ کو گاؤں میں ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ ہمارے گھرانے اور سید برادری کے دیگر ارکان نے فیصلہ کیا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر جانے کی بجائے لڑنے کو ترجیح دیں گے۔ اگست کے آخر تک اردگرد کے دیہات کے مسلمانوں نے تہاڑا میں پناہ لینی شروع کر دی تھی۔ پولیس تو تھی ہی نہیں۔ مسلمان افسروں کو غیر مسلح کیا جا چکا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے نکلنا شروع کر دیا۔ ہم سدھواں بیت گئے جہاں سے ہم تانگے حاصل کر سکتے تھے۔ میری معیت میں 70 خواتین اور بچے تھے۔ کچھ مرد بھی تھے۔ ہم نکودر میں قائم پناہ گزین کیمپ گئے کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ جالندھر پاکستان میں شامل ہو گا۔

''میرے ایک چچا جو پولیس سے ریٹائر ہوئے تھے وہ افیون کھانے کے عادی تھے۔ ہجرت کے دوران کچھ روز میں ان کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ چنانچہ میں بشرٹ اور ٹراؤزر پہنے کیمپ سے باہر ان کے لیے افیون ڈھونڈنے چلا گیا۔ میں نے افیون خریدی اور ابھی کیمپ واپسی کے لیے مڑا ہی تھا کہ ایک نہنگ (مسلح سکھ) تلوار سونتے میری طرف بڑھا۔ ٹھیک اس لمحے ایک سکھ افسر سامنے آیا اور میرے ساتھ معانقہ کیا۔ یہ میرا سابق سکول فیلو نریندر سنگھ تھا۔ اسے دیکھ کر نہنگ بھاگ نکلا۔ نریندر سنگھ ان دنوں ایک وزیر کا ملٹری سیکرٹری تھا۔ ان دنوں میری بڑی ہمشیرہ فاطمہ کافی علیل تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ وہ مرنے والی ہیں اور اگر ان کا انتقال ہوا تو غسل دیئے بغیر ہرگز انہیں نہ دفنایا جائے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو کیمپ میں کوئی تجہیز و تدفین کے لیے ہماری مدد پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ مجبوراً اپنی بہن کو غسل دینے کا کام مجھے کرنا پڑا۔ آخر کار ہم پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے اور ہمارے جو رشتہ دار پیچھے رہ گئے تھے ان سب کو ہلاک کر دیا گیا۔ بہت کم ہندوؤں نے حملوں میں حصہ لیا (بیشتر سکھ تھے)۔ آر ایس ایس اتنی منظم نہیں تھی جتنی سمجھی جاتی ہے۔ اکالی اور سکھ مہاراجے سکھ جتھوں کے بڑے سرپرست تھے۔

"یہاں پاکستان کی طرف میں نے سنا کہ سردار شوکت حیات اور دیگر مسلم لیگی امرتسر اور شاہ عالمی کو آگ لگانے میں ملوث تھے۔ عام آدمی کا فسادات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ زیادہ تر غنڈوں نے قتل عام میں حصہ لیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ محمد علی جناح نے ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا گورنر جنرل نہ بنوا کر درست فیصلہ کیا تھا۔ جب ان کو اس عہدے کے لیے مسترد کیا گیا تو لامحالہ ان کی پرامن انتقال اقتدار میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔"

چودھری ریاست علی

"میں 29 نومبر 1933 کو مشرقی پنجاب کے قصبے ہلواڑہ میں پیدا ہوا۔ یہ ایک مشہور ائیر بیس سے ملحقہ بڑا گاؤں تھا۔ ہم پچھلے 800 سال سے ہلواڑہ میں رہ رہے تھے۔ ہمیں حضرت مخدوم جہانیہ نے دائرہ اسلام میں داخل کیا تھا۔ گاؤں کی زیادہ تر زمین میری برادری کے راجپوتوں کی ملکیت تھی۔ مسلمان آرائیں، جاٹ، سکھ، دھوبی، ہندو برہمن اور کھتری جیسی دیگر برادریاں بھی تھیں۔ جب تقسیم ہوئی تو میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارا گاؤں کافی آخر تک پرامن رہا۔ درحقیقت ہم نے غیر مسلموں کا تحفظ کیا۔ بلکہ ہم نے ان کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ ارد گرد کے دیہات میں اپنے رشتہ داروں کی طرف چلے جائیں۔ ہمارے پاس کئی ریٹائر فوجی اور پولیس افسر تھے کیونکہ راجپوت ہمیشہ خوشدلی سے ایسے محکموں میں ملازمت کرتے ہیں۔ ان میں سے کئی دوسری جنگ عظیم میں حصہ لینے کے بعد واپس آئے تھے۔ ہم نے کافی تعداد میں اسلحہ جمع کر لیا۔ اس لیے کسی بھی حملے کی صورت میں ہماری تیاری مکمل تھی۔ ہمیں اس بات کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ آیا ہمارا گاؤں بھارت میں شامل ہو جائے گا۔ ہم اکثر ہٹلر کے خلاف نعرے بازی کرتے رہتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ انگریز ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ ہمارے کئی رشتہ دار سنگاپور اور ہانگ کانگ میں جنگی قیدی بھی رہے تھے۔ جاپانیوں نے ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا تھا۔ ہمارے کچھ رشتہ دار انگریز مخالف انڈین نیشنل آرمی میں بھی شامل تھے۔ کیپٹن ظفر اللہ خان بھی ان میں سے ایک تھے۔

"ہمارے گاؤں کے 99 فیصد مسلمان مسلم لیگ کے حامی تھے البتہ کچھ مجلس احرار کے لیڈر مولانا بخاری اور کچھ کانگریس کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد کے بھی حامی تھے۔ نوجوان 'لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان' کے نعرے لگاتے رہتے تھے۔ ہمارے گاؤں کے ہی کچھ لڑکے لاہور میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں کافی فعال تھے۔ پھر ہمیں پتہ چل گیا کہ ہمارا گاؤں پاکستان میں شامل نہیں ہو گا کیونکہ یہ دریائے ستلج کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ حتیٰ کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں بھی مشرقی پنجاب کے یہ حصے سلطنت لاہور میں شامل نہیں تھے۔ بہر حال ہلواڑہ اور ضلع لدھیانہ کی بھارت میں شمولیت کی خبروں نے ہمارے لیے سنگین بحران پیدا کر دیا۔ اس سے پہلے کئی مسلمان کنبوں نے ہمارے گاؤں میں پناہ لے رکھی تھی۔ سکھ بدمعاشوں نے دہشت گردی کے حملے شروع کر دیے تھے۔ پھر ہم نے اپنا عسکریت پسند گروپ بنا لیا۔ اس وقت میں صرف چودہ سال کا تھا۔ ہمارے لوہار ہر قسم کا اسلحہ تیار کر سکتے تھے۔ ایسے ماہرین بھی تھے جو بندوقیں بنا سکتے تھے۔

''جب ہم نے محسوس کیا کہ ریاست پٹیالہ کی فوج کو متحرک کیا جا رہا تھا تو یہ واضح ہو گیا کہ ہم زیادہ دیر مزاحمت جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ حکومت نے قریبی گاؤں رائے کوٹ کو پناہ گزین کیمپ قرار دیا تھا۔ ہم وہاں منتقل ہو گئے۔ گاؤں چھوڑنا ہمارے بڑوں کے لیے انتہائی مشکل فیصلہ تھا کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد اس مٹی میں دفن تھے۔ ہم نے نہایت گہرائی تک بحث مباحثہ کیا۔ جب ہم جا رہے تھے تو ہمارے ایک بزرگ نے کہا کہ وہ نہیں جائے گا۔ کیپٹن ظفر اللہ نے اسے طفل تسلی دی کہ ہم عارضی طور پر جا رہے ہیں اور حالات ٹھیک ہونے پر واپس آ جائیں گے۔ ہم ایک ہفتے تک پناہ گزین کیمپ میں رہے پھر میرا ایک کزن ہمیں ٹرک پر لاہور لے آیا۔ ہمیں تقسیم سے بے حد نقصان پہنچا کیونکہ ہمارا سماجی ڈھانچہ بکھر کر رہ گیا۔ وہ گاؤں دوبارہ پہلے والی حالت میں کبھی نہ آ سکا۔ صرف لائل پور کے چک 40 میں ایک چھوٹا ہلواڑہ ہے۔ ہلواڑہ اتنا بڑا گاؤں تھا کہ اس کی سات پٹیاں (ذیلی اکائیاں) تھیں۔''

گجروال

محمد عبداللہ شمشاد

میں نے ملتان کے دورے میں 21 دسمبر 2004 کو ممتاز صحافی محمد عبداللہ شمشاد جو ایم اے شمشاد کے نام سے مشہور ہیں کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا تھا۔ انہوں نے مجھے یہ کہانی سنائی:

''میری پیدائش 20 ستمبر 1937 کو ایک بڑے گاؤں گجروال ضلع لدھیانہ میں ہوئی تھی۔ یہ ایک چھوٹا موٹا قصبہ تھا اور ایک ہزار سے زائد گھروں کے لیے باقاعدہ سینی ٹیشن کا نظام موجود تھا۔ سول ہسپتال، ویٹرنری ہسپتال، ڈاکخانہ، لڑکیوں اور لڑکوں کے سکول بھی موجود تھے۔ اصل میں گجروال میں راجپوت ہندوؤں کی ذیلی ذات سہوتہ کی آبادی زیادہ تھی۔ کچھ نسلوں پہلے کئی ہندو خاندانوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں میرا خاندان بھی شامل تھا۔ اسلام قبول کرنے پر ہندو راجپوت ہمارے دشمن بن گئے۔ انہوں نے ہمارے خلاف اپنے دل میں کینہ پالے رکھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر ہم نے آرائیں مسلمانوں کو دعوت دے کر اپنے گاؤں میں آباد کرایا۔ انہیں ہم نے مفت زمین دی اور ان کی آبادکاری میں حوصلہ افزائی کی گئی۔ 1940 کے عشرے میں گجروال میں مذہبی توازن اس طرح سے تھا: 300 آرائیں خاندانوں سمیت 400 مسلمان گھرانے، 20 سکھ خاندان اور باقی تمام ہندو خاندان تھے۔

''ہمارا خاندان گجروال میں مسلمانوں کا ممتاز گھرانہ تھا۔ میرے کئی رشتہ دار انتہائی تعلیم یافتہ تھے۔ ان میں ڈاکٹر، سائنسدان اور ماہرین تعلیم شامل تھے۔ یہ لوگ پنجاب کے مختلف علاقوں میں تعینات تھے لیکن چھٹیوں پر ہمیشہ گاؤں کا چکر لگاتے تھے۔ اس طرح گاؤں اور خاندان سے ان کا رشتہ بدستور استوار رہا۔ تعلیم حاصل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ نو راجپوت ہونے کی حیثیت سے ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ ہندو راجپوتوں کے مقابلے میں صرف تعلیم ہی ہمیں بچا سکتی تھی۔ جب تحریک پاکستان شروع ہوئی تو مسلمانوں میں اس کی دلچسپی پیدا ہوئی جبکہ ہندو کانگریس کے حامی تھے۔ ہمارا خاندان مسلمانوں

کا چودھری تھا۔ یہ روایت تھی کہ کوئی بھی مسلمان لڑکی شادی کے وقت ہمارے گھر سے رخصت ہوتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہمارا بااثر خاندان اس لڑکی کی پشت پر تھا اور کوئی اس کے ساتھ برے سلوک کی جرأت نہ کرے۔

"46-1945 کے انتخابات کے دوران ہمارے گاؤں میں فرقہ وارانہ تقسیم مزید گہری ہوگئی۔ لدھیانہ کانگریس کا مضبوط گڑھ تھا۔ احرار والے بھی لدھیانہ میں کافی مضبوط تھے۔ مولانا حبیب الرحمان نے عام نشست پر کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا لیکن سکھوں سے شکست کھا گئے۔ ہندوؤں نے انہیں ووٹ نہیں دیا تھا۔ یہ مسلمانوں کے لیے ایک بڑا دھچکہ تھا چنانچہ وہ مسلم لیگ کے مزید قریب ہوگئے۔ انتخابی مہم کے دوران گجروال میں صورتحال پر سکون ہی رہی۔ ہندو اور سکھ دھرم شالہ میں جمع ہوتے جبکہ مسلمانوں کا اجتماع پنڈال میں ہوتا جہاں سیاسی صورتحال پر تبادلہ خیال کیا جاتا تھا۔ میں گجروال ہائی سکول میں زیر تعلیم تھا۔ ہمارے اساتذہ بہت اچھے تھے اور تمام طلبا پر توجہ دیتے اور ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ البتہ 1945 کے بعد ہندو اساتذہ کا مسلمان طلبا سے رویہ مخالفانہ ہوگیا۔ ایک طرح سے وہ ہمیں ہراساں کرتے تھے اور تضحیک انداز میں کہتے، 'اوہ مسلے، کھڑا ہو جا۔' سکول میں سکھوں نے میری دو دفعہ پٹائی کی تھی۔ ہندو طلبا ہمارے ساتھ کھیلتے تھے لیکن جب کبھی ہم ان کی رسوئی کے قریب پھٹکتے تو ان کی رویہ ہذیانی ہو جاتا تھا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوتا کہ ہم ان میں سے نہیں ہیں۔ اس رویے سے کمسن مسلمان کافی نالاں ہوئے اور وہ نعرے لگاتے 'قائداعظم زندہ باد، پاکستان زندہ باد۔' اس سے ہندو اور سکھ کافی مشتعل ہو گئے۔ ان دنوں پٹھانوں کا کافی ہوا بنا ہوا تھا۔ وہ مشرقی پنجاب میں کافی متحرک رہتے تھے اور کبھی کبھی گجروال میں بھی آتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز دس یا بارہ پٹھان آئے تو ہندو خوفزدہ ہو گئے۔ انہوں نے میرے والد سے رابطہ کر کے کہا کہ وہ کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرنا چاہتے۔

"البتہ سکھ ذرا مختلف تھے۔ وہ سخت جان تھے۔ اس علاقے کا بدنام زمانہ جگا ڈاکو پولیس سے مقابلے میں مارا گیا تھا۔ اس کا ایک ساتھی ہمارے گاؤں کا تھا اور مقابلے میں اس کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی تھی۔ اس واقعے سے اس کی زندگی بدل گئی اور وہ گجروال واپس آکر رہنے لگا۔ ہندوازم، سکھ مت اور اسلام پر اس کا گہرا مطالعہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے انسانیت کو کافی نقصان پہنچایا ہے اور اب اسے انسانوں کی خدمت کرنی چاہیے۔ وہ جرائم سے تائب ہو کر بابا بن گیا۔ تمام ہندو، سکھ اور مسلمان اس کا احترام کرتے تھے۔ وہ ہم لڑکوں کو کہتا کہ اسے قرآنی آیات پڑھ کر سناؤ جس کے بدلے وہ ہمیں ٹافیاں دیا کرتا تھا۔ اس کا نام جگجیت سنگھ تھا لیکن جب 46-1945 میں پاکستان کے لیے سیاسی تحریک شروع ہوئی تو وہ بھی تبدیل ہو گیا اور اس نے ہم سے کلمہ طیبہ اور دیگر اسلامی آیات پڑھنے کو کہنا چھوڑ دیا۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سماجی رویوں میں تبدیلی آ رہی تھی۔ ہمارے گھر میں ریڈیو سیٹ تھا اور تمام مسلمان بخوشی ہمارے گھر آکر خبریں سن سکتے تھے۔ مجھے آج بھی وہ خبر یاد ہے کہ جاپان کے شہر ہیروشیما پر امریکہ نے ایٹم بم پھینک دیا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ انگریزوں کو ہندوستان سے جانا ہی پڑے گا کیونکہ دوسری جنگ عظیم نے انہیں بالکل تھکا کر رکھ دیا تھا۔ ہم مسلمان محسوس کرنے لگے کہ انگریزوں کے بعد ہندوؤں کا رویہ ہمارے ساتھ منصفانہ نہیں ہوگا۔ ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہمارا گاؤں بھارت میں شامل ہوگا۔ دوسرا ہمارا یہ بھی خیال تھا کہ کانگریس نے چونکہ ہمارے علاقے میں ایک مسلمان کو انتخابی ٹکٹ جاری کیا تھا اس لیے اگر ہم بھارت میں رہے تو ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ لدھیانہ کے بیشتر مسلمانوں کو گمان تھا کہ لدھیانہ پاکستان کو ملے گا حالانکہ مسلمان وہاں اقلیت

میں تھے۔ مسلم لیگ نے بھی ہمیں یقین دلایا کہ لدھیانہ پاکستان میں شامل ہو گا۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ علمائے دیوبند اور مجلس احرار والوں کو پورا اعتماد تھا کہ ہندو مسلمانوں کو گزند نہیں پہنچائیں گے۔

"14 اگست کو 27 رمضان تھی۔ ہم شام کو مسجد میں نماز تراویح ادا کرنے گئے۔ باہر ہندو اور سکھ بھارت کی آزادی کا جشن منانے کے موڈ میں تھے۔ ہم پوری شب قدر مسجد میں گزارنا چاہتے تھے لیکن سکھ اور ہندو باہر شور و غوغا بلند کرتے رہے جس سے ہم خوفزدہ ہو کر گھروں کو چلے گئے۔ اس سال رمضان 30 دنوں کا تھا۔ عید الفطر (18 اگست) کو مسلمان مرکزی جامع مسجد میں جمع ہوئے۔ یہ اس گاؤں میں مسلمانوں کا آخری بار مشترکہ اجتماع تھا۔ بزرگوں نے خطرے کا احساس کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ وہ مسلمان گھرانے جو ہندو اور سکھ محلوں میں ہیں وہ ادھر جمع ہو جائیں۔ ہماری حویلی پختہ اینٹوں سے بنی تھی اور اس کے مضبوط آہنی گیٹ تھے۔ آرائیں گھرانے ایک ہی سمت میں اکٹھے تھے، اس لیے انہیں ہمارے پاس آنے کی بجائے اسی جگہ رہنے کا مشورہ دیا گیا کیونکہ وہ تعداد میں کافی تھے۔

"مجھے یاد ہے کہ یہ 23 اگست کا دن تھا جب حملہ ہوا۔ ہم آگاہ تھے کہ سکھوں نے گاؤں کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ میرے والد نے والدہ سے کہا کہ پراٹھے بنا کر تمام بچوں کو کھلا دو۔ حویلی میں اس وقت کئی غریب گھرانوں کے افراد بھی مقیم تھے اور کچھ بچوں نے پہلی بار دیسی گھی کے پراٹھے کھائے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عورت نے میرے والد سے پوچھا کہ چاچا جی آج کیا تاریخ ہے تو انہوں نے کہا کہ عید گزرے آج چھ ایام گزر چکے ہیں یعنی 23 اگست کا دن تھا۔ تاریخ پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ ان کی زندگی کا خاص دن تھا کہ انہیں پراٹھے کھانے کو ملے۔ والد صاحب کو اس روز قتل کر دیا گیا تھا۔ پراٹھے بننے سے پہلے ہی فائرنگ شروع کی جا چکی تھی۔ ہمارے گھر کی طرف بھی کچھ گولیاں فائر کی گئیں۔ میرے والد چھت پر گئے تو دیکھا کہ پورا آرائیں محلہ شعلوں میں جل رہا تھا۔ یہ علی الصبح کا وقت تھا۔ ہمارے گھر میں کوئی اسلحہ نہیں تھا کیونکہ پولیس آ کر تمام اسلحہ ضبط کر چکی تھی۔ پولیس نے گزشتہ دو ماہ کے دوران چار سے پانچ چھاپے مارے تھے۔ یوں تمام مسلمان مکمل طور پر نہتے کیے جا چکے تھے۔ پولیس میں بیشتر ملازمین سکھ تھے۔ ان لوگوں نے بڑی چھریاں تک نہیں چھوڑی تھیں بلکہ بڑے ڈنڈے بھی ساتھ لے گئے۔

"جب فائرنگ میں شدت آ گئی تو مکان کی ایک طرف سے سیڑھیاں لگا کر خواتین اور بچوں کو نکال دیا گیا۔ انہیں کہا گیا کہ وہ کھیتوں میں چھپ جائیں یا دیگر گھروں میں روپوش ہو جائیں۔ اس تمام صورتحال کی نگرانی میرے والد کر رہے تھے۔ گھر میں اور کوئی مرد نہیں تھا۔ اس دوران سکھوں نے چلا کر کہا کہ چودھریوں کے گھر سے عورتیں فرار ہو رہی ہیں۔ اگرچہ حملہ آور باہر کے تھے لیکن ہمارے گاؤں کے سکھ بھی ان کے ساتھ تھے اور انہیں ہدایات دے رہے تھے۔ نہنگ سکھوں (مسلح سکھوں کا خصوصی گروپ) نے ہمارے گھر میں باہر سے تیز دھار دھاتی ٹکڑے اور رنگ (Rings) پھینکے۔ جس کسی کا پاؤں ان سے ٹکراتا وہ زخمی ہو جاتا۔ کچھ بچوں اور خواتین کو ہلاک کر دیا گیا۔ ہم نے پوری رات گھر پر گزاری۔ میرا خیال ہے کہ حملہ آوروں نے سمجھا کہ حویلی میں اسلحہ موجود ہے اس لیے انہیں براہ راست حملہ کرنے کی جرأت نہ کی۔ اس دوران میرے والد ساتھ والے گھر گئے تاکہ دیکھ سکیں کہ وہاں پناہ لیے افراد خیریت سے تھے کہ نہیں۔ اس گھر میں انہیں گولی مار دی گئی۔ میری والدہ، دو بہنیں اور خالہ سمیت کچھ خواتین بدستور ہماری حویلی میں تھے۔ ان سب کی تعداد 30، 40 تھی۔ جب رات آئی تو سکھوں نے تیل چھینک کر مکان کو آگ لگانے کی کوشش کی لیکن پختہ اینٹیں ہونے کی وجہ آگ نہ لگی البتہ لکڑی کے دروازے تباہ ہو گئے۔

"اب سکھ چھت سے کود کر برآمدے میں آ گئے تھے۔ وہ لوٹ مار کرنے کے خواہاں تھے۔ میری والدہ، میں اور بہنیں سیڑھی پر بیٹھے تھے۔ میں دوڑ کر چھت پر گیا۔ وہاں سکھ کھڑے تھے۔ ایک نے پکار کر کہا 'یہ نور دین کا بیٹا ہے۔ اس کے باپ کو ہم نے قتل کر ڈالا ہے۔' ایک حملہ آور نے مجھ پر گنڈاسے کا وار کیا۔ میں ایک طرف تیزی سے ہٹ کر بچ گیا۔ پھر چھت سے چھلانگ لگا کر بھاگ گیا۔ ایک مسلمان ہمسایہ عورت نے میری مدد کی اور مجھے اپنے دوپٹے سے لٹکا کر اپنے گھر میں اتار لیا۔ بہر حال سکھوں نے میری ماں، بہنوں اور دیگر خواتین کو جان سے نہ مارا۔ میری بہنیں مجھ سے چھوٹی تھیں۔ ایک بہن دو سال چھوٹی تھی جبکہ دوسری محض دو برس کی تھی۔ اگلی صبح ہمارا خاندان اور خالہ گاؤں سے نکل گئے۔ اچانک نہنگوں کے ایک بڑے جتھے نے ہمیں گھیر لیا۔ میری خالہ نے ایک بزرگ سے التجا کی کہ وہ مجھے نہ ماریں کیونکہ خاندان میں صرف میں ہی مرد زندہ بچا تھا لیکن سکھ بدستور ہمارے قریب آتے گئے۔ وہ فتح کے نشے میں چور تھے۔ ایک بولا 'یہ نور دین کا بیٹا ہے۔' جس بوڑھے سے میری خالہ نے التجا کی تھی وہ بمشکل چل پھر سکتا تھا۔ اس نے چیخ کر پنجابی میں کہا 'اوئے دفع ہو جاؤ، اسے مارنے سے پہلے مجھے مارو، اسے چھوڑ دو۔' وہ بوڑھا سکھ ہمارے گاؤں کا تھا۔ اس طرح ڈیڑھ سو نہنگ وہاں سے چلے گئے۔

"ہم گاؤں سے نکل کر کھیتوں میں چھپ گئے۔ وہاں کئی اور مسلمان بھی تھے۔ میری خالہ کا شوہر جو میرا سگا چچا بھی تھا کھیتوں میں پہلے ہی سویا ہوا تھا۔ ہم نے وہ رات اور اگلا دن وہیں گزارا۔ تیسرے روز ہم قریبی گاؤں میں گئے جہاں مسلمانوں کا اجتماع (چوپال) ہو رہا تھا۔ وہاں ہم تین یا چار روز مقیم رہے۔ پھر ہم نے سنا کہ ارد گرد کے دیہات کے مسلمان قافلہ بنا کر پاکستان جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمارا پہلا پڑاؤ ملیر کوٹلہ ریاست تھی جو ہم سے محض 20 میل دور تھی۔ راستے میں ہمارے گاؤں کے بعض دیگر افراد بھی ہمیں ملے۔ ہم نے سنا کہ آرائیں محلے کے صرف تین افراد زندہ بچے تھے۔ باقی سب کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ میرے چچا اور ان کے بچے بھی ہمارے ساتھ آ ملے۔ قافلے میں اب پناہ گزینوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ ہمارا اولین مقصد یہ تھا کہ ہم ملیر کوٹلہ کے علاقے منڈی میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جائیں۔ راستے میں ہمیں بلوچ رجمنٹ کے کچھ سپاہی ملے۔ انہوں نے ہمیں تحفظ فراہم کیا۔ راستے میں قافلے پر دو بار حملہ کیا گیا لیکن فوجیوں نے دونوں حملے پسپا کر دیے۔ آخر کار ہم منڈی پہنچ گئے جہاں ہمیں کھانا ملا۔ ملیر کوٹلہ میں ہی ہماری ملاقات میرے استاد یعقوب کے خاندان سے ہوئی۔ عید الاضحیٰ ہم نے ملیر کوٹلہ میں ہی منائی۔ بیماری سے میری ننھی بہن وہیں چل بسی جبکہ دوسری بھی شدید علیل ہو گئی۔

"پھر ملیر کوٹلہ سے ایک ٹرین پاکستان کے لیے روانہ ہوئی۔ میری خالہ اور چاچا پہلے ہی جا چکے تھے۔ فیروز پور میں ٹرین کو روک لیا گیا تھا کیونکہ پٹڑیاں اکھاڑ دی گئی تھیں اور سکھوں نے حملہ کر دیا۔ سینکڑوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ میری ماں نے مجھے کہا کہ بیٹا بھاگ جاؤ۔ میری بیمار بہن چل پھر نہیں سکتی تھی اس لیے ٹرین کی بوگی میں رہی۔ ہماری اپنے گاؤں کے بعض مزید لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ حملہ آوروں کی زیادہ دلچسپی زیورات اور نقدی میں تھی۔ وہ لوٹ مار کر کے لوگوں کو قتل کر دیتے یا نظر انداز کر کے چلے جاتے۔ پھر ٹرین دوبارہ چل پڑی اور ہم دریائے ستلج کے پل پر پہنچ گئے۔ جہاں سینکڑوں گورکھا فوجی گشت کر رہے تھے جو سکھوں اور ہندوؤں کی حمایت کر رہے تھے۔ پل کی دوسری طرف پاکستان تھا اس لیے وہ پل پار کرنے سے پہلے لوگوں کو مار رہے تھے۔ ہم ایک بار پھر منتشر ہو گئے۔ میں، میری ماں اور بہنیں دریا کی اس طرف بیٹھے ستلج پار کرنے کے موقع کی تلاش میں تھے۔ ہم کئی روز تک سکھ جتھوں سے بچنے کے لیے کھیتوں میں چھپے

رہے۔ ایک روز بلوچ رجمنٹ کے اہلکار پل پر نظر آئے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ جو کوئی پل پار کر کے پاکستان جانا چاہتا ہے وہ آ جائے۔ مجھے یاد ہے کہ بچوں کو نیزے مارے گئے تھے اور ان کے باپ نعرے لگا رہے تھے 'پاکستان زندہ باد'۔ خواتین کی چھاتیاں اور شرم گاہیں کاٹ دی گئی تھیں۔ ہمیں پیشاب پینے پر مجبور کر دیا گیا۔ کنوؤں اور تالابوں کے پانی میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ میری بہن نے ایسا ہی زہریلا پانی پی لیا اور پاکستان کی سرحد قصور پہنچ کر دم توڑ گئی۔ ہم نے اسے کیمپ میں ہی دفن کر دیا۔ پھر ہم ملتان میں جہاں میرے چچا تھے، پہنچنے کی امید پر غلطی سے ایک مال بردار ٹرین پر سوار ہو گئے لیکن وہ ٹرین شیخوپورہ جا پہنچی۔ سٹیشن پر ہمیں کھانے کو کچھ نہ ملا۔ میری ماں کرب سے رونے لگی کیونکہ اب ہمیں بھیک مانگنا پڑنی تھی۔ میں بھی رونے لگا۔ اس دوران ایک ریلوے ملازم وہاں آیا۔ اس نے ہمیں ایک پوسٹ کارڈ دیا تاکہ ہم مویشی ہسپتال ملتان میں ملازم اپنے چچا کو خط لکھ سکیں۔ اس نے ہمیں کھانے کو چیزیں بھی دیں۔ ہم وہاں کچھ روز ٹھہرے لیکن خط کا کوئی جواب نہیں آیا۔ ریلوے ملازم نے ہمیں بتایا کہ اگلے روز ایک ٹرین ملتان جانے والی تھی۔ اس نے گارڈ سے کہا کہ وہ ہمیں ٹکٹ کے بغیر سفر کرنے دے۔ اس طرح ہم ٹرین پر سوار ہو گئے۔

''ہم ملتان کینٹ سٹیشن کی بجائے ملتان شہر والے سٹیشن پر اتر گئے۔ یہ سہ پہر 4 بجے کا وقت تھا۔ یہ 10 محرم کا دن تھا اور عاشورہ کا مرکزی جلوس شہر کے وسط سے گزر رہا تھا۔ ہم نے رات ایک دکان کے پھٹے پر گزاری۔ میری ماں کا خیال تھا کہ ان کا دیور شاید ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا اس لیے ہم ہسپتال جا کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ پھر ایک چیف ڈاکٹر آیا تو کسی نے کہا کہ آپ کے مہمان آئے ہیں۔ وہ دراصل ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر تھا۔ اتفاق سے اس کا گھر میرے چچا کے گھر کے پاس تھا۔ اسے پتہ تھا کہ میرے چچا کو پوسٹ کارڈ ملا تھا اور انہوں نے اپنے بیٹے کو ہمیں لینے شیخوپورہ بھی بھیجا تھا۔ اس نے ہمیں پتہ سمجھایا تو ہم چچا کے گھر پہنچ گئے۔ وہ برآمدے میں بیٹھے تھے۔ آخر کار ہم محفوظ جگہ پر پہنچ ہی گئے۔

''لیکن میری المیہ داستان یہیں ختم نہیں ہوتی۔ میری والدہ کا انتقال 1949 میں ہوا۔ میں اپنے چچا کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ انہوں نے مجھے قبول کیا لیکن میں وہاں ہمیشہ خود کو اجنبی محسوس کرتا تھا۔ خوشی کے تہواروں کے موقع پر وہ مجھے نظر انداز کر کے اپنے بچوں کے ساتھ خصوصی سلوک کرتے تھے۔ اس رویے سے میری روح پر گہرا گھاؤ آیا۔ جب میں بیمار ہوتا تو کوئی میرا پرسان حال نہ ہوتا لیکن خدا غفور و رحیم ہے۔ میں نے تعلیم حاصل کی اور صحافی بن گیا۔ میں نے پہلے امروز اور پھر نوائے وقت کے ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ اب میں ریٹائر ہو چکا ہوں لیکن روزنامہ خبریں میں لکھتا ہوں۔''

گجروال کا دورہ

مسٹر شمشاد کی داستان نے مجھے انتہائی متاثر کیا۔ وہ اس لحاظ سے کہ میں نے پہلے بھی یہ واقعہ سنا تھا لیکن جو تفصیلات انہوں نے مجھے بتائی تھیں وہ سن کر میں ان کے آبائی گاؤں گجروال جانے کا کافی مشتاق ہو گیا۔ شمشاد صاحب نے بتایا تھا کہ ان کا گاؤں کافی بڑا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت گزرنے کے بعد اب یہ مزید بڑا ہو گیا ہو گا۔ دہلی سے میرے ساتھ ہتیش گوسین اور ورندر سنگھ بھی شامل ہو گئے۔ پاکستانی اخبار میں میرے کالم پڑھنے کے بعد سے ہتیش گوسین کے ساتھ میری کافی عرصے سے خط و کتابت ہو رہی تھی۔ ہم تینوں 29 نومبر 2005 کو گجروال پہنچے۔

گجر وال لدھیانہ سے 20 کلو میٹر دور واقع تھا اور ان دنوں یہاں کی آبادی نو ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ہم نے شمشاد کے سکول کا دورہ کیا اور اس رجسٹر کی تصاویر لیں جہاں ان کا نام اور دیگر ریکارڈ درج تھا۔ یہ واقعی ایک بڑا اور تاریخی سکول تھا۔ اس کے بالکل بالمقابل ٹیکنیکل کالج بن چکا تھا۔ چونکہ گاؤں کے سرپنچ کے ساتھ ہمارا رابطہ تھا اس لیے اس نے فوراً ہی بعض بزرگوں کو ہم سے ملوا دیا۔ ان لوگوں کو شمشاد کے والد اور نور دین کا پتہ تو تھا لیکن چونکہ یہ آرائیں محلے میں رہتے تھے اس لیے انہیں شمشاد کے خاندان پر حملے کا آنکھوں دیکھا حال معلوم نہیں تھا۔ البتہ انہوں نے آرائیں محلے میں ہونے والے خونچکاں واقعات کی تفصیل ضرور بتائی۔

عجائب سنگھ

"میں 1932 میں گجر وال میں پیدا ہوا اور سکول داخل ہو گیا۔ یہ سکول 1882 میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ لدھیانہ میں قائم ہونے والے ہائی سکول کے بعد قدیم ترین سکول تھا۔ یہیں سے میرے والد نے میٹرک کیا اور پھر میں نے بھی۔ ہم راجپوتوں کی چنڈل شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جاٹوں کی گرے وال گوت بھی گجر وال سے پھوٹی تھی۔ مسلمان زیادہ تر آرائیں تھے اور کافی تعداد میں رہتے تھے۔ مین بازار میں دکانیں ہندوؤں کی تھیں۔ سکھوں کی بھی بڑی تعداد گاؤں میں آباد تھی۔ حتیٰ کہ جین مت کے پیروکاروں کے بھی متعدد گھرانے تھے۔ یہ سب امن اور بھائی چارے سے رہتے تھے اور ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے۔ آرائیں خوشحال کاشتکار تھے اور ان کی ملکیت میں بڑا رقبہ بھی تھا۔ مجھے سردار خان اور حبیب اللہ کے نام یاد ہیں۔ یہ دونوں میرے کلاس فیلو تھے۔ ہمارے گاؤں کے مسلمان انتہائی شائستہ اور خدا خوف تھے۔ کوئی انتہا پسند نہیں تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کبھی کوئی ہندو راجپوت مسلمان ہوا تھا۔ میں ان دنوں بہت چھوٹا تھا اور ایسی چیزوں سے میری کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ہمارے مسلمان ٹیچر بہت اچھے اور مہربان تھے مثلاً ماسٹر افضل جو قریبی گاؤں سے ہمیں پڑھانے آتے تھے۔ ان کے علاوہ ماسٹر اسماعیل بھی تھے۔ ماسٹر اسماعیل میری زندگی میں آنے والی سب سے مہربان شخصیت تھے۔ وہ دراز قامت اور متاثر کن انسان تھے۔ وہ پانچ وقت کے نمازی تھے اور شاگردوں کی بہت معاونت کرتے تھے۔ وہ ہمارے گھر کسی بھی وقت آ سکتے تھے اور ہم نہایت احترام سے ان کا خیر مقدم کیا کرتے تھے۔ میں آٹھویں جماعت کا طالبعلم تھا۔

"15 اگست 1947 کو جب بھارت آزاد ملک بن گیا تو گاؤں میں منچلوں کا ایک گروہ جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، ڈھول دھمکا کرتے اور گانے گاتے پھر تا رہا۔ یہ جشن کی کیفیت ایک دو روز ہی جاری رہی کیونکہ ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان ہوتے ہی ارد گرد کے دیہات کے جرائم پیشہ سکھوں پر مشتمل جتھوں نے ہمارے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ ہمارے اپنے گاؤں کے بہت کم افراد نے حملوں میں حصہ لیا۔ اس قصے کا سب سے المناک پہلو یہ تھا کہ کچھ مسلمان سکھ مت قبول کرنے پر راضی ہو گئے۔ انہیں ایک گھر میں لا کر امرت دھارا پلایا گیا۔ البتہ اگلے روز قتل عام شروع ہو گیا۔ ایک روز قبل یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ جڑا ہوا اس گاؤں کے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر حملے کیے تھے۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ انہوں نے رائفلیں اور بندوقیں بھی استعمال کی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ کہانی بالکل جھوٹی تھی۔ ہمارے گاؤں کے بعض بزرگوں نے حملہ آوروں کے سامنے مزاحمت کی کوشش کی۔ ان میں میرے والد رنجیت سنگھ بھی شامل تھے لیکن مزاحمت کرنے والوں

کے پاس ایک 12 بور رائفل تھی جبکہ حملہ آوروں کے پاس کئی تھری ناٹ تھری رائفلیں اور طاقتور آتشیں ہتھیار تھے۔ حملہ آوروں کا سرخیل قلعہ رائے پور کا بدنام بدمعاش حاکم سنگھ تھا۔ ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ جب حملہ شروع ہوا تو میراثی ذات کے چند غریب مسلمانوں نے ہمارے گھر میں پناہ لے لی۔ وہ لوگ موت سے اتنے خوفزدہ تھے کہ کچھ کا پیشاب خطا ہو گیا۔ میری ماں بسنت کور نے انہیں کھانا دیا اور ان کی دیکھ بھال کی۔ بہرحال ان کی جان بچ گئی۔ ایک ننھا بچہ دلشاد جس کے والدین قتل ہو چکے تھے بے لباس ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اسے اور دیگر افراد کو میرے والد نے ملیر کوٹلہ پہنچا دیا۔ میں نے آپ کو پہلے بتایا کہ جاٹوں کی گرے وال گوت اسی گاؤں سے شروع ہوئی تھی۔ ان میں سے کچھ مسلمان بھی ہوئے لیکن بیشتر گرے وال جاٹ سکھ ہی تھے۔ اس گوت کا ایک بوڑھا مسلمان خیرو بھی تھا۔ اس کے گھر کا بھی محاصرہ کر لیا گیا چونکہ اس کے پاس بندوق تھی اس لیے اس نے کافی دیر تک مزاحمت جاری رکھی۔ وہ گھر کی چھت پر کھڑا للکارتا رہا 'اوئے گرے والو میں بھی تم میں سے ہوں، تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟' اس کی جرائم پیشہ عناصر نے ایک نہ سنی کیونکہ وہ اس کے خون کے پیاسے تھے۔ آخرکار وہ زخمی حالت میں چل بسا۔

''ماسٹر اسماعیل ہمارے ڈرائنگ کے استاد تھے۔ جب ان کے گھر پر حملہ ہوا تو ان کی اہلیہ حاملہ تھیں۔ حملہ آوروں نے دونوں میاں بیوی کو بھی بے دردی سے مار ڈالا۔ ان کا ایک دس سالہ بیٹا قریبی گھر میں چھپا لیکن ہمارے گاؤں کے ایک بدمعاش نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے اسے ایک ٹانگ سے پکڑ کر اسے چھری سے کئی زخم لگائے۔ اس کی چیخوں کی آوازیں مجھے آج بھی ستاتی ہیں۔ اس کی بہن سرداراں کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ اس کے ہاتھ میں شیر خوار بہن تھی۔ سرداراں کو پکڑ کر دو ماہ تک زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ زیادتی کے باعث اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کی حالت انتہائی دگرگوں تھی۔ پھر ایک روز اس کا بھائی جو نیوی میں تھا اسے ڈھونڈتے وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ پولیس بھی تھی۔ بعد ازاں وہ ٹھیک ہو گئی۔ اس کی شکل آج بھی میری آنکھوں میں زندہ ہے۔ یہ ایک کم عمر لڑکی کے خلاف خوفناک طرز عمل تھا۔ سینکڑوں (مسلمان) خواتین اور لڑکیوں کو نہر پر لے جا کر برہنہ گھمایا گیا اور زیادتی کی گئی۔ البتہ دائی امانت بی بی اور اس کے خاندان کو بخش دیا گیا۔ چونکہ گاؤں میں بچوں کی پیدائش کے لیے اس کی ضرورت تھی اس لیے اسے کچھ نہ کہا گیا۔ وہ اب سے پندرہ سال پہلے انتقال کر گئی۔ اس کا بیٹا بعد ازاں کمپاؤنڈر بن کر یہاں کام کرتا رہا۔ وہ ایک حادثے میں ہلاک ہوا۔ امانت بی بی کی بیٹی استانی بنی اور یہاں سے کچھ فاصلے پر سکول میں پڑھاتی رہی۔ وہ بھی ایک حادثے میں ماری گئی۔ آج امانت بی بی کے نواسے نواسیوں اور پوتوں پوتیوں کی کافی تعداد ہے۔ اب طویل عرصے کے بعد گجر وال کی مسجد دوبارہ آباد ہو گئی ہے۔ ہم سب اس پر خوش ہیں۔ ہمارے ساتھ ان دونوں بہار اور یوپی کے مسلمان رہ رہے ہیں۔ تقسیم پنجاب کے ان سیاہ ایام کے بعد سے گجر وال میں فرقہ وارانہ تصادم کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ مذہب اور سیاست کو آپس میں نہیں ملانا چاہیے۔''

ہرمائل سنگھ

''ہمارا تعلق بنیادی طور پر گجر وال سے ہی ہے لیکن ہمارے خاندان کو طویل عرصہ قبل مغربی پنجاب کے علاقے عارف والہ میں اراضی الاٹ ہوئی اور میں وہیں پلا بڑھا۔ میں 1946 میں گجر وال واپس آ گیا۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد میں گاؤں کے سکول

میں ہی پڑھاتا ہوں۔ ہاں گاؤں میں ایک ممتاز مسلمان نوردین تھا لیکن اس کا خاندان گاؤں کے دوسرے حصے میں مقیم تھا۔ ان دنوں بھی گاؤں بہت بڑا اور خوب پھیلا ہوا تھا۔ تقسیم کے وقت میرا بڑا بھائی اور دیگر اہل خانہ بحفاظت عارف والہ سے گجروال پہنچ گئے۔ مسلمان انہیں سرحد پر چھوڑنے آئے جہاں سے وہ گلے ملنے کے بعد جدا ہو گئے۔ ان پر دوران سفر کوئی حملہ نہیں کیا گیا لیکن سکھوں میں ایک کالی بھیڑ مندر سنگھ نے راستے میں ایک مسلمان پولیس اہلکار کا گلا کاٹ دیا جس کے بعد ایک حملہ ہوا بصورت دیگر سفر بخیریت ہی گزرا۔

''میں نے اپنے گاؤں اور پورے علاقے میں مسلمانوں کا ہولوکاسٹ دیکھا تھا۔ یہاں رونما ہونے والے واقعات کی سطح کا مغربی پنجاب میں ہونے والے واقعات سے کوئی موازنہ نہیں۔ یہاں (مشرقی پنجاب) تشدد کا بازار بہت زیادہ گرم رہا۔ بدمعاشوں کے جتھوں، جرائم پیشہ عناصر اور شرابیوں نے حملے کیے۔ وہ لوگ لوٹ مار کے مواقع ڈھونڈ رہے تھے اور عورتوں کے بارے میں گندی سوچ رکھتے تھے۔ انہی عناصر نے سنگین جرائم کیے۔ وہ مسلمان جنہوں نے سکھ مت قبول کیا وہ ہمارے گھر میں روپوش تھے۔ پھر ہمارے گاؤں کا ایک برا انسان جس کا نام 'بند' Bind تھا وہ رائے پور کے لوگوں کو ہمارے گھر لے آیا۔ ان لوگوں نے میرے اور عجائب سنگھ کے والد کو قابو کر لیا۔ انہوں نے ہمارے گھر میں گھس کر تمام مسلمان مردوں، خواتین اور بچوں کو چھت کی منڈیر پر قطار میں کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ پھر انہیں نیزوں اور بھالوں کے وار کر کے نیچے گرا دیا گیا۔ نیچے دیگر بدمعاش نیزوں کی انیاں اوپر اٹھائے کھڑے تھے۔ بچوں کو ہوا میں اچھالا گیا اور لاشوں کے گرد بھنگڑے ڈالے گئے۔ ایک لڑکا صدیق جسے میں جانتا تھا کے کئی ٹکڑے ہوئے۔ یہ کوئی مذہبی تحریک نہیں تھی۔ یہ صرف لوٹ مار اور خواتین کی بے حرمتی کی خواہش تھی۔''

ہوشیار پور

4 جنوری 2005 کو وکی اور میں نے ہوشیار پور کا دورہ کیا۔ 1947 کے دوران شہر اور دیہات میں یہاں مسلمان اقلیت میں ہی تھے۔ ہم مقامی کانگریس پارٹی کے دفتر گئے تو ضلعی کانگریس کمیٹی کے جنرل سیکرٹری مسٹر رجنیش ٹنڈن نے ہمیں گھر پر مدعو کیا۔ ان کے والد جن کا نام مجھے پوچھنا یاد نہ رہا نے اپنے شہر کے بارے میں یہ کہانی سنائی:

''جولائی کے آخر تک ہوشیار پور میں امن ہی رہا۔ حفیظ ہوشیار پوری اور طفیل ہوشیار پوری یہاں کے معروف شعراء تھے۔ ان کے گھر ہمارے مکان سے زیادہ دور نہیں تھے۔ یہاں کبھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پھر سکھ جتھوں نے علاقے میں گشت شروع کر دیا۔ شہر اور پورے ضلع میں مسلمان نمایاں تعداد میں آباد تھے۔ 18 اگست تک کوئی سنگین حملہ یہاں نہیں ہوا۔ پھر مسلمانوں نے یہاں سے نکلنا اور پاکستان کو جانا شروع کر دیا۔ اس ضلع میں زیادہ تر انسانیت سوز واقعات ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد ہوئے۔ اس کے درمیانی عرصے میں لوگوں کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ پھر پاکستان اور بھارت کی حکومتوں نے باہم تعاون کا فیصلہ کیا جس کے بعد پاکستانی فوج یہاں سے مسلمانوں کو اپنی نگرانی میں نکالنے لگی۔

''تقسیم کے دوران دنگا فساد قطعی غیر ضروری تھا۔ اصل میں سیاستدان اقتدار کے بھوکے تھے۔ ان کے عزائم نے پرانے پنجاب (متحدہ) کو دفن کر دیا۔ جب سب لوگ مل کر رہ رہے تھے تو صورتحال زیادہ خوبصورت تھی۔ ہمارے

گھر میں ایک مسلمان بزرگ (ولی اللہ) کی قبر ہے جہاں ہم ہر جمعرات کو دیا جلاتے ہیں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ روحانی شخصیات کا احترام کرنا چاہیے۔"

کیپٹن (ر) محمد شفیع

کیپٹن (ریٹائر) محمد شفیع نے ایسے مسلمان عمائدین کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جن کی ہوشیار پور میں املاک تھیں اور وہ اپنے دیہات چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان سب کو میکریاں پولیس سٹیشن میں 23 اگست کو طلب کیا گیا اور ہوشیار پور کے سکھ اور ہندو پولیس ملازمین نے انہیں یہاں سے نکلنے کی دھمکی دی۔ اس سازش میں ڈی ایس پی چودھری دلیپ سنگھ اور سب انسپکٹر پرمانند بھی شامل تھے۔ جب محمد شفیع اور ان جیسے دیگر مسلمانوں نے دباؤ کے سامنے مزاحمت کی تو انہیں پولیس حراست میں لے لیا گیا۔ پھر رہائی کے لیے ان سب سے ہزاروں روپے کا تاوان وصول کیا گیا۔ اس تاوان میں سے اپنا حصہ نہ ملنے پر نالاں ایک کانسٹیبل نے محمد شفیع کو بتایا کہ اگر ہم لوگ تاوان نہ دیتے تو ہم سب کو جان سے مارنے کا بھی منصوبہ تھا (Shafi,1993:162-5)۔ یہ کہانی تو یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ ہوشیار پور سے تمام مسلمانوں کو جبراً پاکستان بھیجا گیا۔

ہوشیار پور کے دیہی علاقے

احمد سلیم نے 30 دسمبر 2005 کو ہوشیار پور کے گاؤں سے ہجرت کر کے 1947 میں شیخوپورہ کیمپ آنے والے مہاجر حاجی مختار احمد خان کا انٹرویو کیا۔

حاجی مختار احمد خان

"میں ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں پنڈوری بھاوا میں 8 جنوری 1929 کو راجپوت گھرانے میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں نو نسلوں پہلے ہمارے ہی آباؤ اجداد نے آباد کیا تھا۔ کسی نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ ہمیں کبھی بزور طاقت یہاں سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہمارے ہندو کھتریوں سے گہرے مراسم نہیں تھے۔ جب کہیں ہم ہندو بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے ان کے گھروں میں جاتے تھے تو ان کی مائیں ہمیں باورچی خانوں کے اندر داخل ہونے سے روک دیتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مسلمانوں کے وجود سے کچن ناپاک ہو جائے گا اور انہیں پانی سے دھونا پڑے گا۔ دوسری طرف سکھوں کے ساتھ ہمارے تعلقات مثالی تھے۔ میٹرک کرنے کے بعد میں پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ مجھے ہاکی کا زبردست کھلاڑی ہونے کے ناتے بھرتی کیا گیا۔ انگریز پولیس افسر مسٹر لنکن نے مجھے بھرتی کیا تھا۔ میں جالندھر تعینات تھا کہ مسلمانوں نے انتخابی مہم کے دوران جلوس نکالے۔ ہمیں ان مسلمانوں سے نمٹنے کے لیے ڈنڈے دیے گئے جو اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے تھے۔ میں نے انکار کر دیا اور استعفیٰ دے کر گھر چلا آیا۔ بعد ازاں والد صاحب نے مجھے محکمہ امداد باہمی میں سب انسپکٹر لگوا دیا۔ 1946 میں میں وہاں سے ڈسچارج ہو گیا۔ حالات نہایت کشیدہ تھے۔ مسلمانوں پر حملوں کا سلسلہ تو جولائی سے شروع ہو چکا تھا اور چھوٹے پیمانے پر مسلسل حملے جاری رہے۔ سکھ جتھوں نے ہمارے بھی علاقے میں حملوں کا آغاز کر دیا۔

"18 اگست کو عید الفطر کا دن تھا۔ ہمارے گاؤں پر پہلا حملہ 19، 20 اگست کی درمیانی شب کو ہوا۔ ہمارا گاؤں چھوٹا سا تھا۔ مجھ پر بھی گنڈاسے کا وار کیا گیا اور میرے دائیں ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں۔ میرے کندھے پر گہرے زخم آئے اور کان بھی زخمی ہوا۔ مجموعی طور پر مجھے 4 زخم لگے۔ میں زخمی ہو کر زمین پر گرا تو بھی مجھ پر دوبار خنجروں سے وار کیے گئے۔ زیادہ خون بہنے سے میں بے ہوش ہو گیا۔ اس دوران پتہ نہیں کیسے افواہ پھیلی کہ فوج آ گئی ہے چنانچہ حملہ آور بھاگ نکلے۔ اگلے روز میں نے ہر طرف لاشیں ہی لاشیں دیکھیں۔ مسلمانوں کی طرف سے بھی کسی نے گھریلو ساختہ رائفل سے گولیاں چلا کر دو سکھوں کو ہلاک کیا تھا۔ میرے والد نے کھیتوں میں چھپ کر جان بچائی۔ پھر پولیس آ گئی۔ وہ لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جانا چاہتے تھے۔ پولیس نفری میں ایک مسلمان کانسٹیبل بھی تھا جو غیر مسلح تھا، باقی سب کے پاس اسلحہ تھا۔ اس نے موقع پا کر ہمیں بتایا کہ ہم لاشیں پولیس کو نہ دیں کیونکہ پھر تمہارے ہی کچھ لوگوں کو سکھوں کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ لہٰذا پولیس سے کہو کہ ہم کوئی مقدمہ درج نہیں کرانا چاہتے۔ پھر اس وقت والد صاحب گھر واپس آ گئے۔ یہ صبح 10 بجے کا وقت تھا۔ وہ علاقے کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ وہ کوئی مقدمہ درج کرانا چاہتے ہیں نہ لاشوں کو پوسٹمارٹم کے لیے بھجوایا جائے گا۔ پھر ہم نے قبریں کھود کر میتیں دفنا دیں۔ ہم گاؤں میں 21 اور 22 اگست تک ٹھہرے پھر بلوچ رجمنٹ کے فوجی آئے اور کہا کہ ہم یہاں مزید قیام نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمیں بہر صورت پاکستان جانا ہو گا۔ ہمیں ہوشیار پور کے سول ہسپتال پہنچایا گیا جہاں بے شمار زخمی موجود تھے۔ مرہم پٹی کے بعد ہم ہسپتال میں ہی رہے۔ کسی نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم کسی سے ٹیکہ نہ لگوائیں کیونکہ یہ زہر آلود ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد میرا کزن، بھتیجا اور میں اسلامیہ سکول میں قائم کیمپ کے لیے روانہ ہوئے جو یہاں سے محض ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ پورا شہر جلا ہوا تھا اور کرفیو نافذ تھا لیکن لوگ اپنے بچاؤ کے لیے ہر خطرہ مول لے رہے تھے۔

"کیمپ میں خاکسار تحریک کا شفیع سالار انچارج تھا۔ خاکسار تحریک کا ایک رضاکار اتنے جذبے کے ساتھ بیماروں اور زخمیوں کی خدمت کر رہا تھا کہ میرا ایمان ہے کہ اسے مرنے کے فوراً بعد جنت ملی ہو گی۔ وہ گوشت سے یخنی بنا کر ہمیں پلاتا۔ 26 اگست کو لاہور سے ایک بس ہمیں لینے آئی۔ پہلے زخمیوں کو بس میں بھیجنے کو ترجیح دی گئی۔ فوج ہمارے ساتھ تھی۔ رات ہم جالندھر پہنچے۔ 27 اگست کو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ہم اس حالت میں بھی لوگوں کو پیدل چلتے دیکھ رہے تھے۔ واہگہ پہنچنے پر ہم نے سکھ کی سانس لی۔ ہم نے لاہور میں چند ہفتے قیام کیا۔ پرانی انار کلی میں ہمارا ایک رشتہ دار رہتا تھا۔ ہم کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہے۔ وہاں ہر طرف ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہم ٹولنٹن مارکیٹ میں لوگوں کو لوٹ مار کرتے دیکھتے تھے۔ کچھ ہفتوں کے بعد مجھے شیخوپورہ میں محکمہ کوآپریٹو میں ملازمت مل گئی۔ زندگی مشکل ضرور ہے لیکن گزارنا پڑتی ہے۔"

کرنل (ر) عطا محمد ڈوگر

"میں جنوری 1930 کو ضلع ہوشیار پور کی تحصیل دسوہہ کے گاؤں بانیاں میں پیدا ہوا۔ یہ ایک بڑا گاؤں تھا جہاں ڈوگر برادری کی اکثریت تھے۔ گاؤں کی کل آبادی تین ہزار کے لگ بھگ ہو گی۔ خطے میں ڈوگر قبیلہ کافی بااثر تھا۔ انگریزوں کے ریکارڈ

میں ڈوگروں کو بے خوف، خود مختار اور زراعت پیشہ قرار دیا گیا تھا۔ ہمارے ارد گرد ڈوگروں کے 44 دیہات تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں جبکہ سکھ پنجاب پر حکومت کر رہے تھے وہ بھی ہمیں ڈرانے دھمکانے کی جرأت نہ کر سکے۔ ہمارے ارد گرد سارے گاؤں سکھوں کے تھے۔ البتہ مشرقی جانب ہندوؤں کے معدودے چند گاؤں تھے۔ علاقے کا ایک اور بڑا قبیلہ اعوانوں کا تھا۔ سکھوں کے ساتھ ہمارے تعلقات شاندار تھے۔ وہ میرے والد کی انتہائی عزت کرتے تھے اور اپنی جائیدادوں وغیرہ کے تنازعات ثالثی کے لیے میرے والد چودھری فضل کریم (الہٰی) کے پاس لایا کرتے تھے۔ جو اپنی غیر جانبداری اور وقار کی وجہ سے معروف تھے۔ ہمارے گھر کے پاس پانچ سکھ بھائیوں کا ایک خاندان رہتا تھا۔ ان میں سے ایک سکھ میرے والد کا پگڑی بدل بھائی بن گیا۔ ایک بار ان میں جائیداد کا کوئی تنازعہ پیدا ہو گیا تو وہ فیصلے کے لیے میرے والد کے پاس آئے۔ ان کا فیصلہ ایک بھائی کے خلاف جاتا تھا لیکن انہوں نے دل وجان سے قبول کیا۔ دسویہ تحصیل میں معاملات تقسیم کے اعلان کے بعد بھی معمول پر رہے لیکن پھر سکھ جتھوں نے حملے شروع کر دیے۔ انہوں نے ہمارے گاؤں پر بھی دھاوا بولا جو پہلے ہم نے پسپا کر دیا۔ پھر وہ دوسری مرتبہ آئے۔ ہمارے گاؤں والے بے خبری میں مارے گئے۔ اس حملے میں 20 سے 25 افراد جن کی اکثریت بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی تھی ہلاک ہوئے۔ چنانچہ گاؤں خالی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ ہم 18 اگست کو عید کے روز روانہ ہوئے اور قریبی گاؤں بھاگراں جہاں تمام ڈوگر جمع ہو رہے تھے پہنچ گئے۔ یہ میرے ننھیال کا گاؤں تھا۔ پھر چار، پانچ روز بعد ہم واپس اپنے گاؤں بانیال آئے کیونکہ سکھوں نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ وہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے تاہم ہمارے گھر ہماری غیر موجودگی میں نذر آتش کیے اور لوٹے جا چکے تھے۔ ہم ایسے بدتر حالات میں بھی وہاں مقیم رہے لیکن کچھ دنوں بعد سہ پہر ساڑھے تین بجے سکھ جتھوں نے ایک بار پھر گاؤں کا محاصرہ شروع کر دیا۔ اس بار ہمارے لوگوں نے مزاحمت کی بجائے فرار کی راہ لی اور کھیتوں میں جا چھپے۔ یہ ستمبر کے شروع کا کوئی دن تھا۔ میرے ماں باپ بھاگ رہے تھے کہ گھڑ سواروں نے انہیں آن لیا۔ وہ میری والدہ پر وار کرنا ہی چاہتے تھے کہ میرے والد نے چیخ کر کہا 'رکو۔' انہوں نے میرے والد کو دیکھ کر پہچان لیا۔ اصل میں حملہ آوروں کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس کے ساتھ ہمارے قریبی تعلقات تھے۔ وہ گھوڑوں سے نیچے اتر آئے اور میرے ماں باپ کے قدموں میں گر کر معافی کے خواستگار ہوئے۔ یوں میرے والدین کی جان بچ گئی۔

''لیکن ہمارے گاؤں والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ نا چاہتے تھے چنانچہ ہم نے بھی خود کو مسلح کر کے ارد گرد کے ہندو اور سکھ دیہات پر حملے شروع کر دیے۔ ان حملوں میں 70 سکھ اور ہندو مارے گئے۔ یہ کھیل کچھ عرصے تک جاری رہا پھر ہم نے گاؤں چھوڑ کر پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے ہم ہریانہ آئے جہاں راجپوت مسلمان ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ پھر کارواں دسویہ گیا اور بالآخر ہم ہوشیار پور کے پناہ گزین کیمپ پہنچ گئے۔ وہاں کئی ٹرکوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ٹرکوں پر گنجائش سے زیادہ رش تھا اور کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ پہلے بچوں، بوڑھوں اور خواتین کو سوار کرایا گیا پھر دیگر لوگ بھی چھلانگ لگا کر چڑھ گئے۔ بہر حال بلوچ رجمنٹ کے سپاہی ہمارے ساتھ تھے۔ یہ قافلہ پہلے جالندھر گیا جہاں ہم نے ایک رات قیام کیا پھر اگلی منزل امرتسر تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہم ستمبر کے وسط میں دریائے بیاس کے پل پر پہنچے۔ موسلادھار بارشیں ہو رہی تھیں اور دریا کے کنارے انتظار کرنے والے کئی افراد لہروں کی نذر ہو گئے۔ دریا

میں سینکڑوں افراد کی لاشیں بہتی نظر آتی تھیں۔ یہ ایک ہولناک منظر تھا۔ امرتسر میں ٹرک سوار بچہ پیاس کے باعث جاں بہ لب تھا لیکن سکھوں نے اسے مفت میں پانی دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بچے کے والد کو ایک گلاس پانی کے لیے 300روپے دینا پڑے۔

"میرے بڑے بھائی، نانا، دادا، چچا، ماموں اور دیگر نوجوان رشتہ دار نومبر کے شروع تک ہوشیارپور کیمپ میں مقیم رہے۔ پھر انہوں نے پاکستان کے لیے سفر کا آغاز کر دیا۔ راستے میں کبھی کبھار کچھ ڈوگر نوجوان قافلے سے الگ ہو کر قریبی سکھ اور ہندو دیہات پر حملے بھی کرتے۔ پھر بھارتی فوج آگئی اور فائرنگ شروع کر دی۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے 100 افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے لیکن ہم نے آخر تک کسی ہندو یا سکھ کو بھی نہ بخشا۔ میرے خیال میں ہلاکتوں کی تعداد برابر ہی رہی۔"

کانگڑہ

ضلع کانگڑہ میں مسلمان چھوٹی اقلیت میں تھے ــ کل آبادی کا صرف 48 فیصد۔ پہاڑی ترائیوں پر آباد اس علاقے میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ جب میں نے اکتوبر 1999 میں انٹرویو شروع کیے تو بزرگ شاعر اور آرٹسٹ امرناتھ سہگل نے مجھے کانگڑہ سے متعلق یہ تفصیل بتائی۔

امرناتھ سہگل

"میرا تعلق شمالی پنجاب کے ضلع کیمبل پور (اٹک) سے تھا۔ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے 1939 میں لاہور آیا اور 1941 میں یہاں سے گریجوایشن کی ڈگری حاصل کی۔ 1947 میں لاہور میں جلاؤ گھیراؤ اور چھرا گھونپنے کے واقعات میں اضافے کے بعد میں مجھے لاہور سے جانا پڑا۔ لاہور سے مجھے انتہائی محبت تھی۔ لیکن جب میں مشرقی پنجاب آیا تو صورتحال یہاں بھی خراب تھی۔ اگست اور ستمبر کے درمیان کانگڑہ۔ کولو وادی میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ 35 ہزار میں سے صرف 9 ہزار افراد زندہ بچنے میں کامیاب ہوئے۔ دریائے بیاس لاشوں سے بھرا تھا اور کئی ہفتے تک فضا میں لاشوں کی سڑانڈ پھیلی رہی۔ میں ان دنوں کئی ہفتے تک بخار میں مبتلا رہا اور رات کو ڈراؤنے خواب دیکھتا۔ بالخصوص بچوں کو نیزوں پر پرونے اور عورتوں کو ٹانگوں سے چیرنے کے مناظر طویل عرصے تک آنکھوں میں گھومتے رہے۔ آج بھی مجھے یہ منظر ڈراتے ہیں۔"

انٹرویوز

امرناتھ سہگل، نئی دہلی 20 اکتوبر 1999

چودھری ریاست علی، حمید اختر، سید محمد اسلام، 18، 19 مئی 2002

انور علی، اسلام آباد 15 اپریل 2003

میاں جلال دین، لاہور 22 اپریل 2003

ہنس راج کھتری، سدھوان بیت، لدھیانہ، 17 مارچ 2004

سلجا سائی، چندی گڑھ 20 مارچ 2004

ملک محمد اسلم، لاہور 17 دسمبر 2004

محمد عبداللہ شمشاد، ملتان 21 دسمبر 2004

وکی کے کلاس فیلو کا والد، گاؤں تھوماجرا، رنجیت سنگھ تھوماجرا، لدھیانہ 4 جنوری 2005

موہن لال جھانجی، بلدیو ورما، مولانا حبیب الرحمان، لدھیانہ جنوری 2005

رجنیش ٹنڈن کے والد، ہوشیار پور 6 جنوری 2005

عجائب سنگھ، ہرمائل سنگھ، گجر وال، لدھیانہ 29 نومبر 2005

حاجی مختار احمد خان، شیخوپورہ 30 دسمبر 2005

کرنل (ر) عطا محمد ڈوگر، لاہور 10 مئی 2007

References

Afzal. Muhammad. *Dastan-e-Sandham*. Islamabad: Chaudhry Muhammad Ajmal (no date given).

Husain. Syed Wajahat, *Memories of a Soldier: 1947 Before, During, After*, Lahore: Ferozsons (PVT) Ltd. (2010).

Khan, Muhammad Ayub, *Tarikh-i-Pakistan Aur Jullundur* (*The Pakistan Movement and Jullundur*), Lahore: Asatair, (2002).

Roberts, 1995, *Eminent Churchillians*, London: Phoenix Books.

Shafi, Mohammad (rtd. Captain), '*Statement of Capt. Mohd. Shafi, Resident of Mansurpur, Police Station Makerian, Distt. Hoshiarpur*' in *The Journey to Pakistan: A Documentation on Refugees of 1947*, 1993, Islamabad: National Documentation Centre.

19

انبالہ ڈویژن اور دہلی

انبالہ پرانے پنجاب کا انتہائی مشرقی جانب بلند ترین انتظامی یونٹ تھا۔ یہ ڈویژن انبالہ، حصار، روہتک، کرنال، گڑ گاؤں اور شملہ کے اضلاع پر مشتمل تھی۔ مسلمان اقلیت کی آبادی کا تناسب پندرہ فیصد تھی۔ اگرچہ بیشتر علاقے ہندی بولنے والے (کئی مقامی لہجوں سمیت) افراد پر مشتمل تھے لیکن انبالہ اور شملہ کے اضلاع میں پنجابی بولنے والے بھی نمایاں تعداد میں رہتے تھے۔ خان بہادر خدا بخش نے 4 اکتوبر 1947 کو انبالہ ڈویژن، جالندھر اور لدھیانہ کی صورتحال پر ایک طویل رپورٹ تحریر کی ہے۔ وہ ان علاقوں میں آتے جاتے رہتے تھے اور انہوں نے مقامی مسلمانوں سے معلومات جمع کیں۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ ان علاقوں میں کس سرکاری حیثیت میں گئے لیکن یہ واضح ہے کہ وہ تقسیم سے قبل کسی اعلیٰ عہدے پر تھے یا پاکستان کی طرف سے وہاں بھیجے گئے۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ مسلمان وہیں رہنے کے خواہاں تھے لیکن انہیں جبراً نکال دیا گیا۔ خان بہادر خدا بخش نے رپورٹ میں لکھا کہ زیادہ تر ریاست پٹیالہ کے مسلح سکھ انبالہ ڈویژن کے مسلمانوں پر حملوں میں ملوث تھے۔ یہاں اس رپورٹ کے کچھ اقتباسات پیش خدمت ہیں:

ضلع انبالہ

ضلع انبالہ میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 32 فیصد تھا۔ روپڑ تحصیل میں مسلمانوں کے کئی دیہات تھے۔ ملک خدا بخش کی رپورٹ کے چند چیدہ چیدہ نکات اس طرح سے تھے۔

1. انبالہ کینٹ میں مسلمانوں کی دکانوں کی منظم طریقے سے لوٹ مار جاری تھی۔ ایسے تمام واقعات میں پولیس جو زیادہ تر غیر مسلموں پر مشتمل تھی نے حصہ لیا۔ اگرچہ لوٹ مار کرنے والوں کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم تھا لیکن اس حکم پر عملدرآمد صرف ڈپٹی کمشنر مسٹر گرے وال نے کیا، باقی تمام ماتحت عملہ اس کی خلاف ورزی پر ہی کمربستہ رہتا۔
2. تحصیل روپڑ کے گاؤں سیسواں میں فوج کی وردی میں مسلح افراد دیہاتیوں کے پاس آئے اور کہا کہ وہ انہیں کورالی کیمپ میں لے جائیں گے لیکن اس آڑ میں انہوں نے ان میں سے بیشتر کو ہلاک کر دیا۔ ایک چھوٹے سے علاقے میں ایک فوجی کپتان نے 300 مسلمانوں کی لاشیں دیکھیں۔
3. گھاگھر پل کے قریب پٹیالہ سے آنے والے مسلمانوں کے قافلے پر مسلح سکھ جتھے نے حملہ کر دیا۔ مسلمان لڑکیوں نے عزت بچانے کے لیے دریا میں چھلانگیں لگا دیں۔

4۔ کھرار تحصیل میں بھیریلی گاؤں جہاں بیشتر آبادی مسلمان سادات کی تھی پر مسلح سکھ جتھوں نے حملہ کر دیا۔ (کہا جاتا ہے کہ حملہ آور پٹیالہ ریاست سے آئے) اور کئی افراد کو قتل کر دیا۔ نوجوان سادات لڑکیوں نے آبرو بچانے کے لیے کنوؤں میں چھلانگ لگا دی لیکن انہیں وہاں سے نکال کر ان کی بے حرمتی کی گئی (2003: 1993)۔

سید قمر الزمان شاہ

''میرے خاندان کی سیاسی وابستگی مجلس احرار سے تھی اور انبالہ میں احرار کا کافی اثر ورسوخ تھا۔ ہمارا یہ ہمیشہ سے مؤقف تھا کہ ہندوستان کی تقسیم سے مسلمان تقسیم ہوں گے۔ انبالہ شہر میں مجلس احرار کو کافی پذیرائی حاصل تھی۔ وسط اکتوبر میں میرے والد نے محسوس کر لیا کہ انبالہ میں مزید قیام کرنا ممکن نہیں کیونکہ پاکستان سے ہزاروں ہندو اور سکھ آرہے تھے۔ ان غیر مسلم پناہ گزینوں میں سے کچھ نوجوان پنجاب میں رہنے والے مسلمانوں سے انتقام لینے کے درپے تھے اور روز بروز مسلمانوں پر حملوں کے واقعات بڑھ رہے تھے۔ کانگریس کے مقامی رہنما احرار والوں کے خیر خواہ تھے۔ انہوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم چلے جائیں اور حالات سازگار ہونے پر واپس آ جائیں۔ دیہی علاقوں سے انبالہ شہر آنے والے مسلمان بہت بری حالت میں تھے۔ بارشوں اور راستے میں حملوں کی وجہ سے کئی دیہاتی مسلمان زخمی یا بیمار تھے۔ کئی افراد کیمپوں میں یا ریلوے سٹیشن پر دم توڑ گئے۔ فوج کی سکیورٹی کی وجہ سے ہم پر راستے میں کوئی حملہ نہ کیا گیا۔''

انبالہ کے دیہی علاقے

چودھری عبدالوحید سے میری ملاقات 1970 کی دہائی میں سٹاک ہوم میں ہوئی۔ وہ سٹاک ہوم یونیورسٹی کے انٹرنیشنل گریجویٹ سکول میں زیر تعلیم تھے جبکہ میں پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ میں تھا۔ انہوں نے تحصیل روپڑ میں 1947 میں مسلمانوں اور اپنے خاندان کے جانی نقصان کی روح فرسا تفصیل سنائی۔ 20 دسمبر 2004 کو ہماری دوبارہ ملاقات کئی برسوں کے بعد ملتان میں ہوئی جہاں میں نے اس موضوع پر ان کے تاثرات قلمبند کیے۔

چودھری عبدالوحید

''1947 میں میری عمر چھ سال تھی۔ ہم انبالہ کی تحصیل روپڑ کے چھوٹے سے گاؤں ڈنگولی میں رہتے تھے۔ (ان دنوں ضلع روپڑ بھارتی ریاست پنجاب میں جبکہ انبالہ شہر ریاست ہریانہ میں واقع ہے) ہمارے گاؤں میں گوجر برادری کی اکثریت تھی اور ہم بھی اسی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ارد گرد کے دیہات میں بھی گوجروں کی اکثریت تھی۔ ڈنگولی میں ہندوؤں بالخصوص اچھوت ذات کے ہندوؤں کے بھی کچھ افراد رہتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں کوئی دکان نہیں تھی البتہ قریبی گاؤں کنولی میں ایک ہندو کی دکان ضرور تھی۔ ہم کنولی میں ہی ایک سکول میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ مجھے یہ پتہ نہیں کہ ہمارے خاندان نے کب اسلام قبول کیا لیکن میرے والد سے تین نسلوں پہلے تک ہم مسلمان ہی تھے۔ تقسیم کے وقت میرے والد شملہ میں ملازم تھے جبکہ میری والدہ اور ہم بہن بھائی سب گاؤں میں رہتے تھے۔ بعد میں مجھے بتایا

گیا کہ ہمارے بزرگوں کو یقین تھا کہ روپڑ اور ہوشیار پور پاکستان میں شامل ہوں گے لیکن پھر حملے شروع ہو گئے اور ہمیں ڈنگولی گاؤں سے نکل کر کھلی جگہ پر قبرستان میں منتقل ہونا پڑا۔ وہاں اردگرد کے ہزاروں مسلمانوں نے بھی پناہ لے رکھی تھی۔ ہم وہاں طویل عرصے تک مقیم رہے۔ ہمارے مویشی بھی ہم سے دور نہ گئے اور اردگرد پھرتے رہے۔ ہم اس عارضی کیمپ میں کافی خطرات محسوس کرتے رہے تھے کیونکہ کیمپ کی سکیورٹی پولیس یا کسی حکومتی ادارے کے سپرد نہیں تھی۔ ہمارے پاس کوئی آتشیں اسلحہ بھی نہیں تھا۔ البتہ ہمارے کاریگروں نے نیزے، چاقو اور گنڈاسے ضرور تیار کر لیے تھے۔

"ایک روز سکھ فوج اور ہندو اسسٹنٹ کمشنر اس قبرستان میں آئے اور ہمیں ہر قسم کا اسلحہ جمع کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بدلے ہمیں تھوڑی دور واقع کورالی گاؤں میں قائم کیمپ میں بحفاظت پہنچانے کا یقین دلایا گیا۔ ہمارے بڑے یہ فیصلہ ماننے سے گریزاں رہے لیکن پھر وہ مان گئے۔ یہ ایک چال تھی۔ سکھ جتھے قریبی کھیتوں میں چھپے تھے۔ اس کے بعد ہم کورالی کیمپ کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہمیں گھنے جنگلوں، پہاڑیوں اور نالوں سے گزرنا پڑا۔ جب ہم روانہ ہوئے تو موسم برسات شروع ہو چکا تھا۔ مجھے میرے ماموں نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔ میری والدہ، پھوپھی، دو بھائی، بہن اور دیگر رشتہ دار اکٹھے چل رہے تھے۔ راستے میں ہمیں ایک ندی میں اترنے کا حکم دیا گیا۔ یہ ندی کہیں کہیں سے کافی گہری تھی اور کچھ خواتین اور بچے پانی میں ڈوبنے لگے۔ ہمارے پاس بھنے چنوں اور مکئی کے دانوں کے سوا کچھ کھانے کو نہیں تھا۔ راستے میں فوجیوں نے ایک بار پھر ہمارے پاس اسلحے کی تلاشی لی اور حکم دیا کہ زیورات ان کے حوالے کر دیے جائیں۔ اسسٹنٹ کمشنر نے کہا کہ کورالی کیمپ پہنچتے ہی زیورات واپس کر دیے جائیں گے۔ راستے میں کہیں کہیں خواتین پر حملہ کر کے ان کے کانوں میں طلائی بالیاں بے دردی سے نوچ لی گئی تھیں جبکہ کلائیاں بھی زخمی کر دی گئیں۔ میری پھوپھی نے بھی ہاتھ میں سونا پہن رکھا تھا اور کسی نے ان کا ہاتھ کاٹ لیا۔ کچھ دیر بعد کہا گیا کہ ندی سے نکل کر خشکی پر چلو۔ تیز بارش ہو رہی تھی۔ میرے چچا دباؤ برداشت نہ کر سکے اور خوفزدہ ہو کر اونچی گھاس اور جھاڑیوں کی طرف بھاگ نکلے۔ ہم نے دوبارہ کبھی ان کی شکل نہیں دیکھی۔ ان کا بیٹا بھی جھاڑیوں کی طرف بھاگا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

"اس عرصے کے دوران سکھوں کے جتھے ہم پر مسلسل حملے کرتے رہے۔ خواتین اور بچیاں اغوا کر لی گئیں۔ یہ قافلہ کئی کلومیٹر طویل تھا اس لیے حملے مختلف جگہوں پر ہوتے تھے۔ فائرنگ بلا امتیاز کی جاتی تھی اور گولیاں لگنے پر لوگ گرتے رہتے۔ آخرکار ہم کورالی کیمپ میں پہنچ گئے۔ بارش اب بھی جاری تھی۔ ہزاروں افراد جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ کئی خواتین اور بچے طغیانی میں ڈوب چکے تھے۔ صرف ایک تہائی قافلہ کورالی پہنچ سکا۔ کورالی مہاجر کیمپ پاکستان کی حکومت کے ریکارڈ میں نہیں تھا اس لیے ہمیں وہاں 3 ماہ تک انتظار کرنا پڑا۔ خوراک کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور لوگوں کو اپنے کھانے پینے کا انتظام خود کرنا پڑتا تھا۔ اردگرد کے دیہات سے ہمیں صرف مونگ پھلی خریدنے کو ملتی تھی۔ گندگی کے باعث صورتحال انتہائی بدترین تھی۔ صاف پانی دستیاب نہیں تھا جبکہ ٹائلٹ گندے تھے۔ حشرات الارض ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے۔ طبی سہولتوں کا کوئی تصور تک نہیں تھا۔ ہزاروں افراد ہیضے، اسہال، ٹائیفائیڈ، نمونیے اور دیگر امراض کے باعث مارے گئے۔ مرنے والوں میں میری والدہ بھی شامل تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی میت زمین پر پڑی تھی اور وہ مجھے کوئی جواب نہیں دے رہی تھیں۔ میں رونے لگا تو مجھے تسلی دی گئی کہ ماں صرف سو رہی تھی۔

"آخر کار معاملہ حکومت پاکستان کے نوٹس میں لایا گیا اور ہمیں لانے کے لیے ٹرک بھیجے گئے۔ گاؤں سے نکلنے کے تین ماہ بعد ہم والٹن مہاجر کیمپ پہنچے۔ ان ہزاروں، لاکھوں مہاجرین میں سے صرف ایک چوتھائی تعداد پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ جب میرے والد کو پتہ چلا کہ ڈنگولی سمیت دیگر دیہات کو جلا دیا گیا ہے تو وہ شملہ سے براہ راست لاہور پہنچ گئے۔ وہ بھی پہلے یہ سمجھتے رہے کہ ہمارا گاؤں پاکستان میں شامل ہو گا اس لیے وہ برے حالات کی پیشگی کوئی تیاری نہ کر سکے۔ وہ ہر روز والٹن کیمپ کا دورہ کرتے۔ ایک روز ہماری برادری کا ایک فرد انہیں ملا اور بتایا کہ ہم لوگ بھی کیمپ میں تھے۔ وہ ہمیں لاہور کے فلیٹیز ہوٹل لے آئے جہاں ان کے کچھ رابطے تھے۔ پھر ان کا تبادلہ ساہیوال کر دیا گیا جہاں ہم نے مکان بنا لیا۔ پنجاب کی تقسیم سے کچھ ہی عرصہ قبل والد صاحب نے آبائی علاقے میں اراضی خریدی تھی لیکن اس کی رجسٹریشن کا عمل مکمل نہیں تھا۔ ہمیں اس کے بدلے کچھ جائیداد ملی لیکن پورا ازالہ نہ ہو سکا۔ میرے ماموں نے پورے راستے مجھے اٹھا کر میری جان بچائی۔ میں ہمیشہ انہیں دعائیں دیتا ہوں۔ وہ فوج سے ریٹائر ہو کر انتقال کر چکے ہیں۔"

چودھری عبدالسعید

اگلے روز 21 دسمبر 2004 کو ہم بہاولپور گئے جہاں چودھری عبدالوحید کے بڑے بھائی چودھری عبدالسعید وکالت کرتے ہیں۔ چودھری عبدالسعید اپنے بھائی سے چند برس بڑے تھے اور یکم جنوری 1937 کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے مجھے یہ کہانی سنائی:

"کنولی کے سکول میں ہندو، سکھ اور مسلمان طلبا میں کافی تناؤ پایا جاتا تھا کیونکہ مسلمان مسلم لیگ کے حامی تھے اور پاکستان چاہتے تھے جبکہ غیر مسلم اس کے مخالف تھے۔ حتیٰ کہ پاکستان کے قیام کا تصور واضح ہونے پر غیر مسلم اساتذہ کا رویہ بھی بدل گیا۔ زیادہ تر طلبا سکھ تھے۔ پورے خطے میں سکھوں کی اکثریت تھی۔ مسلمانوں کو 'ملیچھ' ہونے کی وجہ سے ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ سکول میں ہم ایک حوض سے پانی نہیں پی سکتے تھے۔ جب ہم نے احتجاج کیا تو ہمارا الگ حوض بنا دیا گیا۔ پھر میرا ایک بڑا بھائی روپڑ کے سکول میں داخل ہو گیا اور میں بھی وہاں چلا گیا۔ وہاں صورتحال کشیدہ تھی۔

"ہمارے گاؤں میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان عداوت کی جڑیں تاریخ میں گہرائی تک پیوست تھیں۔ سرہند کے قریب قصبے چمکور میں ایک مقدس گوردوارہ ہے۔ یہ اس جگہ پر تعمیر کیا گیا جہاں کے بارے میں روایت ہے کہ وہاں سکھوں کے گورو گوبند سنگھ کے بیٹوں کو مغلوں نے زندہ چنوا دیا تھا۔ چنانچہ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان مخاصمت پہلے ہی پائی جاتی تھی۔ 1905 میں گائے ذبح کرنے کے تنازعے پر سکھ اور مسلمان گوجروں میں پر تشدد تصادم ہوا تھا۔ مسلمان گوجروں کے مرکزی رہنما مولوی عبداللہ روپڑی (ان کے داماد حافظ سعید ہیں جو لشکر طیبہ کے سربراہ کے طور پر مشہور ہوئے) اہلحدیث مکتبہ فکر کے سخت ترین پیروکار تھے۔ چنانچہ ایک روز جب نماز جمعہ ادا کی جا رہی تھی تو سکھوں نے حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے جوابی کارروائی کر کے 30، 40 سکھوں کو قتل کر ڈالا۔ اس تصادم نے سکھوں اور مسلمانوں کی دشمنی کو علاقے میں مزید گہرا کر دیا۔ یوں 1947 میں سکھ نہ صرف مغربی پنجاب میں ہونے والے واقعات بلکہ گورو گوبند سنگھ کے بیٹوں سے بدسلوکی

بلکہ 1905 کے واقعے کا بدلہ لینے کی تلاش میں تھے۔ ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان ہوتے ہی مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے گئے۔ ڈنگولی، ڈگولی، کنولی، چنڈیال، مرسلی اور دیگر دیہات کے مسلمان وہاں کے قبرستان میں جمع ہو گئے۔ یہ قبرستان ڈیرہ غازی خان سے ڈنگولی آنے والی روحانی شخصیت کی وجہ سے مشہور تھا۔ ہم وہاں دو سے تین ماہ تک رہے۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ بارشیں بھی شروع ہو گئیں اور بالخصوص ہمارے علاقوں میں ان کی شدت زیادہ تھی۔ ہم نے سنا کہ لدھیانہ، پٹیالہ اور جالندھر سے آنے والے سکھ جتھوں کی صورت میں جمع تھے۔ ہم اپنا گاؤں نہیں چھوڑنا چاہتے تھے اور ماضی میں ہم نے سکھوں کے کئی حملے پسپا کیے تھے۔ مولانا عبد اللہ روپڑی نے مسلمانوں کے دستے تیار کیے جو پہاڑیوں، ندی نالوں اور ہر جگہ سکھوں سے لڑتے تھے۔ گولیوں کا بھی تبادلہ ہوتا تھا۔

"اکتوبر میں کورالی جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مسلمانوں کا قافلہ کئی میل لمبا تھا۔ فوجیوں اور اسسٹنٹ کمشنر نے لاؤڈ سپیکروں سے اعلانات کرائے کہ اسلحہ حکومت کو جمع کرا دیا جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے قافلے کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر انہوں نے اسلحے کی تلاشی شروع کر دی اور مسلمانوں کے پاس موجود لمبی چھڑیاں تک ضبط کر لیں۔ اس کے بعد کھیتوں میں چھپے سکھوں نے نہتے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے۔ ہزاروں افراد مارے گئے۔ ندیوں اور نہروں کا پانی سرخ ہو گیا۔ خواتین اور بچوں تک کو نہ چھوڑا گیا۔ میرے چچا، میرے خالو اور دیگر کئی قریبی رشتہ دار قتل ہو گئے۔ کسی نے میری چچی کے بھائی کو قابو کر لیا۔ وہ اس کی ٹانگیں کاٹنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میری چچی نے بھائی کو زخمی حالت میں چھوڑنے سے انکار کر دیا لیکن اس نے کہا کہ میں تو مر رہا ہوں لیکن تم چلی جاؤ۔ پھر اس نے بھائی پر چادر ڈال کر قافلے میں شمولیت اختیار کر لی۔ پیچھے رہ جانے والے تقریباً تمام افراد کا صفایا کر دیا گیا۔ کورالی کا کیمپ ایک جہنم تھا۔ مردے دفن کرنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اس لیے کسی بھی جگہ گڑھا کھود کر میت دفنا دی جاتی تھی۔ سکھ نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور ان میں سے بیشتر کبھی بازیاب نہیں ہو سکیں۔ ہزاروں ہلاک کر دی گئیں۔ البتہ کچھ سکھ ہم پر مہربان بھی تھے۔ منگل سنگھ جو سائیں ذاتی سے تعلق رکھتا تھا ہمارے گاؤں کا تھا۔ اس کی کریانے کی دکان تھی۔ وہ کورالی کیمپ میں آتا اور میرے بھائی کو چینی اور دیگر غذائی اشیا فراہم کرتا تھا۔ اسی طرح بعض دیگر مسلمانوں کے دوست سکھ بھی ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ ہندوؤں سے بھی ہمارے اچھے تعلقات تھے۔ وہ بھی مختلف طریقوں سے کیمپ میں آ کر اپنے جاننے والوں کی مدد کرتے تھے۔"

ڈنگولی کا دورہ

29 نومبر 2005 کی سہ پہر کو ہتیش گوسین، ورندر سنگھ اور میں ڈنگولی پہنچے۔ یہ روپڑ شہر سے 10 کلومیٹر دور واقع ہے۔ مشرقی پنجاب کا یہ حصہ نہایت سرسبز ہے کیونکہ یہاں مون سون کی بارشیں سب سے پہلے آتی ہیں اور زیادہ دیر تک برقرار رہتی ہیں۔ چھوٹی پہاڑیوں، ندیوں، دریائی دہانوں اور آزادی کے بعد تعمیر کیے گئے نہری نظام نے اس علاقے کو مزید خوبصورت بنا دیا ہے۔ یہاں سے شمال مشرق میں ہماچل پردیش ہے جہاں پہاڑی ترائیاں واضح ہو جاتی ہیں اور بتدریج بلند ہوتے شیوالک پہاڑی سلسلے سے جا ملتی ہیں۔

چترو

''میں گاؤں کا چوکیدار ہوں۔ ہم 1947 میں بھی اسی جگہ رہتے تھے۔ ڈنگولی کے نئے باسی سکھ جاٹ ہیں جو پاکستان سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ تقسیم سے پہلے گاؤں میں زیادہ تر گوجر ذات کے مسلمان رہتے تھے۔ ان کا وڈیرہ عمرا گجر (عمر دین) تھا۔ جب حملے شروع ہوئے تو دریائے ستلج کے پار واقع مسلمانوں کے دیہات کو فوج اور سکھ جتھوں نے گھیر لیا۔ انہوں نے دیہات کو آگ لگا کر مکینوں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ لوگ دریا پار کر کے ایک قبرستان میں جمع ہو گئے۔ اس سے تھوڑی دور مسلمانوں کی روحانی شخصیت گوہر شاہ مدفون ہیں۔ قبرستان میں تقریباً 80 ہزار سے ایک لاکھ پناہ گزین مقیم تھے۔ گاؤں کے لمبر دار عمرا نے ہمیں (غیر مسلموں کو) کہا کہ ہم یہاں سے چلے جائیں کیونکہ بے گھر ہو کر یہاں آنے والے مسلمان ہم سے انتقام لے سکتے تھے۔ چنانچہ ہم وہاں سے نکل کر کھنولی چلے گئے۔ مسلمان یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے لیکن فوج نے انہیں جانے پر مجبور کر دیا۔ راستے میں ان پر کئی حملے ہوئے اور ہزاروں افراد مارے گئے۔ ہمارے گھر سمیت تمام مکانات نذر آتش کر دیے گئے۔ بعد میں ہم واپس آئے اور تعمیر نو کی۔ اس کے لیے ہم نے مسلمانوں کے مکانات کا سامان (ملبہ) استعمال کیا۔ اگر تمہیں زیادہ تفصیل چاہیے تو لمبر دار امر سنگھ سے مل لو۔ وہ اب 80 سال کا ہے۔''

ہم اس گاؤں کی طرف گئے اور پھر ایک کمسن لڑکی کی مدد سے ہم امر سنگھ کے گھر پہنچ گئے۔ یہ ایک اینٹوں سے بنا بڑا گھر تھا جیسا کہ لمبر دار امر سنگھ نے خود ہمیں بتایا تھا کہ اس کا تعلق ماضی میں اچھوت ذات سے رہا تھا۔ یہ گھرانہ خوشحال تھا اور امر سنگھ واقعی ایک اہم شخصیت تھا لیکن ان کا گھر گاؤں سے باہر تھا۔ یہ واضح نہیں ہو سکا کہ نسلی امتیاز کی وجہ سے گھر گاؤں سے باہر تھا یا مکان کے لیے اراضی ہی گاؤں سے باہر دستیاب ہو سکی تھی۔ ہم صحن میں بیٹھ گئے اور امر سنگھ کے تاثرات ریکارڈ کیے۔

امر سنگھ

''میری پیدائش 1922 میں ڈنگولی کے ایک ہریجن (دلت) گھرانے میں ہوئی۔ یہ گاؤں مسلمان گوجروں کا تھا جبکہ چند مکانات ہریجنوں کے بھی تھے۔ کئی مسلمان میرے دوست تھے۔ ہم سب پر امن انداز میں رہتے تھے۔ لمبر دار عمرا بہت اچھا اور انصاف پسند انسان تھا۔ باقی مسلمانوں میں سے مجھے خیر دین، شاہ محمد اور شیر محمد کے نام یاد ہیں۔ اس علاقے میں مسلمانوں کے کئی دیہات تھے۔ 1947 تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات پر امن رہے لیکن پھر بدنام زمانہ عناصر، سکھوں، سرکاری انتظامیہ اور فوج میں سے بعض غنڈوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ ہر طرف خوف و ہراس تھا۔ ارد گرد کے دیہات، نارا گڑھ ریاست اور نور پور بیدی کے مسلمان حضرت گوہر شاہ کے دربار کے قریب قبرستان میں جمع ہو گئے۔ ان کی تعداد یقیناً ایک لاکھ کے لگ بھگ ہو گی۔ اکثر افراد گوجر برادری کے ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے رشتہ دار بھی تھے۔ ان دنوں تیز بارشیں ہوئی تھیں۔

''لمبر دار عمرا نے ہمیں خبر دار کیا کہ ہم فی الحال گاؤں چھوڑ دیں کیونکہ مسلمان سمجھتے ہیں کہ حملوں میں ہریجنوں کا ہاتھ ہے۔ ہم احتیاطاً نزدیکی گاؤں میں منتقل ہو گئے لیکن ہم اپنے گاؤں کے حالات سے بے خبر نہیں رہے۔ سکھ جتھے منظم ہو چکے تھے اور بندوقوں، کلہاڑوں اور گنڈاسوں سے لیس تھے۔ شروع میں کھنولی (کہیں کنولی اور کہیں کھنولی کہا گیا ہے) گاؤں کے

سکھوں نے اس خوف سے فوج بلوائی مبادا مسلمان ان پر حملہ کریں۔ مسلمانوں کو ڈنگولی گاؤں سے کورالی مہاجر کیمپ میں منتقل ہونے کا حکم دیا گیا۔ انہوں نے فوج اور انتظامیہ کے اس حکم کی مزاحمت کی جس کے نتیجے میں کچھ جھڑپیں بھی ہوئیں۔ بہر حال پھر وہ کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس کے بعد وہ آگے پہاڑی علاقے اور شہزادہ پیر کے علاقے کی طرف بڑھے۔ وہ وہاں تقریباً ایک ماہ تک مقیم رہے۔ سکھ فوج اور سب ڈویژنل مجسٹریٹ پنڈت لکشمی چند (اسے چودھری عبدالسعید نے اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر قرار دیا تھا) نے مسلمانوں کو ہر قسم کا اسلحہ اور زیورات جمع کرانے کا حکم دیا۔ بیشتر افراد نے حکم کی تعمیل کی لیکن کچھ نے مزاحمت بھی کی جس پر فوج نے سٹین گنوں سے گولی چلا دی جس سے کافی ہلاکتیں ہوئیں۔ پھر قتل عام شروع ہوا۔ ہزاروں افراد مارے گئے۔ ہم نے کئی میل کے قطر میں لاشیں دیکھیں۔ ندی نالوں اور کنوؤں میں لاشیں بھری تھیں۔ ان میں وہ خواتین بھی شامل تھیں جنہوں نے خودکشی کی اور وہ بھی تھیں جن کو سکھوں اور فوج نے جان سے مار ڈالا۔ مجھے صحیح تعداد کا تو علم نہیں لیکن یہ بہر حال ہزاروں میں ضرور ہوگی۔ یہ لٹا پٹا کارواں کورالی پہنچا جہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد انہیں پاکستان بھجوا دیا گیا۔ ہر کسی کو اس داستان خونچکاں کا علم ہے۔ یہاں کے مسلمان امن پسند لوگ تھے۔ ان میں سے کچھ بعد ازاں اپنے گاؤں دوبارہ ملنے آئے لیکن مجھے یاد نہیں کوئی واپس ڈنگولی آیا ہو۔"

نصیب کور یا عظمت بی بی

ڈنگولی جاتے ہوئے ہم نے ایک ایسی خاتون کا ذکر سنا جو پیدا تو مسلمان ہوئی تھی لیکن اس کی جان سکھوں نے بچائی اور وہ سکھ کی حیثیت سے ہی پلی بڑھی۔ امر سنگھ سے ملاقات کے بعد ہم اس خاتون کے گاؤں پھول خورد پہنچے۔ یہ شام کے 7 بجے کا وقت تھا اور اسے ڈھونڈنا چنداں مشکل ثابت نہ ہوا۔ ہم ایک روایتی دیہاتی مکان میں داخل ہوئے جس کے صحن میں بکریاں، گائیں اور بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ نصیب کور ایک خوش شکل اور خوش مزاج مہربان خاتون ثابت ہوئی۔ اس کی داستان افسانوی کم اور حیران کن زیادہ ہے۔

"تقسیم کے وقت میں صرف چار سال کی تھی۔ ہمارے گاؤں کو آگ لگا دی گئی اور میں اپنی ماں سے بچھڑ گئی جس نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میری پیدائش کے کچھ عرصے بعد میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا لہٰذا میں واحد اولاد تھی۔ ایک خاتون مجھے روتے دیکھ کر اپنے ساتھ سکھ کے گھر لے گئی جو محکمہ انہار میں اوورسیئر ملازم تھے۔ یہ خاتون بعد ازاں خود پاکستان منتقل ہو گئی۔ میرے چاچاجی (سکھ اوورسیئر) نے مجھے دیکھتے ہی پسند کر لیا۔ اگرچہ انہوں نے خود مسلمانوں پر ہونے والے کئی حملوں میں حصہ لیا تھا لیکن میرے لیے وہ باپ کے برابر تھے۔ ان کی اپنی بھی بیٹی تھی۔ میرے آنے کے بعد ان کے گھر دو بیٹے پیدا ہوئے اور خاندان بتدریج خوشحال ہوتا چلا گیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں ان کے خاندان کے لیے خوش قسمت ثابت ہوئی تھی اور وہ باہر بھی ہر کسی سے کہتے کہ یہ بچی ہماری زندگی میں خوشیاں لائی ہے۔

"میرا نام انہوں نے نصیب کور (مطلب قسمت کی شہزادی) رکھا۔ اس وقت مجھے اپنے اصلی (اسلامی) نام کا علم نہیں تھا۔ میں جوان ہوئی تو میری شادی ایک سکھ نوجوان سے کر دی گئی اور اب میں بچوں اور پوتے پوتیوں کی ماں ہوں۔ ان تمام تر حالات کے باوجود میں اپنی بی بی (ماں) کو نہ بھلا سکی جو مجھ سے شدید محبت کرتی تھی۔ میں ہر روز اسے یاد کرتی رہتی

تھی۔ بظاہر میں ماں بحفاظت پاکستان پہنچ گئی تھی۔ اس نے دوسری شادی کر لی لیکن مجھے اپنی یادوں سے نہ مٹا سکی۔ پھر اس کی ملاقات اس خاتون سے ہوئی جس نے مجھے سکھ اوور سیئر کے حوالے کیا تھا۔ 1990 میں وہ میرے دروازے پر آئی اور کہا کہ میں تمہاری ماں ہوں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اس نے بتایا کہ تمہارا نام ہم نے عظمت بی بی رکھا تھا۔

"ہم تقریباً 43 سال بعد ملے تھے۔ میں اب سکھ ہوں اور میرا اپنا گھرانہ ہے۔ میری والدہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہے اور دن میں پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہے۔ میں نے ماں کو بتایا کہ میری پرورش کرنے والے والدین اور ان کے بچوں نے میرے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا اور پورا گاؤں میرے ساتھ مہربان ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ میں اب قدامت پسند سکھ بن چکی ہوں اور اپنے عقیدے اور خاندان سے انتہائی جڑی ہوئی ہوں۔ وہ مجھے اطمینان بخش حالت میں دیکھ کر واپس چلی گئی۔ پھر میں پاکستان گئی اور اپنے رشتہ داروں سے ملی۔ میری ماں کے دو بیٹے تھے۔ میں اپنے ماموؤں اور خالاؤں سے بھی ملی۔ میں اس کے بعد مزید تین مرتبہ پاکستان گئی۔ ان سب نے مجھے اس حیثیت سے قبول کر لیا اور تحائف بھی دیے۔ کسی نے مجھ پر دباؤ نہ ڈالا کہ میں اسلام دوبارہ قبول کر لوں۔ ہم سب نے تقسیم کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کو ذہنی طور پر تسلیم کر لیا۔"

میں (مصنف) اس حیران کن واقعے سے نہایت متاثر ہوا کہ سچے انسانی جذبات کیسے ہوتے ہیں اور لوگوں کی انفرادی سوچ نظریاتی سے زیادہ کس طرح عملی ہوتی ہے۔ 1947 میں کروڑوں افراد کی زندگیاں منتشر ہو گئیں قطع نظر اس بات کہ کس نے بھارت، بنگال یا پنجاب کی سرحد کے کس طرف رہنا پسند کیا۔

حصار

ضلع حصار میں 1947 میں مسلمان 28 فیصد کے تناسب میں تھے۔ خان بہادر ملک خدا بخش نے اپنی رپورٹ میں حصار کی تحصیل سرسہ کے بارے میں یہ تاثرات قلمبند کیے تھے۔

> سرسہ سب ڈویژن کے مسلمانوں نے خود کو کافی منظم کر لیا تھا چنانچہ یہ دیکھ کر جاٹوں نے ان پر حملے سے گریز کیا۔ انہوں نے سرسہ میں اپنی طرز کی لڑائی لڑی اور اندازہ ہے کہ ساٹھ ہزار مسلمان بہاولپور ریاست کو ہجرت کر گئے۔ پہلے یہ اطلاعات آئیں کہ بیکانیر ریاست پناہ گزینوں کے ساتھ تعاون نہیں کر رہی تاہم بعد ازاں ان کی مدد سے ہی اتنی بڑی تعداد میں مسلمان وہاں سے گزر گئے۔ مشرقی پنجاب حکومت کے وزیر ترقی کیپٹن رنجیت سنگھ نے مجھے بتایا کہ وہ اس ضلع کے 17 مقامات سے مسلمانوں کو بہاولپور منتقل کریں گے (1993: 208)۔

پشپا گوئل

مارچ 2004 میں میرے دورہ مشرقی پنجاب اور دہلی میں میری ملاقات وِل ایسار جن کا انٹرویو پہلے کتاب میں دیا جا چکا ہے کے جاننے والے ہندو خاندان سے ہوئی۔ اس خاندان نے تقسیم کے وقت مشہور پاکستانی کرکٹر انضمام الحق کے اہل خانہ کی ضلع حصار کے علاقے ہانسی میں جان بچائی تھی۔ مسز پشپا گوئل نے مجھے یہ داستان سنائی:

"پاکستان کرکٹ ٹیم کے دورہ بھارت میں انضمام الحق نے اپنے والدین کے آبائی شہر ہانسی جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کی درخواست حکومت ہند نے مسترد کر دی لیکن میرے بیٹے نے ہوٹل جا کر ان سے ضرور ملاقات کی۔ جب انضمام الحق واپس وطن گئے اور ہمارا ذکر کیا تو ان کے والدین نے ہمارے خاندان کو فوراً پہچان لیا۔ ہمارے خاندان نے فسادات میں ان کے خاندان کی جان بچائی تھی۔ ایک ہجوم ان لوگوں پر حملے کی نیت سے آیا لیکن میرے والد نے انہیں واپس بھیج دیا۔ انضمام کی واپسی پر ملتان سے ان کے والد کا مجھے فون آیا۔ انہوں نے کہا 'ارے پشپا! کیسی ہو تم؟' میں نے کہا 'ٹھیک ہوں بھائی صاحب۔' اس کے بعد دیگر باتیں ہوئیں۔ انہوں نے مجھے 1999 میں ملتان میں انضمام الحق کی شادی میں شرکت کی دعوت بھی دی۔ ان دنوں وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے لاہور کا دورہ کیا ہوا تھا اور دونوں ملکوں کے خوشگوار تعلقات سے ویزہ آسانی سے مل گیا۔ میں ان لوگوں کی مہمان نوازی سے نہایت متاثر ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ میں اپنے ہی گھر میں آئی ہوں۔ ہمارے بڑوں کے آپس میں اچھے تعلقات تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ میں سبزی خور ہوں اس لیے انہوں نے سختی سے اس بات کا خیال رکھا۔ ان کی خواتین نے نہایت گرمجوشی اور مہربانی کا مظاہرہ کیا۔ میں اپنا ملتان کا دورہ کبھی نہیں بھلا سکتی۔"

روہتک

ضلع روہتک میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی 17.4 فیصد تھی۔ خان بہادر خدا بخش نے ستمبر 1947 کی یہ صورتحال اپنی رپورٹ میں بیان کی ہے:

> اگرچہ یہ افواہیں پھیلی ہوئی تھیں کہ روہتک کے مسلمانوں کا صفایا کیا جا چکا تھا تاہم صورتحال حقیقت میں اتنی خراب نہیں تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ سون پت، بہادر گڑھ، گوہانہ اور دیگر دیہات کے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تھا لیکن میں نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ ماسوائے بہادر گڑھ ہر جگہ پر مسلمان متحد ہو کر جاٹوں اور فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔ کلانور کے مسلمانوں نے حملہ آور جاٹوں کی بڑی تعداد کی بھرپور مزاحمت کی۔ روہتک شہر بھی محفوظ تھا۔ البتہ ان میں خوف کی فضا پائی جاتی تھی اور غذائی قلت بھی موجود تھی (1993:207-8)۔

محمد فرید مرزا

"میرا تعلق روہتک کے ایک بااثر مغلیہ خاندان سے ہے۔ ہمارے بیشتر قریبی رشتہ دار مسلم لیگی تھے تاہم میرے ایک ماماجی کانگریس کے زبردست سپورٹر تھے۔ کانگریس کے مقامی رہنماؤں سے ہمارے روابط اچھے تھے۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ ہم یہاں سے جائیں لیکن دیگر مسلمانوں کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان کے فوراً بعد ارد گرد کے محلّوں میں حملے شروع ہو چکے تھے۔ اس وقت تک کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ہمیں جبراً یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ ہمارے خاندان نے روہتک میں ہی قیام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہاں ہماری کافی گہری جڑیں تھیں۔

"اگست کے آخر یا ستمبر کے شروع میں سکھ جتھوں نے روہتک اور گرد و نواح کے دیہات میں حملے شروع کر دیے تھے۔ پہلے پہلے انہوں نے رات کی تاریکی میں حملے کیے پھر دن دہاڑے کارروائیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ یہ بات واضح ہو گئی کہ ہم مزید یہاں قیام جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ ہمارے کچھ عزیز اس امید پر دہلی چلے گئے کہ حالات معمول پر آتے ہی وہ گھروں کو واپس آ جائیں گے۔ چونکہ ہم مسلم لیگ سے اپنے روابط کی وجہ سے کافی معروف تھے اس لیے میرے والد نے ساہیوال (جو 1947 میں منٹگمری کہلاتا تھا) منتقل ہونے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہاں ہمارے کچھ رشتہ دار رہتے تھے۔ ایک روز ہمارے گھر پر حملہ کر کے آگ لگا دی گئی لہٰذا ہمیں بے سر و سامانی کے عالم میں نکلنا پڑا۔ کئی اور مسلمان ہجرت کر کے مسلمانوں کے لیے قافلے میں شامل ہو گئے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں نے مجبوراً اپنے ضعیف والدین اور معذور بچوں تک کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ کچھ خواتین کو حملہ آور اغوا کر کے لے گئے۔ ایک سڑک لاشوں سے بھری تھی اور بیشتر لاشوں کے سر کٹے ہوئے تھے۔ عورتوں کی چھاتیاں کاٹ کر انہیں مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ میں طویل عرصے تک خوفناک خواب دیکھتا رہا۔ حملہ آور اگرچہ باہر سے آئے لیکن بلاشبہ انہیں پولیس اور مقامی انتظامیہ کی حمایت حاصل تھی۔

"پناہ گزین کیمپ میں صورتحال قابل رحم تھی۔ مون سون کی بارشوں نے حالات کو بدتر بنا دیا۔ کئی لوگ مر گئے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ صدمے کی حالت میں ایک خاتون نے اپنے مرے ہوئے بچے کو چھاتی سے لگایا تھا اور کسی کو اسے ہاتھ نہ لگانے دیا۔ ہم کیمپ میں ایک ماہ سے زائد عرصے تک مقیم رہے اور آخر کار پاکستانی فوج کی معیت میں ٹرین پر روانہ ہو گئے۔ بیشتر عام لوگوں کو پیدل قافلوں کے ساتھ جانا پڑا۔ راستے میں سکھوں نے ہماری ٹرین پر فائرنگ کر دی جس سے کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ زخمی ہوئے۔ فوج نے حملہ آوروں کو ٹرین سے دور رکھا۔ ہم نومبر میں پاکستان پہنچے۔ دہلی منتقل ہونے والے ہمارے اکثر رشتہ دار مارے گئے اور صرف کچھ ہمارے پاس پاکستان آ گئے۔ میں مرنے سے پہلے ایک بار روہتک جانا چاہتا ہوں۔ میری عمر اب 82 سال ہے اس لیے یہ دورہ جلد ہو جائے تو بہتر ہے لیکن یہ خواہش تب ہی پوری ہو گی جب اللہ چاہے گا۔"

بریگیڈیئر سرجیت سنگھ چودھری

میری سکھ ادیب تری دیوش سنگھ مائنی کے ساتھ کافی عرصے سے خط و کتابت چل رہی تھی جو دونوں طرف کے پنجاب کے درمیان دوستی کے فروغ کی مہم چلا رہے ہیں۔ میں 2005 کو دورہ دہلی میں ان کے نانا سے ملا تھا جنہوں نے بتایا کہ انہوں نے ہریانہ سے کئی مسلمانوں کو اپنی حفاظت میں پاکستان جانے میں مدد فراہم کی تھی۔ بریگیڈیئر سرجیت سنگھ چودھری نے یہ واقعات یوں بیان کیے:

"میرا تعلق ضلع راولپنڈی کے علاقے کہوٹہ سے ہے۔ میں آٹھویں پنجاب رجمنٹ میں کپتان تھا اور 1947 میں دوسری جنگ عظیم کے دوران عراق کے محاذ سے ہندوستان واپس آیا تھا۔ میں پنجاب باؤنڈری فورس میں تو شامل نہیں ہوا لیکن میری خدمات پنجاب پولیس کو مستعار دے دی گئیں اور مجھے روہتک میں تعینات کر دیا گیا۔ یکم ستمبر سے 31 جنوری 1948 کے درمیان میں نے 11 دیہات کے مسلمان رنگڑوں کو قصور سرحد پر حسینی والا پہنچایا۔ یہ کام پاکستان سے لٹے پٹے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کی سخت مخالفت کے دوران کیا گیا جو اپنا انتقام مشرقی پنجاب کے مسلمانوں سے لینا چاہتے تھے۔ پنجاب

کے دونوں طرف کے لوگوں نے درندوں جیسا طرز عمل اختیار کیا تھا۔ یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا کیا۔ یہ سب کچھ واقعی شرمناک تھا۔ میں نے رنگڑوں کو پاکستان بحفاظت پاکستان پہنچا کر اپنا فرض ادا کیا۔"

کرنال

ضلع کرنال میں بھی مسلمان 31 فیصد نمایاں اقلیت میں تھے۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کا تعلق بھی کرنال سے تھا۔ 28 نومبر 2005 کو، ہتیش گوسین، وریندر سنگھ اور میں وریندر سنگھ کے والدین کے گھر شام کے وقت پہنچے۔ مجھے وہاں ایک معزز برہمن سے گفتگو کا موقع ملا جن کا نام تو میں یاد نہیں رکھ سکا لیکن سب لوگ انہیں پنڈت جی کہتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کرنال میں 1947 میں کافی قتل عام ہوا اور سینکڑوں افراد مارے گئے۔ یہ واقعہ یہاں سے (جہاں ہم بیٹھے تھے) زیادہ دور رونما نہیں ہوا تھا۔ بھاگنے والے مسلمانوں پر ہندو جاٹوں نے حملے کیے۔ 200 سے 300 افراد ہلاک ہوئے۔ پنڈت جی نے بھی تصدیق کی کہ 46-1945 سے پہلے کرنال میں سب لوگ بلا امتیاز مذہب پرامن طریقے سے رہتے تھے۔ سر چھوٹو رام (انتقال 1945) جو یونینسٹ پارٹی کے لیڈر اور صوبائی وزیر تھے کا تعلق کرنال سے تھا۔ ان کی موت سے بین المذاہب ہم آہنگی متاثر ہوئی اور فرقہ واریت نے جنم لیا۔

خان بہادر ملک خدا بخش

اپنی رپورٹ میں ملک خدا بخش نے ضلع کرنال کے بارے میں یہ تاثرات بیان کیے ہیں:

> ضلع کرنال میں کافی عرصے سے صورتحال کافی سنگین رہی تھی اور دیہات میں املاک کا زبردست نقصان ہوا۔ کئی علاقوں کے مسلمان 20 ستمبر تک بڑے دیہات میں جمع ہو چکے تھے اور حملوں کی مزاحمت بھی کر رہے تھے لیکن سب کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ وہ زیادہ عرصے کے لیے بقا کی جنگ نہیں لڑ سکیں گے۔ چونکہ ان کی حفاظت کا مناسب بندوبست نہیں تھا اس لیے بچاؤ کا واحد راستہ صرف وہاں سے انخلا ہی تھا۔ میں نے سنا کہ ڈپٹی کمشنر نے مسلمانوں کو صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے انخلا کا خود بندوبست کریں کیونکہ وہ ان کی سکیورٹی کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پی سی ایس (صوبائی سول سروس) افسر میاں محمد شفیع نے مسلمانوں کی نقل مکانی کے معاملات کی نگرانی کے انتظامات سنبھالنے کی پیشکش کی تھی۔ 20 ستمبر کو کرنال میں فساد برپا ہوا اور کافی جانی نقصان ہوا۔ [یقیناً اوپر پنڈت جی نے بھی اسی تصادم کا ذکر کیا ہے] (1993:2007)۔

شملہ

ضلع شملہ میں 1947 میں مسلمانوں کی آبادی 18 فیصد تھی۔ انگریز حکومت کا گرمائی دارالحکومت ہونے کے ناتے یہ پرفضا شہر کافی اہمیت اور وقار کا حامل تھا لیکن تقسیم کے بعد دیگر علاقوں کی طرح یہاں بھی انسانی جانوں کو خطرے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ شملہ کے بارے میں ملک خدا بخش نے یہ لکھا ہے:

ستمبر کے دوسرے ہفتے میں شملہ سے تشویشناک صورتحال کی اطلاعات موصول ہونا شروع ہوئیں۔ شملہ سے کالکا کے درمیان تین جبکہ کالکا سے پاکستان کے لیے دو خصوصی ٹرینیں چلائی گئیں جن سے مہاجرین کو منتقل کیا گیا۔ شملہ، سولان اور کساؤلی میں کئی معزز گھرانے پھنس کر رہ گئے۔ ان لوگوں کے انخلا کا کام صرف فوج کر سکتی تھی کیونکہ شملہ اور متصل علاقوں میں سکھ مہاجرین کا انبوہ کثیر آ رہا تھا اور مہاجرین کو ان کے درمیان سے نکلنا تھا (208 :1993)۔

نسیم حسن

امریکہ میں مقیم انجینئر نسیم حسن سے میرا تعارف اپنے اخباری کالموں کی وجہ سے ہوا جن میں گاہے بگاہے تقسیم کے موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا جاتا تھا۔ میرے اصرار پر انہوں نے اپنے ماضی کی یادداشتیں تحریر کیں۔ اگرچہ ان دنوں وہ نہایت کمسن تھے لیکن انہوں نے سفر کی تفصیلات کافی واضح انداز میں بیان کی ہیں:

"1912 کے لگ بھگ میرے دادا ابراہیم اور ان کے چھوٹے بھائی بہتر ذرائع معاش کی تلاش میں گورداسپور سے شملہ منتقل ہوئے۔ میرے دادا نے اچھی کمائی کی اور گاؤں واپس لوٹ آئے لیکن ان کے چھوٹے بھائی شملہ میں ہی کامیاب بزنس مین بن گئے اور یورپی طرز کی ٹیلرنگ میں مہارت حاصل کرلی۔ انہوں نے اس دور کے معیار کے مطابق کافی پیسہ بنایا۔ مشہور مال روڈ پر ان کی دکان میں دس افراد ملازم تھے۔ میرے والد خادم حسین شملہ میں سرکاری افسر بن گئے۔ ہمارے کافی رشتہ دار گرمیوں میں شملہ کام کاج کرنے آتے اور سردیوں میں واپس لوٹ جاتے۔ ہمارا گھر مال روڈ کے قریب واقع تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے سے ایک سڑک گزر کر ریڈنگ ہسپتال جاتی تھی۔ میں آج بھی آنکھیں بند کر کے شملہ میں دور واقع پہاڑیوں کے رنگ یاد کر سکتا ہوں — مٹیالا، سبز اور سفید رنگ — سڑک کے ایک طرف باڑ تھی اور دوسری طرف گھروں کی قطار تھی۔ یہ باڑ حفاظتی نکتہ نظر سے بنائی گئی تھی کیونکہ نیچے خطرناک پھسلن اور ڈھلوانیں تھیں۔ پہاڑیاں سرسبز تھیں جبکہ ترائیوں پر ان گنت جنگلی پھول اگے ہوئے تھے۔ تقسیم ہند کروڑوں لوگوں کی زندگی کا فیصلہ کن موڑ تھا۔ ان دنوں ہر کسی کو صرف اپنی اور اپنے اہل خانہ کی فکر تھی۔ تقسیم سے پہلے ہندو اور مسلمان امن کے ساتھ رہتے تھے۔ مجھے مکند لال سود، ڈاکٹر پامرے اور گربیر کوہلی جیسے کئی ہندو نام آج بھی یاد ہیں جو میرے والد صاحب کے دوست تھے۔

"جون میں تصادم کے اکادکا واقعات ہوئے۔ جولائی میں شملہ کے مسلمانوں نے پاکستان منتقل ہونا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے امراء نے نقل مکانی کی۔ مجھے بالکل ٹھیک طرح یاد ہے کہ ہمارا گھر باہر سے مقفل تھا۔ جولائی / اگست ٹائم فریم مقرر کیا گیا تھا۔ ہمارے گھر کی بالائی منزل پر ایک اور مسلمان گھرانہ منتقل ہو گیا تھا۔ ہمارا ایک گھریلو ملازم مختار تھا جو ہر قسم کے مذاہب کے پیروکار افراد کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔ وہ ہمارا بہت بڑا سہارا تھا اور گھر میں محصور ہونے پر وہی ہمارے لیے غذائی اشیالایا کرتا تھا۔ اس عرصے میں ہمارا اپنے چھوٹے دادا اسماعیل اور ان کے خاندان کے ساتھ رابطہ منقطع ہو گیا۔ ان کی دکان پر حملہ کیا گیا تھا جس پر وہ ایک ہوٹل میں منتقل ہو گئے تھے۔ بعد ازاں ان کو ان کے کاروباری سکھ حریفوں اور دیگر نے حملہ کر کے مار ڈالا۔ میرے والد کو ان کے قتل کی اطلاع مل گئی تھی لیکن انہوں نے پاکستان آنے تک یہ خبر ہم سے چھپائی رکھی۔

"اگست 1947 میں ہم ہندو ڈاکٹر پامرے کی مدد سے ریپون ہسپتال منتقل ہو گئے اور وہاں اس وقت تک مقیم رہے جب تک پاکستان کے لیے ٹرین دستیاب نہ ہو گئی۔ چھوٹی پٹڑی والی ٹرینیں شملہ سے کالکاتک چلتی تھیں۔ مجھے ایک مہاجر کیمپ یاد ہے جو خیموں کی بستی جیسا تھا۔ ایک رات کیمپ پر حملہ ہو گیا۔ میرے والدین نے میری بہنوں کو اور مجھے اپنے جسم کے نیچے ڈھانپ لیا تاکہ ہمیں حملہ آوروں سے بچایا جاسکے۔ کالکا میں تین روز تک قیام کے بعد ہم دیگر رشتہ داروں کے ساتھ رات کو ٹرین پر پاکستان جانے کے لیے سوار ہو گئے۔ مسافروں نے اپنے ڈبوں کو اندر سے مقفل کر لیا تاکہ کوئی اور نہ چڑھ سکے۔ راستے میں کئی جگہ لوگوں نے دروازے پر لٹکنے کی کوشش کی لیکن اندر والوں نے انہیں دھکا دے کر گرا دیا۔ ٹرین پنجاب کے میدانی علاقوں میں سست رفتار کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ جب ٹرین سٹیشن پر پہنچی تو مجھے تابدار سورج کی جھلک نظر آئی جو آج بھی مجھے یاد ہے۔ وہاں اچانک سکھوں کا ایک جتھہ نمودار ہوا جو 'ست سری اکال' کے نعرے لگا رہا تھا۔ ٹرین رکتے ہی وا ہیتھی اور ہجوم قریب تر آ رہا تھا کہ اچانک ٹرین نے واپسی کی سمت دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ٹرین ایک اور متبادل روٹ اختیار کر کے پاکستان میں داخل ہو گئی۔ ہمیں اور دیگر مہاجرین کو لاہور سے باہر والٹن مہاجر کیمپ میں رکھا گیا۔ ہر روز لوگ ادھر ادھر گھوم کر اپنے بچھڑے رشتہ داروں کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ لاہور میں قیام ہونے کے بعد ہمیں والد صاحب نے اپنے چچا اسماعیل کی موت کی خبر دی۔

"میں تقسیم کے طویل عرصے بعد 1980 کی دہائی میں کاروباری دورے پر بھارت گیا۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد میں نے دو ہفتے کی چھٹی لی اور بذریعہ ٹرین شملہ گیا۔ ٹرین پہاڑوں اور وادیوں میں سے گزرتی چلی گئی۔ شملہ میں پہلا منظر جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا وہ پہاڑوں کا صفاچٹ ہونا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کی بھرمار تھی۔ شملہ سے متعلق میرے خواب بکھر کر رہ گئے۔ پہاڑ پر چڑھتے ہوئے مجھے کہیں پرانے دور کے لمبے لمبے درخت دکھائی نہ دیے۔ ریلوے سٹیشن کے باہر ہوٹل ایجنٹوں اور قلیوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ قلی زیادہ تر کشمیر کے رہنے والے تھے۔ میرا سامان اٹھا کر بھی وہ مجھ سے زیادہ رفتار میں آگے بڑھتے رہے۔ ہوٹل میں قیام کے بعد میں باہر مانوس چیزیں ڈھونڈنے کے لیے نکلا لیکن مجھے وہ سرسبز و شاداب شملہ کہیں نظر نہ آیا جو میں یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ اگلے روز میں علی الصبح اٹھا اور جاکھو ہل کی طرف گیا۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہم یہاں ہنومان مندر میں آیا کرتے تھے۔ ہماری والدہ ساتھ ہوتی تھیں اور مندر کی چھت پر بندر چھلانگیں مارا کرتے تھے۔ جیسے جیسے میں آہستہ آہستہ پہاڑی چڑھتا گیا تو مجھے لمبے دیودار اور چیڑھ کے درخت نظر آئے۔ یہ جگہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی تیس سال پہلے تھی۔ آہستہ آہستہ میں پہاڑی کے اوپر پہنچا اور دیکھا کہ بندروں کا ایک گروہ بڑے آرام سے کچھ فاصلے پر گزر رہا تھا۔ ہر قسم کی عمر اور حجم کے بندروں کے دیگر گروہ ہنومان مندر کی حدود میں نمودار ہوئے۔ ایسا لگا وقت تھم گیا تھا اور اس جگہ کا وہی سدابہار حسن تھا جو مجھے یاد تھا۔ میں جھاکو ہل پر اس صبح تنہا دو گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ پھر وہ جو پہلا شخص نمودار ہوا وہ فرائی سنیکس بیچنے والا پھیری باز تھا۔ چونکہ میں نے اس کی 'بوہنی' کرائی تھی اس لیے اس نے مجھے پیسے سے زیادہ سامان دیا۔ جب میں ارد گرد کی تصاویر کھینچ رہا تھا تو میں نے سنا کہ کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ میرے پیچھے ایک جوڑا اور تین بچے کھڑے تھے۔ اس آدمی نے مجھے کہا کہ میں اسکے بچوں کی تصاویر کھینچوں۔ میں نے بلاتوقف بچوں کی چند تصاویر بنائیں۔ اس شخص نے سمجھا کہ میں کوئی مقامی فوٹو گرافر تھا، اس لیے اس نے کہا کہ میں اسے اگلے روز تصاویر کا پرنٹ دے دوں۔ وہ لوگ جالندھر سے سیر کے لیے آئے تھے۔ جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو ان کا رویہ کافی دوستانہ ہو گیا۔ میں نے وعدہ کیا کہ انہیں امریکہ سے تصاویر ارسال کروں گا۔

"جب دوپہر ہوئی تو موسم خوشگوار ہو گیا۔ میں نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ اوپر جانے کے مقابلے میں نیچے اترنے میں آدھا وقت کم لگا۔ دوپہر کو میں انگریزوں کے تعمیر کردہ چرچ کے باہر بیٹھ گیا۔ کئی لوگ ایک پلی پر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ میں بھی سورج کی تمازت سے لطف اندوز ہونے لگا۔ میرے ساتھ بیٹھے شخص نے اپنا تعارف سکھبیر کے طور پر کرایا اور بتایا کہ وہ ریاست ہماچل پردیش کا ملازم تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں تیس برس بعد اپنی جنم بھومی میں واپس آیا ہوں تو اس کا رویہ ایک دم تبدیل ہو گیا اور وہ مجھ سے ایسے برتاؤ کرنے لگا جیسے کہ میں اس کا دیرینہ دوست تھا۔ اس نے مجھے اپنا 'وطنی' قرار دیا۔ اس نے مجھے ایک مقامی حکیم، ریستوران کے مالک سمیت کئی دوستوں سے ملوایا۔ ان سب نے میرے ساتھ شملہ کی ایک بڑے خاندان کے رکن کی حیثیت سے سلوک کیا۔ دورہ بھارت میں پہلی بار مجھے لگا کہ میں اپنے ہی گھر میں تھا۔"

گڑگاؤں

ضلع گڑگاؤں میں مسلمان اقلیت کا تناسب تقریباً 37 فیصد تھا۔ یہ دہلی کی سرحد پر واقع تھا اور اب شہر کا مضافاتی علاقہ ہے۔ ممتاز پاکستانی صحافی اور انسانی حقوق کے علمبردار آئی اے رحمان نے گڑگاؤں کے بارے میں یہ داستان سنائی:

آئی اے رحمان

"میں ضلع گڑگاؤں میں دہلی سے 30 میل جنوب میں دریائے جمنا کے کنارے گاؤں حسن پور میں پیدا ہوا۔ گاؤں میں نصف آبادی مسلمانوں کی اور نصف غیر مسلموں کی تھی۔ زمیندار مسلمان تھے اور ان کا تعلق بلوچ قبیلے رند سے تھا۔ مغل بادشاہ ہمایوں کے دور (چھٹی صدی) میں یہ رند بلوچ دہلی کے اطراف میں ہندو جاٹوں کے حملے روکنے کے لیے آباد ہوئے تھے۔

"حسن پور کے ہندوؤں کے ساتھ ہمارے تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ ہم ہندو طلبا کے ساتھ ہی پڑھتے اور اساتذہ بھی ہندو تھے۔ ہم نے کبھی ان سے کوئی مخاصمت محسوس نہیں کی۔ ہمارے قریب ترین دوستوں میں بھی کئی ہندو تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر ذرائع آمدن کم تھے چنانچہ ہمارے بڑوں نے حصول تعلیم پر زور دیا۔ حتیٰ کہ ہماری لڑکیاں بھی سکول داخل کرا دی گئیں۔ میرے دادا عبد الرزاق صاحب نے ہمارے گھر میں گرلز سکول کھولا۔

"ہمارے گاؤں میں انگریز مخالفت فضا پائی جاتی تھی۔ کسی فرد نے انڈین فوج کے لیے خدمات پیش نہ کیں۔ ہمارے بزرگوں کا رجحان خاکسار تحریک کی طرف تھا۔ اس کے بعد کچھ رشتہ داروں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی لیکن نیم دلی کے ساتھ۔ میرے والد وکیل تھے اور گڑگاؤں کے قریبی قصبے کلوال میں پریکٹس کرتے تھے۔ وہ مسلم لیگ کے رکن نہیں تھے۔ وہ 14 اگست 1947 کو گاؤں کے ممتاز افراد کے ساتھ ٹرک پر ارد گرد کے دیہات میں گئے اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ علاقہ چھوڑ کر نہ جائیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ لوگ صدیوں سے یہاں رہ رہے ہیں اور اب اپنے گھر چھوڑ کر جانے کی کوئی وجہ نہیں۔

"فروری 1947 میں پہلے ہی فسادات رونما ہو چکے تھے لیکن اس کی وجہ سیاسی نہیں بلکہ ہندو جاٹوں اور مسلمانوں میوؤں کے درمیان مقامی سطح کی دشمنی تھی۔ یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ ان دنوں میو مکمل طور پر دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے

تھے بلکہ وہ ہندوانہ اور اسلامی دونوں طرح کی رسموں پر چلتے تھے۔ یہ لوگ اپنے تنازعات کا حل گوتر (قبیلے) کی بنیاد پر کرتے تھے۔ کسی وجہ سے کسی نے فرقہ واریت کا پہلو ابھارا جس سے فسادات برپا ہو گئے۔

"10 ستمبر کو ہمارے گاؤں پر حملہ کر دیا گیا۔ حملہ آوروں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ اگرچہ کئی حملہ آور قریبی گاؤں کے تھے لیکن بعض تو ڈیڑھ سو کلومیٹر دور سے بھی آئے تھے۔ ان میں کوئی سکھ شامل نہیں تھا۔ میرے دو قوی الجثہ کزنوں کو ان کے بیس سال پرانے دوست نے ہی ہلاک کر دیا۔ یہ دوست بنیا تھا۔ اس نے آخر کس بنا پر یہ حرکت کی مجھے آج تک اس راز کا پتہ نہیں چل سکا۔ ہماری برادری کے کئی افراد حملوں میں مارے گئے۔

"ماؤنٹ بیٹن کو صورتحال کا علم ہوا تو انہوں نے متھرا میں موجود فوجی یونٹ کو مداخلت کا حکم دیا جس کی وجہ سے لوگوں کی جان بچ گئی۔ اس بات کا کیمپبل کی ڈائری میں بھی کیا گیا ہے۔

"اس کے بعد ہمارے لوگ کلوال منتقل ہو گئے۔ گاندھی جی نے مولانا حبیب الرحمان اور پنڈت سندر لال جو گاندھی کے سیکرٹری تھے کو علاقے میں بھیجا۔ انہوں نے ہمیں کہا کہ ہم پاکستان نہ جائیں۔ میرے والد نے ان سے کہا، 'میں بھی جانا نہیں چاہتا لیکن اب جبکہ دونوں حکومتیں ایک معاہدے پر پہنچ چکی ہیں تو پناہ گزین مردوں اور عورتوں کو کیا کہوں؟ کیا آپ لوگ ان کی سلامتی کی ضمانت دے سکتے ہیں؟' انہوں نے کہا، 'نہیں ہم ضمانت نہیں دے سکتے۔'

"چنانچہ ہم گڑ گاؤں سے بھٹنڈہ اور پھر فاضلکا پہنچے۔ فوج ہمارے ساتھ تھی۔ میرے والد نے گھر اور دفتر کی چابیاں اپنے دوست راؤ بہل سنگھ کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ امن بحال ہوتے ہی وہ واپس آ جائیں گے۔"

دہلی

دارالحکومت دہلی اگرچہ صوبہ پنجاب کا حصہ نہیں تھا لیکن پنجاب کے کئی سول افسر دہلی میں تعینات تھے۔ اس کے علاوہ جنوبی پنجاب سے سکھوں اور ہندو مہاجرین کی بڑی تعداد کی آمد سے پنجاب کے مسلمان زبردست دباؤ میں آ گئے اور انہیں پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ کھوسلہ رپورٹ میں دہلی کے مسلمانوں پر قہربار حملوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جسٹس کھوسلہ نے دعویٰ کیا ہے کہ قبل ازیں نومبر 1946 اور پھر ستمبر اکتوبر 1947 میں مسلمانوں نے فسادات پھیلانے کے لیے اشتعال انگیزی کی۔ جب مسلمانوں پر حملہ کیا گیا تو ایک ہزار مسلمان مارے گئے۔ (1989: 283) سابق وفاقی وزیر تعلیم اور کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے دہلی اور قرب و جوار میں رونما ہونے والے واقعات کی تفصیل بیان کی ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

اگلے روز میں نے اپنے اہل خانہ کو پرانے قلعے کی طرف بھجوا دیا جہاں شہر کے مسلمان جمع تھے اور ریسکیو کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ان دنوں اگرچہ کئی یادگار واقعات ہوئے لیکن سب سے اہم واقعہ ذاکر ذاکر حسین جو بعد میں صدر ہند بنے کو اوکھالا کے نزدیک جامعہ جو ان دنوں دہلی سے کافی دور تھا سے لانا تھا۔ ہم دونوں بعد ازاں اکٹھے گاندھی سے ملنے گئے۔ ہمیں ان کو

کچھ زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کیونکہ ان کے کارکن پہلے ہی انہیں اہم واقعات سے لمحہ بہ لمحہ باخبر رکھے ہوئے تھے۔ ان سے سچ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ قتل عام صرف آپ رکوا سکتے ہیں۔ انہوں نے لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچا پھر وعدہ کیا کہ 'میں جو کچھ بن پڑا کروں گا' اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا ورنہ انہیں قتل نہ کیا جاتا (Qureshi 1995: 192)۔

ریاض احمد چیمہ

سٹاک ہوم میں میرے انتہائی دیرینہ دوست ریاض احمد چیمہ کا تعلق ان پنجابی خاندانوں سے ہے جو دہلی میں رہتے تھے کیونکہ ان کے والد کی تعیناتی وہاں ہو گئی تھی۔ 16 مئی 2007 کو انہوں نے یہ خیالات بیان کیے:

"میں 5 فروری 1937 کو پیدا ہوا۔ بنیادی طور پر ہمارا تعلق سیالکوٹ سے تھا لیکن تقسیم کے وقت میرے والد ایم عبداللہ چیمہ دہلی میں بطور سول جج تعینات تھا۔ ان کا تعلق پنجاب کی صوبائی سروس سے تھا۔ اگرچہ دہلی پنجاب کا حصہ نہیں تھا لیکن پنجاب کے افسروں کی دارالحکومت میں تعیناتی کی روایت ان دنوں عام تھی۔ ہم آٹھ بہن بھائی اور والدین عطاالرحمن لین کے علاقے میں سول لائنز میں رہتے تھے۔ والد صاحب کے کئی ہندو، سکھ اور مسلمان قریبی دوست تھے لیکن سب سے قریبی دوست ایک ہندو بزنس مین رام کرشن تھا۔ پرانی دہلی میں ان کا ایک پرنٹنگ پریس تھا۔ ایک اور دوست چودھری غلام عباس تھے جو دہلی کے سٹی مجسٹریٹ تھے۔ ان کا تعلق پنجاب کے علاقے چکوال سے تھا۔

"1947 کے آغاز میں دہلی میں فرقہ وارانہ فسادات کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ البتہ ہڑتال اور مظاہرے ہوتے رہتے تھے۔ مارچ 1947 میں راولپنڈی میں فسادات کے بعد وہاں سے کئی سکھ راولپنڈی میں اپنے رشتہ داروں کے پاس آئے۔ دہلی میں ان دنوں بڑی تعداد میں پنجاب کے سکھ آباد تھے۔ یہ سکھ کاروبار سمیت کئی اقسام کے شعبوں سے منسلک تھے۔ راولپنڈی کے کئی متاثرہ سکھ واپس چلے گئے لیکن اکثر دہلی میں ہی مقیم رہے۔ صورتحال کافی کشیدہ ہو گئی کیونکہ راولپنڈی کے سکھوں نے مسلمانوں کے مظالم کی داستانیں اپنے رشتہ داروں کو اور گوردواروں کے اجتماعات میں دیگر سکھوں کو سنائیں۔ کئی مواقع پر خراب حالات کی وجہ سے والدین نے ہمیں سکول میں نہ بھیجا۔ رات کو اندھیرا ہوتے ہی ہمیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔

"3 جون کے بعد پارٹیشن پلان کا اعلان ہوا تو واقعات تیزی سے رونما ہونے لگے۔ میرے والد نے پاکستان میں قیام کا فیصلہ کیا اور انہیں حکومت نے جہلم میں سینئر سول جج تعینات کر دیا۔ ہم دہلی سے 16 اگست کو روانہ ہوئے۔ ہمیں ٹرین میں سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں جگہ ملی۔ میرے والد کے پاس ایک ریوالور اور ایک بندوق تھی۔ ایسی داستانیں گردش کر رہی تھیں کہ سکھ جتھے ٹرینیں روک کر مسلمان مہاجرین کو قتل کر رہے تھے تاہم ہماری ٹرین بحفاظت لاہور پہنچ گئی۔ دہلی سے نکلنے سے پہلے میرے والد کے ایک سکھ کولیگ نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس کے چپڑاسی سکھ کو پاکستان لے جائیں تاکہ وہ راولپنڈی سے اپنا کنبہ ساتھ لا سکے۔

"لاہور ٹرین پہنچی تو میرے والد اس سکھ کے ڈبے میں گئے۔ وہ وہاں موجود تھا لیکن جب ٹرین لاہور سے باہر نکلی تو والد صاحب نے کچھ غنڈوں کو ریل گاڑی پر چڑھتے دیکھا۔ گوجرانوالہ سٹیشن پر والد ایک بار پھر سکھ چپڑاسی کو دیکھنے گئے لیکن وہ وہاں

موجود نہیں تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ جب غنڈوں نے حملہ کیا تو سکھ نے دریائے راوی میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا، کیا وہ تیراکی جانتا تھا یا نہیں؟ یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ جب ہم عید کے روز یا ایک دن پہلے جہلم پہنچے تو سکھ اور ہندو بدستور وہاں موجود تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سکھ گوشت کی دکانوں پر بیٹھے گوشت فروخت کر رہے تھے۔

''مجھے آج بھی یاد ہے کہ ان دنوں دہلی کے مقامی مسلمان پاکستان جانے پر آمادہ نہیں تھے۔ عطاالرحمن لین میں ہمارے ہمسایوں میں مسلمان تاجر سلطان احمد جاپان والا کا خاندان بھی تھا۔ وہ دہلی کا قدیم باشندہ اور نہایت دولتمند بزنس مین تھا۔ سلطان جاپان والا کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی اور ان کی عمریں ہم بہن بھائیوں کے برابر ہی تھیں۔ انکا ایک بیٹا بعد ازاں پاکستان کے صوبہ سندھ کا وزیر خزانہ بھی بنا لیکن 1947 میں لگتا تھا کہ جاپان والا خاندان کا پاکستان جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہماری پاکستان روانگی کے وقت انہوں نے علاقے میں ایسے تمام افراد کی دعوت کی جو رخصت ہو رہے تھے۔ انہوں نے بچوں میں ٹافیاں تقسیم کیں جن پر خدا حافظ تحریر تھا۔

''یہ ستم ظریفی ہے کہ مسلم لیگ کو ہندو اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی حمایت زیادہ ملی جبکہ مسلمان اکثریت والے صوبوں سے مسلم لیگ کو حمایت بہت بعد میں ملی۔ جناح نے پاکستان کا منصوبہ بناتے ہوئے ذہن میں نظریاتی بنیاد اور جغرافیائی سرحدوں پر غور نہیں کیا تھا۔ میں نے حال ہی میں ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ 1942 میں مسلم لیگ نے پاکستان کا ایک خیال پیش کیا جس میں نہ صرف مسلم اکثریت والے صوبے بلکہ دہلی بھی شامل تھا حالانکہ دہلی میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں تھی۔ آخر کس بنیاد پر یہ منصوبہ بنایا گیا وہ تاحال ایک راز ہے۔

''1964 میں، میں نے دہلی کا دورہ کیا اور اپنے والد کے دوستوں سے ملنے گیا۔ ایسی ہی ایک ملاقات میں مجھے بمبے کا ایک شخص ملا جو بنیادی طور پر لاہور کا تھا۔ جب اس نے سنا کہ میرے نام کا حصہ چیمہ بھی ہے اور میرے والد سول جج تھے تو اس نے استفسار کیا کہ کیا ہم لاہور کے مجسٹریٹ ایم جی چیمہ کے رشتہ تو نہیں۔ میں نے یقین دلایا کہ ایم جی چیمہ ہمارا رشتہ دار نہیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ مجسٹریٹ چیمہ لاہور کی ہندو آبادیوں میں آگ لگانے کا ماسٹر مائنڈ تھا۔ کئی سال بعد مجھے ایم جی چیمہ سے لاہور میں ملاقات کا موقع ملا۔ میں ان کے سامنے لاہور کے 1947 کے واقعات کا ذکر نہ کر سکا کیونکہ وہ ایک بزرگ تھا اور اس کے ماضی میں جھانکنے کی کوشش پر برا منا سکتا تھا۔''

انٹرویوز

محمد فرید مرزا، لاہور، 7 اپریل 2003

پشپا گوئل، دہلی، 29 مارچ 2004

چودھری عبدالوحید، ملتان، 20 دسمبر 2004

چودھری عبدالسعید، بہاولپور، 21 دسمبر 2004

آئی اے رحمان، 14 جنوری 2005

پنڈت جی، کرنال، ہریانہ، 28نومبر 2005

امر سنگھ، ڈنگولی، 29نومبر 2005

چترو، ڈنگولی، 29نومبر 2005

نصیب کور، گاؤں پھول خورد، ضلع روپ نگر، نومبر 2005

بریگیڈیئر سرجیت سنگھ چودھری، دہلی، 3دسمبر 2005

ریاض احمد چیمہ، سٹاک ہوم، 16مئی 2006

نسیم حسن، ہوسٹین، ڈیلاور، امریکہ (ای میل) یکم جنوری 2007

References

Qureshi, Ishtiaq Husain, *'Hindu Muslim Social Relations 1935-47'* in Mushirul Hasan, *India Partitioned: the Other Face of Freedom*, Vol. II, New Delhi: Rupa, 1995.

Malik, Khuda Baksh (Khan Bahadur, *'A brief report made by K.B. Malik Khuda Baksh regarding the districts of Ambala, Karnal, Rothak, Hissar, Simla, Ludhiana and Jullundur'*, in *The Journey to Pakistan: A Documentation on Refugees of 1947*, 1993, Islamabad: National Documentation Centre, (1993).

20

مشرقی پنجاب کی خود مختار ریاستیں

پنجاب کے مستقبل کا اصل تنازعہ انگریزوں کی انتظامی عملداری والے 29 اضلاع کا تھا جنہیں انگریزوں کے علاقہ جات کہا جاتا تھا۔ خود مختار راجواڑوں کا معاملہ البتہ الگ چیز تھی۔ ان ریاستوں نے معاہدوں کے ذریعے برطانوی کی حاکمیت تسلیم کرر کھی تھی۔ تکنیکی اعتبار سے انگریزوں کا اقتدار ختم ہونے کے بعد ایسی ریاستیں پاکستان یا بھارت میں سے کسی کے ساتھ روابط استوار کرنے میں آزاد تھیں۔ البتہ کہا یہ جاتا ہے کہ مارچ 1947 سے سکھ خود مختار ریاستوں کے سپاہیوں نے بھیس بدل کر امرتسر میں فسادات میں حصہ لیا۔ بعد میں مئی میں فرید کوٹ اور نابھ ریاستوں کے فوجیوں نے لاہور کے نواحی علاقے راج گڑھ پر حملے میں بھی حصہ لیا۔ اس کے علاوہ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے پنجاب کو متحد رکھنے کی نیت سے مہاراجہ پٹیالہ اور جناح کے درمیان مذاکرات کے لیے سہولت کار کا کردار بھی ادا کیا۔ یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ دسمبر 1946 میں ہزارہ اور پھر مارچ 1947 میں راولپنڈی، اٹک اور جہلم کے اضلاع سے مسلمانوں کے حملوں اور لوٹ مار سے بھاگ کر آنے والے سکھوں نے انہی سکھ ریاستوں میں پناہ لی۔ انہوں نے وہاں اپنے ہم مذہب افراد کو مسلمانوں کے مظالم کی داستانیں سنائیں۔ اس طرح سکھ ریاستیں دسمبر 1946 سے ہی برطانوی عملداری والے علاقوں میں وقوع پذیر واقعات سے ہم آہنگ تھیں۔

البتہ پنجاب کے مستقبل کے معاملے میں خود مختار ریاستوں کی دلچسپی فسادات سے کئی ماہ پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اکالی سکھ 1930 کے عشرے سے خود مختار ریاستوں میں قدامت پسند سکھ ریاست کے قیام کی مہم چلا رہے تھے اور انہیں بتدریج پذیرائی مل رہی تھی۔ کم از کم 1945 سے ماسٹر تارا سنگھ اور ہمنوا کا پٹیالہ کے مہاراجہ یادیوندر سنگھ سے مسلسل رابطہ تھا جس میں ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں ممکنہ مسلمان ریاست سے لاحق چیلنجوں سے نمٹنے پر غور کیا جاتا رہا۔ آئن کوپلینڈ Ian Coupland لکھتے ہیں کہ:

''اکالیوں کے شاہی ریاستوں میں بڑھتے اثر ورسوخ سے شاہی خاندان کے ممتاز خاندانوں میں سکھ قدامت پسندی راسخ ہوتی گئی۔ یوں شاہی خاندانوں کو دیکھتے ہوئے مذہبی اور ثقافتی نشاۃ ثانیہ کی سوچ کو فروغ ملنے لگا۔ 1947 تک ان تبدیلیوں کے کافی اہم فرقہ وارانہ اثرات مرتب ہوئے۔ مثال کے طور پر مسلمان اور ہندو درباریوں کی جگہ سکھوں نے لے لی۔ لیاقت حیات خان (سر سکندر حیات کے بھائی) ڈی کے سین آف پٹیالہ، کپور تھلہ کے عبد الحمید اور جنڈ کے محمد صادق قربانی کا بکرا بننے والوں میں شامل تھے۔ (Coupland, 2002: 675-77)۔ اس وقت تک لیاقت حیات خان، عبد الحمید اور محمد صادق وزیر اعلیٰ یا دیوان کے طور پر کام کر رہے تھے اور وزراء کونسل کو جاری ہونے والے احکامات کا لازمی حصہ تھے۔''

رابن جیفری لکھتے ہیں کہ سکھ جتھوں کو منظم کرنے اور انہیں تربیت دینے میں انڈین نیشنل آرمی کے سابق لیفٹیننٹ کرنل نرنجن سنگھ گل (1974: 50-7) کا بہت بڑا کردار تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ انڈین نیشنل آرمی (جاپانیوں کی قید میں رہنے

والے بھارتی فوجیوں پر مشتمل تھی) کی ساکھ قوم پرست اور حب الوطن فورم کے طور پر تھی۔ سبھاش چندر بوس نے اس فوج میں مذہبی اور ذات برادری کی تفریق ممنوع قرار دی تھی اور سب فوجی ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے اور بلا تفریق مذہب ایک دوسرے کے بھائی سمجھے جاتے تھے۔ تاہم انہی فوجیوں کے ایک حصے نے تقسیم کے وقت قتل عام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بظاہر لگتا ہے کہ اینگلی اقدار ان فوجیوں میں زیادہ گہرائی تک نہیں اتر سکی تھیں۔ مجھے راولپنڈی کے بعض بزرگوں نے بتایا کہ آئی این اے کے سابق مسلمان فوجی سکھوں پر حملوں میں ملوث رہے تاہم آئن کولینڈ نے سکھ جتھوں کو متحرک کرنے کی یہ وجہ بتائی:

> امرتسر کی کونسل آف ایکشن کی ہدایات کے تحت ایک مفرور مجرم گیانی ہربنس سنگھ کے علاوہ انڈین نیشنل آرمی کے سابق افسر نرنجن سنگھ، سردار بلدیو سنگھ، گیانی کرتار سنگھ، ماسٹر تارا سنگھ اور پٹیالہ کے سابق وزیر رگھبیر سنگھ نے پیسہ جمع کرنے اور جتھوں کے لیے اسلحہ اور سامان خریدنے کا کام کیا۔ اس کے نتیجے میں 10 سے 12 لاکھ جنگجو تیار ہو گئے (Coupland, 20002: 680)۔

ایسی تیاریوں کے لیے سیاسی پشت پناہی بھی حاصل کی گئی۔ آر ایس ایس اور ہندو مہا سبھا سے رابطہ کیا گیا تا کہ پنجاب پر مسلمانوں کا غلبہ قائم ہونے سے روکا جا سکے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اپریل 1947 کے اوائل میں فرید کوٹ کے حکمران کو اس کے زیر کنٹرول پنجاب کے حصے میں عسکری کارروائیاں کرنے کی دعوت دی۔ بعض ذرائع کے مطابق اس کام کے بدلے اسے ضلع فیروزپور بطور معاوضہ دینے کی پیشکش کی گئی۔ پٹیالہ، نابھہ، کپورتھلہ اور کالسیہ کے حکمرانوں نے بھی پنجاب کی تقسیم اپنی مرضی کے مطابق نہ ہونے کی صورت میں مسلمانوں سے تصادم کے لیے سکھوں کی تیاری میں حصہ لیا۔ یوں یہ جتھے انتہائی پرعزم اور مسلح سکھوں پر مشتمل تھے۔ بعض جتھوں کے پاس تو ہیوی مشین گنیں بھی تھیں۔ البتہ عام طور پر ان کے پاس برین گنیں، ٹومی گنیں، دستی بم، پٹرول بم، رائفلیں، پستول، ریوالور، کرپانیں اور نیزے سمیت دیگر ہلکے ہتھیار ہوتے تھے۔ انہیں جیپیں اور ٹرک بھی مہیا کیے گئے جبکہ کچھ یونٹ مکمل طور پر موٹرائزڈ تھے۔ کولینڈ نے اپنی تصنیف میں لکھا کہ ایسے شر پسند اقدامات کو ماسٹر تارا سنگھ کی اکالی پارٹی کے بعض لیڈروں سمیت تمام سکھوں کی حمایت حاصل نہیں تھی (Ibid: 680-2)۔

سکھوں کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ وہ تو پاکستان میں شامل کیے جانے والے علاقوں میں بھی حملے کرنا چاہتے تھے لیکن جب تک جواہر لال نہرو وزیر اعظم رہے اس وقت تک بھارتی حکومت نے ایسی کسی کارروائی کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ انہوں نے دریائے ستلج کی دوسری جانب اور سکھ خود مختار ریاستوں تک کارروائیاں محدود رکھیں تا کہ ان علاقوں سے تمام مسلمانوں کا صفایا کیا جا سکے۔ دہلی میں برطانوی ہائی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق 8 لاکھ سے 10 لاکھ سکھوں کو جتھوں کی صورت میں منظم کیا گیا۔ بعض دیگر رپورٹوں کے مطابق ان میں ایک ہزار خونخوار قاتل تھے۔ کولینڈ نے اندازہ ظاہر کیا ہے کہ جتھوں کی مجموعی تعداد 2 لاکھ تھی (Coupland, 2002: 687)۔

اہداف کا انتخاب نہایت احتیاط سے کیا گیا۔ جہاں مسلمان بڑی تعداد میں جمع تھے وہاں حملے سے گریز کیا گیا۔ ایسے قافلے جن کے ساتھ فوجی دستے تعینات تھے پر بھی حملے نہ کیے گئے۔ کسی ہدف کا چناؤ ہونے کے بعد فوجی انداز میں کارروائی کی جاتی کیونکہ

حملہ آوروں میں بڑی تعداد میں سابق فوجی بھی تھے۔ ٹرینوں کے نظام الاوقات کی مناسبت سے گاڑیوں پر حملوں کی منصوبہ بندی کی گئی۔ حملے کا آغاز مشین گنوں یا لائٹ مشین گنوں سے کیا جاتا جس کے بعد کرپانوں یا نیزوں سمیت روایتی ہتھیاروں کا استعمال کیا جاتا۔ دیہات پر حملوں کی منصوبہ بندی بھی عسکری انداز میں کی گئی۔ آخری مرحلے میں جنگ کے مال غنیمت کے طور پر بچوں اور عورتوں کو اٹھایا گیا۔ (Ibid: 688) حملوں کے دوران لوٹ مار محبوب مشغلہ تھا۔ اس تناظر میں پنجاب کی خود مختار ریاستوں (Princely States) میں ہونے والے چیدہ چیدہ واقعات نیچے پیش کیے جا رہے ہیں۔

پٹیالہ

مشرقی پنجاب کی سب سے بڑی اور طاقتور خود مختار ریاست پٹیالہ تھی جس پر تقسیم کے وقت سکھ مہاراجہ یادیوندر سنگھ حکمران تھا۔ ریاست کی مجموعی آبادی 19 لاکھ 36 ہزار 259 تھی۔ مسلمانوں کی تعداد 4 لاکھ 36 ہزار 539 یعنی 24 فیصد تھی۔ سکھ ریاستوں بالخصوص پٹیالہ میں ہونے والے قتل عام کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا صفایا کرنے کی سازش تقسیم سے کہیں پہلے تیار کر لی گئی تھی۔ مغربی پنجاب کے وزیر مہاجرین و بحالیات میاں افتخار الدین نے 9 نومبر 1947 کو ایک نوٹ میں دعویٰ کیا کہ پٹیالہ سے صرف 2 لاکھ مسلمان 16 ستمبر تک پاکستان منتقل ہوئے اور باقی ماندہ 2 لاکھ 36 ہزار مار دیے گئے۔ حکومت پاکستان کی شائع کردہ رپورٹوں میں کہا گیا کہ مسلمانوں کی نسل کشی کے منصوبے کا سرخیل مہاراجہ پٹیالہ تھا جبکہ ریاست نابھہ اور کپورتھلہ اور چھوٹی ریاستوں کے حکمران (میرے نزدیک کپورتھلہ کا مہاراجہ نہیں بلکہ ولی عہد ٹکا سنگھ) بھی ملوث تھے۔ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کی تیار کردہ رپورٹوں میں بھی اس سازش کی تصدیق کی گئی ہے۔ کیمونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) کے سابق جنرل سیکرٹری ہرکشن سنگھ سرجیت نے مجھے انٹرویو میں اس کی تفصیل خود بتائی۔

البتہ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا نشان تک مٹانے کا منصوبہ ہندوستان کی تقسیم سے مشروط تھا۔ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو مشرقی پنجاب کی خود مختار سکھ ریاستوں میں مسلمانوں کے قتل عام کا کوئی جواز نہ ہوتا۔ اسی طرح ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ پنجاب کی تقسیم بھی ناگزیر تھی۔ اور یہ تلخ حقیقت پنجاب کے گورنروں نے بار بار سامنے لائی۔ مزید برآں سکھ پنجاب کی ایسی تقسیم بھی قبول کرنے پر تیار نہیں تھے جس کے باعث انہیں مذہبی مقامات، نہری کالونیوں اور لاہور سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ پنجاب کی انتظامیہ کافی عرصے سے مذہبی بنیادوں پر نجی فوجوں کی تیاری اور اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرتی آئی کہ سکھوں کے پاس ان کے مذہبی عقیدے کی بنا پر کرپان لازمی ہوتی ہے جس سے وہ زمانہ امن میں بھی مسلح ہوتے ہیں۔ مارچ 1947 اور پہلے دسمبر 1946 کے ہزارہ کے کچھ فسادات کے حوالے سے بھی، مغربی پنجاب میں سکھوں پر مسلمانوں کے مظالم کی تصوراتی کہانیاں گردش کر رہی تھیں۔ سکھوں کے مذہبی اجتماعات اور مختلف دیہات میں ہونے والے اکٹھ میں بھی مسلمانوں پر مظالم، عورتوں سے زیادتی، ان کی چھاتیاں کاٹنے، شیر خوار بچوں کو اچھال کر نیزوں پر اٹھانے کے واقعات بار بار دہرائے جاتے رہے۔ سکھوں کی غیرت جگا کر انہیں اپنے مذہبی کے خلاف جرائم کا انتقام لینے پر اکسایا گیا اور اس کام کو ان کا مذہبی فریضہ قرار دیا گیا۔ پر تشدد تصادم کا تمام گٹھ جوڑ مکمل ہو چکا تھا کیونکہ سکھ پنجاب پر اپنی ملکیت کے دعویدار تھے لیکن انہیں پریشانی اس بات کی تھی کہ وسطی اور مغربی پنجاب میں وہ اکثریت میں نہیں تھے۔ جہاں تک

مسلمانوں کے تحفظ کا تعلق تھا تو وہ پہلے ہی خطرے میں تھے کیونکہ پنجاب باؤنڈری فورس کے دائرہ کار سے سکھ خود مختار ریاستیں باہر تھیں۔ چنانچہ ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد مسلمان ان ریاستوں میں سکھ جتھوں کے رحم و کرم پر تھے۔ البتہ تمام حکمران ان حملوں میں ملوث نہیں تھے۔پٹیالہ ریاست کے ریٹائر سپرنٹنڈنٹ پولیس سردار عبدالعزیز نے اس سازش کی مفصل تصویر کشی کی ہے کیونکہ سازش پٹیالہ میں ہی تیار ہوئی تھی۔ عبدالعزیز 1944 کے اختتام پر ریٹائر ہوئے لیکن ان کے بقول مہاراجہ پٹیالہ بہت پہلے ہی اپنی سربراہی میں عظیم تر سکھ ریاست قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ پولیس ملازمت کے دوران عبدالعزیز نے سنا کہ مہاراجہ کے ایک شاہی جوتشی نے انہیں 'ساؤ سکھی' کی پیشنگوئی کی تھی جس کے تحت پنجاب پر سکھوں کی بالادستی کی بات کی گئی تھی اور یہ کہا گیا کہ اس ممکنہ ریاست کے حکمران کی نشانیاں مہاراجہ پٹیالہ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ مہاراجہ یادیوندر سنگھ نے یہ پیشنگوئی سن کو جوتشی کو طلب کیا اور شاہی دربار میں مستقل ملازم رکھ لیا۔ اس کے بعد مہاراجہ نے پنتھی ریاست کے قیام کی تیاری شروع کر دی۔ ریاست کے انگریز ملازم مسٹر ہیوٹن سمیت سکھ افسروں کو رائفلوں اور دیگر اسلحے کی تیاری کا حکم دیا گیا۔ مہاراجہ نے اکالیوں کے ساتھ بھی مراسم کو فروغ دیا حالانکہ پٹیالہ کے سابق حکمران اس سے گریز کرتے رہے تھے۔ بلدیو سنگھ، ماسٹر تارا سنگھ، گیانی کرتار سنگھ اور دیگر سکھ لیڈروں نے پٹیالہ کے دورے شروع کر دیے۔ ریاستی محکموں میں ہندو اور مسلمان افسروں کی جگہ سکھ افسروں کو تعینات کیا گیا۔ سکھ جتھے منظم ہو گئے اور ایک بڑی لڑاکا فورس جمع کی گئی۔ عبدالعزیز نے ریاستی فورسز کے ہاتھوں مسلمانوں کے کئی واقعات کا ذکر کیا ہے (1993: 195-200)۔

حکومت پاکستان کی دو اشاعتوں 'سکھ ان ایکشن' The Sikhs in Action اور 'نوٹ آن سکھ پلان' Note on the Sikh Plan میں اکالی لیڈروں اور اکالی فوج میں ڈیل کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ رپورٹیں یونینسٹ دور حکومت یا گورنر راج (5 مارچ کو دفعہ 193 کے تحت نافذ ہوا) کے دوران تیار کی گئی تھیں۔ سکھ منصوبے کی تیاری کی حقیقی تاریخ کا تو ذکر نہیں کیا گیا لیکن اس میں 1947 کے شروع سے لے کر آگے تک کا ڈیٹا ضرور دیا گیا ہے۔ ان رپورٹوں میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ انڈین نیشنل آرمی کے کئی سابق فوجی مسلمانوں سے مقابلے کے لیے ہندوؤں اور سکھوں کو تیار کر رہے تھے۔ 'نوٹ آن سکھ پلان' میں یہ پیرا درج ہے:

> شواہد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سکھ بالادستی کے خواب کی تعبیر کے لیے اس منصوبے کے فوری مقاصد یہ تھے۔ (اے) مسلمانوں کے جان و مال کی بڑے پیمانے پر تباہی۔ (بی) اگر ممکن ہو تو مغربی پاکستان کی مشرقی سرحد پر سکھ پٹی سے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانا... سازش کے مرکزی کرداروں میں اکالی پارٹی کے ماسٹر تارا سنگھ، گیانی کرتار سنگھ، ادھم سنگھ ناگوک اور دیگر لیڈر شامل تھے۔ منصوبے کے کوخامی سے پاک کرنے کے لیے دانشور طبقے، مذہبی، سیاسی رہنماؤں، سابق فوجیوں، کسانوں، اساتذہ اور طلبا کو متحرک کیا گیا۔ بعض صورتوں میں تحریک کے امور کی انجام دہی کے ساتھ قتل کرنے، لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ کی تربیت دینے کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے گئے۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ سکھ ریاستوں کے ساتھ انگریزوں کے زیر انتظام پنجاب کے سکھ لیڈر اس سازش کا فعال حصہ تھے۔ عسکریت پسند ہندوؤں کو بھی ساتھ ملایا گیا۔ (بعض صورتوں میں ہندوؤں کو ہندوستان کے دیگر حصوں میں تربیت دی گئی)۔ ان ہندوؤں نے زیر زمین دہشت گردانہ سرگرمیوں کے علاوہ مفید معلومات دینے اور جاسوسی کی بھی خدمات انجام دیں (1948: 28-29)۔

'سکھ ان ایکشن' رپورٹ میں مہاراجہ پٹیالہ کی طرف سے پورے مشرقی پنجاب میں سکھوں کا حکمران بننے کے منصوبے کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کی بنیاد سردار عبدالعزیز ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں میرے اندر اس دور میں پٹیالہ میں رونما ہونے والے واقعات کی تفصیل جاننے کی دلچسپی پیدا ہوئی۔ صیغہ واحد متکلم میں '1947 کے مظلوم کی کہانی، خود مظلوم کی زبانی' کے عنوان سے ایک کتاب میں حکیم محمد طارق محمود عبقری مجذوبی چغتائی نے متعدد داستانیں رقم کی ہیں۔ ہم یہاں ان میں ایک آدھ کہانی کا ذکر کر رہے ہیں۔ ایک تو پٹیالہ کے مسلمانوں پر ٹوٹنے والی قیامت صغریٰ' کے عنوان سے آپ بیتی ہے اور کچھ میری اپنی تحقیق ہے۔

محمد افضال شریف

> پٹیالہ میں مثالی امن اور قانون کی حکمرانی تھی۔ امن وامان کی صورتحال اتنی بہتر تھی کہ لوگ گھروں کے دروازے کھول کر سوتے تھے۔ مسلمان، سکھ اور ہندو بہت پیار محبت سے رہتے تھے اور ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے۔ 1945 میں پاکستان کے حق میں جو نعرہ بلند ہوا اس کی بازگشت پٹیالہ میں بھی سنائی دی۔ مسلمانوں نے چھاتی پر جناح کی تصویر والے بیج لگانے شروع کر دیے تھے۔ یہ لوگ نعرے لگاتے 'قائداعظم زندہ باد' اور 'بن کے رہے گا پاکستان' تاہم اس کے باوجود ریاست میں صورتحال پر امن رہی۔ میرے والد پیشے کے لحاظ سے سینماؤں کے آرائشی بورڈ اور پوسٹر بنانے والے پینٹر تھے۔ میرے والد اور سیٹھ چرن داس منہ بولے بھائی تھے۔ سیٹھ چرن داس اور چودھری عید محمد نے ایک نیا سینما بنایا اور میرے والد جون 1947 میں اس کی تزئین و آرائش کر رہے تھے۔ وہ لکڑی کی سیڑھی پر چڑھ رہے تھے کہ اس کا ڈنڈا ٹوٹ گیا جس سے وہ اور ان کا اسسٹنٹ نیچے گر گئے۔ میرے والد کے سر پر شدید چوٹ آئی۔ انہیں فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا جہاں سیٹھ چرن داس کے سسر رگھوناتھ نے میرے والد کو بچانے کی سر توڑ کوشش کی۔ ان دنوں قانون یہ تھا کہ جو مریض ہسپتال میں جان دے دیتا تھا اسے شہر واپس لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی بلکہ وہیں سے قبرستان یا شمشان گھاٹ پہنچایا جاتا تھا چونکہ ہمارے آپس میں بہت قریبی خاندانی مراسم تھے اس لیے سرجن نے میرے چچا غوث محمد سے کہا کہ آپ پہلے ہی مریض کو گھر لے جائیں کیونکہ اب یہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ چنانچہ والد کو گھر لے جایا گیا جہاں انہوں نے جان دے دی۔ یوں ہم تین چھوٹے بھائی اور شیر خوار بہن یتیم ہو گئے جبکہ والدہ بیوہ بن گئیں (Ibid: 24-25)۔

اس کہانی کی باقی تمام تفصیل میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ کس طرح افضال شریف کی خالہ اور اس کے بیٹی بیٹے کو سکھوں نے انبالہ سے پٹیالہ جاتے ہوئے قتل کر دیا۔ جب مسلمانوں کو یہ محسوس ہوا کہ پٹیالہ پاکستان میں شامل نہیں ہوگا تو انہوں نے اس فیصلے کا سوگ گھروں کی چھت پر سیاہ پرچم لہرا کر منایا۔ گڑبڑ شروع ہونے سے قبل مغربی پنجاب سے بے گھر کر آنے والے کئی سکھ خاندان پٹیالہ میں آباد ہو گئے۔ یہ لوگ خوانچہ فروش کے بہروپ میں مسلمان آبادیوں کا پھیرا لگاتے لیکن دراصل اس بات کی جاسوسی کرتے تھے کہ کس کے پاس کتنا مال تھا۔ اپنی داستان میں آگے چل کر افضال نے بتایا کہ رمضان کے مہینے کے بعد صورتحال یک لخت بدترین ہو گئی۔ کچھ مسلمانوں

کو پٹیالہ سٹیشن پر قتل کر دیا گیا۔ مہاراجہ نے پٹیالہ پولیس کو حکم دیا کہ مسلمانوں کے گھروں پر چھاپے مار کر ہر قسم کا اسلحہ ضبط کر لیا جائے۔ تاہم عید کا دن (18 اگست) خیر و عافیت سے گزر گیا۔ چار سے پانچ روز بعد پٹیالہ میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ مسلمان ان مقامات پر منتقل ہونے لگے جہاں ان کے ہم مذہب بڑی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ اس کے بعد جگہ جگہ گھات لگا کر مسلمانوں کو ہلاک کیا جانے لگا۔ افضال شریف کے کئی دیگر رشتہ دار بھی مارے گئے۔ پھر وہ اپنے ایک اور عزیز کے گھر منتقل ہو گئے۔ یہاں رکنے کے ایک گھنٹے کے اندر ان پر گولیاں چلائی گئیں جس کے نتیجے میں ایک اور خالہ ان کے شوہر، نوجوان بیٹا اور دیگر بچے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کچھ روز بعد انہوں نے محسوس کر لیا کہ پٹیالہ میں مسلمانوں کا قتل عام ناگزیر ہو چکا تھا۔ کتاب میں دیگر تمام مضامین میں مسلمانوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک کی تفصیل دی گئی ہے۔ اگرچہ ہلاکتوں کی تعداد نہیں دی گئی لیکن یہ یقیناً ہزاروں میں ہو گی۔ افضال شریف کے کئی رشتہ دار جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ انہوں نے بالخصوص دو ڈاکٹروں یعنی ڈاکٹر حکیم اور ڈاکٹر کریم کا ذکر کیا ہے جنہوں نے سکھ ہندو حملہ آوروں کو مسلمانوں سے دور رکھنے کے لیے گاہے بگاہے بندوق سے گولیاں چلائیں۔ ان کے پاس ہزاروں گولیاں تھیں۔ افضال شریف کے مطابق ڈاکٹر حکیم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے خاندان کی تمام خواتین کو ہلاک کر دیا۔ اس نے سوچا کہ تمام مردوں کو تو چونکہ مار ڈالا جائے گا لہٰذا اس کی بیوی اور بیٹیاں سکھوں کے ہاتھ کیوں لگیں (Ibid: 27)۔

بہر حال قتل و غارت کا سلسلہ کچھ عرصے کے لیے جاری رہا اور بچنے والے افراد کو بہادر گڑھ مہاجر کیمپ منتقل کر دیا گیا جہاں یہ لوگ تین ماہ کے لیے مقیم رہے۔ مہاجر کیمپ کی حالت نہایت دگرگوں تھی۔ کئی افراد مر بھی گئے۔ مرنے والوں کی مناسب تجہیز و تکفین کا بھی بندوبست نہیں تھا۔ انہیں ایک بڑی قبر کھود کر دفنا دیا گیا۔ بعد میں ایسی لاشوں کو آگ لگانا بھی شروع کر دیا گیا۔ اس داستان میں مزید لرزہ خیز تفصیلات بھی ہیں۔ کئی صحتمند افراد کو مہاراجہ کے فارم پر جبری مشقت کے لیے بھی بھجوایا گیا۔ ان میں مصنف افضال شریف کا نانا بھی شامل تھا۔ اس کے بعد پاکستانی فوج کی بلوچ رجمنٹ کے اہلکار وہاں آئے اور ان لوگوں کو بحفاظت پاکستان منتقل کیا۔ کئی لڑکیوں کو اغوا کر کے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ کچھ کو بعد ازاں بازیاب کرا لیا گیا جبکہ بعض بدقسمت کبھی واپس نہ مل سکیں۔ کئی متمول خاندان غربت کے بھنور میں پھنس کر بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو پاکستان بننے کی یہ قیمت ادا کرنا پڑی تھی اور یہ حقیقت کبھی بھولنی نہیں چاہیے۔ آخر میں انہوں نے لکھا کہ سیٹھ چرن داس نے تقسیم کے بعد بھی ہمیں خطوط لکھے اور پٹیالہ آنے کی دعوت دی لیکن ہمارے خاندان کا کوئی فرد واپس نہیں جانا چاہتا تھا (Ibid: 27-33)۔

پٹیالہ میں انٹرویو

پٹیالہ میں یہ کہانی عام ہے کہ پٹیالہ شہر میں فسادات اس وقت شروع ہوئے جب شہر کے ممتاز مسلمان ڈاکٹر حفیظ نے پہلے مہاراجہ پٹیالہ کی طرف گولی چلائی جس کے نتیجے میں سکھ جتھوں اور فوج کو مسلمانوں کا صفایا کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ جب میں 7 جنوری 2005 کو پٹیالہ گیا تو میں نے یہ کہانی کئی لوگوں سے سنی۔ یہ بات ناقابل فہم تھی کہ مسلمان ایک ایسی سکھ ریاست جو پاکستان کی سرحد سے کافی دور واقع تھی میں ایسی جرأت کا مظاہرہ کریں گے چنانچہ میں اس کی باوثوق شواہد سے تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

وکی، نانک سنگھ اور میں نے پٹیالہ کی سڑکوں پر انٹرویو کے لیے تعلیم یافتہ اور مناسب افراد تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ہمارے پاس کوئی مخصوص حوالہ یا تعلق نہیں تھا اس لیے یہ ایک مختلف نوعیت کا معاملہ بن گیا۔ ہم نے گلیوں میں معمر افراد سے ملاقات کی۔ ان میں سے کئی مغربی پنجاب سے منتقل ہو کر یہاں آئے تھے لیکن ہم بعض مقامی افراد سے بھی ملے تھے۔پٹیالہ میں فسادات کے حوالے سے ڈاکٹر حفیظ اور اس کے بھائی کا نام لیا جاتا ہے لیکن بھائی کا نام کسی کو یاد نہیں تھا۔ کسی کو ڈاکٹر کریم اور ڈاکٹر حکیم کا نام یاد نہیں تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ڈاکٹر حفیظ ایک ممتاز مسلمان تھے۔پٹیالہ شہر کے مکین امرک چند آہلووالیہ (پیدائش 1925) جن کے تاثرات باب 2 میں بھی بیان کیے گئے ہیں بھی 1947 میں اسی شہر میں موجود تھے۔

امرک چند آہلووالیہ

''پٹیالہ میں گڑبڑ آر ایس ایس اور اکالی ورکروں نے شروع کی۔ اس سے پہلے ریاست میں کسی قسم کی سیاسی سرگرمی کی گنجائش نہیں تھی لیکن 1947 میں معاملات اچانک آتش فشاں بن گئے۔ڈاکٹر حفیظ شہر کے مسلمان لیڈر اور قابل احترام فزیشن تھے۔ یہ سچ ہے کہ صورتحال اس وقت خراب ہوئی جب پولیس اور ڈاکٹر حفیظ کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ یہ بات سچ نہیں کہ ڈاکٹر حفیظ نے مہاراجہ پٹیالہ پر بھی گولی چلائی تھی۔ یہ ایک اور پولیس افسر تھا جو ڈاکٹر حفیظ کے گھر سے اسلحہ جمع کرنے آیا اور گولیوں کا تبادلہ ہوا لیکن پولیس نے مشہور کر دیا کہ ڈاکٹر حفیظ نے مہاراجہ پر فائرنگ کی۔ چنانچہ انتشار پھیل گیا۔ ڈاکٹر حفیظ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ سبزی منڈی کے علاقے میں کم از کم پچاس مسلمان قتل کیے گئے۔یہاں ٹھاک بازار جہاں ہم بیٹھے ہیں اور اکالی منڈی میں بھی مسلمانوں کو ہلاک کیا گیا۔ ان دنوں پٹیالہ شہر کی آبادی 25ہزار تھی۔ کم از کم ایک ہزار مسلمان جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ میں نے بہار سے 10 کلو میٹر دور گاؤں صفرہ میں 200، 300 مسلمانوں کی لاشیں پڑی دیکھیں۔ کوئی بھی زندہ نہ چھوڑا گیا۔ پٹیالہ میں مسلمان اسی طرح بے کس تھے جس طرح مغربی پنجاب میں ہندو اور سکھ تھے۔ ہمارا ایک ہمسایہ 1950 میں پاکستان سے یہاں واپس آیا۔ اس نے گھر کی دیوار کے پاس پانچ تولے سونا زمین میں دبا رکھا تھا۔ وہ وہاں سے نکال کر واپس پاکستان چلا گیا۔ کچھ مسلمان ان حالات میں بھی پٹیالہ میں رہے اور کبھی یہاں سے نہ گئے۔''

پنڈت موہن لال بلو

''میں 1923 میں پٹیالہ میں پیدا ہوا لیکن میں 1947 کے اوائل میں لاہور کی فلم انڈسٹری میں بطور میوزک ڈائریکٹر کام کر رہا تھا اور دیگر ساتھیوں سمیت میں نے فلم 'یملا جٹ' کی موسیقی ترتیب دی۔ گلوکارہ شمشاد بیگم اور نور جہاں نے میری موسیقی پر گانے گائے تھے۔ میں نے موسیقی کی تعلیم استاد عاشق علی خان سے حاصل کی تھی۔ مارچ 1947 میں میری بہن کی شادی طے ہونا پائی تھی چنانچہ میں آبائی شہر پٹیالہ واپس آ گیا جہاں میرا خاندان رہائش پذیر تھی۔ ڈاکٹر حفیظ کا شہر میں بڑا کلینک تھا۔ پولیس اور ڈاکٹر حفیظ کے درمیان کلینک پر کچھ ہاتھا پائی ہوئی جس پر ڈاکٹر حفیظ نے چند گولیاں

چلائیں۔ البتہ انہوں نے مہاراجہ کو فائرنگ کا ہرگز نشانہ نہیں بنایا۔ پولیس افسر شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لیے یہ واقعہ ہر طرف حملے شروع ہونے کا شاخسانہ ثابت ہوا۔ ڈاکٹر حفیظ کو بے رحمی کے ساتھ مار ڈالا گیا۔ کچھ ہندو اور سکھ بھی مرے لیکن زیادہ جانی نقصان مسلمانوں کا ہی ہوا۔ جتھوں کے سرخیل مغربی پنجاب بالخصوص راولپنڈی اور پشاور سے دربدر ہونے والے سکھ تھے۔ وہ مسلمانوں کے مظالم کا انتقام لینا چاہتے تھے اور اس موقع کو انہوں نے بھرپور استعمال کیا۔ مقامی افراد نے مسلمانوں پر حملوں میں ہرگز حصہ نہیں لیا تھا۔ میرے دوست ولی محمد، ذاکر حسین اور کئی دیگر ہمسایوں نے ایک ہندو مندر میں پناہ لی۔ میرے والد محکمہ پولیس سے ریٹائر ہوئے تھے اس لیے گھر میں کچھ اسلحہ بھی تھا۔ اس بنا پر حملہ آور گھر سے دور رہے۔ جب صورتحال کچھ بہتر ہوئی تو میرے والد نے مجھے اور میرے بھائی برج لال کو کہا کہ ہم پناہ لینے والوں کو بہادر گڑھ قلعے میں چھوڑ آئیں جہاں ایک مہاجر کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ ہم کیمپ میں بھی اپنے دوستوں کو خوراک اور دیگر چیزیں پہنچایا کرتے تھے۔"

چودھری غلام ربانی

مسلم لیگ ریاست نابھ کے صدر چودھری غلام ربانی نے کئی سکھ ریاستوں میں رونما ہونے والے واقعات بیان کیے ہیں۔ پٹیالہ کے بارے میں انہوں نے لکھا:

> ڈاکٹر حفیظ نے جوانمردی کے ساتھ پٹیالہ پولیس کے جبر کا مقابلہ کیا۔ ایسے مسلمان جنہوں نے اپنے دفاع میں آتشیں اسلحہ استعمال کرنے کی جرأت کی ان پر مہاراجہ کا قہر ٹوٹ پڑا۔ ایسے ہی ایک انسان ڈاکٹر حفیظ تھے جنہوں نے بہادری کے ساتھ اپنا اور اپنے اہل خانہ کی زندگی اور عزت کے لیے جنگ کی۔ مہاراجہ نے ٹینک کے ساتھ ان کا گھر زمین بوس کر دیا۔ پورا گھرانہ مکان کے ملبے کے نیچے دب کر مارا گیا تاہم ڈاکٹر حفیظ کو زندہ پکڑ کر درخت کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ میں نے نہایت کرب کے ساتھ یہ تفصیلات جمع کیں اور ان کی تصدیق کی اور مطمئن ہوں کہ یہ بالکل ٹھیک ہیں (1993: 223)۔

۔۔۔ڈاکٹر حفیظ یا ڈاکٹر حکیم

یہ امکان ہے کہ محمد افضال شریف پٹیالہ کے ڈاکٹر کا صحیح نام بھول گئے ہوں یا تقسیم کی داستانوں کے مرتب حکیم چغتائی نے جان بوجھ کر 'ڈاکٹر حکیم' اور 'ڈاکٹر کریم' کے نام گھڑے ہوں۔ حتیٰ کہ دوسرے بھائی کا تو سرے سے وجود ہی نظر نہیں آتا۔ دیگر تمام واقعات میں ڈاکٹر حفیظ کا ہی ذکر ملتا ہے کیونکہ انہوں نے ہی اپنے ہاتھوں سے اپنے گھرانے کی خواتین کو جان سے مارا تھا۔ اس لیے ممکن ہے کہ کسی قانونی کارروائی سے بچنے کے لیے ڈاکٹر حفیظ (ڈاکٹر حکیم) کا نام بدل دیا گیا ہو۔ میں نے اور احمد سلیم نے مزنگ چونگی (لاہور) کے علاقے میں حکیم چغتائی کے گھر جا کر ملنے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیں دستیاب نہ ہو سکے۔ احمد سلیم نے فون پر ان سے بات کر کے میری پاکستان آمد کی بات لیکن بدقسمتی سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میاں نور محمد

حکیم چغتائی کی کتاب میں دوسرا بیان میاں نور محمد ایڈووکیٹ کا دیا گیا ہے۔ میاں نور محمد کے مطابق انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد پٹیالہ میں وکالت شروع کر دی۔ شہر میں وہ واحد مسلمان وکیل تھے اور سخت محنت کے باعث انہوں نے جلد نام کما لیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ، ''جوڈیشل افسروں میں خاص طور پر سردار رنجیت سنگھ سرکاریہ قابل تعریف تھا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ ایک سکھ تھا۔ اس نے کبھی کسی مذہب کے خلاف تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا، اس لیے لوگ بھی رنجیت سنگھ سرکاریہ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مہاراجہ پٹیالہ بھوپندر سنگھ بھی پہلے اپنی رعایا کے ساتھ قطعاً متعصبانہ رویہ اختیار نہیں کرتا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کا جانشین اس کا بیٹا مہاراجہ بنا۔ اس نے بھی وہی پالیسی جاری رکھی۔''

میاں نور محمد ہمیں بتاتے ہیں کہ 23 مارچ 1940 کو لاہور میں منظور کی جانے والی قرارداد پاکستان کی بازگشت پٹیالہ میں بھی سنائی دی۔ پٹیالہ کے مسلمان بھی مسلمانوں کی الگ ریاست کے قیام کے حق میں تھے۔ پٹیالہ میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی لیکن ماحول نے سیاسی رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ 1946 کے انتخابات میں مسلم لیگ بھاری اکثریت کے ساتھ مسلمانوں کی بڑی جماعت بن کر ابھی لیکن 3 مارچ 1947 کو ماسٹر تارا سنگھ کے اشتعال انگیز بیانات نے پٹیالہ میں زبردست کشیدگی پیدا کر دی۔ وہ لکھتے ہیں:

> 18 اگست کو عید کا دن تھا۔ سکھوں نے بھٹنڈہ جو پٹیالہ ریاست کا حصہ تھا میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ حملہ آور میرے گھر کی طرف چل پڑے تھے۔ میری رہائش ہندو محلے میں تھی اور میں محلے کا واحد مسلمان وکیل تھا۔ ہم نے مسلمان محلے میں پناہ لے لی جہاں ایک مہربان مسلمان گھرانے نے ہمیں بچا لیا۔ فائرنگ شروع ہو گئی۔ پانچ روز بعد ہم گھر سے نکلے۔ میری والدہ میری شیر خوار بچی اٹھا کر ریلوے سٹیشن کی طرف چلی گئی۔ میں بیوی اور دو چھوٹے بیٹوں کے ساتھ دوسری سمت کو دوڑ پڑا۔ پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر ہم بھی ریلوے سٹیشن جا پہنچے۔ وہاں بڑی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ سکھ کرپانیں لہرا کر پاکستان مخالف نعرے لگا رہے تھے۔ اچانک ایک نیزہ بردار سکھ میری طرف لپکا۔ میں دوڑ کر بھاگا اور سٹیشن کے باہر کھیتوں میں گھس گیا۔ میں وہاں کئی روز تک چھپا رہا۔ جب صورتحال کچھ بہتر ہوئی تو میں دوبارہ سٹیشن آ گیا۔ وہاں موت کا سکوت طاری تھا اور زمین خون سے سرخ تھی۔ ایکدم مجھے اپنی بیوی اور ماں کا خیال آیا اور مجھے لگا میں دنیا میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ میں خود کو دھاڑیں مار کر رونے سے نہ روک سکا۔ میں پیدل چلنے لگا اور کچھ دیر بعد ایک گاؤں میں جا پہنچا۔ میں نے ایک دروازے پر دستک دی تو ایک عورت باہر آئی اور چلانے لگی ''مارو، مارو، ایک مسلمان یہاں ہے۔'' میں دوبارہ بھاگا اور کھیتوں میں پناہ لے لی جہاں مجھے مزید کئی روز چھپنا پڑا۔ آخر کار میں چھوٹے سے گاؤں ڈب والی پہنچا۔ (آج کل یہ گاؤں ہریانہ کے ضلع سرسہ میں واقع ہے)۔ مجھے ایک پولیس سٹیشن نظر آیا تو میں اندر چلا گیا۔ ایک ہندو کانسٹیبل نے مجھ پر ترس کھاتے ہوئے مجھے مناسب کھانا دیا۔ میری کہانی سن کر اس نے کہا کہ ایک نیا مسلمان تھانیدار پولیس سٹیشن میں تعینات ہوا ہے۔ وہ ابھی کسی تفتیش کے لیے گیا ہے لیکن تم اس کی واپسی کا انتظار کرو۔ میں اس غیر متوقع خبر پر حیران ہو گیا۔ اس کی واپسی کا انتظار کرنے کی بجائے میں خود اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس تک پہنچ گیا۔ جب میں نے اپنا تعارف

کرایا تو اس نے چہرہ پھیر لیا۔ میں بھلا ایسی صورت میں کیا کرتا۔ میں گھوم کر پھر اس کے سامنے ہو گیا۔ اس بار اس نے غصے سے کہا کہ، "گاڑی میں بیٹھو۔" پھر وہ مجھے سرسہ لے آیا۔ اس کے بعد ہم مسلمانوں کو حصار کے پناہ گزین کیمپ میں بھجوا دیا گیا۔ حصار سے میں نے بھٹنڈہ کے سول جج سردار رنجیت سنگھ سرکاریہ کو التجا کی کہ میری والدہ، بیوی اور بچوں کا پتہ چلایا جائے۔ کچھ عرصے بعد اس کا جواب ملا کہ اس کی کوششوں سے میری بیوی اور بچے زندہ مل گئے تھے۔ ہماری ٹرین 24 اکتوبر کو براستہ بھٹنڈہ پاکستان روانہ ہوئی۔ سردار رنجیت سنگھ سرکاریہ خود میرے بیوی بچوں کے ساتھ سٹیشن پر موجود تھا۔ اپنی بیوی کو پاکر میں اپنے سارے دکھ بھول گیا۔ میں نے دیکھا کہ بچے اس کے ساتھ نہیں تھے۔ مجھے بتایا کہ گیا کہ بچوں کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ میری والدہ اور بیٹی بھی نہ ملی(6-34 :1993)۔

یہ کہانی آگے بھی جاری رہی جس میں میاں نور احمد نے اپنی مزید مشکلات ذکر کیا۔ تاہم اس کی شیر خوار بیٹی پاکستان میں مل گئی۔

پٹیالہ کے دیہی علاقے

دسمبر 2004 میں راولپنڈی کے ارد گرد دیہات میں زبانی داستانیں جمع کرنے کے دوران مجھے اور احمد سلیم کو بعض لوگوں نے کلر سیداں میں چودھری روشن دین کا بتایا۔ ہم اس سے 15 دسمبر 2004 کو ملے۔ اس کی داستان انتہائی روح فرسا اور دل فگار تھی۔ بعد ازاں میں نے اس کے گاؤں آدم پور اور دیگر نواحی دیہات کا نومبر 2005 میں دورہ کیا تا کہ دوسری جانب کا نکتہ نظر معلوم کر سکوں۔ ہماری ملاقات ملیر کوٹلہ میں زندہ بچنے والے 2 دیگر افراد چودھری عبد الشکور اور اس کے کزن بابو خان سے ہوئی۔

چودھری روشن دین

"میں جون 1936 میں سرہند شریف (اب ضلع فتح گڑھ صاحب) کے گاؤں آدم پور کی آرائیں خاندان میں پیدا ہوا۔ یہ ایک بڑا گاؤں تھا جس میں اکثریتی آبادی سکھوں اور ہندوؤں کی تھی۔ ہندوؤں میں برہمن اور چمار (اچھوت) دونوں قسم کی برادریاں تھیں جبکہ مسلمانوں کے سات گھرانے تھے۔ تین آرائیں خاندان تھے جبکہ باقی گوجر اور تیلی برادری کے تھے۔ ہمارے خاندان کے پاس زرعی اراضی تھا۔ ہمارا پختہ اینٹوں سے بنا ایک بڑا گھر تھا جس میں کئی کمروں کے علاوہ وسیع دلان بھی تھا۔ تمام مذاہب کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ تقسیم کے وقت ہمارا اپنا گھر چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ زندگی پرسکون طریقے سے گزر رہی تھی کہ ایک روز بھادوں کے موسم میں اچانک سکھوں نے علاقے کا گھیراؤ شروع کر دیا۔ یہ لوگ بڑی تعداد میں اچانک آئے۔ وہ کہہ رہے تھے 'پاکستان بن چکا ہے تو یہ مسلمان یہاں کیا کر رہے ہیں؟' ہمارے گاؤں کے لوگوں نے ہمیں کہا کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔ کچھ گندے لوگوں نے ہماری کم تعداد کا فائدہ اٹھایا۔ ہماری روانگی سے قبل میرے کزن جمال دین کو ناگیا ڈاکو کے بیٹے بجے مل اور گھیر ویا گھیر سنگھ نے اس کے کنویں کے پاس موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ دونوں ہمارے گاؤں کے ہی تھے۔ انہوں نے جمال دین کی بہن اور بیوی کو اغوا بھی کر لیا تاہم بعد ازاں ان عورتوں کو حکومتی اداروں کی مدد سے بازیاب کرالیا گیا۔ حملہ آوروں میں پٹیالہ کی ریاستی فوج کی گاڑیوں پر سوار فوجی بھی تھے۔

''ہم بھارت کے قریبی مسلمان گاؤں ماٹھی پہنچ گئے۔ ارد گرد کے ہزاروں مسلمان بھی وہاں جمع تھے۔ ہم میں کسی کے پاس اسلحہ نہیں تھا اس لیے جب سکھوں نے حملہ کیا تو ہم بے بس تھے۔ حملہ آوروں نے مردوں کو خواتین اور بچوں سے الگ کیا، پھر مردوں کو کچھ فاصلے پر لے جا کر قتل کر دیا گیا۔ مرنے والوں میں میرے والد بھی شامل تھے۔ میں اور میرا چھ سالہ بھائی والدہ کے ساتھ تھے۔ خواتین کے ساتھ بھی کوئی رحم نہ برتا گیا۔ سینکڑوں خواتین کو سکھ ساتھ لے گئے۔ میری والدہ کو میرے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ چھوٹے بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ کم از کم ایک ہزار مسلمانوں کو ہلاک کیا گیا۔ میرا چھوٹا بھائی (وہ چند سال پہلے یہاں کلر سیداں میں انتقال کر گیا) میں اور دیگر تیس بچے لاشوں کے نیچے چھپ کر بچ گئے۔ قتل عام مکمل ہونے کے بعد آگ جلائی گئی اور لاشوں کو شعلوں کی نذر کر دیا گیا۔ لاشیں آگ میں پھینکتے ہوئے وہ لوگ نفرت سے کہتے تھے 'تمہارا پاکستان بن گیا ہے، جاؤ پاکستان میں۔' اس وقت رات گہری ہو چکی تھی۔ حملہ آور لاشوں کو وہیں چھوڑ کر چلے گئے جس کے بعد ہم رینگتے رینگتے باہر نکلے اور خاموشی سے دور چلے گئے۔ کچھ دیر بعد کچھ ہریجن وہاں آئے اور ہمیں زندہ حالت میں پا لیا۔ ان میں ایک چوکیدار تھا جس نے ہمیں پناہ دی اور ہم اس کے گھر کی چھت پر سو گئے۔ کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم وہاں سے قریبی سکھ گاؤں بوران گئے۔ وہاں کے سکھوں نے کچھ بچے پاس رکھ لیے جبکہ باقی ماندہ بچوں کو آگے بھجوا دیا گیا۔ یقیناً سکھوں نے ان بچوں کو ڈھور ڈنگر چرانے کے لیے رکھا ہوگا۔ پھر دو چمار سکھ ہمارے ساتھ بھجوائے گئے اور ہم سرہند شریف کے مہاجر کیمپ میں پہنچ گئے۔ ہمارے والدین اب دنیا میں نہیں تھے۔ نانا، دادا اور دیگر قریبی رشتہ دار بھی مارے جا چکے تھے۔ لدھیانہ کے ایک گاؤں میں میری بہن اور اس کا بیٹا بھی ہلاک ہو گئے لیکن میرے بہنوئی جو لدھیانہ میں تھے وہ بچ گئے۔ میرا ایک چچا اور اس کا بیٹا بھی زندہ بچ گئے لیکن وہ کسی طرح بھی ہماری مدد نہ کر سکے۔ ان کی تین بیٹیوں کو اغوا کر لیا گیا البتہ دو کو بعد ازاں بازیاب کرا لیا گیا۔ بچنے والیوں میں سے ایک ان دنوں فیصل آباد میں رہتی ہے۔

''پناہ گزین کیمپ میں ہمیں ہر روز کھانے کے لیے دلیے کی ایک پلیٹ ملتی تھی۔ کیمپ کی صورتحال بہت دگرگوں تھی۔ اس سال مسلسل بارشیں ہوتی رہیں۔ کیمپ میں ہر طرف کیچڑ بکھرا ہوا تھا، کئی بچے مر گئے۔ ہم دونوں بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنی بہن کے گھر چلے جائیں (ہمیں خبر نہیں تھی کہ وہ بے چاری ماری جا چکی تھی) لیکن وہاں تک جانے کی ہم میں ہمت نہیں تھی۔ کچھ دنوں بعد کیمپ میں ایک شخص جسے ہم تایا جی کہتے تھے نے بتایا کہ حالات معمول پر آ چکے ہیں اس لیے اگر ہم بہن کے پاس جانا چاہیں تو یہ مناسب وقت ہے۔ چنانچہ ہم دونوں پیدل چل پڑے۔ ہمیں ایک شخص ملا جو گھاس کاٹ رہا تھا۔ اس نے ہم پر رحم کھاتے ہوئے ہمیں دو آنے پیسے دیے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی ہندو تھا۔ آگے بڑھے تو ہمیں گھڑ سوار سکھ اپنی طرف آتے نظر آئے۔ وہ کیمپ سے نکلنے والے کسی مسلمان کا تعاقب کر رہے تھے۔ بہر حال ہم کسی نہ کسی طرح کمند گڑھ پہنچ گئے۔ پہلے ہمارا آمنا سامنا سکھ جوڑے سے ہوا۔ بالخصوص اس خاتون نے ہمارے ساتھ نہایت شفقت کا برتاؤ کیا۔ اس نے ہمیں کھانا دیا اور سونے کے لیے ایک چادر بھی دی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہم اس کے ساتھ گاؤں میں رہیں لیکن ہم نے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم چھپتے چھپاتے اس سڑک پر پہنچے جو لدھیانہ کو پٹیالہ سے ملاتی تھی۔ وہاں ایک کمہار اپنے گدھے چرا رہا تھا۔ وہ بھی ہندو تھا اور اس نے بھی ترس کھا کر ہمیں چار آنے دیے۔ ہم چلتے رہے اور گوبند گڑھ جا پہنچے۔ وہاں ہم نے ایک کوچوان سے پوچھا کہ وہ ہمیں مالاؤد پہنچانے کے کتنے پیسے لے گا۔ اس نے کہا کہ تم لوگ فکر نہ کرو اور بیٹھ جاؤ۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ وہ ہمیں

ایک گوردوارے میں لے آیا اور بولا، 'یہاں سے تم کو مدد مل سکتی ہے کیونکہ وہاں اور کئی دیگر مسلمان بھی پناہ لیے ہوئے تھے۔' لیکن ہم چپکے سے وہاں سے کھسکے اور مالاؤد کی طرف سفر جاری رکھا۔

"اس دوران رات ہوئی تو ہم راستہ بھول گئے اور واپس گوبند گڑھ کی طرف چل پڑے۔ وہاں دو سکھوں نے ہمیں پکڑ لیا۔ دونوں شراب کے نشے میں دھت تھے۔ ایک سکھ ہمیں جان سے مارنا چاہتا تھا لیکن دوسرے نے کہا کہ بچوں کو جانے دو۔ اس معاملے پر ان میں گرما گرمی پیدا ہو گئی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم وہاں سے بھی کھسک لیے۔ وہاں ہم نے بیل گاڑیاں جاتی دیکھیں لیکن کوشش کے باوجود ہم انہیں نہ پکڑ سکے۔ پھر ہمیں راستے میں لکڑی کا ایک تختہ ملا جہاں ہم نے رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اگلی صبح ہم نے سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ ہمیں ایک ہندو ملا اور پوچھا کہ تم کون ہو۔ میں نے اپنی شناخت نہ چھپانے کا فیصلہ کیا اور بتایا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس نے کہا کہ میں تمہیں ایک بنیا کے پاس لے جاتا ہوں۔ تم اس کی بھیڑ بکریاں پالنا لیکن میں نے کہا کہ ہم اپنے رشتہ داروں کے گھر جانا چاہتے ہیں۔ ہم چلتے رہے اور آخر قصبہ کھنہ پہنچ گئے۔ ہم سڑک کے ساتھ چل رہے تھے کہ نیکر پہنے ایک سکھ نظر آیا اور ہمیں دیکھ کر کرپان لہرائی اور بولا دونوں لڑکو ادھر آؤ۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے رشتہ دار مارے جا چکے ہیں۔ اس نے ایک اور شخص کو آواز دی اور کہا کہ بچوں کو میرے گھر لے جاؤ اور سردارنی سے کہو کہ ان کی دیکھ بھال کرے اور کھانا دے۔ سردارنی نے ہمیں بٹھا کر کھیر دی جو ہم نے روٹی پر لگا کر کھالی۔ اس دوران ایک آدمی آیا اور کہا کہ میں بچوں کو جان سے مار دوں گا۔ ان لوگوں نے اسے کمرے میں بند کر دیا اور بتایا کہ اس کے رشتہ دار مارے جا چکے ہیں جس کے صدمے میں وہ حواس کھو بیٹھا تھا۔ ہم نے چھوٹا کھنہ جانے کا راستہ پوچھا (اب اسے کھنہ خورد کہتے ہیں)۔ انہوں نے سمت بتائی تو ہم آگے بڑھنے لگے۔ کھنہ میں ہمیں ایک لڑکی مویشی چراتے ہوئی ملی تو ہم نے اس سے ریونہ کا راستہ پوچھا (ممکن ہے یہ ریونہ اچا ہو، علاقے میں ریونہ نام کے کئی گاؤں تھے لیکن وہ اس جگہ سے ہٹ کر تھے)۔ جہاں ہمارا کزن رہتا تھا۔ اس نے راستہ سمجھا دیا۔ یہ کافی دور تھا جبکہ راستہ گرم اور گرد آلود تھا۔ میرے بھائی کو پیاس لگ گئی۔ ہم ایک کنویں کے پاس آئے لیکن اس میں سے پانی اوپر نہ کھینچ سکے۔ پھر ایک نوجوان سکھ آیا اور پانی نکالنے میں ہماری مدد کی۔ ہم نے اپنی پیاس بجھا لی۔ کچھ لڑکے تاش کھیل رہے تھے۔ ہم نے ان سے سمت پوچھی جو انہوں نے بتا دی۔

"پھر ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور بولا 'ڈرو مت میں مسلمان ہوں، میں نے کڑا پہن رکھا ہے اور سکھ بن گیا ہوں لیکن تمہاری مدد کروں گا۔ تم رات ہمارے پاس ٹھہرو۔' ہم اس کے اہل خانہ کے ساتھ ٹھہر گئے اور نہا کر کپڑے بھی تبدیل کر لیے۔ کئی اور لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ اچانک ایک پیامبر آیا اور کہا کہ دو سکھ عورتیں لوہار کے گھر میں تھیں جو ہمیں آگے جانے میں مدد فراہم کریں گی۔ ہم ان کے ساتھ گئے اور ایک دوسرے گاؤں میں قیام کیا۔ وہاں ہم تین راتیں مقیم رہے۔ چوتھے روز ان سکھ عورتوں کے بھائی نے تلوار اٹھائی اور کہا کہ آؤ میرے ساتھ چلو۔ ہمیں ایک نہر کا پل پار کرنا تھا۔ وہاں سکھ جتھوں سے ہماری مڈ بھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے پوچھا 'سردار جی، ان لڑکوں کو کہاں لے جا رہے ہو؟، ہم ان کا کام تمام کر دیں گے۔' اس سکھ نے تلوار سونت کر کہا کہ پہلے مجھے مارو چنانچہ ہمیں آگے جانے دیا گیا۔ بالآخر ہم مالاؤد پہنچ گئے۔ یہ ضلع لدھیانہ میں ملیر کوٹلہ ریاست کے قریب چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں ہمیں پتہ چلا کہ قریبی علاقے میں سکھ فوجی موجود ہیں۔ پھر سکھ نے ہمارے سر پر سکھوں کی طرح پگڑی باندھ دی۔ اس کی دونوں بہنیں بھی دھیرے دھیرے ہمارے پیچھے آ رہی

تھیں۔ پھر وہ چانن وال گاؤں میں لے گئے۔ یہ ملیر کوٹلہ کی سرحد پر واقع تھا۔ ہم ان کے ساتھ بیس روز تک رہے۔ انہیں معلومات ملیں کہ ہمارے نانا، نانی سمیت ننھیال کے تمام رشتہ دار مارے جا چکے تھے۔ ہم نے اس گھر میں خون آلود نیزے اور گنڈاسے بھی دیکھے جس سے پتہ چلا کہ مسلمانوں پر حملوں میں یہ گھرانہ بھی حصہ لیتا رہا تھا۔ لیکن اللہ نے اس سکھ خاتون کا بھلا کرے جو ہمارے لیے کھانا تیار کرتی اور ہمارا بیس روز تک اچھا خیال رکھا۔ وہ واقعی خدا ترس عورت تھی۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ اسے جنت میں جگہ دے۔

"وہ ہمارے لیے لسی اور سبزیاں تیار کرتی تھی کیونکہ مسلمان ہونے کے ناتے ہم ان کے طریقے سے تیار کردہ گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ایک روز ایک چمار ان کے گھر آیا اور خاتون کو بتایا کہ قریبی گاؤں روہیڑا (ملیر کوٹلہ) میں ایک شخص بس پر مسلمانوں کو پاکستان بھیج رہا تھا۔ اگر آپ پسند کریں تو میں لڑکوں کو وہاں پہنچا دیتا ہوں۔ وہ اس شرط پر راضی ہوئی کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ وہ آدمی ہمیں ایک لمبر دار کے پاس لے گیا جو آرائیں برادری کا تھا۔ اس کی ماں اور بہن نے بھی ہمارا خوب خیال رکھا۔ وہ لمبر دار چاہتا تھا کہ ہم س کے گھر میں اس کے بیٹے بن کر رہیں کیونکہ وہ 25 بیگھہ زمین کا مالک تھا لیکن اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ میں نے پیشکش مسترد کر دی۔

"اس دوران ملیر کوٹلہ میں ایک نائی آیا اور لوگوں کو بتایا کہ سرہند شریف پٹیالہ سے روشن دین اور تاج دین نام کے دو لڑکے آئے ہیں۔ میری خالہ جو ملیر کوٹلہ میں بیاہی تھیں نے نام سن کر کہا کہ یہ دونوں میرے بھانجے ہیں۔ ہماری خالہ اور کزنوں نے ہمیں پہچان لیا لیکن چند روز کے بعد خالہ کا شوہر ہم سے تنگ آ گیا۔ اس نے ہمیں پاکستان جانے والی ٹرین پر سوار کرا دیا۔ ملیر کوٹلہ کیمپ میں ہزاروں مسلمان پناہ گزین تھے۔ تمام لوگ ٹرین پر نہیں چڑھ سکتے تھے اس لیے کئی افراد کو پیدل ہی چلنا پڑا۔ یہ ٹرین تین بار آئی اور گئی۔ تیسرے پھیرے میں ہمیں اوپر چڑھنے کا موقع ملا۔ جب ہم سرحد پر پہنچے تو پاکستان کی حدود میں قصور کو ملانے والی پٹڑی تباہ ہو چکی تھی۔ دوسری طرف مسلح سکھوں سے بھرے ٹرک دریائے ستلج کے قریب کھڑے تھے۔ ٹرین کے ساتھ جانے والے گورکھا فوجیوں نے وائرلیس پر پاکستان پیغام بھجوایا جس پر پاکستان نے فوجیوں سے بھرے ٹرک بھجوا دیئے۔ وہ ہمیں اپنی حفاظت میں لے آئے۔ مرد پیدل چل رہے تھے جبکہ بوڑھے، خواتین اور بچے بسوں پر سوار ہو کر سرحد پار کر گئے۔ ہم کیمپ میں تین روز تک مقیم رہے۔ پھر ہمیں راولپنڈی کے قریب حسن ابدال کیمپ میں بھجوا دیا گیا۔ ایک روز ایک سکول ماسٹر آیا اور مجھے گود لینے اور میری پرورش کرنے کا وعدہ کیا جبکہ دوسرا آدمی غفور میرے بھائی کو لے گیا۔ میں راولپنڈی میں تحصیلدار حاجی صفدر کے دفتر میں ملازم تھا۔ وہاں ایک کلرک فضل احمد تھا جو خود بھی مہاجر تھا، اس نے آدم پور میں ہماری جائیداد کے کلیم میں ہماری مدد کی۔ میں نے درخواست کی کہ ہمارے گاؤں کے لمبر دار کو خط لکھا جائے تاکہ وہ ہماری اراضی کی تصدیق کر دے۔ اس کے علاوہ اس کلرک نے مشرقی پنجاب میں ہماری جائیداد کے بدلے میں یہاں متروکہ وقف املاک کے کلیم کے لیے ایک فارم بھی بھروایا۔ حاجی صفدر صاحب نے میری طرف سے کاغذات پر دستخط کیے کیونکہ میں نابالغ تھا۔ چند ہفتوں بعد لمبر دار کے دستخط سے تصدیق کا خط بھی موصول ہو گیا۔ یہاں آ کر بھی معاملات پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے تھے اور ہمیں کئی روز تک بھوکا رہنا پڑتا۔ ہمارے کسی رشتہ دار نے ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ بالآخر ہمیں اراضی الاٹ کر دی گئی۔ 1955 سے میں یہاں کلر سیداں میں آباد ہوں۔ کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ میں تمام سکھوں کو قتل کر دوں۔

انہوں نے میرے اہل خانہ پر مظالم کی انتہا کر دی تھی۔ میرے تقریباً تمام قریبی رشتہ دار مارے گئے۔ یقیناً کچھ سکھ اچھے اور خدا ترس بھی تھے۔ اس کے باوجود میں سکھوں کو معاف نہیں کر سکتا۔

"اب حالات بہت اچھے ہیں۔ میں یہاں پیپلز پارٹی کا صدر رہوں۔ میں نے کبھی کوئی غلط یا غیر قانونی کام نہیں کیا۔ اب دو، تین مارکیٹیں میری ملکیت ہیں۔ بچے اچھے مقام پر ہیں۔ یہاں ہمارے پانچ گھر ہیں۔ اس خطے میں ہماری برادری کے بہت کم لوگ ہیں۔ یہ بات میرے لیے پریشان کن ہے۔ میں اپنے بچوں کی شادی آرائیں برادری میں ہی کرنا چاہتا ہوں لیکن مناسب رشتہ ڈھونڈنا مشکل ہے۔ میں آج بھی بھٹو صاحب سے محبت کرتا ہوں۔ میں سیاسی سرگرمیوں کے باعث جیل میں بھی رہا۔ ضیاالحق نے مجھے جیل میں ڈالا تھا۔ ہم 200 افراد جیل گئے تاہم ہائیکورٹ کے حکم پر ہمیں رہائی ملی۔ یہ 1986 کی بات ہے، پولیس نے آدھی رات کو چھاپہ مار کر مجھے گرفتار کر لیا۔ پیپلز پارٹی کے مقامی ایم پی اے قیوم بٹ نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔ بھٹو کا قتل (پھانسی) ایک بڑا جرم تھا۔"

آدم پور میں ریکارڈ کیے گئے انٹرویو

ہتیش گوسین، ورندر سنگھ اور میں مقامی واقف کاروں کی مدد سے صبح 11 بجے آدم پور پہنچے۔ وہاں ایک سکھ کھلاڑی بھی تھا جس نے بین الاقوامی کبڈی مقابلوں میں بھارت کی نمائندگی کرنے کی شرٹ فخریہ انداز میں پہن رکھی تھی۔ گاؤں میں سیالکوٹ کے مہاجر سکھ آباد تھے تاہم مقامی سکھ بھی موجود تھے۔ ہم نے گاؤں کے داخلی راستے پر ان لوگوں کو بیٹھے دیکھا۔ شروع میں وہ ہم سے کوئی بات کرنے سے گریزاں رہے لیکن جب ہم نے انہیں تسلی دی کہ ہم صرف 1947 کے واقعات پر ریسرچ کر رہے ہیں تو وہ انٹرویو دینے پر تیار ہو گئے۔

بستا سنگھ اور ناؤ گر ڈیال سنگھ

دو بزرگ سکھوں نے ہمیں انٹرویو دیے۔ ایک بستا سنگھ (75 سال) اور دوسرا ناؤ گر ڈیال سنگھ (80 سال) تھا۔ یہ دونوں سدھو جاٹ ہیں۔ انہوں نے فسادات سے متعلق یہ تفصیل بتائی:

"آدم پور میں زیادہ تر آبادی سکھوں کی تھی۔ کچھ برہمنوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں اور سات، آٹھ مسلمانوں کے بھی گھر تھے۔ مسلمانوں میں اکثر آرائیں تھے لیکن کچھ گوجر اور تیلی برادری کے گھر بھی تھے۔ آرائیں مسلمان گوبند گڑھ کے گاؤں سالیانی سے یہاں آئے تھے۔ انہوں نے یہاں اراضی خریدی اور ایک بڑی حویلی میں رہتے تھے جس میں کئی کمرے تھے اور ارد گرد مضبوط چار دیواری تھی۔ 1947 کی گڑبڑ شروع ہونے سے پہلے ہم سب پر امن انداز میں رہتے تھے اور گاؤں کے میلوں ٹھیلوں میں حصہ لیتے تھے۔ گاؤں کا ایک ہی کنواں تھا جس سے سب لوگ پانی لیتے تھے البتہ مسلمانوں کی کنویں تک رسائی مختلف راستے سے تھی۔ ایک آرائیں کا نام جمال دین تھا۔ اس کے والد کا نام اللہ بخش تھا جس کے دو بھائی برکت اور سوندھی تھے۔ سوندھی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ سوندھی کی موت کے بعد برکت نے اس کی بیوہ سے شادی کر لی جس سے اولاد ہو گئی۔

''بھادوں کے مہینے میں یہاں کشیدگی کا آغاز ہوا۔ مسلمان فوری طور پر اپنے ہم مذہب افراد کے بڑے گاؤں ماٹھی کی طرف چلے گئے۔ حملہ آوروں میں انگریز فوج کے ریٹائر سکھ فوجی اور مغربی پنجاب سے یہاں آنے والے سکھ شامل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ مغربی پنجاب میں سکھوں پر ہونے والے مظالم کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ ہمارے گاؤں کے چند بد طینت لوگوں نے بھی حملے میں حصہ لیا۔ ان میں دس نمبری مجرم ناگیا کا بیٹا جے مل بھی تھا۔ اب یہ دونوں باپ بیٹا مر چکے ہیں۔ جرائم پیشہ لوگوں کی عمریں زیادہ نہیں ہوتیں۔ 2 تیلی مسلمانوں مگھی اور چمبہ کو گاؤں میں قتل کر دیا گیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ جمال دین آرائیں کو بھی ہلاک کر دیا گیا تھا لیکن وہ گاؤں سے باہر مارا گیا تھا۔ نچلی ذات کے کچھ مسلمانوں نے سکھ مذہب قبول کر لیا اور یہاں گاؤں میں رہ گئے۔ ایک ایسے ہی مسلمان کا چند برس پہلے ہی انتقال ہوا ہے۔ کئی دیہات بالخصوص ماٹھی میں مسلمانوں کا کافی قتل عام کیا گیا۔ کئی مسلمان خواتین نے خود کنوؤں میں کود کر جان دی جبکہ مردوں اور بچوں کو زبردستی کنویں میں دھکیلا گیا۔ ہم نے مسلمانوں کو پناہ نہ دی کیونکہ حملہ آور ہمیں بھی سزا دے سکتے تھے یا پولیس ہمیں اس کیس میں ملوث کر دیتی۔ ہاں ہم نے خود کسی مسلمان کو مارا نہ ان کے اثاثے لوٹے تھے۔ اس سال ہر روز بارش ہوتی تھی۔ یہ سال کا آٹھواں مہینہ (اگست) تھا۔''

ہم تینوں (مصنف اور ساتھی) اس کے بعد ماٹھی گاؤں گئے۔ موجودہ لمبر دار نے بتایا کہ وہ تقسیم کے بعد پیدا ہوا تھا اس لیے ان دونوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتا سکتا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ماٹھی کے باہر مسلمانوں کا بہیمانہ قتل کیا گیا تھا لیکن حملہ آور باہر سے آئے تھے۔ وہ کوئی انٹرویو دینے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے کہا کہ گاؤں میں کوئی بھی آپ کو تفصیل نہیں بتا سکے گا کیونکہ بیشتر لوگ پاکستان سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے ہیں۔ ہمارے اصرار پر اس نے مشورہ دیا کہ آپ لوگ گاؤں بوران جائیں جو ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور وہاں تیجا سنگھ سے ملیں۔ وہ ماٹھی میں ہونے والے تمام واقعات سے آگاہ ہے۔

تیجا سنگھ

ہماری ملاقات تیجا سنگھ (76 سال) سے ہوئی تو وہ گھر سے باہر چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک دراز قامت اور وجیہ سکھ تھا۔ اس نے ہمیں یہ تفصیل بتائی:

''ماٹھی مسلمانوں کی اکثریت کا گاؤں تھا۔ 1947 میں حملہ کرنے والے باہر کے لوگ تھے۔ ہم تو مسلمانوں سے بھائیوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ یہاں جاٹ مسلمان بھی تھے۔ ان میں سے ایک الٰہی بخش تھا۔ کئی کمہار مسلمان بھی تھے۔ ماٹھی ہمارے گاؤں بوران سے بڑا تھا۔ حملہ دن کے وقت کیا گیا۔ بارش ہو رہی تھی۔ میں گاؤں سے باہر مویشی چرا رہا تھا۔ حملے میں 800 سے ایک ہزار کے قریب مسلمانوں کو ہلاک کیا گیا۔ میں ماٹھی گیا تاکہ پتہ کر سکوں کہ جاٹوں کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ پتہ چلا ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔ صرف ایک چھوٹا بچہ زندہ تھا جو چنن کا بیٹا جامو تھا۔ میں نے جامو کو اپنی پناہ میں لے لیا اور وہ 4، 5 سال ہمارے ساتھ رہا۔ پھر اس کا ماموں پاکستان سے آیا اور بتایا کہ بچے کے تمام قریبی رشتہ دار مارے جا چکے ہیں۔ اگر بچہ پاکستان چلا جائے تو ہم اس کی

ملکیت جائیداد کا کلیم داخل کر سکتے ہیں۔ میں نے اسے پولیس سٹیشن چھوڑا اور تاکید کی کہ پاکستان جا کر مجھے خط لکھنا لیکن اس کا خط کبھی نہ آیا۔

"ماٹھی میں ایک مسلمان کمہار عورت بھی رہتی تھی۔ ماٹھی کا لمبر دار گجا سنگھ تھا۔ اس کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے بیوی کی اجازت سے اس مسلمانوں خاتون کو دوسری بیوی بنالیا۔ اس کمہارنی کا نام بچنی تھا۔ دراصل وہ کمہاروں کی بہو تھی۔ حملے میں اس کا شوہر اور تمام اہل سسرال مارے گئے۔ بہر حال پولیس نے خاتون کا سراغ لگالیا اور اسے جالندھر لے گئی لیکن گجا سنگھ چلا گیا اور بھاری رشوت دے کر خاتون کو واپس لے آیا۔ وہ بھی یہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ گجا سنگھ اور بچنی دونوں اب مر چکے ہیں۔ ان کا بیٹا بلدیو سنگھ اب ماٹھی کا لمبر دار ہے۔ (اسی آدمی نے ہمیں انٹرویو دینے سے گریز کیا تھا)۔ جب قریبی دیہات کے مسلمانوں نے ماٹھی میں جمع ہونا شروع کیا تو سکھ جاٹ بھاگ کر بوران آ گئے۔ ماٹھی پر حملے کا منصوبہ ساز بوران کا گندا انسان بتا سکھ تھا۔ اس کے ڈاڈھیری میں رشتہ دار تھے۔ وہاں سے وہ جتھہ دار بابا کو لے آیا۔ ان کے ساتھ ارد گرد کے جرائم پیشہ افراد کا گروہ تھا۔

"حملہ نہایت شدید تھا۔ مسلمانوں کو یہ جھوٹ بول کر گھر سے باہر نکالا گیا کہ انہیں سکھ بنایا جائے گا۔ پھر انہیں دھوکہ دہی سے کھیتوں میں قتل کر دیا گیا۔ بوڑھی عورتوں کو مار ڈالا گیا جبکہ جوان خواتین سے زیادتی کی گئی یا اغوا کر لیا گیا۔ ان میں سے کچھ نے خود کنوؤں میں چھلانگ لگا دی جبکہ دیگر کو حملہ آوروں نے پھینک کر دیا۔ بچوں اور بوڑھوں تک کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے کنویں یا چھپڑوں میں لاشیں پھینک دی گئیں۔ یہ صورتحال اس وقت پیدا ہوئی جب سرہند میں ایک ٹرین آئی جو سکھ عورتوں کی لاشوں سے بھری تھی۔ ان خواتین کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں اور لاشیں کٹی پھٹی تھیں۔ مہاراجہ پٹیالہ نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر ننکانہ صاحب پر مسلمانوں نے حملہ کیا تو وہ اپنی فوج کو سرہند کیمپ پر حملے کا حکم دے دے گا لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا اس لیے سرہند کیمپ بھی محفوظ رہا۔ کئی مسلمان وباؤں، خوراک کی کمی یا گندی صورتحال کے باعث ہلاک ہو گئے۔

"حملوں کی بڑی وجہ دولت کی حرص اور لوٹ مار کی نیت تھی۔ امام دین اور نظام دین کافی مالدار تیلی تھے اور لوگوں کو بلا سود قرضے دیا کرتے تھے۔ وہ مشکل کی گھڑی میں بلا تفریق مذہب گاؤں والوں کی مدد کرتے تھے۔ جب حملہ ہوا تو کسی کو نہ بخشا گیا۔"

جب ہماری تیجا سنگھ سے گفتگو ہوئی تو اس کے 48 سالہ بیٹے گردیپ سنگھ نے بھی اس کی معاونت کی کیونکہ بوڑھے کی آواز کافی مدہم تھی۔ گردیپ سنگھ نے بتایا کہ لمبر دار گجا سنگھ اکثر کہتا ہے کہ یہاں کے مسلمان بہت نیک اور اچھے لوگ تھے۔

ملیر کوٹلہ کا خصوصی استثنیٰ

میں جانتا تھا کہ ملیر کوٹلہ کی ننھی سی ریاست جس کا حکمران مسلمان نواب تھا میں 1947 میں داخل ہونے والے کسی بھی مسلمان کو مکمل امان حاصل تھی۔ 1941 کی مردم شماری کے مطابق ملیر کوٹلہ کی کل آبادی 88 ہزار 109 تھی۔ تینوں

بڑے مذاہب کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ ہندوؤں کی تعداد 23 ہزار 479 یا تقریباً 27 فیصد تھی۔ ہندوؤں میں اونچی اور نچلی ذات کی ذیلی تقسیم بھی تھی۔ مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد یعنی 33 ہزار 881 یا 38.4 فیصد تھی جبکہ سکھ 30 ہزار 320 یا کل آبادی کا 34.4 فیصد تھے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سکھ حملہ آور ملیر کوٹلہ کی حدود میں داخل ہونے والے کسی مسلمان کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ یہ دراصل سکھوں کے گورو گوبند سنگھ کے حکم کا احترام تھا جس نے ملیر کوٹلہ کے نواب کے لیے اچھے الفاظ استعمال کیے تھے کیونکہ اس نواب نے مغل حکمرانوں کے دباؤ کے باوجود گوبند سنگھ کے بیٹوں کو پناہ دی تھی۔ اس کے بعد گورو گوبند نے حکم دیا کہ ملیر کوٹلہ کے مسلمانوں کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ البتہ آئن کولینڈ نے اپنی کتاب میں یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ ملیر کوٹلہ کے مسلمان کافی مسلح تھے اور سکھوں کو حملے کی صورتحال میں کافی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہم نے سنا کہ تخت ہزارہ کے سکھوں نے مہاراجہ پٹیالہ سے مل کر سکھ جتھوں کو ملیر کوٹلہ کے اندر حملے کرنے کی اجازت طلب کی لیکن وہ نہ مانا چنانچہ جس وقت ریاست کے باہر ہزاروں مسلمانوں کو کاٹا جا رہا تھا اس وقت ملیر کوٹلہ کے اندر مسلمان نہ صرف محفوظ رہے بلکہ متاثرہ مسلمانوں کو پناہ بھی دی گئی۔ میں ملیر کوٹلہ جانے کا کافی مشتاق تھا تاکہ وہ رونما ہونے والے واقعات جان سکوں۔ سٹاک ہوم میں میرے ایک دوست رضوان ڈار نے میرے ملیر کوٹلہ کے دورے کا بندوبست کیا۔ اس کی کزن کی شادی ملیر کوٹلہ کے ڈاکٹر نظام دین سے ہوئی تھی۔ 6 جنوری 2005 کو ڈاکٹر نظام دین نے اپنے گھر پر ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔

ڈاکٹر نظام دین

"میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ ملیر کوٹلہ میں کیا ہوا تھا۔ یہ ریاست اس لیے خونریزی سے محفوظ رہی کیونکہ نواب صاحب نے تحریک آزادی کے دوران اپنی غیر جانبداری برقرار رکھی۔ ان کا ایک کزن لاہور میں مسلم لیگ کا لیڈر تھا اور وہ شاہی خاندان پر دباؤ ڈالتا تھا کہ قیام پاکستان کی حمایت کی جائے تاہم اس امر کی ریاستی عمائدین نے مزاحمت کی۔ نواب ملیر کوٹلہ کے قریبی سکھ خود مختار حکمرانوں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے اور ریاست کے ہندو اور سکھ نواب صاحب کے وفادار رہے۔ کچھ لوگ مسلم لیگ کے حامی تھے لیکن مجموعی طور پر فرقہ وارانہ امن برقرار رہا۔ یہ سچ ہے کہ سکھوں کے ممکنہ حملے کی صورت میں مزاحمت کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ریاستی پولیس اور چھوٹی فوج ہتھیاروں سے مسلح تھی اور مزاحمت کر سکتی تھی لیکن بڑی تعداد میں سکھوں کو داخل ہونے سے نہیں روک سکتی تھی۔ میری یہ سوچ ہے کہ مہاراجہ پٹیالہ نے نواب کو یقین دلایا تھا کہ ملیر کوٹلہ کو حملوں سے استثنیٰ دیا جائے گا۔ میں نے سنا ہے کہ انگریزوں کا بھی نواب سے رابطہ تھا اور انہوں نے اسے ممکنہ حملے کی اطلاع دی تھی۔ اگر سکھ ملیر کوٹلہ پر حملہ کرتے تو یہ ایک بڑی خبر بن جاتی۔ اس چیز سے جتھے بچنا چاہتے تھے۔ وہ اپنا ایجنڈہ خفیہ طریقے سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ برس گاؤں میں 300، 400 مسلمان عورتوں اور لڑکیوں نے بے حرمتی سے بچنے کے لیے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ ملیر کوٹلہ نے لاکھوں مسلمانوں کو محفوظ پناہ گاہ فراہم کی۔ ہزاروں افراد سرحد کے باہر مارے گئے۔ شاید سکھوں نے گورو گوبند کے حکم کے احترام میں ملیر کوٹلہ کو بخش دیا تھا۔ اکثر سکھ گورو گوبند کا نہایت احترام کرتے ہیں اور ان کے حکم پر چلنا ان کے لیے اہم تھا۔"

ملیر کوٹلہ کے مہاجرین

ڈاکٹر نظام دین نے اپنے دو کزنوں کا انٹرویو کرنے میں ہماری مدد کی جو گاؤں کاکڑہ سے بھاگ کر ملیر کوٹلہ آباد ہوئے۔

چودھری عبدالشکور

''میں کاکڑہ بھوانی گڑھ پٹیالہ کے مسلمان کمبوہ خاندان میں پیدا ہوا۔ یہ 1200، 1300 افراد پر مشتمل بڑا گاؤں تھا۔ اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ دوسرے نمبر پر ہندو تھے جن میں سے بیشتر کھتری اور کمہار تھے۔ مسلمانوں کی بڑی برادریوں میں رنگڑ راجپوت، کمبوہ، گوجر، تلی، دھوبی اور پچیس سے، تیس فقیر برادری شامل تھیں۔ گاؤں میں کوئی سکھ نہیں تھا۔ پانچ مسجدیں اور ایک مندر تھا۔ رنگڑ راجپوت جنہیں خان صاحب کہا جاتا تھا وہ گاؤں کے چودھری تھے۔

''یہ بھادوں کی 3 تاریخ (3 ستمبر 1947 بنتی ہے۔ مصنف) تھی جب اچانک ہزاروں سکھوں نے گاؤں کا گھیراؤ کر لیا۔ نماز ظہر ختم ہوئی تھی اور گھڑی نے پورے 2 بجائے تھے کہ میرا کزن جو کنوئیں کی طرف جا رہا تھا اچانک چیخ کو بولا 'دیکھو گاؤں ٹوڈا کی طرف سے بے شمار لوگ ہمارے گاؤں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔' چنانچہ میرے چچا نے فوراً اونٹ کو اٹھایا اور بیٹے کو پیچھے بٹھا لیا۔ کسی نے ان پر فائرنگ کی جس سے گولی انکی ٹانگ پر لگی۔ بہرحال وہ گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ حملہ شروع ہو چکا تھا۔ ڈھائی، تین سو مسلمان مارے گئے لیکن کچھ حملہ آور بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مکینوں نے گاؤں خالی کرنا شروع کر دیا۔ ہم رات کو 10 بجے گھر سے نکلے۔ ہم چھیٹاں والی پہنچے تو بارش ہو رہی تھی۔ کئی دیگر دیہاتی بھی ہمارے ساتھ آ ملے۔ چھیٹاں والی میں ایک اور حملہ ہوا جس میں مزید 6، 7 افراد ہلاک ہو گئے۔ 6 بھادوں (6 ستمبر) کو ہم اس گاؤں سے بھی نکل گئے۔ حملہ آوروں کی نظر سے بچنے کی امید پر اس بار بھی ہم رات کے وقت نکلے۔ ہم کچھ فاصلہ طے کر کے نابھ ریاست کے علاقے ٹونگا میں داخل ہوئے۔ وہاں مٹی کے ٹبے (ٹیلے) تھے۔ ہم وہاں کچھ روز مقیم رہے پھر ملیر کوٹلہ کی طرف سفر جاری رکھا۔ ہم نے نہر پار کی تو خود کو ایک بے آب و گیا علاقے میں پایا۔ سیم اور تھور نے پورے علاقے کو بنجر کر دیا تھا۔ یوں ایک وسیع و عریض میدان کسی تحفظ کے بغیر مسلمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ پھر صحیح معنوں میں قتل عام کا آغاز ہو گیا۔ ہزاروں لوگ مارے گئے۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا تھا۔ میرے والد، ایک چچا کے سوا تمام چچا، میرے والد کے چچا، میرے چار بھائی اور چار کزن بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیے گئے۔ میرے خاندان کے 145 افراد جان سے گئے۔ میں، میرا بھائی اور والدہ بچ گئے۔

''میں زخمی ہوا (اس نے چھاتی پر ایک گہرا گھاؤ دکھایا)۔ ہم کماد کے کھیت میں چھپ گئے۔ پھر ہم نے پل کے ذریعے نہر پار کی۔ ہم نے دو بہنوں کی لاشیں زمین پر پڑی دیکھیں۔ چند روز پہلے ہی عید منائی گئی تھی۔ ان بے چاری بہنوں نے خوبصورت کپڑے پہن رکھے تھے اور جوتے بھی نئے تھے۔ ایک کا چار ماہ کا بچہ تھا جبکہ دوسری عورت کی دو ماہ کی بیٹی تھی۔ دونوں بچے زندہ تھے۔ میری ماں نے کہا کہ ہمیں انہیں ساتھ لے لینا چاہیے۔ میں اور میرے بھائی نے انہیں اٹھا لیا۔ پھر ہم ملیر کوٹلہ کے بالکل سرحد پر واقع علاقے جین پور پہنچ۔ وہاں ہماری ملاقات رائفل بردار سکھ جاٹوں سے ہوئی۔ انہوں نے ہمیں کہا 'رک جاؤ۔' پھر مزید افراد وہاں جمع ہو گئے۔ ہم سب ملا کر 12، 14 افراد تھے۔ سکھوں نے ہمیں مارنے نہ دیا۔ ہمیں ایک جگہ پر لے جایا گیا جہاں 200 سے 250 مسلمان لڑکیاں جمع تھیں۔ سکھ ان لڑکیوں کی ملکیت کے حصے پر جھگڑا کر رہے تھے۔

کوئی کہتا میں یہ لوں گا، کوئی کہتا میں وہ لڑکی لوں گا۔ لیکن کچھ سکھوں نے اس غیر اخلاقی لین دین سے منع کیا جس پر مجرمانہ ذہنیت والے سکھ منتشر ہو گئے۔ اس کے بعد ہم سب مانک ماجرا پہنچے جہاں ملیر کوٹلہ کے سپاہی انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اور گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ ہم نے شیر خوار بچے ان کے سپرد کیے اور ملیر کوٹلہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں پر ہماری ملاقات اپنی دادی سے ہو گئی جو خود وہاں پہنچ گئی تھیں۔ اس وقت سے ہم ملیر کوٹلہ میں رہ رہے ہیں۔ کئی ہزار مسلمانوں کو میری آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا۔ کرپانیں، برچھیاں اور رائفلیں استعمال کی گئیں۔ لوگ رحم کی بھیک مانگ رہے تھے اور اپنا سب مال اسباب دینے کو تیار تھے لیکن سکھوں نے پھر بھی انہیں قتل کر دیا یا ساتھ لے گئے۔ بعد ازاں کچھ خواتین بازیاب بھی ہو گئیں۔ ملیر کوٹلہ میں ہم نے کہیں خوف محسوس نہیں کیا۔ ڈاکٹر نظام دین ہمارے خاندان کی طرح ہیں۔"

بابو خان

بعد ازاں عبد الشکور کے کزن بابو خان (پیدائش 1940) بھی ہماری گفتگو میں شامل ہو گئے۔ بابو خان عبد الشکور کے چچا کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ:

"حملے کے روز میرے چچا آئے۔ اس وقت بچے کھیل رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا 'جلدی کرو، ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔' ہم نے نکلنے کی کوشش کی لیکن گاؤں کا چاروں اطراف سے محاصرہ کیا جا چکا تھا لہٰذا ہم واپس آ گئے۔ حملہ آور باہر کے لوگ تھے۔ نیزوں، بھالوں اور لمبے پھل والے چاقوؤں سے لیس ہزاروں افراد گاؤں کی طرف پیشقدمی کر رہے تھے جبکہ ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ یہ بہت دہشتناک منظر تھا۔ ہم نے کھیتوں میں چھپنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میرے والدین، بھائی اور بہنیں کھیتوں میں چلے گئے۔ سکھ باہر سے للکارتے رہے کہ باہر آؤ لیکن ہم نے سنی ان سنی کر دی۔ انہوں نے حملہ کر دیا اور میرے ماں باپ کو گنڈاسے کا ایک وار لگا۔ والد زخمی حالت میں بھاگتے رہے لیکن پھر حملہ آوروں نے تعاقب کر کے انہیں نیچے گرا دیا۔ میں وہاں کھڑا یہ سب مناظر دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بچوں کو کچھ نہ کہا۔ میرا چھوٹا بھائی رونے لگا تو میں نے کہا، 'مت رو۔' ماں نے اسے دکھایا کہ تیز دھار پھل کے وار سے ان کا پیٹ چاک تھا اور انتڑیاں باہر کو لٹک رہی تھیں۔ ہم صدمے سے سن ہو کر رہ گئے۔ پھر ایک سکھ بولا 'کھیت کو آگ لگا دو۔' میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ سکھوں نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ بچے کے پاس کچھ نہیں ہے، بڑوں کو دیکھو جن کے پاس پیسہ اور زیورات ہیں۔ میں ایک جھاڑی میں دبک کر بیٹھ گیا۔ ہزاروں افراد میری آنکھوں کے سامنے مارے گئے۔

"پھر میں نے اپنی ماں اور دیگر اہل خانہ کو زور زور سے پکارنا شروع کر دیا لیکن والدہ، میرے دو بڑے اور دو چھوٹے بھائی مردہ حالت میں پڑے تھے۔ والد کو بھی قتل کیا جا چکا تھا۔ اس دوران ہماری کمبوہ برادری کی ایک لڑکی وہاں آئی۔ وہ مجھ سے تھوڑی سی بڑی تھی۔ صرف ہم دونوں زندہ بچے تھے۔ قریب ہی ایک کنواں تھا ہم وہاں چلے گئے۔ بارش ہو رہی تھی۔ میں نے گاؤں واپس جا کر کھانے کو کچھ لانے کا فیصلہ کیا لیکن پورا گاؤں شعلوں میں جل رہا تھا۔ پھر میں واپس آیا تو لڑکی کہیں جا چکی تھی یا اسے اٹھا لیا گیا تھا۔

''میں نے پوری رات کنویں پر گزاری اور قریب ہی بنے ایک چھوٹے سے کمرے میں سو گیا۔ کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ تیسرے روز گاؤں کا ایک لڑکا کنویں پر آیا۔ وہ عمر میں مجھ سے تھوڑا بڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھاگ نکلا۔ میں نے کہا 'میں بابو ہوں، ڈرو مت' چنانچہ وہ واپس آ گیا۔ ہم دونوں نے گاؤں واپس جا کر کھانے کو کچھ تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب کھتریوں نے ہمیں دیکھا تو وہ ہمیں برا بھلا کہنے لگے۔ کرپان بردار دو سکھ ہماری طرف لپکے۔ میرے ساتھ لڑکا دوسری سمت کو بھاگا تو سکھ اس کے پیچھے دوڑے۔ پھر میں بھوانی گڑھ آ گیا جہاں ہماری زمین اور ایک کنواں بھی تھا۔ میں نے وہاں رات گزاری اور مکئی کی چھلیاں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہ مل سکی۔ چنانچہ میں ایک بار پھر کاکڑہ چلا آیا۔ گھر پر کوئی نہیں تھا۔ صرف مویشی موجود تھے۔ وہاں مجھے ایک نہنگ سکھ مویشی لے جاتے دکھائی دیا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا کہ، 'گائیوں پر نظر رکھو۔' میں اس کے ساتھ چل دیا لیکن کچھ دیر بعد چپکے سے کھسک کر اس جگہ پہنچا جہاں میں لڑکی سے ملا تھا۔ وہ لڑکا جو مجھ سے الگ ہو گیا تھا وہ بھی زندہ وہاں کھڑا تھا۔

''ہم دونوں اپنے تایا کے خالی گھر چلے گئے اور وہیں رات گزاری۔ پھر صبح ہم نے گاؤں چھنہ نانک والیہ جانے کا فیصلہ کیا۔ لڑکا بولا 'ہمیں چھنہ نانک والیہ گاؤں جانا چاہیے حالانکہ وہ سکھوں کا گاؤں ہے۔' میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ہم چل پڑے۔ راستے میں ایک سکھ ہمیں آتا دکھائی دیا۔ وہ لڑکا رونے لگا جبکہ میں کھیتوں میں چھپ گیا۔ وہ سکھ بولا 'رومت، کیا تم مجل ہو؟' لڑکے نے کہا 'جی۔'

'تمہاری ماں اور باپ کے ساتھ کیا ہوا؟'

اس نے کہا 'انہیں مار دیا گیا ہے۔'

'تمہاری بہن؟'

'اس کا کچھ پتہ نہیں۔'

پھر سکھ نے لڑکے سے کہا 'میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔'

اس موقع پر وہ لڑکا چلایا 'بابو باہر آؤ، یہ آدمی ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔' وہ سکھ حقیقت میں بھلا انسان تھا۔ اس نے شفقت سے ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرے اور ہم کو لمبر داروں ہرنام سنگھ، پریم سنگھ کے پاس لے گیا اور کہا کہ یہ لڑکے ہمیں رکھ لینے چاہئیں۔ وہاں ہمیں کھانا دیا گیا اور سونے کو بستر بھی ملا۔ انہوں نے دروازہ مقفل کرتے ہوئے کہا کہ، 'تم دونوں یہیں رہو۔' اس گاؤں میں تقریباً ستر مسلمانوں کی جان بچائی گئی تھی۔ ہم وہاں دو ماہ تک مقیم رہے۔ ہم ان کے مویشی کھیتوں میں چرایا کرتے تھے۔ لمبر دار نے اپنے بھتیجے سے کہا تھا کہ وہ ہر وقت ہمارے ساتھ رہے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور ہمیں کبھی اکیلا نہ چھوڑا۔ ایک روز انہوں نے مجھے اپنے حقے کے لیے تمبا کو لانے کو بھیجا۔ وہاں میری ملاقات ایک معمر شخص سے ہو گئی جو میری خالہ کا سسر نکل آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسماعیل کا بیٹا ہوں اور میرے ماں باپ مر چکے تھے۔ شدت غم سے وہ رونے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ چار، پانچ روز میں ملیر کوٹلہ جانے والا ہے اور اس نے مجھے بھی ساتھ لے جانے کی پیشکش کی۔ پروگرام کے مطابق اس نے چند روز بعد پیغام بھجوایا کہ آ جاؤ لیکن لمبر دار نے کہا کہ لڑکا نہیں جانے دیا جائے گا۔ چنانچہ خالہ کا سسر اکیلے ہی چلا گیا۔ ملیر کوٹلہ میں اس بوڑھے کی ملاقات میرے چھوٹے چچا سے ہوئی اور بتایا کہ آپ کا بھتیجا چھنہ نانک والیہ

کے لمبر داروں کے پاس ہے۔ میرے ماما بھی ملیر کوٹلہ میں تھے۔ انہوں نے ایک سکھ امر سنگھ کو لمبر داروں کے پاس بھیجا لیکن میں ڈر گیا اور رونے لگا۔

"امر سنگھ نے مجھے تسلی دی کہ وہ مجھے میرے ماموں کے پاس پہنچا دے گا۔ لہٰذا میں مان گیا۔ رات 10 بجے ہم گاؤں 'پھیری' پہنچے اور قیام کیا۔ اگلے روز ہم چھنہ بندر والیاں پہنچے۔ وہاں امر سنگھ کی کزن کا گھر تھا۔ اس نے کہا کہ تم اس ترک (مسلمانوں کو نفرت سے مخاطب کرنا) کو کیوں لے جا رہے ہو، اسے مار ڈالو۔ امر سنگھ نے کہا کہ وہ میرے خاندان کو جانتا تھا۔

"اگلے روز ہم گاؤں سربور پور پہنچے۔ یہ امر سنگھ کا اپنا گاؤں تھا۔ اس کی بیوی نے بتایا کہ میرے چچا اور ماموں دونوں لڑکے کے لیے آئے تھے۔ ہم نے وہاں سے کھانا کھایا اور پھر گاؤں بھینی (بھینی کمبوہاں کے نام سے مشہور) آئے جہاں میرے چچا اور ماموں میرے منتظر تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں رونے لگے۔ اب ہم بھینی میں ہی رہتے ہیں۔ میری یہاں شادی ہو گئی۔ رشتے کا بندوبست میرے چچا اور ماموں نے ہی کیا تھا۔"

کا کڑہ کا دورہ

ملیر کوٹلہ کے بعد ہماری اگلی منزل گاؤں کا کڑہ تھا۔ آدم پور، ما ٹھی اور بوران میں انٹرویو مکمل کرنے کے بعد اسی روز میں، ہتیش گوسین اور وریندر سنگھ کا کڑہ پہنچے۔ تقسیم سے پہلے کے افراد کو ڈھونڈنا بہت مشکل تھا۔ ان میں سے بیشتر افراد پنجاب بالخصوص گوجرانوالہ اور حافظ آباد کے راستے پر واقع دیہات سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ یوڈووالا سکھو سے تعلق رکھنے والے معمر سکھ کرنیل سنگھ نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم ہندو راج مستری دیس راج سے ملیں جو اس گاؤں کا مقامی باشندہ تھا۔

دیس راج

"کا کڑہ ایک بڑا گاؤں تھا جہاں مسلمانوں کے 900 جبکہ ہندوؤں کے 300 گھرانے آباد تھے۔ میں اور عبد الشکور بچپن میں اکٹھے کھیلتے تھے۔ یہ ایک خوش و خرم گاؤں تھا جہاں مختلف ذاتوں کے ہندو اور مسلمان پر امن طریقے سے رہتے تھے۔ اگرچہ کمبوہ برادری کی تعداد زیادہ تھی لیکن گاؤں کے چودھری رنگڑ راجپوت ہی تھے۔ روایت کے مطابق راجپوت خان صاحبان پٹیالہ فوج میں ملازمت کرتے تھے اور نہایت اثر و رسوخ کے حامل تھے۔ علاقے میں گڑبڑ اس وقت شروع ہوئی جب پاکستان معرض وجود میں آگیا۔ ارد گرد کے دیہات میں مغربی پنجاب سے ہزاروں سکھ اور ہندو آرہے تھے۔ بھادوں کی 3 تاریخ کو مجھے یاد ہے کہ پچھلے پہر 4 بجے گھڑ سوار اور پیدل سکھ جتھے موگا اور ارد گرد کے دیہات سے یہاں آدھمکے۔ ان میں سے بیشتر بدنام جرائم پیشہ لوگ تھے۔ کچھ عرصے سے کا کڑہ میں قرب و جوار کے دیہات کے مسلمان جمع ہو رہے تھے۔ حملہ اچانک اور زور دار تھا لیکن کچھ مسلمانوں نے مزاحمت بھی کی۔ فریقین کا تناسب نہایت غیر متوازن تھا۔ پہلے ہلے میں 11 حملہ آور اور 300 مسلمان مارے گئے۔ مرنے والوں میں سے بیشتر قریبی دیہات سے آنے والے مسلمان تھے جو کھیتوں میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اگلے روز پولیس نے آکر لاشوں کو دفن کیا۔

"ہم نے عارضی طور پر کا کڑہ گاؤں چھوڑ دیا کیونکہ مسلمان لمبر دار نے ہمیں محتاط رہنے کی تنبیہ کر دی تھی۔ اگرچہ گاؤں کے مسلمان ہمیں نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن لمبر دار دیگر دیہات سے آنے

والے مسلمانوں کے مثبت رویے کی ضمانت دینے کو تیار نہیں تھا۔ ہم گاؤں سے نکل کر تھوڑی دور مقیم رہے اور اگلے روز آکر دیکھا تو کاکڑہ شعلوں میں جل رہا تھا۔ پولیس آچکی تھی اور بڑی تیزی سے اجتماعی قبر میں لاشیں دفنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خالی گھروں میں لوٹ مار کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ پہلے ہی حملے میں عبدالشکور کے کئی رشتہ دار مارے گئے تھے۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ ہمارے گاؤں کے جو لوگ ملیر کوٹلہ کی طرف گئے وہ تو بچ گئے لیکن چھپیتانوالی کو جانے والے افراد بڑی تعداد میں نہر پار مارے گئے۔ بابو خان اسماعیل کا بیٹا تھا۔ اس کے بیشتر رشتہ دار بھی جان سے گئے۔ یہ تمام واقعات ہمارے ارد گرد کے دیہات میں ہوئے تھے، اس لیے ہمیں پتہ ہے کہ یہاں کیا ہوا۔

''عبدالشکور نے 52 سال بعد گاؤں کا چکر لگایا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص رفیق بھی تھا۔ میں نے فوراً رفیق کو پہچان لیا جو میرا بچپن کا گہرا دوست تھا۔ میں نے شکور کی شکل بھی پہچان لی لیکن مجھے اس کا نام یاد نہیں تھا۔ بابو خان نے بھی کاکڑہ کا چکر لگایا۔ اس کے ساتھ عبدالشکور بھی تھا۔''

میرے اپنے تاثرات

کاکڑہ میں موجودگی کے دوران ہمیں بتایا گیا کہ اتر پردیش اور بہار سے آنے والے مسلمانوں نے گاؤں کی مسجد دوبارہ آباد کر دی ہے۔ ہم مسجد گئے تو ایک نوجوان قاری قرآن پاک کی تعلیم دے رہا تھا۔ میں یہ منظر دیکھ کر نہایت متاثر ہوا اور فیصلہ کیا کہ مسجد کو کچھ چندہ دوں۔ قاری صاحب نے یہ کہتے ہوئے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا کہ وہ ایک سادہ سی زندگی گزارتے ہیں اور ان کی ضروریات بھی محدود ہیں تاہم میرے اصرار پر انہوں نے چندہ قبول کر لیا۔ میں نے ہندو راج مستری دیس راج کو بھی چندے کی پیشکش کی کیونکہ مجھے پتہ چلا کہ اس نے مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسجد کی تعمیر نو کے لیے کسی معاوضے کے بغیر کام کیا۔ وہ ایک غیر تمند پنجابی تھا جو کوئی امداد قبول نہیں کرتا لیکن میں نے یہ کہا کہ یہ رقم تم آئندہ مسجد کی تزئین و آرائش کے لیے استعمال کر لینا۔ سکھوں کے بچے جمع ہو کر مجھے ملنے آئے اور خوشی کا اظہار کیا کہ پاکستان سے کوئی مسلمان انہیں ملنے آیا تھا۔ ہم گاؤں میں گھومنے گئے اور انہوں نے مجھے راجپوت مسلمانوں کی بنائی خستہ حال عمارتیں دکھائیں جو آج بھی علاقے میں طاقت ور اور اثر و رسوخ کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

شام کو ماحول اچانک اس وقت جذباتی ہو گیا جب یہ پتہ چلا کہ ہمیں دیس راج سے ملوانے والے سکھ کرنیل سنگھ کا آبائی شہر گوجرانوالہ تھا۔ وہ میرے ساتھ پنجابی اسی لاہوری لہجے میں بول رہا تھا جو میں بولتا ہوں۔ جب وہ اور دیگر سکھ کاکڑہ آئے تو یہاں تشدد کی علامات اب بھی دیکھی جا رہی تھیں۔ وہ میرے ساتھ مزید باتیں کرنے کا خواہاں تھا کیونکہ بہر حال ہم دونوں پنجاب کے ایک ہی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیا میں نے اپنی ذات میں چھپے اسلامی جذبے سے متاثر ہو کر مسجد کو چندہ دیا یا یہ تقسیم کے المناک واقعے پر افسوس کا نتیجہ تھا؟۔ میں ان مخصوص تاثرات کا تعین نہیں کر سکا۔ البتہ میں، ہتیش گوسین، وریندر سنگھ، دیس راج، کرنیل سنگھ، مسلمان قاری صاحب اور طالبعلم بچے سب کے سب جذباتی ضرور ہوئے حتیٰ کہ چند افراد کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

جسپال سنگھ ٹوانہ

کئی برسوں سے میرے سکھوں کے ساتھ کافی زیادہ رابطے رہے۔ اس کی بڑی وجہ پنجاب کے لیے ہماری مشترکہ محبت تھی۔ ان میں سے کئی سکھوں کے تاثرات کتاب کے مختلف حصوں میں دیے گئے ہیں۔ یہاں میں جسپال سنگھ ٹوانہ کی داستان رقم کر رہا ہوں:

"میرا گاؤں چنا تھل کلاں پٹیالہ اور سرہند کے درمیان واقع ہے۔ 1947 میں یہ پٹیالہ ریاست کے ضلع پٹیالہ کا حصہ تھا اور یہاں کی آبادی ایک ہزار تھی۔ گاؤں میں سکھ جاٹوں کی ذیلی شاخ ٹوانہ کی اکثریت تھی لیکن ایک تہائی ٹوانہ مسلمان بھی تھے۔ (مغربی پنجاب کے ٹوانے خود کو راجپوت نسل قرار دیتے ہیں لیکن مشرقی پنجاب میں ٹوانہ برادری جاٹ کہلاتی ہے)۔ گاؤں میں ایک مسجد بھی تھی اور گوردوارہ بھی تھا۔ دونوں مذاہب کے درمیان مثالی دوستانہ مراسم تھے۔ مسلمان ٹوانے بنیادی طور پر سکھ تھے لیکن بتایا گیا ہے کہ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے دور میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ 1947 میں میری عمر 12 سال تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب فسادات شروع ہوئے تو میرے دادا سردار سمپورن سنگھ ٹوانہ کی قیادت میں گاؤں کے بڑے کس طرح مسلمانوں کی مدد کے لیے آگے بڑھے۔ گاؤں کے وسط میں 'بنگلہ' میں حکمت عملی کا فیصلہ کرنے کے لیے اکٹھ ہوا۔ گاؤں کے بزرگ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے کیونکہ ٹوانے ہماری برادری کے ہی بھائی تھے لیکن نوجوان مشرقی پنجاب میں سکھوں کے ساتھ مظالم پر تیخ پا تھے۔ ان کی نظریں دراصل مسلمانوں کے مویشیوں اور املاک پر تھیں۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ قرب وجوار کے دیہات کا 'دشمن' پر حملے کے لیے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ فسادات کی خبریں ادھر ادھر گردش کر رہی تھیں۔ ایک روز ترکھیڑی گاؤں کے سردار لال سنگھ کی قیادت میں مسلح جتھہ ہمارے گاؤں کے قریب نمودار ہوا۔ یہ لوگ مسجد مسمار کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے بزرگوں کے مشورے پر انہوں نے مسلمانوں کو قرآن کے نسخوں سمیت مقدس اوراق نکالنے کی اجازت دے دی۔ یہ شرپسند سیمنٹ سے بنی مسجد کے محض مینار ہی مسمار کر سکے تاہم انہوں نے کسی مسلمان کو جسمانی طور پر کوئی نقصان نہ پہنچایا۔

"قریبی دیہات میں مسلمانوں کی املاک کی لوٹ مار کی جا رہی تھی۔ بیرونی حملہ آوروں کی نظریں ہمارے گاؤں کے مسلمانوں پر بھی تھیں۔ ہم کسی بھی روز ان پر حملے کی توقع کر رہے تھے۔ صورتحال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے بنگلہ میں ایک بار پھر اجتماع ہوا۔ نوجوان سکھ مسلمانوں کو نکال باہر کرنے اور جائیداد ہتھیانے کے درپے تھے لیکن بڑوں نے مسئلے کا ایک اور حل بتایا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مسلمانوں سے کہیں گے کہ وہ سکھ ازم قبول کر لیں بصورت دیگر بیرونی حملے کے لیے تیار رہیں۔ میراثی مسلمان تو بے چوں وچرا اسلام چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے کیونکہ انہوں نے کہا کہ ان کے بڑے مردانہ صاحب گورونانک کے قریبی ساتھی تھے۔ اپنی زندگی کو لاحق خطرات کے پیش نظر دیگر مسلمان بھی سکھ مذہب قبول کرنے پر آمادہ تھے لیکن سکھوں کے نوجوان اور غیر ذمہ دار عناصر کو اب بھی تحفظات لاحق تھے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ صورتحال معمول پر آنے کے بعد یہ لوگ دوبارہ مسلمان ہو جائیں گے۔ اس لیے تبدیلی مذہب کی تقریب میں انہیں سؤر کا گوشت ہر حال میں کھانا پڑے گا۔ اس طرح یہ لوگ ہمیشہ کے لیے دائرہ اسلام سے باہر ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایک مسلمان سے خنزیر ذبح کرنے اور کاٹنے کے لیے کہا گیا، پھر گوشت پکا کر انہیں پیش کیا گیا۔ ان میں سے کئی نے مکروہ گوشت کھا کر الٹی کر دی۔ مجھے یقین نہیں کہ کسی مسلمان نے گوشت کھایا ہو گا۔ یہ ایک کریہہ منظر تھا۔

"جیسے ہی یہ خبر پھیلی کہ گاؤں چناتھل میں ایسے مسلمان محفوظ و مامون ہوں گے جو سکھ مذہب قبول کر لیں تو کئی مسلمان خفیہ مقامات سے نکل کر ہمارے گاؤں میں آ گئے۔ ایک غریب آدمی نے تین روز سے کچھ نہیں کھایا تھا اور گنے کے کھیت میں روپوش تھا۔ ہمارا گوردوارہ ایک چھوٹے ریلیف کیمپ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ کسی کو جان سے نہ مارا گیا۔ بس فتح محمد، فتح سنگھ اور فقیریا، فقیر سنگھ بنا دیا گیا۔ یہ لوگ نیلی پگڑی پہنتے تھے اور چھوٹی سی کرپان ان کے کندھے پر لٹکی ہوتی تھی۔ ایک روز یہ پتہ چلا کہ فتح سنگھ کو حجام کی دکان پر کچھ بال منڈھواتے دیکھا گیا ہے جس پر فتح سنگھ اور دونوں ہندو حجاموں کو گوردوارے میں طلب کر لیا گیا۔ انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی جس پر سکھ مہنتوں نے انہیں چھوٹی سی سزا دی۔ تھوڑا سا جرمانہ کیا، یعنی ہر صبح گوربانی (سکھوں کا مقدس کلام) سننے آنے والے افراد کے سات روز تک جوتے صاف کرنا اور گندے برتن دھونا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ بہت ہلکی سزا تھی کیونکہ سکھ مہنت ایک نیک انسان تھا۔ ایک ہفتے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ کچھ مسلمان اپنی قیمتی اشیا سمیت رات گئے چپکے سے گاؤں سے کھسک کر سرہند دربار کے قریب روزہ شریف کیمپ میں منتقل ہو گئے تھے۔ (یہ وہی کیمپ تھا جس میں چودھری روشن دین نے پناہ لی تھی: مصنف)۔ اس عمل سے نوجوان شر پسندوں کو بہانہ مل گیا۔ انہوں نے شور مچایا کہ 'کیا ہم نے تم لوگوں کو قبل از وقت متنبہ نہیں کر دیا تھا؟' چنانچہ انہوں نے مسلمانوں (دراصل نئے سکھوں) کو سبق سکھانے کا ارادہ کیا۔ بڑے سکھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ گاؤں سے چوری چھپے نہ نکلیں۔ اگر آپ لوگ سچے سکھ بن کر نہیں رہنا چاہتے تو ہم آپ کو کیمپ تک اپنی حفاظت میں پہنچا دیتے ہیں۔ چند مسلمان اس پیشکش کے جھانسے میں آ گئے۔ ایک رات یہ لوگ نوجوان سکھوں کی حفاظت میں روزہ شریف کیمپ جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں پنڈرالی گاؤں کے قریب ایک گھنا جنگل تھا جہاں بیل گاڑیاں روک کر مسلمانوں سے تمام زیورات اور نقدی چھین لی گئی اور پھر ان کی بہو بیٹیاں نیچے اتار کر بے رحمی کے ساتھ ان کی آبروریزی کی گئی۔ یہ شرمناک خبر اگلی صبح گاؤں پہنچ گئی۔ معمر سکھوں کی ایک ٹولی میرے دادا کے پاس بیٹھی یہ کہتی پائی گئی: 'سالیاں نے منہ کالا کر دتا ایہہ، اونہاں نوں کیمپ وچ ملن جو گا وی نئیں چھڈیا۔'

"میری دادی نے مسلم خاندان کو گھر پر پناہ دی۔ اس خاندان کے مردوں کو ہمارے دادا کے بھٹہ خشت پر کام دیا گیا۔ ان کی دو غیر شادی شدہ لڑکیاں بھی تھیں۔ اردگرد کے نوجوان لڑکوں کی اب ان پر نظریں تھیں۔ اس سے پہلے کہ انہیں کوئی نقصان پہنچتا، ایک روز میرے دادا خاموشی سے انہیں روزہ کیمپ چھوڑ آئے۔ ہمارے گھر کے پاس چند غیر شادی شدہ مرد رہتے تھے۔ ان کی کوئی زمین نہیں تھی یا تھوڑی سی اراضی تھی اور وہ لفنگے مشہور تھے۔ انہوں نے تین سے مسلمان خواتین کو اغوا کر کے گھر میں رکھا ہوا تھا۔ بچن سنگھ (جو خونی بچنا کے نام سے بدنام تھا) نے کئی افراد کو قتل کر رکھا تھا۔ اس کے گھر میں دو مغوی خواتین تھیں۔ البتہ یہ 'ہنی مون' مختصر ثابت ہوا۔ جلد ہی پولیس نے تمام خواتین برآمد کر کے پاکستان بھجوا دیں۔

"کبھی کبھار ہماری ٹوانہ برادری کے مسلمان بھائی پاکستان سے ہمیں ملنے آتے۔ لاہور کے ایک نوجوان تنویر ٹوانہ نے مجھے انٹرنیٹ پر تلاش کر لیا۔ اس کے دادا عبدالرشید ٹوانہ اپنی خاندان سمیت 1947 سے قبل گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ مجھے دادا جی کہتا ہے اور رابطے میں رہتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے خاندان کے سب لوگ محفوظ رہے۔ سکھ ہمسایوں کی مدد سے وہ بحفاظت ریلیف کیمپ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ تنویر ٹوانہ نے بتایا کہ ٹوانہ برادری کے افراد ان دنوں شیخوپورہ، سرگودھا، قصور اور لاہور میں آباد ہیں۔"

نابھہ ریاست

نابھہ ریاست کی کل آبادی 3 لاکھ 40 ہزار 44 تھی۔ اس میں سے مسلمان 50 ہزار 972 یعنی 15 فیصد تھے۔ ڈاکٹر خوشی محمد خان ہیمبرگ انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس سے 1991 میں ریٹائر ہوئے۔ وہ جون 2003 میں سٹاک ہوم میں میرے مہمان تھے۔ انہوں نے یہ داستان مجھے سنائی:

ڈاکٹر خوشی محمد خان

"میں 12 اکتوبر 1930 کو نابھہ ریاست کے ضلع املوہ میں پیدا ہوا تھا۔ مسلمان ریاستی آبادی کا 20 فیصد تھے۔ تمام مذاہب کے پیروکار پرامن انداز میں رہتے تھے۔ ماحول انتہائی بھائی چارے والا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے گھر میں کھیل کود کر بڑے ہوئے۔ میں اپنے ایک برہمن دوست کے باورچی خانے میں جا کر کھانا کھایا کرتا تھا۔ اس کی والدہ میرے ساتھ اپنے بیٹے جیسا سلوک کرتی تھی۔ البتہ وہ اس بات پر تشویش ضرور ظاہر کرتی تھی کہ قدامت پسند ہندو ایک مسلمان بچے کو رسوئی میں داخل ہونے کی اجازت دینے پر ناراض ہو سکتے تھے۔ چونکہ علاقے میں کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا تھا اس لیے ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ تقسیم پنجاب اور اس سے جڑے مسائل کی کیا صورتحال تھی۔ میرے والد صاحب وکیل تھے اور ہر قسم کے لوگ ان کی خدمات حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ زیادہ تر سکھ اور ہندو ہی انہیں وکیل کرتے تھے۔ املوہ میں مسلم لیگ یا کانگریس کی کوئی شاخ نہیں تھی۔ کچھ لوگ پاکستان بننے کی بات کرتے تھے لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ حقیقت میں کیا ہونے والا ہے۔ میرے والد سے مسلم لیگ کی مقامی شاخ کا صدر بننے کے لیے رابطہ کیا گیا لیکن انہوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ میرے لیے بیوی بچوں کے معاملات زیادہ مقدم ہیں۔ مزید یہ کہ یہاں تمام عقائد کے پیروکار ہنسی خوشی رہ رہے ہیں اس لیے ایسا کام کیوں کیا جائے جس سے ہم آہنگی کی فضا مکدر ہو جائے۔

"1940 کے عشرے کے اوائل میں ہم نابھہ ٹاؤن منتقل ہو گئے۔ اگست 1946 میں بنگال اور پھر بہار کے مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں نابھہ پہنچنا شروع ہو گئی تھیں لیکن اس وقت ہم نے یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ اس سے پنجاب بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں نابھہ چھوڑنے کا احساس 14 اگست 1947 کے بعد ہوا تاہم ہمارا انخلا نومبر 1947 سے پہلے نہ ہوا۔ نابھہ شہر میں پان والے کی دکان پر ایک ہی ریڈیو سیٹ ہوتا تھا۔ نابھہ ریاست چونکہ جی ٹی روڈ سے ہٹ کر تھی اس لیے پہلے پہل بہت کم ہندو اور سکھ یہاں منتقل ہوئے تھے لیکن اکتوبر اور نومبر میں یہ تعداد اچانک بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ مسلمان اقلیت کو یہ خدشات لاحق ہونے لگے کہ ان پر حملوں کی منصوبہ بندی تیار ہو رہی تھی۔ ہماری گلی میں دیگر مذاہب کے افراد کے علاوہ ہمارے چند رشتہ دار بھی رہتے تھے۔ بہرحال نومبر میں مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے گئے۔ ہم نے نومبر میں رخصتی کا فیصلہ کیا کیونکہ میری والدہ نے احتجاج کیا کہ آئے روز اردگرد کے دیہات پر مسلمانوں پر حملوں کی خبریں آ رہی ہیں اور اگر یہاں سے نہ نکلے تو ہم بھی خونریزی کا نشانہ بن سکتے تھے۔ چنانچہ میرے والد نے نابھہ شہر کے ناظم (میئر) سے رابطہ کیا جو ایک سکھ اور میرے والد کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ فی الوقت آپ لوگ نابھہ قلعے میں پناہ لے لو۔ وہ خود بھی وہاں رہ رہا تھا

جبکہ ضلعی پولیس افسر اور میڈیکل افسر بھی قلعے میں ہی مقیم تھے لیکن والد صاحب نے املوہ میں ہی اپنے آبائی گھر میں قیام جاری رکھنے کو ترجیح دی۔

''ایک اور کلاس فیلو غالباً اس کا نام پرتاپ سنگھ تھا اور وہ مقامی بس سروس کا مالک تھا نے میرے والد کو خبردار کیا کہ اکالی سکھ حملوں کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اس لیے آپ لوگ اگلی صبح یہاں سے نکل جائیں۔ اس نے ہمیں بحفاظت پناہ گزین کیمپ تک پہنچانے کا وعدہ کیا۔ میرے والد نے بات مان لی اور اگلی صبح ہم کسی کو بتائے بغیر روانہ ہو گئے۔ یہ علی الصبح کا وقت تھا۔ ہمارے پاس بمشکل کوئی سامان تھا۔ نابھ شہر جاتے ہوئے راستے میں تلوار بردار اکالی سکھوں نے ہمیں روکنے کی کوشش کی لیکن پرتاپ سنگھ نے بچ بچا کر ہمیں نابھ کیمپ پہنچا دیا۔ ہمارے کئی رشتہ دار پہلے ہی وہاں تھے۔ میرے والد کچہری گئے جہاں ان کے اسسٹنٹ میاں عبداللطیف جنہوں نے حال ہی میں پریکٹس شروع کی تھی نے بتایا کہ نابھ کے حکمران نے حکم دیا ہے کہ نابھ شہر میں کسی پر حملہ نہیں کیا جائے گا تاہم دیہی علاقوں میں حملے کیے جا سکتے ہیں۔ نومبر کے شروع میں نابھ سے ایک قافلہ روانہ ہوا اور ہمیں پاکستان پہنچنے میں دس روز لگے۔ قافلے میں ایک لاکھ کے قریب افراد ہوں گے۔ اگرچہ کئی مقامات پر خطرے کی گھنٹی بجی لیکن ہمارے قافلے پر کہیں حملہ نہیں کیا گیا تھا۔ رات کو کوئی سو نہیں سکتا تھا۔ کئی افراد راستے میں ہی انتقال کر گئے۔ پاکستانی فوج کی بلوچ رجمنٹ کے دستے چونکہ ہماری سکیورٹی پر فائز تھے اس لیے ہم محفوظ رہے۔ ہم لوگ قصور بارڈر سے پاکستان پہنچے کیونکہ واہگہ اٹاری سرحد نہایت پرخطر تھی۔ جلد ہم گوجرانوالہ آ گئے۔ میرے والد جن کی نابھ میں زبردست پریکٹس تھی وہ یہاں کے انگریزی تعلیم یافتہ وکیلوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے ضلع کچہری کے باہر عرضی نویس کے طور پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اکثر اپنے آبائی علاقے نابھ کو یاد کرتے اور فارسی کا یہ شعر پڑھتے تھے کہ میرے اپنے وطن کا کانٹا دیارِ غیر کے پھولوں سے بہتر ہے۔

''میں 1963 میں جرمنی آ گیا اور وہاں سے نابھ میں اپنے پرانے سکول سے رابطے کی کوششیں شروع کیں۔ دوسری طرف سے بڑی گرمجوشی سے جواب دیا گیا لیکن مجھے 1979 سے پہلے نابھ جانے کی اجازت نہ مل سکی۔ جب میں وہاں پہنچا تو لگا کہ پورا شہر میرا استقبال کرنے کو امڈ آیا تھا۔ مجھے کئی گھروں میں کھانے پر مدعو کیا گیا۔ شہر میں مسلمان قصابوں اور رنگسازوں کی ایک خاندان بدستور مقیم تھا کیونکہ لوگوں کو ان کی خدمات کی ضرورت تھی۔ اب میں باقاعدگی سے نابھ جاتا ہوں اور ایک ایک ماہ وہاں قیام کرتا ہوں۔ میں اپنے برہمن دوست اشوینی کمار شرما کے گھر میں رہتا ہوں۔ ان کی اہلیہ اور بچے میرے میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔''

کپورتھلہ ریاست

دکی، نانک سنگھ، ڈرائیور اور میں 3 جنوری کی سہ پہر کو کپورتھلہ پہنچے جو کبھی پنجاب کی خودمختار ریاستوں میں پیرس کے طور پر مشہور تھا۔ اب بھی تقسیم سے پہلے کی شان و شوکت کی کچھ کچھ جھلک باقی تھی۔ کپورتھلہ جالندھر سے زیادہ

دور نہیں۔ جب ہم شہر کے قلب میں پہنچے تو وہاں ایک شاندار مسجد پوری شان و شوکت کے ساتھ کھڑی تھی۔ مسجد کی دیوار پر سنگ مرمر کی تختی پر یہ تحریر کندہ تھی:

یہ مورش مسجد عزت مآب مہاراجہ جگجیت سنگھ بہادر کے حکم پر تعمیر کی گئی۔ تعمیراتی کام اکتوبر 1926 سے مارچ 1930 تک جاری رہا۔ کل لاگت چار لاکھ روپے آئی۔ افتتاحی تقریب میں عالی مرتبت مہاراجہ نے بہاولپور ریاست کے نواب صادق محمد خان بہادر کے ساتھ بہ نفس نفیس شرکت کی۔ اس مسجد کا وجود مہاراجہ کی رواداری پر مبنی سوچ اور اپنی رعایا کی بہبود کی لگن کا غماز ہے۔

1941 کی مردم شماری کے مطابق کپور تھلہ ریاست کی کل آبادی 3 لاکھ 78 ہزار 389 تھی۔ ہندوؤں کی آبادی 61 ہزار 546 تھی جس میں 20 ہزار 892 نچلی ذات کے ہندو بھی شامل تھے۔ اگرچہ ریاست کا حکمران سکھ تھا لیکن سکھوں کی آبادی صرف 88 ہزار 350 تھی جبکہ مسلمانوں کی آبادی سب سے زیادہ تھی یعنی 2 لاکھ 13 ہزار 557 افراد اہل اسلام تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ مسلمان 56.4 فیصد کے تناسب سے اکثریت میں تھے۔ ان دنوں یہاں کوئی بھی مقامی مسلمان نہیں۔ ہم نے کپور تھلہ سے 30 کلو میٹر دور سلطان پور لودھی قصبے کا بھی دورہ کیا کیونکہ میں نے یہاں کے ایک سابق باسی مولانا مجاہد الحسینی سے وہاں جانے کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے کپور تھلہ کی مرکزی مسجد اور سلطان پور لودھی کے دو سکھ گوردواروں کی تصاویر کھینچنے کی فرمائش کی تھی۔ مولانا نے اپنے آبائی قصبے میں پیش آنے والے واقعات یوں بیان کیے:

مجاہد الحسینی

''میں 1925 کو کپور تھلہ کے قصبے سلطان پور لودھی میں پیدا ہوا۔ ہمارے علاقے کا ماحول نہایت پرامن اور دوستانہ تھا۔ مہاراجہ جگجیت سنگھ انتہائی روشن خیال، وسیع النظر اور انصاف پسند حکمران تھا۔ وہ کئی ملکوں کی سیر کر چکا تھا اور مراکش کے اس نے کئی دورے کیے تھے۔ 1930 میں اس نے شہر کے عین وسط میں ایک عالیشان مسجد بنوائی۔ چونکہ ان کی رعایا کی اکثریت مسلمان تھی اس لیے یہ مسجد مہاراجہ کی طرف سے ان کے لیے تحفہ تھی۔ کئی مسلمان ان کے وزیر اعلیٰ رہ چکے تھے جبکہ ریاستی عہدوں پر بھی ان کی نمایاں تعداد فائز تھی۔ سلطان پور لودھی میں دو تاریخی گوردوارے تھے۔ ایک گوردوارہ بیر صاحب اور دوسرا گوردوارہ ہٹ صاحب۔ یہ گوردوارے مجھے آج تک یاد آتے ہیں کیونکہ میں ان کی حدود میں بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ تمام مذاہب کے بچے اس میں مل کر کھیلا کرتے تھے اور ماحول حقیقی معنوں میں دوستانہ اور محفوظ تھا۔ ایک دوسرے کے عقیدے کا احترام ریاست کا لازمی جزو تھا۔ کپور تھلہ کے دیگر حصوں اور سلطان پور لودھی میں مجلس احرار کے بہت زیادہ حامی پائے جاتے تھے۔ میرا خاندان دیوبند مکتبہ فکر سے منسلک تھا۔ میرے نام میں جو لفظ الحسینی شامل ہے وہ جمعیت علمائے ہند کے روح رواں مولانا حسین احمد مدنی سے متاثر ہو کر رکھا گیا ہے۔ ہم مذہبی بنیاد پر تقسیم ہند کے حق میں نہیں تھے لیکن مارچ 1947 میں جبر اولپنڈی سے سکھ

پناہ گزین یہاں منتقل ہونے گئے تو حالات میں اچانک تبدیلی آنے لگی۔ وہ ادھر ادھر گھوم کر مسلمانوں کے مظالم کی کہانیاں سناتے رہتے تھے۔

"اگست 1947 میں جب تقسیم کا عمل روبہ پذیر تھا تو مہاراجہ دورہ یورپ پر تھے۔ ان کا ولی عہد ٹکا صاحب مختلف قسم کا انسان تھا۔ وہ اکالی سکھوں کے زیر اثر تھا اور اس نے انہیں ریاست کے مسلمانوں کو نشانہ بنانے کا گرین سگنل دے دیا تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد سلطان پور لودھی اس منصوبے کا نشانہ بنا۔ شروع کے حملوں میں مسلمانوں کا جانی نقصان سینکڑوں میں تھا لیکن کچھ حملہ آور بھی مارے گئے۔ مسلمان عمائدین نے سلطان پور لودھی چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ہم نے جالندھر کی طرف جانے پر غور شروع کر دیا۔ ہمارے قافلے میں ہزاروں افراد شامل تھے۔ راستے میں ہم پر بار ہا حملے کیے گئے۔ میں نے دیکھا کہ ٹکا صاحب خود مسلمانوں پر گولی چلانے کا حکم دے رہا تھا۔ میرے قصبے کے ایک سکھ نے مجھے پہچان کر بچا لیا، البتہ میدانی علاقے میں ہزاروں دیگر افراد کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ زندہ بچنے والے آخر کار بھاگ کر جالندھر کیمپ پہنچ گئے۔ میں نے سڑک اور کھیتوں میں ہزاروں افراد کی گلی سڑی لاشیں دیکھیں۔ قتل و غارت کا یہ تمام کھیل قطعی غیر ضروری تھا۔ اگر مہاراجہ خود ہندوستان میں ہوتے تو کپور تھلہ خون میں ہرگز نہ نہاتا۔"

شیخ نور محمد

"میری پیدائش اگرچہ کپور تھلہ میں ہوئی لیکن 1935 سے 1945 کے دوران میں لاہور میں مقیم رہا۔ مجھے 23 مارچ 1940 کا لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس اچھی طرح یاد ہے۔ اس وقت یہ جشن کا موقع تھا لیکن تب کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ پاکستان کی تخلیق لاکھوں عام افراد کے لیے مصائب کا کیسا بار گراں لائے گی۔ 1945 میں ہم واپس کپور تھلہ آ گئے۔ یہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ مہاراجہ نے کپور تھلہ شہر میں ریلوے سٹیشن کے قریب مسجد تعمیر کرائی تھی۔ وہ اتنا اچھا انسان تھا۔ (شیخ نور محمد اس موقع پر رونے لگے)۔ جب تقسیم کا اعلان ہوا تو تب جا کر ہمیں معلوم ہوا کہ ہم پاکستان کی حدود میں نہیں آئیں گے۔ اچانک دیہات میں مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے گئے۔ ان دنوں مہاراجہ خود ریاست میں موجود نہیں تھے۔ ایک ٹرین پاکستان بھیجی گئی۔ یہ اگست کا مہینہ تھا۔ میرے والد بوڑھے تھے۔ میری تین بہنوں کی شادیاں لاہور میں ہوئی تھیں۔ انہوں نے اور ان کے شوہروں نے لاہور میں تشدد سے بچنے اور محفوظ جگہ کی امید میں کپور تھلہ میں سکونت اختیار کر لی لیکن یہاں آ کر وہ الٹا پھنس گئے۔ میں نے اپنے گھر کی چابی ہندو ہمسائے کو دی اور کہا کہ وہ ہماری واپسی تک گھر کا خیال رکھے۔

"میرے بہنوئی کو ایک سکھ نے بتایا کہ اس نے سنا ہے کہ کپور تھلہ سٹیٹ کا جنرل جے سنگھ ایک اور سکھ کو بتا رہا تھا کہ مسلمانوں کی ٹرین پر کپور تھلہ سے نکلتے ہی حملے کی منصوبہ بندی کر لی گئی ہے۔ جب میرے بوڑھے والد نے یہ سنا تو انہوں نے ہمیں کہا کہ ہم ٹرین پر سفر نہ کریں۔ چنانچہ ہم واپس گھر میں آ گئے۔ ہم تاکے بند محلہ (یہاں حقہ ساز ماہرین کے گھر تھے) میں رہتے تھے۔ تانگہ بان نے ہم سے معمول سے کہیں زیادہ کرایہ لیا۔ اس رات 9 بجے پورے شہر میں ٹرین پر حملے کی خبر پھیل گئی اور یہ کہ کس طرح مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تھا۔

"ہم اپنے گھر میں بند ہو کر رہ گئے۔ ہر روز ہم سنتے کہ مسلمانوں کے قافلوں کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ بالآخر ہم نے سنا کہ مسلمانوں کو ٹرکوں پر لے جایا جا رہا تھا کیونکہ جالندھر چھاؤنی میں پناہ گزین کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ کپور تھلہ شہر میں کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔ ہم نوٹرکوں پر روانہ ہوئے۔ جالندھر سے نصف میل پہلے ایک اسلامیہ ہائی سکول تھا۔ وہاں پاکستان سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کا کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ وہاں ہمارے سکھ ڈرائیور نے ٹرک روک لیا۔ آناً فاناً تلواروں اور نیزوں سے مسلح ہندوؤں اور سکھوں نے ہمارا گھیراؤ کر لیا۔ ہم میں سے کئی افراد سے ٹرکوں سے چھلانگیں لگا دیں لیکن کچھ مسلمانوں کو کاٹ ڈالا گیا۔ میرے والد اور چچا بری طرح زخمی ہو گئے۔ اچانک سکھ فوجیوں کا ایک ٹرک وہاں آگیا۔ اس کا انچارج ایک اچھا انسان تھا۔ اس نے شرپسندوں پر فائرنگ کرادی جس سے وہ بھاگ گئے اور ہم بچ گئے۔

"ہم بڑی سڑک کے ساتھ کھیتوں کے اندر چلتے رہے۔ وہاں ہم نے کچھ ٹینک بھی دیکھے۔ فوجیوں نے ہمیں ٹینکوں پر چڑھنے کی اجازت دے دی۔ دو تین میل کے بعد ہم نے اپنے قافلے کے کچھ اور افراد جاتے دیکھے۔ ایک مسلمان لڑکے نے ہمیں ہسپتال میں قیام کرنے میں مدد فراہم کی۔ وہ کچھ روٹیاں کھانے کے لیے لے آیا۔ زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کی گئی۔ اس کے بعد ہماری ملاقات چند پٹھان فوجیوں سے ہوئی جو ہمیں چھاؤنی میں لے آئے۔ ہم کیمپ میں بارہ روز تک ٹھہرے۔ ہم اپنے ساتھ کھانے کا کچھ سامان بھی لائے تھے۔

"ایک روز کپور تھلہ سے ایک ہندو آیا اور بتایا کہ میرے والد اور چچا خیریت سے تھے لیکن بھوک سے بے حال تھے۔ میں نے ان کے لیے کچھ غذا بھجوائی۔ اس کے بعد ہم لاہور کے قریب میاں میر سٹیشن پر پہنچے۔ ہم نے تاثر دیا کہ ہماری سکیورٹی پر مامور سپاہی مسلمان تھے لیکن دراصل وہ گورکھا تھے۔ میاں میر سٹیشن پر اتر کر ہم لاہور کے موہنی روڈ آئے جہاں ہمارا خاندان آج بھی آباد ہے۔"

بیگم بی اے چودھری

جولائی 2007 میں ڈاکٹر محمد فاروق نے 'دی نیوز انٹرنیشنل' اخبار News International,14 July 2007 میں میرے دورہ کپور تھلہ کی روداد پڑھ کر میرے ساتھ رابطہ کیا اور اپنی والدہ کے خاندان سمیت کپور تھلہ سے رخت سفر کی تکلیف دہ کہانی سنائی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فاروق نے مجھے 14 اگست 2007 کو تفصیلی ای میل ارسال کی:

"میرا پیدائشی نام منظور اختر ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بیسویں صدی میں متحدہ ہندوستان میں کپور تھلہ مشرقی پنجاب کی ایک خوشحال اور ترقی کرتی ریاست تھی جس کے حکمران سکھ مہاراجہ عالی مرتبت جگجیت سنگھ بہادر تھے۔ چونکہ وہ ایک نیک دل انسان تھے اس لیے ان کی رعایا ان کا بہت احترام کرتی تھی۔ ان کی ایک خوبی اور تھی وہ ایک روشن خیال، کھلے ذہن اور سیکولر خیالات کے حامل انسان تھے۔ انہوں نے اپنی کثیر المذاہب ریاست میں کبھی کسی فرد کے خلاف مذہبی یا لسانی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اسی بنا پر نہ صرف سکھوں کو بلکہ دیگر مذاہب کے ارکان کو بھی اہم ریاستی عہدوں پر بلا تفریق فائز کیا گیا تھا۔ میرے والد مسلمان تھے اور ریاست کے محکمہ ہارٹی کلچر میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ان کے ماتحت بڑی تعداد میں لوگ کام کرتے تھے۔

"میں 1927 میں کپور تھلہ میں پیدا ہوئی۔ میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن کا دور وہیں گزارا۔ میں نے مہارانی ہر بنس کور گرلز سکول جو جلاؤ کھنہ کے نام سے بھی مشہور تھا سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ یہ سکول ایک پرانی لیکن شاندار گھر کی عمارت کے ایک حصے میں واقع تھا۔ یہ دراصل مہارانی کے خالی کردہ ایک محل میں بنایا گیا تھا۔ یہ تین منزلہ عمارت تھی۔ عمارت کے بعض حصے دیگر سماجی سرگرمیوں کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر یتیم لڑکیوں اور معذور عورتوں کو سلائی، کڑھائی اور دیگر دستکاری کی تربیت دی جاتی تھی۔ ان سرگرمیوں کی نگران شریمتی کولاں دیوی تھیں۔ یہ خاتون دو گھوڑوں پر مشتمل بگھی پر آتی تھیں۔ اس سکول کے بڑے ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے اپنی دس سالہ تعلیم کے دوران اس کے تمام کمرے نہیں دیکھے تھے۔ یہاں کئی تہہ خانے اور سرنگیں تھیں جن میں بیشتر استعمال میں نہیں تھیں، اس لیے یہاں اندھیرا ہی ہوتا تھا۔ مجھے آج بھی اپنی کئی کلاس فیلو لڑکیوں کے نام یاد ہیں۔ ان میں دو لڑکیاں بیرو اور جیتو تھیں۔

"لڑکوں کی تعلیم کے لیے ایک الگ اور معروف تعلیمی ادارہ رندھیر گورنمنٹ سکول / کالج کپور تھلہ تھا جہاں دور دور سے طلبا حصول تعلیم کے لیے آتے تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ کپور تھلہ مختلف عقائد کے پیروکاروں کا مسکن تھا جہاں سکھ، ہندو، مسلمان اور عیسائی دوستانہ ماحول میں مل کر رہتے تھے۔ بالکل ایک خاندان کی طرح۔ ہمارا گھرانہ نہایت آرام دہ زندگی بسر کر رہا تھا اور ہمارے کئی گھریلو ملازمین تھے۔ شہر کے عین وسط میں ایک بڑی مسجد تھی جو فن تعمیر کا شاہکار تھی۔ مسجد میں قائم مدرسے میں زیر تعلیم طلبا کی اقامت کے لیے 30–40 کمروں کا ہاسٹل بھی تھا۔ مسجد کے قریب سرسبز و شاداب دالان بھی تھا۔ میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ گاہے بگاہے مسجد دیکھنے جایا کرتی تھی۔ ایسے مواقع پر والد صاحب مسجد کے اندر نماز ادا کرنے چلے جایا کرتے تھے جبکہ میری والدہ اور ہم بچے دالان میں بیٹھ جاتے تھے۔

"کپور تھلہ ریلوے سٹیشن اگرچہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن مسافروں کے لیے کافی متاثر کن ضرور تھا۔ صفائی ستھرائی اور انتظام و انصرام زبردست تھا۔ ریلوے سٹیشن پر ایک طرف مہاراجہ کا چمکتا دمکتا سفید سیلون تھا۔ جب کہیں مہاراجہ نے سفر کرنا ہوتا تھا تو وہ یہی ڈبہ استعمال کیا کرتے تھے۔ مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے جب لوگ نہایت اشتیاق کے ساتھ ریڈیو سیٹ کے گرد تقسیم ہند کا اعلان سننے کے لیے بیٹھے تھے۔ ہماری خوشی کا اس وقت کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب ہم نے ابتدا میں سنا کہ ہوشیار پور، گورداسپور، جالندھر اور فیروز پور کے اضلاع پاکستان میں شامل ہوں گے۔ (مجھے ان حقائق کے بارے میں کچھ تحفظات ہیں: مصنف)۔ یہ سن کر ہم نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ اس فیصلے کے نتیجے میں اب ہمیں اپنا گھر بار نہیں چھوڑنا پڑتا تھا لیکن جلد ہی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ یہ سب اضلاع مشرقی پنجاب میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر ہم نہایت غمگین اور مایوس ہو گئے۔ چند گھنٹے کے اندر ہی کپور تھلہ طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کے قریب پہنچ گیا۔ مختلف عقائد کے گروہ جو اب تک عشروں سے دوستانہ مراسم میں منسلک تھے اب اچانک مسلمانوں کے خلاف جارحانہ انداز پر اتر آئے۔ بااعتماد دوست دشمن بن گئے۔

"ہماری بدقسمتی کہ ایسے کڑے وقت میں مہاراجہ جگجیت سنگھ بہادر خود ریاست میں نہیں تھے، اس لیے برے وقت میں وہ اپنی مسلمان رعایا کی مدد کے لیے نہ پہنچ سکے۔ ان کا بڑا بیٹا اور قائم مقام حکمران ٹکا صاحب مسلمانوں کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اور جیسا کہ بعد میں ثابت ہو گیا کہ اس نے اپنی مسلمان رعایا کی حفاظت کے لیے کوئی مخلصانہ کوششیں

نہیں کیں ورنہ اتنی بڑی تباہی و بربادی سے بڑی حد تک بچا جا سکتا تھا۔ اس نے ایسے لوگوں کی کوئی مدد نہ کی جنھوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال کپور تھلہ ریاست کی خدمت میں گزار دیے۔ اس موقع پر مسلمان عمائدین کے وفد نے ٹکا صاحب سے مل کر مسلمانوں کے محفوظ انخلا کے لیے مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن یہ درخواست نیم دلی کے ساتھ منظور کی گئی۔ ولی عہد نے 28 ٹرکوں پر مشتمل قافلے کے لیے فوجی سکیورٹی مہیا کرنے کی منظوری دی تاکہ مسلمان اور ان کے خاندان اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ جب قافلہ اگلے روز مسلمان مہاجرین کو لے جانے کے لیے تیار تھا تو انارکلی کے باعث مسلمان مرد اپنے اپنے خاندانوں کی حفاظت کے لیے مختلف محفوظ مقامات پر جمع تھے تاکہ سکھ حملہ آوروں سے بچ سکیں۔ اگلی شام کو ٹرکوں کا کارواں پہنچ گیا لیکن اس کے ساتھ فوجی نہیں تھے۔ خوفزدہ اور بوکھلائے مسلمان ٹرکوں پر بے صبری کے ساتھ سوار ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ ہمیں بتایا گیا کہ پروگرام کے تحت قافلہ پہلے شہر کے وسط میں جائے گا جہاں الوداعی تقریب ہوگی اور ٹکا صاحب مسلمانوں کو ان کی خدمات کے اعتراف میں سلیوٹ کرے گا کیونکہ مہاراجہ تجگجیت سنگھ نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ ٹکا صاحب نے مین بلیوارڈ پر ہمیں الوداعی سلام کیا جس کے بعد ولی عہد اور دیگر عمائدین ریاست منتشر ہو گئے۔

''پروگرام کے مطابق ہمیں اب روانہ ہونا تھا لیکن پتہ چلا کہ اس شیڈول میں تبدیلی کی گئی ہے کیونکہ قافلے کی سکیورٹی کے لیے فوجی گاڑیاں ابھی تیار نہیں تھیں۔ چنانچہ ہمیں دوبارہ گھروں میں پہنچا دیا گیا اور اگلے روز تک انتظار کرنے کو کہا گیا۔ میں گھر واپس گئی تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ ہمارے سکھ ہمسائے جن سے ہمارے قریبی دوستانہ مراسم تھے نے لوٹ مار کے لیے بیرونی دیوار میں نقب لگا رکھی تھی اور کئی قیمتی اشیا لوٹی بھی جا چکی تھیں۔ چھت کے پنکھے بھی غائب تھے۔ کتنی مضحکہ خیز بات تھی کہ چند ہی گھنٹے پہلے انہی ہمسایوں نے ہمیں نم آلود آنکھوں کے ساتھ گرمجوشی سے رخصت کیا تھا اور یہ یقین دلایا کہ وہ ہماری عدم موجودگی میں گھر کی حفاظت کریں گے۔ چاہے ہم کئی دہائیوں کے بعد بھی گھر واپس آئیں تب بھی وہ اسی حالت میں ملے گا۔

''ان ہمسایوں کے رویے میں اچانک تبدیلی پر میں اپنے جذبات قابو میں نہ رکھ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری والدہ نے مجھے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا کیونکہ خفت سے بچنے کے لیے ہمارے ہمسائے ہمیں جان سے بھی مار سکتے تھے۔ یہ ہمارے لیے بے سکونی کی رات تھی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اگلے روز ہر کوئی بے تابی سے کارواں کا انتظار کرنے لگا۔ جاں گسل انتظار کے بعد شام کو بالآخر ٹرک پہنچ گئے۔ خوفزدہ اور بوکھلائے ہوئے لوگ ایک بار پھر ٹرکوں پر سوار ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ ٹرک مسافروں سے بری طرح بھرے ہوئے تھے۔ اور جس وقت میرے والد اور دادا وہاں کھڑے تھے تو سکھوں کی ایک ٹولی نے ان سے پیسوں اور زیورات بھرا بریف کیس چھین لیا اور انہیں یرغمال بنا لیا۔ یوں وہ ہمارے ساتھ ٹرک پر سوار نہ ہو سکے۔ قافلے کے سٹاف نے ٹرکوں کو اوپر سبز رنگ کی چادر سے ڈھانپ دیا تاکہ حملہ آور سکھ نوجوان لڑکیوں، عورتوں اور بچوں کو نہ دیکھ سکیں۔ ہمارا خاندان ٹرک نمبر 7 پر سوار ہوئی۔ میری ماں نے مجھے اور دیگر بچوں کو اپنی گود میں چھپا لیا۔ وہ کہتی رہیں کہ اپنے منہ سے ایک بھی لفظ نہ نکالو۔

''کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد قافلے پر سکھ جتھے نے حملہ کر دیا اور صرف گیارہ یا بارہ ٹرک وہاں سے فرار ہوئے جبکہ باقی ماندہ ٹرک وہیں کھڑے ہو گئے کیونکہ حملہ آوروں نے ٹائروں پر گولیاں مار کر انہیں بے کار کر دیا

تھا۔ چادر کے پیچھے دبکے ہوئے ہم سب کس و بے آسرا خواتین اور بچوں کی آوازیں سن سکتے تھے۔ ہمارا ٹرک کچھ آگے بڑھا تو یہ چیخیں دھیمے سے دھیمے ہوتی گئیں۔ اب اندھیرا چھا چکا تھا۔ قافلہ ایک جگہ رکا تو وہ مقام جنگل جیسا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ کپور تھلہ ریاست کی سرحد تھی اور وہاں سے آگے ہمیں اپنی ذمہ داری پر جانا پڑے گا۔ اس وقت تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہمیں ٹرکوں سے باہر نکلنے کا حکم دیا گیا۔ ہم ہر طرف برساتی پانی کے ریلے دیکھ سکتے تھے۔ دیگر مسافروں کی طرح ہمیں بھی پانی سے گزرنا پڑا جو بعض مقامات پر 2 سے 3 فٹ گہرا تھا۔ میری ماں نے ہم پانچ بہنوں کے اکلوتے بھائی کو گود میں اٹھا رکھا تھا جس کی عمر صرف چھ سال تھی۔ میرے ساتھ تین بہنیں تھیں۔ میری بڑی بہن نہایت ڈرپوک تھی اس لیے وہ ہماری کوئی رہنمائی نہ کر سکی۔ چنانچہ ساری ذمہ داری میرے کندھوں پر آن پڑی۔ ہماری سب سے بڑی بہن شادی شدہ تھی اور پہلے ہی پاکستان میں رہ رہی تھی۔ گہرے پانی میں چلتے چلتے ہمارے جوتے کہیں گر گئے اور پاؤں ننگے ہونے کی وجہ سے پتھروں سے زخمی ہو گئے۔ جھاڑیوں نے الگ ہمیں نقصان پہنچایا۔ کئی جگہ پر جو کلیں چبھ گئیں جو دیگر مہاجرین کی طرح ہمیں بھی بار بار اتارنا پڑیں۔ کچھ افراد کو سانپوں نے کاٹ لیا۔ ہمیں تقریباً دس روز تک چھپنا پڑا۔ یہ ایک آزمائش کا وقت تھا کیونکہ کھانے کو کچھ تھا نہ پینے کو۔ ہمیں گندم کے دانے چبانے پڑے جو کچھ خاندان ساتھ لائے تھے۔ کچھ مرد دور دراز سے کنویں سے پانی لے آئے لیکن بہت کم مقدار میں۔ ٹائلٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور مردوں کو اپنے خواتین خانہ کے پردے کے لیے کپڑوں کے ٹکڑے استعمال کرنا پڑے۔

''اس موقع پر پتہ چلا کہ راستے میں کوئی ریل کی پٹڑی نہیں البتہ پاکستان جانے والی ایک سڑک 2 میل دور تھی۔ ہم اس سڑک پر جا پہنچے۔ کچھ دیر بعد ٹرکوں کا ایک قافلہ وہاں رکا۔ یہ پاکستانی فوج کا دستہ تھا جو بھارت سے آنے والے مہاجرین کی حفاظت پر مامور تھا۔ ہر کوئی بے تابی سے ٹرک پر سوار ہونے کی کوشش کرنے لگا لیکن ان میں بمشکل کوئی گنجائش باقی تھی۔ اپنے دادا اور والد (ہمارا مرد وں) کی عدم موجودگی میں ہمیں سخت معذوری کا سامنا کرنا پڑا۔ میری ماں نے فوجیوں سے التجا کی کہ وہ ان کے بچوں کو پاکستان لے جائیں۔ والدہ نے خود پاکستان جانے کی بجائے بھارت میں ہی اپنے شوہر اور سسر کی تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کے بچے بحفاظت پاکستان چلے جائیں۔ ان کی خواہش تھی کہ سکھوں کی بجائے اپنے بچے مسلمانوں کے حوالے کرنا زیادہ بہتر تھا۔ ایک فوجی نے ترس کھاتے ہوئے ہم بچوں کو پاکستان لے جانے کا وعدہ کیا لیکن ٹرک میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ چنانچہ ہمیں ایک روز وہیں قیام کرنے کو کہا گیا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت قافلہ واپس آگیا اور فوجیوں نے میری ماں کو پہچان کر کہا کہ آپ بچوں سمیت ٹرک میں سوار ہو جائیں۔ لیکن والدہ نے ہمیں ٹرک پر بٹھا کر خود نہ جانے کی وجہ بتائی۔ نمناک آنکھوں کے ساتھ انہوں نے ہمیں الوداع کہا اور فوجی سے کہا 'میں لاچارگی کی اس حالت میں بچوں کو تمہاری نگرانی میں دے کر جا رہی ہوں۔ خدا را ان کا دھیان رکھنا۔ اللہ بھی انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔'

''اس کے بعد ٹرک چلا پڑا۔ ہم نے اپنی ماں کو دیکھا اور یوں لگا کہ ہم انہیں دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ کچھ دیر بعد وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ اس نو عمری میں غیر محفوظ اور ایک اجنبی جگہ پر ہونے کے احساس سے ہم رونے لگے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد قافلہ رک گیا۔ سڑک کنارے ایک مسلمان خاتون ساکت پڑی تھی۔ وہ کسی حملے کا نشانہ بنی تھی

اور فوجی اس کی مدد کے لیے رکے تھے۔ اگرچہ خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا لیکن وہ اب بھی زندہ تھی لیکن کومے کی حالت میں تھی۔ اس کا پیٹ چاک تھا۔ فوجیوں نے کپڑے کا ٹکڑا اس کے زخم کے گرد کس کر باندھ دیا اور اسے ٹرک میں ڈال لیا گیا۔ ہمیں کہا گیا کہ ہم اس کے زخمی زخمی جسم سے چیونٹیاں پکڑ کر اتاریں۔ یہ سب ہمارے لیے ایک ڈراؤنے خواب جیسی صورتحال تھی۔ قافلے نے سفر جاری رکھا۔ پھر بتایا گیا کہ ہم واہگہ بارڈر پہنچ چکے تھے۔ قافلے کے شرکا نے جذبات اور احترام کے ساتھ پاکستان کی سرزمین کو چوم لیا۔ زخمی خاتون کو ایمبولینس پر ہسپتال بھجوا دیا گیا۔ معلوم نہیں کہ وہ بے چاری زندہ بچی یا مر گئی۔ وہ خاندان جن کے تمام رشتہ دار زندہ پاکستان پہنچ گئے نہایت خوش تھے لیکن ہمارے چہروں سے آزردگی اور ملال عیاں تھا کیونکہ ہم اپنے والدین اور دادا سے محروم تھے۔ پاکستان میں لوگ مہاجرین کے لیے کھانے پینے کی اشیا اور دیگر ضروری سامان لاتے تھے۔ واہگہ پر کچھ وقت گزرنے کے بعد ٹرک والٹن سٹیشن مہاجر کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ بہت بڑا مہاجر کیمپ تھا جہاں ہم گیارہ روز تک مقیم رہے۔ وہاں لاؤڈ سپیکروں سے مہاجرین کے نام پکارے جاتے تھے۔ جو لوگ نئے آتے ان کے نام بار بار پکارے جاتے تاکہ ان کے دوست اور رشتہ دار ان سے رابطہ کر سکیں۔ اسی طرح ان کے پاکستانی رشتہ داروں کے نام بھی لیے جاتے تاکہ وہ اپنے عزیزوں سے مل سکیں۔ یہ کام ریڈیو پاکستان پر بھی کیا جاتا تھا۔

"گیارہویں روز ہم اعلانات سن رہے تھے کہ ایک دور کے رشتہ دار کا نام میری سماعت سے ٹکرایا۔ وہ بیڈن روڈ لاہور کے ایک گھر میں رہ رہا تھا۔ یہ ایک کربناک سفر کے بعد امید کی نئی کرن تھی۔ ہم نے فوراً بیڈن روڈ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے ایک تانگے والے سے مل کر پوچھا کہ کیا وہ ہمیں بیڈن روڈ لے جائے گا لیکن ہمارے پاس کرایہ دینے کے لیے کوئی پیسہ نہیں۔ ان دنوں پاکستانیوں کے قوم پرستانہ اور حب الوطنی کے جذبات عروج پر تھے۔ وہ فوراً مان گیا۔ ہم وہاں پہنچے تو ہمارے عزیزوں کو ہمیں لٹی پھٹی حالت میں اور جوتوں کے بغیر دیکھ کر سکتہ لگ گیا۔ تقسیم سے پہلے جب کبھی وہ کپورتھلہ آتے تھے تو ہم متمول زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے ہمارے والدین کے بارے میں پوچھا تو ہم نے انہیں پوری کہانی سنا دی۔ وہ مزید صدمے سے دوچار ہوئے۔

"نہانے کے بعد ہمیں صاف ستھرے کپڑے پہننے کو دیے گئے۔ طویل عرصے کے بعد ہم نے پر تکلف اور لذیذ کھانا کھایا۔ ہم وہاں دس روز تک مقیم رہے۔ ہمارے رشتہ داروں نے ہمارے نام اور پتہ ریڈیو پاکستان سے نشر کرایا جس سے دیگر عزیزوں کو بھی پتہ چل گیا۔ یوں ہمارا اپنے پیاروں سے دوبارہ ملنا ممکن ہو سکا۔ میرے والدین اور دادا ہم سے ایک ماہ بعد ملے۔ وہ ایک اور قافلے میں شامل ہو گئے تھے لیکن سیلاب کے باعث دریائے بیاس پر پل ٹوٹنے سے انہیں آنے میں تاخیر ہو گئی۔"

شیخ محمد فاروق

میری شیخ محمد فاروق سے ملاقات 13 دسمبر 2004 کو راج گڑھ کے دورے میں ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنی سلطان پور لودھی سے نقل مکانی کی یہ تفصیل بتائی:

"میں، میری والدہ اور بہنیں سلطان پور لودھی میں رہتے تھے۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے گھر میں کوئی جوان مرد نہیں تھا۔ جب فسادات کا آغاز ہوا تو میرے والد کا ایک سکھ دوست سانتا سنگھ ہماری مدد کو آیا۔ ہم مہاجر کیمپ کے

لیے روانہ ہوئے۔ میں اس کے کندھوں پر سوار تھا جبکہ میری ماں اور بہنیں پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ اچانک ہمیں سکھوں نے گھیر لیا۔ یہ لوگ مجھے اور میری ماں کو قتل کرنا اور میری بہنوں کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ سانتا سنگھ نے انہیں للکار کہا، 'تم لوگوں کو پہلے میری لاش سے گزرنا پڑے گا۔ یہ لوگ میرے اہل خانہ جیسے ہیں۔ کیا گوروؤں نے تمہیں یہی درس دیا ہے؟' یہ سن کر جتھے میں سے ایک معمر سکھ آگے آیا اور سانتا سنگھ کے سامنے کھڑے ہو کر بولا 'اس سکھ کو اپنا وعدہ پورا کرنے دو، اس مسلمان خاندان کی بے حرمتی مت کرو، چنانچہ وہ ہجوم منتشر ہو گیا۔"

پاکستان سے کپورتھلہ کے لیے خط

میں نے قبل ازیں کتاب میں بتایا ہے کہ ہوشیار پور کے دورے میں ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے جنرل سیکرٹری مسٹر رجنیش ٹنڈن ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ ان کی اہلیہ نے مجھے یہ کہانی سنائی تھی:

"میرا آبائی شہر کپورتھلہ ہے۔ میرے والد کے کئی دوست مسلمان تھے۔ وہ سب 1947 میں یہاں سے چلے گئے۔ ایک روز پاکستان سے میرے والد کے نام ایک خط اور منی آرڈر آیا۔ یہ ان کے ایک پرانے مسلمان دوست کی طرف سے تھا۔ وہ میرے والد کے بھائی جیسا تھا۔ تقسیم کے بعد اسے پاکستان جانا پڑا۔ اس نے میرے والد سے کچھ پیسے ادھار لیے تھے جو وہ اس وقت واپس نہ کر سکا۔ خط میں اس نے میرے والد کو بتایا کہ وہ بستر مرگ پر تھا اور کسی بھی وقت اس کی موت واقع ہو سکتی تھی۔ پاکستان میں اسے نہایت مشکل وقت گزارنا پڑا۔ اس لیے وہ کافی عرصے تک قرضہ اتارنے کے قابل نہ ہو سکا۔ لیکن اب وہ رقم لوٹا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ امید ہے میرے والد اس تاخیر پر اسے معاف کر دیں گے۔ خط پڑھ کر والد صاحب رونا شروع ہو گئے اور جواب لکھا کہ ادھار کی رقم اتنی اہم نہیں اور مجھے تو اب یہ یاد بھی نہیں تھی۔ وہ اتنے عرصے کے بعد اپنے دوست کی خبر ملنے پر خوش تھے لیکن اس بات کا انہیں دکھ تھا کہ وہ آخری وقت میں اس کے پاس نہیں تھے۔"

فرید کوٹ ریاست

فرید کوٹ کی کل آبادی ایک لاکھ 99 ہزار 283 تھی جس میں سے سکھوں کی آبادی ایک لاکھ 15 ہزار 70 (57.5 فیصد) تھی جبکہ مسلمانوں کی آبادی 61 ہزار 352 اور ہندوؤں کی تعداد (بشمول شیڈول کاسٹ) صرف 21 ہزار 789 تھی۔ مہاراجہ فرید کوٹ بہت عرصے پہلے اکالیوں کا حامی بن چکا تھا اور فرید کوٹ کے فوجی لاہور کے نواحی علاقے راج گڑھ میں مسلمانوں پر حملوں میں ملوث تھے۔ فوج اور پولیس نے شہری اور دیہی دونوں علاقوں میں کئی مسلمانوں کو نشانہ بنایا۔ فرید کوٹ شہر سے مسلمانوں کی بے دخلی کے عمل کی مہاراجہ نے خود نگرانی کی۔ انہیں زیادہ سامان ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی (Disturbance in Punjab,1995: 396)۔

فرید کوٹ سے مسلمانوں کی بیدخلی کی مختلف کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ ایک کہانی ہارون سلیم بھٹی کی دادی سناتی ہیں کہ مہاراجہ کی ماں نے اسے مسلمانوں کے خلاف طاقت کے استعمال سے منع کیا تھا کیونکہ ریاستی فوج اور مہاراجہ کے حفاظتی دستے میں کئی مسلمان شامل تھے اس لیے اخلاقی طور پر وہ پابند تھا کہ مسلم کمیونٹی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

چنانچہ مہاراجہ نے مسلمانوں کو حفاظتی دستے کے ساتھ حسینی والا ہیڈ ورکس تک پہنچایا جہاں سے انہوں نے پاکستان کی سرحد پار کی۔ ایک اور داستان مجھے حسن دین نے سنائی۔

حسن دین

''ہم فرید کوٹ شہر کے چھوٹے کاشتکار تھے۔ ہماری زمین شہر سے باہر تھی۔ سکھوں نے اگست میں مسلمانوں پر مظالم ڈھانا شروع کیے۔ مسلمانوں کو بتایا گیا کہ مہاراجہ نے ان کی بے دخلی کا حکم دیا تھا۔ فرید کوٹ کی فوج ہمارے ساتھ کچھ فاصلے تک گئی اور پھر واپس آگئی۔ ہمارے ساتھ ہزاروں افراد سفر کر رہے تھے۔ بوڑھے افراد چھکڑوں پر اور کچھ سائیکل پر سوار تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ کہیں کہیں بوڑھے اور کمزور افراد کو آگے لے جانا مشکل ہو گیا اور انہیں پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ کئی معمر افراد نے خود اپنے رشتہ داروں کو کہا کہ انہیں چھوڑ کر آپ پاکستان جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کریں۔ دراصل انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اپنے خاندانوں پر بوجھ تھے اور ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے وہ صرف اللہ پر یقین رکھتے ہوئے مشکل حالات کے لیے تیار ہو گئے۔ کہیں کہیں کوئی خاندان کا فرد بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ پیچھے رہ گیا۔ چونکہ یہ ایک بڑا قافلہ تھا اس لیے مجھے پتہ نہیں کہ ایسے افراد کے ساتھ کیا ہوا۔

''جیسے ہی ہم انگریز حکومت کی حدود میں پہنچے (یقیناً یہ تحصیل فیروز پور کا علاقہ تھا) تو ہم پر کئی قسم کے ہتھیاروں سے مسلح سکھ جتھوں نے حملہ کر دیا۔ یہ لوگ نعرے بھی لگا رہے تھے۔ لوگ حملے کے بعد ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ میرے والد نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا جبکہ والدہ نے چھ ماہ کی میری چھوٹی بہن کو اٹھا رکھا تھا۔ میرا بڑا بھائی اور بہن بھی ماں کے ساتھ تھے۔ گھڑ سوار ایک سکھ نے میرے والد کے سینے پر نیزہ مارا تو وہ چیخ مار کر گر پڑے۔ میں خوف سے رونے لگا تو وہ سکھ وہاں سے چلا گیا۔ ایک اور سکھ میری طرف آیا لیکن جب اس نے مجھے باپ کے ساتھ چمٹے دیکھا تو وہ بھی جھجک کر چلا گیا۔ پتہ نہیں اس کے ذہن میں کیا آیا لیکن بہر حال وہ مجھے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ہر طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ صرف کچھ بچوں کی جان بخشی کر دی گئی۔ کچھ معمر عورتوں کو بھی چھوڑ دیا گیا تھا جبکہ جوان خواتین وہ ساتھ لے گئے۔ میری ماں اور بہن کو مار ڈالا گیا۔ انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ مجھے آج تک پتہ نہیں چلا کہ میرے بڑے بھائی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ کئی ہزار افراد میں سے محض چند سو مسلمان کھیتوں میں چھپ کر جان بچا سکے۔ فیروز پور میں خوش قسمتی سے ہماری ملاقات ایک انگریز افسر کی سربراہی میں فوجی دستے سے ہو گئی۔ اس میں شامل مسلمان فوجیوں نے ہماری مدد کی۔ قصور پہنچنے میں ہمیں کئی روز لگے جہاں عیسائی رضاکاروں نے ہمیں طبی امداد فراہم کی۔

''میں قصور مہاجر کیمپ میں کئی روز تک مقیم رہا۔ وہاں کی حالت کافی دگرگوں تھی لیکن اب ہم پاکستان میں تھے اور محفوظ تھے۔ مجھ جیسے بے آسرا بچوں کو کچھ خدا ترس انسانوں نے سنبھالا اور کھانے پینے کو دیا۔ مقامی مولویوں نے بھی جو کچھ بن پڑا ہماری مدد کی۔ پھر ایک روز میرے ماموں نے مجھے تلاش کر لیا۔ وہ لاہور میں سول سیکرٹریٹ میں ملازم تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی چنانچہ انہوں نے مجھے گود لے لیا اور اپنا بیٹا بنا لیا۔ زندگی میرے لیے نہایت تکلیف دہ

اور جدوجہد والی ثابت ہوئی۔ میں اپنے ماں باپ کو آج بھی یاد کرتا ہوں۔ اب میری اپنی اولاد ہے لیکن میرے پرانے زخم آج بھی تازہ ہیں۔"

خان بہادر ملک خدا بخش

قبل ازیں خان بہادر ملک خدا بخش کا تقسیم پنجاب سے پہلے کے مشرقی اضلاع کے حالات کے حوالے سے ذکر کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس دور میں سکھ ریاستوں کا بھی دورہ کیا ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

پٹیالہ

یکم ستمبر 1947 کو پٹیالہ شہر میں 48 گھنٹے کا کرفیو نافذ کیا گیا جس کے دوران سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ نے مسلمان عمائدین کو طلب کر کے کہا کہ شہر کے تین اطراف میں پناہ کیمپ قائم کیا جا چکا ہے جس کی حفاظت مسلمان سپاہیوں کے سپرد ہوگی۔ چنانچہ مسلمان کیمپوں کی طرف چلے گئے۔ اس دوران مسلمان اور سکھ سپاہیوں میں تصادم ہو گیا جس کا نتیجہ مسلمانوں کی ہزیمت کی صورت میں نکلا۔ اس کے بعد مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام کیا گیا۔ سینکڑوں مسلمان خواتین کو برہنہ شہر کی سڑکوں پر گھمایا گیا اور سکھوں سے کہا گیا کہ وہ جسے چاہیں اپنے لیے پسند کر لیں۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے میں خواتین کی شرمناک انداز میں بے حرمتی اور ان کی چھاتیاں کاٹنے کا ذکر کروں۔۔۔

سرہند شریف میں ملحقہ دیہات سے 30 ہزار مسلمانوں کو جمع کیا گیا۔ میں نے خود خانقاہ حضرت مجدد الف ثانیؒ پر ان لوگوں کا اجتماع دیکھا تھا— کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ پٹیالہ نے اعلان کیا تھا کہ اگر مسلمان ننکانہ صاحب کو نقصان نہیں پہنچاتے تو خانقاہ کو بھی نہیں چھیڑا جائے گا۔ لیکن اگر ننکانہ صاحب پر مسلمانوں نے حملہ کیا تو وہی سلوک خانقاہ مجدد الف ثانی کے ساتھ بھی کیا جائے گا— پٹیالہ ریاست میں مسلمانوں کا بھاری جانی اور مالی نقصان ہوا۔ دراصل انبالہ، لدھیانہ اور کرنال میں مسلمانوں کے ساتھ جو ہوا اس کے ذمہ دار بھی پٹیالہ ریاست کے لوگ تھے (1993: 210-12)۔

نابھہ

میں نے وزیر اعظم نابھہ سے رابطہ کیا جنہوں نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے 15 ہزار مسلمانوں کی حفاظت کا یقین دلایا تاہم انہوں نے ان مسلمانوں کے جلد از جلد انخلا پر زور دیا۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ:

"میں ڈی ایس پی سردار رجندر سنگھ کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں تا کہ وہ ذاتی طور پر تمام صورتحال سے آگاہ کرے۔ سیاسی تصفیے، فرقہ وارانہ پاگل پن، ریاست کے جغرافیہ اور پولیس اور فوج کی ناکافی تعداد کے پیش نظر ریاست سے مسلمان اقلیت کا جلد انخلا ضروری ہے۔۔۔

جب میں نابھ سے رخصت ہوا تو ریاست کی صورتحال میں کافی تناؤ پایا جاتا تھا۔ مجھے وزیراعظم کی بات پر یقین تھا مگر اس بات پر شبہ تھا کہ وہ زیادہ دیر تک حالات سنبھال سکیں گے۔ واحد حل نابھ کے مسلمانوں کی بہاولپور کی طرف نقل مکانی تھا (Ibid)۔

کالسیہ ریاست

کالسیہ ایک ننھی ریاست تھی جس کی کل آبادی 67 ہزار 393 نفوس پر مشتمل تھی۔ جس میں سے 25 ہزار 49 یعنی 37 فیصد تعداد کے ساتھ مسلمان اکثریت میں تھے۔ ملک خدا بخش لکھتے ہیں کہ:

لگتا ہے کہ مسلمانوں کی نسل کشی میں کالسیہ ریاست پٹیالہ کا مقابلہ کر رہی تھی لیکن ریاست کے جغرافیہ کی وجہ سے مسلمان فرار ہو کر انبالہ چلے گئے اور میرے خیال میں یہاں جانی نقصان پٹیالہ جتنا نہیں ہوا۔ میں نے ڈیرہ بسی (کالسیہ) کے مسلمانوں کو بخیریت مبارک پور کیمپ تک پہنچایا۔

نعل گڑھ

نعل گڑھ کالسیہ سے بھی چھوٹی ایک پہاڑی ریاست تھی۔ کل آبادی 52 ہزار 780 تھی۔ مسلمانوں کی تعداد 6862 یا 13 فیصد تھی۔ خان بہادر ملک خدا بخش نے لکھا ہے کہ:

انبالہ کے ایم ایل اے سید غلام بھیک نارنگ Syed Ghulam Bhik Narang کے نام مضطرب ٹیلی گراموں سے پتہ چلا کہ ریاست میں مسلمانوں کو ذبح کیا جا رہا تھا۔ میں نے ریاست کے مہاراجہ کو تار بھجوائی جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا تھا کہ مسلمانوں کی زندگی اور حرمت کا تحفظ یقینی بنایا جائے۔ مجھے ان کی جوابی تار موصول ہوئی کہ وہ ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس کے باوجود ریاست میں مسلمانوں کے قتل عام کی اطلاعات ملتی رہیں۔

ریاست جند کے چیف جسٹس خان بہادر عبدالعزیز

ریاست جند Jind State کے سابق چیف جسٹس کی ایک تفصیلی رپورٹ میں سے کچھ اقتباسات نیچے دیے جا رہے ہیں:

مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اکالی لیڈروں، نابھ، پٹیالہ اور فرید کوٹ کے حکمرانوں اور انڈیا یونین کے نائب وزیراعظم مسٹر پٹیل کے درمیان اس سازش کا گٹھ جوڑ موجود تھا۔

انہوں نے اپنی رپورٹ میں کئی واقعات بتائے ہیں۔ پاکستان جانے والی ایک ٹرین پر بھٹنڈہ اور ڈھوری میں حملے کیے گئے۔ یہ دونوں علاقے ریاست پٹیالہ کی حدود میں تھے۔ ان ٹرینوں میں پاکستان کے کئی حکام بھی تھے۔

کئی افراد ہلاک ہوئے۔ چنانچہ حکومت نے اس روٹ پر آمد و رفت پر پابندی لگا دی۔ جسٹس عبد العزیز کے مطابق اگر حکومت پاکستان 'مناسب' اقدامات کرتی تو ہلاکتوں سے بچا جا سکتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> میری یہ پختہ رائے ہیں کہ پاکستانی پنجاب کے وزیر بحالیات میاں افتخار الدین پٹیالہ ریاست میں لا پتہ ہونے والے ڈھائی لاکھ افراد کی تلاش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یقیناً ان لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا ہے اور ان کی تلاش کی کوششیں قطعی طور پر بے کار ثابت ہوں گی۔
> جہاں تک ریاست جند کا تعلق ہے میں نے وہاں نو سال تک خدمات انجام دیں تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ریاست کا حکمران خوش قسمتی سے غیر متعصب تھا۔ وہ اپنی مسلمان رعایا کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ یہاں جو کچھ ہوا وہ پٹیالہ، نابھ اور فرید کوٹ ریاست کے زیر اثر ہوا۔

انٹرویوز

ہرکشن سنگھ سرجیت، نئی دہلی، 21 اکتوبر 1999
حسن دین، لاہور، 13 اپریل 2003
ڈاکٹر خوشی محمد خان، سٹاک ہوم، 16 جون 2003
چودھری روشن دین، کلر سیداں، ضلع راولپنڈی، 15 دسمبر 2004
مجاہد الحسینی، فیصل آباد، 19 دسمبر 2004
شیخ نور محمد، لاہور، 27 دسمبر 2004
مسز رجنیش ٹنڈن، ہوشیار پور، 3 جنوری 2005
ڈاکٹر نظام دین، ملیر کوٹلہ، 6 جنوری 2005
چودھری عبد الشکور، ملیر کوٹلہ، 6 جنوری 2005
بابو خان، ملیر کوٹلہ، 6 جنوری 2005
چودھری عبد الشکور، ملیر کوٹلہ، 6 جنوری 2005
امر ک چند آہلووالیہ پٹیالہ، 7 جنوری 2005
پنڈت موہن لال بالو پٹیالہ، 7 جنوری 2005
شیخ محمد فاروق، راج گڑھ، لاہور، 13 جنوری 2005
بستہ سنگھ، ادم پور، ضلع فتح گڑھ، مشرقی پنجاب، 28 نومبر 2005
نو گردیال سنگھ، ادم پور، ضلع فتح گڑھ، مشرقی پنجاب، 28 نومبر 2005

تیجا سنگھ، مٹھی، ضلع فتح گڑھ، مشرقی پنجاب، 28 نومبر 2005

دلیس راج، کاکڑا، مشرقی پنجاب، 28 نومبر 2005

جگپال ٹیوانہ، ڈارٹماؤتھ، کینیڈا، بذریعہ ای میل، 11 اپریل 2007

بیگم بی۔ اے چودھری، لاہور، کے بیٹے ڈاکٹر محمد فاروق نے بذریعہ ای میل، 22 جولائی 2007

ہارون سلیم بھٹی کی دادی، لاہور سے بذریعہ ٹیلی فون، 22 فروری 2011

References

Aziz, Abdul (Khan Bahadur), *'Report made by Khan Bahadur Abdul Aziz, Chief Judge, Jind State'*, *The Journey to Pakistan: A Documentation on Refugees of 1947*, 1993, Islamabad: National Documentation Centre, (1993).

Coupland, Ian, 2002, *'The Master and the Maharajas: The Sikh Princes and the East Punjab Massacres of 1947'*, *Modern Asian Studies*, Vol. XXXVI, No. 3, Cambridge: Cambridge University Press.

Disturbances in the Punjab, Islamabad: National Documentation Centre, (1995).

Jeffrey, Robin, 1974, *'The Punjab Boundary Force and the Problem of Order, August 1947'*, *Modern Asian Studies*, Vol. VIII, No. 4, Cambridge: Cambridge University Press.

Malik, Khuda Baksh (Khan Bahadur), *'A brief report made by K. B. Malik Khuda Baksh regarding the districts of Ambala, Karnal, Rothak, Hissar, Simla, Ludhiana and Jullundur'*, *The Journey to Pakistan: A Documentation on Refugees of 1947*, 1993, Islamabad: National Documentation Centre, (1993).

Muhammad, Mian Noor, *'Patiala ke Mussalmanon par Tutne wali Qiamat-e-Sughra: Hissa Dom'* (*The Mini Day of Judgement that befell the Muslims of Patiala: Part Two*) in Chughtai, Hakim Muhammad Tariq Mehmood Abqary Mujadidi (compiler and editor), *1947 Ke Muzalim ki Kahani khud Muzlumon ki Zabani* (*The Story of the 1947 Atrocities from the Victims' Themselves*), Lahore: Ilm-o-Irfan Publishers, (2003).

Rabbani, Chaudhri Ghulam, *'Statement of Ch. Ghulam Rabbani S/0 Ch. Abdul Azia Caste Arain, Contractor, Mohalla Hakiman, Nabha'*, *The Journey to Pakistan: A Documentation on Refugees of 1947*, 1993, Islamabad: National Documentation Centre, (1993).

Sardar Abdul Aziz, *'Statement of Sardar Abdul Aziz: retired superintendent of police, Patiala State'*, *The Journey to Pakistan: A Documentation on Refugees of 1947*, 1993, Islamabad: National Documentation Centre, (1993).

Sharif, Muhammad Afzal, *'Patiala ke Mussalmanon par Tutne wali Qiamat-e-Sughra: Hissa Awwal'* (*The Mini Day of Judgement that befell the Muslims of Patiala: Part One*) in Chughtai, Hakim Muhammad Tariq Mehmood Abqary Mujadidi (compiler and editor), *1947 Ke Muzalim ki Kahani khud Muzlumon ki Zabani* (*The Story of the 1947 Atrocities from the Victims' Themselves*), Lahore: Ilm-o-Irfan Publishers, (2003).

Government publications

The Sikhs in Action, Lahore: Government Printing Press, (1948).

Note on the Sikh Plan, Lahore: Government Printing Press, (1948).

21

تجزیہ اور اخذ کردہ رائے

اگست 1947 کے وسط میں تقسیم پنجاب کی طرف بڑھنے والے واقعات ترتیب کے ساتھ یہاں پیش کیے جا چکے ہیں۔ آغاز 1945 کی انتخابی مہم سے ہوا اور یہ عمل منقسم پنجاب کے دونوں حصوں میں غیر مطلوب اقلیتوں کے صفائے پر منتج ہوا۔ باب اول میں ان واقعات پر نسلی بنیادوں پر نسل کشی کے نظریے کی روشنی میں تجزیہ پیش کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ اس بنیاد پر ایک نتیجہ اخذ کیا گیا کہ کیا مسلمانوں یا سکھوں کے پاس نسل کشی کا سوچا سمجھا عظیم منصوبہ موجود تھا؟ اس تجزیے کا اختتام شناخت پر بحث پر کیا گیا ہے جس میں شناخت بالعموم اور پنجابی شناخت کا بالخصوص نو آبادیاتی تناظر اور نظریاتی دلائل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔

پنجاب تبدیلی کی زد میں: جدیدیت کو درپیش مسائل

عمومی نظریاتی سطح پر یہ بات محسوس کی جا سکتی ہے کہ جب انگریزوں نے پنجاب کو اپنے زیر نگین لانے کے بعد اسے اپنی مجموعی نو آبادیاتی حکمت عملی کے تحت جدید بنانے کا فیصلہ کیا تو ان تبدیلیوں سے روایتی معاشرے کی کایا کلپ کا عمل شروع ہو گیا۔ اس طرح سرمایہ دارانہ فریم ورک کے اندر نئے اقتصادی مواقع نے جنم لیا۔ سکھوں اور ہندوؤں نے ان مواقع سے فائدہ اٹھایا جبکہ مسلمان پیچھے رہ گئے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ساہوکاروں کے ہاتھوں مسلمان زمینداروں کی زرعی اراضی ہتھیانے پر پائے جانے والے غم و غصے کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی جس کے تحت پنجاب حکومت نے پنجاب لینڈ Alienation ایکٹ 1901 متعارف کرایا۔ اس قانون کے مطابق ساہوکاروں پر اپنے قرضے کے بدلے اراضی ہتھیانے پر پابندی لگا دی گئی لیکن بد قسمتی سے ساہوکاروں نے مسلمان فرنٹ مین کی آڑ میں زمینوں پر بدستور قبضہ جاری رکھا البتہ اس قانون کے بعد زمین ہتھیانے کا سلسلہ کافی حد تک کم ہو گیا۔ ان تبدیلیوں کے برعکس جب جولائی 1947 میں پنجاب باؤنڈری کمیشن کے روبرو سکھوں اور وکیلوں نے اپنے مؤقف میں جو دلائل دیے ان کا مطلب یہ تھا کہ ہندو اور سکھ پنجاب میں 75 سے 80 فیصد جائیداد کے مالک تھے۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کی غربت اور احساس محرومی ایک حقیقت تھی۔ البتہ سیاسی سطح پر مسلمانوں کی اکثریت اور انگریز نواز یونینسٹ پارٹی ایک بین العقائد شراکت اقتدار کا ایسا فارمولا تیار کرنے میں کامیاب ہو گئی جس نے فرقہ وارانہ استحکام اور ہم آہنگی کی بنیاد فراہم کر دی۔ تاہم بیسویں صدی کے اوائل میں مذہبی احیائے نو نے شہروں اور دیہات میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بدگمانی کا بیج بو دیا۔ ان تحریکوں نے ایسی 'اعلیٰ ثقافتوں' کو جنم دیا جن میں اپنے مذہب کی 'خالص اور سکہ بند' روایات کی نمائندگی کی گئی۔ اس میں حیرت نہیں کہ اس عمل کے دوران زور اختلافات پر دیا گیا۔ اس روش کا صدیوں سے صوفیوں، سنتوں اور گوروؤں کی کوشش سے پنجاب میں مستحکم ہونے والی 'جیو اور جینے دو' کی مقبول روایات سے تصادم ہونے لگا۔ مذہبی احیائے نو سے شہر اور قصبے زیادہ متاثر ہوئے۔ یہ عمل دراصل سیاسی اصطلاح میں مذہبی قوم پرستی تھا۔

چنانچہ احیائے نو کی تحریکوں کے درمیان شہری تناظر میں جھڑپیں ہوئیں البتہ دیہی علاقوں میں ماضی کی طرح پر انا نظام بدستور برقرار رہا۔ جہاں لوگ اپنے مقام سے آگاہ تھے اور کافی حد تک اسے قبول کر لیا تھا۔ یہ گویا ایک جامع معاشرہ تھا جس میں سماجی تفاوت اور عدم مساوات کے رویوں کے ساتھ پر امن تعلقات بھی برقرار رہے۔ روایتی اقدار اور عقائد نے ایک ایسے رویے کی حوصلہ افزائی کی جس کے تحت لوگوں نے 'سٹیٹس کو' کو اپنی قسمت اور ناقابل تبدیل چیز کے طور پر قبول کر لیا۔ طویل ماضی نے جاری صورتحال کی اثر پذیری ثابت کر دی تھی۔

'رنگیلا رسول' کے عنوان سے کتابچے کی اشاعت، علم دین کے ہاتھوں پبلشر راج پال کا قتل اور پھر علم دین کی 1929 میں پھانسی معاشرے کے ان مسائل کی نشاندہی کرتی تھی جن کا سامنا ہونے والا تھا۔ اظہار کی آزادی صدیوں پرانے تعلقات اور عقائد کو تہہ و بالا کر رہی تھی۔ چند برس بعد شہید گنج مسجد — گوردوارہ تنازعہ 1935 میں رونما ہوا جس سے مذہب اور مذہبی شناخت کی بنیاد پر لوگوں کو متحرک کرنے کی صلاحیت آشکار ہو گئی۔ ملتان، راولپنڈی اور بعض دیگر شہری علاقوں میں کچھ فرقہ وارانہ فسادات دیکھنے میں آئے لیکن مجموعی طور پر پنجاب یونینسٹ پارٹی کی قیادت میں صوبہ بدستور پر امن رہا۔

مارچ 1940 میں مسلمانوں کے الگ وطن کے مطالبے پر مبنی مسلم لیگ کی قرارداد کی منظوری سے روایتی استحکام اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو یقینی طور پر بڑا دھچکا لگا۔ ہندو اور سکھ پریس نے اسے 'قرارداد پاکستان' قرار دیا۔ سکھوں نے مذہبی بنیاد پر پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کر کے اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ اس طرح پنجاب کے تناظر میں تقسیم کی بنیادی منطق سادہ مگر دھاکہ خیز فارمولے سے عبارت تھی۔ یعنی اگر مسلمان ہندوستان کی تقسیم سے اپنی الگ ریاست حاصل کرتے ہیں تو سکھ بھی پنجاب میں ایسا چاہتے ہیں۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ اکالی سکھوں نے اگرچہ سکھوں کی خود مختار ریاستوں میں اپنی لابنگ شروع کر دی تھی۔ اس کے باوجود سکھوں کے پاس کوئی عظیم تر منصوبہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ 1940 کے عشرے کے شروع تک کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ تقسیم کے کیا نتائج و عواقب ظاہر ہوں گے۔

یہ بات بھی اظہر من الشمس تھی کہ مسلم لیگ پنجاب کے مسلمانوں جو اب تک یونینسٹ پارٹی کے حامی تھے کی حمایت حاصل کیے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ قرارداد لاہور کی منظوری بالخصوص دسمبر 1942 میں سر سکندر حیات کے انتقال کے بعد یونینسٹ پارٹی کے اندر قیادت کی کشمکش شروع ہو گئی۔ سر خضر ٹوانہ جاگیرداروں کی حمایت برقرار نہ رکھ سکے جو ایک ایک کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود اس مرحلے پر ہندوستان یا پنجاب کی تقسیم کا کوئی نقشہ واضح نہیں ہوا تھا کیونکہ انگریزوں نے ابھی تک اپنی رخصتی یا ہندوستان والوں کو انتقال اقتدار کا دو ٹوک اعلان نہیں کیا تھا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جن سیاسی سرگرمیوں میں تیزی آئی وہ اس اندازے کی بنیاد پر مبنی تھیں کہ انگریز فوری طور پر ہندوستان والوں کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے تیار تھے۔ لندن میں حکومت کی تبدیلی سے لیبر پارٹی اقتدار میں آئی جس نے صوبائی اسمبلیوں اور آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کا ارادہ ظاہر کیا۔ تمام عملی مقاصد کے لیے انتخابی نتائج کو اس ریفرنڈم کے طور پر لیا جانے لگا کہ کیا ہندوستان متحد رہے یا اسے تقسیم ہونا چاہیے۔ اس مرحلے پر بنگال اور پنجاب کی تقسیم کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

پہلا مرحلہ

جولائی 1945 میں پنجاب میں شروع ہونے والی انتخابی مہم کے ایجنڈے میں پنجاب کی تقسیم شامل نہیں تھی۔ البتہ سکھ طویل عرصے سے ضرور خبردار کر رہے تھے کہ اگر ہندوستان تقسیم ہوا تو پنجاب بھی ہو گا۔ یہ فطری بات تھی کہ سکھ اپنی کم تعداد کے باعث اپنا مقصد ہندو پنجابیوں کو ساتھ ملائے بغیر حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ انتخابی مہم کے دوران مسلم لیگ نے یونینسٹ پارٹی اور کانگریس دونوں کو ہدف بنایا۔ سر خضر ٹوانہ کو اسلام کا غدار قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف قابل اعتراض نعرے لگائے گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں دونوں کو کافر اور استحصالی طبقے کے طور پر مطعون کیا جانے لگا۔ پنجاب کے گورنر اور چیف سیکرٹری کی پندرہ روزہ رپورٹیں اس امر کی واضح دلالت کرتی ہیں۔ یونینسٹ پارٹی نے کانگریس نواز مجلس احرار کے مقررین کو استعمال کر کے جواب دیا جنہوں نے مسلم لیگ کے لیڈروں بالخصوص قائداعظم کی اسلامی حیثیت پر سوالات اٹھائے لیکن اس حکمت عملی پر کسی نے کان نہ دھرے۔ انتخابی مہم سے پہلے اہم دور اگست 1942 سے جون 1945 کے درمیان پورے ہندوستان اور پنجاب میں کانگریس کی قیادت جیلوں میں نظر بند تھی۔ یوں مسلم لیگ کو کسی بڑے چیلنج کا سامنا کیے بغیر قیام پاکستان کے اپنے مقاصد کی ترویج کا بھرپور موقع مل گیا۔

پنجاب میں مسلم لیگ نے انتخابی مہم میں بریلوی علما، مسلمان کمیونسٹوں اور علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبا کا تعاون حاصل کیا۔ پاکستان کو مستقبل کی جنت ارضی قرار دینے کا نقشہ کھینچنے سے وہ مسلمان بھی اس خیال کی طرف راغب ہو گئے جو مسلم لیگ کے ووٹر نہیں تھے۔ انتخابی نتائج تباہی کا شاخسانہ ثابت ہوئے۔ انتخابی مہم کے دوران ہندوؤں اور سکھوں میں خوف اور بے چینی نے جنم لیا اور انتخابی نتائج نے ان کے بدترین خدشات درست ثابت کر دیے۔ پنجاب کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کی بلا شرکت غیرے حمایت کی تھی۔ یونینسٹ پارٹی کو یکسر مسترد کر دیا گیا۔ دوسری طرف سکھوں نے بھی پنتھی پارٹیوں کو ووٹ دیا۔ جن میں ماسٹر تارا سنگھ اور دیگر اکالی لیڈر شامل تھے جن کا دو ٹوک موقف تھا کہ پاکستان بنا تو پنجاب ضرور تقسیم ہو گا۔ 1945 میں سر چھوٹو رام کے انتقال کے بعد انبالہ کے ہندی بولنے والے ہندو جاٹوں نے بھی اپنی وفاداریاں یونینسٹ پارٹی سے کانگریس کی طرف منتقل کر دیں۔ ہندو مہاسبھا، مجلس احرار اور دیگر چھوٹی پارٹیوں کا الیکشن میں صفایا ہو گیا۔ صوبے کے تینوں مذاہب اب انتخابی اور سیاسی طور پر تین سیاسی جماعتوں سے منسلک ہو چکے تھے۔ مسلم لیگ واضح طور پر مسلمانوں کی مکمل نمائندہ جماعت بن کر ابھری تاہم حکومت بنانے کے لیے اسمبلی میں مطلوب نشستوں میں سے دس نشستیں اب بھی کم تھیں۔

کانگریس اور سکھوں نے پنجاب میں مسلم لیگ کی حکومت بننے کی ہر ہر کوشش میں روڑے اٹکائے۔ انہوں نے سر خضر کو وزیراعظم پنجاب بنانے کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جو مخلوط حکومت وجود میں آئی وہ آئینی تقاضوں کے عین مطابق بنی تھی لیکن اس سے مسلم لیگ اشتعال میں آ گئی اور راست اقدام کی دھمکی دے دی۔ خفیہ حکومتی رپورٹوں میں بارہا خبردار کیا جا رہا تھا کہ انتخابی مہم کے آغاز سے بننے والی پرائیویٹ فوجوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ اگر پنجاب میں سیاسی بحران نے طوالت اختیار کی تو مسلم لیگ نیشنل گارڈز، آر ایس ایس اور اکالی فوج خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں تاہم تصادم کے عمل میں اس وقت تیزی آئی جب خضر ٹوانہ نے لاہور کے کشمی چوک پر مسلم لیگ کے مرکزی (صوبائی)

دفتر پر پولیس کو چھاپہ مارنے کا حکم دیا۔ اس عمل سے پنجاب میں صورتحال بدتر ہوگئی۔ مسلم لیگی لیڈروں نے پولیس کے عمارت میں داخل ہونے کی مزاحمت کی۔ چنانچہ مسلم لیگ کی تاریخ میں پہلی بار پارٹی قیادت کو حکومتی احکامات نہ ماننے پر جیل کی ہوا کھانا پڑی۔

اس وقت تک لاہور سمیت پنجاب کے چھوٹے بڑے شہروں اور قصبوں میں مسلمانوں نے پاکستان کے مطالبے کے جائز ہونے پر یقین کرنا شروع کر دیا تھا۔ تھانوں کی حوالاتیں اور جیلیں رضاکارانہ گرفتاریاں دینے والوں سے بھر گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وزیر اعظم خضر حیات ٹوانہ کے خلاف پراپیگنڈہ بھی تیز تر ہوگیا اور ان کے خلاف پنجاب میں غلیظ نعروں میں بھی شدت آتی چلی گئی۔ یہ بات قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ کیا خضر ٹوانہ نے صوبے کے طول و عرض میں پھیلنے والے ایجی ٹیشن کو دبانے سے پولیس کو منع کیا تھا تاہم حکومتی رپورٹوں سے یہ بات عیاں ہے کہ مسلم انتظامیہ (70 فیصد پولیس مسلمان تھی) کی ہمدردیاں پہلے ہی پاکستان کے مطالبے کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ مؤخر الذکر بات سچ کے زیادہ قریب لگتی ہے۔ اگرچہ انہی رپورٹوں سے وزیر اعظم کی اس خواہش کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلم لیگ سے تصادم نہیں چاہتے تھے کیونکہ ان کے بیشتر ساتھی پہلے ہی ان کا ساتھ چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے۔ جس بات نے خضر ٹوانہ کے حوصلے پست کیے وہ 20 فروری 1947 کا برطانوی حکومت کا یہ بیان تھا کہ انگریز حکومت جون 1948 تک اقتدار بہر صورت ہندوستانیوں کے حوالے کر دے گی۔ اس تناظر میں خضر ٹوانہ کو انگریز راج کے تسلسل کے بغیر اپنا کوئی سیاسی مستقبل نظر نہ آیا۔

ہندو سکھ نکتہ نظر سے 1945 کی انتخابی مہم اور 24 جنوری سے 26 فروری 1946 کے راست اقدام سے ان کے خدشات کی تصدیق ہوگئی کہ متحدہ پنجاب میں وہ ظالم اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ یوں جب خضر حکومت نے 2 مارچ کو مسلم لیگ کا راست اقدام ختم کرانے کے لیے ایک معاہدے کے تحت استعفیٰ دیا تو ہندو اور سکھ لیڈروں کو شدید صدمہ پہنچا۔ ماسٹر تارا سنگھ کی پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر ڈرامائی تقریر نے جلتی پر تیل کا کام کیا جس سے کسی معجزے کے سوا تشدد سے بچنا ناممکن ہوگیا۔ اس معجزے کے امکانات 3 مارچ کی شام کو مزید گھٹ گئے جب ہندو مہا سبھا اور سکھ لیڈروں نے جنگ کرنے کی اشتعال انگیز تقریریں کیں جس کے باعث غیر معمولی فرقہ وارانہ تصادم شروع ہوگیا۔

4 مارچ 1947 کو لاہور میں ہندوؤں۔ سکھوں کے مسلمانوں سے تصادم کے بعد امرتسر، جالندھر، ملتان اور راولپنڈی میں بھی جھڑپیں ہوئیں۔ راولپنڈی جہاں پہلے ہی پر تشدد واقعات ہوتے رہے تھے میں جھڑپوں کی شدت زیادہ رہی۔ 5 مارچ 1947 کو پنجاب میں صورتحال اس وقت ایک دم تبدیل ہوئی جب صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ اس کے بعد تقسیم تک کوئی منتخب حکومت برسر اقتدار نہیں رہی۔ اس کے بعد بھی مسلم لیگ اور اس کی بڑی حریف سکھ پنتھی پارٹیوں اور کانگریس کے درمیان اختلافات کی خلیج پاٹنے کی کوششیں ناکام رہیں۔ یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ راولپنڈی میں فسادات شروع ہونے پر شہر میں سکھوں کو پہلے دو روز تک برتری حاصل رہی لیکن صورتحال نے یک لخت اس وقت پلٹا کھایا جب مسلمان حملہ آوروں نے ارد گرد کے سکھ دیہات کا رخ کیا جو چاروں طرف سے مسلمانوں کے دیہات میں گھرے ہوئے تھے۔ بے قابو ہندو۔ سکھ مظاہرین پاکستان مخالف نعرے لگاتے تھے جبکہ مسلمان ان کا جواب دیتے۔ سکھوں کے دیہات پر ہزاروں کی تعداد میں حملہ آور دھاوا بول دیتے جس سے سکھوں کی مزاحمت خس

و خاشاک کی طرح بہہ جاتی۔ یہ حملے بلاشبہ پوری منصوبہ بندی اور نسل کشی کی نیت سے کیے گئے۔ سکھوں کی طرف سے اپنی عورتوں کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے قتل کرنا اس المیے کا سب سے خوفناک پہلو تھا لیکن اس دور کی غیرت اور Purity اسی عجیب رویے کی متقاضی تھی۔

میں نے ایسے کئی افراد جو حکومت پاکستان میں اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہے سے پوچھا کہ آخر گڑبڑ والے علاقوں میں فوج اتنی تاخیر سے کیوں پہنچی؟ فوج 13 یا 14 اگست سے پہلے شورش زدہ علاقوں تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ راولپنڈی میں انگریز فوج کی ناردرن کمانڈ کے ہیڈ کوارٹر سے شورش زدہ دیہات ایک یا دو گھنٹے کی مسافت سے زیادہ دور نہیں تھے اور یہ بات ماننا بھی ناممکن ہے کہ انگریز افسروں کو اس بارے میں کوئی انٹیلی جنس رپورٹ نہ ملی ہو لیکن کسی نے مجھے تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ خون بہانے کی سازش، ممکنہ طور پر مقامی، کو خارج از امکان نہیں قرار دیا جاسکتا۔ شاید پاکستان اور بھارت کی فوری تقسیم کے لیے ایسے حالات ضروری تھے۔ قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ پاکستان کے قیام کے فیصلے کو برطانوی فوج کی حمایت مل چکی تھی البتہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انگریز نے متحدہ پنجاب کی حمایت کی تھی لیکن سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان فسادات نے پنجاب کے مزید متحد رہنے کے امکانات معدوم کر دیے۔ ہزاروں سکھ وسطی اور مشرقی پنجاب میں جمع ہو چکے تھے اور نوجوان سکھوں نے پنجاب کی اپنی مرضی کے مطابق تقسیم نہ ہونے پر خود کو منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک نتیجہ، ارادی یا غیر ارادی، یہ تھا کہ اس سے سکھ تحریک کو ایسے قوم پرست عناصر میسر آئے جن کے پاس مسلمانوں کے مظالم کی داستانیں تھیں۔ مسلمان مخالف اس پراپیگنڈے سے سکھوں کی نظر میں مسلمان مطعون اور وحشی بن چکے تھے۔

میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ پنجاب حکومت نے صرف شہری علاقوں میں فسادات کی روک تھام کا بندوبست کیا تھا لیکن انتظامیہ راولپنڈی، اٹک اور جہلم کے اضلاع میں حملوں کا جواب دینے کے لیے پوری طرح تیار نہیں تھی۔ اس کے علاوہ انگریز حکومت نے مارچ 1947 میں پہلے ہی فیصلہ کر دیا تھا کہ کسی بھی صورت میں انگریز فوجیوں کو کسی گڑبڑ والے علاقوں میں نہیں بھیجا جائے گا البتہ یہ فوجی راولپنڈی شہر میں یورپی شہریوں کے تحفظ کے لیے موجود رہیں گے۔ اس فیکٹر نے انتظامیہ کے سست رد عمل میں شاید کچھ کردار ادا کیا ہو۔ راولپنڈی کے فوجی حکام واضح حکمت عملی کی عدم موجودگی میں عملی اقدام اٹھانے میں ہچکچاہٹ کا شکار رہے۔ بہر حال یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا کلکتہ اور بہار میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں پنجاب پہنچی تھیں جنہوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف اشتعال انگیزی پر مائل کیا؟ اس کا قریب ترین جواب ڈاکٹر جگدیش سرن کا بیان ہے جنہوں نے جہلم پناہ گزین کیمپ میں بطور رضاکار کام کیا اور وہاں کئی مسلمانوں کو یہ کہتے سنا کہ بہار اور اتر پردیش سے کئی مسلمان راولپنڈی آئے جنہوں نے اپنے خلاف سکھوں اور ہندوؤں کے مظالم کے واقعات سنائے اور شمالی پنجاب کے مسلمانوں کو انتقام لینے پر برانگیختہ کیا لیکن گورنر سر ایوان جینکنز اور جنرل میسروی نے اس پہلو کا کہیں ذکر نہیں کیا تاہم اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ بہار اور کلکتہ کے واقعات نے مسلمانوں کے درمیان غم و غصے کو بڑھاوا دیا۔ اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ انگریز فوج سے فارغ شدہ مسلمان فوجیوں نے دیہات پر حملوں کی منصوبہ بندی اور عملدرآمد میں فعال کردار ادا کیا۔ ممکن ہے کہ ان فوجیوں میں سے کچھ نے اپنی آنکھوں سے بہار میں ہونے والے

مظالم دیکھے ہوں۔ کم از کم ایک مثال ایسی ہے جس میں ضلع اٹک کے گاؤں پڑیال میں سکھوں کے گوردوارے پر جن افراد نے حملہ کیا وہ بہار سے واپس آئے تھے۔

کیا راولپنڈی میں ہونے والے واقعات میں ہندوؤں کا ہاتھ تھا؟ پاکستان میں کیے جانے والے پراپیگنڈے میں ہندوؤں کو ذمہ دار گردانا جاتا ہے لیکن یہ بالکل غلط تاثر تھا جو تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد بھی جاری رہا۔ جہاں تک مارچ 1947 میں شمالی پنجاب میں ہونے والے فسادات کا تعلق ہے تو جواب 'ناں' میں آتا ہے۔ شمالی پنجاب میں ہندو چھوٹی اقلیت میں تھے۔ وہ اتنے بااثر نہیں تھے کہ دیہات میں ہونے والے واقعات پر اثر انداز ہو سکیں۔ ہاں اگر مسلمان حملہ آوروں کو انہوں نے رشوت دی ہوتی تو الگ بات تھی لیکن یہ امر ویسے ہی مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔ دہلی میں اس وقت قائم مرکزی عبوری حکومت میں کانگریس کے علاوہ مسلم لیگ اور سکھوں کے بھی وزراٗ موجود تھے۔ ایسی حکومت پنجاب میں مداخلت کی طاقت یا اختیار نہیں رکھتی تھی۔ 1935 ایکٹ کے تحت ایگزیکٹو اختیارات حقیقی معنوں میں صرف گورنر جنرل (جو وائسرائے بھی تھا) کے پاس تھے۔ دوسری طرف جب کانگریس 8 مارچ 1947 کو سکھوں کے پنجاب کی تقسیم کے مطالبے کی حمایت کے لیے آگے آئی تو یہ بات واضح ہو گئی کہ نہ صرف مسلم لیگ بلکہ کانگریس کی اعلیٰ قیادت پنجاب کے مسئلے کے کسی ایسے حل کی حمایت پر آمادہ نہیں تھی جو ان کے آل انڈیا سطح پر مقاصد یا عزائم کے منافی ہو۔ مسلم لیگ کے معاملے میں ایسی صورتحال زیادہ پیچیدگی کی حامل تھی جو پنجاب میں حکومت سازی کے لیے مطلوبہ اکثریت حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ مسلم لیگ نے انتخابات کے بعد گاہے بگاہے گورنر سے رابطہ کر کے حکومت سازی کی دعوت دینے کا مطالبہ کیا جو سر ایوان جینکنز نے دو وجوہات کی بنا پر مسترد کر دیا۔ ایک تو مسلم لیگ پنجاب اسمبلی میں مطلوبہ نشستیں نہیں جیت سکی تھی دوم یہ کہ سکھوں نے مسلم لیگ کی حکومت بننے کی صورت میں پر تشدد احتجاج کی دھمکی دے رکھی تھی۔ یہ پہلو ایک ناقابل فہم نکتہ ہی رہا ہے کہ اگر مسلم لیگ حکومت بنا لیتی تو پنجاب کے معاملات کون سا رخ اختیار کرتے۔ بہر حال کانگریس اور سکھوں کی مخالفت کی بنا پر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مسلم لیگ کی احتجاجی تحریک کے نتیجے میں خضر ٹوانہ کی حکومت رخصت ہوئی جس کے بعد کانگریس اور سکھ مسلم لیگ کی حمایت کیونکر کر سکتے تھے۔ مسلم لیگ کی قیادت نے اقلیتوں کے خدشات رفع کرنے کی بھی بہت کم کوشش کی۔ محمد علی جناح نے بہار کے مسلمانوں پر حملوں کی تو کھلے عام مذمت کی لیکن پنجاب میں فسادات پر انہوں نے چپ سادھ لی۔ جسٹس منیر لکھتے ہیں کہ انہیں مسٹر جناح نے ہدایت کی کہ وہ سکھوں پر حملے رکوائیں لیکن اس بات کی تصدیق کے لیے قائداعظم کا کوئی عوامی سطح پر بیان موجود نہیں۔ اس کے برعکس ایسے شواہد موجود ہیں کہ مسلم لیگ کی قیادت اور مقامی سیاستدان شمالی پنجاب میں سکھوں پر حملوں میں ملوث رہے۔ بہر صورت ابھی تک نو آبادیاتی نظام خامیوں اور کجیوں کے باوجود فعال تھا۔ مارچ 1947 کے اختتام تک کشیدگی اور تصادم موجود تھا لیکن خدشات، شکوک و شبہات اور تناؤ کی شدت اتنی نہیں تھی لیکن انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔

پنجاب میں رونما ہونے والے ایسے واقعات بلاشبہ ہندوستان کی مرکزی سطح پر انگریز حکومت کی ناکامی کے عکاس تھے جو ہندوستانی قیادت کو متحدہ ہندوستان اور آزادی کے بعد بھی انگریزوں کی حکومت برقرار رکھنے پر قائل نہ کر سکی۔ اس ضمن میں کابینہ مشن آخری بڑی کوشش تھی لیکن جیسے ہی وزارتی مشن ناکامی سے دوچار ہوا تو منظم تشدد پھیلنے لگا جس کے نتیجے میں کلکتہ

اور بہار میں ہزاروں افراد مارے گئے۔ انتخابات کے بعد پنجاب میں صورتحال ویسے ہی خراب تھی اور اسے مزید دھماکہ خیز بنانے کے لیے تھوڑی سی وجہد رکار تھی۔ مرکز میں جو عبوری کابینہ بنائی گئی تھی اس کے پاس اختیارات نہیں تھے۔ کابینہ کے ارکان کے اپنے بھی مفادات تھے۔ وائسرائے لارڈ ویول کی رخصتی اور ماؤنٹ بیٹن کے تقرر سے صورتحال میں کچھ بہتری آئی لیکن وہ بھی عارضی ثابت ہوئی۔

دوسرا مرحلہ

پنجاب کی تقسیم کا دوسرا مرحلہ اپریل 1947 سے شروع ہوتا ہے جب اختیارات کی کشمکش دہلی کے ایوانوں میں منتقل ہو گئی جہاں ماؤنٹ بیٹن کو فوراً احساس ہو گیا کہ چونکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں میں اعتماد اور تعاون کا فقدان ہے اس لیے ہندوستان کو مزید متحد نہیں رکھا جا سکتا۔ البتہ انہوں نے دونوں بڑی جماعتوں کے رہنماؤں کی دولت مشترکہ میں شمولیت کے حوالے سے تاثرات جمع کرنا شروع کر دیے۔ لندن میں برطانوی حکومت نے انہیں واضح ہدایت کی تھی کہ ہندوستان تقسیم ہو یا متحد رہے دونوں صورت میں اسے دولت مشترکہ میں رہنا چاہیے۔

جناح کے ساتھ نجی ملاقاتوں میں ماؤنٹ بیٹن نے یہ موقف اختیار کیا کہ اگر بھارت دولت مشترکہ میں شامل نہیں ہوتا تو صرف پاکستان کو رکن قبول کرنا ممکن نہیں ہو گا جبکہ نہرو کے ساتھ بات چیت میں ماؤنٹ بیٹن نے چالاکی کے ساتھ یہ کہا کہ اگر بھارت دولت مشترکہ میں شامل نہیں ہوتا تو ہندوستان تقسیم ہو جائے گا کیونکہ جناح پاکستان کو دولت مشترکہ کا رکن بنانے کے لیے تیار ہیں۔ ایسی حکمت عملی کے تحت ابھرنے والے دباؤ کے باعث دونوں جماعتیں دولت مشترکہ میں شامل ہونے پر رضامند ہو گئیں۔ اسی سوچ کو مد نظر رکھتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن نے پنجاب کے مسئلے سے نمٹا۔ پنجاب کے کئی گورنر یہ کہتے آئے تھے کہ پنجاب کو متحد رہنا چاہیے کیونکہ انہیں پنجاب کی ایسی کوئی قدرتی حد بندی نظر نہیں آتی جس پر عملدرآمد سے تمام متعلقہ فریق خوش ہوں۔ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ پٹیالہ اور جناح کے درمیان کئی ملاقاتوں کا اہتمام کیا اور کم از کم ایک ملاقات میں وہ خود بھی موجود تھے۔ جناح اور مہاراجہ کے مشیر بھی ان کے ساتھ تھے۔ جناح نے سکھوں کو تقسیم کے مطالبے سے دستبردار ہونے پر فراخدلانہ رعایتوں کی پیشکش کی بلکہ انہوں نے ایک طرح سے سکھوں کو پاکستان کے اندر ایک سکھ ریاست بنانے کی پیشکش کی۔ مسلمانوں اور سکھوں کے تعلقات مسجد-گوردوارہ شہید گنج کے تصادم اور شمالی پنجاب میں سکھوں کے قتل عام کے بعد کبھی دوبارہ بحال نہ ہو سکے بلکہ اختلافات کی دیوار بتدریج مضبوط ہو رہی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کانگریس بھی سکھوں کو ہاتھ میں لے رہی تھی اور اس نے مسلم-لیگ-سکھ سمجھوتے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ اس کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کی جامع شناخت بھی مشترکہ تھی کیونکہ کھتری اور اروڑہ سکھ اور ہندو بڑی تعداد میں موجود تھے جس نے ہندوستان کے ساتھ نسلی بنیادوں پر الحاق کی حمایت کی۔ جہاں تک پراپیگنڈہ مہم کا معاملہ تھا تو مسلمانوں اور سکھوں میں اختلافات کو ہوا دینے کے لیے مغل حکمرانوں کے ہاتھوں سکھ گوروؤں پر مظالم کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جناح کی طرف سے سکھوں کو مراعات دینے کی پیشکش مئی 1947 میں بے کار گئی۔ بہر حال ماؤنٹ بیٹن نے جناح اور سکھ لیڈروں کے درمیان پنجاب کو متحد رکھنے کی سعی کے طور پر ملاقاتوں کے لیے سہولت کار کا کردار ادا کیا۔ اس بات پر

شک وشبہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ ایک موقع پر ماؤنٹ بیٹن کا مسلم لیگ سے رویہ جارحانہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سکھوں اور مسلم لیگ کے مذاکرات کی ناکامی تھی جس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے پنجاب کو بھی تقسیم کرنے کا ذہن بنالیا تھا۔ جناح کا یہ موقف نہایت کمزور تھا کہ بنگالی اور پنجابی ثقافتی قومیں تھیں اور انہیں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات ان کے مرکزی موقف سے متصادم تھی کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں تھیں۔

سر خضر حیات ٹوانہ نے تجویز دی کہ پنجاب کو ایک اور طریقے سے متحد رکھا جا سکتا تھا کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی میں شامل ہوئے بغیر براہ راست دولت مشترکہ کا ممبر بن جائے۔ اس تجویز کو برطانوی حکومت کی طرف سے کسی طرح پر پذیرائی نہ ملی۔ یہ اگرچہ ایک اچھوتا خیال تھا لیکن اس مرحلے پر انگریزوں کے لیے اس پر غور کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کے نمائندے کے طور پر مسلم لیگ اور کانگریس سے ہی معاملات طے کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی نے اس تجویز کی حمایت نہیں کی۔ تقسیم ہند کے ڈرامے کا سب سے متنازعہ عمل ماؤنٹ بیٹن کا تقسیم کی تاریخ کو جون 1948 سے وسط اگست 1947 تک پیچھے لانا تھا۔ بظاہر انہوں نے اس فیصلے پر نہرو کو اعتماد میں لیا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے تھے لیکن دیگر تمام سیاستدانوں کے لیے یہ نئی تاریخ دھچکے کا باعث بنی۔ اس تناظر میں جہاں ماؤنٹ بیٹن اس فیصلے کے نتائج و عواقب اور تباہی کے ذمہ دار تھے وہاں نہرو بھی مورد الزام ٹھہرائے جاتے ہیں کیونکہ نجی طور پر وہ بھی نئی تاریخ سے آگاہ تھے۔ بہر حال حالات کچھ بھی تھے 3 جون کے تقسیم ہند پلان میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس کے طریقہ کار کے تحت ان دونوں صوبوں میں مسلمان اور غیر مسلم آبادی اور 'دیگر عوامل' کی بنیاد پر تقسیم کا عمل وقوع پذیر ہونا تھا۔ پنجاب اسمبلی نے تقسیم کے حق میں فیصلہ دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ پنجاب میں فرقہ وارانہ تشدد کا آغاز ہو چکا تھا اور اپریل میں امرتسر میں خوفناک واقعات رونما ہوئے۔ اس کے ذمہ دار مسلمان تھے۔ چیف سیکرٹری اختر حسین نے اپنی رپورٹ میں اس کی تصدیق کی۔ بدنام زمانہ چوڑی۔ مہندی کا واقعہ جس سے لاہور کے غنڈے اور بدمعاش اشتعال میں آئے۔ یہ منصوبہ بھی امرتسر کے غنڈوں اور بدمعاشوں نے تیار کیا تھا جس کا نتیجہ لاہور میں گھیراؤ جلاؤ اور چھرا گھونپنے کے واقعات کی صورت میں نکلا۔ مئی کے وسط کے بعد تک لاہور میں صورتحال ہر گزرتے روز کے ساتھ خراب ہوتی چلی گئی۔ نابھہ اور فرید کوٹ ریاستوں کے سرکاری دستوں کی طرف سے لاہور کے مضافاتی علاقے راج گڑھ میں حملے سے جہاں ایک طرف مسلمان جمع ہو گئے وہاں ہندو اور سکھ دوسری طرف اکٹھے ہونے کا عمل تیز ہو گیا۔ مئی کے آخر تک لاہور شہر کے ہندو اکثریتی علاقے آگ میں جل رہے تھے۔

گورنر سر ایوان جینکنز کے خیال میں 3 جون کے تقسیم ہند پلان کے اعلان پر پنجاب میں کسی خاص جوش و جذبے کا مظاہرہ نہیں کیا گیا لیکن اس کی آڑ میں جرائم پیشہ عناصر، ان کے سیاسی سرپرستوں اور انتظامیہ میں ان کے ہمدردوں کے لیے تشدد کی رفتار تیز کرنا آسان ہو گیا۔ لاہور کے شاہ عالمی بازار میں آتشزدگی اس کی ایک مثال تھی کہ تشدد کی منصوبہ بندی کیسے کی گئی۔ شاہ عالمی کی آگ نے لاہور میں ہندوؤں کی کمر توڑ کر رکھ دی جو اس وقت کم تعداد کے باوجود لاہور میں ہی قیام کرنے کے خواہاں تھے۔ گاندھی سمیت کانگریس کی قیادت نے ہندوؤں کو لاہور میں ہی رہنے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ 21 اور 22 جون کی رات کو جب شاہ عالمی کے بیشتر حصوں میں آتشزدگی کے بعد ہندوؤں میں خوف وہراس پھیل گیا

اور کافی تعداد میں ہندو لاہور سے چلے گئے، اب انتظامی مشینری میں موجود لوگ اپنے ہم مذہب افراد کی کھلم کھلا حمایت کر رہے تھے۔ لاہور کی حد تک مسلمانوں کو بالادستی حاصل تھی۔ حتیٰ کہ فائر بریگیڈ بھی ہندوؤں کے علاقے میں لگی آگ بجھانے میں نیم دلانہ کردار ادا کر رہا تھا۔ دیہی علاقوں میں البتہ معاملات معمول کے مطابق چل رہے تھے۔ کچھ سکھوں نے ہو سکتا ہے کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں سے مغربی پنجاب کے مظالم کا انتقام لینے کا سوچا ہو لیکن ابھی اس خیال نے زیادہ ٹھوس شکل اختیار نہیں کی تھی۔

اگرچہ پنجاب کے گورنر کی حاکمیت تیزی سے گھٹ رہی تھی لیکن نوآبادیاتی طاقت کی علامتیں یعنی سول سرونٹس، پولیس آفیسرز اور انگریزی فوجی افسر اب بھی فعال تھیں۔ ان طاقتوں نے پنجاب کو فوری طور پر انتشار کی حالت میں جانے سے تو روکا لیکن کوئی وقت جاتا تھا کہ یہ بھی دم توڑنے والی تھیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ سکھ اور ہندو پنجاب کے مشرقی حصے کی طرف جانا شروع ہو گئے تھے اور ہندوؤں اور سکھوں پر حملوں کے پس پردہ جو عوامل کار فرما تھے ان میں لوٹ مار سب سے ٹھوس جذبہ تھا کیونکہ جہاں مسلمان تعداد میں بہت زیادہ تھا وہاں غیر مسلم طبقہ انتہائی مالدار تھا۔ ایسی تلخ حقیقت مذموم عزائم کی ترویج اور مجرمانہ اثرات کا باعث بنی۔ راشٹریہ سیوک سنگھ نے لاہور میں جوابی کارروائی کی کوشش کی لیکن آر ایس ایس کو وہ وسائل میسر نہیں تھے جو لاہور کے بدمعاشوں کو انتظامیہ کی ملی بھگت سے دستیاب تھے۔ جون کا اختتام پنجاب کی آئینی طریقے سے تقسیم کے عمل میں ہوا لیکن صوبے میں جو حالات پیدا ہو رہے تھے ان میں آئینی اور قانونی بنیادیں تیزی سے وقعت کھو رہی تھیں۔

ہندوستان کی مرکزی سطح پر 4 جولائی کو محمد علی جناح کا یہ اعلان کہ ماؤنٹ بیٹن کی جگہ وہ خود پاکستان کے گورنر جنرل ہوں گے وائسرائے کو غضبناک کرنے کا باعث بنا۔ اس سے پہلے تقسیم کی جو بحثیں جاری تھیں ان میں کہا جا رہا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن دونوں آزاد مملکتوں کے بیک وقت گورنر جنرل ہوں گے۔ لیکن جناح نے جو اعلان کیا اسے ماؤنٹ بیٹن معاف کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اس کا اظہار دونوں رہنماؤں کی گفتگو کے ریکارڈ سے واضح طور پر ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات ضرور تھی کہ جناح مسلح افواج کے سربراہ اور صوبوں کے گورنر انگریز برقرار رکھنے پر تیار تھے۔ فوج میں کئی اعلیٰ افسر بھی انگریز ہی تھے۔ لازمی بات ہے کہ 4 جولائی کے جناح کے اعلان کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کے لیے بغض رکھنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن یکم اگست 1947 تک پاکستان کو اس کے حصے کے اثاثے اور ساز و سامان دینے پر زور دے رہے تھے لیکن اس بات کا غالب امکان موجود ہے کہ 15 اگست 1947 کو بھارت کا گورنر جنرل بننے کے بعد انہوں نے پاکستان کے لیے تعصب کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا ہو کیونکہ اس تاریخ کے بعد وہ صرف بھارتی ریاست اور حکومت کے مفادات کے نگہبان تھے۔

بہرحال علاقوں اور اثاثوں کی تقسیم کے عمل کی نگرانی کے لیے کئی کمیٹیاں تشکیل پا چکی تھیں۔ ان میں سب سے اہم پنجاب باؤنڈری کمیشن تھا۔ ریڈکلف ایوارڈ کی کارروائی کا مفصل جائزہ کتاب میں پہلے دیا جا چکا ہے۔ یہاں محض یہ کہنا کافی ہو گا کہ نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کی مبینہ سازش پر کافی تنازعہ پیدا ہوا تھا کہ ان کی وجہ سے ضلع گورداسپور کی چار میں سے تین تحصیلیں بھارت کو دے کر اس کا تحصیل پٹھان کوٹ کے ذریعے کشمیر کے ساتھ زمینی رابطہ استوار کر دیا گیا۔ دوسری طرف

یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ ریڈکلف ایوارڈ دراصل 7 فروری 1946 کے ویول حد بندی پلان کے ہی مطابق تھا۔ اس میں معمولی رد و بدل یہ کیا گیا کہ لاہور ضلع کی تحصیل قصور کا کچھ حصہ بھارت کو دے کر لاہور اور امرتسر کے درمیان براہ راست رابطہ منقطع کیا گیا۔

پنجاب میں جولائی سے اقلیتوں کے خلاف حملوں کا سلسلہ مشرقی حصوں کی طرف پھیلنے لگا۔ سکھ جتھوں نے مسلمانوں کے خلاف حملے بتدریج تیز کر دیے۔ ان جتھوں کے مسلح اور منظم ہونے کے بارے میں حکومتی سطح پر کافی عرصے سے خبردار کیا جا رہا تھا۔ انگریزوں کے ماتحت فوجی دستوں کی تعداد ناکافی تھی اور تشدد میں مزید اضافے کی صورت میں امن وامان کی صورتحال مکمل طور پر خراب ہونے کا خدشہ تھا۔ چھوٹی سی پنجاب باؤنڈری فورس یکم اگست سے فعال ہو چکی تھی اور اس نے سکھ حملہ آوروں کے خلاف کچھ تادیبی اقدامات بھی کیے لیکن ایسی کارروائیوں سے پنجاب کے طول و عرض میں ہونے والے فرقہ وارانہ حملوں کا مکمل سدباب ممکن نہیں تھا۔ بظاہر پنجاب کی تقسیم کے نتائج و عواقب سے دور افتادہ دیہات کے لوگ لاعلم رہے۔ اسی طرح امرتسر اور لاہور کے دور دراز کے گاؤں یا تو مکمل یا جزوی طور پر حقیقت حال سے بے خبر رہے۔

اسی طرح ہندو۔ سکھ گروپوں اور دوسری طرف مسلمانوں کے درمیان ابلاغ معدوم تھا۔ مختلف کمیونٹیوں کے مابین یہ خلا تقسیم کے عمل کے آغاز سے شروع ہو کر آخر تک برقرار رہا۔ معلومات میسر نہ ہونے کے باعث اہل دیہہ کو بھاری خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ان تمام افراد میں سے سب سے زیادہ مشرقی پنجاب بالخصوص سکھ خود مختار ریاستوں کے مسلمان تقسیم کے فیصلوں کی بابت اندھیروں میں رہے۔ چونکہ وسطی، شمالی اور مغربی پنجاب کے مسلم اکثریتی اضلاع میں ہندوؤں اور سکھوں پر جولائی کے آغاز تک حملے نہیں کیے گئے تھے اس لیے مسلمانوں کو ان کے برعکس بہت کم پتہ تھا کہ پنجاب کی تقسیم کے نتائج کیا نکلیں گے۔

12 اگست کو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی پہلی بڑی تعداد میں نقل مکانی گورنر جینکنز کے علم میں آئی۔ اس سے پہلے مارچ 1947 سے مغربی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کا مشرقی حصے کی طرف انخلا دیکھنے میں آرہا تھا۔ گویا اب پورا پنجاب شورش کا شکار تھا۔ جینکنز کی 13 اور 14 اگست کو آخری پندرہ روزہ رپورٹ اور ٹیلی گرام سے یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ پنجاب طوائف الملوکی اور شورش میں گھر چکا تھا۔ انہوں نے زور دیا کہ یہ نئی انتظامیہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ صورتحال کو قابو میں لائے۔ یہ بات واضح تھی کہ ایسی انتظامیہ جو صورتحال پر بتدریج کنٹرول کھو رہی تھی کے تسلسل کے باوجود ہلاکتوں کی تعداد کم رہی۔ شاید 10 سے 15 ہزار تاہم گورنر جینکنز نے اس کا تخمینہ کم ظاہر کیا ہے۔

تیسرا مرحلہ

پنجاب کی تقسیم کا تیسرا اور حتمی مرحلہ نفسیات کی اصطلاح میں ہوبیسی ڈراؤنے خواب Hobbesian Nightmare جیسا ہے جب ریاست اور امن وامان سے متعلق حکومتی مشینری منظر عام سے غائب تھی۔ قدیم پنجاب کے 'سکہ بند' باسی غیر متعلقہ ہو چکے تھے۔ اس عمل سے وائسرائے کے پسندیدہ حلقے اور مقامی لیڈروں کے یہ دعویٰ بری طرح بے نقاب ہو گیا کہ تقسیم پنجاب کے نتیجے میں آبادی کی نقل مکانی نہیں ہو گی۔ اس معاملے میں صرف محمد علی جناح کو استثنیٰ حاصل ہے کیونکہ انہوں نے نومبر 1946 میں بہار میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد بھارت اور پاکستان کے درمیان آبادی کے تبادلے کی تجویز دی تھی، لیکن

یہ تجویز صد البصحر اثابت ہوئی۔ کثیر المذاہب معاشرہ کا کانگریس کا جماعتی نظریہ تھا اور مسلم لیگ نے بھی اسے مسترد نہیں کیا تھا۔ اگرچہ الگ مسلم ریاست کے قیام کی بات اس موٴقف سے میل نہیں کھاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ماؤنٹ بیٹن کا خیال تھا کہ سرکاری مشینری کو نو آزاد شدہ کسی ملک میں خدمات انجام دینے کا حق دینا چاہیے لیکن عام آدمی کو وہیں رہنا چاہیے کیونکہ انتظامیہ کی تبدیلی سے غیر جانبداری ختم نہیں ہوگی۔

ایسا موٴقف اختیار کرنے کے لیے کوئی سامراجی بنیاد موجود نہیں تھی۔ اس کے برعکس تمام تر شواہد اس بات کے گواہ تھے خونریزی ناگزیر تھی۔ بالخصوص سکھ رہنماؤں کے عزائم سربستہ نہیں تھے۔ بھارت یا پاکستان دونوں نے انگریز دور کے گورنروں یا چیف سیکرٹریوں کی پندرہ روزہ خفیہ رپورٹیں شائع کرنے کی زحمت نہیں کی۔ ایسے حالات میں اس زمانے کے واقعات کا پیمانہ صرف صیغہ واحد متکلم میں بیانات ہیں۔ اس کے علاوہ 15 اگست 1947 کے بعد سال کے اختتام تک رونما ہونے والے واقعات کا بیان ہے۔

پاکستانی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کا انخلا کئی ماہ سے جاری تھا۔ ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان سے پہلے 5 لاکھ غیر مسلم سرحد پار کر کے جا چکے تھے۔ باقی ماندہ افراد نئی انتظامیہ کو انتقال اقتدار کے بعد پرواز کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان حالات میں پنجاب کے گورنر سر فرانسس موڈی نے یہ کہنے میں ذرا تامل نہ کیا کہ مشرقی پنجاب سے آنے والے لاکھوں مسلمانوں کو آباد کرنے کے لیے یہاں سے ہندوؤں اور سکھوں کو بے دخل کر دیا جائے۔ البتہ یہ بات واضح لگتی ہے کہ غیر مسلموں کو مغربی پنجاب سے نکال باہر کرنے کا کوئی عظیم منصوبہ بہر حال تیار نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن مشرقی پنجاب سے مہاجرین کا سیلاب آنے سے یہ ناگزیر ہو گیا تھا کیونکہ مہاجرین کی آبادکاری میں شدید مشکلات در پیش تھیں۔ اس کے علاوہ متاثرہ مسلمانوں کی دردناک داستانیں بھی ان کے ہم مذہب افراد کو غضبناک کرنے کا باعث بنیں۔ یوں ہندوؤں اور سکھوں پر حملوں کے لیے دباؤ بتدریج بڑھ گیا۔

اس بات پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اکالیوں سمیت سکھ قیادت اور بعض خود مختار ریاستوں کے سکھ حکمرانوں نے مشرقی پنجاب کو تمام مسلمانوں سے پاک کرنے کا ذہن بنا لیا تھا۔ اس منصوبے پر 17 اگست کو ریڈ کلف ایوارڈ منظر عام پر آنے کے بعد فوراً عملدرآمد شروع کر دیا گیا۔ اگلے روز عید کا دن تھا جس میں مشرقی پنجاب کے 60 لاکھ مسلمانوں پر قیامت ڈھا دی گئی۔ بیشتر مسلمان عام کسان تھے جنہیں قطعاً اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ انہیں ان کے آباؤاجداد کی سرزمین سے ایک روز یکسر بے دخل کر دیا جائے گا۔ یہ سازش اگرچہ بہت پہلے تیار کی گئی تھی لیکن موزوں وقت کے انتظار تک اسے بالکل خفیہ رکھا گیا۔ یہ حملے بالکل اسی طرح کیے گئے جس طرح مارچ 1947 میں شمالی پنجاب میں سکھوں کے دیہات پر کیے گئے لیکن مشرقی پنجاب میں حملوں کی شدت بہت زیادہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حملوں کے لیے مالی معاونت فراہم کرنے میں ہندوؤں کا ہاتھ تھا لیکن عملی طور پر حملے کرنے والے سکھ ہی تھے۔ ہندی بولنے والے مشرقی اضلاع میں ہندو جاٹوں نے بھی حملوں میں حصہ لیا۔ لاقانونیت اور وحشت کی بدترین صورتحال سکھ خود مختار ریاستوں میں نظر آئی جہاں مسلمانوں کو بے دخل کرنے کی تیاری طویل عرصے سے جاری تھی۔ پنجاب باؤنڈری فورس کا خود مختار ریاستوں میں کوئی عمل دخل نہیں تھا چنانچہ مسلمانوں پر حملہ اور بھی آسان ہو گیا۔

انگریز حکومت کے زیر انتظام علاقوں میں لدھیانہ ایسا علاقہ تھا جہاں پی بی ایف کی سرگرمیاں زیادہ متحرک نہیں تھی چنانچہ سکھوں نے لدھیانہ کے دیہی علاقوں میں مسلمانوں کا بدترین قتل عام (پٹیالہ کے بعد دوسرے نمبر پر) کیا۔ اگر کوئی خوش قسمت فرار ہو کر ریاست ملیر کوٹلہ کی حدود میں داخل ہوتا تو سکھ اسے امان دے دیتے۔ کیا سکھوں کے گورو گوبند نے اس سے منع کیا تھا یا یہ کہ ریاست کے باسی مسلمان اچھی طرح مسلح تھے اور سکھوں کو مزاحمت کا خدشہ تھا؟ اس سوال کا جواب رہنے ہی دیا جائے کیونکہ دونوں ہی باتیں ٹھیک تھیں۔

جہاں تک تینوں مذاہب کی قیادت کے ملوث ہونے کے شواہد کا تعلق ہے تو جہاں ماسٹر تارا سنگھ، مہاراجہ پٹیالہ اور کپور تھلہ کے ولی عہد کا نام لیا جاتا ہے وہاں سردار پٹیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بم فیکٹریوں کو مالی معاونت فراہم کرتے تھے۔ انہوں نے سکھوں کو لاہور کے مسلمانوں کو بھی ہلاک کرنے کی شہ دی لیکن 12 اور 13 اگست تک بہت تاخیر ہو چکی تھی کیونکہ مسلمانوں نے شہر میں بالادستی حاصل کر لی تھی۔ اس بات کے بھی کچھ شواہد موجود ہیں کہ کاموںکیس (گوجرانوالہ) میں ہندو اور سکھ مہاجرین سے بھری ٹرین پر حملے میں حکومت پاکستان کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ حکم وفاقی کابینہ کی طرف سے آیا تھا اور اس کا مطلب ہے کہ وزیراعظم لیاقت علی خان اس اقدام سے باخبر تھے۔ یہ حکم مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر بہیمانہ حملوں کو روکنے کے لیے دیا گیا تھا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نہرو اور گاندھی نے مسلمانوں کی زندگیاں بچانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا جبکہ جناح نے صرف مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی مذمت میں چند بیانات جاری کیے۔ راولپنڈی کے خاکساروں اور امرتسر کے کیمونسٹوں نے انسانی جانیں بچانے میں خصوصی کردار ادا کیا۔

پیشگی مطلع ہونے کا مطلب قبل از وقت مسلح ہونا

اب اگر ہم دونوں طرف کے پنجاب کے واقعات کا تجزیہ کریں تو انگریزی کا یہ محاورہ Forewarned is Forearmed ہدف بننے والے افراد کی تعداد، ان کی اپنے دفاع کی تیاری اور حملہ آوروں کی منصوبہ بندی کے تناظر میں صادق نظر آتا ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ مغربی پنجاب میں 38 لاکھ ہندو اور سکھ جبکہ 59 لاکھ مسلمان تھے۔ سیکرٹری مغربی پاکستان بورڈ آف اکنامک انکوائری ایم حسن نے یہ اعداد و شمار اکتوبر 1947 کے آخر میں دیے لیکن غالب امکان ہے کہ وہ ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان سے پہلے کی تعداد کا حوالہ دے رہے تھے۔ چنانچہ 5 لاکھ ہندو اور سکھ پہلے ہی محفوظ مقامات کی طرف منتقل ہو چکے تھے لیکن مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر انخلاً (بقول گورنر جینکنز) 12 اگست کے بعد شروع ہوا۔ یوں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں مسلمان زیادہ تعداد میں نشانہ بننے کے لیے دستیاب تھے۔ اس سے بھی اہم قابل ذکر بات یہ ہے کہ جہاں سکھوں کے پاس اپنے مذہبی عقیدے کے طور پر کرپانیں موجود ہوتی تھیں وہاں ہندو اور مسلمان غیر مسلح تھے۔ یوں حملہ کرنے یا دفاع میں دونوں صورتوں میں سکھوں کو خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ ہزارہ اور پھر راولپنڈی میں حملوں کے تناظر میں سکھوں کا نیٹ ورک پہلے ہی وجود میں آ چکا تھا تو مسلمانوں کے خلاف انتقامی حملوں کے لیے ان کی تیاریاں مسلمانوں کی بہ نسبت کہیں تیز تھیں۔

ایسا لگتا ہے کہ مارچ 1947 میں شمالی پنجاب میں مسلمانوں جن کی اکثریت ریٹائر فوجیوں پر مشتمل تھی کے حملوں کے طریقہ کار کو سکھ جتھوں نے ماڈل بنا کر اپنے ہم مذہب افراد کے خلاف کارروائیوں کا انتقام لینے کی ٹھان لی۔ دوسری طرف ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد بھی مغربی پنجاب میں حملوں کی شدت مشرقی حصے کے برابر کبھی نہیں ہو سکی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سکھوں نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کے لیے واضح حکمت عملی اختیار کی۔ چنانچہ جیسے ہی نو آبادیاتی نظم ونسق کمزور ہوا یا ختم ہوا تو سکھوں کو بالادستی حاصل ہو گئی، بالخصوص ان علاقوں یعنی خود مختار ریاستوں میں جہاں انگریز حکومت کی پہلے ہی کوئی عملداری نہیں تھی۔ یوں تشدد کے دو مختلف منظر ناموں کا موازنہ کرتے ہوئے اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ جاتا کہ مشرقی پنجاب کے غیر مسلح اور مسلمانوں کے خلاف منظم حملے زیادہ واضح اور موثر ہو سکے۔

سیاق وسباق

تاہم 'پیشگی مطلع ہونے کا مطلب قبل از وقت مسلح ہونا' کے نظریے کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے کیونکہ خود مختار ریاستوں میں ماحول مشرقی اور مغربی پنجاب سے قطعی مختلف تھا۔ اگرچہ مشرقی اور مغربی پنجاب میں نئی انتظامیہ نے کنٹرول سنبھال لیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ انگریزوں کا دور سرے سے ہی ختم ہو چکا تھا۔ مشرقی پنجاب کے ضلع لدھیانہ کے دیہی علاقوں جہاں مسلمانوں پر حملوں کا سلسلہ بلا روک ٹوک جاری رہا بالکل ویسے جیسے 6 مارچ سے 13 مارچ 1947 تک شمالی پنجاب میں ہوا، کے سوا صوبہ بھر میں مجموعی امن وامان کی صورتحال برقرار تھی۔ البتہ خود مختار ریاستوں میں جہاں کے حکمران مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے بیک جنبش قلم نکالنے کی سازش میں شریک تھے وہاں خفیہ انداز میں قتل عام جاری رہا کیونکہ پی بی ایف یا کسی اور حکومتی فورس کو وہاں مداخلت کا اختیار نہیں تھا۔ اس کے بعد پاکستانی اور بھارتی فوجوں کے مشترکہ یونٹوں نے کارروائی کرتے ہوئے ریسکیو آپریشن کیا۔ جیسا کہ میجر جنرل سید وجاہت حسین بتاتے ہیں کہ ایسی ہی ایک یونٹ نے کپورتھلہ میں کئی مسلمانوں کی جان بچائی جبکہ لیفٹیننٹ جنرل آفتاب احمد خان نے مغربی پنجاب بالخصوص منٹگمری کے ارد گرد کے علاقوں میں کئی ہندوؤں اور سکھوں کو بچایا۔ البتہ یہ یونٹ ہر جگہ نہیں تھے اور جہاں پیدل قافلے جا رہے تھے یا ٹرینیں سکیورٹی کے بغیر گئیں انہیں دونوں طرف حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔

اگر صرف پٹیالہ ریاست میں دو سے ڈھائی لاکھ مسلمان لاپتہ ہوئے، جیسا کہ میاں افتخار الدین کہتے ہیں، اور یہ لوگ کبھی پاکستان نہ آئے تو صرف پٹیالہ میں ہونے والا جانی نقصان پورے مغربی پنجاب میں ہونے والے جانی ضیاع کے برابر ہے۔ وہ مسلمان جن کی گواہی اس کتاب میں پیش کی گئی ہے وہ جانی نقصان ہزاروں کی تعداد میں بتاتے ہیں۔ کافی حد تک غیر جانبدار اور پر مغز کھوسلہ رپورٹ قابل فہم ڈیٹا کے ساتھ بتاتی ہے کہ دسمبر 1946 سے دسمبر 1947 کے درمیان مغربی پنجاب میں ہندو اور سکھ مسلمانوں کی جارحیت کا نشانہ بنے۔ اگر مغربی پنجاب میں ڈھائی لاکھ ہندو اور سکھ اپنی جان سے گئے تو کم از کم اتنی ہی تعداد مشرقی پنجاب میں بھی ہلاکت کا نشانہ بنی چاہیے۔ اس کا اعتراف کھوسلہ رپورٹ اور کسی حد تک متعصب ایس جی پی سی رپورٹ میں لگایا گیا ہے۔ دراصل دونوں رپورٹوں میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے زیادہ نقصان کو تسلیم کیا گیا ہے۔

میں نے جو تحقیق کی ہے اس کا مطلب پنجاب میں مجموعی جانی نقصان کی حتمی علمی بنیاد فراہم کرنا نہیں تھا بلکہ میں کئی دیگر سکالروں کی اس آبزرویشن پر روشنی ڈالنے کے لیے مشتاق تھا کہ مغربی پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں کی کل تعداد سے زیادہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ ان میں خود مختار ریاستیں اور ضلع لدھیانہ سر فہرست تھے۔ اور یہ کہ مسلمانوں پر حملے زیادہ بڑے پیمانے پر کیے گئے اور ہزاروں افراد کی جانیں لی گئیں۔ اس تناظر میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مشرقی پنجاب میں ڈھائی لاکھ سے 5 لاکھ مسلمانوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یوں خود مختار ریاستوں اور انگریز حکومت کے زیر انتظام علاقوں میں مجموعی طور پر 5 لاکھ سے ساڑھے سات لاکھ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا اور جولائی 1947 کے شروع میں ہندوؤں اور سکھوں کے زیادہ نقصان کے برعکس مجموعی طور پر مسلمانوں کو زیادہ ہزیمت اٹھانا پڑی۔ مرنے والوں میں ایک بڑی تعداد ایسی عورتوں اور لڑکیوں پر مشتمل تھی جنہیں ان کے اپنے ہی رشتہ داروں نے بے حرمتی سے بچانے کے لیے قتل کر دیا۔ کچھ خواتین نے خود ہی موت کو گلے لگا لیا۔ البتہ جنوری سے دسمبر 1947 تک تمام تر ہلاکتیں صرف تشدد کا نتیجہ نہیں تھیں بلکہ مون سون کی طوفانی بارشوں، سیلاب اور وبائی امراض نے بھی بے سہارا افراد پر قہر ڈھا دیا۔ ہزاروں افراد پناہ گزین کیمپوں میں جاتے یا وہاں رہتے ہلاک ہوئے۔

تین مرحلے: ایک مجموعی عمل

درج بالا تجزیے سے تینوں مرحلوں کے درمیان تعلق تلاش کرنا مشکل نہیں رہ جاتا۔ ہر مرحلہ اگلے مرحلے کے لیے راہ ہموار کرتا رہا۔ مشترکہ پنجابی شناخت سے ابھرنے والا سماجی ڈھانچہ اس وقت لرزنے لگا جب سیاسی اور نسل پرست کارکنوں نے حقیقی یا فرضی ماضی کے واقعات اور تصادم کو نمایاں کرنا شروع کیا۔ مختلف کمیونٹیوں اور جماعتوں میں ابلاغ کی کمی نے عام طبقے میں خوف اور کشیدگی کو جنم دیا۔ ریاستی مشینری اور حکومتی رٹ کی گرفت تیزی سے کمزور پڑنے کے ساتھ متاثرہ افراد پر یکے بعد دیگرے حملے ہونے لگے۔ اگر اب ہم پنجاب میں برطانوی انتظامیہ میں اعلیٰ ترین سطح پر پائی جانے والی غیر یقینی، اعلیٰ سطح پر سیاست کے ارادی اور غیر ارادی عملی اقدامات کے نتائج، نسب پرست اور عام لوگوں پر مشتمل منظم گروہوں کو بھی شامل کر لیں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ صورتحال قابو سے باہر ہو گئی اور مختلف شدت کی انارکی اور بدامنی نے زور پکڑ لیا تھا۔ بالخصوص دونوں طرف سے مسلح دستوں نے زیادہ خونریزی کی۔ عام طور پر ہمسایوں نے ہمسایوں پر حملے نہیں کیے ہاں البتہ بعض شر پسند اس علاقے کے بھی ملوث پائے گئے۔ کسی بھی موقع پر تشدد اور قتل عام نے مذاہب کے درمیان جنگ کی شکل نہیں اختیار کی۔ بھارتی اور پاکستانی حکومتوں کو اختیارات منتقل ہونے کے بعد درمیان میں پل کا کام کرنے والا انگریز انتظامیہ کا فیکٹر ختم ہو گیا۔ اس طرح نسل پرستی پر مبنی تصادم کا نتیجہ جبری ہجرت اور نسلی قتل عام کی صورت میں نکلا۔ ان تمام تینوں مراحل میں ہم لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد کرتے اور انہیں تحفظ فراہم کرتے بھی دیکھتے ہیں۔ ایسا طرز عمل اجنبیوں تک سے اپنایا گیا، حتیٰ کہ بعض صورتوں میں اپنی جان پر کھیل کر بھی یہ کام کیا گیا۔

ترغیبات

حملوں میں حصہ لینے کی ترغیبات میں نظریاتی، مذہبی اور یقینا بقا کی جبلت کا عنصر کارفرما رہا لیکن حملہ آوروں کو متحرک کرنے کی سوچ لوٹ مار کرنے اور دشمن کی عورتیں ہتھیانے کی خواہش کی تابع تھی۔ اس طرح نہ صرف دشمن کو معاشی نقصان پہنچایا گیا بلکہ اس کی عزت کی بھی دھجیاں بکھیری گئیں۔ انتقامی قتل عام جس کے بارے میں پال براس نے بھی لکھا ہے وہ خود پر سائی پر مبنی قوم پرستی سے منسلک تھا اور مطعون اور مقہور 'دوسرے فریق' پر غلبہ پانے کا موقع تھا۔ یہ بات بھی دلچسپی کی حامل ہے کہ مغربی پنجاب میں اچھوت ہندو حملوں سے اس لیے بچ گئے، اس کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ انہوں نے گندے کھیل کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ دوسری جانب میرے مشرقی پنجاب کے دوروں میں بھی میں نے سنا کہ کمی ذاتوں کے لوگ (غیر زمیندار) سکھوں کے حملوں کے دوران لا تعلق ہی رہے۔ چنانچہ پنجاب کے دونوں حصوں میں زمینوں اور جائیدادوں پر قبضہ کرنا حملوں میں ملوث ہونے کا طاقتور فیکٹر تھا۔ اسی طرح نچلی ذاتوں کے افراد نے بعض علاقوں میں بدستور رہنا چاہا تو انہیں اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ پنجاب کی تقسیم صرف ان عناصر کے لیے پرکشش موقع تھی جو انسانیت کے خلاف جرائم سے مالی منفعت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

نسل کشی یا قتل عام؟

پنجاب میں 1947 میں جو کچھ ہوا اس کی مناسب ترین تعریف کیا ہو سکتی ہے، نسل کشی Ethnic Cleansing یا قتل عام Genocide؟ جواب بالکل آسان ہے: کسی شک وشبے کے بغیر یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد نسلی صفائے کا پہلا واقعہ تھا۔ اس بات کی حمایت میں کوئی شواہد نہیں ملتے کہ مسلم لیگ یا سکھ کوئی ایسا جماعتی نظریہ رکھتے تھے جس کے تحت انسانوں کے مطعون و مقہور گروہ کو سیاسی مقاصد کے لیے مٹا کر رکھ دیا جائے۔ بلاشبہ مارچ 1947 اور پھر اگست ستمبر میں سکھوں پر اس وقت منظم طریقے سے حملے کیے گئے جب پورا پنجاب شورش کا شکار تھا۔ یہ حملے کسی تخصیص کے بغیر کھلے اور خطرناک انداز میں کیے گئے۔ خصوصاً مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے خلاف ہونے والے حملے انتقامی نسل کشی کی عملی تفسیر تھے۔ اس وقت غالب جذبہ غیر مطلوب آبادیے چھٹکارا پانا تھا اور اس مقصد کا حصول صرف طاقت کے استعمال سے ممکن تھا۔

البتہ اگر انخلا کا کوئی راستہ نہ ہوتا تو پھر نسل کشی کا عمل قتل عام کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ جس میں نہ صرف جسمانی قتل بلکہ جبری تبدیلی مذہب کا عمل بھی شامل ہو سکتا تھا۔ اس تناظر میں حتمی نتیجے کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ایک کروڑ پنجابی غیر مطلوب اقلیت بن گئے اور ان سے چھٹکارا پانے کے لیے طاقت کا استعمال کیا گیا۔ یہ مقصد 5 لاکھ سے ساڑھے 7 لاکھ افراد کو زندگی سے محروم کر کے حاصل کیا گیا۔

خلاصہ

اوپر کی گئی بحث کی بنیاد پر اب ہم مسلمان بمقابلہ سکھ پلان برائے نسل کشی کے چند پہلوؤں پر بحث کر سکتے ہیں۔

کیا تقسیم کی صورت میں مسلمانوں کا پاکستانی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کو مٹانے کا کوئی منصوبہ تھا؟

ایس جی پی سی میں الزام لگایا گیا ہے کہ 1940 میں قیامِ پاکستان کا باضابطہ مطالبہ سامنے آنے سے پہلے ہی تقسیم سے پہلے کے پنجاب سے تمام ہندوؤں اور سکھوں کا نام و نشان مٹانے کا عظیم تر منصوبہ موجود تھا۔ جو نظریاتی اور سیاسی پہلوؤں کا حامل تھا جس نے ایک ایسی سوچ کو جنم دیا جس کے تحت مسلمان بے رحمی کے ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کو مطعون و مقہور کرنے کے در پے تھے۔ اگر مسلم لیگ کو پورا پنجاب مل بھی جاتا تو وہ ہندوؤں اور سکھوں کو طاقت کے زور پر نکال باہر کر دیتی تاکہ پاکستان میں غیر مطلوب اقلیتوں کا کوئی نام و نشان تک باقی رہ جائے۔

ایسی رائے پر یقین کرنا آسان نہیں۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ تقسیم شدہ پنجاب تک میں مسلم لیگ کے پاس اقلیتوں کے معاملے پر واضح پالیسی موجود نہیں تھی۔ بعض ہندوؤں اور سکھوں کے بیانات سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ فسادات ختم ہونے پر وہ واپس گھروں میں آجائیں گے۔ رام پرکاش کپور کے واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی بعض مسلم لیگی رہنما ان پر زور دے رہے تھے کہ وہ بھارت نہ جائیں لیکن انہوں نے چند ہی روز بعد اپنے موقف سے پھرتے ہوئے کہا کہ آپ پاکستان سے چلے جائیں کیونکہ اس دوران مشرقی پنجاب سے لٹے پٹے مسلمانوں کا انبوہ کثیر لاہور آنا شروع ہو گیا تھا۔ ایسے فیصلے کو طے شدہ سازش کی بجائے عملی سیاست Realpolitik کا عکاس سمجھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ دور دراز کے اضلاع میں جہاں ہندو اور سکھ بہت تھوڑی تعداد میں تھے ان پر حملے ستمبر تک شروع نہیں ہوئے تھے۔ دوسری طرف اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شمالی پنجاب کے سکھ دیہات پر حملے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اور عسکری انداز میں کیے گئے اور راولپنڈی سطح کے بعض مسلم لیگی لیڈروں نے بھی حملوں میں حصہ لیا، لاہور میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کو نکالنے کے لیے منظم کارروائیاں کی گئیں۔ کیا یہ ایک ایجنڈے کا حصہ تھا جس پر مسلم لیگ خفیہ طور پر متفق ہو چکی تھی۔ میری تحقیق میں کوئی ایسا ناقابلِ تردید ثبوت اس بابت میں نہیں مل سکا جس کا سکھوں کے منصوبے سے موازنہ کیا جا سکے۔

یقیناً یہ بات بھی اخذ کی جا سکتی ہے کہ چونکہ ہندوؤں اور سکھوں کے لیے ہندوستان کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم ناقابلِ قبول تھی اس لیے انہوں نے اس کا جواب پنجاب کی تقسیم کے مطالبے کی شکل میں دیا۔ اس لاحاصل کھیل کا حل منطقی دلائل سے نہ نکالا جا سکا۔ ایسے حالات میں تشدد ہی سب سے بڑا آپشن بن کر ابھرا۔ بالفاظ دیگر یہ کہ اگر اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں کہ مسلم لیگ نے پنجاب سے سکھوں اور ہندوؤں کا مکمل صفایا کرنے کا کبھی کوئی منصوبہ بنایا تھا تو بھی مذہبی بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ موروثی اعتبار سے امتیازی تھا چونکہ اور ہندو اور سکھ ایسی کسی ریاست میں رہنے کے خواہاں نہیں تھے جہاں ان کے نزدیک امتیازی اسلامی قانون نافذ ہو اس لیے مقابلے کے لیے مسلح تصادم ناگزیر تھا۔

کتاب کے باب اول میں نظریاتی دلائل کے ساتھ یہ دلائل پیش کیے گئے کہ جب دو یا زائد گروہ ایک ہی علاقے پر دعویٰ کرتے ہیں تو ایسے مسئلے کا حل کمزور گروہ کے جبری انخلا کی صورت میں نکل سکتا ہے یا پھر اس سے بھی بدتر یہ کہ اس کا وجود ہی مٹا دیا جائے۔ چنانچہ اگر غیر منقسم پنجاب سے غیر مسلموں کے یکسر خاتمے کا مسلم لیگ کا کوئی منصوبہ تیار نہیں تھا تو بھی اس نے جو نظریہ یا سیاست اختیار کی وہ تقسیم پنجاب کا شاخسانہ بن گئی۔ یعنی سکھوں نے تقسیم پنجاب کا مطالبہ کیا اور کانگریس نے اس کی حمایت کی۔ یہ بالکل سادہ سی بات ہے کہ اگر ہندوستان تقسیم ہوتا ہے تو کانگریس اور سکھ مسلم لیگ کو پورے کا پورا پنجاب دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ یا یوں کہہ لیں کہ اگر مسلم لیگ نے مغربی پنجاب سے سکھوں اور ہندوؤں کو

نکال باہر کرنے کا کوئی باقاعدہ منصوبہ تیار نہیں کیا تھا تو بھی اس نے ایسے حالات پیدا کر دیے جو صوبے کو توڑنے پر منتج ہوئے اور نسل کشی نے سر اٹھایا۔

اس کے ساتھ مسلم لیگ کی قیادت عاقبت نااندیش اور غیر ذمہ دار تھی جس نے یہ محسوس نہ کیا کہ ان کے پاکستان کے منصوبے سے لاکھوں غیر مسلح مسلمانوں کی زندگیوں کو خطرہ ہونا ناگزیر تھا اور یہ کہ پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ جون 1947 میں تیار ہو چکا تھا اور پنجاب اسمبلی نے اس کی منظوری بھی دے دی تھی لہٰذا اس فیصلے سے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو آگاہ کرنا ضروری تھا۔

مسلم لیگ کے رہنماؤں کے دفاع میں ایک دلیل یہ بھی دی جاسکتی ہے کہ وہ بدستور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تقسیم کی صورت میں آبادی کا تبادلہ ضروری نہیں تھا۔ یہ بھی کہ سکھ پنجاب کی ان کی مرضی کے مطابق تقسیم کی صورت میں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے آرہے تھے تو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو اس صورتحال سے آگاہ کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس بعض علاقوں میں مسلمانوں پر اپنا قیام برقرار رکھنے پر زور دیا گیا۔ امرتسر میں یہ پالیسی اس وقت تک اختیار رکھی گئی جب تک حالات قابو سے بالکل باہر نہ ہو گئے۔

کیا سکھوں نے مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو مٹانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا؟

اس کا بلاتوقف جواب دیا جاسکتا ہے کہ 'ہاں'۔ لیکن اس کا نتیجہ نکالنے کے لیے ٹھوس تجزیہ ضروری ہے۔ اکالی سکھ لیڈر مشرقی پنجاب میں سکھ ریاست کے قیام کے لیے خود مختار سکھ حکمرانوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مصروف کار تھے اور کم از کم مہاراجہ پٹیالہ ایک نجومی کے کہنے پر ایسے عزائم رکھتا تھا۔ بعض دوسرے حکمران بھی فریق بن گئے۔ البتہ یہ پلان مشروط یا کسی حد تک ہنگامی تھا۔ اگر ہندوستان متحد رہتا تو یہ پلان غیر موثر ہو جاتا لیکن پنجاب کی تقسیم نے اس منصوبے میں جلدی پیدا کر دی جو مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے منظم قتل عام کی صورت میں نکلا۔ یہ بات محسوس کرنا بھی اتنی ہی اہم ہے کہ سکھ اس بات پر انتہائی نالاں تھے وہ سکھ ریاست بنانے میں ناکام رہے۔ وہ نہ صرف پنجاب میں اقلیت میں تھے بلکہ ادھر ادھر منتشر بھی تھے۔ اگر وہ پرامن رہتے تو پنجاب کی تقسیم انہیں تقسیم کر دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے مئی 1947 میں جناح کی فراخدلانہ پیشکش مسترد کر دی اور اس کے بعد سر پنیڈرل مون کی جولائی میں کوششیں ناکام ہوئیں تو بھی آخر تک سکھ اپنے موقف پر قائم رہے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ اپنے منصوبے کو کیسے پایہ تکمیل تک پہنچائیں۔

البتہ ان کے پاس ایک ہنگامی منصوبہ عملدرآمد کے لیے تیار تھا کہ اگر پنجاب تقسیم ہوا تو وہ طاقت اور دہشت کے زور پر مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو جان بچانے کے لیے دوڑنے پر مجبور کر دیں گے۔ لہٰذا اگر ہندوؤں کو اس وقت دلچسپی نہیں تھی تو بھی مسلمانوں کو بے دخل کرنے میں سکھوں کو خاص دلچسپی تھی تاکہ وہ ان علاقوں میں اپنے ہم مذہب افراد کو جمع کر لیں جہاں وہ سکھستان یا خالصتان بنانا چاہتے تھے۔ ایسے منصوبے کے لیے طاقت کا وحشیانہ استعمال ناگزیر تھا اور سکھوں نے اس کے مطابق ہی تیاریاں کیں۔ انہوں نے جو ہتھیار جمع کیے ان میں مشین گنوں سمیت بعض دیگر خودکار اسلحہ بھی شامل ہے۔ انگریز حکومت سے بھارتی انتظامیہ کو اقتدار کی منتقلی سے انہیں چند ہی ماہ میں مسلمانوں کا صفایا کرنے کا فوری موقع مل گیا۔

ایس جی پی سی رپورٹ یہ ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے کہ مسلم لیگ کے پاس پنجاب سے سکھوں اور ہندوؤں کو نکالنے کا قطعی منصوبہ موجود تھا جبکہ سکھوں نے محض ردعمل ظاہر کیا۔ یہ بات معقول لگتی ہے لیکن اس سے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سکھوں کے پاس ردعمل کے لیے ایسا ہنگامی منصوبہ موجود تھا جو انہوں نے مغربی پنجاب سے سکھوں اور ہندوؤں کے انخلا کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال میں زیادہ جذبے کے ساتھ نافذ کیا۔ بالکل اسی طرح یہ دلیل بھی معقول ہے کہ شروع سے ہی مسلم لیگ کے پاس کوئی گرینڈ پلان موجود نہیں تھا لیکن اس کی سیاست اور نظریے نے ایسی دھماکہ خیز صورتحال پیدا کر دی کہ اس کے ہر ہر اقدام نے جبری نقل مکانی اور نسل کشی کے عمل کو تیز کر دیا۔ اسی تناظر میں سکھوں کے پنجاب کی تقسیم کی صورت میں پلان کو مد نظر رکھنا ہوگا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سکھ پنجاب کی تقسیم کے ذریعے سکھ ریاست کا قیام چاہتے تھے بلکہ اگر پنجاب کی تقسیم ان کی امیدوں کے مطابق نہیں ہوتی تو وہ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے طاقت کا استعمال کریں گے۔

پنجاب، ایک کثیر المذاہب یا کثیر العقائد جامع ثقافت؟

تقسیم سے پہلے کے پنجاب کے واقعات کے محتاط تجزیے سے بین المذاہب تعلقات یا رابطوں کی درست نوعیت پر واضح مؤقف کا اظہار نہیں ہوتا۔ کیا یہ ایسا صوبہ تھا جس میں کئی مذاہب کے پیروکار واحد پنجابی شناخت کا حصہ بنے بغیر ساتھ ساتھ رہے تھے۔ جیسا کہ کپور کہتے ہیں کہ یہ کثیر المذاہب معاشرہ تھا یا کثیر العقائد جامع کلچر تھا جو مذہبی اختلافات کے برعکس ایک ایسی ثقافت تشکیل دینے کا باعث بنا جو متنوع آبادی کا مجموعہ تھی؟ یہ حقیقت ہے کہ پنجاب کو انتہائی بہیمانہ انداز میں لہولہان کیا اور توڑا گیا اس بات کا غماز ہے کہ تینوں مذاہب کی منفرد حیثیت اور جداگانہ وجود حقیقی تھا۔ دیگر الفاظ میں کم از کم مسلمان ایک طرف جبکہ ہندو اور سکھ دوسری طرف مشترکہ طور پر کسی یکجہتی اور جڑاؤ کے بغیر رہ رہے تھے۔

خلاصے کی اس شکل کا خود بخود اور کسی مشکل کے بغیر اتباع نہیں کیا گیا۔ اگرچہ یہ لگتا ہے کہ اس میں سچائی کا عنصر کسی حد تک موجود ہے۔ تقسیم کے اس عمل کے بعد مشرقی اور مغربی پنجاب دونوں میں شہریوں کا اس قسم کا قتل عام دوبارہ نہیں ہوا۔ اسی طرح ریاست اور ریاستی ڈھانچے کا انہدام بھی دوبارہ نہیں ہوا۔ البتہ مغربی پنجاب نسل پرستی اور شناخت کے حوالے سے مشترکہ یونٹ میں تبدیل نہیں ہو سکا۔ جیسا کہ نسل کشی کے باب میں شناخت، اجتماعی اور انفرادی دونوں کو خودساختہ اور دوسروں کا تعریف کردہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک منطقی بات ہے اور حتمی نہیں۔ اس کے علاوہ اختلافات اپنے طور پر تصادم کا باعث نہیں بنتے۔ اسے سیاسی پہلو دینا پڑے گا۔ نتیجتاً مشترکہ شناخت مکمل طور پر بامقصد بیان اور فکس سرحدوں کا معاملہ نہیں۔ عنواناتی محسوسات اور سیاسی عناصر کے عمل دخل نے شناخت سازی اور تصورات کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔

مغربی اور مشرقی پنجاب میں نسلی شناخت

1947 میں مغربی پنجاب ہندوؤں اور سکھوں سے خالی ہو گیا۔ چھوٹی سی عیسائی اقلیت اور مٹھی بھر پارسیوں اور دیگر گروپوں کے سوا مغربی پنجاب باقاعدہ طور پر مرتکز مسلم اکثریت کا صوبہ بن گیا۔ البتہ ایسے علما اور پیر جنہوں نے تحریک آزادی کے دوران

پاکستان کی آواز بلند کی اور یہ بھی کہا کہ نیا ملک ایک اسلامی ریاست ہو گا تو اب یہ عناصر پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دینے کا مطالبہ کرنے کے پابند تھے۔ چنانچہ ان حلقوں نے بہت شروع سے ہی پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دینے کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ 1951 کے آغاز پر سنی اور شیعہ دونوں مکتبہ فکر کے علما نے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے 22 نکاتی ایجنڈے پر دستخط کیے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسلام کی کس فقہ کو ریاستی نظریہ قرار دیا جائے اور یہ کہ مسلمان کون ہے؟ اس ابتدائی مرحلے پر شیعہ سنی اختلافات پس منظر میں چلے گئے کیونکہ دونوں فرقے احمدیوں کے خلاف متحد تھے جن کے عقائد کو وہ اسلام کے منافی سمجھتے تھے۔ یوں 1953 میں لاہور میں احمدیوں کے خلاف پر تشدد تحریک شروع ہو گئی جس کے پیچھے مسلم لیگ کے وہ لیڈر شامل تھے جو مرکز میں اپنی پارٹی کی ہی حکومت کو غیر مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ خود وزیر اعظم بن جاتے۔(Court of Inquiry,1945: 283) یہ بات ذہن نشین رہے کہ احمدیوں کے لیڈر اور ممتاز قانون دان سر محمد ظفر اللہ خان نے پنجاب باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا مقدمہ بڑے جوش و جذبے کے ساتھ لڑا تھا۔ 1947 میں حکومت کے ریکارڈ میں احمدیوں کو مسلمانوں کے ساتھ شامل کیا گیا۔ اس بنا پر صرف ضلع گورداسپور میں مسلمانوں کی آبادی 51 فیصد کی سادہ اکثریت میں تبدیلی ہوئی تھی۔ 1974 میں احمدیوں کے عقائد کو اسلام کے منافی قرار دیتے ہوئے پاکستان کی قومی اسمبلی نے انہیں مذہبی اقلیت (یعنی غیر مسلم) قرار دے دیا۔ 1980 کی دہائی سے آگے تک سنی اور شیعہ فرقے دہشتگردی اور فرقہ وارانہ تشدد کا شکار ہو گئے۔ اس کی ابتدائی وجہ تو سعودی عرب اور ایران کی مداخلت تھی تاہم ان فرقوں کے اندر بنیاد پرستی پیدا ہونا بھی ایک بڑی وجہ تھی۔ اس سے سماجی مرکز میں اتحاد و یگانگت کی فضا مکدر ہو گئی۔ ایک بار پھر ان ہنگاموں میں عام شیعہ سنیوں نے حصہ نہیں لیا بلکہ دونوں طرف کے مسلح افراد ہی دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث تھے۔ ان لوگوں نے مخالف فرقے کے افراد کو جان سے بھی مارنے سے گریز نہیں کیا۔ یہاں مخالف فرقے کی مساجد، قبرستان اور دیگر مقدس مقامات کی بے حرمتی کی گئی۔ ایک دوسرے گروپ کے افراد کو چن چن کر بھی نشانہ بنایا گیا (Ahmed, 2009: 159-65)۔

اگر اپنی طرز کی پیورٹی کے غلبے کے لیے دیگر رکاوٹوں کو ہٹانے کی سوچ جاری رہی تو مستقبل میں شیعہ سنی تقسیم مغربی پنجاب کی مشترکہ حیثیت کے لیے زہر قاتل ثابت ہو گی۔ حالیہ برسوں میں سنی مکتبہ فکر کی ذیلی شاخوں دیوبندیوں اور بریلویوں کے درمیان بھی خونریز تصادم کے واقعات ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی زبان کو سرکاری سرپرستی فراہم نہ کی گئی اور پنجابی زبان میں تعلیم دینے کا فقدان رہا۔ 1990 کی دہائی کے اوائل میں مغربی پنجاب اسمبلی کے سپیکر محمد حنیف رامے نے ایوان میں ارکان اسمبلی کو پنجابی زبان میں بولنے کی اجازت دی لیکن اس کو زیادہ پذیرائی نہ ملی۔ پنجابی زبان کو نظر انداز کرنا پاکستانی حکومتوں کی مستقل پالیسی رہی ہے۔ دوسری طرف مشرقی پنجاب میں مذہبی قوم پرستی کی منطق خاص نے ہندو سکھ تعلقات کو نقصان پہنچانے کا عمل جاری رکھا۔ 1956 میں خود مختار ریاستوں پٹیالہ، فرید کوٹ، کپور تھلہ اور دیگر کو مشرقی پنجاب میں ضم کر دیا گیا لیکن اس اقدام سے اکالی دل کے ان سکھ رہنماؤں کی تسلی نہ ہوئی جنہوں نے پنجابی بولنے والی مرتکز آبادی پر مشتمل صوبے کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ اس مطالبے کا اصل مقصد ہندی بولنے والی انبالہ ڈویژن کو نکال کر سکھ اکثریت والا صوبہ بنانا تھا۔ اس کے رد عمل میں پنجابی ہندوؤں نے کانگریس سمیت کئی مذہب پرست جماعتوں کے

زیر اثر پنجابی زبان کی بجائے ہندی کو اپنی مادری زبان قرار دے دیا۔ تاہم 1965 میں پاکستان کے خلاف جنگ میں سکھ فوجی افسروں اور سپاہیوں نے جوش و جذبے سے حصہ لیا جبکہ سکھ لیڈروں نے بھی جنگ کی بھرپور حمایت کی۔ اس کے نتیجے میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے پنجابی صوبہ بنانے کی مخالفت ترک کر دی چنانچہ 1966 میں یہ صوبہ بن گیا۔ لیکن اس فیصلے کا مطلب یہ نہیں کہ سکھوں نے قوم پرستی کا جذبہ ترک کر دیا تھا۔ 1970 کے عشرے میں کچھ سکھوں نے علیحدہ سکھ ریاست 'خالصتان' کے قیام کا تصور پیش کیا۔ 1980 کی دہائی میں خالصتان تحریک ملک توڑنے کا ایک بڑا خطرہ بن کر ابھری۔ اس کا نتیجہ مسلح سکھوں کے بھارتی فوج اور پولیس سے تصادم کی صورت میں نکلا۔ آخر کار 1990 کے اوائل میں طاقت کا بے دریغ استعمال کر کے اس تحریک کو کچل دیا گیا۔ (Ahmed, 1998: 113-34) سینئر بھارتی صحافی راجندر پوری نے پنجاب کی تقسیم کے منفی اثرات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> تقسیم کے بعد پنجابی غائب ہو گئے، مغربی پنجاب میں وہ پاکستانی بن گئے جبکہ مشرقی پنجاب میں وہ سکھ یا ہندو بنے۔ وہ اکالی، کانگریس والے، آریا سماج اور جن سنگھی تو بنے لیکن پنجابی کبھی نہ بن سکے (1985: 132)۔

نسل پرستانہ امن اور دشمنی

اس معاملے کا ایک اور بھی پہلو ہے۔ جب کبھی دونوں حکومتوں نے پنجاب والوں پر ایک سے دوسرے حصے میں جانے کی پابندیاں نرم کیں تو کئی جذباتی مناظر دیکھنے میں آئے۔ اس کی ایک بہترین مثال وہ ہے جب 1955 میں دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر نے مشرقی پنجاب والوں کو لاہور آکر کرکٹ ٹیسٹ میچ دیکھنے کی دعوت دی تو ہزاروں سکھ اور ہندو لاہور آئے۔ بچھڑے پنجابیوں کے ملاپ کا سب سے عمدہ مظاہرہ لاہور میونسپل کمیٹی میں ہونے والا مشاعرہ تھا۔ مشاعرے کے شرکا میں میرے بھائی مشتاق احمد بھی موجود تھے۔ انہیں اب بھی یاد ہے کہ جب مشہور پنجابی شاعر استاد دامن نے سٹیج پر آکر اپنی نظم کا پہلا شعر پڑھا تو کئی لوگوں کی آنکھیں بھر آئیں جبکہ بعض تو دھاڑیں مار کر رونے لگے۔

> لالی اکھاں دی پئی دسدی اے
> روئے تسی وی او، روئے اسی وی آں

مجھے ایک دوست امجد بابر جو استاد دامن کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اور طویل عرصے تک ان کی صحبت میں رہے نے بتایا کہ دامن نے پہلی بار یہ نظم تقسیم کے فوراً بعد دہلی کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی۔ پنڈت نہرو بھی سٹیج پر موجود تھے اور استاد دامن نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے نظم پڑھی تھی۔ اس موقع پر وزیر اعظم نہرو بھی آبدیدہ ہو گئے۔

بہر حال 1955 کے کرکٹ میچ کے بعد کئی بار پاکستانی امرتسر میں کرکٹ سمیت دیگر کھیل دیکھنے جاتے رہے۔ وہاں بھی اتنی ہی گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس قسم کی آخری مثال 2004 میں مشرقی پنجاب کے مرکزی شہر چندی گڑھ کے موہالی

سٹیڈیم میں ہونے والا کرکٹ میچ تھا۔ مشرقی اور مغربی پنجاب کے باسیوں کے درمیان ملاقاتوں سے بخوبی اندازہ ہوا کہ ثقافت کی تشکیل میں پنجابی شناخت بدستور طاقتور جذبہ رہا۔ دونوں طرف کے پنجاب کی حکومتوں نے تعلقات کی بحالی کے لیے بعض اقدامات کیے لیکن ان کی نوعیت بہت چھوٹی تھی۔ بہر حال لاہور سے امرتسر کے لیے 25 جنوری 2006 سے بس سروس کا آغاز کیا جا چکا ہے۔

موہنی چڈا

بھارتی سفارتکار موہنی چڈا جنہوں نے راولپنڈی اور تھمالی سمیت اپنے آبائی دیہات کا دورہ کیا تھا اور ان کا ذکر پہلے میں اس کتاب میں کر چکا ہوں۔ انہوں نے لاہور ائیرپورٹ پر اترنے پر اپنے جذبات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

"جیسے ہی پی آئی اے کی پرواز نے لاہور ائیرپورٹ کی زمین کو چھوا تو میں انتہائی جذباتی ہو گیا حالانکہ اس شہر کے ساتھ میرا ناتا برائے نام تھا۔ چند گھنٹے بعد میں دو انجن والے چھوٹے طیارے میں راولپنڈی جانے کے لیے سوار ہوا۔ میں اپنی پگڑی کی وجہ سے واضح طور پر بھارتی نظر آرہا تھا اور مرکز نگاہ بنا ہوا تھا۔ جیسے ہی طیارے نے پرواز کی تو کھڑکی کے ساتھ نشست پر بیٹھا شخص مجھ سے پنجابی میں بات چیت کرنے لگا اور اپنا تعارف عارف کے نام سے کرایا۔ مجھے اس کے نام کا دوسرا حصہ اب یاد نہیں تاہم اس نے بتایا کہ انہوں نے 1979 میں اٹارنی جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ نہ میں نے استعفیٰ دینے کی وجہ دریافت کی نہ انہوں نے بتائی۔ اس نے لندن سے ایل ایل ایم کی ڈگری حاصل کی اور لاہور بار کونسل کا صدر بن گیا۔ جب اسے میرے مشن کا پتہ چلا تو عارف نے میرے ساتھ تقسیم کے المیے پر بات چیت کی جس کے دوران معلوم ہوا کہ میری طرح عارف بھی 1937 میں پیدا ہوا لیکن بھارتی پنجاب کے علاقے ہوشیارپور میں۔ میری طرح اس کا بھی پورا خاندان مہاجر تھا۔ اس کی والدہ سمیت کئی رشتہ دار قتل کر دیے گئے البتہ وہ اپنی بیوی سمیت جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ میری طرح وہ بھی اپنی جنم بھومی کے بارے میں ناسٹلجیا کا شکار تھے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے آبائی گاؤں کی مٹی واپس بھارت لے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو اس نے کہا کہ وہ اپنے شہر ہوشیارپور کے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتا تھا اور اسے توقع تھی کہ وہ بھی ایک دن وہاں جا کر وہی کام کرے گا جو میں کرنا چاہتا تھا۔ ان چند لمحات کے دوران ہی ہم ایک ہی رشتہ میں بندھ گئے، وہ رشتہ تھا مشترکہ المیہ۔"

یہ اتفاقی ملاقات زمین سے ہزاروں میٹر اوپر ہوا میں دو پنجابیوں کے درمیان ہوئی جس میں تقسیم کے ان ایک جیسے المیوں کا ذکر کیا گیا جو بچپن سے ان کی یادوں کو کچوکے لگا رہے تھے۔ چونکہ یہ میری ریسرچ سے متعلق بات تھی لہٰذا میں نے اس آدمی (عارف ایڈووکیٹ) کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ انٹرنیٹ سے مجھے کچھ رہنمائی نہ ملی۔ آخر کار میں نے لاہور میں اپنے دوستوں سے کہا کہ وہ اس کو تلاش کرنے میں مدد کریں۔ اس دورے سے ڈاکٹر حسن عامر شاہ، خواجہ عارف مسعود اور ان کے صاحبزادے خواجہ عمر پر مشتمل ٹیم عارف کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔ خواجہ عارف مسعود لاہور میں وکالت کرتے ہیں اور لیبر لاء اور رائٹس کے کیسوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ موہنی چھڈا نے جس عارف کا ذکر کیا ہے وہ عارف چودھری سے مماثل ہے تاہم یہ پتہ نہیں کہ عارف چودھری ہوشیارپور میں پیدا ہوا تھا۔ چند ہفتے کی مزید تحقیق کے بعد انکشاف ہوا کہ عارف چودھری ہوشیارپور میں ہی پیدا ہوا تھا۔ شاید مختصر گفتگو میں موہنی چھڈا کو کچھ مغالطہ لگا

تھا۔ عارف چودھری نے کبھی اٹارنی (ایڈووکیٹ) جنرل کے طور پر کام نہیں کیا تھا۔ وہ پنجاب بار کونسل کا کبھی صدر نہیں رہا بلکہ 79-1978 میں اس نے لاہور ہائی کورٹ بار کے صدر کا الیکشن جیتا تھا۔ وہ پہلے پنجاب (لاہور) ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ کے جج بنے۔ ریٹائرمنٹ پر جسٹس (ر) عارف چودھری نے فیڈرل سروسز ٹریبونل کے چیئرمین کے طور پر کام کیا۔ ان دنوں وہ پاک انڈیا فرینڈشپ سوسائٹی کے بانی سرپرست ہیں جس کی شاخیں لاہور، مشرقی پنجاب اور لندن میں موجود ہیں۔

ست پال اروڑہ

پاکستان اور بھارت کی طرف سے ایٹمی دھماکوں کے بعد میں امن کی تحریک چلانے کے لیے متحرک ہو گیا۔ میں انٹرنیٹ کا ممنون ہوں جس کی وجہ سے میرا ان بھارتی باشندوں سے رابطہ ہوا جن کا تعلق لاہور سے رہا تھا۔ دہلی کے باسی ست پال اروڑہ جو اندرون شہر لاہور کے پانی والا تالاب کے محلے کچا ملوماتا کے رہنے والے تھے نے 2001 کے اوائل میں میرے ساتھ رابطہ کیا۔ میں نے اس برس دہلی کا دورہ کیا اور ان سے ان کے گھر پر ملاقات کی۔ اگرچہ اروڑہ اور ان کی بیوی کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن میں یہاں صرف ایک کہانی بیان کر رہا ہوں:

"1995 یا 1996 میں لاہور سے ایک معزز شخص سید اسد حسین ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے بنگلور آیا۔ اسی دوران جب وہ دہلی میں تھا تو اس نے 'انڈین ایکسپریس' اخبار کو خط لکھ کر ڈاکٹر خیرہ کے بارے میں استفسار کیا جس نے لاہور میں بچپن میں اسد حسین کی جان بچائی تھی۔ ڈاکٹر خیرہ میری بیوی کا چچا تھا اور ہمارے ان سے قریبی تعلقات تھے لیکن وہ عرصہ پہلے آنجہانی ہو چکے تھے۔ وہ تقسیم سے پہلے لاہور کے مشہور سرجن تھے۔ ہم اسد حسین شاہ سے ملنے گئے تو اس نے بتایا کہ وہ پوری زندگی اس مہربان ڈاکٹر کو ڈھونڈنے کی خواہش رکھتا رہا جس نے آپریشن کر کے ایک خطرناک مرض سے میری جان بچائی تھی۔ وہ ہم سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اسد حسین سے مل کر مجھے اپنے شہر جانے کا اشتیاق ہوا۔ مشکل یہ تھی کہ مجھے اس علاقے کا ٹھیک سے پتہ نہیں تھا جہاں ہمارا گھر تھا۔ لیکن میرے ساتھ جو ٹیکسی ڈرائیور تھا وہ فرشتہ ثابت ہوا اور اس نے جگہ جگہ سے میرے علاقے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ آخر کار میری ملاقات ایک بوڑھے آدمی سے ہوئی جو مجھے اپنے ساتھ ایک جگہ لے کر گیا اور بولا، 'سامنے دیکھو، کیا یہ تمہارا گھر نہیں تھا؟' ایک لمحے کے لیے گزرے تمام برس بے معنی ہو کر رہ گئے۔ وقت جیسے تھم کر رہ گیا۔ میرے سامنے میرا گھر کھڑا تھا۔ وہاں لوگوں کا ایک بڑا مجمع کھڑا تھا۔ ان لوگوں کو پتہ چلا تھا کہ میں بھارت سے یہاں آیا تھا۔ اچانک کسی نے ہمیں کوکا کولا کی بوتلیں لا کر دیں جو ہم نے نوش کر لیں۔

"میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ ایک معمر شخص باہر نکلا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ کبھی ہمارا گھر تھا اور اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں صرف اسے اندر سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ باریش اور ہمدردی سے بھرپور تھا۔ اس نے کہا، 'یہ آپ کا اپنا گھر ہے، براہ کرم اندر آ جائیں۔' خواتین خانہ کو میری آمد کی اطلاع دی گئی چنانچہ میں کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے گھر میں گھومنے لگا۔ مجھے ایک کرسی نظر آئی جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ ہم ہی چھوڑ کر گئے تھے۔ انہوں نے میری بات کی تصدیق کی۔ گھر میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ میں جذبات سے مغلوب ہو گیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ گھر کا موجودہ مالک بھی کافی متاثر نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ اور میرے بیٹے سے گلے ملا۔ وہ رو رہا تھا اور بولا اب

چونکہ آپ نے لاہور میں اپنا گھر دیکھ لیا ہے تو براہ کرم یہ وعدہ کریں کہ مجھے مرنے سے پہلے جموں میں اپنے آبائی گھر دیکھنے کے لیے میری مدد کریں گے۔"

یوراج کرشن جو پرانی انار کلی لاہور میں رہتا تھا کی کہانی میں نے قبل ازیں کتاب میں شامل کی ہے۔ وہ ان دنوں نئی دہلی سے کافی دور علاقے وسنت گنج کے علاقے میں رہتے ہیں۔ جب میں ان سے ملنے گیا تو ٹیکسی ڈرائیور ایک سکھ تھا اور نئی دہلی کے ارد گرد کے علاقوں سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ چنانچہ ہماری تلاش طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی۔ آخر کار میں ایک کریانہ شاپ پر گیا اور مسٹر کرشن سے رہنمائی مانگی۔ جب ہماری گفتگو ختم ہوئی تو دکان میں موجود ایک 25،30 سال کی عمر کا نوجوان آگے آیا اور کہا کہ کیا آپ لاہور سے آئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے پوچھا کہ تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ "میرے والد کی سید مٹھا بازار اندرون لاہور میں ایک دکان تھی۔ آپ جو پنجابی بول رہے ہیں اس کا لہجہ میرے چچا سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اس لیے مجھے لگا کہ آپ یقیناً لاہور سے ہی آئے ہوں گے۔" اس نے مجھ سے فون کرنے کے پیسے وصول نہ کیے اور بولا کہ اس طرح میرے والد کی روح خوش ہو گی کہ ہماری دکان پر ایک لاہوری آیا تھا(Ahmed, 2006)۔

پرانے وقت کے پاکستانی پنجاب سے تعلق رکھنے والے جن افراد سے میری گفتگو ہوئی ان سب میں جہاں ایک طرف پرانے ہندو اور سکھ دوستوں کی یادیں موجود تھیں وہاں یہ لوگ ہمیشہ ہندوؤں کے ذات پات کے تعصب پر نالاں نظر آئے۔ کچھ لوگوں نے سیاسی پہلو سے کہا کہ اگر ہندو اور سکھ یہاں سے نہ جاتے تو مسلمان بدستور محروم اور غریب رہتے۔ اسی طرح پنجابی ہندوؤں اور سکھوں کو جہاں اپنے خالی گھروں اور سکولوں کی یادیں ستاتی ہیں وہاں وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ تقسیم کا منصوبہ اس لیے بنایا گیا تھا تا کہ مسلمان ہماری جائیدادیں لوٹ سکیں۔ البتہ وہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ذات پات کی تقسیم نے مسلمانوں اور ان کے درمیان خلیج پیدا کی۔

گھر کو واپسی

میں نے بے شمار ایسے پنجابیوں کی کہانیاں جمع کی ہیں جنہیں سرحد کے دوسری طرف اپنے آبائی گھر میں دوبارہ جانے کا موقع ملا۔ ان میں سے بعض منتخب کہانیاں یہاں پیش کی جا رہی ہیں۔

سابق بھارتی وزیر اعظم اندر کمار گجرال

اندر کمار گجرال سے میری ملاقات اکتوبر 1992 میں دہلی میں ہوئی۔ میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا تھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی پنجاب سے تعلق رکھنے والے افراد سے ملنے کی کوشش کی کیونکہ میں پرانے پنجاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں ہمیشہ سے دلچسپی رکھتا آیا ہوں۔ آئی کے گجرال اور ان کی اہلیہ شیل گجرال مجھے اپنے گھر میں ملے اور چند ہی لمحوں میں ہم مغربی پنجاب کے لہجے والی پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے۔ مجھے یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ شیل گجرال کا تعلق اسی ٹیمپل روڈ مزنگ لاہور سے تھا جہاں میرا آبائی گھر آج بھی ہے۔ دونوں نے مجھے اپنے دورہ پاکستان کے کئی واقعات سنائے کہ کس طرح گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا گیا اور اپنے پرانے ہمسایوں اور دوستوں کے ساتھ ملاقات

کے کیسے جذباتی مناظر تھے۔ بیگم گجرال نے بتایا کہ جب وہ اپنے شوہر اندر کمار کے ساتھ ٹیمپل روڈ پر ہمارے پرانے گھر گئے تو ہمارے پرانے ہمسائے جو اب بھی وہیں تھے نے اصرار کیا کہ ہم ان کے ساتھ قیام کریں۔ ایک اور کہانی مجھے یاد آ گئی ہے کہ کس طرح شیل گجرال کی بہن کے وفادار ملازم نے ان کے قیمتی زیورات سنبھال کر رکھے اور جب صورتحال معمول پر آئی تو اس نے ایمانداری سے ہر چیز لوٹا دی۔ آئی کے گجرال نے اپنی خودنوشت (Matters of Discretion 2011) میں اپنے جہلم میں گزارے گئے بچپن کے ایام اور لاہور میں زمانہ طالب علمی کا کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان کا خاندان آریا سماج تحریک کا پیروکار تھا۔ ان کے والد اوتار نارائن گجرال مہاتما گاندھی کے شاگرد تھے اور لاہور میں قیام کے دوران آئی کے گجرال کیمونسٹ تحریک میں شامل ہو گئے۔ اندر اور شیل نے 1982 میں جہلم اور لاہور کا دورہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> جب ہم رخصت ہونے ہی والے تھے کہ ایک معمر خاتون خدیجاں بی بی، دوڑی دوڑی میری طرف آ رہی تھی، میں فوراً اسے پہچان گیا کیونکہ وہ میری اور میرے چھوٹے بھائیوں کی آیا رہی تھی۔۔۔ خدیجاں بی بی نے مجھے ایک ماں کی طرح گلے لگایا۔ شیل سے ان کی پہلی بار ملاقات ہو رہی تھی۔ اس نے شیل کو شگون کے طور پر ایک سکے کا تحفہ دیا (Gujral, 2011:20)۔

گجرال کے بچپن کے دوست احسن علی، نارائن گجرال کے اسسٹنٹ مظفر حسین شاہ اور گجرال کے والد کے کولیگ محمد بشیر تب ان سے ملنے کے لیے آئے۔ ان سب کو سول کلب جہلم میں ڈنر پر مدعو کیا گیا۔ پنجابی شاعر جوگی جہلمی نے گجرال سے پوچھا کہ کیا تم نے مجھے پہچانا ہے؟ گجرال نے جواب دیا کہ مجھے آج بھی یاد ہے کہ آپ کس طرح جوبلی گھاٹ پر ہونے والے جلسوں میں انگریز مخالف نظمیں پڑھتے تھے۔ بعد ازاں ایک مشاعرہ ہوا جس میں ڈپٹی کمشنر اور دیگر انتظامی افسر موجود تھے۔ چونکہ اردو شاعری میں آئی کے گجرال کا کافی اچھا ذوق تھا اس لیے صدارت ان کے حوالے کی گئی۔ شیل گجرال نے بھی اپنی ایک غزل پڑھی۔ مشاعرے کی روداد جذباتی انداز میں لکھتے ہوئے گجرال لکھتے ہیں کہ مشاعرے کے بعد تقریباً تمام افراد نے ہمیں دوبارہ خاندان کے ساتھ گھر آنے کی دعوت دی۔ میں اس بات سے انتہائی متاثر ہوا جب ان لوگوں نے کہا: 'جہلم آج بھی آپ کا شہر ہے، اسے بھلائیں مت' (Ibid: 23)۔

سنیل دت

''جب سے میرا خاندان 1947 میں ضلع جہلم کے گاؤں خورد سے نکلا تھا، میں کم از کم ایک بار وہاں جانے کا خواہاں تھا۔ اگرچہ ایک بڑا فلسٹار بننا اور بھارتی کانگریس کا رکن منتخب ہونا بڑی کامیابی کی بات تھی لیکن میری روح ہمیشہ سرحد پار پاکستانی پنجاب میں اپنے ماضی سے جڑی رہی۔ 1998 میں مجھے آخر کار 'خورد' گاؤں جانے کا موقع مل گیا۔ اس کے لیے میں اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف کا شکر گزار ہوں جنہوں نے خصوصی دلچسپی لی۔ میں دلیپ کمار کے ساتھ آیا۔ ہمارے گاؤں کے افراد کو پہلے ہی مطلع کر دیا گیا تھا۔ کئی نوجوانوں نے تو میری فلمیں بھی دیکھ رکھی تھیں۔ وہ محسوسات ناقابل بیان ہیں جب میں نے اس مٹی پر پاؤں رکھے جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ ایک بوڑھی عورت نے مجھے میرے بچپن کے نام 'بجیا' سے مخاطب کیا جو کہ

میرے اصل نام بلراج کو بگاڑ کر بنایا گیا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ میری ماں کیسی تھیں۔ جب میں نے بتایا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے تو وہ رونے لگے۔

''میری خاندان کی جان میرے چچا کے دوست یعقوب نے بچائی تھی۔ میں ان کے گاؤں نواں کوٹ گیا تا کہ 1947 میں ہماری مدد کرنے پر ان کا شکریہ ادا کروں۔ ان انتقال ہو چکا تھا اور ان کے بچے بھی اب گاؤں چھوڑ کر جا چکے تھے۔ بہر حال میں وہاں دیگر لوگوں سے ملا اور اپنے جذبات ان تک پہنچائے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ یعقوب کے بچوں تک میرے جذبات پہنچائیں گے۔ میں ان خیالات کے ساتھ واپس آیا کہ اچھے اور برے لوگ ہر مذہب میں موجود ہوتے ہیں اور پوری دنیا کو مکمل طور پر جاننا ممکن نہیں۔''

راج ببر

''ہاں یہ ٹھیک ہے کہ بالی ووڈ فلم انڈسٹری میں مجھے زبردست کامیابی ملی لیکن میرے گھر میں میرے والدین اپنے آبائی شہر جلالپور جٹاں (ضلع گجرات) کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے جو انہوں نے 1947 میں چھوڑا تھا۔ چند برس پہلے میں پنجابی کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان گیا۔ ائیرپورٹ اور ہوٹل میں میرا جس طرح پرجوش خیر مقدم کیا گیا وہ یادگار ہے۔ اگرچہ میری پیدائش آگرہ میں ہوئی لیکن میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ میں جلالپور جٹاں میں اپنا گھر کھو چکا ہوں۔ پاکستان کے دورے میں مجھے لگا کہ میں اپنے گھر واپس آیا ہوں۔ میں نے جلالپور جٹاں میں اپنا آبائی گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس کا فوری بندوبست کر دیا گیا۔ یہ خبر آناً فاناً جلالپور جٹاں میں بھی پھیل گئی۔ وہاں سے کچھ نوجوان لاہور آئے اور مجھے ساتھ لے کر جلالپور روانہ ہوئے۔ موٹر سائیکلوں کا قافلہ اس چھوٹے سے قصبے میں داخل ہوا۔ شہر کے باسیوں نے بھی میرا پرتپاک استقبال کیا۔ کئی بوڑھوں کو میرے خاندان اور ہمارے گھر کا پتہ تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ کے خالی کردہ گھر کے صحن میں اب ایک مسجد تعمیر کی جا چکی تھی اور پتہ نہیں کہ آپ وہاں جانا پسند کریں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو میں وہاں ضرور جانا پسند کروں گا۔ اس روز مجھے اپنی کامیابی کی وجہ معلوم ہوئی۔ اگر لوگ میرے گھر میں قائم مسجد میں روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے تو یقیناً اس کا ثواب مجھے بھی ملتا ہو گا۔ میری اس بات سے وہ سب بہت خوش ہوئے اور ہم فوراً پرانا گھر دیکھنے چلے گئے۔ میں لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ رہا ہوں کہ اصل مسئلہ لوگ نہیں بلکہ گندی سیاست ہوتی ہے۔ غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے آپ کو ہر ممکن اقدام اٹھانا پڑے گا۔''

رچنا آنند

سنگاپور میں انسٹی ٹیوٹ آف ساؤتھ ایشین سٹڈیز میں وزٹنگ ریسرچ پروفیسر کی حیثیت سے تین سالہ قیام کے دوران میری کئی ایسے پنجابیوں سے ملاقات ہوئی جن کی جڑیں پنجاب کے دوسرے حصے میں تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون رچنا آنند نے مجھے اپنے آبائی قصبے پنڈ دادنخان کے دورے کی سحر انگیز کہانی سنائی۔ تقسیم سے پہلے ان کے دادا حکیم چونی لال کوہلی قصبے کے

انتہائی قابل احترام حکیم تھے جن سے ہر کوئی علاج کے لیے رابطہ کر سکتا تھا۔ رچنا کے والد تقسیم کے وقت سکول کے طالب علم تھے۔ وہ پنڈ داد نخان کی باتیں کرتے نہیں تھکتے تھے حالانکہ تقسیم کے بعد وہ کبھی وہاں نہیں گئے تھے۔ رچنا آنند شادی کے بعد سنگاپور منتقل ہو گئیں لیکن وہاں بھی پنڈ داد نخان ان کی زندگی کا حصہ برقرار رہا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے 16 مارچ 2007 کو پاکستان کا دورہ کیا۔ اس دورے کا اہتمام سنگاپور پریس کلب نے جذبہ خیر سگالی کے طور پر کیا تھا۔ ان کے راولپنڈی قیام کے دوران انگریزی اخبار 'پاکستان پوسٹ' کے چیف ایگزیکٹو آفیسر راجہ ارشد خان نے رچنا آنند کو حکومت سے پنڈ داد نخان جانے کی اجازت لے کر دینے میں نہایت تعاون کیا۔ انہوں نے رچنا کا تعارف ممبر صوبائی اسمبلی چودھری نذر محمد گوندل سے کرایا۔ انہوں نے چودھری نذر محمد بتایا کہ وہ اس جگہ پر جانے کے لیے کتنی بے تاب تھیں جس کا ذکر کرتے ان کے والد تھکتے نہیں تھے۔ باقی کی تمام کہانی ان کے اپنے الفاظ میں یہاں دی جا رہی ہے۔ میری درخواست پر انہوں نے مجھے یہ ای میل بھجوائی تھی:

"راجہ ارشد نے مجھے اگلے روز اپنے دفتر کی گاڑی پر ڈرائیور کے ساتھ پنڈ داد نخان بھجوانے کا بندوبست کیا۔ چنانچہ اگلے روز علی الصبح ہم روانہ ہو گئے۔ میں موبائل فون پر دہلی میں مسلسل اپنے والد صاحب کے ساتھ رابطے میں رہی۔ ہم دونوں فرط جذبات کے باعث ایک پل کے لیے بھی نہ سو سکے۔ ساری رات ہم باتیں ہی کرتے رہے۔ مجھے اس رات کی جذباتی کیفیت کبھی نہیں بھولے گی۔ صبح پونے دس بجے ہم پنڈ داد نخان پہنچ گئے اور سیدھے چودھری نذر گوندل کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ وہ بہ نفس نفیس وہاں موجود تھے اور میرے ساتھ نہایت خلوص کے ساتھ ملے۔ مجھے وہاں بڑی عمر کے لوگوں کی کافی تعداد بیٹھی نظر آئی۔ ہلکی پھلکی تواضع کے بعد ہم آبائی گھر کی طرف چل پڑے۔

"اگرچہ میں پہلے یہاں کبھی نہیں آئی تھی لیکن سب کچھ اپنا اپنا لگ رہا تھا۔ جب ہم میرے والد کے سکول پہنچے تو میں آسانی سے سب چیزوں کا بتا سکتی تھی۔ اپنے ذہن میں بنے نقشے کی مدد سے میں بتا سکتی تھی کہ ہم آبائی گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہاں ایک بڑا ہجوم میرے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ جب میں ان کے قریب پہنچی تو کئی لوگ مجھے ہار پہنانے کے لیے آگے بڑھے۔ اس کے بعد جیسے مجھ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ جب وہ لوگ مجھے جلوس کی شکل میں گلیوں میں لے جا رہے تھے تو میرے والد کی سب سے بڑی بہن کی ایک سہیلی میرے پاس آئی اور گرمجوشی سے مجھے گلے لگا لیا اور پھر ہجوم کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ خاتون اتنی دور سے صرف گھومنے نہیں آئی بلکہ اپنا آبائی گھر دیکھنا چاہتی ہے۔ پھر وہ میرا ہاتھ تھامے مجھے میرے گھر کی طرف لے گئی۔

"جب لوگوں کو پتہ چلا کہ میں کس کی پوتی ہوں تو انہوں نے مجھ پر محبتوں کی برسات کر دی۔ میرے لیے اب مزید برداشت کرنا ناممکن تھا۔ میں جواب میں صرف رو سکتی تھی۔ ہر کوئی مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے گھر جو کچھ موجود تھے مجھے بطور تحفہ دے رہے تھے۔ میں اس محبت سے گنگ ہو کر رہ گئی۔ کوئی شخص میرے دادا کے پرانے خط اور پھر لکڑی کا ایک کھلونا لے آیا لیکن اس نے شرط رکھی کہ یہ چیزیں اسی صورت میں ملیں گی اگر میں ان کے گھر جاؤں۔ لہٰذا میں چلی گئی۔ مجھے کہا گیا کہ میں لکڑی کا کھلونا ساتھ لے جا سکتی ہوں لیکن پہلے بتاؤں کہ یہ کس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا۔ مجھے یہ محسوس کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ میں کس کے گھر

بیٹھی تھی۔ یہ میرے دادا کے پیارے دوستوں میں سے ایک مولوی عبدالعزیز امام مسجد اور مہتمم مدرسہ کا گھر تھا۔ وہ حافظ قرآن تھے جبکہ میرے دادا بھی ہندو ہونے کے باوجود اسلام کے ایک بڑے سکالر تھے اور روانی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کر سکتے تھے۔ دونوں دوست قرآنی آیات، اردو شاعری اور کتابوں پر باقاعدگی کے ساتھ مباحثے کرتے تھے۔

”پنجاب کے دونوں حصوں میں بدترین خونریزی شروع ہونے سے چند ہفتے قبل میرے دادا پنڈ داد نخان سے رخصت ہوگئے۔ جب وہ بھارت میں تھے تو انہیں پتہ چلا کہ مولوی عبدالعزیز شدید علیل تھے چنانچہ انہوں نے ایک دوائی تیار کر کے لکڑی کے کھلونے میں چھپائی اور کسی طرح سمگل کر کے ان تک پہنچا دی۔ دوائی کھا کر مولوی صاحب مکمل صحت یاب ہوگئے چنانچہ ان کی اولاد نے دونوں دوستوں کی یاد میں لکڑی کے کھلونے سنبھال کر رکھ لیے۔ مجھے درست جواب دینے پر ایک لکڑی کا کھلونا تحفے میں دے دیا گیا۔ کئی افراد میرے دادا کی جادوئی حکمت اور دوائیوں کے معترف تھے۔ ان کے ہاتھ میں جادو تھا اور کئی افراد حکیم چونی لال کوہلی کے ہاتھوں شفا پانے کی وجہ سے میرا شکریہ ادا کرنے آئے۔ کچھ لوگوں کو وہ قرآن کے سکالر، کتابوں کے شوقین اور انسان نواز ہونے کی وجہ سے یاد تھے۔ دادا نے غریبوں سے کبھی طبی معائنے کی فیس وصول نہیں کی تھی بلکہ دوائی کے ساتھ اناج بھی کھانے کو دیتے تھے۔ کسی کسی مریض کو ایک چٹ بھی دیتے تاکہ وہ مقامی حلوائی سے مفت دودھ پی کر صحت یاب ہو جائے۔

”مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ وہاں ایک ہندو برہمن، دت نسل کا، آج بھی موجود تھا اور اس نے مجھے کہا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ نہایت پرامن طریقے سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میرے والد نے فون کر کے اس سے بات چیت کی۔ انہیں اس ہندو کے خاندان کے بارے میں معلوم تھا۔ چودھری نذر محمد گوندل صاحب نے بھی میرے والد سے فون پر گفتگو کی اور انہیں پنڈ داد نخان آنے کی دعوت دی۔ پنڈ داد نخان میں ایسے خاندانوں کی موجودگی کا جان کر میرا دل خوشی سے معمور ہوگیا جو آج میرے خاندان کا حصہ ہیں اور یہ تعلق آنے والی نسلوں تک برقرار رہے گا۔“

وسیم اکرم

منگل 3 مئی 2005 کو کرکٹ کے لیجنڈ اور شاید آج تک کے دنیا کے سب سے عظیم لیفٹ آرم فاسٹ باؤلر وسیم اکرم اور ان کے والد چودھری محمد اکرم نے ضلع امرتسر کے گاؤں چونڈہ دیوی کا دورہ کیا۔ چونڈہ دیوی میں مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کی تقریباً ایک جتنی آبادی تھی۔ مسلمان زیادہ تر آرائیں اور سید برادری کے تھے۔ وسیم اکرم کا خاندان آرائیں تھا۔

وسیم اکرم اور ان کے والد کو ان کے آبائی گاؤں کے نوجوان اور معمر افراد نے پرتپاک طریقے سے خوش آمدید کہا۔ ان کے والد جنہوں نے 1947 میں ہجرت سے پہلے یہاں اپنا بچپن گزارا تھا کو ان کے پرانے دوست زندہ مل گئے۔ اپنے اس پرانے گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر چودھری اکرم جذباتی ہوگئے جہاں ان کا بچپن بیتا تھا۔ گھر کے موجودہ مالک بھگوان سنگھ نے ان سے گرمجوشی سے معانقہ کرتے ہوئے پنجابی میں کہا کہ ”یہ گھر اب بھی آپ کا ہے“(The Hindu, 4 May 2005)۔

جب کسی نے زور دیا کہ آپ یہاں آتے رہا کریں تو وسیم اکرم کے والد نے کہا: "میں ہر مہینے آ سکتا ہوں اگر دونوں طرف کی حکومتیں اس کی اجازت دیں" (Zee TV, 3 May 2005)۔

ڈاکٹر خوشی محمد خان

"میں نے آپ کو پہلے ہی یہ داستان سنائی ہے کہ ہم نابھ سے پیادہ پا کس طرح پاکستان پہنچے۔ ہم گوجرانوالہ میں بس گئے۔ 1949 میں میں نے اپنے دوست اشوینی کمار شرما کے والد ڈاکٹر گردھاری لال کو خط لکھا۔ برہمن ڈاکٹر گردھاری لال املوہ شہر میں واحد کوالیفائیڈ میڈیکل پریکٹیشنر تھے۔ وہ ایک مہربان، شفیق انسان تھے اور ہر کوئی ان کا احترام کرتا تھا۔ خط کا جواب آیا تو میرے اور اشوینی کے درمیان خط و کتابت شروع ہو گئی۔ ہمارے درمیان 1958 تک رابطہ برقرار رہا۔ اس دوران میں نے اکنامکس اور انگلش لٹریچر میں ایم اے کر لیا اور لیکچرر کے طور پر اپنے کیرئیر کا آغاز کیا جس کے باعث میں مغربی پنجاب کے مختلف شہروں میں تعینات ہوتا رہا۔ 1963 کو میں سکالرشپ پر جرمنی گیا اور وہاں ڈویلپمنٹ اکنامکس میں پی ایچ ڈی کر لی۔ میں واپس پاکستان آ گیا لیکن مجھے کوئی تسلی بخش ملازمت نہ مل سکی۔ واپس جرمنی جا کر میں نے شادی کر لی اور یونیورسٹی ٹیچر اور ریسرچر کے طور پر کام شروع کر دیا۔ میری پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے مجھے دنیا کے کئی ممالک میں جانا پڑا لیکن میرا دل اور روح اس جگہ پر اٹکے رہے جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ وہ ہے املوہ۔۔۔ چنانچہ میں نے اشوینی کمار سے اپنے رابطے بحال کیے۔ اس نے زور دیا کہ میں املوہ ضرور آؤں۔

"لیکن ان دنوں مشرقی پنجاب بدامنی کی آگ میں جل رہا تھا۔ خالصتان تحریک زوروں پر تھی اور ایک پاکستانی پس منظر کے حامل شخص کے لیے بھارت کا ویزہ حاصل کرنا ناممکن تھا۔ اس دوران خوش قسمتی نے دروازے پر دستک دی۔ معروف بھارتی پروفیسر جو پہلے جرمنی میں سفیر بھی رہے تھے جرمن اوورسیز انسٹی ٹیوٹ میں آئے جہاں میں کام کرتا تھا۔ میں نے انہیں اپنی داستان سنائی اور درخواست کی کہ ویزے کے حصول میں میری مدد کریں۔ اس مہربان شخص نے واقعی مدد کی اور یوں مجھے بھارتی ویزہ مل گیا۔

"میں 35 سال بعد 1982 میں املوہ واپس آیا۔۔۔ چھوٹا سا قصبہ کافی بدل چکا تھا لیکن لوگ پہلے جیسے ہی نیک دل تھے۔ مجھے ایسے پرتپاک طریقے سے خوش آمدید کہا گیا جیسے برسوں سے کھوئے دھرتی کے بیٹوں کو کہا جاتا ہے۔ اشوینی اور بچپن کے دیگر دوست مجھے جلوس کی شکل میں بڑی سڑکوں سے گزار کر لے گئے۔ بوڑھے مرد اور عورتیں میرے خاندان کے بارے میں حال احوال پوچھتے رہے۔ اتنے سارے لوگوں میں کھینچا تانی شروع ہو گئی کہ لنچ کون دے گا اور ڈنر کون۔ مسلمانوں کو کچن میں داخل ہونے سے روکنے کی پرانی روایت دم توڑ چکی تھی۔ میں جہاں بھی گیا میرا خیر مقدم خاص پنجابی مہمان نوازی کے انداز میں کیا گیا۔ ایک جلسہ عام کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں مقررین نے عظیم صوفی بابا فرید الدین گنج شکر، سکھ مت کے بانی بابا گورونانک اور دیگر روحانی شخصیات کی تعلیمات پر مبنی مشترکہ پنجاب ورثے کی بات کی۔ میں نے درخواست کی کہ مجھے اس پرانے گھر میں پہلی رات سونے دیا جائے جہاں پیدا ہوا تھا۔ وہاں کے موجودہ مالک لائل پور سے آنے والے سکھ مہاجرین کا ایک خاندان تھا۔

"میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر اپنے آبائی قصبے اور اس کے باسیوں کا کوئی قرض ہے چنانچہ میں نے ایک تعلیمی فاؤنڈیشن قائم کی جس کا نام میں نے 'منشی جی' رکھا۔ اس نام سے میرے مرحوم والد قصبے میں مشہور تھے۔ میں نے ایک معقول رقم مقامی بینک میں جمع کرا دی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ڈیپازٹ کرائی گئی رقم کے منافع سے نادار طلبا کو تعلیم جاری رکھنے کے لیے سکالرشپ جاری کیے جائیں۔ لڑکے اور لڑکیاں دونوں اس پروگرام سے استفادہ کر رہے ہیں۔ میں نے اس کے بعد املوہ کا کئی بار چکر لگایا اور ہمیشہ میرا قیام اپنے سابق کلاس فیلو اشوینی کمار کے ساتھ ہوتا ہے جس کے بچے میرا اپنے بزرگوں کی طرح خیال رکھتے ہیں۔ جرمنی میں بھارتی سفارتخانے کی طرف سے ملٹی پل ویزے کی وجہ سے اب میں برصغیر کے اپنے دورے میں دونوں طرف کے پنجاب میں ایک جتنا وقت گزار سکتا ہوں۔"

بیشتر پنجابیوں کے لیے ناپسندیدہ شخصیات

وہ چند خوش قسمت افراد جو سرحد پار کر کے پنجاب کے کسی حصے میں جاتے ہیں وہ ہمیشہ پرتپاک خیر مقدم کی کہانیاں سناتے ہیں لیکن بیشتر پنجابیوں کے لیے آبائی گھروں کو واپسی خارج از امکان ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ 1999 میں جب بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی اور وزیراعظم نواز شریف نے اعلان لاہور پر دستخط کیے تو پاکستان اور بھارت کے درمیان دوستانہ تعلقات کے دروازے کھل گئے۔ میڈیا میں یہ بات اچانک سامنے آئی کہ کئی پنجابی اپنے آبائی گھروں کو دیکھنا چاہتے تھے۔ پاکستانی اخبارات میں یہ اعلان شائع ہوا کہ مشرقی پنجاب جانے کے خواہشمند افراد ویزے کے لیے درخواستیں جمع کرا دیں تو ہزاروں افراد نے درخواستیں دے دیں۔ یہ اعلان محض جھانسہ ثابت ہوا کیونکہ پاکستان اور بھارت دونوں کی حکومتیں کنٹرول میں نرمی نہیں لانا چاہتی تھیں۔ لاہور (2004) اور موہالی (2005) میں کرکٹ میچوں کے دوران دونوں حکومتوں نے شائقین کو سرحد پار کرنے کی اجازت دے دی۔ ہزاروں افراد نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ان کا دونوں طرف پنجاب کی روایتی مہمان نوازی میں خیر مقدم کیا گیا۔ عام طور پر ایسا ممکن نہیں۔ نیچے دی گئی دو کہانیوں میں مٹی کی کشش کا ذکر کیا گیا ہے جو کبھی نہیں جاتی۔

بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر

"تقسیم کے بعد میں شیر خوار تھا اس لیے میری اس بارے میں ذاتی طور پر کوئی یادیں نہیں۔ مغلوں کے دور سے ہی ڈوگر برادری کے افراد پنجاب کے 44 متصل دیہات میں مقیم تھے اور اس علاقے کو 'ڈوگر چوتالیہ' کہا جاتا تھا۔ میرے والدین، خالائیں، چچا اور دیگر بڑے اپنی زندگی کی آخر سانس تک اپنے دیس یا دیش کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ وہاں کی اقدار، روایات، بھائی چارے کا بھی ذکر کرتے ہوئے کہتے کہ انہیں اس نئے علاقے میں وہ سب کچھ نہیں ملا جہاں انہیں جبراً جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ زمین کا جو ٹکڑا انہیں سب سے عزیز تھا وہ ضلع ہوشیارپور کی تحصیل داسویہ کا گاؤں ڈھاڈر تھا۔

'میں نے بارڈر سکیورٹی فورس کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لیے دو دفعہ جالندھر کا دورہ کیا۔ پہلی مرتبہ میں 14 سے 15 دسمبر 1994 کو اور دوسری بار 17 سے 19 دسمبر 1995 کو گیا۔ میں نے دونوں مرتبہ اپنے اس آبائی گاؤں میں جانے کی خواہش کا اظہار کیا جہاں میں 8 دسمبر 1946 کو پیدا ہوا لیکن دونوں مرتبہ میری درخواست سکیورٹی وجوہات کی بنا پر مسترد کر دی گئی۔

''اس سے بھی المناک بات یہ ہے کہ 1994 میں پہلی بار میرے ماما جی نے اپنے کلاس فیلو لیفٹیننٹ کرنل (ر) ہرگرجیت سنگھ سندھو کے لیے میرے ہاتھوں تحائف بھی بھجوائے تھے۔ دونوں ایک ہی گاؤں چک 10 بی ایل چیچہ وطنی ضلع ساہیوال کے رہنے والے تھے۔ دونوں نے جماعت اول سے دہم تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی اور دونوں بہت گہرے دوست تھے۔ ان کی اہلیہ قریبی چک 9 بی ایل کے لمبر دار کی بیٹی تھی۔ بوڑھا کرنل اب جالندھر کے ماڈل ٹاؤن میں ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ کرنل سندھو کو پہلے دن ہی میری آمد کی اطلاع مل گئی تھی کیونکہ جہاں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی وہاں کسی نے کرنل سندھو کو میرے بارے میں بتادیا تھا۔ وہ میری جائے سکونت سے چند کلومیٹر دور ہی تھا لیکن یہ درخواست بھی مسترد کر دی گئی۔ البتہ آخری روز میں نے ایک سینئر سکھ افسر وہ بھی ہندو تھا سے بات کی۔ اسے کسی طرح میرے محسوسات کی سمجھ آ گئی چنانچہ وہ مجھے وہاں لے جانے کی بجائے کرنل سندھو اور اس کی بیوی کو وہاں سے لے آیا۔ میں نے انہیں مل کر ماما جی کے تحائف دیے اور ان کا پیغام بھی پہنچایا۔ وہ نہایت متاثر ہوئے۔ وہ کرنل اپنی بیٹی اور نواسوں کو بھی لایا تھا۔ اس نے انہیں بتایا کہ آؤ تمہیں ایک ایسے خاص آدمی سے ملاؤں جو میرے وطن سے آیا ہے۔

''میری بدقسمتی ہے کہ میں یہ اچھی خبر اپنی ماں کو نہیں سنا سکا۔ (ان کا انتقال 1989 میں اس وقت ہوا تھا جب میں سیاچن کے محاذ پر کمانڈ کر رہا تھا) کہ میں ان کے آبائی گھر گیا تھا اور اپنے آباؤ اجداد کی قبریں دیکھیں تھیں اور اپنے گاؤں کو دیکھ کر پیدا ہونے والے روحانی احساسات اور جذبات بیان سے باہر ہیں۔''

ڈاکٹر اے جے مہرہ

''میں بھارتی صوبہ بہار کے چھوٹے لیکن خوبصورت قصبے ڈھیری اونسون میں پرورش پا رہا تھا تو میں نے اپنے ددھیال کے بزرگوں کی یہ کہانیاں سنیں کہ وہ سرحد پار خوبصورت قصبے چکوال سے آئے تھے۔ مہرہ کھتریوں کا عقیدہ ہے کہ ہماری ذات کا خمیر چکوال سے ہی اٹھا تھا۔ مجھے 'سرحد پار' کا مطلب چند برس میں سمجھ آیا جب میں کچھ سمجھدار ہوا اور 1947 میں 'تقسیم' کے بارے میں پڑھا۔ پھر بھی مجھے چکوال کا یا ان حالات کا پتہ نہیں تھا جن کے باعث ہمارے بڑے پنجاب سے بنگال آئے۔ جس کا ان دنوں بہار بھی حصہ تھا۔ بظاہر میرے پر دادا کو بہار پولیس میں ملازمت ملی اور بعد ازاں پورا خاندان وہاں منتقل ہو گیا۔ میرے ددھیال میں سے موجودہ نسل کے کسی فرد نے چکوال نہیں دیکھا تھا۔

''چنانچہ جب مجھے 2003 میں قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد نے 'جنوبی ایشیا میں فرقہ وارانہ تصادم' کے موضوع پر کانفرنس میں مدعو کیا تو مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ مجھے امید پیدا ہوئی کہ بالآخر میں اپنے آباؤ اجداد کے شہر چکوال جانے کی خواہش پوری کر سکوں گا لیکن 2003 پاکستان اور بھارت کے باسیوں کے لیے ایک دوسرے کے ملک جانے کے حوالے سے برا وقت تھا۔ 2001 میں بھارتی پارلیمنٹ پر دہشت گردوں کے حملوں کے بعد دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کی حدود میں پروازیں بند کر دی تھیں۔ سفارتی تعلقات کشیدگی کا شکار تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں معمول سے زیادہ مشکل طریقے سے ویزا ملنا تھا۔ ویزے کے لیے مجھے دہلی کے چانکیہ پوری علاقے میں ڈپلومیٹک انکلیو میں بلند دیواروں والی پاکستانی ہائی کمیشن کی عمارت میں جانا پڑا۔ خوش قسمتی سے میں ہائی کمیشن کے ایک اعلیٰ ترین افسر جو کہ دراصل سفارتکاری کی سروس میں جونیئر

ترین تھے سے ملنے میں کامیاب ہو گیا اور ویزے کے بارے میں بتایا۔ وہ ایک شائستہ انسان تھا اور کہا کہ ویزے کے لیے اسے وزارت داخلہ سے کلیرنس لینی پڑے گی جو کبھی نہ مل سکی۔ آخر کار پاکستان کے میرے تین میزبانوں کے زور پر اس نے مجھے اگلے روز ہائی کمیشن کا دفتر 5 بجے بند ہونے سے چند لمحے قبل ویزا جاری کر دیا۔

''البتہ بھارت اور پاکستان دونوں ایک دوسرے کے شہریوں سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے صرف مخصوص شہروں کا ویزہ دیتے ہیں۔ مجھے صرف اسلام آباد کے لیے ویزہ جاری ہوا۔ میں نے درخواست کی کہ مجھے کم از کم چکوال اور لاہور جانے کی ہی اجازت دے دیں لیکن اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ''اس بار اسلام آباد ہو آئیے، اگلی بار سارا پاکستان گھما دیں گے۔

''میرے میزبان چاہتے تھے کہ وہ مجھے اسلام آباد سے صرف 60 کلومیٹر دور چکوال لے جائیں لیکن کچھ ہچکچاہٹ کا بھی شکار تھے۔ اگر پولیس یا سکیورٹی والے چیک کر لیتے تو ہم دونوں مشکل میں پڑ جاتے۔ چنانچہ میں چکوال نہ جا سکا۔ مجھے اب بھی امید ہے کہ میں جب بھی ممکن ہوا تو اگلی بار چکوال جا سکوں گا۔ اس شہر کے بارے میں میں نے چکوالیوں سے بہت کچھ سن رکھا ہے۔''

بدقسمتی سے پاکستان نژاد افراد قطع نظر اس بات کے کہ وہ 1947 سے پہلے پیدا ہوئے یا بعد میں کو بھارت کا ویزہ جاری نہیں کیا جاتا۔ جب سے پاکستان سے مبینہ تعلق رکھنے والے دہشت گردوں نے ممبئی میں 26 نومبر 2008 کو حملے کیے (173 بے گناہ افراد ہلاک ہوئے) اس وقت سے پاکستانیوں کو ملٹی پل ویزہ جاری نہیں کیا جا رہا۔

انسانی فطرت اور شناخت

اوپر کی گئی بحث کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ انسانی فطرت بنیادی طور پر خود غرض، مشکوک اور جارحانہ نہیں جیسا کہ نفسیات دان ہوبز سمجھتا ہے۔ اسی طرح اس پر کسی تحفظات کے بغیر اعتماد کرنا یا دوسروں کے کام آنے کی امید رکھنا بھی ممکن نہیں۔ بلکہ تمام تر حالات میں بقائی جبلت سب سے اہم ثابت ہوتی ہے جس کا اندازہ معروضی صورتحال میں اعتماد، یکجہتی اور اسکے ساتھ ساتھ بداعتمادی اور تصادم سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی شناخت کثیر الجہات ہوتی ہے تو یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ اگرچہ ہندو، مسلم اور سکھ مذہبی شناختیں ایک دوسرے کے ساتھ پر امن طریقے سے رہنے سے نہیں روکتی تھیں لیکن ذات برادری کے تعصب اور معاشی عدم مساوات کے عناصر سے کشیدگی ضرور پیدا ہوئی۔ ان عوامل کو مد نظر رکھ کر ایسا سیاسی فارمولہ تیار کیا جا سکتا تھا جو اختلاف کو کم کرنے اور مشترک ثقافت اور روایت کے فروغ میں معاون ہو سکتا تھا لیکن 1947 میں اس کی جگہ تشدد اور جارحیت پھیل گئی کیونکہ تینوں مذاہب کے رہنما انتقال اقتدار کا بہتر فارمولہ تیار کرنے میں ناکام رہے تھے۔

پنجاب لہولہان، منقسم اور نسل کشی کا مرکز

ریڈکلف ایوارڈ کی طرف سے 17 اگست 1947 کو متنازعہ بین الاقوامی سرحد کے اعلان سے دونوں ملکوں میں تلخی نے جنم لیا۔ 1950 میں لیاقت نہرو معاہدے سے نہ صرف سرحدوں کے از سر نو تعین کا باب بند ہو گیا بلکہ ان سکھوں، مسلمانوں

اور ہندوؤں کے لیے بھی اپنے گمشدہ گھروں میں جانا ناممکن ہو گیا جو 1947 کی شورش کے نتیجے میں بے گھر ہوئے تھے۔ البتہ 1965 اور 1971 کی جنگوں تک دونوں ملکوں کے درمیان دو طرفہ تنازعے نے روایتی تعلقات کو متاثر نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد چند ہی ایسے مواقع آئے جب دونوں طرف کے لوگ آزادانہ دوسری طرف سرحد پار کر کے جا سکے ہوں۔ یہ مواقع بھی کرکٹ میچوں کے دوران میسر آئے۔ لاہور اور امرتسر کے درمیان بس سروس بھی بنیادی طور پر سکھ زائرین کے لیے شروع کی گئی۔ ورنہ مجموعی طور پر سرکاری سطح پر ایک دوسرے کو مسترد کرنے کا وطیرہ نظر آتا ہے۔ اس کی سب سے بہترین مثال واہگہ اٹاری بارڈر پر پرچم کشائی کی تقریب ہے۔ ہر شام سرحدی محافظ اور فوجی جارحانہ انداز میں پرچم کشائی کے بعد ایسے طریقے سے گیٹ بند کرتے ہیں جس سے صاف پیغام ملتا ہے کہ دونوں ملکوں اور ان کے عوام کے درمیان ناقابل گزر بیریئر موجود ہے۔ ہر شام ایک دوسرے کو مسترد کرنے کی اس تقریب کو دونوں طرف کے لوگ بڑے مجمع کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ تالیاں بجا کر اور نعرے لگا کر جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ حالیہ عرصے میں یہاں اگرچہ جارحانہ انداز کی شدت کم ہوئی ہے اور اب اسے زیادہ تر تفریح کے طور پر لیا جاتا ہے لیکن دونوں پنجاب اب بھی ایک دوسرے کی پہنچ سے دور ہیں۔

انٹرویوز

اندر کمار گجرال، نئی دہلی، 9 اکتوبر 1992

شیلا گجرال، نئی دہلی، 9 اکتوبر 1992

راج ببر، ممبئی، 20 اکتوبر 2001

سنیل دت، ممبئی، 20 اکتوبر 2001

ڈاکٹر خوشی محمد خان، اسٹاک ہوم، 16 جون 2003

امجد بابر، واشنگٹن ڈی سی، 11 جولائی 2009

مونی چڈا، دہلی سے بذریعہ ای میل، 28 دسمبر 2010

بریگیڈیر یعسوب علی ڈوگر، لاہور سے بذریعہ ٹیلی فون اور ای میل، 13 جنوری 2011

ڈاکٹر اجے مہتہ، یوپی سے بذریعہ ٹیلی فون اور ای میل، 20 فروری 2011

مشتاق احمد، اسٹاک ہوم، 16 جون 2003

رچنا آنند، سنگاپور سے بذریعہ ای میل، 21 فروری 2011

References

Ahmed, Ishtiaq, *State, Nation and Ethnicity in Contemporary South Asia*, London and New York: Pinter, (1998).

Ahmed, Ishtiaq, *'The Lahore Effect'*, *Seminar*, Number 567, November, New Delhi, (2006).

Ahmed, Ishtiaq, *'The Spectre of Islamic Fundamentalism over Pakistan (1947-2007)'* in Rajshree Jetly (ed.), *Pakistan in Regional and Global Politics*, London, New York, New Delhi: Routledge, (2009).

Maini, Tridivesh Singh. *South Asian Cooperation and the Role of the Two Punjabs*. New Delhi: Siddharth Publications, (2007).

Puri, Rajinder, *'What it's all about?'* in Amrik Singh (ed.), Punjab in *Indian Politics: Issues and Trends*, New Delhi: Ajanta Books International.

Government Publications

Mansergh, Nicholas and Moon, Penderel (eds), *The Transfer of Power 1942-7*, Vol. XI, *The Mountbatten Viceroyalty: Announcement and Reception of the 3 June Plan, 31 May – 7 July 1947*, London: Her Majesty's Stationery Office (1982).

Report of the Court of Inquiry constituted under Punjab Act II of 1954 to enquire into the Punjab Disturbances of 1953, Lahore, (1954).

List of Members of the Punjab Legislative Assembly 21 March 1946 to 4 July 1947

SPEAKER
Diwan Bahadur S. P. Singha, M.A., LL.B.
(West Central Punjab — Indian Christian)
(21 March 21 1946 to 4 July 1947)

DEPUTY SPEAKER
Sardar Kapur Singh, B.A., LL.B.
(Ludhiana East — Sikh, Rural)
(26 March 1946 to 4 July 1947)

PREMIER
Malik Sir Khizr Hayat Khan Tiwana, K.C.S.I., O.B.E. (Khushab — Muhammadan Rural), (21 March 1946 to 2 March 1947)

MINISTERS (Cabinet dissolved after Governor's rule imposed on 5 March 1947)

1. Chaudhri Lahri Singh, B.A., LL.B. (Rohtak North — General, Rural) — Minister of Public Works
2. Mian Muhammad Ibrahim Barq (Alipur — Muhammadan, Rural) — Minister of Education
3. Mr. Bhim Sen Sachar, B.A., LL.B. (Lahore City — General, Urban) — Finance Minister
4. Nawab Sir Muzaffar Ali Qizilbash (Lahore — Muhammadan, Rural) — Minister of Revenue
5. Sardar Baldev Singh (Ambala North — Sikh, Rural) — Minister of Development

MEMBERS

1. Abdul Ghafur Khan, Chaudhri (Shakargarh — Muhammadan, Rural)
2. Abdul Hameed Khan, Khan Sahib Sardar (Muzaffargarh — Muhammadan, Rural)
3. Abdul Hamid Khan, Rana, B.A., LL.B. (Pakpattan — Muhammadan, Rural)
4. Abdul Hamid Khan, Sufi (Karnal — Muhammadan, Rural)
5. Abdul Haq, Mian (Okara — Muhammadan, Rural)
6. Abdul Sattar Khan, Mr. (Mianwali North — Muhammadan, Rural)
7. Ahmad Jan, Maulvi (North-West Gurgaon — Muhammadan, Rural)
8. Ajit Singh, Sardar (South-West Punjab — Sikh, Rural)
9. Akram Ali Khan, Chaudhri (Taran Taran — Muhammadan, Rural)
10. Ali Akbar Khan, Chaudhri (Kangra and Eastern Hoshiarpur — Muhammadan, Rural)
11. Allah Bakhsh Khan Tiwana, K.B. Nawab Malik Sir, M.B.E. (Sargodha — Muhammadan, Rural)
12. Allah Yar Khan Daultana, Khan Bahadur Mian (Mailsi — Muhammadan, Rural)
13. Anwar Khan, Rai (Jaranwala — Muhammadan, Rural)
14. Asghar Ali, Khan Sahib Captain Chaudhri (Gujrat East — Muhammadan, Rural)
15. Ashiq Hussain, Major Nawab, M.B.E. (Multan — Muhammadan, Rural)
16. Ashiq Hussain, Sayed (Dipalpur— Muhammadan, Rural)

17. Atta Muhammad Khan, Sardar, B.A., LL.B. (Dera Ghazi Khan North — Muhammadan, Rural)
18. Aziz Din, Chaudhri (Lyallpur — Muhammadan, Rural)
19. Bachan Singh, Sardar (Ludhiana Central — Sikh, Rural)
20. Badlu Ram, Chaudhri (Rohtak Central — General, Rural)
21. Bagh Ali, Mian (Fazilka — Muhammadan, Rural)
22. Bahadur Khan Dreshak, Sirdar, M.B.E. (Dera Ghazi Khan South — Muhammadan, Rural)
23. Bahawal Bakhsh, Chaudhri (South-East Gujrat — Muhammadan, Rural)
24. Barkat Ali, Malik (Eastern Towns — Muhammadan, Urban)
25. Barkat Hayat Khan, Sardar (North Punjab — Labour)
26. Bashir Ahmad, Mian, Bar-at-Law (Ferozepore East — Muhammadan, Rural)
27. Behari Lal Chanana, Lala (South-East Multan Division — General, Rural)
28. Beli Ram, Thakur, B.A., LL.B. (Kangra East — General, Rural)
29. Bhagat Ram Sharma, Pandit, B.A., LL.B. (Kangra West — General, Rural)
30. Bhagwan Das, Lala (Commerce and Industry)
31. Budhan Shah, Pir (Khanewal — Muhammadan, Rural)
32. Dalip Singh Kang, Sardar (Lyallpur East — Sikh, Rural)
33. Dalip Singh, Thakur (Kangra South — General, Rural)
34. Daud Ghaznavi, Maulana (East Punjab — Labour)
35. Dev Raj Sethi, Mr. (Lyallpur and Jhang — General, Rural)
36. Durga Chand Kaoshish, Pandit (East Punjab — Landholders)
37. Faiz Muhammad, Khan Bahadur Shaikh, B.A., LL.B., M.B.E. (Dera Ghazi Khan Central — Muhammadan, Rural)
38. Faqir Chand, Pandit (West Lahore Division — General, Rural)
39. Fateh Muhammad Sayyal, Chaudhri, M.A. (Batala — Muhammadan, Rural)
40. Fazal Elahi, Chaudhri (Gujrat North — Muhammadan, Rural)
41. Fazal Elahi, Mr. (East Central Punjab — Indian Christian)
42. Fazal Haq Piracha, Khan Bahadur Sheikh (Bhalwal — Muhammadan, Rural)
43. Ganga Saran, Rai Bahadur Lala (Trade Union Labour)
44. Ghazanfar Ali Khan, Raja (Pind Dadan Khan — Muhammadan, Rural)
45. Ghulam Farid, Chaudhri, B.A., LL.B. (Gurdaspur East — Muhammadan, Rural)
46. Ghulam Muhammad Shah, Syed (Jhang East — Muhammadan, Rural)
47. Ghulam Mustafa Shah Jilani, Khan Sahib Makhdum Sayed (Lodhran — Muhammadan, Rural)
48. Ghulam Rasul, Chaudhri (South West Gujrat — Muhammadan, Rural)
49. Ghulam Samad, K. S. Khawaja (Southern Towns — Muhammadan, Urban)
50. Gibbon, Mr., C. E. (Anglo Indian)
51. Gopi Chand Bhargava, Dr. (University)
52. Guest, Mr. P. H. (European)
53. Gurbachan Singh Bajwa, Sardar, B.A., LL.B. (Sialkot — Sikh, Rural)
54. Gurbachan Singh, Sardar (Ferozepore West — Sikh, Rural)
55. Gurbanta Singh, Master (Jullundur General — Rural, Reserved Seat)
56. Harbhaj Ram, Chaudhri (Lyallpur and Jhang — General, Reserved Seat)
57. Hari Lal, Munshi, B.A. (Hons), LL.B. (South-West Towns — General)
58. Iftikhar Hussain Khan, Nawab (Ferozepore General — Muhammadan, Rural)

59. Inder Singh, Sardar (Eastern Town — Sikh, Rural)
60. Isher Singh Majhail, Sardar (Amritsar North — Sikh, Rural)
61. Jagdish Chander, Mr. (Karnal North — General, Rural)
62. Jagjit Singh Mann, Sardar (Central Punjab — Landholders)
63. Jahan Ara Shah Nawaz, Begum, M.B.E. (Outer Lahore — Muhammadan, Women, Urban)
64. Jahan Khan, Chaudhri (North-West Gujrat — Muhammadan, Rural)
65. Jaswant Singh, Sardar (North-West Punjab — Sikh, Rural)
66. Jiwan Lal, Pandit (South-East Gurgaon — General, Rural)
67. Jogindar Singh Mann, Sardar, M.B.E. (Gujranwala and Shahdara — Sikh, Rural)
68. Kabul Singh, Sardar (Jullundur East — Sikh, Rural)
69. Kale Khan, Raja (Rawalpindi East — Muhammadan, Rural)
70. Karamat Ali, K.B. Sheikh, B.A., LL.B. (North-Eastern Towns — Muhammadan, Urban)
71. Kartar Singh, Sardar (Lyallpur West — Sikh, Rural)
72. Kehar Singh, Sardar (Jagraon — Sikh, Rural)
73. Khair Mehdi Khan, Raja (Jhelum — Muhammadan, Rural)
74. Khan Muhammad Khan Kathia, Mehr (Montgomery — Muhammadan, Rural)
75. Kidar Nath Sehgal, Lala (Amritsar and Sialkot — General)
76. Krishna Gopal Dutt, Chaudhri (North-Eastern Towns — General)
77. Lehna Singh Sethi, Dr. (North Western Towns — General, Urban)
78. Man Singh Jathedar, Sardar (Sheikhupura West — Sikh, Rural)
79. Mangoo Ram, Chaudhri (Hoshiarpur West — General, Rural, Reserved Seat)
80. Manuel, Mr. P (Anglo-Indian)
81. Matu Ram, Chaudhri (Ludhiana and Ferozepore — General, Reserved Seat)
82. Mehr Chand, Chaudhri (Hoshiarpur West — General, Reserved Seat)
83. Mehtab Khan, Chaudhri (South East Gurgaon — Muhammadan, Rural)
84. Mir Muhammad Khan, Rai (Samundri — Muhammadan, Rural)
85. Mohan Lal, Mr. (Una — General, Rural)
86. Mohar Singh, Rao Sahib Rao, B.A., LL.B. (North-West Gurgaon — General, Rural)
87. Mohy-ud-Din Lal Badshah, Sayed (Attock South — Muhammadan, Rural)
88. Mubarik Ali Shah, Major Sayed (Jhang Central — Muhammadan, Rural)
89. Muhammad Abdullah Khan Sahib, Mir (Mianwali South — Muhammadan, Urban)
90. Muhammad Abdus Salam, Mian (Jullundur North — Muhammadan Rural)
91. Muhammad Amin, K. S. Sheikh (Multan Division Towns — Muhammadan, Urban)
92. Muhammad Arif Khan, Khan (Jhang West — Muhammadan, Rural)
93. Muhammad Feroz Khan Noon, Malik Sir, K.C.S.I., K.C.I.E. (Rawalpindi Division Towns — Muhammadan, Urban)
94. Muhammad Ghulam Jilani Gurmani, Mian (Muzaffargarh North — Muhammadan, Rural)
95. Muhammad Hassan, Chaudhri (Ambala and Simla — Muhammadan, Rural)
96. Muhammad Hussain, Chaudhri, B.A., LL.B. (Sheikhupura — Muhammadan, Rural)
97. Muhammad Hussain, Sardar (Chunian — Muhammadan, Rural)
98. Muhammad Iftikhar-ud-Din, Mian, B.A. (Oxon) (Kasur — Muhammadan, Rural)
99. Muhammad Iqbal Ahmad Khan, Rai (Ludhiana — Muhammadan, Rural)
100. Muhammad Jamal Khan Leghari, Khan Bahadur Nawab Sir (Tumandar)

101. Muhammad Khurshid Khan, Rao, B.A., LL.B. (Rohtak — Muhammadan, Rural)
102. Muhammad Nawaz Khan, Lt Col Sardar Sir, K.C.I.E. (Attock Central — Muhammadan, Rural)
103. Muhammad Nur Ullah, Mian (Toba Tek Singh — Muhammadan, Rural)
104. Muhammad Rafiq, Mian (Outer Lahore — Muhammadan, Urban)
105. Muhammad Raza Shah Jilani, Haji Mukhdumzada Syed (Shujabad, -- Muhammadan, Rural)
106. Muhammad Sarfraz Ali Khan, Raja (Chakwal — Muhammadan, Rural)
107. Muhammad Sarfraz Khan, Chaudhri (Sialkot Central — Muhammadan, Rural)
108. Mumtaz Ali Khan, Sardar, B.A., LL.B. (Attock North — Muhammadan, Rural)
109. Mumtaz Muhammad Khan Daulatana, Mian (Sialkot South — Muhammadan, Rural)
110. Narindar Singh, Sant (Montgomery East — Sikh Rural)
111. Narotam Singh, Sardar, B.A., LL.B. (South-East Punjab — Sikh, Rural)
112. Nasar Din, Chaudhri, B.A., LL.B. (Sialkot North — Muhammadan, Rural)
113. Nasarullah Khan Nasir, Rana (Hoshiarpur West — Muhammadan, Rural)
114. Nasarullah Khan, Chaudhri (Amritsar — Muhammadan, Rural)
115. Nau Bahar Shah, Sayyed (Kabirwala -- Muhammadan, Rural)
116. Pancham Chand, Thakur, B.A., LL.B. (Kangra North — General, Rural)
117. Parbodh Chandar, Mr. (Gurdaspur -— General, Rural)
118. Parkash Kaur, Shrimati Dr. (Amritsar — Sikh Women)
119. Partap Singh, Sardar, M.A. (Amritsar South — Sikh, Rural)
120. Piara Singh, Sardar (Hoshiarpur South — Sikh Rural)
121. Prem Singh, Chaudhri (South-East Gurgaon — Reserved Seat)
122. Prem Singh, Mahant (Gujrat and Shahpur — Sikh, Rural)
123. Prithvi Singh Azad, Sardar (Ambala and Simla — Reserved Seat)
124. Raj Muhammad Khan, Chaudhri (Hafizabad -— Muhammadan, Rural)
125. Ram Sharma Pandit, Shri (Southern Towns — General, Urban)
126. Rameshawari Nehru, Mrs. (Lahore City — General, Women, Urban)
127. Ranbir Singh Mehta, Mr. (Ludhiana and Ferozepore — General, Rural)
128. Ranjit Singh, Chaudhri (Hissar South — General, Rural)
129. Rattan Singh Tabib, Chaudhri (Ambala and Simla — General, Rural)
130. Rattan Singh, Sardar (Ferozepore East — Sikh, Rural)
131. Rattan Singh, Sardar (Ferozepore North — Sikh, Rural)
132. Roshan Din, Khan Bahadur Chaudhri (Shahdara — Muhammadan, Rural)
133. Sadiq Hasan, Sheikh (Amritsar City — Muhammadan, Rural)
134. Sahib Dad Khan, Khan Sahib Chaudhri, B.A., LL.B. (Hissar — Muhammadan, Rural)
135. Sahib Ram, Chaudhri (Hissar North — General, Rural)
136. Said Akbar Khan, Raja, B.A., LL.B. (Gujjar Khan — Muhammadan, Rural)
137. Sajjan Singh Margindpuri, Sardar (Kasur — Sikh, Rural)
138. Salah-ud-Din, Chaudhri (Gujranwala North — Muhammadan, Rural)
139. Samar Singh, Chaudhri (Karnal South — General, Rural)
140. Sant Ram Seth, Dr. (Amritsar City — General, Urban)
141. Sant Ram, Mr. (Jullundur General -- Reserved Seat)
142. Sardul Singh, Sardar (Lahore West — Sikh, Rural)
143. Shahadat Khan, Rai (Nankana Sahib — Muhammadan, Rural)
144. Shanno Devi Sehgal, Shrimati (South-Eastern Towns — General, Urban)

145. Shaukat Hayat Khan, Sardar (South Eastern Towns — Muhammadan, Urban)
146. Sher Singh, Chaudhri (Jhajjar — General, Urban)
147. Shiv SaranSingh, Sardar (Kangra and Northern Hoshiarpur – Sikh, Rural).
148. Shiv Singh, Sardar (Gurdaspur North — Sikh, Rural)
149. Sudarshan Seth, Mr. (Eastern Town — General, Urban)
150. Sultan Ali Nangiana, K.B. Mian (Shahpur — Muhammadan, Rural)
151. Sundar Singh, Chaudhri (Amritsar and Sialkot — General, Reserved Seat)
152. Sundar, Mr. (Karnal North — Reserved Seat)
153. Suraj Mal, Rao Bahadur Chaudhri, B.A., LL.B. (Hansi — General, Rural)
154. Swaran Singh, Sardar, B.A., LL.B. (Jullundur West - - Sikh, Rural)
155. Tara Singh, Sardar Sahib Sardar (Ferozepore South — Sikh, Rural)
156. Tasadaq Hussain, Begum (Inner Lahore — Muhammadan, Women, Urban)
157. Tilak Raj, Professor, M.A. (Rawalpindi Division — General, Rural)
158. Udham Singh, Sardar (Amritsar Central — Sikh, Rural)
159. Ujjal Singh, Sardar (Western Towns — Sikh, Urban)
160. Virendra, Mr. (West Multan Division — General, Rural)
161. Wali Muhammad Gohir, Chaudhri (Jullundur South — Muhammadan, Rural)
162. Waryam Singh, Sardar (Batala — Sikh, Rural)
163. Wazir Muhammad, Malik (Inner Lahore — Muhammadan, Urban)
164. Zafar-ul-Haq, Chaudhri (Rawalpindi Sadar — Muhammadan, Urban)
165. Zafarullah Khan Jhanian, Chaudhri (Ajnala — Muhammadan, Rural)
166. Zafarullah Khan, Chaudhri (Gujranwala East — Muhammadan, Rural)

Bibliography

Books

Abisaab, R., *Converting Persia: Religion and Politics in the Safavid Empire, London: I.B. Tauris*, (2004).

Adeeb, Y., *Mera Shehr Lahore* (My City of Lahore), Lahore: Atish Fishan Publications, (1991).

Afzal, Muhammad, *Dastan-e-Sandham (*The Story of Sandham), Islamabad: Chaudhry Muhammad Ajmal (no date given).

Ahmad, Saeed, *Great Sufi Wisdom: Bulleh Shah*, Islamabad: Saeed Ahmad, (2004).

Ahmed, Ishtiaq, 'Sikh Separatism in India and the Concept of Khalistan' in Haellquist, K. R. (ed.), *NIAS Report 1990*, Copenhagen: Nordic Institute of Asian Studies, (1990).

Ahmed, Ishtiaq, *State, Nation and Ethnicity in Contemporary South Asia*, London and New York: Pinter, (1996, 1998).

Ahmed, Ishtiaq, 'The 1947 Partition of Punjab: Arguments put Forth before the Punjab Boundary Commission by the Parties Involved' in Ian Talbot and Gurharpal Singh (eds*), Region and Partition: Bengal, Punjab and the Partition of the Subcontinent*, pp. 116-167, Karachi: Oxford University Press, (1999).

Ahmed, Ishtiaq, 'Let's not forget Jallianwala Bagh', Lahore: *Daily Times*, (13 April 2003).

Akbar, M. J., *India: The Siege Within*, Harmondsworth: Penguin Books, (1985).

Alhaq, Shuja, *A Forgotten Vision: A Study of Human Spirituality in the Light of the Islamic Tradition*, Chippenham, Wiltshire: Minerva Books, (1996).

Ali, Chaudhri Muhammad, *The Emergence of Pakistan*, Lahore: Research Society of Pakistan, (1973).

Ali, Ikram, *History of the Punjab (1799-1947)*, Delhi: Low Price Publication, (1970).

Ali, Imran, *The Punjab under Imperialism 1885-1947*, Karachi: Oxford University, (1989).

Allana, G. (ed.), *Pakistan Movement: Historic Documents*, Lahore: Islamic Book , (1977).

Anand, Som, *Lahore: Portrait of a Lost City*, Lahore: Vanguard Books Ltd, (1998).

Ashraf, Agha, *Aik Dil Hazaar Dastan* (One Heart and a Thousand Stories), Lahore: Atish Fishan Publications, (1989).

Azad, Maulana Abul Kalam, *India Wins Freedom*, Lahore: Vanguard Books Pvt., (1989).

Aziz, Khursheed Kamal (ed.), *Complete Works of Rahmat Ali*, Islamabad: National Commission on Historical and Cultural Research, (1978).

Aziz, Khursheed Kamal, *The Murder of History*, Lahore: Vanguard Books, (1993).

Aziz, Khursheed Kamal, History of Partition of India, Vol. I, New Delhi: Atlantic Publishers and Distributors, (1995).

Bakshi, S. R. (compiler), *The Making of India and Pakistan: Ideology of the Hindu Mahasabha and other Political Parties*, Vol. III, New Delhi, Deep & Deep Publications, (1997).

Bashir, Ahmad, *Dil Bhatkay Ga* (The Heart will go Astray), Lahore: Ferozsons, (2003).

Batalvi, Ashiq Hussain, *Hamari Qoumi Jidojehed* (Our National Struggle), Lahore: Pakistan Times Press, (no year of publication given).

Bell-Fialkoff, A, *Ethnic Cleansing*, New York: St. Martin's Press, (1999).

Bhatia, S., *Social Change and Politics in Punjab: 1898-1910*, New Delhi: Enkay Publishers Pvt. Ltd, (1987).

Brass, Paul, *Ethnicity and Nationalism: Theory and Practice*, New Delhi: Sage Publications, (1991).

Browning, C. R.,*The Path to Genocide*, Cambridge: Cambridge University Press, Canto edition, (1995).

Burki, Shahid Javed, *Pakistan under Bhutto, 1971-1977*, New York: St. Martin's, (1980.)

Butalia, Urvashi., *The Other Side of Silence: Voices from the Partition of India*, New Delhi: Penguin Books, (1998).

Chandra, Prabodh (compiler), *Rape of Rawalpindi*, Lahore: 'The Punjab Riots Sufferers' Relief Committee, (1947).

Chaudhry, Nazir Ahmed, *Development of Urdu as Official Language in the Punjab (1849-1974)*, Lahore: Government of the Punjab, (1977).

Chalk, F., and K. Jonassohn, *The History and Sociology of Genocide: Analysis and Case Studies*, New Haven and London: Montreal Institute of Genocide Studies and Yale University Press, (1990).

Chughtai, Hakim Muhammad Tariq Mehmood Abqary Mujadidi (compiler and editor), *1947 ke Muzalim ki Kahani khud Muzlumon ki Zabani* (The Story of the 1947 Atrocities from the Victims Themselves), Lahore: Ilm-o-Irfan Publishers, (2003).

Collins, Larry and Dominique Lapierre, *Freedom at Midnight*, New York: Avon Books, (1975).

Connor, W., *Ethnonationalism: The Quest for Understanding*, Princeton: Princeton University Press, (1994).

Darling, S. M., *The Punjab Peasant in Prosperity and Debt*, New Delhi: Manohar Book Service, (1978).

Farquhar, J. N., *Modern Religious Movements in India*, Delhi: Munshiram Manoharlal, (1967).

Gardezi, H. N., *Chains to Lose, Life Struggles of a Revolutionary: Memoirs of Dada Amir Haider Khan*, New Delhi: Patriot Publishers, (1989).

Geertz, C. (ed.), *Old Societies and New States*, New York: The Free Press, (1963).

Robert Gellately and Ben Kiernan (eds), *The Specter of Genocide: Mass Murder in Historical Perspective*, Cambridge: Cambridge University Press, (2003).

Gillmartin, David, *Empire and Islam: Punjab and the Making of Pakistan*, Delhi: Oxford University Press, (1989).

Gopal, M., *Sir Chhotu Ram: A Political Biography*, New Delhi: B. R. Publications, (1988).

Gujral, Inder Kumar, *Matters of Discretion: an autobiography*, New Delhi: Hay House India, (2011).

Gujral, Satish., *A Brush with Life: An Autobiography*, Delhi: Viking Books, (1997).

Gutman, R., *A Witness to Genocide*, Shaftesburg, Dorset: Element Book, (1993).

Hamid, Shahid (Maj. Gen [Retd]), *Disastrous Twilight*, London: Lee Cooper, (1986).

Hansen, Anders Bjorn, *Partition and Genocide: Manifestation of Violence in Punjab 1937-1947*, New Delhi: India Research Press, (2002).

Hasan, Mushirul, *India Partitioned: the Other Face of Freedom*, Vol. II, New Delhi: Lotus Collection, Roli Books, (1995).

Hobbes, Thomas, *Leviathan*, London: Penguin Classics, (1985).

Husain, Azim., *Mian Fazl-i-Husain: Glimpses of Life and Works 1898-1936*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, (no date of publication given).

Husain, Syed Wajahat (Major General), *Memories of a Soldier: 1947 – Before During After*, Lahore: Ferozsons (Pvt) Ltd., (2010).

Ibbetson, S. D., *Punjab Castes*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, (1994).

Iftikhar, Khawaja, *Jabb Amritsar Jall Raha Tha* (When Amritsar was Burning), Lahore: Khawaja Publishers, (1991).

Jalal, Ayesha, *The Sole Spokesman*, Cambridge: Cambridge University Press, (1985).

Jetly, Rajshree (ed.), *Pakistan in Regional and Global Politics*, London, New York, New Delhi: Routledge, (2009).

Jonassohn, K., and Björnson, K. S., *Genocide and Gross Human Rights Violations*, New Brunswick and London: Transaction Publishers, (1999).

Jones, K. W., *Arya Dharm: Hindu Consciousness in 19th-Century Punjab*, Delhi: Manohar, (1989a).

Jones, K. W., *The New Cambridge History of India: Socio-Religious Reform Movements in British India*, Cambridge University Press, Cambridge, (1989b).

Jonsson, G. (ed), East Timor: *Nationbuilding in the 21st Century*, Stockholm: Centre for Pacific Asian Studies, (2003).

Josh, Bhagwan, *Communist Movement in Punjab (1926-47)*, Delhi: Anupama Publications, (1979).
Khan, Fazal Muqeem Khan (Major-General), *The Story of the Pakistan Army*, Karachi, Karachi: Oxford University Press, (1964).
Kholi, S. S., *The Life and Ideals of Guru Gobind Singh*, Delhi: Munshiram Manoharlal, (1986).
Jonassohn, K., and Björnson, K. S., Genocide and Gross Human Rights Violations, New Brunswick and London: Transaction Publishers, (1999).
Jonsson, G. (ed), *East Timor: Nationbuilding in the 21st Century*, Stockholm: Centre for Pacific Asian Studies, (2003).
Kellas, J.G., *The Politics of Nationalism and Ethnicity*, New York: St Martin's , (1998).
Kecmanovic. D. The Mass Psychology of Ethnonationalism, New York and London: Plenium Press, (1996).
Khan, Muhammad Ayub, *Tarikh-i-Pakistan Aur Jullundur* (The Pakistan Movement and Jullundur), Lahore: Asatair, (2002).
Khosla, Gopal Das, *Stern Reckoning: A Survey of the Events Leading Up To and Following the Partition of India*, New Delhi: Oxford University Press, (1989, first published in 1949).
Kuper, Leo, *Genocide*, New Haven and London: Yale University Press, (1982).
Lahori, Tahir. *Sohna Shehr Lahore* (The Lovely City of Lahore), Lahore; Sang-e-Meel Publications, (1994).
Lake, D. A. and D. Rothchild. (eds). *The International Spread of Ethnic Conflict*, Princeton: Princeton University Press, (1998).
Lamb, Alastair. *Incomplete Partition: The Genesis of the Kashmir Dispute 1947-1948*, Hertingfordburg, Hertfordshire: Roxford Books, (1997).
Lang, B., *Act and Idea in the Nazi Genocide*, Syracuse: Syracuse University Press, (2003).
Leigh, M. S.,*The Punjab and the War*. Lahore: Government Printing Press, (1922).
Maini, Tridivesh Singh, *South Asian Cooperation and the Role of the Two Punjabs*, New Delhi: Siddharth Publications, (2007).
Malhotra, Dina Nath, *Dare to Publish*, New Delhi, (2004).
Malik, M. A., *The Making of the Pakistan Resolution*, Karachi: Oxford University, (2001).
Mann, M., *The Dark Side of Democracy: Explaining Ethnic Cleansing*, Cambridge: Cambridge University Press, (2005).
Melson, R., *Revolution and Genocide: On the Origins of the Armenian Genocide and the Holocaust*, Illinois: University of Chicago Press, (1992).
Menon, Ritu and Bhasin, Kamla, *Borders and Boundaries: Women in India's Partition*, New Delhi: Kali for Women, (1998).
Mittal, G., *Lahore ka jo Zikr Kiya: Aap Biti* (Remembering Lahore: An Autobiography), Lahore: Book Home, (2003).
Moon, Penderel, *Divide and Quit*, New Delhi: Oxford University Press, (1998).
Munir, Muhammad. *From Jinnah to Zia*. Lahore: Vanguard Books Ltd, (1980).
Nagina, Z. I., *Ghazi Ilam Din Shaheed*, Lahore; Jang Publishers Press, (1988).
Naimark, N. M., *Fires of Hatred: Ethnic Cleansing in the Twentieth Century Europe*, Cambridge Mass., London: Harvard University Press, (2001).
Nevile, Pran, *Lahore, a Sentimental Journey*, Delhi and Karachi: Allied Publishers, (1993).
Modern Asian Studies, Vol. VIII, No III, Cambridge: Cambridge University Press, (1974).
Pandey, Gayendra, *Remembering Partition*, Cambridge: Cambridge University, (2001).
Pirzada, Syed Sharifuddin (ed.), *Foundations of Pakistan: All-India Muslim League Documents, 1906-1947*, Vol. II, Karachi: National Publishing House , (1970).
Rashid, Rao, *Jo Meiney Dekha: Pakistani Syasat aur Hukumrani ki Haqiqat* (What I Saw: The Inside Story of Pakistani Politics and Governance), Lahore: Jamhoori Publications, (2010).
Robert, Andrew, *Eminent Churchillians*, London: Phoenix, (1995).
Salim, Ahmad (ed.), *Lahore 1947*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, (2003).

Seervai, H. M., *Partition of India: Legend and Reality*, Bombay: Emmanem Publications, (1989).

Shahnawaz, Begum Jahan Ara, *Father and Daughter: A Political Biography*, Karachi: Oxford University Press, (2002).

Shils, E. 'Primordial, Personal, Sacred and Civil Ties', *in British Journal of Sociology*, (1975).

Singh, Amrik (ed.), *The Partition in Retrospect*, Delhi: Aanamika Publishers & Distributors (P) Ltd, (2000).

Singh, G., *Religion and Politics in the Punjab*, New Delhi: Deep & Deep Publications, (1986).

Singh, Harbans and Barrier, N. Gerald (eds), *Punjab Past and Present: Essays in Honour of Dr. Ganda Singh*, Patiala: Punjab University, (1976).

Singh, Khushwant, *A History of the Sikhs, Vol. I, 1469-1839*, Princeton: Princeton University Press, (1963).

Singh, Khushwant ,*A History of the Sikhs, Vol. II, 1839-1964*, Princeton: Princeton University, (1966).

Singh, Khushwant, *Ranjit Singh: Maharajah of the Punjab 1780-1839*, New Delhi: Orient Longman, (1985).

Singh, Khushwant, *Truth, Love and a Little Malice*, New Delhi: Viking, (2002).

Singh, Kirpal, *The Partition of the Punjab*, Patiala: Patiala University, (1989).

Singh, Kirpal, *Select Documents on Partition of Punjab – 1947*, Delhi: National Book Shop, (1991).

Steinberg, S., *The Ethnic Myth: Race, Ethnicity and Class in America*, New York: Atheneum, (1981).

Stone, Dan (ed), *The Historiography of Genocide*, Houndsmill, Basingstoke, Hampshire: Palgrave Macmillan, (2008).

Taqi-ud-din, Hafiz, *Tarikh ki Adalat Mein*, (In the Courtroom of History), Gujranwala: Jeenay Do Publications, (1999).

Taqi-ud-din, Hafiz, *Pakistan ki Syasi Jamaaten Aur Tehriken* (The Political Parties and Movements of Pakistan), Lahore: Classic, (2001).

Talbot, Ian, *Khizr Tiwana: The Punjab Unionist Party and the Partition of India*, Richmond, Surrey: Curzon, (1996).

Talbot, Ian and Gurharpal Singh, (eds), *Region and Partition: Bengal, Punjab and the Partition of the Subcontinent*, Karachi: Oxford University Press, (1999).

Talbot, Ian and Shinder Thandi, (eds), *People on the Move: Punjabi Colonial, and Post-Colonial Migration*, Karach: Oxford University Press, (2004).

Talha, Naureen, *Economic Factors in the Making of Pakistan*, Karachi: Oxford University Press, (2000).

Talib, Sardar Gurbachan Singh, *Muslim League Attack on Sikhs and Hindus in the Punjab 1947*, New Delhi: Voice of India, (1991, first published in 1950).

Tan, Tai Yong, and Gyanesh Kudaisya, *The Aftermath of Partition in South Asia*, London: Routledge, (2000).

Tan, Tai Yong, *The Garrison State: The Military, Government and Society in Colonial Punjab, 1849-1947*, New Delhi: Sage Publications, (2005).

Tanwar, Raghuvendra, *Reporting the Partition of Punjab: Press, Public and Other Opinions*, New Delhi: Manohar, (2006).

Tuker, Sir Francis, *While Memory Serves*, London: Cassell and Company Ltd, (1950).

Wali, Khan, *Facts are Facts: The Untold Story of India's Partition*, New Delhi: Vikas Publishing House Pvt Ltd, (1987).

Warraich, Suhail, *The Traitor Within: The Nawaz Sharif Story in His own Words*, Lahore: Sagar Publishers, (2008).

Westerlund, David and Svanberg, Ingvar (eds.), *Islam Outside the Arab World*, Richmond: Curzon Press, (1999).

Williams, H. 'Freelance' in *Times Literary Supplement*, (13 February 2004).

Wolpert, Stanley, *Jinnah of Pakistan*, Karachi: Oxford University Press, (2002).

Young, C., *The Politics of Cultural Pluralism*, Madison: The University of Wisconsin Press, (1976).

Official documents

Carter, L. (ed. and compiler), *Punjab Politics 1936-1939, The Start of Provincial Autonomy, Governors' Fortnightly Reports and Other Key Documents*, Delhi: Manohar, (2004).

Carter, L. (ed. and compiler), *Punjab Politics 1940-1943, Strains of War, Governors' Fortnightly Reports and other Key Documents*, Delhi: Mahohar, (2005).

Carter, L. (ed. and compiler), *Punjab Politics 1 January 1944–3 March 1947: Last Years of the Ministries, Governor's Fortnightly Reports and other Key Documents*, New Delhi: Manohar (2006).

Carter, L. (ed. and compiler), *Punjab Politics, 3 March–31 May 1947, At the Abyss, Governors' Fortnightly*

Reports and other Key Documents, New Delhi: Manohar, (2007a).

Carter, L. (ed. and compiler), *Punjab Politics, 1 June–14 August 1947, Tragedy, Governors' Fortnightly*

Reports and other Key Documents, New Delhi: Manohar, (2007b).

Disturbances in the Punjab, Islamabad: National Documentation Centre, (1995).

Mansergh, Nicholas and W. W. R., Lumby, (eds), *The Transfer of Power 1942-7, Volume I The Cripps Mission, January–April 1942*, London: Her Majesty's Stationery Office, (1970).

Mansergh, Nicholas and W. W. R., Lumby, (eds), *The Transfer of Power 1942-7, Volume II Quit India, 30 April–21 September 1942*, London: Her Majesty's Stationery Office, (1971).

Mansergh, Nicholas and W. W. R., Lumby, (eds), *The Transfer of Power 1942-7, Volume VI The post-war phase: new moves by the Labour Government, 1 August 1945–22 April 1946*, London: Her Majesty's Stationery Office, (1976).

Mansergh, Nicholas and W. W. R., Lumby, (eds), *The Transfer of Power 1942-7, Volume VII The Cabinet Mission, 23 March–29 June 1946*, London: Her Majesty's Stationery Office, (1977).

Mansergh, Nicholas and W. W. R., Lumby, (eds), *The Transfer of Power, 3 July–1 November 1946, Volume VIII The Interim Government*, London: Her Majesty's Stationery Office, (1979).

Mansergh, Nicholas and W. W. R., Lumby, (eds), *The Transfer of Power 1942-47, Volume IX The fixing of a time limit, 4 November 1946–22 March 1947*, London: Her Majesty's Stationery Office, (1980).

Mansergh, Nicholas and W. W. R., Lumby, (eds), *The Transfer of Power 1942-47, Volume X, The Mounbatten Viceroyalty, Formulation of a Plan, 22 March–30 May 1947*, London: Her Majesty's Stationery Office, (1981).

Mansergh, Nicholas and W. W. R., Lumby, (eds), *The Transfer of Power 1942-7, Volume XI, The Mountbatten Viceroyalty, Announcement and Reception of the 3 June Plan, 31 May–7 July 1947*, London: Her Majesty's Stationery Office, (1982).

Mansergh, Nicholas and W. W. R., Lumby, (eds), *The Transfer of Power 1942-47, Volume XII The Mountbatten Viceroyalty Princes, Partition and Independence, July 8–15 August 1947*, London: Her Majesty's Stationery Office, (1983).

Note on the Sikh Plan, Lahore: Government Printing Press, (1948).

RSS (Rashtriya Swayam Sewak Sangh) in the Punjab, Lahore: Government Printing Press, (1948).

Sadullah, Mian Muhammad (compiler), *The Partition of the Punjab 1947, Volumes I, II, III and IV* (official documents compiled for the National Documentation Centre, Lahore) Lahore: Sang-e-Meel Publications, (1993).

The Journey to Pakistan: A Documentation on Refugees of 1947, Islamabad: National Documentation Centre, (1993).

The Punjab Alienation of Land Act, 1901, Lahore: Government Printing Press, (1901).

The Report of the Court of Inquiry constituted under Punjab Act II of 1954 to enquire into the Punjab Disturbances of 1953 (also known as Munir Report), Lahore: Government Printing Press, (1954).

The Sikhs in Action, Lahore: Government Printing Press, (1948).

Microfilms

Fortnightly Reports of Punjab chief secretary for 1946 (which also include reports of the Punjab governor) in the Political Department Miscellaneous (also known as Political and Judicial records) under the designation: L/P & J/5/249, London: British Library.

Fortnightly Reports of Punjab chief secretary for 1947 (which also include reports of the Punjab governor) in the Political Department Miscellaneous (also known as Political and Judicial records) under the designation: IOR L/P & J/5/250, London: British Library.

Newspapers

Daily Times, Lahore, 13 April 2003.
Dawn, Delhi, 1947.
The Pakistan Times, Lahore, 1947.
The Tribune, Lahore, 1947.
The Civil and Military Gazette, Lahore, 1947.

Journals, Magazines and Reports

Economic and Political Weekly, Vol. XXXIII, no. 12, 8 August 1998, Mumbai, (1998).
Journal of Genocide Research, London: Taylor & Francis, Cartex Publishing, (2003.
Journal of Punjab Studies, Vol. II, no. 1, Coventry, (Spring 2004).
Journal of Sikh Studies, Vol. XXVII, No. 2, Amritsar: Guru Nanak Dev University, (2002).
Middle East Journal, Vol. 4, No. 3 , July, Washington DC (1950).
Modern Asian Studies, Vol. VIII, No. 4, Cambridge: Cambridge University, (1974).
Modern South Asian Studies, Vol. XIII, No. 3, Cambridge: Cambridge University, (1979).
Modern Asian Studies, Vol. XXXVI, No. 3, Cambridge: Cambridge University (2002).
NIAS Report 1990, Copenhagen: Nordic Institute of Asian Studies, (1990).
Outlook, New Delhi, (28 May 1997).
The Chronicle of Pakistan, http://therepublicofrumi.com/chronicle/1947_09.htm, (downloaded on 13 December 2010).
Seminar, Number 567, November, New Delhi, (2006).
The South Asian, http://www.the-south-asian.com/July-Aug2000/Chakwal_memories_4.htm, Delhi, (downloaded on 7 August 2000).
War in History, Vol. XVI. No. 4, London: Sage Publications, (2009).

Interviews

1992

Recollection of conversation with Inder Kumar and Sheil Gujral, New Delhi.

1997

Naqsh Lyallpuri, Mumbai, 2 January, 1997
B.R. Chopra, Mumbai, 4 January 1997
Abdullah Malik, Lahore, 9 December 1997
C.R. Aslam, Lahore, 15 December 1997

1999

Som Anand, New Delhi, 18 October 1999
Rattan Chand, Delhi, 19 October 1999
Ram Parkash Kapur, New Delhi, 20 October 1999
Jamna Das Akhtar, Delhi, 20 October 1999

Amarnath Sehgal, Delhi, 20 October 1999
Pran Nevile, Delhi, 21 October 1999
Harkishen Singh Surjeet, New Delhi, 21 October 1999
Yuvraj Krishan, Delhi. 21 October 1999
Prem Dhawan, Mumbai, 22 October 1999
Nanak Singh Broca, Mumbai, 23 October 1999
Dr Jagdish Chander Sarin, Delhi, 24 October 1999
Dr Prem Sobti, Delhi, 24 October 1999
Ramanand Sagar, Delhi, 25 October 1999 and again in Mumbai, 18 October

2000

Mujahid Taj Din, Lahore, 2 and 25 February 2000

2001

Ramanand Sagar, (second interview), Mumbai, 18 October 2001
Raj Babbar, Mumbai, 20 October 2001
Sunil Dutt, Mumbai, 20 October 2001
Sat Paul Arora, Delhi, 22 October 2001
Bhisham Sahni, Delhi, 23 October 2001

2002

Mushtaq Ahmad, Stockholm, 12 April 2002
Aziz Mazhar, London, 18-19 May 2002
Chaudhri Riasat Ali, London, 18 May, 2002
Rashid Ishaq Khaksar, London, 18 May 2002
Hameed Akhtar, London, 19 May 2002
Syed Muhammad Islam, London, 19 May 2002
Syed Zia Mohiyuddin, Stockholm, 24 June 2002
Mrs Kanta Singh Luthra, Salem, Oregon, 15 July 2002
Professor Emeritus Shaukat Ali, Mansfield, Massachusetts, 29 July 2002

2003

Mian Maqsood Ahmed, Lahore, 3 April 2003
Mian Muhammad Salim, Lahore, 4 April 2003
Arif Khokhar, Lahore, 4 April 2003
Col. (Retd) Nadir Ali, 5 April 2003
Mohammad Farid Mirza,Lahore, 7 April 2003
Hassan Din, Lahore, 13 April 2003.
Syed Afzal Haider, Lahore, 13 April 2003
Sheikh Anwar Ali, Islamabad, April 15, 2003
Khawaja Iftikhar, Lahore, 17 April 2003
Noor Bhari, Lahore, 17 April, 2003
Chaudhri Muhammad Bashir, Lahore, 18 April 2003
Rana Muhammad Rashid, Lahore, 18 April 2003
A. Hameed, Lahore, 19 April 2003
Professor Muhammad Sharif Kunjahi, Gujrat. 20 April 2003
Syed Aftab Hassan, Gujrat, 20 April 2003
Ahmad Bashir, Lahore, 22 April 2003
Mian Jalal Din, Lahore, 22 April, 2003.
Syed Ejaz Hussain Jafri, Lahore, 22 April 2003

A.T. Chaudhri, Lahore, 23 April 2003
Haji Muhammad Akram, Lahore, 23 April 2003
Begum Nasim Amir Hussain Shah, 25 April 2003
Tahira Mazhar Ali Khan, Lahore, 25 April 2003
Chaudhri Muhammad Siddiq, Lahore, 27 April 2003
Raja Tajammul Hussain, 27 April 2003
Sardar Shaukat Ali, Lahore, 3 May 2003
Dr Khushi Muhammad Khan, Stockholm, 16 June 2003

2004

Kamla Sethi, Delhi, 7 March 2004
Jagan Nath, Delhi, 8 March 2004
Kevel Krishan Tulli, Delhi, 8 March 2004; clarifications via telephone on 30
Sampuran Singh Sachdev, Delhi, 9 March 2004
Kidar Nath Malhohtra, Delhi, 10 March 200
Professor V.N. Dutta, Delhi, 10 March 2004
Balraj Dev Aggarwal, Delhi, 12 March 2004
B.R. Lal, Delhi, 12 March 2004
Manohar Lal Sharma, Delhi, 12 March 2004
Ram Dayal Chopra, Delhi, 12 March 2004
Iqbal Singh, Delhi, 13 March 2004
Vimal Issar, Delhi, 13 March 2004
Mrs Vimla Virmani, Delhi, 13 March 2004
Amar Singh, (formerly of Rawalpindi) Delhi, 14 March 2004
Madanlal Singh, Delhi, 14 March 2004 and 15 March 2004
Amar Singh, Delhi, 15 March 2004
Dina Nath Malhotra, Delhi, 15 March 2004
Hari Dev Shourie, Delhi, 16 March 2004
Gurdev Singh (formerly of Jhang), Delhi, 16 March 2004
Hans Raj Khatri, Sidhwan Bet, Ludhiana district, 17 March 2004
Old Mr Arora, Kishanpura, Moga district, 18 March 2004
Pyara Singh Naulakh, Kishanpura, Moga district, 18 March 2004
722 / The Punjab Bloodied, Partitioned and Cleansed
Gurdev Singh (formerly of Lyallpur rural areas), village Galib Kalan, Ludhiana district, 18 March 2004.
Nashatar Singh, village Galib Kalan, Ludhiana district, 18 March 2004
Harkishan Singh Mehta, Chandigarh, 20 March 2004
Selja Saini, Chandigarh, 20 March 2004
Gurcharan Das Arora, Amritsar, 24 March 2004
Devi Das Mangat, Amritsar, 25 March 2004
Mohan Singh Rahi, Amritsar, 25 March 2004
Ripudamman Singh, Amritsar 26 March 2004
Giani Mahinder Singh, Amritsar, 27 March 2004
Sardar Kundan Singh Samra, Kotla Sultan Singh, Amritsar district, 27 March
Moni Chadha, Delhi, 28 March 2004
Gurbachan Singh Tandon, Noida, 29 March 2004
Pushpa Goel, Delhi, 29 March 2004
Savitri Dutt-Chibber, Delhi, Noida, 29 March 2004
Pushpa Hans, Delhi, 31 March 2004
Col. Hans Raj Chopra, Delhi, 31 March 2004

Mahmooda Begum, 9 December 2004
Ameer Khan, Chak Beli Khan, Rawalpindi district, 11 December 2004
Haji Muhammad Hanif, Chak Beli Khan, Rawalpindi district, 11 December
Khawaja Masud Ahmed, Rawalpindi, 12 December 2004
Sheikh Noor Din, Rawalpindi, 12 December 2004
Haji Muhammad Sharif, Parial, Attock (Campbellpur) district, 13 December
Faiz Zaman, Parial, Attock (Campbellpur) district, 13 December 2004
Syed Nazir Hussain, Choa Khalsa, Rawalpindi district, 14 December 2004
Raja Muhammad Riasat Khan, Chou Khalsa, Rawalpindi district, 14 December
Haji Sher Khan, Thamali, Rawalpindi district, 14 December 2004
Jan Dad Khan, Thamali, Rawalpindi district, 14 December 2004
Davender Bhardwaj, via email from USA, 14 December 2004
Chaudhri Roshan Din, Kallar Syedan, Rawalpindi district, 15 December
Haji Sher Ahmed, Rawalpindi, 15 December 2004
Sheikh Muhammad Ishaq, Rawalpindi, 15 December 2004
Malik Muhammad Aslam, Lahore, 17 December 2004
Mustansar Husain Tarrar, Lahore, 17 December 2004
Ghulam Rasul Tanveer, Lyallpur (Faisalabad), 19 December 2004
Mujahid Al-Hussaini, Lyallpur (Faisalabad), 19 December, 2004
Abdul Bari, Multan, 20 December 2004
Chowdhry Abdul Wahid, Multan, 20 December 2004
Chowdhry Abdul Saeed, Bahawalpur, 21 December 2004
M. A. Shamshad, Multan, 21 December 2004
Syed Khurshid Abbas Gardezi, Multan, 21 December 2004
Arshad Multani, Multan, 22 December 2004
Ataullah Malik, Multan, 22 December 2004
Akram Warraich, email from Lahore, 22 December 2004
Mashkoor Sabri, Multan, 22 December 2004
Sheikh Abdul Wahab, Lahore, 24 December 2004
Kaleb Ali Sheikh, Lahore, 25 December 2004
Qamar Yurish, Lahore, 26 December 2004
Omar Saeed, Lahore, 27 December 2004
Sheikh Arshad Habib, Lahore, 27 December 2004
Sheikh Nur Muhammad, Lahore, 27 December 2004
Syed Qamurruzaman Shah, Lahore, 28 December 2004
Muhammad Ashiq Raheel, Lahore, 29 December 2004
Ali Bakhsh, Lahore, 30 December 2004
Haji Abdul Rahman Gill, Lahore, 30 December 2004; followed up by Ahmed Salim on 29 September 2005; and 15 October 2005

2005

Professor Kirpal Singh, Chandigarh, 2 January 2005
Tilak Raj Oberoi, Chandigarh, 2 January 2005
Mahinder Nath Khanna, Amritsar, 3 January 2005
Bhagwan Das, Batala, 3 January 2005
Inderjeet, Batala, 3 January 2005
Ranjit Singh Bhasin, Kapurthala, 3 January 2005
Mrs Rajnish Tandon, Hoshiarpur, 3 January 2005.
Professor Chaman Lal Arora, Jullundur, 4 January 2005
Baldev Verma, Ludhiana, 4 January 2005.

Maulana Habibur Rahman Sanvi Ludhianvi, Ludhiana, 4 January 2005.
Mohan Lal Jhanji, Ludhiana, 4 January 2005.
Ranjit Singh (Ajit Singh), village Nathu Majra, Ludhiana district, 4 January, 2005.
Vicky's classmate's father, village Nathu Majra, Ludhiana district, 4 January, 2005.
Babu Khan, Malerkotla, 6 January 2005.
Chaudhri Abdul Shakoor, Malerkotla, 6 January 2005.
Dr Nizam Din, Malerkotla, 6 January 2005.
Amrik Chand Ahluwalia, Patiala, 7 January 2005.
Pandit Mohan Lal Balo, Patiala, 7 January 2005.
Raghbir Singh Sahni, Patiala, 7 January 2005
Sardul Singh Virk, Lakhmari, Kurukshestra district, 8 January 2005
Faqir Singh Virk, Lakhmari, Kurukshestra district, 8 January 2005
Shamsherjit Singh Virk, Lakhmari, district Kurukshestra, Haryana, 8 January
Premchand Khanna, Delhi, 9 January 2005
Girdhari Lal Kapur, Delhi, 9 January 2005
Bhola Nath Gulati, Delhi, 9 January 2005
Aftar Singh Judge, Delhi, 10 January 2005
Lajpat Rai Seth, Delhi, 10 January 2005
Professor V. N. Dutta, New Delhi, 10 January 2005
Raskhat Puri, Delhi, 10 January 2005
Trilok Kumar Gulati, Delhi, 11 January 2005.
Ghulam Haider, Rajgarh, Lahore, 13 January 2005
Muhammad Munir, Rajgarh, Lahore, 13 January 2005
Lambardar Muhammad Hanif, Rajgarh, Lahore, 13 January 2005
Sheikh Muhammad Farooq, Rajgarh, Lahore, 13 January 2005
I.A. Rehman, Lahore, 14 January 2005.
Mian Muhammad Sharif, Lahore, 14 January 2005
Mian Mustafa Kamal Pasha, Lahore, 14 January 2005
Professor Vinay Kumar, Stockholm, 3 February 2005.
Professor Prem Singh Kahlon, Nashville, Tennesse via email, 15 June 2005
S. Jarnail Singh Pasricha interviewed by Mrs Inderjeet Kaur, Headmistress
Montgomery Girls High School, Kapurthala and sent by email on 1 August, 2005
Suleman Cheema, via telephone from Lahore, 13 October 2005
Hukum Qureshi, Lahore (by Ahmad Salim), 30 October 2005
Syed Ahmed Saeed Kirmani, Lahore, (by Ahmad Salim) 31 October 2005
Panditji, Karnal, Haryana, 28 November 2005
Basta Singh, village Adampur, Fatehgarh district, East Punjab, 28 November, 2005
Naugurdial Singh, village Adampur, Fatehgarh district, East Punjab, 28 November, 2005
Richpal Singh, village Adampur, Fatehgarh district, East Punjab, 28 November, 2005
Teja Singh, Boran, Fatehgarh district, East Punjab, 28 November 2005
Des Raj, village Kakra, Patiala district, 28 November 2005
Karnail Singh, village Kakra, Patiala district, 28 November 2005
Ajaib Singh, Gujjarwal, Ludhiana district, 29 November 2005
Harmail Singh, Gujjarwal, Ludhiana district, 29 November 2005
Chhitru, village Dangoli, district Rupnagar, 29 November 2005
Amar Singh, village Dangoli, Rupnagar district, 29 November 2005
Naseeb Kaur born Azmat Bibi, village Phul Khurd, Rupnagar district, 29
November, 2005
Chaman Lal Ahuja, Panipat, 30 November 2005
Sudharshan Kumar Kapur, Old Gargaon outside Delhi, 1 December 2005
Brig (Retd) Sarjit Singh Chowdhary, Delhi,1 December 2005

Ashwini Kumar, Delhi, 2 December 2005
Raj Rani Gosain, Noida, 2 December 2005
Sikander Lal Bagga, Delhi, 3 December 2005
Chaudhri Nazir Ahmed Virk, Sheikhupura, (by Ahmad Salim), 30 December , 2005
Chaudhri Tawwakullah Virk, Sheikhupura, (by Ahmad Salim), 30 December, 2005
Haji Mukhtar Ahmed Khan, Sheikhupura, (by Ahmad Salim), 30 December, 2005

2006

Asaf Ali Shah, Lahore (via email) 3 January 2006
Ahad Malik, Stockholm, 13 January 2006
Dr Hafeez Ahmad Mughal, interview via email from Lahore, 16 January
Riaz Ahmed Cheema, 16 May 2006
Jaspal Singh Kohli, London, 8 June 2006
Chaudhri Anwar Aziz, Lahore, 15 December 2006
Baroness Shreela Flather, Maidenhead, Berkshire County, 7 July 2006
Reginald Massey, Llanidloes, mid-Wales on 5 July 2006; also via email 4 August on 4 August 2007
Ambassador Azim Husain, London, 8 July 2006

2007

Nasim Hassan, Hockessin, Delaware, USA (by email) 1 January 2007
Ayaz Khan, Linkoping, Sweden (via email), 14 January 2007
Lt. Gen. Aftab Ahmad Khan, letter from Lahore dated 2 February 2007
Muhammad Feroz Dar, Solna, Sweden, 18 February 2007
Col. (Retd) Ata Muhammad Dogar, Lahore, 10 May 2007
Bhisham Kumar Bakshi, via email from Delhi, 5 March 2007
Manmohan Taneja, interviewed by Professor Manchanda in New Delhi, on 7 and 10 March, sent on 10 March 2007
Dr. Satya Pal 'Bedar', interviewed by Professor Manchanda in New Delhi 11 March 2007, sent on 11 March 2007
Dr Teja Singh, Edmonton, Canada, via email on 17 March 2007
Gobind Thukral, Chandigarh, via email, 21 July 2007
Jagpal Tiwana, Dartmouth, NS, Canada, via email, 11 April 2007
Mrs. B.A. Choudhary, Lahore, via email sent by her son Dr. Muhammad Farooq on 22 July 2007

2009

Amjad Babar, Washington DC, 11 July 2009

2010

Ian Talbot, his email response from Southampton, UK of 19 March 2010.
Professor Narendra Mohan Vaid, Panipat, interviewed by Arvind Vaid who sent it by email on 14 April 2010
Kumar Chand, Singapore, 10 May, 2010
Moni Chadha, second interview via email from Delhi, 28 December 2010

2011

Nirmal Tej Singh Chopra, Singapore, via email, 5 January 2011
Brig. (Retd) Yasub Ali Dogar, Lahore, via telephone and email, 13 January
Dr Ajay K. Mehra, Noida, UP, via telephone and email, 13 January 2011
Mushtaq Ahmad, second interview, Stockholm, 20 February 2011
Rachna Anand, via email from Singapore, 21 February 2011
Batool Begum, interviewed by her son, Brigadier Yasub Ali Dogar, in Lahore,
Grandmother of Saleem Haroon Bhatti, via email from Lahore, 5 March
Kuldip Kumar Chopra, Stockholm, 20 April 2011

ایک المیہ ہزار داستانیں

بہترین نان فکشن کیلیے کراچی لٹریچر فیسٹیول کوکا کولا پرائز اور یو بی ایل - جنگ گروپ لٹریری پرائز جیسے 2 قومی ایوارڈ جیتنے والا تحقیقی شہکار پیراماؤنٹ کے زیر اہتمام اب اردو ترجمہ کے ساتھ آپ کی نذر

آپ کی خدمت میں پیش ہونے والی یہ کتاب پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق احمد کا روایت شکن شاہکار ہے جو 1947 میں مشرقی اور مغربی پنجاب دونوں کو ناپسندیدہ اقلیتوں سے پاک کرنے سے متعلق دستاویزات پر مبنی ہے۔ اس میں انتہائی عرق ریزی کے بعد برطانوی دور کی ان خفیہ رپورٹوں کو شامل کرنے کے ساتھ ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد دونوں طرف ہونے والے قتل عام کے واقعات کے عینی شاہدین، زندہ بچ جانے والے افراد۔۔۔۔حتیٰ کہ کارروائیوں میں حصہ لینے والوں۔۔۔۔۔کے دل فگار تاثرات دیے گئے ہیں۔ پنجاب کی تقسیم کے بارے میں یہ خاص (exclusive) واقعات ان لوگوں کی آنکھوں سے بیان کیے گئے ہیں جو ان کا حصہ تھے یا پھر ان کے اثرات سے متاثر ہوئے بلکہ آج بھی متاثر ہیں۔

یہ تحقیقی کتاب نہ صرف انگریز دور کے متحدہ ہندوستان کے دارالحکومت دہلی اور غیر منقسم پنجاب کے مرکزی شہر لاہور سے جنم لینے والے سیاست اور اقتدار کے کھیل کی جامع تفصیل بلکہ اس انسانی قیمت کا بھی ماتم ہے جو پنجاب کے عوام کو ادا کرنا پڑی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیسے مذہبی اختلافات اس وقت تک پرامن بقائے باہمی کیلیے نقصان دہ ثابت نہیں ہوتے جب تک کہ تقسیم کی درپے قوتیں انہیں اجاگر نہ کریں۔

پیراماؤنٹ کے زیر اہتمام اردو ایڈیشن پنجاب اور پنجابی عوام کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے کیونکہ پہلی بار اردو کے توسط سے اس اہم تحقیقی کتاب تک پاکستان کی بڑی تعلیمیافتہ اکثریت کو رسائی مل رہی ہے اور یوں اب وہ خود اپنا ذہن تیار کر سکتے ہیں کہ 1947 میں کیا کیا ہوا۔

اشتیاق احمد 24 فروری 1947 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ اسٹاک ہوم یونیورسٹی سے پولیٹکل سائنس میں پی ایچ ڈی ہیں۔ ان دنوں آپ لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS) میں وزیٹنگ پروفیسر ہیں۔ آپ اسٹاک ہوم یونیورسٹی میں پولیٹکل سائنس کے پروفیسر اماریٹس اور انسٹی ٹیوٹ آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز، یونیورسٹی آف سنگاپور میں اعزازی سینئر فیلو ہیں۔ آپ کی تحقیقاتی دلچسپیاں ریاستی اسلام، نسل اور قوم پرستی، انسانی، اقلیتی اور گروہی حقوق اور مطالعہ تقسیم جیسے متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔

پنجاب کا بٹوارا 1947 ایک المیہ ہزار داستانیں پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق احمد

پڙهندڙ نَسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين "اُداس نسلين" نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ "لُڙهندَڙ نَسُل" نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندَڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياجوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني وِچان "پڙهندڙ" نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان ڪڍي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنى e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعوىٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي کي پئسا گَڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.

جهڙيءَ طرح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اهڙيءَ طرح پڙهندڙ نسُل وارا پَنَ بہ مختلف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، پرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. بين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصي ۽ تالي لڳل ڪلب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪم ڪار سهڪاري ۽ رضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هڪٻئي جي مدد ڪرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَن پاران ڪتابن کي ڊجيٽائيز digitize ڪرڻ جي عملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊجيٽائيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو ورهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڌ کان وڌ ڪتاب خريد ڪري ڪتابن جي ليکڪن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي همٿائِن. پر ساڳئي وقت علم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪنهن بہ رُڪاوٽ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، جاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڏي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موتي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَتي، هي بَم- گولو،

جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ -

اِن حسابَ سان اڻجاڻائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ "هاٿي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو" ناداني‎ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻجاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين

ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بڻائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، چالاڪ ۽ ڪينئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشش ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نه رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽل گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان به پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪِي پائي چيو ته ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)